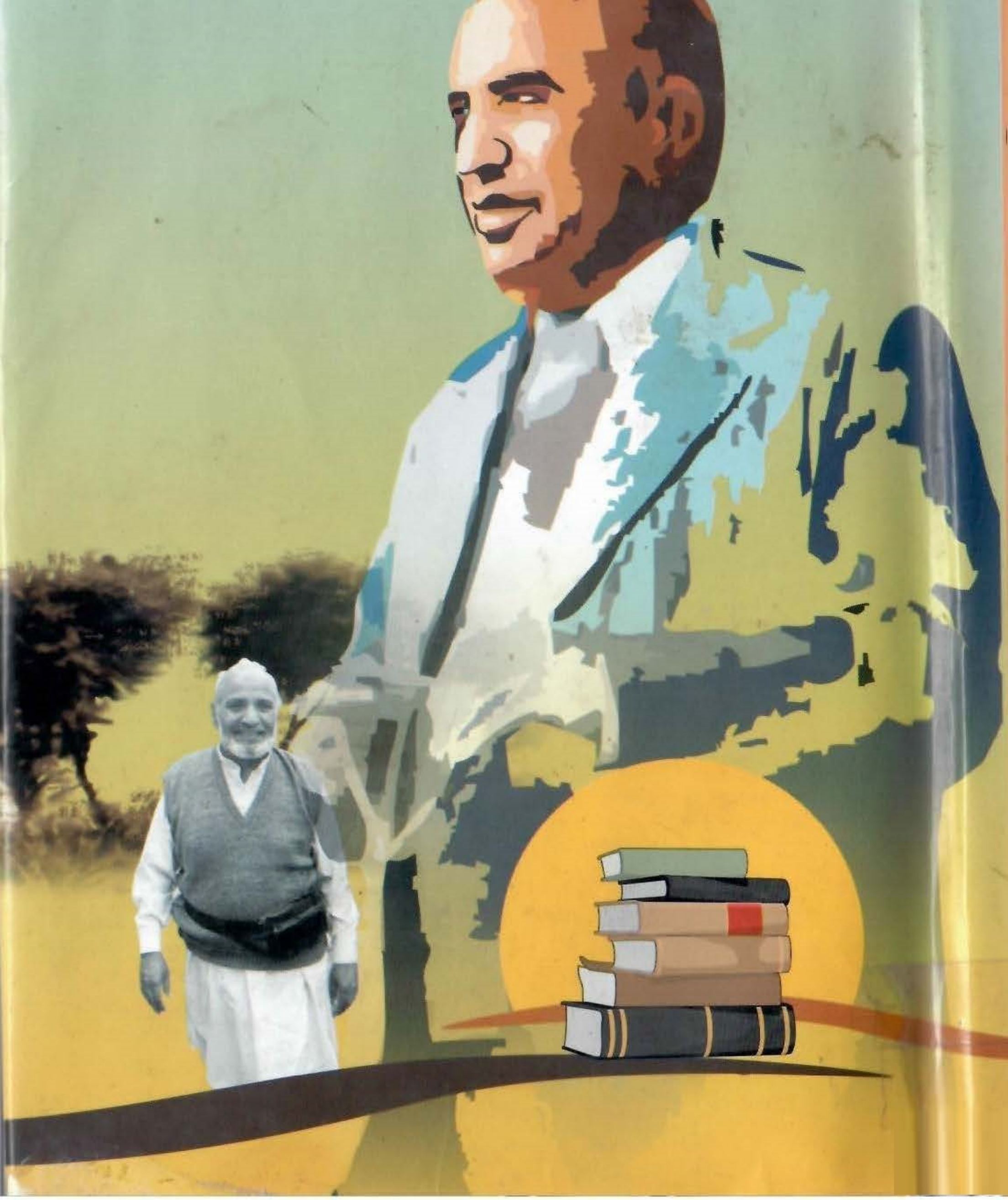
منکہ ایک مدرس

قاضی ذوالفقار احمد





منکہ ایک مدرّس

محکمہ تعلیم سے وابستہ ایک ریٹائرڈ آفیسر کی داستانِ حیات، جو زندگی کی حسرتوں، مسرتوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کا مرقع بن کر غور و فکر کے نئے دریچے وا کر گئی

قاضی ذوالفقار احمد

☆☆

ابلاغ پبلشرز
مین مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور فون: 7311569

اشاعت اول: اگست 2004ء

نام کتاب	:	منکہ ایک مدرس
مصنف	:	قاضی ذوالفقار احمد
سرورق	:	عامر شہزاد
ناشر	:	جمیل النبی خان
کمپوزنگ	:	جاوید اختر
مطبع	:	اکبر امین پریس لاہور
باہتمام	:	سلمان قریشی

قیمت/=350 روپے

یکے از مطبوعات:

ابلاغ پبلشرز

مین مارکیٹ اردو بازار لاہور۔فون نمبر ۰۴۲/۷۳۱۱۵۶۹

فہرست ابواب

مندرجہ بالا عنوانات کو محض ''عنوان نامہ'' ہی سمجھا جائے کیونکہ ایک ایک عنوان کے تحت ہر (وقفہ) نیا واقعہ ہے اور اس میں نئی کہانی اور نئی بات موجود ہے جبکہ ''منکہ ایک مدرس'' ایک مسلسل داستانِ حیات ہے۔ ◆

انتساب

ان تمام اساتذہ کرام کے نام
جن کا ذکر اور حوالہ کتاب میں آیا ہے

طرازِ عنوان

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

اقبالؔ

پیش لفظ

میں ارادے باندھنے اور توڑنے والا ایک متلون مزاج، ناپختہ کار اور جذباتی سا انسان ہوں۔ دوسروں پر جلدی ایمان لے آتا ہوں اور کبھی کبھی محبت کرنے والوں سے اپنی ہی غلطیوں کی پاداش میں زک اٹھا کر ڈانواں ڈول پھرتا رہتا ہوں۔ دوسروں کے مثبت کردار سے اور دوسروں کی اچھی تحریروں سے متاثر ہونا بھی میری فطرت ہے۔ جب سے میں نے کچھ باعمل لوگوں کی رفاقت میں ان کی شخصیتوں کا مطالعہ کیا اور جب سے لوگوں کی سوانح حیات کو پڑھا تو میں نے لحظہ بہ لحظہ اپنے اندر کچھ کرنے اور کہنے کی تمنا کی پرورش کرنے لگا۔ جب میں نے بالخصوص ممتاز مفتی کی ''علی پور کا ایلی'' پڑھی تب ہی سے میں مفتی صاحب کے انداز میں اپنے بارے میں لکھنے کا سوچنے لگا تھا۔ لیکن میں کبھی کچھ نہ لکھ سکا۔ سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ کیا لکھوں؟ بقول ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قریبی عزیز کے کہ ہماری زندگی میں ایسی کونسی راہنما اور سنگ میل باتیں ہیں کہ ان کو یاد رکھا اور لکھا جائے۔ پھر بھی میرے اندر خود کو دوسروں کے سامنے پیش کر دینے کی آنچ برقرار رہی۔ یوں بھی میں مایوسی سے بھی کبھی مایوس نہیں ہوا۔ رنج سے خوگر ہو کر ہی رنج کو مٹایا

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ء میں ''اجالے کی تلاش'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کا تعارف مولانا عبدالمجید سالک مرحوم مدیر ''انقلاب'' نے لکھا تھا۔ افسوس وہ افسانوی مجموعہ اب میرے پاس بھی موجود نہیں رہا۔ درس و تدریس کی زندگی میں، میں مختلف النوع تحریروں سے اپنے تجربات اور مشاہدات لکھتا رہا۔ ''سیارہ ڈائجسٹ'' پندرھویں صدی اور ''اردو ڈائجسٹ'' کے علاوہ کئی رسائل میں میرے تراجم اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ میں اپنی یہ تحریریں لوگوں کو اپنے محسوسات منتقل کرنے کے لئے اشاعت کی خاطر بھیجتا رہا۔ مجھے جو نئی بات، نیا تجربہ اور نیا احساس ہوتا ہے اور میں اس سے کچھ خوشی یا راہ نمائی حاصل کرتا ہوں تو پھر میں اس کو دوسروں تک پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہوں۔ نہ جانے کیوں...... شاید میں یہ چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی اس احساس سے میری طرح راہ نمائی حاصل کریں۔

۱۹۸۹ء میں مَیں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا تو اردو بازار کے کچھ پبلشر حضرات کا درسی نوعیت کا کام کرتا رہا۔ فروری ۱۹۹۰ء میں، میں نے 'اردو ڈائجسٹ' میں ''پاسر پا جنگ سے

فرار'' کی داستان تلخیص و ترجمہ کر کے لکھی اور پھر میں ایک طرح سے بطور فری لانسر قلمکار کے 'اردو ڈائجسٹ' سے ہی وابستہ ہو کر رہ گیا۔

مشہور ہے کہ اکثر اخبارات و جرائد کے مدیر حضرات خود نہیں لکھتے لیکن دوسروں سے اپنی سوچوں کے مطابق لکھواتے ہیں۔ ''اردو ڈائجسٹ'' کے مدیر انتظامی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی بھی ایسے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ ہیں۔ انھوں نے مجھ سے بہت سی ایسی تحریریں لکھوائیں جن کی طرف کبھی میرا امیلانِ طبع نہیں ہوا تھا۔ میرا رجحان تو افسانہ نویسی تھا۔ تاہم دوسرے کئی لکھنے والوں کی طرح میں نے بھی ان سے بہت سیکھا' لغت کے درست استعمال کے معاملے میں بھی وہ میرے راہ نما ثابت ہوئے۔

۲۰۰۰ء میں انہی کی راہ نمائی اور ترغیب پر میں نے بطور مدرس کے اپنی آپ بیتی ''منکہ ایک مدرس'' کی ایک قسط ماہ اپریل کے ''آپ بیتی'' نمبر میں لکھی۔ قارئین کو پسند آئی۔ جب کوئی تحریر قارئین کو پسند آتی ہے تو لکھنے والے قلمکار اور شائع کرنے والا ادارہ دونوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ ''منکہ ایک مدرس'' کے حوالے سے میرے کئی ساتھیوں اور شاگردوں سے میرے تعلقات کی بھی تجدید ہوئی اور میرا اعتماد انسانی رشتوں پر بحال ہوا۔ اپنی ذات بھی مجھے کچھ بھلی لگنے لگی۔

جمیل یوسف ریٹائرڈ پروفیسر ہیں جبکہ محمد خلیل چودھری حاضر سروس ہیڈ ماسٹر ہیں اور آپ بیتیوں کے مطالعے کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ دونوں حضرات کے خطوط ادارہ ''اردو ڈائجسٹ'' ماہ مئی کے شمارے میں اپنے مستقل سلسلے ''چمن خیال'' میں شائع ہوئے جو یوں تھے:

'اُردو ڈائجسٹ' آپ بیتی نمبر

> ''آپ نے آپ بیتی نمبر نکال کر کمال کر دیا ہے۔ محدود حجم کے رسالے میں ۲۷ ناقابل فراموش شخصیات کی زندگیوں کے ایسے واقعات منتخب کر کے جمع کر دیے جو قارئین کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اہل وطن اور بیرون وطن اردو دان طبقے کے لئے آپ بیتی نمبر ایک انمول تحفہ ہے جسے وہ زندگی بھر حرز جان بنائے رکھیں گے۔ اردو میں شائع ہونے والے اکثر ڈائجسٹ خیالی اور فرضی

کہانیوں سے قاری کا ذہن بھر دیتے ہیں جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ میں آپ کو خراج تحسین اور ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور آپ کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے۔

یوں تو سبھی شخصیات کی سرگزشت دلچسپ ہے مگر مجھے بطور خاص قاضی ذوالفقار احمد صاحب کی تحریر ''منکہ ایک مدرس'' اور دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی اچھی لگی۔ قاضی صاحب نے جس دلکش، سادہ مگر دل موہ لینے والے اسلوب میں اپنی ابتدائی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں اس کا جواب نہیں۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر قاضی صاحب اپنی آپ بیتی اسی انداز میں مکمل کریں جس طرح اس کی پہلی قسط لکھی ہے تو بلاشبہ اردو میں ایک یادگار اور بے مثل خودنوشت ہوگی''۔

(جمیل یوسف......اسلام آباد)

دینہ ضلع جہلم سے محمد خلیل چودھری کے خط کا متن یوں ہے......

''شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء آپ بیتی نمبر پڑھ کر دل خوش گیا۔ تمام آپ بیتیاں بالخصوص سید قاسم محمود کی آپ بیتی بہت خوب تھی۔ سب سے زیادہ لطف قاضی ذوالفقار احمد کی آپ بیتی ''منکہ ایک مدرس'' نے دیا۔ میں خود بھی ایک معلم ہوں، لہٰذا ایک معلم کی آپ بیتی پڑھ کر شعبہ درس وتدریس کے کئی گوشوں سے آ گاہی ہوئی۔

میں نے ہی سب سے پہلے شمارہ ستمبر ۱۹۹۹ء میں تجویز دی تھی کہ ''سالنامہ ۲۰۰۰ء کو بطور آپ بیتی نمبر شائع کریں تو قارئین یقیناً پسند کریں گے۔'' اب آپ بیتی نمبر کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی تشنگی باقی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ جو نامور شخصیات رہ گئی ہیں۔ مثلاً مرزا ادیب، احسان دانش، خواجہ حسن نظامی، صدر ایوب خان

وغیرہ انھیں دوسری جلد میں شامل کر لیں''۔

دوسری قسط چھپنے پر ایک خط ماہ جون کے ''چمن خیال'' میں شائع کیا گیا

''شمارہ مئی میں آپ نے سید قاسم محمود اور قاضی ذوالفقار احمد کی آپ بیتیاں جاری رکھ کر بہت اچھا کیا۔ یہ دونوں آپ بیتیاں اس قابل ہیں کہ انھیں اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لئے ہر ماہ شائع کیا جائے۔

(مظہر سلیم مجوکہ...... ملتان)

آپ بیتی مسلسل چھپتی رہی اور قارئین اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ مجھے داد بیداد ملتی رہی لیکن میں خوش تھا کہ لوگ میری تحریر پڑھ تو رہے ہیں؟ دو خط اور ملاحظہ فرمایئے:

''قاضی صاحب کی آپ بیتی دلچسپ ہے اور بہت سی یادوں کو تازہ کرنے کا باعث بن رہی ہے' ان کے دیرینہ دوست اصغر علی گردیزی وفات پا چکے' ظفر سوشلسٹ اکثر صاحبزادہ فاروق علی خان کے ہم نشیں ہوتے ہیں''۔

(پروفیسر ریٹائرڈ افتخار حسین شاہ......ملتان)

کراچی سے ایک محترمہ رقم طراز ہیں

''منکہ ایک مدرس'' فضول سی داستان ہے جس میں جھوٹ' دھوکہ دہی اور بے ایمانی کی بھرمار ہے۔ کاش کسی سچ بولنے والے' ایماندار استاد کی آپ بیتی شائع کی جاتی۔

(ذکیہ بلگرامی......کراچی)

ایک خط چکوال سے عبدالجبار خان صاحب کا بھی آیا۔ وہ بوچھال کلاں میں ۱۹۵۳ء میں طالب علم تھے۔ انھوں نے تصحیح فرمائی کہ میں نے اپنے جس ہم جماعت مدرس کو ملک اللہ یار لکھا ہے وہ دراصل خواجہ جعفر تھے۔ مجھے اپنی یادداشت پر افسوس ہوا۔ ان کی درستی کے بعد مجھے اپنی غلطی کا بھی احساس ہوا لیکن میں اس غلطی کی تصحیح نہ کر سکا اس لیے کہ اردو ڈائجسٹ کے نائب مدیر محسن فارانی مستعفی ہو گئے اور ہمیں عبدالجبار کا خط ان سے دستیاب نہ ہو سکا۔

اسلام آباد سے خالد اقبال کا خط:

مکان نمبر ۱۶، گلی نمبر ۲۷
جی ۶/۲، اسلام آباد
۱۱/ اکتوبر

مزاج بخیر...... عرصہ سے آپ کی تحریریں نظر نواز ہو رہی ہیں...... تعلیمی دنیا سے مَس ہونے اور آپ کے انداز بیان سے حد درجہ ان تحریروں سے محظوظ ہوتا ہوں۔ اللہ کرے آپ کا قلم اور............

اس مراسلے کا باعثِ تحریر...... اردو ڈائجسٹ کے حالیہ شمارے میں مطبوعہ آپ کی آپ بیتی بعنوان ''منکہ ایک مدرس'' میں بوچھال کلاں کے تذکرے میں بیان کردہ چند حقائق تحریر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً

۱) آپ نے وہاں کے مقامی اساتذہ (محترم سکندر خان صاحب اور محترم اللہ یار صاحب کو راجہ لکھا ہے جبکہ وہ 'راجہ' نہیں 'ملک' ہیں

۲) سیٹھ ملک عباس خان صاحب (مرحوم) ''سر سید و نہار'' بابا مہدی خان صاحب (مرحوم) کے پوتے نہیں تھے بلکہ قریبی عزیز تھے۔

۳) سیٹھ عباس خان کا کاروبار سنگاپور میں نہیں بلکہ ہانگ کانگ میں تھا۔ نیز یہ کاروبار بابا مہدی خان صاحب (مرحوم) کے صاحبزادے کا نہ تھا۔

۴) سیٹھ صاحب (مرحوم) کا قیام راولپنڈی میں نہیں بوچھال کلاں میں تھا۔ سیٹھ صاحب کی شاندار کئی منزلہ حویلی (جسے اکثر لوگ ''محل جی'' کہتے تھے) کلر کہار کی جانب سے بوچھال آتے ہوئے دور سے نظر آتی تھی۔

۵) اُستاد محترم بشیر حسین چغتائی صاحب بوچھال کلاں سے اپنی

خداداد صلاحیتوں کی بناء پر کیڈٹ کالج حسن ابدال چلے گئے تھے۔
اُمید ہے مذکورہ بالا حقائق آپ کی آپ بیتی کے فائل میں مقام پائیں گے اور میری یہ تحریر بارِ خاطر نہ ہوگی۔
میرا مختصر سا تعارف:
بوچھال کلاں ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر (۱۹۵۳-۵۴) قاضی عبدالسلام صاحب (مرحوم) میرے والد محترم تھے میں نے نہم اور دہم کی تعلیم وہاں پائی) والسلام

خالد اقبال

کئی احباب نے ٹیلیفون کئے...... کئی نے ملاقاتیں کیں۔ اس سب کچھ سے مجھے زندگی کے متعلق لکھنے کی ایسی تحریک ملی کہ میں نے اپنی آپ بیتی کو اپنی تحریروں میں ''مدرس'' تک محدود نہ رکھا۔ اس پر ادارہ (اردو ڈائجسٹ) معترض ہوا۔ ادارے کا اعتراض بجا تھا کہ آپ بیتی طویل ہوتی جائے گی۔ ۷۳ سال کی عمر کے واقعات' تجربات اور مشاہدات کو سمجھنے کے لئے کم از کم ۷۳ ابواب تو چاہئیں۔ اتنی طویل قسطوں کا ایک ماہوار جریدہ متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بھی عرض پرداز تھا کہ ''مدرس'' صرف مدرس ہی نہیں ہوتا۔ عام انسانی معاشرے کا ایک فرد بھی ہوتا ہے جو تمام سماجی بندھنوں میں الجھا ہوتا ہے اور لکھنے والے کو اپنے اظہار بیان میں تھوڑی سی آزادی بھی حاصل ہونا لازمی ہے۔ یک نہ شد دو شد والا معاملہ کہ ہر قسط کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے کہ اگلی قسط میں تعلیم کے فلاں فلاں پہلوؤں کو زیرِ تحریر لانا ضروری ہے یوں ان تمام پہلوؤں کو سمیٹتے سمیٹتے یہ آپ بیتی ۲۶ اقساط میں اپنے اختتام کو پہنچی...... جبکہ میں نے ۲۵ اقساط میں آپ بیتی ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بہر کیف 'اُردو ڈائجسٹ' نے ۲۶ ویں قسط کو بھی شائع کرنے کی مہربانی کی۔

میں نے اپنی سرگزشتِ حیات اپنی یادداشتوں کے سہارے لکھی ہے۔ اس میں یقیناً کہیں نہ کہیں سہو ہوا ہوگا لیکن قارئین کرام سے یہ التجا ضرور کروں گا کہ وہ محترمہ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی طرح اسے جھوٹ' دھوکہ دہی اور بے ایمانی کی بھرمار سمجھیں نہ مجھے ان صفات کا حامل۔ بلکہ اس تحریر کو پڑھ کر متوازن رائے قائم کریں کہ ہمارا تعلیمی اور معاشرتی نظام کس نہج پر ہے۔ حقائق تو آج پہلے سے بھی زیادہ گھناؤنے نظر آرہے ہیں جن کا ذکر میری تحریر میں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ

ہمارا قومی نظامِ تعلیم بتدریج بگڑتا ہی چلا جارہا ہے۔ جو چند لوگ کامیاب و کامران، عالم، فاضل، ماہر اور نمایاں نظر آتے ہیں یہ ان کی ذاتی محنتوں اور کاوشوں کا صلہ ہے جو قدرت نے ان کو ان کے والدین کی دعاؤں اور اساتذہ کی شفقت سے عطا کیا ہے۔

جس دور کے بارے میں مَیں نے لکھا وہی انحطاط کے آغاز کا دور تھا اور ہمیں ملی طور پر احساس تھا کہ ہم کسی غلط منزل کی طرف جارہے ہیں۔ مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوا اور ملک قرضوں کے جال میں جکڑا گیا، پے در پے اقتدار فوج نے سنبھالا۔ چنانچہ مہنگائی اور بیروزگاری نے نہ صرف مثبت انفرادی سوچ کو محدود کردیا بلکہ اسے زبردستی نفسانفسی اور افراتفری کی وادیوں میں اتار دیا۔ دہشت گردی کا جنم اسی نظام کی کوکھ سے پیدا ہوا جس سے پوری قوم عاجز ہے۔ اور وہ درمیانہ طبقہ جس نے نہ صرف اپنا بلکہ ننھی ننھی جانوں کا خونِ جگر دے کر پاکستان بنایا تھا آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اور تو اور ہم نے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی ۵۶ برس گزر جانے کے باوجود ایک نہیں بنا سکے بلکہ اچھوت اور شودر بنا دینے والے طبقاتی نظامِ تعلیم (اے لیول، او لیول) کو راستہ دے دیا ہے۔ بیشتر مدرسین نے اپنی ذمہ داری سے، والدین نے اچھی تربیت سے اور شاگرد نے ادب و احترام سے منہ موڑ لیا ہے۔ شرح خواندگی میں اضافہ ہوا ہے نہ ہی تعلیم چھوڑ دینے والی تعداد میں کمی۔

آج کا پورا ماحول آپ قارئین کے سامنے ہے۔ ذرا اس کا جائزہ لیجئے اور ایسے عملی اقدام کے متعلق سوچئے کہ وطنِ عزیز کا مستقبل مزید تاریک نہ ہو۔ ہم مسلمان ایک ملت کے حوالے سے زندہ رہ سکیں۔ میں نے اگر اپنے ذاتی بگاڑ کی بات سپردِ قلم کردی ہے تو میں اپنی غلطیوں کے حوالے سے اللہ جل شانہ سے معافی کا طلبگار ہوں اور ملتجی ہوں کہ

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر　　از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

میری اس سرگزشت کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ ابلاغ پبلشرز کے مالک جمیل النبی خان نے محض میرے ساتھ دوستی نبھانے کی خاطر کیا۔ میں ان کے حوصلے کی داد بھی دیتا ہوں اور ان کے خلوص کی بھی۔ الحمدللہ...... ہماری رفاقت "گولڈن جوبلی" کی دہائی میں داخل ہو چکی ہے اور خاں صاحب نے اپنی شائع کردہ ہر کتاب مجھے پڑھنے

کے لئے مرحمت فرمائی ہے۔

میں ذاتی طور پر ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ایک معمولی مدرس کی داستانِ حیات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ سب سے بڑھ کر میں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کا ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے مجھے وہ لکھنے کی تحریک دی جسے میں ایک عرصہ سے التواء میں ڈالتا آیا تھا۔ سب سے بڑا احسان اور کرم ذات باری تعالیٰ کا ہے کہ اس نے مجھے اور میرے مہربانوں کو توفیق بخشی اور ہم نے مل جل کر یہ سرگزشت قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

یکم دسمبر ۲۰۰۳ء

قاضی ذوالفقار احمد
۵۱۴۔ جہانزیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

(۱)

بے شعوری کا زمانہ

میری عمر پانچ سال تھی جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ میرے دو چھوٹے بھائی تھے جبکہ مجھ سے چھوٹے تیسرے بھائی کا انتقال والد صاحب کی حیات میں ہی ہو گیا تھا۔ ماں بتاتی تھیں کہ ایک مرتبہ ہم تینوں کو چیچک کے مرض نے آلیا، ہم تینوں صحت یاب بھی ہوئے لیکن اچانک مجھ سے چھوٹے کو بخار ہوا اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس حادثے کے بعد چوتھا بھائی تولد ہوا تھا۔

ماں نے تو مجھے میرے ابا جان اور میرے بارے میں ان کے ارادوں کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا جو مجھے اب بھی کچھ دھندلا دھندلا یاد ہے۔ چند ایک دھندلی یادیں میرے بچپن کی وہ یادیں ہیں جو کبھی کسی واضح شکل میں میرے سامنے نہیں آئیں۔

مجھے اپنے مرحوم و مغفور باپ کا چہرہ یاد ہے نہ مرحوم بھائی کا۔ لیکن بھائی کا چہرہ میں نے اپنے بچپن کے عالم کی ایک تصویر میں دیکھا تھا۔ یہ تصویر جیسا کہ ماں بتایا کرتی تھی۔ چڑیا گھر لاہور میں منٹ کیمرے کے ذریعے کھینچی گئی تھی اس میں ہمارے ماموں مرحوم کرسی پر بیٹھے تھے اور تیسرے بھائی ممتاز احمد کو انھوں نے گود میں اٹھا رکھا تھا جو اپنی زبان باہر لٹکائے ہوئے تھا۔ مَیں ماموں کی بائیں سمت میں کھڑا تھا اور دائیں سمت مرحوم بھائی مختار احمد کھڑا تھا۔ یہ فوٹو میں ۱۹۶۱ء میں فریم کرنے کے لئے لوہاری دروازے کے اندر ایک فریم کرنے کی دکان پر دی لیکن جب میں اسے واپس لینے گیا تو دکان بند ملی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ فریم کرنے والا دکان بڑھا گیا ہے اور میری طرح بہت سے لوگ اس کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

میرے والد روزنامہ ''انقلاب'' میں خوشنویسوں کے سربراہ تھے اور ہم وسن پورہ میں گندے نالے کے پاس کہیں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مجھے جو یاد باقی ہے وہ یہ ہے کہ

ایک روز میرے ابا جان ایک پلش کا نیا کوٹ اور چاندنی جوتی میرے لیے خرید کر لائے۔ ان کو پہنا کر وہ مجھے اپنے ساتھ کسی بازار میں لے گئے جہاں اس قدر بارش ہوئی کہ چاندنی جوتی خراب ہوگئی کیونکہ میں اس کو اتارنے کو تیار نہ تھا جبکہ کوٹ کو بھیگنے سے بچا لیا گیا۔

ایسی ہی ایک بچپن کی ایک اور یاد ہے۔ اس یاد کی کیفیت دھندلائے سے خواب کی ہے۔ میں اپنے ابا سے چلغوزے لے کر نہ آنے پر خفا تھا۔ شاید...... وقت باہر جا کر چلغوزے لانے کا نہ تھا۔ وہ مجھے بہلانے اور ٹالنے کی خاطر کہہ چکے تھے کہ وہ صبح کو لا دیں گے۔ میری ضد پر نفسیاتی طور پر مجھے قابو میں رکھنے کے لیے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انھیں تو اب چلغوزے کی شکل ہی یاد نہیں رہی۔ بھلا چلغوزہ کس طرح کا ہوتا ہے؟ مجھے انھوں نے چلغوزے کی تصویر بنانے کو کہا تھا۔ میں کسی کاغذ پر ڈرائینگ کرنے لگا تھا اور یوں ہی ڈرائینگ کرتے کرتے سو گیا تھا۔

بعد ازاں مجھے میری ماں لکڑی کی بنی ایک کنس پر رکھے پتیل کے لوٹے سے چلغوزے نکال نکال کر دیا کرتی تھی۔

اس بچپن میں مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں گھر کے قریب بہتے گندے نالے میں کاغذ کی بنی ناؤ پھینک کر اس کو دور دور تک جاتے دیکھا کرتا تھا۔

ہمارے پڑوس میں جو گھر تھا اس میں بجلی موجود تھی۔ وہاں ایک قمقمہ رات گئے تک جلتا نظر آتا اور میری ماں اکثر ابا سے کہتی کہ کاش یہ قمقمہ ہمارے گھر میں بھی جلتا تاکہ بچے اسے حسرت سے نہ دیکھا کرتے۔

انہی ایام ایک بڑی گڑگڑاہت سے لاہور میں زلزلہ آیا۔ میری آنکھیں دکھنے آئی ہوئی تھیں۔ ماں نے نیم گرم آٹا کپڑے کی پٹی میں ڈال کر میری آنکھوں پر باندھ رکھا تھا اور میں سو رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ سے ہڑبڑا کر جاگا اور پٹی کو کھول کر دوڑتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔ اس وقت میرے چھوٹے بھائی کہاں تھے مجھے یاد نہیں۔

ایک مرتبہ ایک ریچھ والا تماشا دکھانے آیا۔ گلی میں میں اس کا تماشا دیکھ چکا تو ریچھ کا مزید تماشا دیکھنے کے لئے میں ریچھ والے کے ساتھ ہولیا۔ جب کافی دیر تک میں گھر نہ لوٹا تو ماں بیچاری اپنا شٹل کاک برقعہ پہنے مجھے تلاش کرتی کرتی مجھ تک چاہ میراں پہنچ گئی۔ جب وہ مجھے پکڑنے کے لئے مجھ پر جھپٹنے ہی والی تھی تو میں نے برقعے سے جھانکتے چھوٹے بھائی مختار احمد کو دیکھ لیا اس طرح میں ماں کے ہیولے کو پہچان گیا اور گھر کی سمت بھاگ اٹھا۔ پہلے بھی ایک دو بار میں ایسا کر چکا تھا اور

ماں نے مجھے خاصی پھینٹی لگائی تھی۔ اب ان مہربان ہاتھوں کی یاد ہی رہ گئی۔

لاہور کی ان دھندلی یادوں کے ساتھ ساتھ ڈسکہ کی یادیں بھی ذہن کے پردوں پر روشن ہیں کہ ابا جان کا جسم ایک چارپائی پر ان کے حقیقی ماموں منشی عنایت اللہ کی حویلی کے بیرونے میں رکھا ہے۔ رات ہے۔ مرد ایک طرف کھڑے ہیں اور عورتیں چارپائی کے قریب بیٹھی رو رہی ہیں۔ ان کو ڈسکے سے گاؤں کیسے لایا گیا؟ ہم گاؤں کیسے آئے کچھ یاد نہیں؟ ہاں نالہ ایک کے کنارے پڑی وہ چارپائی یاد ہے جو والد کے جسدِ خاکی سے خالی ہو چکی تھی۔ ان کو دفن کیا جا چکا تھا اور میرے پھوپھا محمد شریف قریشی کو جو میرے والد کے ماموں زاد تھے اس چارپائی کے قریب بے ہوشی میں دندن پڑ گئی تھی اور مردان کو سنبھال رہے تھے۔

جب بھی میں اپنے بے شعوری کے اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو ان مناظر کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ ماں اور بھائی بھی نہیں کہ وہ کہاں تھے۔ جبکہ میرا چھوٹا بھائی سرفراز احمد والد کی وفات کے وقت چھ ماہ کا تھا۔ اب ہم لاہور سے گاؤں آ گئے تھے۔ دادا' دادی اور چچا کے ساتھ جدی مکان میں رہتے تھے۔ ایک حصہ ہمارے پاس تھا جبکہ تین حصوں میں ہمارے حصے کا برابر حصہ چچا جان کا تھا۔ جن دادا کو ہم نے دیکھا ہے وہ دراصل ہمارے حقیقی دادا کے بھائی تھے۔ لاولد ہونے کی وجہ سے انھوں نے ہمارے چچا جان کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا جو مدرس تھے اور ضلع گجرات میں تعینات تھے۔

وہ بات بھی مجھے دھندلی سی یاد ہے جب مجھے پہلی بار سکول چھوڑا گیا تو میں موقع پاتے ہی سکول سے بھاگ آتا تھا۔ کوئی مجھے روزانہ سکول چھوڑ آتا تھا اور میں روزانہ ہی بھاگ آتا تھا۔ پھر مجھے نہ جانے کیسے منشی محمد علی نے پھسلا لیا کہ میں از خود بستہ اٹھائے سکول جانے لگا۔ پورے چھ سال لوئر مڈل سکول بیگو والہ میری پسندیدہ جگہ رہی۔

بے شعوری کی وادی سے مجھے مڈل سکول کی تعلیم' گردوپیش کی دنیا' روزانہ کے سکول جانے کے سفر' معاملات کی غلط سلط فہم اور مسجد کے نمازیوں کی باہم گفتگو نے نکالا۔ زندگی کے تجربات بڑھے اور یہاں تک بڑھے کہ میں بڑھاپا لئے اکیسویں صدی میں داخل ہوا اور جب مجھے اپنی گزاری ہوئی مدرس کی زندگی کے بارے میں لکھنے کے لئے کہا گیا تو میں چونک کر رہ گیا' جیسے کسی نے مجھے سوتے میں شدید "چونڈی" بھری ہو۔

☆☆

اپنے بارے میں لکھنے کے لئے "قلم تھامے" میں تصور ہی تصور میں اپنی کتاب زندگی

کے اوراق پلٹ رہا ہوں۔ ان اوراق میں سے مجھے ان ابواب کی تلاش ہے جن کا تعلق میرے مدرس ہونے سے ہے۔ ابتداء ہی سے میرا شعوری اوڑھنا بچھونا درس و تدریس ہی رہا ہے۔ میں ایک مدرس ہوں...... جی ہاں! ایک مدرس اور مجھے اس پر فخر ہے۔

میرے ذہن کے پردوں پر ایک باب ابھرا ہے۔ یادداشت کی قوت کے سہارے چشم تصور نے ۱۹۴۳ء کے ایک منظر کو شناخت کر لیا ہے جو میری درس و تدریس کی زندگی کا حرف آغاز ہے۔ میں نے اسی حرف آغاز سے مدرس کی سرگزشت کو بیان کرتے چلے جانا ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ مدرس اپنے اردگرد کے معاشرے کا ایک فرد بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا احتمال ہے کہ "منکہ ایک مدرس" مختلف مقامات پر منکہ کچھ اور بھی ہوتا نظر آئے گا۔ اس کچھ اور میں زندگی کے سفر کے کئی پہلو اور عمر رفتہ کی کئی منازل بھی ہوں گی۔

مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی بُری بھلی تعمیر اپنے ہی ہاتھوں سے کی ہے۔ مجھے یادیں کریدنا اچھا لگتا ہے اس سے مجھے روحانی تسکین ہوتی ہے۔ یادوں سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ پروردگار نے کس طرح مجھے میری اوقات سے زیادہ نوازا ہے۔ اس کی رحمت کا حال کیا رہا ہے اور اپنی کرتوتوں کا دفتر کیسا رہا ہے؟ میں اپنا محاسبہ کرنے اور اپنی اصلاح کے لئے یادوں سے دل بہلاتا رہتا ہوں بہرکیف ہم (آپ اور میں) ۱۹۴۳ء کے منظر سے آگے بڑھتے ہیں اور ساتھ ساتھ ماضی کی جھلکیاں بھی دیکھتے چلیں گے۔ تو آیئے آگے بڑھیں۔ بعض احباب کے لواحقین نے احباب کے صحیح اور درست نام لکھنے پر بُرا منایا۔ میں نے ایسے معترض نام اس کتاب میں بدل دیئے ہیں۔

☆☆

چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا بیگو والہ گھڑتل نامی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہے یہ پلیٹ فارم زمین کی سطح سے ذرا سا بلند ہے۔ اس نے اسکاؤٹس کی وردی پہن رکھی ہے جس کی ایک جیب پر چرچل کی انگلیوں کے حجم کے برابر "وی" کا نشان بنا ہوا۔ اس لڑکے کے سر پر خاکی رنگ کی کلے دار پگڑی ہے۔ جس کے اوپر فٹ بھر اونچا شملہ اکڑا کھڑا ہے۔ پاؤں میں پہنے ہوئے کالے فوجی بوٹ بھی اس کے قد میں مزید ایک انچ کا اضافہ کر رہے ہیں۔

مئی کے پہلے ہفتے کا سورج نو بجے ہی سخت گرم ہے۔ دور مشرق کی سمت ریل کی پٹڑی کے اوپر شعلے سے لپکتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس پٹڑی پر تھوڑی ہی دیر میں سیالکوٹ سے چل کر وزیر آباد جانے والی شٹل ریل گاڑی آنے والی ہے۔ بار بار وہ پٹڑی پر دور تک نظر دوڑاتا ہے

پھر پھاٹک کے قریب دوڈھلکے بازوؤں والے سگنل کو دیکھتا ہے۔ کچھ بڑبڑاتا ہے۔ پھر وہ اپنے قریب اسٹینڈ پر کھڑی سائیکل کے پیڈلوں کو گھما کر پچھلا پہیہ تیزی سے گھماتا ہے۔ تیزی سے گھومتے ہوئے پہیے سے ایک سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے۔ جسے چند ثانیے سن کر وہ بریک لگا کر پہیے کو روک دیتا ہے۔ اس کی تمام حرکات سے اس کی اندرونی اضطراری کیفیت کا اظہار ہو رہا ہے۔ گرمی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

دور سے ریل گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دھوئیں کا ایک غبار بھی نظر آتا ہے۔ اب وہ خوش نظر آرہا ہے، اس کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ دراصل ریل گاڑی سے بابو دین محمد اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سکولوں کے معائنہ جات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ وہ لوئر مڈل سکول بیگووالہ کے ہیڈ ماسٹر اپنے چچا قاضی محمد صادق کے حکم پر ان کے اسٹیشن سے سکول تک کے سفر کے لئے سائیکل لے کر آیا ہے۔ گو...... گاؤں تک تانگے بھی چلتے ہیں لیکن سڑک اس قدر خستہ حال ہے کہ انجر پنجر ڈھیلے کرانے کے علاوہ مسافر دھول سے بھی اٹ جاتے ہیں۔ سائیکل یا پیدل سفر ہی میں عافیت ہے۔ اس لڑکے نے اسی سال ورنیکلر مڈل کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا ہے اور وہ ضلع کے کسی پرائمری سکول میں غیر تربیت یافتہ نائب مدرس مقرر ہونے کا امیدوار ہے لہٰذا محکمہ تعلیم کے چھوٹے سے افسر کو اپنا قد کاٹھ بڑا دکھانے اور خدمتگار ہونے کا احساس دلانے کے لئے اسے ریلوے اسٹیشن پر بھیجا گیا ہے۔ اس کے چچا نے بابو صاحب کو جب اس کی عرضی برائے ملازمت پہنچائی تھی تو انھوں نے درخواست دہندہ کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بابو صاحب پرانے حلقہ افسر ہیں اور وہ انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے جانتا ہے۔...... گاڑی نزدیک آتی ہے تو وہ مستعد ہو جاتا ہے۔ اسکاؤٹس کا ماٹو ہی ''المستعد'' ہے۔ وہ سائیکل کو اسٹینڈ سے اتار لیتا ہے۔ بابو صاحب بھی گاڑی سے اترتے ہیں۔ ان کی نظریں فوراً اسکاؤٹ اور سائیکل کو تلاش کر لیتی ہیں۔

☆☆

وہ نوجوان لڑکا میں خود ہی تھا۔ رقم الحروف! قاضی ذوالفقار احمد...... میرے چچا ایک خدمت گزار، منکسر المزاج اور اعلیٰ درجے کے ایس وی مدرس تھے۔ وہ خطاطی، مصوری اور فن تقریر میں مہارت رکھتے تھے۔ بہترین استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ جس سکول میں جاتے تھے اسے تعلیم کا گہوارہ بنا دیتے تھے۔ اس وجہ سے افسران ان کا خاصا احترام کرتے تھے۔ ویسے بھی ان کا ملازمت کا ماٹو تھا کہ جب افسر کہے کہ یہ کرو، وہ نہ کرو تو جواب میں کہا جائے ''بھلا جی'' یعنی جیسے آپ فرما رہے

ہیں ویسا ہی ہوگا۔ اور اگر اتفاق سے آپ وہ نہ کر پائیں جو افسر نے کہا تھا اور افسر ناراضگی میں سرزنش کرے تو صفائی پیش کرنے کے بجائے کہا جائے: ''بھولا جی'' بس ''بھ'' پر زبر اور پیش کا استعمال ماتحت کو ہر حاکم بالا کے جلال سے بچالے گا۔ عافیت کے اس کلیے پر عمل کرنے سے بعض افسران کے ساتھ ان کا ''معاملہ واحد'' تھا۔ یہ اصطلاح میں اکثر سنا کرتا تھا لیکن اس کے معانی مجھے بڑی دیر بعد سمجھ میں آئے۔ بابو صاحب سے بھی ان کا ''معاملہ واحد'' تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے معاملے میں بابو صاحب نے چچا کو مایوس کر دیا اور کہا کہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا فوج میں تو بچہ کمپنی میں بھرتی ہو سکتا ہے۔ سترہ سال سے کم عمر کے باعث وہ نائب مدرس بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔

اسکاؤٹس وردی کے حوالے سے میں نے بابو صاحب کو بائیں ہاتھ سے سلام بھی کیا اور ان کے نہ چاہنے کے باوجود ان سے بایاں ہاتھ ملایا اور اپنا نام بتایا۔ نام سننے پر وہ چونکے اور میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے کے بعد دھیرے سے مسکرائے۔ سائیکل تھامی اور کہا: ''اچھا تو تم زلف ہو! تم نے فرسٹ ڈویژن میں ورنیکلر مڈل کیا ہے۔ شاباش، اب دوڑ لگاؤ اور مجھ سے پہلے گھر پہنچ جاؤ۔''

وہ سائیکل پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ میں نے خود کو پگڑی اور بوٹوں سے آزاد کیا۔ دونوں اشیاء گلے کے اسکارف میں باندھیں اور دوڑتا ہوا گاؤں کو ہولیا۔ راستے میں رہٹ بھی چل رہے تھے لیکن میں نے پیاس کے باوجود پانی نہیں پیا۔ آج سوچتا ہوں کہ بھاگ کر گھر پہنچنے کی جو ہدایت بابو صاحب نے دی تھی، اس پر حرف بحرف عمل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ حکم میں کوئی اسرار تھا یا میری سوچ کا فتور تھا کہ گرمی کے باوجود پسینے میں شرابور میں بھاگتا ہوا گھر پہنچا اور جاتے ہی نلکے سے منہ لگا کر پانی پیا جو سیدھا، بقول میری ماں، کلیجے کو جا لگا اور میں پیٹ میں درد سے نڈھال ہو گیا۔ ماں کے دبانے اور کچھ رونے کے بعد جب مجھے آرام آیا تو مجھے وہ کہانی یاد آئی جس میں ایک لڑکی نے پیاسے بادشاہ کو شربت دیتے ہوئے چند تنکے پیالے میں ڈال دیے تھے تاکہ وہ غٹاغٹ شربت کو پینے کے بجائے آرام سے رک رک کر پیے غالباً یہ پہلا موقع تھا جب میں نے 'مثال' سے راہنمائی حاصل کی۔ جب ماں کو بتایا کہ میں اسٹیشن سے دو میل متواتر دوڑتا ہوا آیا ہوں تو وہ کہنے لگی ''آخر اس قدر جلدی کی کیا ضرورت تھی؟'' میں کوئی وضاحت نہ کر سکا۔ دراصل یہ ہماری غلامانہ ذہنیت تھی جو سوچ، غور اور تدبر سے عاری تھی۔ بغیر چوں چراں کیے ہمیں حکم بجا لانے ہی کی عادت ڈالی گئی تھی۔

شام کو جب چچا گردن جھکائے افسردہ سے ہمارے برآمدے میں آکر بیٹھے تو انھوں نے میری ماں سے کہا: ''بہن جی! افسر نے کہہ دیا ہے کہ زلف ابھی بہت ''ہولا'' ہے۔ عمر بھی

سرکاری نوکری کی نہیں۔ آپ اجازت دیں تو اسے فوج کی بچہ کمپنی میں بھرتی کرا دیا جائے۔ راشن پانی ادھر سے ملے گا اور تنخواہ پوری کی پوری بچتی رہے گی۔''

''فوج میں تو ان پڑھ بھی بھرتی ہو رہے ہیں۔ اگر فوج میں ہی بھرتی کرانا ہوتا تو پھر پڑھانے کی کیا ضرورت تھی'' میری ماں نے کہا۔ لہٰذا ماں نے مجھے فوج میں بھرتی کرانے کی حامی نہیں بھری۔ بھلا جب جنگ کا بازار دنیا بھر میں گرم ہو تو کونسی ماں ہوگی جو اپنے نابالغ بچے کو فوج میں جانے دے گی۔ ان دنوں فوج میں تو گھر سے بھاگے ہوئے' اسکولوں کے ستائے ہوئے یا نمبرداروں' ذیلداروں اور دوسرے سرکاری ایجنٹوں کے بہکائے ہوئے جوان ہی جاتے تھے اور پھر ایک طرف ان کے لواحقین پچھتاتے تھے دوسری طرف وہ خود موقع پا کر فوج سے بھاگ نکلتے تھے لیکن پکڑے جاتے تھے اور سزا کے طور پر محاذوں پر بھیج دیے جاتے تھے۔ میری ماں کی تو کل کائنات ہی ہم تین بھائی تھے جن کی خاطر اس نے آٹھ سال کی شادی شدہ زندگی کے بعد بیوگی کا جنجال گلے میں ڈال رکھا تھا۔ ماں محنت' مشقت اور بردباری سے ہمیں پال رہی تھی۔ بے شک وہ بڑا مشکل وقت تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ ہم بھوکے سوئے ہوں' ننگے رہے ہوں یا ہماری روزمرہ کی ضروریات پوری نہ ہوئی ہوں۔ یہ تو ماموں اور چچا ہی کی بے تدبیری تھی کہ انھوں نے چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے کس اینگلوورنیکلر سکول میں داخل کرانے کے بجائے لوئر مڈل سکول ہی میں چھ جماعتیں کرنے کو کہا۔

ہم لغوی معنوں میں غریب بھی نہیں تھے لیکن رشتے داروں نے ماں کو بیوگی اور ہمیں یتیمی کا احساس دلا دلا کر ایک ذہنی افلاس میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو بھی رشتے دار آتا وہ کوئی نہ کوئی شے' کپڑا' اناج' زکوٰۃ یا صدقہ اٹھائے لاتا اور چند افسردہ اور مجہول جملوں کے بعد جب وہ میری ماں کو دیتے تو وہ کس بل کھا کر رہ جاتی۔ ماں اکثر دادی ماں سے اس موضوع پر بات کرتی کہ میں تو بچوں کو اس لیے لے کر بیٹھ گئی تھی کہ یہ رُل نہ جائیں ورنہ پلنے کو تو جانوروں کے بچے بھی پل ہی جاتے ہیں۔ یہ ہمارے عزیز ہر وقت مجھے بیوہ ہونے کا اور بچوں کو یتیم ہونے کا احساس کیوں دلاتے رہتے ہیں؟ ہماری مدد کرنے پر انھوں نے کمر کیوں باندھ رکھی ہے جب کہ ہمیں ضرورت نہیں اور نہ ہی ان کو مدد کرنے کا سلیقہ ہے۔ میری کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کے لئے مجھے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ میں تو دو چار آنے کی فیس معاف کرا کر بچوں کو سکول میں بھی کمتری کے احساس میں مبتلا کرنے کے حق میں نہیں۔'' زلف نے مجھے کئی بار بتایا کہ جب منشی جی کہتے ہیں کہ وہ بچے جن کی فیس معاف ہے کھڑے ہو جائیں تو وہ کھڑا ہونا نہیں چاہتا۔ بیٹھا رہتا ہے اور پھر منشی جی اسے کہتے ہیں۔ اوئے! الو کے پٹھے! تو نے

نہیں سنا کہ میں کیا بھونک رہا ہوں؟"

ماں غیرت' خودی اور عزت نفس کے ساتھ جینے کی قائل تھی لیکن ہمارے ہی اردگرد مقامی معاشرے میں ایسے بے شمار لوگ تھے جو ہر وقت اپنی غربت کا رونا روتے رہتے تھے اور کھلے بندوں دوسروں کے جذبہ ترحم کو بیدار کرتے تھے۔ ماں یہ سب کچھ ناپسند کرتی تھی۔ گاؤں کے بعض جاننے والے ماں کے اس رویے کی وجہ سے ہمارا اور زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں شاید یہ بات تھی کہ سفید پوش ضرورت مندوں کی مدد کرنا زیادہ ثواب کا کام ہے۔ لہٰذا ہمیں کوئی سبزی بھیج دیتا' کوئی اناج' کوئی کپڑا اور کوئی نقدی۔ ماں انکار نہ کر سکتی۔ ایسا کرتی تو لوگ اسے متکبر سمجھتے۔ وہ انھیں سمجھا بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میرا روزگار لگتے ہی وہ گاؤں کی رہائش ترک کر دے گی۔ چچا اس خیال سے میرے لئے فوری طور پر روزگار کا بندوبست کرنا چاہتے تھے کہ ان کے بھائی کے گھر پر سے غریبی' یتیمی اور بیوگی کی تہمت دور ہو۔ لہٰذا وہ مجھے فوج میں بھرتی کرانے یا مدرس لگوانے کی تگ ودو میں تھے۔ میرا درجہ اول میں مڈل پاس کر لینا میری ماں کی بیوگی کی زندگی میں بہار کی پہلی کونپل تھی لیکن ابھی ہمارے سارے معاملے دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ جب چچا نے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو انھوں نے ان آنسوؤں کو بابو صاحب کے انکار کے بعد مایوسی کے آنسو گردانا جو۔ ان کی تقریر کرنے والی حس جاگ اٹھی اور انھوں نے کہا:

"بہن جی! آپ فکر نہ کریں۔ ایک در بند' سو در کھلے۔ میرا افسروں کے افسر بابو رحمت اللہ انصاری سے بھی "واحد معاملہ" ہے۔ میں ان سے بات کروں گا۔ آپ کیوں اداس ہوتی ہیں۔ آپ اتنا کریں کہ گھر کے اچھے بیس سیر چاولوں کا ایک توڑا تیار کر دیں۔"

☆☆

قیام پاکستان سے پہلے بیگووالہ کی سرزمین چاولوں اور خربوزوں کی فصلوں کے لیے مشہور تھی۔ چاول کی خوشبو اور لذت کی دھوم تو لندن تک تھی جبکہ خربوزہ بھی اپنی مٹھاس کی وجہ سے خاص مقام رکھتا تھا۔ کنبے کی تین ایکڑ زمین تھی جس کی پیداوار کا چوتھا حصہ ہمارا ہوتا۔ دھان ہماری ضرورت سے وافر ہوتا۔ ماں چاول سنبھال رکھتی تھی اور ضرورت کے وقت بیچ لیتی تھی۔ بہرکیف ماں نے سال پرانے چاول نکالے اور گھر مین قرآن مجید پڑھنے آنے والی لڑکیوں کے ساتھ مل کر ان کو چھان پھٹک کر لٹھے کے توڑے میں ڈال کر اس کا منہ مضبوطی سے سی دیا۔

◆◆◆◆◆

(۲)

خوشی کا خزانہ

دو تین دن بابو دین محمد صاحب کا اپنی سب ڈویژن کے سنٹر مدرسے میں قیام رہا۔ جاتے وقت وہ سالانہ معائنے کی خوشی میں سکول کے طلباء کو ایک یوم کی چھٹی دے گئے۔ اسی چھٹی کے دن چچا سیالکوٹ گئے اور شام کو جب واپس آئے تو چاولوں کے خالی تھیلے کے اندر سے انھوں نے مٹھائی کا ڈبہ بھی نکالا۔ ماں کو مبارک باد دی کہ میرا تقرر بطور نائب مدرس لوئر مڈل سکول کٹھالہ گناں میں ہو گیا ہے۔ تنخواہ کی شرح پندرہ روپے ماہوار ہے جب کہ ساڑھے سات روپے مہنگائی الاؤنس بھی ہے۔ مٹھائی تھوڑی کھائی گئی اور بقیہ ہمسایوں کو میرے تقرر کی خوشخبری کے ساتھ تقسیم کی گئی۔ ماں نے اس رات نوافل پڑھے۔ اگلی ہی صبح میں اپنی تقرری کا پروانہ اور چچا کا خط کٹھالہ کے ہیڈ ماسٹر' جو اتفاق سے چچا کے ایس وی جماعت کے ہم جماعت تھے' کے نام لے کر چچا کی سائیکل پر کٹھالہ گناں کی سمت روانہ ہو گیا۔ چچا نے ازراہ شفقت مجھے راستے کا نقشہ بنا دیا تھا۔ ماں نے آلو میتھی ڈال کر دو پراٹھے بھی ساتھ دیئے۔ دعاؤں کا سلسلہ الگ تھا۔ دادی ماں نے خاص طور پر کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکیں ماری تھیں۔

اسٹیشن سے آگے جب میں جرنیلی سڑک پر پہنچا تو میں نے راستے کا نقشہ دیکھا۔ وہاں ایک ہی پگڈنڈی بیلے کی سمت جا رہی تھی۔ میں اس پر ہو لیا۔ سائیکل کو میں کبھی تیز چلاتا' کبھی آہستہ' خوب لطف آ رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ بھرڑی کا ٹکڑا آیا جس پر کنکروں کی وجہ سے راستے کا نشان مدھم ہو گیا تھا۔ وہ ٹکڑا ختم ہوا تو میں راستہ بھول چکا تھا۔ اب میں ایک غلط ڈنڈی پر ہو لیا تھا۔ نقشے کے مطابق پلکھو نالے پر پل آنا چاہئے تھا لیکن میں جس ڈنڈی پر جا رہا تھا اس کے سامنے تو پلکھو نالے پر کسی درخت کا بڑا سا تنا رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس سائیکل نہ ہوتی تو میں آسانی تنے پر سے گزر جاتا کیونکہ پل پر سے ہو کر بھی میں نے پھر سے اسی ڈنڈی ہی کو پکڑنا تھا۔ وہ گاؤں

جس کا نام ''دینے کا کوٹ'' تھا اسی پگڈنڈی کے سامنے تھا۔ پیدل راستہ بھی یہی تھا۔
پوچھنے پر چارہ کاٹتے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ سائیکل پر پلکھو عبور کرنے کے لئے تمہیں سارا نکے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر جانا چاہیئے تھا۔ بہرصورت اب مجھے پلکھو کے کنارے کنارے میل بھر چڑھائی کی سمت جانا ہوگا۔ گاؤں سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ میل بھر کا یہ سفر خاصا دشوار تھا کیونکہ سائیکل پر سواری کرنا مشکل تھا اور بعض کھیتوں میں رہٹوں سے آئے ہوئے پانی نے کیچڑ بنا رکھا تھا۔ مٹی پہیوں اور مڈگارڈوں کے درمیان پھنس پھنس جاتی تھی۔ میرے جوتے بھی کیچڑ سے پٹ گئے تھے۔ بہرکیف میں افتاں خیزاں پل پر جا ہی پہنچا۔ دوسری سمت پگڈنڈی صاف تھی۔ ''دینے کے کوٹ'' کے دوسری طرف نالہ نیلوا بھی آیا۔ یہ بیلے کے علاقے کا خطرناک برساتی نالہ تھا۔ چونکہ ابھی برسات کا موسم نہیں تھا لہٰذا میں سائیکل پر بیٹھے بیٹھے دوسرے لوگوں، کی طرح پانی کے دھارے کو چیرتا ہوا اسے پار کر گیا لیکن دوسرے کنارے کی خشک اور دھانسو ریت میں سے مجھے سائیکل چلانا دشوار ہو گیا، اسے گھسیٹنا پڑا۔ راستہ پوچھتے پوچھتے بالآخر میں اپنی منزل پر جا ہی پہنچا لیکن سینٹر ہیڈ ماسٹر چودھری غلام حیدر نے مجھے کسی سکول کی ڈاک لے کر آنے والا طالب علم سمجھا اور تحکمانہ انداز میں پوچھا:

''تم کس سکول سے آئے ہو؟''

میں نے بمشکل انھیں بتایا کہ جناب میں تو مدرس تعینات ہو کر اپنے گھر بیگووالہ سے آیا ہوں۔ میں نے چچا کا رقعہ اور تقرری کا پروانہ ایک ساتھ ان کی خدمت میں پیش کیا تو وہ حیران ہوئے۔ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ ادھر بیلے میں تو تم سے بڑے بڑے لڑکے ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ تم ماسٹر کیسے بن گئے ہو؟ اس سوال کے باوجود وہ میرے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آئے کہ کوئی بھی نہ آیا ہوگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میری کرسی کی پشت پر آئے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے کچھ ہمدردی اور راہنمائی کی ایسی باتیں کہیں کہ میں پسیج کر رہ گیا۔ پھر انھوں نے ایک مدرس کو میری حاضری رپورٹ تیار کرنے، رجسٹر حاضریِ معلمین پر میرا نام لکھنے، حاضری لگوانے اور برآوری میں نام شامل کرنے کی ہدایت کے ساتھ اس مدرس سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے ذمے یہ کام بھی لگایا کہ وہ مجھے ہر کمرہ جماعت میں لے جائے اور میرا تعارف اچھے الفاظ میں طلبہ اور دوسرے مدرسین سے کرائے۔ یہ خاص طور پر بتائے کہ میں قاضی محمد صادق کا بھتیجا اور چودھری محمد اسماعیل زمانی کا خاص الخاص شاگرد ہوں۔ موخرالذکر ایک بزرگ اور لائق

استاد اور شاعر تھے اور ضلع کا ہر مدرس ان سے واقف تھا۔ بہت سے سکولوں میں صبح کی اسمبلی میں ان کی لکھی ہوئی دعا کہلائی جاتی تھی۔ مدرسین کی ایک بڑی تعداد بھی ان کی شاگرد تھی۔

اگرچہ میں اپنا لنچ جسے ان دنوں کھانا بھی نہیں کہا جاتا تھا بلکہ روٹی یا ٹکر پانی پکارا جاتا تھا ساتھ لایا تھا لیکن پھر بھی چودھری غلام حیدر دوپہر کو چھٹی کے بعد مجھے اپنی بیٹھک میں لے گئے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ میری روٹیاں بھی اس کھانے میں شامل تھیں۔ کھانے میں ان کا جماعت چہارم میں پڑھنے والا لڑکا بھی شامل تھا۔ اسے انھوں نے نصیحت کی کہ گرمی کا موسم ہے اس لئے وہ روزانہ میرے سکول پہنچتے ہی مجھے اپنے گھر سے ٹھنڈی لسی لا کر ضرور پلایا کرے۔ دوپہر کو بھی ماسٹر جی کو سکول کے بوڑھے پیڑ تلے چارپائی ڈال دیا کرے' کھانا بھی کھلایا کرے۔ ساتھ ہی مجھے بھی کہا: ''برخوردار تم نے اب گھر سے روٹی نہیں لانی۔ یہ غلام حیدر کی توہین ہے اور دوپہر دھوپ میں واپس بھی نہیں جانا۔ آرام سے عصر کے بعد جاؤ اور ٹھنڈے ٹھنڈے ہی آ جایا کرنا۔''

کئی دن تو میں سکول میں ''بھونترا بھونترا'' ہی رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا لڑکپن چھن گیا ہے اور اب مجھے بڑوں کی صف میں اٹھنا بیٹھنا ہے اور بڑوں سے باتیں کرنا ہیں۔ یہ مقام شکر تھا کہ میں نے خلاصے اور گائیڈیں پڑھ کر مڈل پاس نہیں کیا تھا بلکہ میں جس سکول میں پڑھتا رہا تھا وہاں ہم طلبا نے تو جماعت ہشتم میں ہر مضمون کا منظور شدہ سیٹ پڑھنے کے بعد اردو میں زمانی صاحب سے بانگ درا' فارسی میں پیرایہ خرد' ریاضی میں گلزار حساب' گلزار جیومیٹری' گلزار الجبرا اور تاریخ جغرافیہ کی بھی اسی قسم کی اضافی کتب پڑھیں تھیں۔ دن رات مدرسے میں رہتے تھے۔ سخت اور کڑی نگرانی کے علاوہ پڑھائی بھی کڑی ہوتی تھی۔

نقل اور سفارش کا رواج تھا نہ پرچوں کے پیچھے جانے کا۔ ٹھوس پڑھائی ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود معاشرے کے دفاتر میں ''واحد معاملہ'' کا سلسلہ چلتا تھا۔ میرے تقرر میں یہی ''اسم اعظم'' کام آیا تھا۔

میں نے ورنیکلر مڈل ڈی بی مڈل ماڈل سکول سمبڑیال سے کیا تھا۔ ماڈل سکول ہونے کی وجہ سے وہاں ہمیں فنون بھی سکھائے جاتے تھے۔ سکول کا ایک میوزیم بھی تھا جس میں سائنسی نوعیت کی بہت سی ماڈل اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ علم حیاتیات کے ضمن میں مرتبانوں میں انواع واقسام کے مردہ جانور محفوظ کئے گئے تھے۔ کپڑا بننے کی کھڈیاں تھیں۔ امری بنانے' مٹی کے کھلونے بنانے اور پیپر میشی کے عملی اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے طغرے

سارے سکول میں آویزاں تھے۔ جن پر بنی تصاویر اور رباعیاں آج بھی میرے چشم تصور کے سامنے آ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پینٹنگ میں کرۂ ارض پر ایک اندھا اور نیم عریاں شخص بیٹھا آسمان کی طرف منہ اٹھائے تھا اور نیچے یہ رباعی درج تھی ؎

یہی آدم ہے سلطان بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا' اس بے بصر کا
نے خود بیں' نے خدا بیں' نے جہاں بیں
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا

حضرت علامہ اقبالؒ کی ایسی بے شمار رباعیوں کو مرقع غالب کی طرح مصوری سے مطالب میں ڈھالا گیا تھا۔ اسی طرح ایک رباعی تھی جس میں یہ مصرعہ آتا ہے

ع...... تیرے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے

کھڈی ماسٹر ثناءاللہ جان بوجھ کر مزاح پیدا کرنے کے لئے دم میں دال پر پیش اور دل میں دال کو واؤ پڑھا کرتے تھے۔ میں حیران ہوں کہ ہم میں بھی ایسا لطیف مزاح سمجھنے کی صلاحیت ہمارے اساتذہ نے پیدا کر رکھی تھی۔

مشہور شاعر طفیل ہوشیار پوری اپنا کلام ریڈیو پر گانے کے لئے سیالکوٹ سے لاہور آتے ہوئے رات اسی ماڈل سکول میں رکتے اور حضرت زمانی صاحب کو اپنا کلام ہارمونیم کی دھن پر سناتے' ان سے زبانی زبانی ''پاس'' کی سند لیتے۔ ان کے بھائی محمد خان کلیم بھی اسی سکول میں مدرس تھے۔ انھوں نے خاصا ادبی ذوق ہم طلبہ کے اندر پیدا کیا۔ بلکہ ہم میں سے بعض ہم طلبہ کے میرے سمیت کچھ تک بندی بھی کرنے لگے تھے آج کا مشہور شاعر جاوید شاہین بھی اسی سکول میں ہمارا جونیئر تھا۔

بہرحال اپنے اساتذہ کے اس فیضان کی بدولت میں نے لوئر مڈل سکول کٹھالہ گناں میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ پہلے چند ایام کے دوران چھٹی جماعت کے طلبہ نے ریاضی کے سوالات سمجھنے اور اردو میں الفاظ کے معانی اور ان کا جملوں میں استعمال پوچھنے کے بہانے میرا بار بار امتحان بھی لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کو مطمئن کر سکا بلکہ الفاظ اشعار میں استعمال کر کے میں نے ان کو ہی نہیں اساتذہ کو بھی حیران کر دیا۔ انھوں نے مجھے کریدنا چھوڑ دیا اور میں سکول کے ماحول میں گھل مل گیا۔

چودھری صاحب نے مجھے سکول کی بزم ادب کا انچارج بنا دیا۔ مڈل سکول کی تربیت میرے کام آئی اور میں نے ہر ماہ کی آخری تاریخ کو ہونے والی سینٹر میٹنگوں میں سے ماہ جون کی ''سینٹر میٹنگ'' میں ایک پروگرام پیش کر کے دوسرے سکولوں کے اساتذہ کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ چودھری غلام حیدر نے میری بڑی تعریف اور حوصلہ افزائی کی کیونکہ میں نے ان کے بیٹے کو چوتھی جماعت میں ہی مقرر ہی نہیں بلکہ ایک مزاحیہ اداکار بھی بنا دیا تھا۔

اپنے چچا کے انداز میں، میں نے سکول کی بھی خاصی زیبائش کی۔ ایسے چارٹس بنائے جو میں نے مڈل ماڈل سکول میں دیکھے تھے۔ پرندوں کے پروں کا چارٹ، جڑی بوٹیوں کے پتوں کا چارٹ، اجناس کا چارٹ، اسباق پر مبنی چارٹ، اقوال زریں کا چارٹ، ہندو مسلم، عیسائی اور سکھ تہذیبوں سے متعلق چارٹ وغیرہ۔ میں خود حیران تھا بلکہ اب بھی حیران ہوتا ہوں کہ میں یہ سب کچھ کیسے کر پایا، آخر کو میں بقول ایک ساتھی مدرس کے تھا تو ابھی ''منڈا'' ہی۔

سکول کے عملے میں ایک معمر ہندو، ماسٹر گردھاری لعل بھی تھے۔ باقی کے تین مدرسین مع ہیڈ ماسٹر صاحب کے میرے متعلق دبی زبان سے یہ کہہ چکے تھے کہ میری عمر تو ابھی پڑھنے کی ہے، پڑھانے کی نہیں۔ لیکن ماسٹر گردھاری لعل اس سے آگے بھی کہتے تھے...... وہ کہتے تھے بے شک مجبوریاں ہوتی ہیں لیکن مشکل اوقات بہر حال گزر جاتے ہیں اور جفاکش لوگ ہی باقی رہتے ہیں۔ وہ ورنیکلر مڈل میں میری فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے سے بڑے متاثر تھے اور روازنہ ہی مجھے مزید پڑھنے کی مختلف ترغیبات دیتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مجھے سکول کی صندوق میں بند لائبریری سے ایک کتاب ''میاں کوشش'' پڑھنے کے لئے دی۔ جسے جب میری ماں نے پڑھا تو وہ بھی خاصی متاثر ہوئی اور کہا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمھارے ماموں اور چچا کی خواہش کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ تمہارا ماموں تو میرا چھوٹا بھائی ہے میرے سامنے بول نہیں سکتا جبکہ تمھارے چچا تمھارے مرحوم باپ کے بھائی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم کما کر چھوٹے بھائیوں کو پڑھاؤ۔ ان کی نیت بھی صائب ہے، اس لئے میں ان کو جھٹلا نہیں سکتی، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو چاہتی تھی کہ تم کم از کم دس جماعتیں تو پاس کرتے۔ خالو عبدالحکیم نے کہا تھا کہ دسویں کے بعد وہ تمہیں کسی دفتر میں نوکری دلوا دیں گے۔ میں نے ماں کو بتایا کہ ابتدا ہی سے غلطی ہو چکی ہے کہ مجھے چوتھی جماعت کے بعد سمبڑیال یا گھڑتل انگریزی پڑھنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اب اگر میں انگریزی پڑھوں تو مزید دو سال لگیں گے۔

چچا نے مجھے جو سائیکل عاریتاً دے رکھی تھی وہ انھوں نے از راہ شفقت مجھے ہی تحفۃً دے ڈالی۔ سائیکل خاصی پرانی تھی۔ اکثر خراب رہتی۔ روزانہ ہی مجھے آنہ، دو آنے یا چار آنے کے عوض مرمت کرانا پڑتی۔ میں ایک تھیلے میں ہوا بھرنے کا پمپ، پنکچر لگانے کا سامان اور نٹ بولٹ وغیرہ کسنے کیلئے بارہ موری والی چابی ساتھ رکھتا تھا۔ میں چودھری غلام حیدر کے وضع کردہ پروگرام کے مطابق مدرسے ٹھنڈے ٹھنڈے جا اور آ رہا تھا۔

گاہے بگاہے میں ماں کو اپنے سفر کے تجربات سے آگاہ کرتا رہتا۔ ایک روز ماں کے سامنے نیلوا کا ذکر آیا تو ماں کانپ اٹھی حالانکہ وہ نالہ ایک کے پانیوں کی عادی تھی اس کے باوجود وہ ایک مرتبہ کسی تقریب میں جب ''دینے کے کوٹ'' سے آگے کسی گاؤں میں گئی تھی تو نیلوا میں یکا یک طغیانی آ جانے کے باعث وہ پانی کے بہاؤ کے آگے قدم نہ جما سکی تھی۔ یہ تو خدا کو اس کا زندہ رکھنا مقصود تھا کہ اس کی ساتھی عورتوں نے جو طغیانی سے پہلے نالہ عبور کر چکی تھیں نے ماں کی چیخ و پکار سن کر خیمہ برقعہ اس کی طرف پھینکا جس کا گھیرا ماں نے پکڑ لیا اور دوسری عورتوں نے اسے باہر کھینچ لیا۔ ماں نے مجھے بڑے زور سے نصیحت کی کہ برسات کے موسم میں کبھی نیلوا میں قدم نہ رکھنا حالانکہ وہ جانتی تھی میں ایک اچھا تیراک ہوں لیکن اس کا فلسفہ تھا کہ شہسوار ہی گھوڑوں سے گرتے ہیں اور تیراک ہی پانی میں ڈوبتے ہیں۔

☆☆

۲۳ رجولائی ۱۹۴۳ء کو موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں اور اسی روز مجھے ماہ مئی کے چھبیس دنوں کی تنخواہ ملی۔ اکھٹے بیس سے زائد روپے پا کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ تنخواہ تقسیم کرتے وقت میری خوشی کی اندرونی چمک کو دیکھ کر ماسٹر گردھاری لعل نے پھر اپنی نصیحت کو دھرایا کہ میں روپوں کی بجائے علم سے محبت کرنا سیکھوں گا تو دنیا میں سرخرو رہوں گا۔ انھوں نے تعطیلات کے دوران میں مجھے مزید پڑھنے کی تلقین کی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ''میاں کوشش'' بننے کی کوشش کروں گا۔

جب میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں بیٹھے جمے موچی سے میں نے اپنے بوٹ مرمت اور پالش کروائے۔ مزدوری ادا کرنے کے لئے میں نے جُمے کو دس روپے کا نوٹ دیا کہ وہ دو آنے کاٹ کر بقایا واپس کرے۔ کنگ جارج ششم کی تصویر والا نوٹ دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس بقایا کہاں سے آیا؟ وہ تو دن بھر میں یہی دس بارہ

آنے کماتا ہے میں نے بڑے فخر سے اسے بتایا کہ میرے پاس تو دس دس کے نوٹ ہی ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اسے دس کے دوسرے نوٹ کی جھلکی بھی کرائی جبکہ پہلا نوٹ میں نے اس کے ہاتھ سے اچک کر کہا کہ میں اسٹیشن ماسٹر سے ریزگاری لاتا ہوں۔ اس وقت بکنگ آفس بند تھا۔ اس نے خود ہی کہا کہ میں اسے دو آنے اگلے روز دے دوں۔

ماں نے تنخواہ میں سے کچھ روپوں کی شرینی پھر سے تقسیم کی۔ چند روپے میرا صدقہ اتار کر مائی فضلاں نابینی کو دیئے۔ پانچ روپے مجھے خرچے کے طور پر دیئے اور یوں ہمارے گھر میں خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جی ہاں! خوشحالی کا دور...... اس لئے کہ دوسری عالمی جنگ کے باوجود گندم دو روپے من تھی۔ گھی ایک روپے کا سوا سیر اور مٹی کا تیل ایک آنے میں بوتل ملتا تھا۔ گوشت چار آنے سیر تھا پھر بھی کوئی کوئی کھاتا تھا۔ میں جسے اپنا گاؤں لکھ رہا ہوں دراصل وہ دس ہزار سے زائد نفوس پر مشتمل قصبہ ہے۔ اس میں ٹاؤن کمیٹی تب بھی تھی۔ بازار کے مشرقی اختتام پر تانگوں کے اڈے کے قریب قصاب کی دکان تھی جس کے لئے ایک بکرے کا گوشت بیچنا مشکل ہوتا تھا جبکہ تول میں وہ گوشت والے پلڑے میں جھکاؤ رکھتا تھا۔ کلیجی، پھیپھڑے اور سری پائے تو اس کی بیوی گلیوں میں ہانک لگا کر بیچتی تھی۔

کٹھالہ گناں کے لوئر مڈل سکول کے سارے استاد چودھری غلام حیدر کی طرح زمیندار نہیں تھے، لیکن خوشحال تھے۔ تنخواہ سے کچھ پس انداز بھی کر لیتے تھے۔ اپنے فرائض دلجمعی سے ادا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کا خاصا دید لحاظ بھی تھا۔ صرف ہیڈ ماسٹر صاحب ہی مقامی تھے۔ باقی میری طرح سائیکل یا پیدل اپنے اپنے گاؤں سے آتے جاتے تھے۔ سب تہ بند باندھتے تھے۔ سرسری معائنہ متوقع ہوتا تو سکول آ کر الماری میں رکھی شلوار نکال کر پہن لیتے۔ بسا اوقات ایسا بھی نہ کرتے۔ چودھری صاحب خود بھی تہ بند کے شیدائی تھے لہٰذا وہ لباس پر توجہ ہی نہ کرتے۔ ماسٹر گردھاری لعل کا بھی یہی حال تھا۔ میرے ننگے سر کے سوا سب کلے کے بغیر پگڑیاں باندھتے۔ چودھری صاحب کُلے اور مائع کا استعمال کرتے تھے۔ زمیندار ہونا بڑی بات تھی۔ پھر ساتھ ہی سرکاری ملازم ہونا سونے پر سہاگے والی بات تھی۔

اساتذہ کی باہم گفتگو سے معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تو کبھی کبھار عموماً دو تین سال بعد ہی سکول کا دورہ کرتے ہیں لیکن اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر پابند ہے کہ وہ ہر سال ہر سکول کے دو سرسری معائنے بلا اطلاع یعنی اچانک کرے اور ایک سالانہ معائنہ اطلاع دے کر

کرے۔ سرسری معائنہ جات میں سے ایک تعلیمی سال کے آغاز میں کرے اور دیکھے کہ کیا مدرسین نے اپنی اپنی جماعت کا تدریسی کام سال بھر کے کام کے دنوں پر تقسیم کر کے سلیبس کا چارٹ تیار کر کے باضابطہ اوقات کار بنالیا ہے۔ تدریسی اور تحریری کام کی رفتار کیا ہے؟ اپنی ہفتہ وار ڈائری لکھ رہے ہیں کہ نہیں۔ تدریس کے علاوہ رجسٹرات مدرسہ کی تکمیل کے لئے تقسیم کار میں کون کون سے کام ہیڈ ماسٹر یا اول مدرس نے کس کس مدرس کو سونپے ہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں کی صورت حال کیا ہے؟ صفائی اور سکول کی زیب وزینت کا معیار کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اول جماعت پر جماعت کا مدرس انچارج، اول مدرس اور معائنہ افسر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ جماعت کا ایک رجسٹر رفتار ترقی تیار کیا جاتا تھا جس میں ہر طالب علم کی ہفتہ وار ترقی کی رفتار گوشوارے کی صورت میں درج کی جاتی اور اسی رجسٹر رفتار ترقی سے معائنہ افسر کلاس کا جائزہ لیتے اور لاگ بک میں خصوصی رائے درج کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی جماعت کے طلبہ ایک تجربہ کار ماسٹر کی تحویل میں دیئے جاتے۔ کٹھالہ گناں میں ماسٹر گردھاری لعل جماعت اول کے انچارج تھے اور سچی بات ہے کہ کامل استاد تھے۔ انھوں نے مقامی طور پر ملنے والی اشیا سے بہت سے سمعی اور بصری معاونات بنا رکھے تھے جن کے ذریعے وہ جماعت اول کے طلباء کی تعلیمی بنیاد مضبوط کر دیتے تھے۔

ہر ماہ کی آخری تاریخ کو سنٹر بھر کے اساتذہ کی میٹنگ ہوتی جس میں صدر دفتر کو بھیجے جانیوالے گوشواروں کی تکمیل ہوتی۔ اس گوشوارے کا نام گوشوارا ''الف'' تھا جس میں ہر سکول کی تعداد مدرسین، تعداد طلبا، داخلہ خارجہ، آمدن وخرچ فنڈات اور سرکاری خزانہ سے آنے والی تنخواہ کی تقسیم کی صورت حال، غرض ہر قسم کی معلومات اور اعداد وشمار درج ہوتے، کی تکمیل کی جاتی۔ گوشوارہ الف کی تکمیل میں اگر ذراسی بھی کمی رہ جاتی تو سنٹر ہیڈ ماسٹر کو چین نہ آتا۔ دفاتر کی ساری منصوبہ بندی کا انحصار اسی گوشوارے پر ہوتا تھا۔ گوشوارہ مکمل ہو جاتا تو پھر اساتذہ کے مسائل پر گفتگو ہوتی۔ اگلے ماہ کی برآورد بنائی جاتی۔ سابقہ تنخواہ کا قبض الوصول تیار کیا جاتا۔ غرض بہت کچھ ہوتا۔ کبھی کبھی دعوت بھی ہو جاتی۔ میری موجودگی میں مئی جون اور جولائی کی ایسی میٹنگیں ہوئی جن میں سے ایک میٹنگ پر میں نے سکول کی بزم ادب کا پروگرام اساتذہ کے سامنے پیش کیا۔

میرے ذمے داخل خارج کا رجسٹر بھی لگایا گیا۔ اس کو مکمل رکھنے کا ڈھنگ مجھے ماسٹر غلام نبی نے سکھایا۔

اس حلقے کے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سردار ایشر سنگھ تھے۔ بیگو والے کے

حلقے میں بابو دین محمد سے پہلے وہ اس حلقے کے انچارج تھے۔ میں ان کو بھی پہچانتا تھا کہ وہ سکولوں کے بابو ہیں۔ ہم طلبہ انسپکٹر ان کو بابو ہی کہا کرتے تھے۔ وہ پکے گرو کے سکھ تھے۔ سوائے آنکھوں، ناک اور ہونٹوں کے سب کچھ سفید لمبے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح وہ سکول میں آ دھمکے۔ بھاگم بھاگ مدرسین نے شلواریں پہنیں۔ چودھری غلام حیدر ابھی گھر سے نہیں آئے تھے ان کا لڑکا دوڑتا ہوا گھر گیا کہ بابو صاحب کی آمد کی اطلاع دے۔ جنرل حاضری بورڈ پر ابھی آج کی حاضری درج نہیں کی گئی تھی۔ انھوں نے حاضری بورڈ سے صرف کل تعداد طلباء ۲۱۱ ذہن میں رکھی۔

ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ سکول میں سناٹا چھا گیا۔ چودھری صاحب کے آتے ہی انھوں نے ان سے وقت پوچھا۔

''میرے پاس تو گھڑی نہیں۔ سکول کے لئے کلاک آپ نے ابھی تک دلوایا نہیں۔''

پھر رک کر بولے: ''آپ کے پاس تو ویسٹ اینڈ کی گھڑی تھی کیا وہ خراب ہوگئی؟''

سردار صاحب کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا، بولے: ''رجسٹر داخل خارج منگواؤ۔''

چودھری صاحب نے مجھے رجسٹر داخل خارج اور متعلقہ فائل لانے کو کہا۔ میں جب رجسٹر داخل خارج لے کر آیا تو انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور فرمایا: ''توں مینوں رحمت اللہ انصاری دا رشتے دار لگنا ایں۔'' پھر چودھری صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''یار چودھری! رحمت اللہ نے ضلع دے سارے ''انڈر ایج'' انصاری منڈے بھرتی کرن دا لائسنس کدے کولوں لیا اے۔''

''لیکن یہ لڑکا تو قاضی صادق کا بھتیجا ہے۔'' چودھری صاحب نے وضاحت کی۔

پھر سردار صاحب نے رجسٹر داخل خارج اور لاگ بک بڑی تفصیل سے چیک کی اور ہیڈ ماسٹر پر خاصی جرح کی۔ اب سردار صاحب اٹھ کر ہر جماعت میں گئے۔ ان کا چہرہ بالوں کی وجہ سے ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا لیکن بچوں سے سوال کرتے ہوئے ان کے لہجے میں نرمی اور رسانیت رہی۔ پہلی جماعت سے لے کر چھٹی جماعت تک انھوں نے سلیبس کے مطابق طلباء کو خوب سوالات کئے۔ اردو کی کتاب پڑھا کر اور ریاضی کے سوالات لکھوا کر پورا پورا امتحان لیا۔ ہر جماعت کا معائنہ ختم کرنے کے بعد انھوں نے طلباء کو تختی لکھنے کو کہا۔ پنجم اور ششم میں ہر مضمون کی کاپیاں ملاحظہ کیں اور ان پر اپنے دستخط کیے۔ خاص طور پر یہ دیکھا کہ معلمین نے جو لکھوایا ہے اس کی پڑتال بھی کی ہے یا نہیں اور وہ سب کچھ طلبہ کے ذہن کی تختی پر بھی لکھا

گیا ہے یا نہیں؟ جو کچھ وہ دیکھتے لاگ بک میں درج کرتے جاتے۔ معائنے سے فارغ ہو کر انھوں نے لاگ بک چودھری صاحب کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''تیرا نظم ونسق کمزور اے پر اساں اچھا ای لکھیا اے۔ ماسٹراں نوں ایہہ لکھیا ضرور پڑھانا۔''

معائنے کے بعد وہ اس کمرے میں تشریف فرما ہوئے جو ماسٹر اسلم نے ان کے دوپہر کے قیام کے لئے آراستہ کر دیا تھا۔ اب سردار صاحب بالکل ہی بدل گئے۔ ادھر ادھر کی گپیں ہانکنے لگے۔ اساتذہ سے گھل مل کر باتیں کیں۔ ان کے شکوے شکایات سنیں۔ پھر اچانک سب کے سامنے ہی چودھری صاحب سے کہا: ''کوئی ککڑ بھنیا ای کہ نئیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور غلام حیدر غفلت کرے۔ میں نے اسی وقت اسلم کو آپ کی مہمان نوازی سونپ دی تھی۔'' ساتھ ہی سردار صاحب سے اجازت لے کر طلبہ کو چھٹی کرا دی۔

کھانا کھانے سے قبل انھوں نے مدرسین کو بھی گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس روز میں بھی سکول سے اپنے معمول کے خلاف ہی نکل آیا تھا۔

تعطیلات کے پہلے ہی روز مجھے ماسٹر گردھاری کی نصیحتوں نے میرے دل ودماغ کو آدبوچا۔ میں سیدھا حکیموں کی حویلی میں گیا وہاں ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو کا دور چلتا رہتا تھا۔ حکیم برادران میں دو اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ معلم بھی تھے۔ ماسٹر محمد افضل قریشی پرائمری میں میرے استاد رہے تھے اور اب ایس اے وی کرنے کے بعد کسی ہائی سکول میں تھے۔ ان کا بیٹا محمد اکرم قریشی میرا ہم جماعت رہا تھا لیکن انگریزی پڑھنے کی وجہ سے آگے نکل گیا تھا۔ محمد اشرف قریشی حکیم احسن صاحب کا لڑکا تھا اور ہم سے دو جماعت آگے تھا۔ محمود الحسن ایم اے اور ایس اے وی تھے۔ وہ ہی مڈل ماڈل سکول سمبڑیال کے ہیڈ ماسٹر تھے جہاں سے میں نے ورنیکلر مڈل کیا تھا۔ وہ میری اہلیت کے مداح تھے۔ اس قدر محنتی معلم تھے کہ مسلسل پڑھائے بغیر ان کو چین نہ آتا تھا۔

تعطیلات میں وہ اپنے بھتیجوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے بھی انگریزی پڑھنے کی ابتداء ان کی حویلی ہی سے کی۔ اکرم اور اشرف نے مجھے ابتدائی انگریزی کا قاعدہ پڑھانا شروع کیا۔ اتفاق سے اے بی سی مجھے پہلے ہی آتی تھی۔ جو کچھ وہ مجھے بتاتے میں اسے خوب رٹا لگاتا۔ چند ہی ایام میں، میں نے پہلا انگریزی قاعدہ پڑھ لیا تو مجھے آگے بڑھنے کا جنوں ہو گیا۔ میں نے ایسے لفاظ کی ایک فہرست اردو رسم الخط میں بنائی جو انگریزی کے اسم تھے لیکن اردو میں

مستعمل تھے۔ جیسے اسٹیشن، پلیٹ فارم، سائیکل، ریل کار، شیڈ، ٹکٹ، ہینڈل، بریک، چین، سائیکل پین، پمپ، بلڈنگ، ٹیچر وغیرہ وغیرہ۔ پھر عام چیزوں کے انگریزی نام دوسروں سے پوچھ پوچھ کر میں اردو میں لکھ لیتا اور یوں درست ہجوں کے بغیر مجھے کئی انگریزی الفاظ یاد ہو گئے۔ پھر ہجوں کی باری آئی تو ذہن مزید کھلا۔ انگریزی لکھنے کا ڈھنگ مجھے پبلک ہائی سکول گھڑتل میں پڑھنے والے خوش نویس طالب علم چودھری محمد انور نے سکھایا۔ چار لکیروں کی کاپی پر ''جی'' کی نب سے جب میں نے کچھ الفاظ لکھ کر افضل قریشی صاحب کو دکھائے تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی خاطر اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''دیکھا، پڑھنا اس کو کہتے ہیں، بغیر استاد کے اس نے کیسا خوبصورت لکھنا سیکھ لیا ہے حالانکہ ان کا بیٹا بھی بہترین لکھنے والا تھا۔'' پھر مجھے روزانہ دو چار صفحے لکھتے رہنے کی ہدایت کی جس پر میں نے خوب عمل کیا۔

مجھے اپنے مستقبل کا فکر کرنے کا شعور تھا نہ ہی مجھے علم تھا کہ اگر میں پڑھ بھی جاؤں گا تو کیا ہوگا؟ نوکری ہی ملے گی نا۔ وہ تو اب بھی ملی ہوئی تھی۔ علم کے فوائد سمجھنے کی میری عمر نہ تھی۔ بس اس وقت تو میں انگریزی میں زیادہ سے زیادہ شدبد محض اس لیے حاصل کرنے کا متمنی تھا کہ تعطیلات موسم گرما کے بعد میں سکول جاؤں اور اپنی انگریزی کی رفتار و ترقی سے ماسٹر گردھاری لعل کو حیران کر سکوں اور وہ خوش ہو کر مجھے تھپکی دے اور میری تعریف کرے۔

تعطیلات کے دوران میں، میں دو مرتبہ تنخواہ لینے کٹھالہ گناں گیا۔ وہاں ماسٹر گردھاری لعل صاحب کو ان کے پوچھنے کے بغیر بتایا کہ میں ان کی نصیحت پر عمل کر رہا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تعطیلات کے بعد وہ میری لکھی ہوئی کاپیاں ضرور دیکھیں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ مجھے مڈل تک پڑھے ہوئے مضامین کی کتب کا اعادہ بھی کرتے رہنا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ انگریزی تو یاد رہے اور باقی پڑھا لکھا ختم ہو جائے۔

اوپر ہونے والی بارشوں کی وجہ سے واپسی پر نیلوا میں طغیانی آ چکی تھی۔ میں خود تو نیلوا کو عبور کر سکتا تھا لیکن سائیکل کا کیا کرتا۔ مجبوراً میں واپس کٹھالہ چلا گیا۔ رات وہاں بسر کی۔ اگلی صبح تک نیلوا اتر چکا تھا۔ رات گھر میں سب پریشان رہے تھے کہ میں رات لوٹ کر کیوں نہ آیا۔ ماں تو ساری رات جاگتی اور نفل پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتی رہی تھی۔ چچا نے ان کو یقین دلایا کہ ہو سکتا ہے وہاں تنخواہ نہ پہنچی ہو اور ماسٹر حیدر نے برخوردار کو روک لیا ہو۔ دادی ماں، ماں کی ڈھارس بندھاتی حقہ پیتی رہیں۔

اس وقت ہنگامی نوعیت کی اطلاع دینے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ڈاک کا ہرکارہ بھی ''دینے کے کوٹ'' سے ہی لوٹ گیا تھا۔ اگر وہ کٹھالہ تک آ جاتا تو شاید وہ میرے متعلق بیگو والہ جا کر بتا دیتا۔ اس سے چچا نے جا کر نیلوا کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ روزانہ کٹھالہ سے بھی آگے ایک گاؤں تک ڈاک لینے اور دینے جاتا تھا۔ پیدل چل چل کر اس کی پنڈلیوں کی رگیں پھول چکی تھیں لیکن وہ برابر اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ میں اسے ڈاک کا تھیلا اٹھائے اکثر آتا جاتا دیکھتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ وہ روزانہ اس قدر پیدل کیسے چل لیتا ہے؟ مرکزی ڈاک خانہ ہمارے ہی قصبے میں تھا۔

تعطیلات کے اختتام سے چند روز قبل چچا جان پھر بابو رحمت اللہ کے پاس گئے اور وہاں سے میرے تبادلے کے احکامات لے کر آئے۔ سات میل کے بجائے اب مجھے بیگو والہ کے سنٹر میں شامل دو میل کے فاصلے پر واقع ڈی پی پرائمری سکول گھڑتل میں تبدیل کیا گیا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے ماسٹر گردھاری لعل سے بچھڑ کر دکھ ہوگا۔

اب مجھے کٹھالہ گناں میں صرف ایک یوم کے لئے جانا تھا تاکہ وہاں سے فراغت کا پروانہ حاصل کرسکوں۔ جس دن سکول کھلے اسی دن میں چچا کا خط تبادلے کے حکم کے ساتھ لے کر چودھری غلام حیدر کے پاس جا پہنچا۔ خط میں چچا نے چودھری صاحب کی شفقت و محبت، بندہ پروری اور تعاون کا شکریہ ادا کیا تھا۔ چودھری صاحب کے مشورے سے مدرسین نے مل کر ایک چھوٹی سی الوداعی تقریب بھی منعقد کی جس میں، میں شرمایا شرمایا سا رہا۔ ماسٹر گردھاری لعل نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے بہت سی دعائیں ہندی میں دے کر رخصت کیا اور میرے ساتھ اپنی محبت کی وجہ بھی بتائی۔ اس کا ایک میرا ہی ہم عمر لڑکا نیلوا میں ڈوب گیا تھا۔ وہ لڑکا بڑا محنتی تھا اور میرے سراپے میں ماسٹر گردھاری کو اپنا لڑکا گھومتا پھرتا نظر آتا تھا۔

میں ماسٹر گردھاری لعل کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو کبھی نہیں بھول سکا اور نہ ہی ماسٹر گردھاری لعل کے پڑھائے ہوئے اس سبق کو کہ پڑھو، تمھاری عمر پڑھنے کی ہے۔ آج میں یہ سمجھتا ہوں کہ ساری ہی عمر پڑھنے کی ہوتی ہے بشرطیکہ بچپن میں ہم نے واقعی کچھ پڑھا ہو۔ طوطے کی طرح رٹا نہ ہو بلکہ، سوچ سمجھ کر پڑھا ہو۔

◆◆◆◆◆

(۳)

ایک اور گردھاری لعل

ڈی بی پرائمری سکول گھڑتل میں جماعتیں چار تھیں اور عملہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ لالہ مکند لعل اول مدرس تھے اور مقامی تھے۔ چوتھی جماعت ان کی تحویل میں تھی۔ اول اور دوم ماسٹر سردار محمد کے پاس تھیں۔ مجھے تیسری جماعت دی گئی۔ لالہ مکند لعل مجھے کوئی اچھا انسان نہیں لگا۔ حالانکہ میرا اس سے پہلے کوئی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ شاید یہ بزرگوں کی اس گفتگو کا نتیجہ تھا جو حکیموں کی حویلی میں برصغیر کی سیاست اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں اور مسلم آزادی کے متعلق میں گزشتہ دو ماہ کے دوران میں سنتا رہا تھا۔ لفظ ''لالہ'' میں ہی ایسی گھن اور الجھن تھی کہ بغیر کسی وجہ ہی کے میں نے اسے ناپسند کر دیا۔ اس کے برعکس مجھے ماسٹر سردار محمد اچھے لگے تھے۔ وہ ایک مشکی گھوڑی پر طرے دار پگڑی پہنے اور لش لش کرتی مائع لگی شلوار قمیض پہنے آتے۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ ہوتا۔ پہلے ہی روز انھوں نے مصافحہ کے بجائے میرے ساتھ معانقہ کیا۔ ان کا لہجہ بڑا نرم اور اپنائیت کا تھا۔ آنے والے چند دنوں کے اندر اندر انھوں نے مجھ سے وہ سب کچھ اگلوا لیا جو میں کسی کو بھی بتانے سے گریز کرتا تھا۔

وہ اپنے گاؤں کانبانوالہ میں نمبردار بھی تھے۔ زمین بھی خاصی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو بھی لاتے اور تفریح کے وقت مجھے اپنی ''ریفریشمنٹ'' میں شامل کر لیتے۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ میں نے ان ہی کی زبانی سنا تھا۔

میں نے انھیں بتایا کہ میں پانچ سال کا تھا جب میرے باپ کا انتقال ہوا۔ دو بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ ہم لاہور میں رہا کرتے تھے۔ والد صاحب روزنامہ ''انقلاب'' میں ہیڈ کاتب تھے۔ محنتی آدمی تھے۔ کھلا خرچ کر کے بھی انھوں نے لاہور میں مکان کے لئے وسن پورہ میں جگہ خریدی۔ گاؤں میں بھی آٹھ مرلے جگہ موجود ہے۔ اپنے آبائی مکان میں ہمارا حصہ چوتھا ہے بلکہ

زمین کی پیداوار میں بھی یہی حصہ ہے۔ ہمارا گزر بسر اچھا ہو رہا ہے۔ رشتے دار اور عزیز بھی ہمارا خیال رکھتے ہیں لیکن میری ماں کا خیال ہے کہ دوسروں کی ہمدردی سے ہماری عزت نفس مجروح ہو رہی ہے۔ ہماری غریبی ہی کے خیال سے تعلیم کے دوران میں مجھے پرائمری کے بعد لوئر مڈل سکول بیگو والہ ہی میں رکھا گیا چنانچہ میں انگریزی نہ پڑھ سکا۔ قصہ کوتاہ اب میں یہ ملازمت کر رہا ہوں تو اس کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو اچھی تعلیم دلاؤں۔ ماسٹر سردار محمد کے سراپے میں مجھے ایک ہمدرد اور غمگسار دوست نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں جتنی بھی گنجلکیں تھی وہ میں نے سردار محمد کو بتائیں اور انھوں نے نہ صرف سب کچھ سنا اور سمجھا بلکہ میری ذہنی گنجلکیں کھول کر رکھ دیں۔ ایک روز لالہ مکند لعل سکول نہیں آیا تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے طلبہ بھی کم تھے۔ ہم نے سردی کی وجہ سے کچھ لکڑیاں جلائیں اور بچوں کو چھٹی دے کر دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

ماسٹر سردار محمد نے بڑی سنجیدہ گفتگو کی اور کہا:

''دیکھو برخوردار! تم ابھی بچے ہو۔ غیر تربیت یافتہ معلم ہو۔ محکمہ تمہیں کسی بھی وقت بغیر پیشگی اطلاع کے برخواست کر سکتا ہے۔ تم جس آسامی پر کام کر رہے ہو یہ آسامی منشی منیر احمد کی ہے۔ وہ چار سال تمھاری طرح نوکری کرنے کے بعد چھٹی لے کر جے وی کلاس میں پڑھ رہا ہے۔ اپریل یا مئی میں وہ واپس آ جائے گا۔ وہ چونکہ ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس لئے وہ یہیں آئے گا۔ محکمہ تمھارے چچا کی وجہ سے تمہیں کہیں اور بھیج دے گا یا فارغ کر دے گا لہٰذا یہ بائیس روپے کی نوکری کوئی ڈھیر سارے دکھوں کا علاج نہیں نہ ہی تمھاری ماں کی بیوگی اور محنت کا صلہ ہے۔ برا وقت بہر حال گزر جاتا ہے۔ کوئی منزل بھی دور نہیں ہوتی۔ کچھوا ہلکی چال چل کر ہی جیتا تھا۔ ''میاں کوشش'' نے بھی قدم بقدم چل کر ترقی کی۔ مزا تو جب ہے کہ تم بھائیوں کو بھی پڑھاؤ اور خود بھی پڑھو۔ جس طرح تم نے ورنیکلر مڈل کر لیا ہے اسی طرح وہ اینگلو ورنیکلر مڈل بھی کر لیں گے۔ ایم بی ہائی سکول وزیر آباد میں ورنیکلر مڈل طلبہ کو اینگلو ورنیکلر مڈل بنانے کے لئے صرف انگریزی کے دو پرچوں کی تیاری کرانے کی خاطر جونیئر اور سینئر کی کلاسیں جاری ہیں۔ دو سال کی بات ہے۔ تم وہاں داخل ہو جاؤ۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں دس روپے ماہوار خرچہ دیتا رہوں گا۔ تم پانچ چھ سال بعد کما کر لوٹا دینا۔''

جب ہم چھٹی کر کے گھروں کو جانے لگے تو ماسٹر سردار محمد نے کہا: ''گھر جا کر اپنی ماں

سے اپنے متعلق تفصیل سے بات کرنا۔ کسی دوسرے کا پڑھا تمھارے کام نہیں آئے گا۔ میں نے بھی پڑھنے میں کوتاہی کی اور یہ معمولی نوکری کر رہا ہوں اس لئے کہ میں ''واہی بیجی'' نہیں کر سکتا۔ میرا پتے کا اپریشن ہو چکا ہے۔ میرا بھائی نہروں کا انجینئر ہے۔ اس کے بچے شہری سکولوں میں کرسیوں پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں جبکہ میرے دو بچے کانبانوالہ میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر ہی پڑھتے ہیں۔ اپنے اندر اہلیت نہ ہو تو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ پہلے اپنا آپ سنوارو' پھر دوسرے کی بات کرو۔'' وہ چونکہ جاٹ آدمی تھا لہٰذا اس نے کہا کہ بھائی ہی شریکہ ہوتے ہیں۔ میں نے شریکے کی اصطلاح بھی سن رکھی تھی لیکن اس کے معانی سے آشنا نہ تھا۔

میں ماسٹر سردار محمد جتنی اہلیت رکھتا تھا نہ تجربہ۔ میرا یہی حال ماسٹر گردھاری لعل کے مقابلے میں بھی تھا۔ ان لوگوں کو میری ذاتی ترقی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں...... وہ حقیقی انسانی ہمدردی کے تحت مجھے اپنے مستقبل کو اچھا بنانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ از خود نہیں کر سکتا تھا لیکن ''میاں کوشش'' نے تو اپنے بارے میں فیصلے خود ہی کیے تھے۔ آئندہ کے چند ماہ کے دوران میں ماسٹر سردار محمد کے لہجے میں ذرا درشتی بھی آ گئی۔ وہ مجھے کہتے: ''لاؤ کاغذ اور قلم' لکھوا ستعفیٰ' وقت برباد نہ کرو۔ میں تمہیں اخراجات کی گارنٹی دے رہا ہوں تو پھر ہچکچاہٹ کیسی۔ اگر تمہیں شک ہے تو یہ لو سو روپے ایڈوانس۔'' اور میں ان کے بٹوے میں نیلے نیلے سو سو کے نوٹ دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ وہ انگریزی محاورہ بولتے ''یو کانٹ وِن' اَن لیس یو بی گِن'' پھر مجھے اس کا مطلب بتاتے اور میں کہتا کہ میں ابتداء کر چکا ہوں۔

میں نے ماسٹر سردار محمد سے وعدہ کیا کہ میں نئے تعلیمی سال سے ضرور جونیئر سینئر کلاس میں داخلہ لے لوں گا۔ گھر میں اب میں ماسٹر گردھاری لعل کے بجائے ماسٹر سردار محمد کا تذکرہ کرنے لگا۔ جو باتیں روزانہ ہوتیں میں ماں کو سناتا۔ ماں وہی پرانی بات دہراتی کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ تیرا ماموں بھی کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اپنے چچا سے مشورہ کر لو۔ وہ ناراض نہ ہوں۔ انھوں نے ہی تجھے نوکری دلائی ہے۔ کوئی فیصلہ نہ ہونے کے باوجود میں اپنے طور پر انگریزی پڑھے جا رہا تھا۔ دوست میری مدد اور راہنمائی کر رہے تھے۔

☆☆

تعلیمی سال کی آخری سہ ماہی آتے ہی سکولوں میں سالانہ معائنوں کا دور شروع ہو گیا۔ بابو دین محمد نے فروری ۱۹۴۴ء میں بیگووالہ سنٹر کے مدارس کے سالانہ معائنوں کے لئے لوئر مڈل سکول

میں کیمپ کیا۔ مدارس نے ان کو خشک راشن مہیا کر دیا۔ ان کا اردلی ساتھ تھا' وہ ان کی مرضی کے مطابق ناشتہ اور رات کا کھانا تیار کرتا۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے اور انعام اکرام لینے وہ بابو صاحب سے پہلے اس سکول میں پہنچ جاتا جس کا اس روز معائنہ ہوتا۔ مجھے بھی بابو صاحب پگڈنڈیوں کے راستے دکھانے کے لئے ساتھ رکھتے۔ میں سائیکل پر ان کے آگے آگے چلتا۔ جب تک معائنہ جاری رہتا میں بھی اسی سکول میں رہتا۔ وہ کھانا عموماً اکیلے کھاتے تھے۔ میں اور ان کا اردلی بشیر خوب ڈٹ کر کھاتے مگر دوسرے کمرے میں۔ سکول کا عملہ ہمارا ویسے بھی بابو صاحب سے بڑھ کر خیال رکھتا۔

بابو دین محمد ہی نہیں' بعد کی زندگی میں' میں نے دیکھا کہ افسران معائنہ ایک خصوصی معدہ رکھتے ہیں۔ ٹھنڈا گرم ایک ساتھ ہضم کر جاتے ہیں۔ جس روز پرائمری سکول گھڑتل کا معائنہ تھا اس روز میں راہنمائی کے لئے بابو صاحب کے ساتھ تھا۔ بابو صاحب بطور ناشتہ گری' بادام اور میوے کے حلوے کی ایک پلیٹ کھا کر اور نصف جگ کچے انڈے ملا دودھ پی کر چلے تھے۔ راستے میں دو جماعتوں کا ایک برانچ سکول بھاڈے چک پڑتا تھا۔ وہاں رکے۔ وہاں کے مدرس نے بالاصرار دودھ اور برفی سے تواضع کی۔ تھوڑے سے انکار کے بعد بابو صاحب کٹوری بھر دودھ اور پاؤ بھر برفی کھا گئے۔ میں کوشش کے باوجود کچھ نہ کھا سکا۔ ناشتے کو ابھی گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے بھاڈے چک کے اول مدرس کو حکم دیا کہ وہ اپنے رجسٹرات اور لاگ بک لے کر گھڑتل پہنچ جائے۔

ہم گھڑتل پہنچے لالہ مکند لعل نے جماعتوں کے معائنے سے پہلے رجسٹرات کی پڑتال اور ان پر دستخط کروانے کے لئے بابو صاحب کو خصوصی طور پر تیار کردہ استقبالی کمرے میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ مکند لعل کے گھر سے چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں مختلف اقسام کی مٹھائیاں اور کچھ نمکین اشیا دودھ اور سبز چائے کے ساتھ آ گئیں۔ میں اور سردار محمد صاحب اپنی اپنی جماعتوں میں تھے۔ اردلی بشیر کو بابو صاحب نے اس کمرے میں بلا لیا۔ اس نے آ کر ہمیں بتایا بابو صاحب کے کچھ بھی کھانے سے انکار پر لالہ ان سے ناراض ہو گیا تھا لہٰذا اس کو خوش کرنے کی خاطر بابو صاحب کو ہر کٹوری سے کچھ نہ کچھ چکھنا اور سبز چائے کا پیالہ پینا پڑا ہے۔ مجھے انھوں نے اپنی امداد کے لئے بلایا تھا اور کہا ہے کہ میں کھانے کا کچا راشن ہی لے کر جلدی سے بیگو والے چلا جاؤں اور وہاں دوپہر کا کھانا تیار کروں۔

ماسٹر سردار محمد نے لالہ مکند لعل کے کہنے پر چار مسلمان طلبہ جماعت چہارم سے بشیر اردلی کے ساتھ بھیجے۔ خشک راشن میں کیا کیا تھا یہ ایک راز تھا لیکن اس سب کچھ کو اٹھانے کے لئے چار

طلباء کی ضرورت تھی۔ یقیناً اس راشن میں سے بشیر کا بھی حصہ تھا۔ جس سکول میں ہم بابو صاحب کی ہمراہی میں کھانا کھاتے تھے وہاں عام طور پر روٹی، مرغ پلاؤ، مرغی، مچھلی، بیٹر اور کبھی کبھی کوئی شکار وغیرہ جیسی متفرق اشیا ہوتیں۔ ان دنوں ایسی چیزیں سستی تھیں اور فراوانی کے ساتھ مل جاتیں۔ مرغی اور انڈہ تو افسران معائنہ کا مرغوب کھاجا تھا۔ مرغی دیسی ہوتی تھی انڈے بھی دیسی۔ گھی خالص۔ انہی تین چیزوں کی ڈالی دینے کا رواج تھا بعض زمیندار اساتذہ مکئی، باجرہ، ستو، گندم، گنے اور ایسی ہی دیگر زرعی پیداوار میں سے کچھ نہ کچھ نمونہ افسران کو پہنچاتے رہتے تھے۔ نقد پیسہ دھیلا لینے کا رواج قطعی نہیں تھا۔ کسی مدرس سے اس کی تنخواہ پوچھی جاتی تو وہ ایک مرغی کی قیمت کم کر کے بتاتا۔ سروس کی طوالت پوچھی جاتی تو وہ شلواروں کی تعداد بتاتا۔ ایک شلوار ان کے اندازے میں پانچ سال چلتی تھی۔ ایسے لطائف بھی اساتذہ میں مشہور تھے کہ اچانک افسر معائنہ کے آجانے پر جب فلاں فلاں مدرس نے الماری یا سکول کے کسی کونے میں لٹکتی شلوار عجلت میں پہنی تو اس کے اندر لگے بھڑوں کے چھتے نے ماسٹر صاحب کو اتنا کاٹا کہ وہ کئی دن شلوار چھوڑ تہ بند سے بھی فارغ بخار میں بھنکتے رہے۔

حقے کے بارے میں بھی بڑے لطائف مشہور تھے۔ اچانک افسر معائنہ کے آجانے پر حقے کو سکول کے پچھواڑے یا کسی جھاڑی میں چھپانے کی باقاعدہ تربیت بچوں کو دی جاتی تھی۔ افسران کے علاوہ بعض مدرسین بھی کھانے پینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ واں نامی گاؤں کے اول مدرس کے متعلق ان کا نائب مدرس بیان کیا کرتا کہ جوگی صاحب (اول مدرس) مدرسے میں آتے ہی ایک زمیندار گھرانے سے تین پراٹھے، اچار اور لسّی منگوا کر کھا پی جاتے ہیں اور پھر آدھی چھٹی تک کرسی پر سوئے رہتے ہیں۔

ایک اور مدرس احمد بکھیڑا تھے وہ موسم سرما میں ناشتے میں کم از کم گڑ میں پاؤ بھر گھی یا مکھن ملا کر کھا جاتے تھے۔ بیگو والہ کے ماسٹر امیر علی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سالم مرغی ایک سیر گھی میں بھون کر ستر ہ روٹیوں کے ساتھ کھا چکا تھا۔ جب کوئی مدرس حیران ہو کر پوچھتا کہ کیا واقعی اس نے ایسا کیا تھا تو وہ کہتے تم شرط لگا کر کھلا دو۔ اگر کھا جاؤں تو تمھاری تنخواہ میری نہ کھاؤں تو میری تنخواہ تمھاری۔

☆☆

بابو صاحب کی رفاقت میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض سکولوں میں بعض اساتذہ مدرسی

کے علاوہ تھوڑے سے الاؤنس کے عوض کچھ دیگر محکموں کے کام بھی کرتے ہیں۔ ایسے کاموں میں برانچ پوسٹ ماسٹری کا عہدہ نمایاں تھا جس کا الاؤنس سات روپے ماہوار تھا۔ پھر آوارہ مویشیوں کو پھاٹک میں بند کرنے والے داروغہ کا عہدہ تھا۔ اس میں الاؤنس کے علاوہ بند کیے گئے مویشیوں کے چارے کا خرچہ بھی مویشیوں کی رہائی پر مالک مویشی سے جرمانے کے علاوہ وصول کیا جاتا۔ یہ پیدا کرنے کا عہدہ تھا۔ ایک اور عہدہ امداد باہمی کی انجمن کا سیکرٹری ہونا تھا۔ انجمن امداد باہمی چونکہ قرضے بھی دیتی تھی اس لئے اس کا سیکرٹری ہونا بھی بڑی بات تھی۔ لوئر مڈل سکول بیگووالہ میں ماسٹر غلام رسول صاحب اس عہدہ جلیلہ پر متمکن تھے۔ تیسری جماعت کے انچارج تھے۔ وہ آتے ہی جماعت کو سوال لکھاتے "لکھو پانچ ہزار نو سو دس۔ ضرب یا تقسیم کا ہندسہ بولنے سے پہلے کوئی کھاتہ دار آ جاتا۔ وہ بھول جاتے کہ رقم لکھوانے کے بعد ضرب یا تقسیم کرنے والا ہندسہ یا ہندسے بھی لکھوانے تھے۔ وہ کھاتوں میں الجھ جاتے اور ہم کھیلنے میں۔ ایسے عہدوں کے حصول کے لئے اساتذہ میں کھینچا تانی ہوتی رہتی۔ جو اساتذہ ان عہدوں کو حاصل کر لیتے تھے وہ تدریسی کام بھول جاتے تھے۔ باز پرس سے بچنے کے لئے وہ افسران معائنہ سے "واحد معاملہ" رکھتے تھے۔

☆☆

میرا ادراک پختہ تھا نہ مشاہدہ۔ لیکن پھر بھی میں اپنی ملازمت کے طفیل ایک غیر رسمی تعلیم کے دور سے گزر رہا تھا۔ اپنے اردگرد رہنے والے انسانوں کے متعلق میرا علم بڑھ رہا تھا۔ ان کی عادات و خصائل کی روشنی میں ایک نیا شعور بتدریج میرے اندر سر اٹھا رہا تھا۔ اسی ملازمت کے طفیل میں بچوں کی صف سے نکل کر بڑوں اور بزرگوں کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح دوسروں کے تجربات کی بے شمار داستانیں سن رہا تھا اور ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ بہت نچلی سطح پر سہی مجھے بچوں کے والدین ملنے آتے۔ کسی کے بچے کو کسی بچے نے مارا ہوتا، کسی نے قلم یا پنسل چرا لی ہوتی۔ کسی نے کسی کی کتاب پھاڑ ڈالی ہوتی۔ تختی یا سلیٹ توڑ دی ہوتی۔ میں ان بچوں کے مسائل حل کرتا۔ مدرس ہونے کے وجہ سے بوڑھے والدین کو بھی میری بات سننا اور ماننا پڑتی۔

گھڑتل کے پبلک ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر لالہ ہری رام کھنگورا تھے۔ کھنگورا ان کی ذات نہیں بلکہ دمے کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ یہ لاحقہ لگا دیا گیا تھا۔ ان کا ایک بچہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے مشکل الفاظ پر مبنی املا لکھائی تو وہ دوسرے نمبر پر آیا۔ میں اول، دوم اور سوم آنے والے بچوں کے والدین کو تختی پر ہی لکھ بھیجتا کہ مبارک ہو آپ کا بچہ

اول، دوم یا سوم آیا ہے۔ اول آنے والے کے والدین نے کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا لیکن ماسٹر ہری رام نے بچے کی تختی پر ہی جواباً لکھ بھیجا: ''شکریہ! آپ کی توجہ رہی تو بچہ اول نمبر پر بھی آ جائے گا۔'' میں ابھی خود دوسروں کی توجہ کا طالب تھا لیکن دوسرے میری توجہ کے متمنی تھے۔ یہ میرے بڑے ہونے کی ایک دلیل تھی۔

ایک بچے کا باپ آیا اور اس نے میرے سامنے اپنے بچے کو چند آسان الفاظ لکھوائے۔ بچہ کوئی لفظ بھی درست نہ لکھ سکا تو اس نے کہا: ''ماسٹر جی! تم کیا پڑھا رہے ہو۔ بچے کو ''ڈسکہ'' بھی لکھنا نہیں آتا۔'' میں نے بچے سے کہا: ''جاؤ بھاگ کر نلکے سے پانی کا گلاس لاؤ۔'' اس کا باپ گھور کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بچے کے آنے سے پہلے مجھے دس الفاظ لکھائے۔ ہر لفظ میں چار یا پانچ حروف ہوں۔'' اس نے مجھے چند چیزوں کے نام لکھوائے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اب ذرا باہر چلا جائے میں یہ الفاظ سب بچوں کو لکھواتا ہوں۔ میں نے اونچی آواز سے بول بول کر ساری جماعت کو ان الفاظ کی املا لکھائی۔ اس شخص کے بچے نے سارے الفاظ درست لکھے۔ میں جانتا تھا کہ اس کا بچہ اونچا سنتا ہے۔ جبکہ باپ کو اپنی مصروفیات میں بچے کی اس خامی کا علم نہ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھ پر اور میرے پڑھانے پر الزام دھرنے سے پہلے وہ اپنے بچے کے کانوں کا علاج کرائے۔

میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نئی صلاحیتیں بھی میرے اندر جنم لے رہی تھیں۔ میں نے ''میاں کوشش'' کے علاوہ کٹھالہ گناں کے مڈل سکول کی لائبریری کی ساری کتب پڑھی تھیں اور اب میں پرائمری سکول گھڑتل کی لائبریری بھی پڑھ رہا تھا۔ حکیموں کی حویلی میں حکیم محبوب عالم صاحب کی الماری سے بھی اکرم کے ذریعے حاصل کیے ہوئے کئی ناول بھی میں نے پڑھ ڈالے تھے۔ بچوں کے ساتھ مل کر چاندنی رات میں لکن میٹی کھیلنا، نالہ ایک میں کودنا، گلی ڈنڈا، پٹھو کھیلنا اور مچھلیاں پکڑنا سب کچھ چھوڑ رکھا تھا۔ قدرے تنہائی پسند اور فطرت پرست ہو گیا تھا۔ چیزوں کی ماہیت کو سمجھنے کی دھن سما گئی تھی۔ مشینری میں بھی دلچسپی لیتا تھا کہ وہ کیسے کام کرتی ہے۔ میں اپنے خاندانی کلاک کو پرزہ پرزہ کر کے جوڑ لیتا تھا۔ رنگوں کو باہم ملا کر نئے نئے رنگ پیدا کرتا تھا۔ عجیب عجیب تصاویر بناتا تھا۔ رینگنے، اڑنے اور چرنے پھرنے والے جانوروں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ گو میں ان کی فقاریہ، ممالیہ ایمفیبیا جیسی تشخیص نہیں کر سکتا تھا لیکن ان کو اقسام کے حوالے سے پہچاننے لگا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۴)

نئے ادراک کی نمو

لڑکپن کی رخصتی کے ساتھ ایک جہان نو میرے اندر کروٹیں لے رہا تھا۔عزائم میں پختگی آ رہی تھی،فیصلہ کرنے کی قوت بھی بڑھ رہی تھی۔ ہر بات کو میں نے اس کے پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا جبکہ مجھے اپنے ''خام'' اور ''گم گشتہ'' ہونے کا احساس بھی تھا۔ پھر بھی میں اپنی کمزوریوں کا احساس کر کے ان کو توانائیوں میں بدلنے کی آرزو ہی نہیں، محنت بھی کرنے لگا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ استاد کا مقام معاشرے میں ایک سپاہی یا پٹواری جتنا نہ تھا لیکن پھر بھی علم وفضل والے حکماء وشرفاء کے نزدیک معزز مدرس ہی گردانا جاتا تھا۔ میں گھر سے نکلتا تو گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے جو یہ جانتے تھے کہ میں گھڑتل میں مدرس ہوں مجھے ''منشی جی یا ماسٹر جی'' کہہ کر سلام کرتے۔ گھڑتل کے قریب سلاموں کا زور بڑھ جاتا۔ یہ ننھی سے انفرادیت اسی مرتبہ کے طفیل تھی جس نے مجھے مدرس کی کرسی پر بٹھایا تھا۔

☆☆

اساتذہ میں بیداری اور حقوق کی لہر اس وقت آئی جب ایک انگریزی کے مدرس محمد علی باجوہ نے پنجاب ٹیچرز یونین کی بنیاد رکھی۔ موصوف ڈی بی ہائی سکول آواگت ضلع فیصل آباد میں مدرس تھے۔انھوں نے ضلع کی سیاست میں منفی رجحانات رکھنے والے ممبران اور چیئرمینوں کے خلاف آواز اٹھائی کہ وہ مدرسین کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ہوتا آیا تھا کہ بلدیاتی انتخابات سے پہلے وہ ناپسندیدہ مدرسین کے دور دراز علاقوں میں تبادلے کرا دیتے تھے۔ یہ ناپسندیدگی مدرسین کے لواحقین کے ووٹوں کے حصول میں معاون ثابت ہوتی۔ جن مدرسین کے لواحقین اور برادری کے ووٹوں کے ملنے کی توقع ہوتی ان کو نزدیک کے مدارس میں

تبدیل کر دیا جاتا۔ الیکشن کے بعد بھی تعاون اور عدم تعاون کی بنیاد پر مدرسین کو جزا وسزا تبادلوں کی صورت میں دی جاتی۔ ایسی ہی دوسری دھاندلیوں کے علاوہ یونین کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدرسین کو سرکاری سکولوں کے مدرسین کے مساوی حقوق اور تنخواہیں دی جائیں۔ صدر یونین کے علاوہ سیکرٹری یونین مولانا عبدالغفور غفاری بھی بڑے متحرک کارکن تھے۔ محمد علی باجوہ کی وفات کے بعد وہ تاحیات یونین کے صدر رہے۔

میں نے دیکھا کہ یونین کے بانی صدر کے علاوہ ڈویژنوں' اضلاع اور مراکز کی سطح تک کوئی بھی عہدیدار انگریزی کا استاد نہ تھا۔ جے۔ وی اور ایس وی اساتذہ کی تعداد نمایاں تھی۔ جماعتی عہدے بھی وہی حاصل کرتے' اگرچہ انگریزی مدرس زیادہ اچھے راہنما ثابت ہو سکتے تھے۔ یونین کے طفیل مدرسین کی ایک ایسی برداری وجود میں آئی جس کے اراکین پنجاب بھر کے کونوں کھدروں میں بھی موجود تھے۔ کوئی مدرس کسی کام کے سلسلے میں پنجاب کے کسی کونے میں بھی چلا جاتا تو وہاں موجود مدرسین اس کی میزبانی کو اپنی سعادت سمجھتے۔ سلسلہ درس تدریس بزرگان دین کے ادوار میں بھی ایسا ہی رہا تھا۔ لہٰذا مجھے اساتذہ کی برادری میں اخوت و محبت کا یہ انداز بھی بڑا پسند آیا۔

☆☆

۱۹۴۴ء فروری کا مہینہ آ پہنچا سردار محمد نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے ملازمت چھوڑ کر پڑھنے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے ایک ماہ پہلے استعفیٰ دینا ہو گا۔ ورنہ بورڈ مجھے ایک ماہ کی تنخواہ نہیں دے گا۔ میں نے اب تک جو انگریزی پڑھی تھی اس کی سوجھ بوجھ سے میرا حوصلہ بڑھا تھا اور اب اپنے بارے میں آپ فیصلے کرنے کی قوت بھی مجھ میں آ چکی تھی۔ میں نے فروری کے آخری ہفتے میں بذریعہ رجسٹری ڈاک سررشتہ تعلیم سیالکوٹ کو استعفیٰ بھیج دیا کہ مجھے ۳۱ مارچ ۱۹۴۴ء سے ملازمت سے فارغ سمجھا جائے۔ فروری کے مہینے کی سنٹر میٹنگ ہوئی تو وہاں میرے استعفے کی خبر بذریعہ بابو دین محمد صاحب پہنچ چکی تھی۔ دو دن پہلے سے ہی چچا ناراض ناراض نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے دو تین دوسرے مدرسین کو مجھے سمجھانے کے لئے کہا کہ میں استعفیٰ واپس لے لوں۔ اگلے ہی سال جے وی کر لوں اور چین کی بانسری بجاؤں۔ میں کوئی ضدی بچہ نہ تھا' دوسروں کی مان لینے میں بعض اوقات میں اپنا نقصان بھی کر لیتا تھا لیکن میں استعفیٰ واپس لے کر زندگی بھر ماسٹر گردھاری لعل کو اور چودھری سردار محمد کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ (

یہ ایک الگ حسن اتفاق ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے گردھاری لعل تو ویسے ہی بھارت چلے جانے کی وجہ سے مل ہی نہیں سکے لیکن میری ملاقات قیام پاکستان کے بعد چودھری سردار محمد سے بھی کبھی نہیں ہوئی) میں مخالفت کرنے والوں کو بھی تسلیم کرتا تھا لیکن اپنے اس فیصلے پر میں ڈٹا رہا۔ چچا تو باقاعدہ میرے اس رویے کے باعث عرصے تک میری ہر حرکت پر طنز کے ڈونگرے برساتے رہے لیکن جب میں نے ان کی حیات ہی میں ایم۔اے۔بی۔ٹی کر لیا تو پھر میری مثال بھی دیا کرتے تھے اور بعض سے کہتے کہ ذوالفقار کی پشت پر کسی بزرگ کا ہاتھ ہے۔ میں اپنی ماں کے سوا کسی کو ان معنوں میں بزرگ نہیں مانتا جن معنوں میں چچا کہا کرتے تھے۔

ماں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ ماموں نے صرف اس قدر کہا کہ نوکری چھوڑی ہے تو اب کچھ کر کے دکھانا۔ یوں ماہ مئی ۱۹۴۳ء سے لے کر ۳۱ / مارچ ۱۹۴۴ء تک کا زمانہ تعلیم کے میدان میں ابتدائی درجے کے انتہائی نچلے مقام پر مدرس رہنے کا تھا۔ اس زمانے کے جملہ تجربات میری زندگی پر ہمیشہ کیلئے نقش رہے۔ تدریسی پیشے کے متعلق میری لگن قائم رہی۔ چھوٹے چھوٹے تجربات نے میری آئندہ معلّمی کی زندگی کو زیادہ کارآمد زیادہ مثبت اور زیادہ سرگرم بنایا۔

میرا پہلا معلّمی کا دور یکم اپریل ۱۹۴۴ء کے بعد ماضی بن گیا لیکن میرے مستقبل میں میری متعلمی کے زمانے میں برابر زندہ اور معاون رہا۔ اس دور نے میری زندگی کو لاشعوری طور پر ایک نیا اور مثبت رخ عطا کیا۔

☆☆

۱۹۴۴ء کی تعطیلات موسم بہار کے بعد میں نے ماں سے چند روپے لئے اور انگریزی کا ابتدائی قاعدہ جو میں پڑھ چکا تھا اور لکھائی کی وہ کاپیاں جواب تک میں نے لکھی تھیں سنبھالیں اور ریلوے اسٹیشن کی سمت روانہ ہوا تاکہ وزیرآباد جاؤں۔ دل ہی دل میں میں خوش بھی تھا کہ اب میرا ریل کا سفر مشرق کی سمت کے بجائے مغرب کی سمت ہوا کرے گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مدرسی کے تجربے نے مجھے کچھ ''سیانا'' بنا دیا تھا لہٰذا میں نے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اپنے معمول کے خلاف ریلوے کا آمدورفت کا پاس بنوایا۔ معمول کے خلاف اس لئے کہ سمبڑیال مڈل سکول میں تعلیم کے دوران کبھی طلبہ نے ریلوے کا خرچ نہیں کیا

تھا۔ جب ہم سمبڑیال ریلوے اسٹیشن پر اترتے تو اسٹیشن کی حدود میں کوئی ہمیں ٹکٹ نہیں پوچھتا تھا لیکن وزیر آباد ایک ریلوے جنکشن تھا۔ "بے ٹکٹوں" کا راستہ روکنے کے لئے کئی پل جالیاں اور دیواریں تھیں اور چور دروازوں کا مجھے علم نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ریلوے کا جاری کردہ پاس ایک عافیت نامہ تھا۔

☆☆

ایم۔ بی۔ ہائی سکول وزیر آباد دو منزلہ عمارت میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ دوسری منزل پر گیانی کرتار سنگھ جونیئر سنیئر کلاس میں داخلہ کر رہے تھے میں نے اپنی باری پر انھیں بتایا کہ مجھے انگریزی پڑھنا ہے۔ ورنیکلر مڈل تو میں نے دُرجہ اول میں پاس کیا ہے۔ پھر میں سال بھر ان ٹرنیڈ مدرس بھی رہا ہوں۔ مجھے فیس میں کچھ رعایت دی جائے۔ گیانی کرتار سنگھ نے کہا:

"ہتھ ملایار، توں تیں اپنا مدرس بھرا ایں۔ بس ایک روپیہ دے دے۔"

میں نے گیانی صاحب سے ہاتھ ملایا اور دو پڑا روپیہ ان کے ہاتھ پر رکھا۔ رزلٹ کارڈ پر میرا نام اردو میں تھا وہ انھیں لکھنا نہیں آیا۔ میں نے ان کو لکھ کر بتایا تو کہنے لگے: "اوکھا ناں ای اے، پر خیر۔" پھر انھوں نے ایک طالب علم کو آواز دی اور اس سے کہا کہ مجھے جونیئر کلاس میں چھوڑ آئے۔ کلاس میں ابھی داخلہ جاری تھا، لہٰذا کوئی خاص پڑھائی نہیں ہو رہی تھی۔ تقریباً میری ہی عمر کے طلبہ تختہ سیاہ پر لکھے گئے انگریزی کے حروف تہجی کی نقل چار لائنوں والی کاپی پر کر رہے تھے۔ میں بھی ان میں بیٹھ گیا اور ان ہی کی طرح لکھنا شروع کر دیا۔

دوسرے تیسرے دن گیانی کرتار سنگھ نے مجھے چھیالیس طلبہ کی جماعت کا مانیٹر بنا دیا۔ طلبہ کی حاضری بھی میں لگاتا۔ پوری لگن سے میں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی۔ اڑھائی ماہ بڑے اطمینان اور خاصی محنت میں گزر گئے کہ اچانک جون کے آخری ہفتے میں مون سون گھٹائیں آ دھمکیں۔ گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑنے لگے۔ اچانک ہی آسمانی بجلی کی ایک چمک دار لہر خوفناک گرج کے ساتھ اسکول کی عمارت کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک شدید جھٹکے نے اوپر والی منزل کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی اپنی جگہ سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ ہم بھی اپنے بنچوں سے فرش پر پٹخے گئے جبکہ گیانی کرتار سنگھ کمرے سے باہر صحن میں جا گرے۔ بڑی ہاہا کار

مچی۔ شہری اور بلدیہ کے حکام دوڑے آئے۔ اللہ کا شکر ہے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا' تاہم دو تین دن کے لئے اسکول بند کر دیا گیا۔

☆☆

مجھے اس ناشدنی صورت حال سے چکر آ گیا تھا اور جب میرے حواس بجا ہوئے تو میں بلدیہ کے ہسپتال میں تھا۔ میرے والد مرحوم کے ماموں زاد بھائی محمد سعید قریشی بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی بلدیہ وزیر آباد کے سیکرٹری تھے۔ رشتے داروں میں انھیں سکتر پکارا جاتا تھا۔ تعلیمی لحاظ سے وہ چونکہ ہم لوگوں سے کافی آگے تھے اس لئے ہماری میل ملاقات شادی غمی کے مواقع پر ہی ہوا کرتی تھی۔ ماں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ میں وزیر آباد میں ان سے ملتا رہوں لیکن میں عمر اور امارت کے فرق کی وجہ سے ان سے نہیں ملا تھا۔ وہ اسپتال میں داخل طلبہ اور اساتذہ کی خیر و عافیت دریافت کرنے آئے تو مجھے ایک بیڈ پر لیٹا دیکھ کر حیران ہوئے۔ جھک کر میرا حال دریافت کیا اور پوچھا "جب تم ادھر جونیئر سینئر پڑھنے آ رہے ہو تو مجھے کیوں نہیں بتایا اور گھر کیوں نہیں آیا؟" میں خاموش رہا۔ واپسی پر وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ منٹو چچی نے مجھے گرم دودھ میں گھی ملا کر پلایا اور کہنے لگیں تم بڑے ہی گندے بچے ہو کہ روزانہ وزیر آباد آ رہے ہو اور اپنی چچی سے ملنے نہیں آئے۔ پھوپھی (میری دادی) کی خیر خیریت بتائی ہے نہ بھابی (میری ماں) کی۔ میں کیا جواب دیتا۔ شرماتا رہا۔ وہ اپنی گفتگو میں لفظ منٹ بڑا استعمال کرتی تھیں لہٰذا ان کے اس "ایک منٹ میں" کے تکیہ کلام کی وجہ سے ان کا نام "منٹو" پڑ گیا تھا۔ اصل نام سردار بیگم تھا۔

☆☆

تیسرے پہر میں نے ان سے اجازت لی اور اپنے گاؤں جانے کے بجائے وزیر آباد کے قریب سرانوالی نامی گاؤں میں بیاہی اپنی پھوپھو کے ہاں چلا گیا' میں اکثر وہاں جاتا رہتا تھا۔ ماں کو پتہ تھا کہ جب میں گاؤں نہیں آیا تو ضرور ان کے ہاں ہی گیا ہوں گا۔ اس گاؤں سے کئی لڑکے ایم بی سکول میں پڑھنے آتے تھے۔ اسکول پر آسمانی بجلی گرنے کی خبر اس گاؤں میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ میں پھوپھو کے گھر پہنچا تو سب نے بجلی کے بارے میں سوالات کیے۔ میں نے انھیں بتایا کہ مقام شکر ہے بجلی گری نہیں عمارت کو چھوتی گزر گئی تھی۔ اگر واقعی بجلی گرتی تو سب کوئلہ بن جاتے۔

اس رات میری پھوپھو کی چھوٹی لڑکی نے مجھے موتیوں والا سرہانہ اور اپنے ہاتھ کی کاڑھی ہوئی چادر والا بستر دیا تھا۔ بار بار میری خیریت پوچھی تھی اور سیانوں کی طرح میری پیشانی پر ہاتھ لگا کر دیکھا تھا کہ مجھے بخار تو نہیں۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کے بارے میں پھوپھا نے ابا سے کہا تھا کہ یہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔ ماں اس بات کا ذکر اکثر کیا کرتی تھی۔ ابا کی وفات کے بعد ماں سال میں ایک بار پھوپھو کے ہاں اسی بات کا اعادہ کرنے کے لئے جاتی تھی کہ ان کی چھوٹی بچوں کے ابو کی زندگی ہی میں ہمیں دے دی گئی تھی۔ لہٰذا وہ ہماری ہے۔ توفیق کے مطابق ماں اس کے لئے کپڑے وغیرہ اور دیگر تحائف بھی لے کر جاتی۔ میں نے اپنے بچپن میں اگر کبھی کسی لڑکی کے متعلق سوچا بھی تھا تو وہ یہی لڑکی تھی۔ میری نظر میں وہ دنیا بھر کی تمام لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ عقلمند، سگھڑ اور لائق فائق تھی۔ اس نے میری جو پروا کی تھی اس سے میرے ذہن کی چھوٹی سی دنیا میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ میرے دل کے آس پاس تو رہتی ہی تھی مگر اب اور قریب آ گئی تھی۔ ہمارے درمیان کوئی کھلی بات چیت، قول وقرار اور میل جول نہ تھا، مگر متوقع رشتے کے پیش نظر ایک وابستگی کا احساس تھا۔ وہ اپنی خصوصی توجہ سے مجھے آئندہ کے رشتے کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

اگلی صبح مجھے ایسے لگا جیسے اس لڑکی کے علاوہ باقی اہل خانہ، پھوپھو سمیت میرے بارے میں سرد مہری کا اظہار کر رہے ہیں۔ میرا ارادہ اسی گاؤں میں تین روزہ تعطیلات گزارنے کا تھا لیکن مجھے ان کی بیگانگی کی وجہ سے اچھا نہ لگا کہ میں انجان بنا رہوں اور وہ کچھ محسوس نہ کروں جو مجھے محسوس کرایا جا رہا تھا۔ میں وہاں سے ایک کسک اور میٹھا سا درد لے کر وزیر آباد پہنچا اور وہاں سے اپنے گاؤں اپنے گھر چلا آیا۔

☆☆

بجلی کا ایک نفسیاتی خوف آج تک قائم ہے۔ اب بھی میں گرجتے، چمکتے سیاہ بادلوں سے ڈر جاتا ہوں۔ میں نے وزیر آباد سکول جانا ہی چھوڑ دیا اور پبلک ہائی سکول گھڑتل کے ایک پڑوسی محنتی اور لائق طالب علم سے ابتدائی بول چال، ترجمے اور گرائمر میں مدد لینا شروع کر دی۔ اسی اثنا میں چچا جان کا تبادلہ مڈل ماڈل سکول سمبڑیال میں کر دیا گیا تھا، لہٰذا ان کے کہنے پر میں ان کے ساتھ پھر اسی اسکول میں جانے لگا جہاں سے میں نے ورنیکلر مڈل کیا تھا۔ اسکول کے

ہیڈ ماسٹر محمود الحسن قریشی بھی ہماری برادری میں سے تھے۔ انھوں میری خاطر انگریزی کی تدریس کے اوقات اس طرح ترتیب دیئے کہ میں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں تینوں جماعتوں کے انگریزی کے اوقات سے استفادہ حاصل کرسکوں۔ چھٹی اور ساتویں کو ماسٹر کرتار چند پڑھاتے تھے سخت متعصب آدمی تھے، کئی مسلمان بچوں کو چٹکی بھرنے کی ظالمانہ سزا دیتے کہ اس سزا کے تسلسل کے خوف سے بچے سکول سے بھاگ جاتے۔ مجھے وہ کوئی بات خصوصیت سے بتاتے نہ پوچھتے۔ آٹھویں کی انگریزی کی تدریس خود قریشی صاحب کے ذمے تھی۔ میں چھٹی ساتویں کے اسباق میں ذہانت اور آٹھویں میں رٹے سے کام چلانے لگا۔

اکتوبر نومبر ۱۹۴۴ء میں امتحان ورنیکلر فائنل کے داخلے بھیجنے کا وقت آیا تو میرا داخلہ بھی صرف انگریزی کے پرچے دینے کے لئے پرائیویٹ طالب علم کے طور پر بھیج دیا گیا۔ امتحانات یکم فروری ۱۹۴۵ء سے شروع ہوئے۔ پہلے پرچے انگریزی ہی کے تھے۔ امتحان سے فارغ ہو کر بھی میں انگریزی کو رٹے لگاتا رہا۔ مئی ۴۵ء کے پہلے ہفتے میں نتیجہ نکلا تو میں بھی اللہ کی خاص مہربانی سے پاس ہو گیا اور یوں مدرسی کے اور طالب علمی کے ایک ایک سالہ دور یعنی دو سال بعد میں نویں جماعت میں داخلے کا اہل تھا۔

میری ماں، ماموں اور چچا میری اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ رواج کے مطابق میری ماں نے شیرینی تقسیم کر کے اس خوشی میں محلہ داروں کو بھی شریک کیا۔ چچا اگرچہ اظہار نہیں کرتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ دل ہی دل میرے استعفیٰ دینے پر میرا نتیجہ آنے تک ناراض تھے۔ وہ ہمارے گھر میں آئے اور تخت پوش پر بیٹھ کر مجھے اپنے پاس بلایا۔ دس روپے انعام دیا۔ خوب شاباش دی اور میری ماں کو بتایا کہ وہ میرے استعفیٰ دینے پر اگر ناراض تھے تو اس کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔ انھوں نے خود بھی لوئر مڈل کے بعد ورنیکلر مڈل کیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے کئی مرتبہ انگریزی مڈل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ انگریزی میں چل نہیں سکے تھے اور اپنی اور دوسرے کئی ساتھیوں کی ناکامی کے باعث وہ میرے بارے میں بھی یہی سمجھتے تھے کہ میں بھی دل ہار جاؤں گا۔ پھر مجھے احساس ہوگا کہ ملازمت کیوں چھوڑی۔

وہ میرے آئندہ پڑھنے کے منصوبے پر میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے میرا پبلک ہائی اسکول گھڑتل میں جانا خارج از امکان قرار دیا کہ وہ کانگریسی لالاؤں کا اسکول

ہے اور ہم ہیں مسلم لیگی اور شریف سیدھے سادھے لوگ۔ سیالکوٹ شہر کی نسبت وزیر آباد قریب تھا لیکن اب وہاں میں خود نہیں جانا چاہتا تھا۔ مبادا میں کسی دن پھر سرانوالی نہ جانکلوں۔ مجبوراً میں نے اسلامیہ ہائی سکول سیالکوٹ شہر میں داخلہ لے لیا۔

اسے اتفاق کہئے یا قدرت کی خصوصی مہربانی کہ تعطیلات موسم گرما کے اختتام کے ساتھ ہی انجمن اسلامیہ سمبڑیال نے اپنے مڈل سکول کا درجہ ہائی تک بڑھا دیا اور میں سیالکوٹ سے سرٹیفکیٹ لے کر سمبڑیال میں آ گیا۔

☆☆

۴۶-۱۹۴۵ء اور ۴۷-۱۹۴۶ء کے ''سال برصغیر کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ میں بھی ذاتی طور پر ان دو سالوں کے حالات واقعات سے بڑا متاثر ہوا۔ انہی دو برسوں کے اندر اندر جہاں میں نے رسمی تعلیم سے اپنے ذہنی افق روشن کیے وہاں غیر رسمی تعلیم کے فیوض نے بھی مجھے مالا مال کیا۔ اب میں اپنے بارے میں فیصلے آپ کر رہا تھا۔ لڑکپن سے نکل کر بلوغت کی وادیٔ خارزار میں قدم رکھ رہا تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں اگ رہی تھیں۔ آواز بدل گئی تھی۔ ناول، فلمیں اور عشق و محبت کے موضوع پر گپ شپ اچھی لگنے لگی تھی۔ دنیا اپنے تمام بھید از خود کھولتی نظر آ رہی تھی۔ ایک ''سرکاراما'' میرے چاروں سمت برپا تھا اور میں متحرک زندگی کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ ملکی سیاست، مذہبی تفرقہ بازی، برطانوی سامراج، جنگ عظیم دوم اور ایٹم بم کی تباہیوں کے علاوہ اپنے اردگرد کی شخصیتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ دل و دماغ میں نئے نئے شگوفے کھل رہے تھے۔ حقیقتوں کے جلو میں کچھ مکروہات زمانہ بھی بے نقاب ہو رہی تھیں۔

یہ دو سال میری زندگی کے ہنگامی سال تھے۔

☆☆

اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال کے پہلے صدر معلم قاضی عطاء اللہ مرحوم و مغفور تھے۔ قومی خدمت کے جذبے کے پیش نظر وہ سرکاری سکول کی ملازمت چھوڑ کر انجمن کی ملازمت میں آئے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک دلاویزی، اجلاپن اور خصوصی وقار تھا۔ ان کے چہرے سے نور ٹپکتا واقعی نظر آتا۔ وہ قول و فعل میں اقبال کے مرد درویش تھے۔ انھیں کلام اقبالؒ کا بہت بڑا ذخیرہ زبانی یاد تھا۔ اقبالؒ کے شاہین کی روح ہمارے اندر کاشت کرنے کے لئے انھوں نے نویں جماعت میں اردو کی تدریس بھی اپنے ذمے لے لی تھی۔ انگریزی تو وہ ہمیں پڑھاتے ہی

تھے لیکن وہ آرٹس کے بہت سے مضامین میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ کئی مدرس آئے اور ''ان فٹ'' ہو کے چلے گئے۔ انھیں اپنے مزاج کے اساتذہ کی ٹیم اکٹھی کرتے سال بھر لگ گیا۔ جب میں اور دوسرے ہم جماعت دسویں میں پہنچے تو ایسے اساتذہ آ چکے تھے جو اپنے اپنے مضمون کے ماہر تھے۔ اور قومی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ذاتی طور پر میں جتنا قاضی صاحب سے متاثر ہوا کسی اور سے نہیں ہوا۔ بیشک اس عظیم مردِ مومن کی شخصیت نے مجھے وہ روحانی شعور بخشا جو اب تک میری راہنمائی کرتا ہے۔

میں اپنی ماں کی عزیمت کے بعد اپنے ماموں اور چچا کی اخلاقی اور انسانی اقدار سے بھی فیض یاب ہوا۔ میں ان بزرگوں کی جن باتوں کو لڑکپن اور عہدِ جوانی میں قابلِ تعزیر سمجھا کرتا تھا اب انھیں ان کی عالی ظرفی کے ثبوت سمجھتا ہوں۔ واقعی بزرگوں کی باتوں اور ان کے افعال کو سمجھنے کے لئے بصارت کی نہیں بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے کئی افعال وقتی مصلحت کے نہیں بلکہ مستقبل کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔

☆☆

انہی برسوں میں میں نے حقیقت سے کوسوں دور گھٹیا اور رومانی فلمیں دیکھیں۔ اسی قسم کے رسائل اور کتابوں سے ذہن کو آلودہ کیا۔ اسلامیہ ہائی سکول کی لائبریری مجھ سے دور ہوگئی۔ فلم بینی اداکاروں اور اداکاراؤں کے متعلق تصاویر اور معلومات قریب آ گئیں۔ میرا داؤ لگتا تو میں بغیر ٹکٹ کے سیالکوٹ بھاگ جاتا اور ساڑھے چار آنے والی کلاس میں بیٹھ کر فلم دیکھ آتا۔ نئی آنے والی فلموں کے اشتہارات اور مختلف مناظر کی تصاویر دیکھ کر مجھے خوب لطف آتا۔ انہی دنوں میں نے الف لیلوی کہانی پر مبنی نیم عریاں رنگین انگریزی فلم ''بغداد کا چور دیکھی''۔ ایک فلمی رسالے میں قلمی دوستی کے کالم سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے کئی ایسے قلمی دوست پیدا کیے جنھیں فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کے شجرہ ہائے نسب، ذاتی کارنامے اور ان کے بولے ہوئے مکالمے تک یاد تھے۔ پھر مجھ پر ڈراما لکھنے کا بھوت سوار ہوا۔ میں نے محبت، نفرت، غربت، امارت کے نادان سے تصورات جمع کر کے اور فلموں کے سنے سنائے مکالمے استعمال کر کے ''غلام'' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا۔ غلام بادشاہ کا بھتیجا تھا جو دربار میں اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے آ گھسا تھا اور اس نے بادشاہ کی بیٹی کا دل جیت لیا تھا اور الٹے سیدھے گیت گا گا

کر اس کو پھسلاتا رہتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ

مجھے نہیں معلوم کہ اس ڈرامے کا مسودہ قاضی عطاء اللہ صاحب کے ہاتھ کیسے لگا۔ شاید کسی مولوی قسم کے ہم جماعت نے میرے بستے سے نکال کر ان کو دیا ہوگا۔ قاضی صاحب نے میری کوشش کو سراہا لیکن ساتھ ہی ان فاش غلطیوں کی پہچان کا شعور بخشا جو میری کم علمی اور کم فہمی کا مظہر تھیں۔ انھوں نے مجھے صرف چند غلطیوں کے متعلق پوچھا:

''کیا وزیر کی بیٹی سہیلی کے گھر سے دال مانگ سکتی ہے؟ اور کیا بادشاہ کے گھر والے ٹھوٹھیوں میں کھانا کھاتے ہیں؟ کیا ملکہ کے پاس گرمیوں کے کپڑوں کی کمی ہو سکتی ہے؟ کیا بادشاہ کی بیٹی ایک غلام کی محبت میں اپنے بھائی پر خنجر اٹھا سکتی ہے؟ کیا بادشاہ کے دربار میں ہر کوئی بغیر روک ٹوک گھس آتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں نے اپنے شاہکار میں کس قسم کی ''بونگیاں'' ماری ہوں گی..... قاضی صاحب نے اپنے ظرف کے مطابق نصیحت کی کہ میں پہلے اپنی رسمی تعلیم مکمل کروں، پھر حقیقت کی عکاسی کرنے والے ڈرامے لکھ کر اگر شیکسپیئر اور آغا حشر کاشمیری بن جاؤں تو وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے انعام دیں گے۔ ''فلمیں دیکھنے اور گھٹیا کتب اور رسائل پڑھنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔'' انھوں نے فرمایا۔ ''تمھیں اپنی سوچیں بدلنا ہوں گی اور اپنے چچا کی خواہش کے مطابق دیوبند جا کر دینی عالم بننا ہوگا۔ تمھیں بھانڈوں اور میراثیوں کا چلن اختیار نہیں کرنا ہے۔'' میں اس قدر شرمندہ ہوا کہ رونے لگا۔ تب انھوں نے مجھے حوصلہ مندی، بردباری اور شخصیت کی تعمیر کے دیگر عناصر سے متعارف کرایا اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں مولویوں کے خاندان کے مثالی بیٹوں کا سا طریق اختیار کروں گا۔

☆☆

اتحادیوں کے جنگ جیت جانے کا واقعہ اور تحریک پاکستان میں زور شور بھی انہی سالوں میں رونما ہوا۔ مقامی رہنما گلی گلی اپنی سیاسی جماعتوں کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ مسلم لیگی زعماء مسلمانوں کو کانگریس کی ریشہ دوانیوں اور یونینسٹ پارٹی کی فتنہ انگیزیوں سے آشنا کرنے میں جت گئے تھے۔ تحریک پاکستان کی کامیابی انتخابات ۴۶۔۱۹۴۵ء سے مشروط ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ ان انتخابات میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کے طور پر حصہ لے رہی تھی۔ جب عورتیں تک تحریک پاکستان میں پیش پیش تھیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ہائی سکولوں کے طالب

علم اس میں حصہ نہ لیتے۔ ہم دوست طلبہ بھی جلوس نکالتے اور نعرے لگانے میں آگے آگے ہوتے۔ برصغیر کے مسلم اکثریت والے صوبوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کو بڑی پذیرائی ملی اور وہ شاندار انتخابی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اگست ۱۹۴۶ء کے ڈائریکٹ ایکشن ڈے میں بھی طلبہ نے خوب مظاہرے کیے۔ ریلیں روک روک کر احتجاج کیا۔ نیشنل گارڈ کی وردیاں پہن کر ہم فخر محسوس کرتے۔ ''لے کے رہیں گے پاکستان' دینا پڑے گا پاکستان'' ہمارا محبوب نعرہ تھا۔ پاکستان کے متعلق احساسات بڑے پاکیزہ اور خوش آیند تھے۔ ''یہ مسلمانوں کا وطن ہوگا۔ مسلمان اس میں اپنی زندگیاں اپنے دین کے مطابق بسر کریں گے۔ کوئی غریب نہ رہے گا۔ کسی کا استحصال نہیں ہوگا۔ سماجی مساوات ہوگی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا۔ چھوٹے بڑے کی تفریق مٹ جائے گی وغیرہ وغیرہ۔''

سیاسی کشاکش جاری تھی۔ منزل کی نشان دہی ہو چکی تھی۔ امتحان قریب آ جانے کے باعث ہم طلبہ نے تھوڑی سی توجہ امتحان کی تیاری پر بھی مبذول کی۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں' میں نے پبلک ہائی سکول بھوپال والہ کے امتحانی مرکز میں میٹرک کے پرچے دیئے امتحان سے فارغ ہو کر اب نتیجے کا انتظار تھا۔ میں حکیموں کی حویلی میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اشرف قریشی اور اکرم قریشی دونوں دوستوں کے ساتھ مل کر میں اخبارات پڑھتا اور ریڈیو سنتا۔ بزرگوں کی زبان سے ہندوؤں سکھوں کی خفیہ کارروائیوں پر تبصرے زیر بحث آتے۔ پتہ چلا کہ مسلمانوں کی مخالفت میں سکھ اور ہندو مسلح ہو رہے ہیں۔ سکھوں نے کچھ مہنت بلا رکھے ہیں جو سکھ جوانوں کو گتکا' لٹھ بازی اور بلم چلانے کی تربیت دے رہے ہیں۔ ہم نوجوانوں نے بھی ایسی ہی دوبدو کارروائیوں کے لئے لوہاروں سے ہتھیار تیار کرائے اور پولیس کو متوقع تصادم کی اطلاع دی جس پر پولیس نے چھاپہ مار کر ہندوؤں اور سکھوں کے تربیتی مراکز بند کر دیے۔

☆☆

۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کے بعد حالات کچھ بدل گئے۔ گاؤں کے ہندو اور سکھ منظم طریقے سے نقل مکانی کرنے لگے۔ سکھ جتھوں کے حملوں کی افواہیں اڑتیں جو آدھی سچی اور آدھی جھوٹی ہوتیں۔ ہم بستی کی حفاظت کے لئے متعین رینجرز کے سپاہیوں کی ہمراہی میں سکھوں کے جتھوں کو روکنے کے لئے نہر کے پل یا سڑک کی سمت بڑھتے تو وہاں کوئی جتھہ نہ ہوتا۔ ہاں ہندو سکھ نقل مکانی کر کے جا رہے ہوتے۔ کبھی کسی مسلمان نے ان سے تعرض نہیں

کیا۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ دیہات کے ہندوؤں اور سکھوں کو پریشانی تھی کیونکہ بعض شہروں میں مسلمانوں سے ان کے تصادم ہو رہے تھے۔ فسادات اور چاقو گھونپ دینے کی خبریں اخبارات کے ذریعے دیہات میں پہنچ رہی تھیں۔ ہم چونکہ مسلم اکثریت کے علاقے میں تھے' لہٰذا ہمارے حوصلے بلند تھے۔ مملکت خداداد پاکستان کو صفحۂ ہستی پر ابھرتے دیکھنے کے لئے مسلمان دیدہ دل فرش راہ کیے ہوئے تھے۔ مساجد کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ برادریوں نے دیرینہ نفرتیں اور کدورتیں دفن کر دی تھیں۔ محبت' یگانگت' اخوت اور یک جہتی کے مظاہرے عام تھے۔ بس پاکستان کے قیام کی نوید کا انتظار تھا۔

زندگی کی اس ہماہمی میں امیدوں کے روشن چراغ جلائے رکھنا میرا معمول بن گیا۔ اخبارات اور کتب کا مطالعہ' حکیموں کی حویلی میں حاضری دینا' حالات حاضرہ پر بات چیت سننا اور پھر اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر دل کی باتیں کرنا میری مصروفیات تھیں۔ ماں کو میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سیاسی حالات اور اخبارات کی خبروں سے آگاہ کرتا۔ اپنے بھائیوں کی تعلیمی رفتار بڑھانے کی بھی بھرپور سعی کرتا رہا لیکن مجھے کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ مدرس کی جو روح میرے اندر حلول کر گئی تھی اس کے تحت میں ابتدائی اسکول کے بچوں کو گھر پر پڑھاتا بھی تھا۔ اس دور میں ٹیوشن فیس کا کوئی رواج نہ تھا۔ بس خیر سگالی کا جذبہ فروغ پاتا تھا۔ میں دیکھتا کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو تعلیم سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی۔ اس حوالے سے مجھے اپنے فیصلے پر اطمینان ہوتا۔ ماسٹر گردھاری لعل اور ماسٹر سردار خان مجھے اکثر یاد آتے لیکن طالب علمی کے پچھلے دو برسوں میں ان سے کم کم ہی ملاقات ہوئی تھی۔

ماں کو اس وقت سے میری شادی کی فکر لگی تھی جب سے میں نے ورنیکلر مڈل کیا تھا۔ ماں نے ازخود ہی اپنے بیٹوں کے رشتے یوں طے کر رکھے ہیں' بڑا پھوپھو کے گھر۔ منجھلا چچا کے گھر اور چھوٹا ماموں کے گھر' جس طرح چھوٹے کے لئے ماموں کے گھر کوئی لڑکی پیدا ہی نہیں ہوئی' اسی طرح باقی دو نسبتوں میں بھی دنیاداری حائل ہو گئی۔ جن محرومیوں کو ہم نے مستقبل کے تصورات کی نظر کر دیا تھا' وہ حال کے زمانے میں دوسروں کی نظر میں تو تھیں۔ میرے دل میں پھوپھی زاد بس کر رہ گئی تھی' وہ پھوپھی زاد جس نے مجھے موتیوں والا سرہانا اور کاڑھی ہوئی چادر کا بستر اس رات دیا تھا جب میں آخری باران کے ہاں گیا تھا۔ جس نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ کر یہ جاننا چاہا تھا کہ مجھے بخار تو نہیں۔ جس بخار کی وہ متلاشی تھی وہ تو مجھے اللہ کی مہربانی سے

نہیں چڑھا لیکن تب سے میں اس لڑکی کے لئے ایک بخار محسوس کر رہا تھا۔ مستری محمد شفیع اس بخار کو محبت کی چنگاری کی تپش بتاتا تھا۔

محمد شفیع راج میرے دل کا جانی اور لنگوٹیا تھا۔ وہ بھی حکیموں کی حویلی میں آیا جاتا کرتا تھا۔ اس کے سامنے میں دل کھول کر رکھ دیتا تھا۔ اس نے پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد پڑھنا ترک کر دیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کی افواج کے لئے چاقو بنانے لگا تھا۔ جب وہ پڑھتا تھا تو بے حد ہشیار تھا۔ اب چاقو بناتے بناتے وہ سوچ کے لحاظ سے بند چاقو جیسا ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ محبت کی گھاتیں اور باتیں سننے اور سنانے والا میرا واحد ساتھی تھا۔ وہ بھی اپنی ماموں زاد کی محبت میں گرفتار تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ سعیدہ سے میرے لگاؤ کو الاؤ محمد شفیع کی صحبت نے ہی بنایا تو یہ غلط نہ ہوگا۔

انہی دنوں محمد شفیع کے رنڈوے باپ نے گھر کا چولہا سلگانے کی خاطر بیٹے کی شادی اس کی ماموں زاد محبوبہ سے کر دی تو میرا غمخوار کوئی بھی نہ رہ گیا۔ محمد شفیع کے اتباع میں جب میری ماں نے پھوپھو کے گاؤں جا کر سنجیدگی سے میرا رشتہ طلب کیا تو پھوپھو کے بجائے پھوپھا نے میری ماں کو سمجھایا کہ وہ ''جھلیاں گلاں'' کرنا چھوڑ دے۔ ماں نے تو ''جھلیاں گلاں'' کرنا چھوڑیں یا نہیں، لیکن میں آزردہ اور افسردہ رہنے لگا۔ رو کے جانے کا دکھ میں نے اس شدت سے محسوس کیا کہ میں خود ترسی کا مریض ہو گیا۔

◆◆◆◆◆

(۵)

علاجِ غمِ دل

اپنی محبت میں کامران محمد شفیع سے ہی میں اپنی رومانوی شکست کی داستاں بیان کر سکتا تھا۔ وہ مجھے سائیں جلال کے پاس لے گیا جس نے کہا کہ بی بی کی ہاتھ اور پاؤں کے ناخن لاؤ تو پھر وہ اس کے ماں باپ کا دل موم کر سکتا ہے لیکن ایسا ناممکن تھا۔ وہ مجھے دو سیر آموں کے ساتھ کاکے والی میں مجذوب پیر کاکے شاہ کے پاس لے گیا۔ وہاں غرض مندوں اور حاجت مندوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ نذرانے تو ایک مائی سمیٹ لیتی جب کہ لوگ پیر صاحب کے نزدیک ہوتے تو وہ ان سے دور بھاگتے۔ کبھی دو چار کو تھپڑ یا ٹھڈے بھی لگا دیتے۔ جو تھپڑ ٹھڈے کھا لیتے ان کو لوگ بشارت دیتے کہ بس ان کا کام ہو گیا اور اب وہ فارغ ہیں۔ کوئی دو گھنٹے پیر صاحب نالہ ایک کے پانی میں کھڑے رہے۔ جب وہ پانی سے نکلے تو محمد شفیع کی ہدایت کے مطابق میں آگے ہوا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میں ان کے تھپڑوں سے فیض یاب ہوا۔ لیکن وصالِ یار کی کوئی صورت پھر بھی پیدا نہ ہوئی۔ رشتے داروں کا ایک وفد چچا اور ماموں سمیت اس ”عفیفہ کے ہاں سے ناکام واپس آ گیا۔

آفرین ہے محمد شفیع پر وہ مجھے لئے لئے پھرتا رہا۔ کبوتر اور طوطے کے لہو سے لکھے' سنسان قبرستان میں دفنائے گئے تعویزوں اور آدھی رات کے وقت ایک ٹانگ پر بہتے پانی میں کھڑے ہو کر کیے گئے وظائف بھی دیندار پھوپھا کے دل کو نرم کرنے میں ناکام رہے۔ دعاؤں کی بھی قبولیت نہیں ہوئی۔

☆☆

ابھی میں اپنی کوششوں سے تھکا نہیں تھا۔ جنوں کی یہ کیفیت طاری تھی کہ ماں کے میکے میں ان کے تایا زاد بھائی کے بیٹے کی شادی آ گئی۔ لطیف میرا ہم جماعت تھا اور ورنیکلر مڈل

کرنے کے بعد وہ دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ میں دینی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ برات سمہ سٹہ نامی ریل گاڑی پر گوجرہ منڈی پہنچی جہاں سے ہمیں اکوں پر بیٹھ کر منصور والی نامی گاؤں جانا تھا۔ وہاں ہاکروں نے شور مچا رکھا تھا کہ ''میٹرک کا نتیجہ آ گیا۔ میٹرک کا نتیجہ آ گیا'' میرے ماموں نے اخبار خریدا تو اس میں میرا بھی رول نمبر تھا۔ میں درجہ دوم میں پاس ہوا تھا' تاہم میرے نمبر درجہ اول سے چند ہی کم تھے۔ پاس ہونے کی خوشی بھی تھی لیکن چند نمبروں کی کمی سے مجھے دکھ ہوا۔ ماموں کے لئے یہ بھی بڑی بات تھی کہ میری محنت ٹھکانے لگی تھی۔ تمام براتیوں نے مجھے اور میرے ماموں کو مبارک باد دی۔ کچھ میں بھی خود ترسی کے سحر سے باہر آیا۔

نتیجے کی وجہ سے میں سارے ہجوم میں منفرد تھا۔ میں سعیدہ کے علاوہ بھی کچھ سوچنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ میں منصور والی کے نئے ماحول میں گم ہوتا چلا گیا۔ ریت کے ٹیلے' اونچی نیچی سطح زمین' بہتے کھال' آباد شدہ زمینوں پر کھڑی فصلیں اور بنجر زمین پر آک اور پیلو کے درخت اور آک کی جھاڑیاں میری توجہ کا مرکز بن گئیں۔ برات نے رات بھر وہاں قیام کیا اور اگلے دن واپسی ہوئی اب کے سفر دن کا تھا' لہٰذا میں ریل گاڑی سے باہر اردگرد کے مناظر میں کھویا رہا اور مجھے یکا یک احساس ہوا کہ دنیا بہت وسیع ہے اور اب میں میٹرک بھی کر چکا ہوں' مجھے سرکاری ملازمت اور مدرسی بھی مل سکتی ہے۔

واپسی پر میں اپنے اسکول گیا۔ وہاں سے پروژنل سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ پھر سیدھا وزیر آباد گیا اور اس کی نقول ٹائپ کروائیں۔ چچا نے ایک دو نقول اپنے ماموں زاد بھائی شفیع فاروقی کو' جو لاہور کارپوریشن میں ہیڈ کلرک جنرل تھے کو میری ملازمت کا بندوبست کرنے کے لئے بھیجیں۔ میں اس سے قبل بھی چچا فاروقی سے مل چکا تھا۔ اپنے ابا کا خریدا ہوا سن پورہ لاہور میں پلاٹ بیچنے کے لئے میں نے اپنی ماں کے ساتھ ۱۹۴٦ء لاہور آیا تھا اور سودا چچا فاروقی ہی نے طے کرایا تھا۔ چند اور لوگوں کو بھی درخواستیں بھیجی گئیں۔

☆☆

برطانوی سامراج اور ہندو رام راجیوں کی تمام تر سازشوں کے باوجود پاکستان ۱۴ اگست ۴۷ء کو منصۂ شہود پر ابھرا۔ مسجدیں آباد اور دل شاد تھے۔ گاؤں میں حکیموں کی حویلی میں واحد ریڈیو تھا جس پر سارے گاؤں نے کان لگا رکھے تھے۔ اللہ اکبر' جل جلالہ کی صدائیں اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہی منزلیں تھیں' وہی کارواں تھے لیکن سب کچھ بدلا

بدلا نظر آ رہا تھا۔

انگریز بہادر نے برصغیر کی تقسیم تو مان لی تھی مگر وہ مسلمانوں کی خوشی برداشت نہیں کر پایا تھا۔ بد دیانت ریڈ کلف نے پنجاب کی تقسیم میں جو لکیر کھینچی وہ خونی لکیر بن گئی۔ مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم سے ابلیس رقص کر اٹھا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین پر خون کا ایک چھٹا دریا بہہ نکلا۔ پھر بھی ہم سوچتے تھے کہ شہیدوں کے خون سے مستقبل کی روشنی پھوٹے گی پھر اجالا پھیل جائے گا۔ یہ اجالا صدیوں طاری رہنے والی تاریک رات کے بطن سے جنم لے ہی چکا ہے۔ اس دوران وادی کشمیر سے مہاجرین آنا شروع ہو گئے۔ ہم ان کو بھی سنبھال رہے تھے۔

اس افراتفری میں لاہور سے چچا فاروقی کا خط ملا کہ لاہور میں ملازمت میری منتظر ہے۔ واہ سبحان اللہ! یہ پاکستان ہی کا فیضان تھا۔ پیارا پاکستان میری قسمت کی طرح لاکھوں مسلمانوں کی قسمتیں بدلنے ہی کے لئے بنا ہے۔ میں گھر سے اجازت لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ گاڑیاں اکا دکا آ جا رہی تھیں۔ وزیر آباد جنکشن پر سناٹا تھا۔ جانے گاڑیاں کہاں رک گئی تھیں۔ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ہندو سکھ عملہ چونکہ بھارت چلا گیا ہے اس لئے دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ریل کار فوجی دستہ لئے راولپنڈی سے آئی ہے اور اب لاہور کو روانہ ہونے والی ہے۔ میں نے ریل کار کے انچارج میجر صاحب سے لفٹ مانگ کر اس پٹرولنگ ریل کار پر لاہور آ گیا۔

لاہور میں کیلوں والی سڑک (برانڈرتھ روڈ) پر چاندنی بلڈنگ کو تلاش کر کے میں اپنے دوست بوشے کے پاس پہنچا۔ بوشے کی بہن اس عمارت کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی اور ان دنوں گاؤں گئی ہوئی تھی۔ بوشے نے مجھے جوش خروش سے خوش آمدید کہا۔

یہ اٹھارہ اگست ۱۹۴۷ء کی رات تھی۔ رات گئے بوشے کہیں باہر چلا گیا۔ اس نے لاہور شہر میں ہونے والے فسادات اور انتقال آبادی کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر کسی دکان سے گھڑیوں کے فیتے چوری کیے تھے۔ رات کے اس سمے وہ انہی کو ٹھکانے لگانے گیا تھا۔

میں زندہ دلوں کے شہر لاہور میں تھا۔ میرے ابا نے بھی اپنی زندگی کے کئی سال اسی شہر میں گزارے تھے۔ ان کے حوالے سے میں مولانا عبدالمجید سالک سے بھی ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگلی صبح میں ٹاؤن ہال گیا چچا فاروقی سے مل کر بجلی کے محکمے میں میٹر کلرکی کا حکم نامہ تقرری لیا اور بھارت بلڈنگ کی تلاش میں نکلا۔ چلتے چلتے تھک گیا تو میکلوڈ روڈ اور ہال روڈ کے سنگم پر

کھڑے ایک ٹانگے والے سے پوچھا: ''بھئی مجھے بھارت بلڈنگ جانا ہے۔'' اس نے کہا: ''بیٹھو۔ بارہ آنے ہوں گے۔'' میں ٹانگے پر بیٹھ گیا۔ چند قدم چل کر اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ یہ بھارت بلڈنگ ہے' اسی میں بجلی کا دفتر ہے۔ میں حیران ہوا اور احتجاج کیا: ''بھائی! خدا کا خوف کرو' پاکستان بن گیا ہے تم مجھے بتا سکتے تھے کہ چند قدم پر تو بھارت بلڈنگ ہے۔''

وہ کوئی اکھڑ کوچوان تھا۔ بولا میں نے طے کر کے کرایہ لیا ہے اور ایسا کرنا کوئی جرم نہیں' تمہیں کرایہ منظور نہیں تھا تو ٹانگے پر نہ بیٹھتے۔''

یہ دھوکا کھانے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ نو دن تک میں لاہور کا مشاہدہ کرتا رہے ہندوؤں کی نقل مکانی کے بعد لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی کو محکمہ پبلک ورکس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ میں دو روز کے لئے واپس گاؤں جانا چاہتا تھا تا کہ گھر والوں کو بتا سکوں کہ میں کس قسم کے شب و روز میں ہوں۔ میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اور بوشے نیند میں ڈوبا خراٹے لے رہا تھا۔

☆☆

لاہور میں ان دنوں بازار اور محلے سنسان دکھائی دیتے تھے۔ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر اور غلاظتوں کے انبار لگے تھے۔ شاہ عالمی بازار کے اندر ایک زمین بوس مکان کی کھڑی دیوار پر آویزاں ایک گھڑیال ہنوز درست وقت دے رہا تھا۔ ایک تنگ و تاریک سے کوچے میں لوہے کے باٹوں سے کوئی بادام توڑ رہا تھا اور شاید وہ ان کی گریاں بھی اکٹھی نہ کر سکا تھا اور بھاگ نکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چیونٹیوں نے بادام کے بھورے چھلکوں میں نقب لگا کر اندر سے سفید گریاں کھالی تھیں کھلی بادام گریاں دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا لیکن ایک ہی چھلکے نے حقیقت واضح کر دی.......... بیچارا ہندو۔ بعض گلی کوچوں سے لاشوں کے گلنے سڑنے کی بو آتی تھی۔ ان تنگ و تاریک کوچوں میں گھستے ڈر لگتا تھا لیکن میری ڈیوٹی ہی ایسی تھی۔ مجھے ہر میٹر کی ریڈنگ لینی تھی۔ جہاں تک بجلی کی تاریں جا رہی تھیں میں نے وہاں تک جانا ہی تھا۔ میں یہ سب کچھ ذہن سے نکالنا چاہتا تھا۔ بھیانک یادوں سے فائدہ؟ اس دوران بوشے نے کروٹ لی اور کسی کو گالی دے کر پھر سے خراٹے لینے لگا۔

مجھے ریلوے اسٹیشن کی فضا یاد آئی۔ مہاجرین کے خیموں میں غلاظت کے ڈھیر تھے۔ لٹے پٹے انسانوں کا سیلاب امڈا آ رہا تھا۔ رضا کار اور حکومت کے اہلکار ان کی بہتری اور آبادکاری کے لئے مناسب اقدامات کر رہے تھے لیکن ایسے بدنہادوں کی بھی کمی نہیں تھی جو لٹے

پٹے قافلوں میں جوان خواتین کو گھورتے تھے۔ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور چوری چھپے وہ سب کچھ کر رہے تھے جس پر ان کے ضمیر تو ملامت کرتے ہوں گے لیکن وہ بدی کی عادتوں سے مجبور تھے۔ اور تو اور وہ مہاجرین کے لئے تیار کردہ دال روٹی اپنے گھروں میں لے جانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

گاؤں جانے کے لئے اگلی رات مجھے اسٹیشن پر گزارنا تھی۔ یہ مشورہ مجھے بوشے نے دیا تھا کیونکہ کوئی پتا نہ تھا کہ کب گاڑی آ جائے۔ وہ مجھے ایک چھابڑی والے کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ پلیٹ فارموں پر سناٹا تھا۔ جو گاڑی بھارت کی طرف سے آتی وہ سناٹے کو خوفناک حد تک بڑھا دیتی۔ اس میں سے ایسی مائیں اور بہنیں چیختی، روتی پیٹتی اترتیں جن کے بھائی، شوہر اور باپ سرحد کے اس پار بھالوں، تلواروں، کرپانوں اور گولیوں سے مار ڈالے گئے تھے، معصوم بچوں کے خون کے دھبے ریل کے ڈبوں کی دیواروں پر نمایاں تھے۔ یوں لگتا ہم اسٹیشن پر نہیں کسی مذبح خانے یا سنڈاس کی دیوار پر کھڑے ہیں۔ گاڑی کی آمد کے ساتھ ہی بو سی پھیل جاتی۔ اسے جلدی جلدی خالی کر کے دھونے کے لئے لے جایا جاتا۔ الامان۔ الحفیظ

میں ایک گاڑی کی چھت پر سوار ہو گیا۔ یہ گاڑی قصور کی طرف سے آئی تھی اور اب راولپنڈی کی سمت جا رہی تھی۔ یہ بھی مہاجرین سے کھچا کھچ بھری تھی۔ راستے میں کامونکے کے اسٹیشن پر میری گنہگار آنکھوں نے کئی ستی ساوتریاں بھی اسی انجام سے دو چار پائیں جو بتول بننے کی خواہش رکھنے والی نیک شعار بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں پر وارد ہوا تھا۔

☆☆

ماں کے لئے یہ بڑی بات تھی کہ اس کا بیٹا اسی روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا ہے۔ ماں نے تیسری بار پھر میرے ماموں اور چچا کو اس لڑکی کے والدین کے پاس بھیجا تھا جس نے مجھے موتیوں والا سرہانہ اور پھولدار چادر والا بستر دیا تھا۔ لیکن وہ ناکام ہی لوٹے تھے۔ اب کے بزرگ پھوپھا نے یہ کہا تھا کہ ان کے اور ہمارے درمیان عقیدے کا فرق ہے (وہی نور، بشر کا جھگڑا) اس لئے یہ رشتہ نہیں ہو سکتا، حالانکہ یہ فرق میری پھوپھی اور پھوپھا کے درمیان بھی تھا۔ پھوپھی نے گزر بسر کرنے کے لئے پھوپھا کا عقیدہ تسلیم کر لیا تھا مگر اب یہ بزرگ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی میرے عقیدے پر آمنا و صدقنا کہے۔ یہی نہیں ان نو دنوں میں ایک اور حادثہ بھی ہوا تھا۔ پھوپھو کے ہاں سے ناکام واپس آنے پر اسی رات ماموں نے ماں کے ایما پر

چچا سے کہا تھا کہ آپ کے ہاں بھی لڑکیاں ہیں۔ کیا اچھا نہ ہوگا کہ گھر کا رشتہ گھر ہی میں رہے۔ اس پر چچا نے ماموں سے کہا تھا: ''فضل احمد، تمہارا منہ چھوٹا ہے لیکن تم نے بات بڑی کی ہے۔''

میں نے یہ سب کچھ سنا تو میرے پندار کو ٹھیس لگی کہ ماں کیوں اپنی سبکی کرا رہی ہے، کیوں ماموں کو آزمائشوں میں ڈال رہی ہے؟ آخر اسے میری شادی کی اس قدر فکر کیوں ہے؟ میں نے ماں سے کہا کہ اب وہ سال بھر میرے رشتے کی بات نہیں کرے گی۔ مجھے ذاتی طور پر جو دکھ ہوا تھا اس کے باعث میں رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ ماں کو شاید یہ وہم ہو گیا تھا کہ اس کے بیٹے شاید عمر بھر کنوارے ہی رہیں گے۔ اس کے میکے کے رشتہ داروں میں ایک ایسی مثال موجود تھی کہ یتیمی کی وجہ سے دو بھائیوں کی عمر بھر شادی نہیں ہوئی تھی۔

میں گاؤں سے واپس لاہور آیا تو بوشے کی بہن آ چکی تھی، لہٰذا مجھے اپنا ٹھکانا کہیں اور تلاش کرنا تھا۔ میں اپنے گاؤں ہی کے حاجی رمضان کے پاس گیا جو دل محمد روڈ پر واقع عنایت بلڈنگ کے مختارِ خاص تھے۔ انھوں نے جوتے بنانے والوں کی ایک کرایہ پر اٹھائی گئی دکان کے عقبی حصے میں رات گزارنے کے لئے میری چارپائی اور بستر لگوا دیا۔ کرایہ چار روپے ماہوار طے ہوا۔ رفع حاجت کے لئے میٹروپول کے کونے کھدرے تلاش کرنے پڑتے۔ رات کو تو یہ کام آسان ہوتا لیکن اگر کبھی دن کو ضرورت پڑ جاتی تو مساجد کے طہارت خانے ساتھ دیتے۔ میں دیہاتی ماحول میں پلا ہوا لڑکا تھا، مجھے گرمیوں میں کمرے کے اندر سونے کی عادت نہ تھی اس لئے میں دکان کے بیرونی پھٹے پر اپنا بستر جماتا اور سو رہتا۔ یہ پھٹہ سڑک سے چار پانچ فٹ اونچا تھا۔ ایک رات میں پھٹے سے گر گیا۔ دل اتنا کھٹا ہوا کہ اگلی شام میں اپنے خالہ زاد کانسٹیبل بھائی کے پاس ریلوے پولیس لائن میں چلا گیا۔ سارے سپاہی فرش پر سوتے اور میس سے دال روٹی کھاتے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس بھائی کا تبادلہ والٹن ہو گیا اور میں پھر ٹھکانہ تلاش کرنے لگا۔

میں سرکاری ملازم تو تھا ہی۔ انتقالِ آبادی کے بعد حکومت نے مضافات اور دیگر علاقوں سے آنے والے سرکاری ملازموں کو عارضی طور پر متروکہ مکان الاٹ کرنے کی سکیم نافذ کی۔ میں نے بھی راوی روڈ پر قلعہ لچھمن سنگھ میں کسی پرتاپ کور نامی سکھ خاتون کا مکان الاٹ کرا لیا۔ مکان کیا ملا زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔

یہاں میری آشنائی عارف نامی ایک نوجوان سے ہوئی۔ میں حیران ہوا کہ اس کا

مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ وہ مجھے پانچ آنہ کلاس میں فلم دیکھنے کی دعوت دیتا۔ فلسفہ یہ تھا کہ وہ دس آنے والی کلاس کا عادی تھا۔ مجھے نواز نے کی خاطر وہ پانچ پانچ آنے کے دو ٹکٹ خرید لیتا۔ ناولوں، افسانوں اور غزلوں پر بحثیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے کالجوں میں مباحثے سننے بھی لے جاتا۔ اس کی رفاقت میں، میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ ذہن کے افق پھیلتے گئے۔ مجھے گھر گھر جا کر میٹر پڑھنے کی نوکری سخت گراں گزر رہی تھی۔ میں نے کسی کے مشورے کے بغیر وہ نوکری چھوڑ دی اور محکمہ صحت میں ان آکولیٹر (ٹیکے لگانے والا) بھرتی ہو گیا۔ تربیت والٹن مہاجر کیمپ میں کی اور پھر ہیلتھ افسر سیالکوٹ کے یونٹ میں تبادلہ کرالیا۔ چھ ماہ بعد محکمہ صحت نے تمام ان آکولیٹر فارغ کر دیے تو میں ایک بار پھر بیکار ہو گیا۔ لاہور میں جو متروکہ مکان میں نے سرکاری ملازم کی حیثیت سے الاٹ کرایا تھا وہ میں نے پاکستانیت کے جذبے سے شملہ کے ایک مہاجر کو دے دیا جس نے متعلقہ محکمے سے اس کی باقاعدہ الاٹمنٹ حاصل کر لی۔ اس تگ و دو میں عارف بھی کھو گیا۔

☆☆

اب میں نے خود ہی چچا فاروقی کو خط لکھا کہ میں نے محکمہ بجلی کی نوکری کیوں چھوڑی اور محکمہ صحت نے مجھے کیسے سبکدوش کر دیا۔ فاروقی چچا اس دوران میں ترقی کر کے کارپوریشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری ہو چکے تھے۔ انھوں نے مجھے کارپوریشن کے دفتر ہی میں جونیئر کلرک کی آسامی پر تعینات کر دیا۔ میرے سیکشن میں ایک مسٹر لال مسیح بھی تھے انھوں نے میرا تفصیلی انٹرویو کیا۔ لال مسیح چچا فاروقی کے بڑے بھائی چچا سعید بلدیہ وزیر آباد کے سیکرٹری کی سفارش پر کارپوریشن میں تعینات ہوا تھا۔ وہ کشمیری دروازے کے باہر ''قاضی کی کٹڑی'' میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی رہائش میں حصہ دار بنالیا۔ کمرے میں ہم پانچ ''چھڑے'' ہی رہتے تھے۔ کرایہ فی کس دو روپے پڑتا جس میں مشترکہ نل سے پانی اور ایک ساٹھ واٹ کے بلب کی روشنی بھی شامل تھی۔

کیا وقت تھا۔ سردیوں میں راہداری نما کمرے میں سوتے۔ گرمیوں میں بادامی باغ جانے والی سڑک پر چارپائیاں ڈال لیتے۔ آدھی رات گزرتی تو غلاظت بھر بیل گاڑیاں اس سڑک سے گزرنے لگتیں۔ ہر سو تعفن پھیل جاتا۔ ہم چارپائیاں اٹھا کر اندر آجاتے۔ صبح ہوتی تو کشمیری دروازے میں داخل ہوتے اور بھاٹی دروازے میں آنکلتے۔ پھر لوئر مال سے ہوتے

ہوئے ٹاؤن ہال پہنچ جاتے۔ روزانہ کی یہ آمدورفت اس زمانے میں ہمارے لئے بار نہ تھی۔

☆☆

قاضی کی کٹڑی میں ہی میری ملاقات عنایت علی ہاشمی سے ہوئی جو ایک پڑھا لکھا فاضل آدمی تھا۔ محکمہ ٹیلی گراف کی انجینئرنگ سروس میں تھا۔ معقول تنخواہ لیتا تھا۔ اس کی بیوی کٹڑی کے مالکان کی لڑکی تھی جو انتقال کر چکی تھی۔ دو بچے تھے جو ننھیال ہی میں رہتے تھے۔ تنخواہ کا کچھ حصہ وہ دونوں بچوں کے اخراجات کے کھاتے میں ان کی ننھیال کو دے دیتے' باقی میں ان کی چائے اور سگریٹ چلتے۔ کھانا بھی کھاتے ہوں گے مگر کم کم۔ ہاشمی صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم تعلیم یافتہ لگتے ہو۔ تمھاری گفتگو معلومات سے پُر ہوتی ہے۔ تم لال مسیح' ڈھونڈ' رمضان خان اور جوگی کے ساتھ مل کر کیسے رہتے ہو؟ میں نے کہا یہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ صرف دو روپے کرایہ دینا پڑتا ہے۔ ان کا اپنا کوارٹر بیس روپے کرائے کا تھا۔ پہلے ایک اور شخص ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اب وہ اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ کمرے بھی دو تھے۔ انھوں نے کہا یہ بات ہے تو میرے ایک کمرے میں آ جاؤ۔ کوئی کرایہ نہیں ہوگا۔

اس سالم کمرے میں رہائش بڑی سکون بخش تھی۔ ہاشمی صاحب اردو اور انگریزی اخبار پڑھتے تھے۔ میں بھی ان کا انگریزی اخبار دیکھنے لگا۔ انھوں نے ایک دن کہا: "میرے ہاں جو بھی شخص میری بیوی کی وفات کے بعد ٹھہرا ہے' میں نے اسے یہاں سے کچھ بنا کر ہی بھیجا ہے۔ حال ہی میں جو شخص گیا ہے' وہ میٹرک پاس آیا تھا۔ میں نے دو سال میں اسے بی۔ اے کرایا اور اب وہ نائب تحصیلدار ہو کر یہاں سے گیا ہے۔" میں نے کہا: "یہ نظر کرم مجھ پر بھی ڈالیں۔" انھوں نے مجھے منشی فاضل کرنے پر لگا دیا۔ میں نے دسویں میں فارسی پڑھی تھی' لہٰذا ۱۹۵۰ء میں میں نے منشی فاضل کر لیا۔ اگلے سال صرف انگریزی میں ایف اے اور ۱۹۵۲ء میں بی۔ اے کر لیا۔

اس دوران میں' میں نے بھرپور غیر رسمی تعلیم بھی حاصل کی۔ کارپوریشن میں ملازمت ہونے کی وجہ سے مجھے بلدیہ لائبریری شاہ محمد غوث سے استفادے کی سہولت حاصل تھی اور میں نے ملک فتح شیر خان لائبریرین سے اسسٹنٹ سیکرٹری فاروقی صاحب کا بھتیجا ہونے کی وجہ سے دوستی پیدا کر لی۔ ملک صاحب ڈوڈھی والی چائے کے بھی عادی تھے۔ میں ان کے لئے چائے منگوانے کو ان کے چپڑاسی سے کہتا تو وہ اسے بند مکھن لانے کی بھی تاکید کرتے۔ کبھی

کبھار وہ مجھ سے راشن کے لئے سات آٹھ روپے بھی مانگ لیتے۔ مجھے ایسا کرنا پڑتا اس لئے کہ وہ بیک وقت دو کتابوں کے بجائے مجھے دس دس بیس کتابیں بھی جاری کر دیتے تھے۔

میرے میٹرکلرکی کے زمانے کے واقفان میں سے ایک مسٹر بیگ تھے۔ وہ مجھے اردو ناول پڑھتے دیکھ کر اکثر کہا کرتے: ''کبھی کوئی انگریزی کا ناول پڑھ کر بھی دیکھو'تم حیران رہ جاؤ گے۔ اردو ناولوں میں کیا رکھا ہے؟'' میں انھیں اپنی کمزوری نہ بتاتا کہ میں انگریزی ناول سمجھ ہی نہیں سکتا۔ شاہ محمد غوث لائبریری سے میں نے پہلی مرتبہ انگریزی ناول ''میئر آف کیسٹر برج'' لے کر پڑھا تو واقعی مجھے بیگ کی بات سچ لگی۔ اس کے بعد میں اردو کے علاوہ انگریزی کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرنے لگا۔ ہاشمی صاحب نے میری ذہانت کو صیقل کیا۔ خدا مغفرت کرے ایسا محسن پھر نہیں ملا۔

☆☆

جس زمانے میں' میں بی اے کر رہا تھا تو میں قاضی کی کٹڑی سے اپنی رہائش تبدیل کر کے چوک وسن پورہ میں آ گیا تھا۔ وہاں بیس روپے ماہوار پر ایک عمارت (نچلی منزل) کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ میرا روزمرہ کا معمول یہ تھا کہ میں اذان فجر کے ساتھ بیدار ہوتا۔ اور نماز پڑھتا۔ ان دنوں میں فجر ہی کی نماز پڑھا کرتا تھا اور وہ بھی شاید اس لئے کہ میں نماز سے فارغ ہو کر کپڑے کے ایک تاجر کو انگریزی پڑھانے پر مامور تھا۔ میں وسن پورہ کے چوک ناخدا سے سائیکل پر چلتا اور دہلی دروازے کے پاس مقیم تاجر کو ایک گھنٹہ انگریزی پڑھاتا۔ فارغ ہو کر کہیں سر راہے ناشتا کرتا اور دفتر چلا جاتا۔ دفتر سے وقت نکال کر باغیچے میں بیٹھ کر خود پڑھتا۔ چھٹی ہونے پر سیدھا گڑھی شاہو ریلوے کالونی پہنچتا اور ایک ریلوے ٹریفک انسپکٹر کے بچوں کو پڑھاتا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ بچوں میں ایک بچی تھی جو تیسری جماعت میں ہی اردو اخبار پڑھ سکتی تھی۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔

وہاں سے ریلوے پل عبور کر کے باغبان پورہ والی سڑک پر نمک کے ایک سوداگر کے دو نالائق بچوں کو پڑھاتا۔ وہ پڑھنے کی نسبت مجھ سے باتیں کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں وسن پورہ اپنی قیام گاہ پہنچتا جہاں میں نے دو کمروں میں نیشنل ہائی سکول کھول رکھا تھا۔ یہ ایک ٹیوٹوریل سکول تھا' چند بچے آ جاتے تھے۔ دس بجے رات سکول بند ہوتا تو میں یا تو بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کرتا یا پھر افسانہ نویسی یا مضمون نویسی میں دل کی باتیں

لکھتا۔ نہ جانے کیا جنون تھا کہ بی۔اے کرنے سے پہلے ہی میں مولانا عبدالمجید سالک سے مل کر ''سرخ سویرا کیا ہے؟'' اور ''پاکستان کیسی نعمت ہے؟'' کے عنوانات سے دو مضامین روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع کرا چکا تھا۔

کچھ دن میں نے انقلاب میں خبر سازی کی تربیت میں بھی گزارے۔ میاں افتخار الدین جو وزیر تھے سے بھی مل چکا تھا۔ بس مجھے کسی وزیر سے ملنے کا شوق تھا اور مولانا سالک نے میرا یہ شوق پورا کرایا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے چکر بھی لگاتا تھا۔ کارپوریشن کے ادیبوں اور شعرا نے ایک ''بزم ادب'' بھی بنا رکھی تھی جس کا ہفتہ وار اجلاس اتوار کے دن ہم اسٹینڈنگ کمیٹی کا کمرہ کھلوا کر کرتے۔ اسی بزم ادب کے طفیل میرا تعارف کارپوریشن کے کئی برتر عہدوں کے افسروں سے بھی ہوا۔

وسن پورے میں وہ کاتب رہتا تھا جو میرے والد مرحوم کو جانتا تھا۔ اس کا بچہ میرے پاس پڑھتا تھا اور وہ خود ان دنوں فلم ڈائریکٹر محبوب کے فلمی رسالے ''گل وخار'' کا خوشنویس تھا۔ مدیر نصیر عریبین تھے۔ اس نے میرے افسانے پے در پے ''گل وخار'' میں شائع کرائے۔ نصیر عریبین کے بعد ظہیر احمد نقش مدیر ہوئے وہ بھی کسی وجہ سے رسالہ چھوڑ گئے تو مذکورہ ''کاتب صاحب'' نے مجھے مدیر مقرر کرا دیا لیکن طباعت کے جملہ شعبوں سے ناواقفیت اور کارپوریشن میں جونیئر کلرک ہونے کی وجہ سے میں محبوب صاحب کی نظر میں نہ جچا اور ایک ہی شمارے کے بعد انھوں نے میری ادارتی خدمات سے استفادہ کرنے سے انکار کر دیا' البتہ لکھتے رہنے کو کہا۔

☆☆

قارئین نے شاید میری رہائش کے بارے میں تسلسل ٹوٹتا محسوس کیا ہو۔ میں کٹڑی قاضیاں سے یکا یک وسن پورہ کیوں پہنچا! جی ہاں' میں ہاشمی صاحب کے طفیل ہی کٹڑی قاضیاں کے قریب ایک ایسی لڑکی کو میٹرک کی ٹیوشن پڑھا رہا تھا جو اپنے تین عدد بھائیوں کے ساتھ دادا دادی کے پاس رہتی تھی اور جس کا باپ بیرون ملک انجینئر تھا۔ شاید آبادان' ایران میں تھا۔ اس لڑکی نے کتابوں کے اوراق میں چھوٹے چھوٹے جملے محبت کے موضوع پر لکھ کر میری سمت پھینکنے شروع کر دیے تھے۔ وہ صبح کا ناشتا بھی کرواتی تھی کیونکہ تدریس کا وقت دفتر جانے سے پہلے کا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ یہ فضول حرکات نہ کرے۔ میری منگنی ہو چکی ہے اور میں خالی اور دستیاب نہیں ہوں۔ لڑکی نے شاید دادا دادی سے بات کی اور ان سے کہہ دیا کہ وہ اپنے

ماسٹر سے شادی کرے گی یا ممکن ہے کوئی اور بات ہوئی ہو لیکن شام کو بڑے میاں (اس کے دادا) روتے ہوئے میرے پاس کٹڑی میں آئے اور مجھ سے ملتجی ہوئے کہ میں ان کے ہاں اب پڑھانے نہ آؤں اور ان پر احسان کروں تو یہ علاقہ ہی چھوڑ جاؤں ورنہ ان کی پوتی ان کو گلی محلے اور برادری میں ذلیل کرے گی۔ وہ بے بس بھی ہیں کیونکہ ان کا بیٹا جو رنڈوا ہے بیرون ملک سے ڈرافٹ بھی لڑکی کے نام بھیجتا ہے۔ میں نے اخلاقی اقدار کے متعلق جو کچھ پڑھا تھا اس کا تقاضا تھا کہ میں بڑے میاں کی بات نہ ٹالوں' چنانچہ میں نے فوراً ان کی بات مان لی۔ دفتر کے ایک ٹیکس انسپکٹر نے مجھے بیس روپے ماہوار پر وہ جگہ کرائے پر لے دی جس پر میں نے نیشنل ہائی سکول کو بورڈ لگا دیا اور یوں چٹائی ٹیوٹوریل سکول کھل گیا۔

☆☆

اس سے پہلے آپ نے میری "حکایت جنوں" پڑھی ہی ہے اب اس سلسلے میں ایک اور حادثہ ہوا۔ ننھیال میں ماموں کے ایک دوست تھے۔ وہ خاندانی مولوی اور خطیب جامع مسجد ہونے کے علاوہ طبیب بھی تھے۔ خاندانی طور پر ان کی شرافت اور نجابت کا بڑا شہرہ تھا کیونکہ ان کے والد صاحب اپنے دور کے نامور خطیب اور عالم تھے۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو جب میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا اور اس روز میں ماموں زاد کی برات میں شامل ہوا تھا۔ حکیم صاحب بھی اس برات کے براتی تھے۔ انھوں نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ ماموں سے میری کچھ انفرادی خصوصیات کے بارے میں باتیں بھی کیں اور پھر انھیں خوشخبری دی کہ اگر برخوردار کی کہیں شادی کا معاملہ طے نہیں ہوا تو وہ اپنی صاحبزادی کا رشتہ اس سے کرنے کو تیار ہیں۔

ماموں نے اپنی طبعی شرافت کے پیش نظر اس پیشکش کو اپنی عزت افزائی اور میرے بھائیوں اور ماں کے لئے دائمی بھلائی سمجھا اور حکیم صاحب کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ ماموں اور ماں نے حکیم صاحب کے سامنے ہاں کر دی۔ جب ماموں یہ خوشخبری سنانے لاہور تشریف لائے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر ابھی تک موتیوں والے سرہانے اور پھولدار چادر والی دوشیزہ کی یاد سلگ رہی ہے' تاہم مجھے اس بات پر بھی اچنبھا ہوا کہ وہ کون عجیب شخص ہے جو مجھے ایک بار ہی دیکھنے کی وجہ سے اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ تب ایک کھوکھلا سا احساس برتری میرے اندر جاگا۔ میں نے ماموں سے کہہ دیا کہ میں آپ لوگوں کا فیصلہ کبھی بھی رد نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔

کارپوریشن کی ملازمت کرتے اور وسن پورہ میں رہتے ہوئے میں اسی کوشش میں تھا کہ کچھ رقم جمع کرسکوں تاکہ حکیم صاحب کی بیٹی کو اپنے گھر لاسکوں۔ ماں کی تنہائیاں ختم ہوں اور گھر کے کام کاج سے بھی اسے ذرا سکون ملے۔

وقت کے رندے نے مجھے ہموار کرنا شروع کر رکھا تھا۔ لوگوں سے میل جول' آشناؤں اور واقف کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد' لاہور شہر کی زندگی کے نشیب و فراز' وطن عزیز پاکستان کی سیاسی' سماجی اور اقتصادی رفتار' ذوق مطالعہ' اونچ نیچ کی تمیز' غربت و امارت کے مناظر غرض زندگی کے ہر پہلو نے مجھے متاثر کر رکھا تھا۔ ایک طرف معاشیات میں بڑا نام پانے والا شیخ منظور احمد رات کو میرے ساتھ بی۔ اے کے بارے میں بات چیت کرتا جبکہ بابو وحید مجھے رات کو ہوٹل سٹینڈرڈ' میٹرو اور فلیٹی میں لے جاتا جہاں ڈیڑھ روپے کی چائے پر نیم عریاں رقاصائیں تین چار بار "ٹی ڈانس" پیش کرتیں۔ فلیٹی میں غیر ملکی رقاصاؤں کے ناچ ڈنر پر ہوتے۔ یہ مسحور ہونے کا زمانہ تھا لہٰذا میں مسحور ہو کر رہ جاتا۔ عذرا پشاوری' اینجلا اور اولگا بجک کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ ہاشمی صاحب انگریزی فلمیں دیکھنے کے شوقین تھے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر فلم دیکھتے تاکہ بحث مباحثہ بھی کیا جاسکے۔ وقت اس طور پر طمانیت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ...... ماں نے خط لکھ کر مجھے گاؤں بلایا۔

☆☆

"دہلی چلو...... دہلی چلو...... دہلی چلو۔"

میں لیمپ کی اداس روشنی میں اپنے چھوٹے بھائی کی تختی پر یہی الفاظ لکھ کر اسے تختی پر لکھنے کی اصلاح دے رہا تھا۔ خاکساروں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک عظیم کیمپ دہلی میں لگائیں گے جس میں وہ تقسیم ہند سے پیدا ہونے والی صورت حال میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔ دہلی کیمپ میں دعوت کا ایک اشتہار اخبار میں چھپا تھا۔ میں اسی اخبار سے یہ الفاظ نقل کر رہا تھا۔ میں اس "دہلی چلو" کے نعرے میں جو تاثر تھا' اسے محسوس کر رہا تھا۔ دادا مرحوم کی زندگی میں' میں ان کے دیوان خانے میں خاکساروں کے اجتماعات دیکھتا رہا تھا۔ تب میں بہت چھوٹا تھا لیکن خاکسار تحریک سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے بھی خاکی وردی سلار کھی تھی۔ اخوت کا نشان خرید رکھا تھا۔ بیلچہ دادا سے لیا تھا۔ میں ضد کر کے خاکساروں کی ٹیلے پر ہونے والی مصنوعی جنگوں میں شریک ہوتا۔ جھوٹ موٹ کے زخمی خاکساروں کو پانی لا کر ثواب بھی کماتا تھا۔ خاکسار بھی کیا

تحریک تھی۔ گاؤں کے سب بوڑھے رات کو گلیوں میں "چپ راست" "چپ راست" کرتے۔ ان کی بوڑھی بیویاں اگلے روز تنور پر ان کی باتیں کر کے ہنستیں۔ کوئی ایک راز داری سے بتاتی: "رات اس شرابی حیدر شاہ کو جس نے شراب چھوڑنے کی خاطر خاکساری قبول کی ہے سالار میاں بشیر نے تین درے لگانے کی سزا دی ہے۔" دوسری بتاتی: "اب تو خاکساروں نے عورتوں کو بازار سے سودا لانے سے بھی منع کر دیا ہے اور اب وہ خود یہ کام کر رہے ہیں۔"

مجھے یاد ہے کہ دادا جان خاکسار ہی فوت ہوئے۔ ان کے اثاثوں میں باطل کے خلاف مصنوعی جنگوں کے لئے خریدا ہوا گولہ بارود بھی تھا جو ان کی وفات کے بعد تین سال تک ہر شب برات پر ہم بچے چچا کے ساتھ مل کر پھونکتے رہے۔

ماموں مجھے تختی پر "دہلی چلو" بار بار لکھتے دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر رہے تھے کہ میں خاکساروں کا یہ نعرہ بار بار لکھ کر اس ردعمل کا اظہار کر رہا ہوں جو میرے اندر کی دنیا میں اس غیر متوقع خبر سے ہوا ہے کہ ان کے دوست حکیم صاحب نے میری منگیتر کی شادی، میرے ساتھ منگنی توڑنے کا اعلان کیے بغیر، کسی اور جگہ کر دی ہے۔ مجھے جھٹکا ضرور لگا تھا لیکن اب میں نے اس انداز سے سوچا تھا کہ حکیم صاحب اسکر وائلڈ کے افسانے "فریب دوستی" کے فیاض کردار کی طرح ہیں جس نے گھر کی رکاوٹ دور کرنے کے لئے اپنا ریڑھا دان کر دیا تھا۔ جوان لڑکیاں اکثر بزرگوں کے لئے رکاوٹ ہی ہوتی ہیں۔ حکیم صاحب نے بھی بیٹی کا دان جلدی دے کر سرخروئی حاصل کی تھی۔

ماں کو بھی دکھ تھا۔ اسے شاید مجھ پر ترس آ رہا تھا۔ اور ماموں کو دکھ تو ہونا ہی تھا۔ ان کے دوست نے برسوں کی دوستی کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ دہلی نہ جا سکنے کے باعث خاکسار تنظیم جس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی تھی، میں بھی اس طرح بکھرا بکھرا سا لاہور آ گیا اور "گل وخار" میں ایک افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا: "تین خواب دیکھنے کے بعد۔" اناڑی پن میں افسانے کے کردار اصلی ناموں سے متعارف کرائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند رشتے داروں نے میرا مقاطع کر دیا، جس کا دکھ مجھے کم لیکن میری ماں کو زیادہ ہوا۔

☆☆

میری دنیاوی کامیابیاں دیکھے بغیر اور میری شادی کا ارمان لئے ماموں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھے ان کی ناگہانی وفات پر بڑا دکھ ہوا۔ وہ میرے پاس آئے تھے۔ میں

انھیں میو ہسپتال لے گیا تھا لیکن ڈاکٹروں نے انھوں علاج کے لئے داخل نہیں کیا تھا۔ سفارش چلنے کا رواج چل نکلا تھا۔ میں اقبالؒ کے اس مصرے کا بار بار ورد کر رہا تھا: ''غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے'' جبکہ ہاشمی صاحب نے ملاقات پر کہا: ''بہادر بنو! اور یہ شعر پڑھا کرو

غم جہاں کہ بلا ہو گیا ہے سب کے لئے
اسے میرے سپرد کرو ایک شب کے لئے

۱۹۵۱ء کا شعبان تھا۔ رات چچا ہمارے گھر آئے۔ انھوں نے میری عدم موجوگی میں ماں سے جو بات چیت کی تھی وہ اسے دہرانے لگے۔ انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: '' بیٹے! بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو بچے نہیں سمجھ پاتے' خاص طور پر والدین کی وہ باتیں جو لڑکیوں کے ماں باپ انجانے خطرات کو ٹالنے کے لئے سوچتے اور کرتے ہیں۔ تم اب مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو' باہر کی دنیا میں رہ کر سمجھدار بھی ہو گئے ہو گے۔ زندگی کے تجربات سے بھی کچھ اسباق سیکھے ہوں گے۔ میں شروع ہی سے یہ ارادہ رکھتا تھا کہ تمھیں اپنا بیٹا بناؤں گا لیکن تم ذرا منہ زور تھے۔ اب بھی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم بھٹکے ہوئے نہیں۔ راستوں پر نظر رکھ کر آگے بڑھ رہے ہو۔''

میری ماں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جب بچوں کا باپ نہ رہے تو بیوہ ماں کا رجحان میکے کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ ماموں اور خالائیں زیادہ قابل توجہ ہوتی ہیں۔ ماں لاشعوری طور پر بچوں کو چچوں اور پھوپھیوں سے دور کر دیتی ہے۔ اگر ماں نہ رہے تو باپ اس کے برعکس کردار ادا کرتا ہے۔ میں نے شاید ایسا ہی کیا ہے۔ تمھارے چچا آخر تمھارے ابا کے بھائی ہیں۔ آج جو وہ کہتے ہیں اس سے ان کی نیک نیتی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر نیت میں فتور ہو تو کوئی بھی اپنے بال دوسروں کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔ چچا نے پھر سے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا۔ ایسے شفقت بھرے ہاتھ کے لمس کا مجھے تجربہ نہیں تھا۔ پیار کے دو میٹھے بول ہمیشہ ہی میری کمزوری رہے تھے۔ انھوں نے رواجاً کچھ روپے میرے ہاتھ پہ رکھ دیے۔

واپسی پر میں کئی دن ماضی پر غور کرتا رہا جو ناکامیوں' نامرادیوں' تشنہ کامیوں اور آرزوؤں کا مرقع تھی اور یہ آگہی کی کمی تھی کہ مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ آج میرے بچے مجھے ماضی کی باتیں کرنے پر ٹوک دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو' ماضی کو یاد نہ کیا کریں۔ آپ کا ماضی کوئی قابل فخر ماضی نہیں۔ کیا ہے آپ کے ماضی میں؟ کچھ ان پڑھ رشتے دار' چند لوٹے' چند

تسبیحیں اور چند مصلّے' دھواں اٹی کوٹھڑیاں' سانپ' ہزار پائے' کن کھجورے' حسرتیں' آرزوئیں' ناکامیاں......ملائیت۔

میں ان کو درس دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ میرے ماضی میں دنیا بھر سے قیمتی اثاثہ میری فرشتہ ماں ہے' اس کی قربانی ہے' خلوص بھرے رشتے ہیں' دعائیں ہیں' ادب ولحاظ ہے' اپنی محنت ہے کہ میں گٹر سے نکل کر وکٹری سٹینڈ پر پہنچا ہوا بوڑھا ہوں۔ تم فرش سے اٹھ کر وکٹری سٹینڈ پر نہیں پہنچ سکے۔ بس پھر ہماری ٹھن جاتی ہے' لیکن اب میں نے اپنے آپ کو پابند کر لیا ہے اور خود میں مست رہتا ہوں۔

گرمیوں کا موسم آ گیا تو نیشنل ہائی سکول کی فضا تپ اٹھی۔ میں نے سوچا کہ لاہور کارپوریشن سے چند ماہ کی چھٹی لی جائے اور بی۔اے کے نتیجے کی آمد تک دیہات میں جا بسیرا کیا جائے۔ سو میں نے تین ماہ کی چھٹی کی درخواست دی اور گاؤں میں چچا کو لکھا کہ اب میں ایف۔اے پاس ہونے کی بنیاد پر کسی دیہاتی سکول میں غیر تربیت یافتہ انگریزی معلم تعینات ہو سکتا ہوں۔ آپ کا بابو رحمت اللہ انصاری سے ''واحد معاملہ'' ہے۔ چاول بھی گھر میں ہیں۔ نہ بھی ہوں تو خریدے جا سکتے ہیں۔ میں یکم مئی سے چھٹی لیکر آ رہا ہوں۔ اس سے پہلے مجھے ضلع کے کسی بھی اسکول میں تعیناتی کے احکامات مل جانے چاہئیں۔

میں یکم مئی ۱۹۵۲ء سے چند روز قبل ہی گھر پہنچا تو میری تقرری کے احکامات میری ماں کے پاس موجود تھے۔ مجھے سیالکوٹ کے سرحدی گاؤں باجڑہ گڑھی کے مڈل سکول میں انگریزی مدرس بجائے محمد انور ایم۔اے (رخصتی) کی اسامی پر تعینات کیا گیا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۶)

ایک ماہ سرحدی گاؤں میں

سیالکوٹ سے باجڑہ گڑھی جانے کے لئے راستے کے ایک بڑے گاؤں رسولپور کا تانگہ ملا۔ ڈالووالی کے نالہ ایک کے پل تک سڑک گوارا حالت میں تھی لیکن نالہ پار کرتے ہی کچی سڑک کے گڑھوں اور گردوغبار نے سانس لینا دوبھر کر دیا اور ہچکولوں کی ضربوں نے جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ سائیکل کا سفر بدرجہا بہتر تھا۔ اس سڑک پر بھی سائیکل سوار تانگوں کو پیچھے چھوڑتے آگے گزرے چلے جا رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ مدرسی کے پہلے سفر کے وقت میں بالکل اناڑی تھا اور اب تو میں پورا کھلاڑی ہوں۔ تبھی تو کارپوریشن سے چھٹی لے کر ضلعی بورڈ کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو کر دوہری تنخواہ کا حقدار بن رہا ہوں اس وقت میں ورنیکلر مڈل تھا اب بی۔ اے کے نتیجے کا منتظر ہوں۔ اس وقت ہم برطانوی غلام تھے اب پاکستان کے طفیل آزاد ہیں۔ اس قت انگریز کا وضع کردہ نصاب پڑھانے پر مجبور تھے اب ہم اپنا پاکستانی سلیبس پڑھائیں گے۔ تب میں اپنی تعلیمی قد وقامت اور عہدے کے لحاظ سے باقی مدرسین سے پست تھا۔ اب میری حالت کہیں بہتر تھی۔ باوجود اس کے کہ میں اب بھی غیر تربیت یافتہ معلم تھا لیکن تھا تو انگریزی معلم، میری تنخواہ دیگر جے۔ وی اور ایس۔ وی اساتذہ سے زیادہ تھی۔ انگریزی کی تعلیم نے میری اہمیت کتنی بڑھا دی تھی۔

رسول پور پہنچا تو وہاں سے آگے کے لئے تانگہ ندارد۔ دن بھی ڈوبنے ہی والا تھا۔ میرے پاس ایک درمیانہ سا اٹیچی کیس تھا۔ ایک سائیکل سوار سے میں نے باجڑہ گڑھی تک لفٹ مانگی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کس کے ہاں جانا ہے؟ اس نے یہ جان کر کہ میں باجڑہ گڑھی میں انگریزی مدرس تعینات ہو کر آیا ہوں بڑی خوشی سے میری مدد کی۔ اندھیرا چھانے سے بیشتر ہی وہ مجھے سیدھا سکول کے چپڑاسی نواب دین کے گھر لے گیا۔ جس نے مجھے گھر کے باہر چارپائی پر بٹھایا۔ اندر سے لالٹین اور چابیاں لایا اور میرا اٹیچی اٹھا کر سامنے نظر

آنے والی ایک بلند و بالا عمارت کی طرف لے چلا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک متروکہ عمارت ہے جس کے نچلے حصے میں مڈل سکول کا پرائمری حصہ اور دوسرے حصے میں ڈسپنسری ہے۔ تیسری اور چوتھی منزل میں پٹوار خانہ ہے۔ پانچویں منزل کی چھت پر بنے دو بغلی کمروں اور ان کے درمیانی برآمدے کو ملک صاحب نے پردیسی مدرسین کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ملک صاحب گاؤں کے کرتا دھرتا اور رکن اسمبلی تھے۔

☆☆

اتنی اونچی عمارت کی اندھیری اور تنگ سیڑھیوں پر چڑھنا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا' تاہم جو حبس سا میں نے نواب دین کے گھر کے باہر بیٹھے محسوس کیا تھا وہ اس مکان کی بالائی چھت پر نہیں تھا۔ ایک کمرے سے اس نے چارپائی نکالی۔ اسے بچھایا اور پھر نیچے چلا گیا۔ پھر وہ کھانا اور کچی لسی اور پانی کی بالٹیاں اٹھائے لڑکوں کے ساتھ آیا۔ لڑکے مجھے سلام کر کے پانی ایک کمرے میں رکھتے گئے۔ نہا کر تازہ دم ہوا اور کھانا کھایا جو گھی سے چپڑی ہوئی تنوری روٹیوں اور دال کدو کے سالن پر مشتمل تھا۔ وقت اور موقع کے لحاظ سے یہ بہترین کھانا تھا۔

لڑکوں نے نواب دین کی رہنمائی میں کمرے کو صاف کیا' وہاں سے ایک میز نکالی۔ اس پر پانی کا جگ اور گلاس رکھے۔ باہر چھت کے عین مرکز میں میرا بستر بچھایا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں چائے پسند کروں گا یا دودھ کا گلاس۔ میں نے کہا کہ میں اب صرف سونا پسند کروں گا۔ پوچھنے پر میں نے نواب دین کو بتایا تھا کہ میں رہنے والا تو فلاں گاؤں کا ہوں لیکن میں لاہور میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور اب وہیں سے ادھر آیا ہوں۔ میں نے دانستہ اپنی ملازمت کا ذکر نہیں کیا۔ وہ لاہور کا سن کر اور زیادہ متاثر ہوا لیکن ساتھ ہی اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ شہر کا' اور وہ بھی لاہور کا بندہ...... اس سرحدی دیہات میں کیسے گزارا کرے گا۔ اس نے کچھ مقامی اور کچھ سکول کی سیاست پر بھی روشنی ڈالی۔

فضا صاف اور خاموش تھی۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ مجھے بڑی گہری اور سہانی نیند آئی۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی میں بیدار ہو گیا۔ میں نے رات ہی نواب دین سے کہہ دیا تھا کہ وہ اذان کی آواز کے ساتھ ہی آ جائے۔ وہ آیا تو مجھے باہر کھلے کھیتوں میں لے گیا۔ تقریباً گاؤں کی ساری آبادی ہی باہر نکلی ہوئی تھی۔ فراغت کے بعد کیا مرد' کیا عورتیں' کنوؤں کا رخ کر رہی تھیں۔ جہاں سب ایک

مخلوط قسم کی فضا میں رہٹ کی ناہ سے دور علیحدہ علیحدہ گروپوں میں کھڑے اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے۔ اندھیرے کی چادر لپیٹے اپنی اپنی باری پر سب نہائے۔ میں بھی اپنی باری پر کھلے پانی میں نہایا۔ خوب لطف آیا۔

مجھے سائیکل پر لفٹ دینے والا شخص باجڑہ گڑھی ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے رات ہی یہ خبر پھیلا دی تھی کہ ''انگریزی ماسٹر'' آ گیا ہے لہٰذا اگلی صبح میں جب نواب دین کی ہمراہی میں سڑک کنارے بنائی گئی مڈل سکول کی عمارت کی طرف جا رہا تھا تو ''ماسٹر جی! السلام علیکم۔'' کہہ کر میرے ساتھ بچوں کی ایک لمبی قطار ہو لی۔ سکول کے دفتر میں اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب موجود تھے۔ ان سے میرا تعارف ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بتایا کہ جب سے مسٹر محمد انور رخصت پر گئے ہیں۔ کوئی انگریزی مدرس دستیاب نہیں ہوا۔ لڑکوں کا خاصا ہرج ہوا ہے۔ ان کی کمی پورا کرنا ہوگی۔ چھٹی جماعت نے تو ابھی انگریزی پڑھنا شروع ہی نہیں کی۔

☆☆

کہاں تو لاہور میں، میں اپنی ٹیکس ریکارڈ آفس کی نشست پر ''آنریبل جونیئر کلرک'' بن کر بیٹھا رہتا تھا اور کہاں اب مجھے بچوں کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھانا تھا۔ میں یکا یک اہم ہو گیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر چودھری خان محمد ایس۔ وی بھی میرے سامنے جی جی کر رہا تھا۔ باقی مدرسین اور طلبہ کا تو کیا مذکور۔ مجھے بتایا گیا کہ ملک صاحب اپنی جیب سے ایک سو روپیہ زائد از تنخواہ انگریزی مدرس کو دینے کا اعلان دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میں کر کے آئے تھے کہ جلد کوئی انگریزی مدرس بھیجا جائے۔ ایک نوجوان آیا بھی تھا لیکن اس شہری بابو کو یہاں کی فضا پسند نہ آئی۔ دوسرے دن سے اب تک نہیں لوٹا۔

میں نے تدریس کا کام شروع کر دیا۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کو انگریزی اور ہیڈ ماسٹر کی درخواست پر ہشتم کو ریاضی بھی پڑھاتا۔ میرا ٹائم ٹیبل خاصا ہلکا تھا۔ خالی پیریڈز کو میں نے یوں منضبط کرایا کہ میں چھٹی سے قبل ہی فارغ ہو کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ جاتا۔

جماعت ہشتم کے طلبہ نے میری ہر ضرورت پوری کرنے کا فریضہ سنبھال لیا تھا۔ میں علی الصباح جب باہر نکلتا تو کئی طلباء میرے منتظر ہوتے۔ میرے ساتھ باہر جاتے، مسواکیں بناتے، نہانے کے لئے کمر پر باندھنے کا پرنا، صابن، تیل اور تولیہ بھی لاتے۔ کھانے کا انتظام ہیڈ ماسٹر نے مکمل طور پر نواب دین کے سپرد کر دیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے بتایا کہ بیرونی

مدرسین کیلئے نواب دین کو ملک صاحب خصوصی غلہ اور خرچہ دیتے ہیں بلکہ ایسے مدرسین کی آڑ میں نواب دین کا اپنا چولہا چونکا خوب چلتا ہے۔ لسی، گھی، مکھن، موسمی سبزیاں، خربوزے، تربوز، کھیرے ککڑیاں طلبہ تحفے کے طور پر لاتے جن کی زیادہ مقدار نواب دین کے بچے ہی استعمال کرتے۔ دو چار پائیاں اور بستر بھی ملک صاحب نے مہیا کر رکھے ہیں۔ جن میں سے ایک تو نواب دین کے متواتر استعمال میں رہتا ہے جبکہ دوسرا محفوظ ہے۔

میں نے بی۔اے نصاب میں ایلڈس ہکسلے کا ایک مضمون ''لونگ ان گیرٹس'' پڑھا تھا۔ وہ مجھے بار بار یاد آتا۔ ہکسلے کے خیال کے مطابق گیرٹس میں رہنے والے لوگ عالی دماغ ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کی رہائش عام لوگوں سے الگ تھلگ اور بالا ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ خود بھی عام لوگوں سے بالا مخلوق ہوتے ہیں۔ اتنی بلندی سے چاروں طرف پھیلے گاؤں، ان میں چلتے پھرتے انسانوں، اور پھر دور تک ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھنا ایک عجیب احساس پیدا کرتا تھا۔ موقع کے مطابق اجالے، اندھیرے اور چاندنی میں، میں گرد و پیش کو خوب غور سے دیکھتا۔ کبھی ستاروں سے ہم کلام ہوتا، کبھی سرحد پار کی سرخ اور سبز بتیاں بھی نظر آتیں، کبھی کبھی ہلکے پھلکے دھماکوں کی آواز بھی سنائی دیتی جو سرحدی جھڑپوں کا نتیجہ ہوتی۔ جموں شہر کی طرف جاتی بانہال روڈ پر چلتی ٹریفک بھی رات کے وقت روشنیوں کی صورت میں نظر آتی۔

اپنے روز و شب میں، میں اتنا کھویا کہ ایک ماہ کے قیام کے دوران میں، میں اپنے گھر ماں اور بھائیوں سے ملنے بھی صرف ایک بار ہی گیا۔ بلند و بالا ماحول میں رہائش، مڈل سکول کی لائبریری کی کتب، خاموشی، فراغت، مناظر، جی بھر کر سونا، من و سلوا کے مانند تین وقت کی خوارک کا ملنا، ادھر سے سلام ادھر سے سلام اور بچوں کی طرف سے بے حد عزت و احترام۔ اس حال احوال میں، میں ہاشمی صاحب کو یاد کرتا۔ انھیں اپنے دل کی کیفیت سے آگاہ کرنے کو جی چاہتا۔ خاص طور میں اپنی اونچی رہائش اور ''قاضی کی کٹڑی'' اور وسن پورہ چوک کی عمارت کی نچلی منزل کی رہائش کا موازنہ کر کے ان کو مسحور کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ مئی کا مہینہ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہا کر جا چکا ہے اور اگلے روز چھٹے مہینے کی پہلی تاریخ ہو گی۔

☆☆

یکم جون کو جب میں سکول پہنچا تو میرے خوشگوار خواب زندگی کو توڑنے کے لئے سکول میں محمد انور ایم۔اے آیا بیٹھا تھا اور ہیڈ ماسٹر سے جھگڑ رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر اس کو حاضر کرنے سے

انکاری تھا۔ وہ مجھے فارغ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ہیڈ ماسٹر کے حصے کا تدریس ریاضی کام بھی تو کر رہا تھا۔ محمد انور کا اصرار تھا کہ وہ تین ماہ کی رخصت پر گیا تھا اور اب واپس آ گیا ہے۔ انگریزی میں لکھی رخصت کی منظوری کے حکم میں صراحت کی گئی تھی کہ رخصت سے واپسی پر وہ باجڑہ گڑھی ہی' میں حاضر ہوگا۔ اور اس کی جگہ کام کرنے والے مدرس کو فارغ سمجھا جائے گا۔ میں نے ہیڈ ماسٹر سے عرض کی کہ محمد انور ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے ملازمت کے ختم ہونے کا قطعی کوئی افسوس نہ تھا کیونکہ میری ملازمت تو لاہور میں موجود تھی۔ مجھے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ مجھ سے ''گیرٹ'' چھن رہی تھی۔ ایک ہی ماہ کے قیام سے میں اس سرحدی ماحول میں یوں گم ہو گیا تھا جیسے میں مدتوں سے ادھر ہی تھا۔

☆☆

مرزا محمد انور نے مجھے علیحدگی میں بتایا کہ وہ ادھر آنے سے پہلے بابو رحمت اللہ صاحب سے مل کر آیا ہے اور بابو صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہے۔ بابو صاحب کو آج میرا انتظار ہے۔

میں محمد انور کے ساتھ ہی بابو رحمت اللہ سے ان کے گھر پر ملا۔ بابو رحمت اللہ نے مجھے بتایا کہ ضابطے کے تحت جو اہلکار جس مقام سے رخصت پر جائے۔ رخصت سے واپسی اسے اسی جگہ حاضر کیا جاتا ہے۔ جب مجھے محمد انور کی جگہ تعینات کیا گیا تھا تو یہ خیال تھا کہ محمد انور شاید مزید رخصت لے لیں گے لیکن اب یہ واپس آ گئے ہیں تو میرا فارغ ہونا ضروری ہے۔ ہاں اب اگر میں چاہوں تو بجائے فراغت کے میں شکر گڑھ تحصیل میں کہیں تبدیل کیا جا سکتا ہوں۔ تعطیلات موسم گرما تک میں وہاں وقت گزاروں پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ جبال چودھری عبدالغنی جونیئر وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ کا گاؤں ہے۔ وہاں بھی خاصی مراعات موجود ہیں۔ بابو رحمت اللہ نے مزید بتایا کہ چودھری صاحب بورڈ کے اجلاس میں آئے ہوئے تھے اگر میں دفتر کے اوقات میں آ جاتا تو وہ مجھے ان کے ساتھ ہی جبال بھیج سکتے تھے۔

''کیا آپ جبال جانے کے لئے تیار ہیں؟'' مجھے خاموش پا کر بابو رحمت اللہ نے پوچھا۔

ایک دو لمحوں کیلئے میں نے سوچا پھر میں نے ہاں کر دی۔ انھوں نے اگلی صبح دفتر آنے کا فرمایا۔ رات میں نے محمد انور کے ہاں ہی بسر کی۔

☆☆

دفتر میں بابو رحمت اللہ نے اپنے ایک نائب کلرک سے کہا کہ میرے تبادلہ کے

احکامات اس طرح ٹائپ کرے کہ باجڑہ گڑھی مڈل سکول کے انگریزی کے مدرس محمد انور رخصتی کی واپس آمد پر قاضی ذوالفقار احمد کو مڈل سکول جبال میں خالی آسامی پر تبدیل کیا جاتا ہے اور اسے یکم جون ۱۹۵۲ء ہی سے جبال میں حاضر سمجھا جائے۔

احکامات تو تیار ہو گئے لیکن ان پر دستخط ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے ہونا تھے۔ وہ کہیں دورے پر تھے۔ انھوں نے گیارہ بجے واپس آنا تھا۔ لہٰذا میں ان کے انتظار میں دفتر میں ہی بیٹھا رہا۔ اس دوران میں، میں نے بابو رحمت اللہ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ وہ ضلعی محکمہ تعلیم کے شعبہ انتظامیہ کے ہیڈ کلرک تھے۔ وہ ملازم ڈسٹرکٹ بورڈ کے تھے اس لئے ان کی ساری وفاداریاں چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ کے ساتھ تھیں۔ مدرسین بھی ڈسٹرکٹ بورڈ کے ملازم تھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کی حیثیت محض حکومتی نگران کی تھی۔ وہ مدرسین کی تقرریاں اور تبادلے چیئرمین کی مرضی ہی سے کرتے تھے۔ ان دونوں انتظامی ایجنسیوں کے مابین پل کا کام ہیڈ کلرک انجام دیتا تھا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ پل کس قدر کارآمد شے ہوتا ہے۔

جیسا کہ بعد کی ملازمت کے دوران میں ثابت ہوا، ہیڈ کلرک کی یہ آسامی بڑی کلیدی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی چیئرمین بورڈ کا خاص الخاص آدمی ہوتا۔ چیئرمین بورڈ کے جائز ناجائز احکامات کی تعمیل اس کا فرض ہوتا۔ اس کی سوچ اور حکمت عملی چیئرمین بوڑد کی مرضی کے تابع ہوتی۔ وہ دیگر ممبران بورڈ کو بھی مطمئن رکھتا۔ اساتذہ کی تقرریاں، تبادلوں، ترقیوں اور تنزلیوں میں وہ چیئرمین کی سوچ کے مطابق ہی ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو چلاتا۔ بابو رحمت اللہ بڑا مردم شناس، زمانہ ساز اور مستقبل پر نظر رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کی تجاویز ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کو قبول کرنا ہی پڑتیں جبکہ خود چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ بھی اس کے مشورے کو نہ ٹالتا تھا۔

پنجاب کے اضلاع کے چیئرمینوں نے اپنے اپنے ضلعوں میں بابو رحمت اللہ جیسی صفات کے ہی آدمی اس مخصوص آسامی پر تعینات کر رکھے تھے۔ ضلع گوجرانوالہ میں نعمت علی چودھری، ضلع لاہور میں محمد اشرف چودھری اور ضلع قصور میں بابو محمد احمد ایسے ہی معتبر اور دانا بینا ہیڈ کلرک تھے۔ ان کی مرضی کے بغیر محکمہ تعلیم کا ڈسٹرکٹ انسپکٹر کامیاب نہیں ہو سکتا تھے۔

☆☆

اس روز جمعہ کا دن تھا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب بارہ بجے تشریف لائے۔ میرے احکامات پر دستخط ہوئے بابو رحمت اللہ نے ہی مجھے رائے دی کہ میں اپنے گاؤں چلا جاؤں۔

ہفتہ اور اتوار کی تعطیل مناؤں پیر کا دن سفر کا دن تصور ہو گا۔ منگل کو علی الصباح سکول میں حاضر ہو جاؤں۔ تجویز معقول تھی۔ میں گھر چلا گیا اور سب کو اپنے تبادلے کا بتایا۔ جب میں ہی جبال جانے کو راضی تھا تو کسی دوسرے کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چچا جان نے کہا۔ چلو ڈیڑھ دو ماہ ہی کی بات ہے۔ تعطیلات موسم گرما ۲۳/ جولائی سے ہو رہی ہیں۔ ڈٹ کر کام کرو۔

پیر کو میں دوپہر کے وقت سیالکوٹ سے ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کی بس پر بیٹھا اور تقریباً پانچ بجے ظفروال پہنچا۔ سخت گرم اور حبس زدہ دن تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گرمی کی وجہ سے خچر دستیاب ہے نہ تانگہ مجھے سفر پیدل ہی کرنا ہو گا۔ راستہ دکھانے والے نے مجھے دور ایک بڑ کے درخت کی نشان دہی کی اور کہا کہ سامنے کی ساری زمین بنجر اور کلر اٹھی ہے۔ بعض جگہ تم شاید راستے کا نشان کھو دو لیکن اس بڑ کو نظر میں رکھنا۔ یہ بڑ پیدل مسافروں کا ایک پڑاؤ ہے۔ وہاں ایک کھوئی بھی ہے۔ وہاں سے ممکن ہے مجھے کوئی راہگیر ساتھی بھی مل جائے۔ پھر اس نے خود ہی اس بات کی نفی کی کہ اس وقت جو راہگیر بڑ کے نیچے موجود ہو گا وہ تمہاری طرح اپنا پینڈا (سفر) کھوٹا کر رہا ہو گا۔ تم بھی تیز تیز چلو گے تو مغرب کی اذانوں تک بڑ کے اگلی طرف پنڈی نامی گاؤں میں پہنچ سکو گے۔

کھلے میدانی علاقوں میں جو فاصلہ نزدیک ہی دکھائی دے، لیکن چلتے رہنے سے اور دور ہوتا چلا جائے اسے گہرا فاصلہ (ڈونگہ پینڈا) کہا جاتا ہے۔ بڑ کا درخت جو میل ڈیڑھ کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا قریب آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب بھی میں اسے اس ارادے سے دیکھتا کہ اب وہ کتنی دور ہے وہ اتنی ہی دور نظر آتا جتنا وہ ظفروال سے چلتے وقت نظر آیا تھا۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔ اور میری پشت پر سورج کا گولہ سرخ ہو رہا تھا۔ بہر کیف جب میں بڑ کے درخت کے نیچے پہنچا تو اس وقت ماحول کے سناٹے کی وجہ سے دور سے کسی موذن کی دھیمی سی آواز آ رہی تھی جو مغرب کے وقت کا اعلان تھا۔ تاہم ابھی تاریکی نہیں چھائی تھی۔ میں بڑ کے نیچے پانی پینے بھی نہیں رکا۔ مجھے دیکھ کر درخت پر موجود پرندے چیخنے چلانے لگے۔ ان کے شور سے میں خوفزدہ ہو گیا۔ بڑ مجھے آسیب زدہ نظر آنے لگا اور مجھے ہچکاک کی انگریزی فلم پرندے (برڈز) یاد آئی تو میں لرز کر رہ گیا۔ سر پر اٹھائے اپنے اٹیچی کیس کو ایک ہاتھ سے تھامنے کی بجائے اب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھاما اور دوڑ لگا دی۔ اور اپنی رفتار اسی وقت کم کی جب مجھے دوڑنے کا یارا نہ رہا۔

اندھیرا دم بدم بڑھ رہا تھا لیکن اب ایک واضح راستہ مجھے نظر آ رہا تھا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ تھا۔ بنجر اور کلر اٹھی زمین کے بعد بھر پور فصلوں سے آباد کھیت اس امر کی دلیل تھے کہیں کسی آبادی کے نزدیک پہنچ رہا ہوں۔ مویشیوں کے ڈکارنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی کبھی کبھی آ جاتی تھیں۔ تاہم مجھے کوئی جلتا دیا اور ٹمٹماتی روشنی نظر نہیں آئی۔ ہاں ایک عجیب سی ٹھک ٹھک کی آواز بھی آ رہی ہے۔ اچانک پورے چاند کی روشنی میں کیا دیکھا ہوں کہ سامنے ایک نلکا ہے اس پر ایک ننگ دھڑنگ نوجوان نہار رہا تھا۔ آواز نلکا چلانے کی تھی۔ تھوڑی دیر سانس ہموار کرنے کے بعد میں نے کھنگھارتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔

''بھئی میں نے پانی پینا ہے۔''

''ذرا دم لیں۔'' نوجوان نے کہا اور میں نے اٹیچی زمین پر رکھ دیا۔ اس نے جلدی سے تہ بند باندھا اور ''آؤ پانی پیئو'' کہہ کر نلکا چلانے لگا۔ میں نے اوک سے پانی پیا۔ ٹھنڈے پانی نے جسم میں جان ڈال دی۔ اس نے پوچھا کہ میں اس وقت کہاں سے آیا ہوں اور میں نے کہاں جانا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے جبال جانا ہے اور میں وہاں انگریزی ٹیچر مقرر ہوا ہوں۔ اس نے بتایا کہ اس گاؤں سے کافی بچے جبال پڑھنے جاتے ہیں۔ یہاں کے ایک ماسٹر محمد اسماعیل بھی جبال سکول میں پڑھاتے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے ماسٹر محمد اسماعیل کے گھر ہی لے چلے۔ یہ وہی پنڈی نامی گاؤں تھا جس کے متعلق مجھے راستہ دکھانے والے نے بتایا تھا۔

☆☆

اس نوجوان نے میرا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور ہم اسماعیل صاحب کے گھر کی سمت ہو لیے۔ وہ نوجوان پوچھتا رہا کہ میں دیر سے کیوں چلا۔ پھر مجھے **دھمتھل** کی راہ آنا چاہئے تھا۔ وہاں سے جبال دو کوس پر ہے۔ جبکہ ظفر وال سے تو سات کوس ہے۔ ماسٹر صاحب کے گھر کے سامنے میرا اٹیچی رکھ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی:

''کون ہے بھائی؟''

''مہمان آئے ہیں جی چودھری صاحب' میں رحمت شاہ ہوں۔''

''بسم اللہ' مہمان کہاں سے آئے ہیں؟'' کہتے ہوئے ماسٹر صاحب نے دروازہ کھول دیا۔

میں نے پکی عمر کے ماسٹر صاحب کو بتانا چاہا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں لیکن انھوں نے کہا کہ پہلے اندر تو آئیں پھر جان لیں گے کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے

ہیں۔فی الحال تو آپ مہمان ہیں جو برکتیں لاتا ہے۔

یہ بڑا خلوص بھرا استقبال تھا۔دروازے کے اندر کی طرف ایک کھلا آنگن تھا۔کنال بھر سے کیا کم ہوگا۔اس کے ایک طرف تین کمرے سے بنے ہوئے تھے جن کا احساس ان کے اندر جلتے دیوں کی مدھم زردسی روشنی سے ہو رہا تھا۔ماسٹر صاحب نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تو انھوں نے کہا۔"جوتا اتار دیں اور بے تکلف ہو کر بیٹھیں۔"

رحمت شاہ چلا گیا۔ماسٹر صاحب بھی ایک زرد روشنی والے دروازے میں گئے اور پھر واپس آ کر میرے پاس بیٹھ گئے اور بولے اب بتائیں۔میں نے انھیں اپنے بارے میں بتایا تو بولے۔"آپ کا تو سکول میں بڑا انتظار ہو رہا ہے۔"

"میرا"؟ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔"ہاں' انگلش ٹیچر کا...... جب سے نیا سال شروع ہوا ہے تب سے ہی انگریزی مدرس کی آسامی خالی چلی آ رہی ہے۔ادھر شکرگڑھ تحصیل میں کوئی انگریزی مدرس دستیاب ہی نہیں ہے۔ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب آئے تھے تو انھوں نے ہیڈ ماسٹر کو اختیار دیا تھا کہ وہ جس آدمی کو چاہیں انگریزی مدرس تعینات کر لیں۔تقرری کی منظوری دے دی جائے گی لیکن تگ ودو کے باوجود کوئی آدمی نہیں ملا۔وائس چیئرمین صاحب کا اپنا بیٹا بھی بی۔اے کا امتحان دے کر فارغ ہی تھا لیکن اس نے لاہور میں ہی رہنا پسند کیا ہے۔وہ ذرا اور طرح کا نوجوان ہے۔

اسی طرح کی باتوں میں محمد اسماعیل صاحب کا لڑکا میرے لئے میٹھے دودھ کی لسی لایا۔پھر تھوڑی دیر بعد میرے لئے بستر' چارپائی اور دستی پنکھا لایا۔چارپائی اور بستر کو بچھایا اور پھر مجھے اس پر لیٹ جانے کو کہا۔کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ کریلوں کے ساتھ تازہ پراٹھے لایا۔رات کے کھانے میں پراٹھے دیکھ کر میں حیران تو ہوا لیکن یہ خصوصی مہمان نوازی تھی میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور رسماً ماسٹر صاحب کو بلاوجہ اور ناجائز تکلیف دینے کی معذرت کی تو ماسٹر صاحب نے بڑے موزوں الفاظ میں کہا کہ یہ تو میرے راستہ بھٹک جانے کا فیضان ہے کہ انھیں میرا میزبان بننا نصیب ہوا ورنہ جب مجھے جبال پہنچنے کا آسان راستہ سمجھ میں آ جائے گا پھر کب میں ان کو شرف میزبانی بخشوں گا۔واقعی ان کا یہ کہنا سچ ہی ثابت ہوا لیکن یہ پنڈی میں ایک رات کا قیام میرا بڑا اثاثہ ہے اور اس کا ذکر میں کئی مقامات پر اور کئی محافل میں کر چکا ہوں۔اور آئندہ بھی انشاءاللہ کرتا ہی رہوں گا۔

اگلے روز ناشتے کے بعد ماسٹر محمد اسماعیل صاحب نے مجھے گھوڑی پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ زندگی میں شاید یہ پہلا ہی موقع تھا کہ میں گھوڑی پر سوار ہوا تھا۔ میں ڈر بھی رہا تھا اور سفر سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کا لڑکا ان کے ساتھ گھوڑی پر سکول جایا کرتا تھا لیکن آج وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ پیدل ہی چلا گیا تھا۔ لڑکوں نے انگریزی ماسٹر کے آ جانے کی خبر میرے سکول پہنچنے سے پہلے پہنچا دی تھی۔ طلبہ' اساتذہ اور کئی مقامی افراد اس خبر سے حیرت زدہ تھے اور مجھے ملنے یا دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ میں اپنے آپ میں جھینپ سا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس پسماندہ علاقے میں ایک ایف۔ اے پاس انسان کی کتنی اہمیت ہے۔ مگر یہ بات ۱۹۵۲ء کی تھی جب ابھی پاکستان کو معرض وجود میں آئے پونے پانچ برس ہی ہوئے تھے۔

☆☆

سکول گاؤں سے فرلانگ بھر باہر ایک اچھی نئی اور پختہ عمارت کے علاوہ تین ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ کھیلنے کی گراؤنڈ چھوڑ کر باقی جگہ پر روشیں اور پھولوں کی کیاریاں تیار کی گئی تھیں جن میں موسمی پھول کھلے ہوئے تھے۔ تمام عملہ قریبی دیہاتوں سے تعلق رکھتا تھا۔ صرف محمد عبداللہ ایس۔ وی مقامی تھے۔ عملے میں ان کا خاص احترام تھا۔ ذاتی اہلیت کے علاوہ وہ جونیئر وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ چودھری عبدالغنی کے بھی معتمد خاص تھے۔ اس وجہ سے وہ اردگرد کے تمام سکولوں کے اساتذہ کے کام آتے رہتے تھے۔ ان سے ماسٹر اسماعیل صاحب نے میرا خصوصی تعارف کرایا۔ باقی مدرسین سے بھی رسمی علیک سلیک ہوئی۔ عبداللہ صاحب نے مجھے تدریس انگریزی کا ٹائم ٹیبل دیا۔ زبانی زبانی انھوں نے مجھے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر چودھری شاہ محمد وائس چیئرمین کی برادری کے آدمی ہیں اس لئے وہ مرضی سے ہی تشریف لاتے ہیں۔ ابھی ادھر جنوب سے گھوڑی پر آتے نمودار ہوں گے۔ میں سمجھ گیا کہ ماسٹر عبداللہ صاحب ہیڈ ماسٹر سے خوش نہیں ہیں۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب تشریف لائے تو مجھے انھوں نے دفتر میں طلب کیا۔ اپنی نشست سے اٹھ کر انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا وہ پرانے ایس وی مدرس تھے اور پچاس کے پیٹے میں تھے۔

☆☆

کھانا ماسٹر عبداللہ صاحب کے گھر سے آنے لگا۔ جو یا تو چپڑاسی یا پھر ان کا بیٹا مشتاق (جو بعد میں سکواڈرن لیڈر بنا) لاتا۔

ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر میں سہ پہر کو بھی آٹھویں جماعت کو انگریزی پڑھاتا۔ سکول کے

تحریری ضابطے میں تھا کہ جماعت ششم لازمی طور پر اس عارضی بورڈنگ ہاؤس میں رہے گی جو جونیئر وائس چیئرمین نے اپنی حویلی سے ملحق ایک شیڈ کی صورت میں مہیا کر رکھا تھا۔ درجہ چہارم کا ایک ملازم بطور باورچی کام کرتا تھا۔ ہر طالبعلم سے ۱۲ چھٹانک یومیہ کے حساب سے آٹا لیا جاتا تھا پورے مہینے کے پانچ روپے سالن وغیرہ کے لیے وصول کیے جاتے تھے۔

طلبہ فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہوتے پٹرومیکس جلا دیا جاتا اور سوالاً جواباً لکھی امدادی کتاب سے طلباء تاریخ، جغرافیے اور شہریت کا ایک ایک سوال یاد کرتے۔ ناشتہ اسی کو ملتا جو ازبر کیے سوالات کے جوابات انچارج بورڈنگ ہاؤس کو سنا دیتا۔ ناشتے کے بعد طلبہ سکول آجاتے اور اپنی باری پر ایک مدرس ان کا زیرو پیریڈ لیتا۔ پھر سکول کے اوقات شروع ہو جاتے۔ چھٹی کے بعد موسم گرما کے باعث طلبہ کو پانچ بجے تک کھانے اور آرام کرنے کا وقت دیا جاتا پھر پانچ بجے میں ان کی کلاس سکول میں لیتا۔ ایک گھنٹے کے لئے عبداللہ صاحب بھی آتے۔ وہ تدریس اردو کے ذمہ دار تھے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد طلبہ عشاء تک پڑھتے اس وقت وہ جنرل سائنس یا فارسی کے اسباق ازبر کرتے۔ بعض بچے غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ رٹے میں ان کو کمال حاصل تھا۔

چند ہی دنوں میں ایک لڑکا اجمل میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ اس طرح کہ دوپہر سے لے کر پانچ بجے شام تک کے وقت میں، میں اسے بائیں ہاتھ میں کتاب اور دائیں ہاتھ میں چھڑی تھامے اپنے ڈھور ڈنگروں کو ہانک کر چرانے کے لئے لے جاتے ہوئے دیکھتا۔ پھر وہ پانچ بجے سے پہلے ہی سکول میں آجاتا۔ میری اس سے بات چیت ہوتی تو وہ بڑے بھولپن کے انداز میں معقول اور سلجھی ہوئی گفتگو کرتا۔ اسباق میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ عبداللہ صاحب اسے ہیرا کہا کرتے تھے۔ وہ لڑکا مجھے اس قدر مؤدب، محنتی، لائق اور پیارا لگا کہ میں اسے ''بھائی'' کہنے لگا۔ میں نے اس کی شخصیت پر مبنی ایک افسانہ روزنامہ ''احسان'' کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں لکھا۔ افسانہ شائع ہوا تو میں ''احسان'' کے ادبی ایڈیشن کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج سے پوچھنے گیا کہ افسانہ کیسا تھا؟ تو انھوں نے کہا: ''اچھا ہی تھا تو شائع کیا۔ کیا اجمل جیسا لڑکا واقعی موجود ہے؟'' میں نے بتایا کہ ہاں واقعی موجود ہے اور مجھے جبال میں جب وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا ملا تھا۔

جماعت نہم دہم میں قاضی عطا اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال نے

مجھے جولگن کلام اقبالؒ پڑھنے اور سمجھنے کی لگائی۔ میں اس کو گزشتہ پانچ سالوں کے دوران میں تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ یہاں جبال میں، میں نے ماسٹر عبداللہ صاحب کو اقبالؒ کا والا وشیدا پایا وہ علامہؒ کی کوئی نہ کوئی کتاب ہر وقت اٹھائے پھرتے۔ انھوں نے شاید میرے اندر اقبالؒ کے کلام کی دبی چنگاری کی حرارت محسوس کر لی تھی۔ لہٰذا وہ مجھے اکثر کلام اقبالؒ سناتے، معانی پر بحث کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی رسمی تعلیم میں کلام اقبالؒ کی تدریس کو جماعت اول سے شروع کر کے بی۔اے تک چودہ سالوں پر پھیلا دینا چاہیے۔ اس طرح ہر بی۔اے پاس لڑکا اور لڑکی سچے پاکستانی اور اقبال کے شاہین ہوں گے۔ میرا ایمان ہے کہ ایسے ہی خواب اور لوگوں نے بھی دیکھے ہوں گے لیکن ہم تو بدنصیب قوم ہیں جو آج تک اس ترتیب سے قرآن اور حدیث کی تعلیم کا بھی بندوبست نہیں کر سکے۔

☆☆

میری ملاقات عبداللہ صاحب کی ہمراہی میں جونیئر وائس چیئر مین صاحب سے بھی ہوئی۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھل گئے۔ وہ عبداللہ صاحب کو بتانے لگے کہ کل وہ دھمتھل گئے تھے وہاں سے چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ کی کارگزری اور انھوں نے مجھے صرف ہاتھ ہلا کر ہیلو ہیلو کہا۔

ہاں، کل گرلز ہائی سکول ظفروال کا معائنہ تھا۔'' عبداللہ صاحب نے کہا۔

''تبھی میں کہوں، گھمن اور ادھر کدھر.........''

اس معنی خیز گفتگو میں ڈسٹرکٹ انسپکٹریس مدارس مس قریشی اور چیئر مین مسٹر گھمن کے مبینہ رومان کی طرف اشارہ تھا۔ معلوم ہوا کہ ضلع بھر میں مشہور ہے کہ مس قریشی کے دورے کے پروگرام کی ایک نقل چیئر مین مسٹر گھمن حاصل کر لیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق مس صاحبہ کے پیچھے اسی سکول میں جاوارد ہوتے ہیں جہاں مس صاحبہ گئی ہوں۔ پھر واپسی پر ان کو سیالکوٹ تک لفٹ دیتے ہیں۔ مس قریشی ان کے اس رویے سے نالاں بھی ہیں لیکن بوجوہ خاموشی بھی رہتی ہیں۔ شاید ان کے دل میں گھمن صاحب کے لئے جگہ پیدا ہو چکی ہے۔

مسٹر گھمن بہت تیز اور ذہین افراد میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایک اوسط درجے کے زمیندار کی حیثیت سے ابتدا کر کے انھوں نے تجارت اور سیاست میں نام پیدا کیا۔ وہ پنجاب کے تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں کے چیئر مینوں کی انجمن کے بھی چیئر مین تھے جس کے نتیجے میں پنجاب بھر کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ان ہی کی حکمت عملی چلتی تھی۔ اس دور میں انھوں نے

کچھ ایسی کارگزاریاں کی تھیں کہ ان کے خلاف گیارہ مقدمات چل رہے تھے اور اخبارات لکھتے تھے کہ "ایک بمقابلہ ٹیم" لیکن اس کے باوجود وہ پنجاب حکومت میں وزیر جیل خانہ جات بھی رہے تھے۔

مس قریشی کی خاطر انھوں نے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا جو سکولوں کو سستی کتب اور سٹیشنری مہیا کرتا تھا۔ مشہور تھا کہ ٹرسٹ کے کرتا دھرتا مس قریشی کے عزیز و اقارب ہیں۔ پھر ان پر ضلع بھر کی کچی سڑکوں پر بادلوں کی طرح سایہ فگن بڑے بڑے شیشم کے درخت کٹوا کر لکڑی فروخت کر دینے کا الزام بھی تھا۔ ایک اور مقدمہ جس کا بڑا چرچا تھا یہ تھا کہ وہ ٹھیکیدار کی حیثیت سے فوج کو گوشت کی سپلائی کرتے تھے۔ زندہ بکرے تول کر دیئے جاتے جن کو وہ رات بھر بھوکا رکھ کر صبح پانی پلاتے اور تلواتے۔ اسی دور میں انھوں نے مس قریشی کو مسز امینہ غنی گھمن بھی بنا لیا۔ اسی نام کی تختی وہ جب ڈپٹی ڈائریکٹریس تعلیمات تھی ان کے کمرے کے باہر آویزاں ہوتی۔ یہ بھی مشہور تھا کہ درختوں کی فروخت کے حاصل سرمایے اور سیاہ شیشم کی لکڑی کے استعمال سے گھمن صاحب نے بیگم صاحبہ کو گلبرگ میں وہ کوٹھی بنا کر دی جس میں بیگم صاحبہ اب تک مقیم ہیں۔ اخبارات کے مطابق بیگم صاحبہ نے اپنے نام کی ساری جائیداد کو ایک ٹرسٹ بنا کر وقف کر رکھا ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔

یہ معلومات مجھے جبال سے آنے کے بہت عرصے بعد حاصل ہوئیں لیکن چونکہ ان کے ڈانڈے جونیئر وائس چیئرمین کی گفتگو سے جا ملتے ہیں اس لئے ضمناً ان کا ذکر لازمی تھا۔

جبال میں ہی ایک اور ماسٹر صاحب ملے جو بڑی عجب شے تھے ان کا نام حیدر علی گوجر تھا۔ وہ کسی دوسرے گاؤں سے آتے تھے اور اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر سے ایک درمیانے درجے کی بالٹی میں لسی منگواتے تھے جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیتے رہتے۔ ایک دن میں نے ایک طالب علم کو بھیجا کہ جاؤ ماسٹر صاحب سے لسی کا ایک گلاس لاؤ تو اس نے واپس آ کر جواب دیا کہ ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ ایک گھونٹ تو لسی ہے اس میں سے کیا دوں۔ میں نے اس بات کا ذکر ماسٹر عبداللہ صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ جواب وہ ہر کسی کو دے چکے ہیں بڑے روکھے آدمی ہیں۔ ہم نے ان کا نام "سٹریل بس" رکھا ہوا ہے۔

کوئی دو ہفتے بعد میں نے دھمتھل کے راستے گاؤں کا چکر لگایا۔ دھتمھل تحصیل نارووال میں، ظفروال روڈ پر ظفروال سے پانچ میل کے فاصلے پر ادھر واقع ہے۔ جبال سے یہ

گاؤں پگڈنڈیوں کے راستے پر تھا۔ پیدل، سائیکل اور گھوڑی کا رستہ تھا۔ وہاں سے چند میو زمیندار بچے جبال کے حصہ مڈل میں پڑھنے آتے تھے۔ ان میں سے ایک دو گھوڑی پر ہی آتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی خوشی سے گھوڑی پر "لفٹ" دی۔ کھانے کی بھی دعوت دی جو میں نے قبول کی اور وہاں پہلی بار میں نے چوکور پراٹھے کھائے۔ وہاں سے میں نارووال جانے والی بس پر سوار ہوا۔ تین اپ اور تین ڈاؤن ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کی بسیں چلتی تھیں۔ جن کا پہروں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ نارووال سے دو اڑھائی بجے سمہ سٹہ اور اس کے بعد بھی سیالکوٹ جانے والی ٹرینیں ملنے کی قوی امید ہوتی۔ مجھے سمہ سٹہ ہی مل گئی جس نے کوئی ساڑھے پانچ بجے مجھے بیگووالہ گھڑتل سٹیشن پر اتار دیا یہ راستہ میلوں طویل تھا لیکن آسان اور یقینی تھا۔

☆☆

جب میں دو دن گزار کر پھر جبال پہنچا تو وہاں ماسٹر احمد دین جج۔ وی، چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ کے گاؤں گھوئیں کے سے تبدیل ہو کر تشریف فرما تھے۔ وہ چیئر مین صاحب کے چچا مہر الٰہی کے مخالفین میں سے تھے اور مہر الٰہی کو قہر الٰہی کہتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ چیئر مین تو بورڈ کا ممبر ہے۔ اسمبلی کا رکن ہے۔ وہ کسی پر رعب ڈالے تو اسے حق بھی حاصل ہے لیکن یہ مہر الٰہی کون ہے کہ مدرسین کو اپنا نوکر سمجھتا ہے۔ اس طرح تو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کا چچا یا ماما بھی اساتذہ کا چچا یا ماما بن کر ہم پر رعب گانٹھ سکتا ہے۔ "میں قہر الٰہی کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے میرے سکول میں آ کر مجھے "اوئے ماسٹر" کہا۔ میں نے بھی اسے "اوئے گھسن" کہا۔ بس اس نے میرا تبادلہ ادھر کرا دیا ہے مجھے کیا فرق پڑتا ہے' آ گیا ہوں جب ووٹوں کا زمانہ آئے گا تو گھسن ہاتھ جوڑتے پھریں گے۔ پھر تبادلہ ادھر ہو جائے گا ورنہ آٹھ سال سروس رہ گئی ہے زندگی ہوئی تو ادھر ہی گزار لوں گا۔"

اندازہ ہوا کہ موصوف خاصے تلخ آدمی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے جبال کے جونیئر وائس چیئر مین کے متعلق بھی رائے دیتے ہوئے کہا کہ جی سب چور ہیں اور گھسن ان کا سرغنہ ہے۔ اخبارات میں اس کے کرتوت چھپتے ہی رہتے ہیں۔

"کیا سکول میں کوئی اخبار آتا ہے۔" انھوں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں۔" میرا جواب تھا۔

دو دن وہ میرے ساتھ ہی کھانا کھاتے رہے پھر انھوں نے ایک دن مجھے قائل کر لیا کہ

ہمیں ادھر سکول میں ہی اپنا کھانا تیار کرنا بہتر رہے گا۔ روٹیاں بے شک باری باری طلبہ کے گھروں سے آٹا دے کر پکوالیا کریں گے۔ لیکن ہنڈیا ادھر ہی پکے گی۔ ماسٹر عبداللہ صاحب سے مشورہ ہوا تو انھوں نے پہلے تو یہ پوچھا کہ کیا ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا کھانا مناسب نہیں مل رہا۔ میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں آپ پر ذرا بوجھ بڑھ گیا ہے رود کد کے بعد طے ہو گیا کہ روٹیاں بورڈنگ ہاؤس سے آجایا کریں گی۔ مجھے بھی ہنڈیا پکانا آتی تھی ماسٹر صاحب بھی کم نہیں تھے۔ لیکن زیادہ تر مجھے ہی یہ کام کرنا پڑتا۔ برخوردار اجمل میرا ہاتھ بٹاتا۔

ماسٹر احمد دین صاحب دوپہر کا کھانا کھا کر قاعدے' سیپارے' قرآن مجید اور کتابیں سائیکل پر لاد کر گردونواح کے دیہات میں بیچنے چلے جاتے۔ یہ ان کا اضافی کاروبار تھا۔ کبھی کبھار وہ کھانا کھا کر بھی نہیں جاتے تھے۔ جس گاؤں میں انھوں نے جانا ہوتا وہاں کے کسی طالب علم سے کہہ دیتے کہ وہ آرہے ہیں اور اس کے ہاں کھانا کھائیں گے۔ جب وہ گرمی کے مارے تھکے ماندے واپس آتے تو آدھا سیر چینی کا شربت بنا کر چڑھا جاتے۔ بھولے سے بھی کبھی انھوں نے مجھے پوچھا تک نہیں تھا کہ کیا میں بھی ایک گلاس پیئوں گا۔

ہمارے لیے بورڈنگ ہاؤس سے چھ تنوری روٹیاں آتی تھیں۔ میں بمشکل دو کھاتا۔ ماسٹر صاحب چار کھانے کے بعد بھی بھوک محسوس کرتے۔ ایک روز شام کے وقت میں نے اڑھائی تین روپے کا مرغا منگوایا اور اجمل کی مدد سے پکا رکھا تھا۔ اتفاق کی بات اس روز جونیئر وائس چیئرمین کے ہاں سے بلاوا آیا کہ کچھ انگریزی چٹھیاں پڑھنا ہیں الہٰذا میں ان کے ڈیرے پر پہنچوں۔ کلاس پڑھانے کے بعد ادھر جو گیا تو رات ہی ہو گئی۔ وائس چیئرمین صاحب نے اپنے کھانے میں عبداللہ صاحب کو اور مجھے بھی شامل کر لیا۔ اپنا پکا پکایا کھانا میں نے سنبھال دیا۔ چھ کی چھ روٹیاں بھی ہنڈیا کے اوپر ہی رکھ دیں۔ ماسٹر صاحب اپنے کاروبار سے دیر سے لوٹے۔ انھوں نے سالن گرم کیا اور اندھیرے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ حسب معمول انھوں نے ہنڈیا اس اونچی جگہ پر رکھ دی جو ہم نے اس مقصد کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے وقت میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ لائیں' ہنڈیا کو گرم کریں تو وہ بولے کہ ہنڈیا میں کیا ہے جس کو گرم کرنا ہے؟ وہ سالم مرغ اور چھ روٹیاں کھا گئے تھے۔ جب میں ناراض لہجے میں بولا تو کہنے لگے کہ انھوں نے تو یہی سمجھا تھا کہ میں اپنا حصہ کھا چکا ہوں۔

میں نے دبے دبے لہجے میں ماسٹر احمد دین کی خوراک کا ذکر ماسٹر عبداللہ صاحب سے

کیا تو انھوں نے بتایا کہ پہلے روز جب وہ تشریف لائے تھے تو بورڈنگ ہاؤس کی پیالہ بھر دال کے ساتھ انھوں نے نو روٹیاں کھائی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا تو ایک دن مشترکہ طور پر دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ چار مرغ پکائے گئے۔ ہم کل نو آدمی تھے فی آدمی تین روٹیاں پکوانا طے ہو رہی تھیں تو ماسٹر احمد دین نے کہا کہ ان کا راشن ڈبل کر دیا جائے۔ پھر بھی ماسٹر عبداللہ صاحب نے قسم کھا کر مجھے بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے گن کر روٹیاں ماسٹر احمد دین صاحب کو دیتے رہے ہیں اور انھوں نے تیرہ روٹیاں تین پلیٹ سالن کے ساتھ کھائی ہیں۔

بسیار خوری کے بارے میں خود ماسٹر صاحب بھی کھل کر بولنے لگے۔ بتایا کہ جوانی میں ان کا ریکارڈ ایک مرغ کی ہنڈیا کے ساتھ اکیس روٹیاں اور تھال بھر کھیر کھانے کا ہے۔

ان کا پڑھانے کا بھی ایک اپنا انداز تھا۔ بچوں کو خوب مارتے تھے۔ چوتھی جماعت کے انچارج تھے۔ خود بھی نماز پڑھتے تھے اور بچوں کو بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ گالیاں خوب دیتے تھے۔ کسی کو بڑا نہیں مانتے تھے۔ اپنے آپ کو بھی خاکسار، بندہ گنہگار، ناچیز وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ باوجود طبع کے اختلاف کے میں ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا۔ جب کبھی ان کا ارادہ قاعدے سیپارے بیچنے جانے کا نہ ہوتا تو مجھے سیر کی دعوت دیتے۔ پھر ہم جو کسی سمت نکلتے تو کلاس وغیرہ کو بھی چھٹی کرنا پڑتی۔ کئی مرتبہ ہم زبردستی کسی ناواقف گاؤں میں کسی مدرس بھائی کے ہاں پہنچ جاتے اور زبردستی کے مہمان بن جاتے تھے۔ مجھے افسوس اور شرمساری ہوتی تو ماسٹر صاحب مجھے کئی احادیث سنا دیتے کہ ہم نے مہمان بن کر میزبان پر احسان کیا ہے۔ مجبوری کے تحت میں ایسا احسان ماسٹر محمد اسماعیل صاحب پر کر چکا تھا۔ میں نے احمد دین صاحب کے ساتھ اچانک ماسٹر اسماعیل کے گاؤں جا وارد ہونے کا پروگرام بنایا بھی، لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔

اتوار کو ماسٹر صاحب نجانے کس جذبے کے تحت اپنے کپڑے دھوتے تو میرے بھی دھو ڈالتے۔ اپنی جماعت کے دھوبی لڑکے کو شام کو کپڑے دیتے کہ اگلی صبح وہ استری کروا کر لائے۔ کپڑے بھی کوئی زیادہ نہ ہوتے۔ ایک دو جوڑا ہی ہوتے۔ میری خاکی پتلون تو ہفتوں تک بغیر دھلائی کے چلتی۔

◆◆◆◆◆

(۷)

ایک بیوی کی الاٹمنٹ

شرما داس جبال کا ایک اور کردار تھا جو نقل مکانی کر کے بھارت نہیں گیا تھا۔ کسی قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اکیلا ہی تھا۔ اس کے ساتھ المیہ یہ ہوا تھا کہ باوجود پاکستان میں رہنے کے اس کی ملکیتی تھوڑی سی زمین اور مکان میو مہاجرین کو الاٹ کر دیئے گئے تھے۔ بڑی ردوکد کے بعد اور چودھری عبدالغنی کی مداخلت سے یہ طے ہوا تھا کہ شرما داس متروکہ جین مندر میں رہائش اختیار کرے اور جب تک وہ زندہ رہے اس کی زمین کی نصف آمدنی اس کو ملتی رہے۔

وہ قدرے مخبوط الحواس بھی تھا لیکن بڑے تو بڑے چھوٹے بھی اس کو پتھر نہیں مارتے تھے۔ وہ ہمدردانہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ جہاں بھی جا بیٹھتا وہاں ہی اس کو کھانے کو مل جاتا۔ جس سے سوال کرتا وہ مقدور بھر اس کا سوال پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کئی مرتبہ میرے پاس بھی آیا۔ خاموش بیٹھا رہتا یا پوچھتا۔ ”بھاجی، تہاڈا کیہ حال اے۔“ میں کہتا میرا حال تو اچھا ہے تمہارا حال کیا ہے؟ ”میرا حال بھی آپ کے سامنے ہے۔“ وہ جواب دیتا۔ اسے افسوس تھا کہ جن بچوں کو وہ جی جان سے چاہتا تھا وہ بھارت جاتے ہوئے اس کو جان بوجھ کر ادھر چھوڑ گئے تھے۔ کیونکہ جس روز وہ گورداسپور گئے تھے اس روز شرما داس نارووال گیا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ادھر پاکستان ہی میں رہے گا۔ اس نے دھرم بھرشٹ ہونے کا تصور ہی ختم کر دیا تھا۔ سب مسلمانوں سے کہتا کہ وہی اس کے رشتے دار اور وہی اس کے عزیز ہیں۔

ایک ماسٹر صاحب نے اس سے مذاقاً کہا کہ وہ جو اکیلا پاگلوں کی طرح پھرتا رہتا ہے تو وہ سرکار کو درخواست دے کہ اسے کوئی متروکہ عورت ہی الاٹ کر دی جائے۔ درخواست وزیر بحالیات کو دی گئی جو کمشنر، ڈپٹی کمشنر، مال افسر، قانونگو سے ہوتی ہوئی حلقہ پٹواری کو رپورٹ کے لئے موصول ہوئی۔ اس انوکھی درخواست کے بارے میں پٹواری نے چودھری عبدالغنی سے مشورہ کیا تو انھوں نے

مذاق میں کہا کہ اگر کوئی متروکہ عورت ہے تو اس کی الاٹمنٹ کے لئے لکھ دو۔ پٹواری نے کہا کہ ایک مائی جھیوری نو کھر میں ہے۔ لیکن وہ اس کا حلقہ نہیں ہے۔ وہ مائی بڑی عمر کی تھی لیکن وہ بھی اکلاپے کا شکار تھی چودھری عبدالغنی کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک مائی نے اس کو شرماداس کے ساتھ پھیرے لینے پر راضی کر لیا مگر افسوس وہ دو سال ہی شرماداس کا ساتھ دے سکی۔ اسے جلانے کے بجائے شرماداس نے متروکہ مندر کے قریب ایک ڈھلوان پر دفن کر دیا اور اپنے لئے بھی اس کے قریب جگہ مخصوص کر لی۔ مجھے شرماداس جب بھی ملتا میں اس سے ہنسنے ہنسانے کی بات کرتا کہ اس کا چہرے کی اداسی کچھ کم ہو۔ اس وجہ سے اس کا میرے ساتھ یارانہ کچھ گہرا ہی رہا۔

☆☆

موسم گرما کی تعطیلات جولائی کے تیسرے ہفتے میں ہوئیں۔ اس روز شرماداس میرا اٹیچی کیس اٹھائے میرے ساتھ دھمتھل تک آیا۔ ماسٹر احمد دین بھی سائیکل تھامے ہمارے ساتھ تھے۔ سب نے بڑی گرمجوشی اور ایک پر تکلف مشترکہ کھانے کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا جانے پھر ملاقات ہو کہ نہ ہو۔ اجمل تو رو ہی پڑا۔ مجھے تھپکی دے کر اسے بتانا پڑا کہ زندگی کا یہی چلن ہے کوئی ملتا ہے اور کوئی بچھڑتا ہے اور یہ شکر کا مقام ہے کہ ہم اس امید کے ساتھ بچھڑ رہے ہیں۔ کہ ستمبر میں ہم نے پھر ملنا ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد میرا اجبال آنا کچھ یقینی نہیں ہے اور لاہور میں میری پکی ملازمت بھی ہے۔

میں اپنے گاؤں پہنچا۔ میری کارپوریشن والی چھٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ وہاں یکم اگست کو حاضری تھی۔ میں اگست ۴۷ء کے بعد پہلی بار دس بارہ دن گاؤں میں رہا تھا۔ اب تو میری سوچوں کا مرکز بھی گاؤں میں ہی سمٹ کر آ چکا تھا۔ موتی لگے سرہانے اور پھولوں کی چادر دینے والی لڑکی اب ملٹری اکاؤنٹس کے ایک بابو سے بیاہی جا چکی تھی اور میں نے اپنا ذہن اب اس کیلئے بند کر لیا تھا۔ اب میں اپنی عم زاد کے لئے سوچتا تھا۔ میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب وہ گیارہ بارہ برس کی تھی۔ اب پانچ سال سے اوپر کا عرصہ اسے دیکھے ہو چکا تھا اپنے گاؤں کے قیام کے دوران میں کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے طور پر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں اسے نہیں دیکھ سکا۔ اوپر سے تو میں یہ ظاہر کرتا رہا کہ میں تو اس گلی سے بھی نہیں گزرا جدھر وہ رہتی ہے لیکن حقیقتاً میں بیسیوں چکر ادھر کے لگا چکا تھا۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کے موضوع پر میں نے اسے کچھ کتب بھی بھیجیں تھیں۔ جو اس نے کبھی نہیں پڑھیں۔

ماں خوش تھی کہ اب میں دو دو نوکریاں کر رہا ہوں دو سو سے زائد ماہوار کما رہا ہوں۔ کافی بدلا بدلا بھی لگ رہا ہوں۔ ماں نے مجھے اشارتاً یہ بھی کہا کہ چچا جلدی جلدی رخصتی کا کہہ رہے ہیں۔ میں نے ماں سے نجانے اس وقت کیا کہا ہو گا لیکن ماں کا بھولا نے کا ارمان سال بعد ہی پورا ہو سکا۔

☆☆

فراغت کے ان چند دنوں میں مجھے گاؤں کے مڈل سکول جاتے رہنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں مقامی چودھری غلام نبی چیمہ ہیڈ ماسٹر تھے ان کا ایک عزیز عنایت اللہ چیمہ سرگودھا سے آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی بی۔ اے کا امتحان دے رکھا تھا۔ میرا دوست حکیموں کی حویلی والا اکرم قریشی بھی بی کام کا امتحان دینے کے بعد نتیجے کا منتظر تھا۔ سکول کے ایک کمرے میں بیٹھ کر دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ میں، اکرم اور چیمہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کرتے رہتے۔ چیمہ کا ارادہ بی۔ اے کے بعد لاء کرنے کا تھا۔ میں نے سنی سنائی بات کی کہ لاء کا مستقبل اچھا نہیں ہے۔ اس نے بڑی پتے کی بات کہی کہ محنت اور مستقل مزاجی سے کام کرنے والے کے لئے مستقبل ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ مستقبل کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اس کے بگاڑنے سنوارنے میں انسان کا اپنا عمل دخل ہے۔ واقعی اس نے جو کہا، کر دکھایا۔ اس نے لاء کیا، اچھی وکالت کی۔ مقابلے کا امتحان دیا اور براہ راست ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج منتخب ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ سیشن جج ساہیوال تھا۔

اکرم قریشی بی۔ کام کی وجہ سے کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان چلا گیا۔ ساری عمر وہاں گزار دی۔ اب لاہور فیصل ٹاؤن میں ہے "مرا ہاتھی سوا لاکھ کا" کے مصداق ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اکاؤنٹس کی وجہ سے خاصی ذمہ دار اسامی پر ملازمت کر رہا ہے۔ میں نے اور کارپوریشن کے ملازم دوست چودھری عبدالحمید نے درجہ دوم میں بی۔ اے کر لیا۔ میرا ارادہ تو چیمہ سے گفتگو کے بعد لاء ہی کرنے کا تھا۔ تین سو روپیہ داخلہ وغیرہ کے لئے جمع بھی کر لیا تھا۔ لیکن جب میں نے چودھری عبدالحمید سے مشورہ کیا تو اس نے مجھے سمجھایا کہ لاء میں تین سو روپے صرف داخلہ ہے جبکہ ہم نے تین سو میں بی۔ ٹی کا پورا سیشن گزار لینا ہے اوپر سے وہاں تیس روپے ماہوار وظیفہ بھی ملتا ہے۔ کچھ مجھے ویسے ہی مدرسی کے پیشے میں وقار اور تعطیلات کی بھرمار کا ذاتی تجربہ تھا۔ طبعاً بھی میں ضدی نہیں تھا۔ مجھ آسانی سے بہکا دے یا بہلاوے میں لایا جا سکتا ہے۔ سو میں نے چودھری عبدالحمید کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا۔

ماہ اگست ہی میں داخلہ آ گیا۔ چودھری عبدالحمید کے نمبر زیادہ تھے اسے فوراً داخلہ مل گیا مجھے

پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج مسٹر بی۔اے۔ہاشمی نے مشروط طور پر داخلہ دیا کہ پہلی سہ ماہی کے بعد ہونے والے داخلی امتحان میں ناکامی کی صورت میں مجھے کالج سے رخصت کر دیا جائے گا۔میں نے شرط کو کھلے دل سے تسلیم کیا کیونکہ میں ملازم تو تھا ہی۔ایک نہیں بلکہ دو جگہ۔اور پھر بی۔اے کر لینے کے ساتھ ہی کارپوریشن میں ضوابط کے تحت مجھے سنئیر کلرک کا گریڈ مل جانا تھا۔بی۔ٹی کی باقاعدہ جماعتوں کا آغاز ستمبر میں ہونا تھا اور ابھی تو اگست کا پہلا ہفتہ تھا۔سوچنے کے لئے کافی وقت تھا۔

☆☆

چودھری عبدالحمید نے ہی مجھے مشورہ دیا کہ ہم کارپوریشن کی ملازمت چھوڑنے کے بجائے طویل رخصت لیں۔ چھ ماہ کے لئے رخصت بیماری نصف تنخواہ پر مل سکتی ہے اور نصف کا مطلب اصل تنخواہ کا نصف ہوتا ہے باقی الاؤنس پورے کے پورے ملتے رہتے ہیں۔ ہمارا وقت آسانی سے نکل جائے گا۔

چور کی ڈاڑھی میں تنکا والی بات تھی۔ میں ابھی ابھی تین ماہ کی رخصت سالم تنخواہ پر گزار کر آیا تھا۔چودھری کو میرا رخصت پر جانا تو معلوم تھا لیکن میری مصروفیات کا اسے علم نہ تھا۔میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔میں رخصت بیماری حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کسی وقت بھی ہمارا بی۔ٹی میں پڑھنے کا بھید کھل سکتا ہے۔

میں نے پہلی بار جرأت سے کام لیا اور ایک شام اپنے چچا فاروقی کے ہاں جا پہنچا۔ان سے اپنے بی۔اے کرنے اور بی۔ٹی میں داخلہ مل جانے کی بات کی۔میری توقع کے برعکس انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور میری مدد کرنے کا وعدہ بھی۔انھوں نے کہا کہ میں انھیں دفتر میں یاد دلاؤں وہ میری ذاتی مسل نکلوا کر اکاؤنٹ برانچ سے بات کریں گے۔انھوں نے مجھے نصیحت کی میں جملہ حالات صاف صاف درخواست میں لکھوں۔

میں نے اپنی ملاقات کا ذکر چودھری عبدالحمید سے کیا تو وہ سخت ناراض ہوا۔لیکن جب مجھے دو ماہ پندرہ دن کی رخصت سالم تنخواہ پر تین ماہ کی نصف تنخواہ پر اور بقیہ بلا تنخواہ مل گئی تو عبدالحمید کی باچھیں کھل گئیں۔اس کی سروس مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔اس نے بھی میری طرح سب کچھ صاف صاف لکھ کر درخواست برائے رخصت گزاری۔تو اس کو بی۔ٹی کے پورے سیشن کی رخصت سالم اور نصف تنخواہ پر مل گئی۔

تنخواہوں کے پیسے ملنے' ایک ٹیوشن پڑھانے اور کچھ دوستوں سے ادھار لینے کے

باوجود بھی اس سال ۵۳۔۱۹۵۲ء میں مجھ پر اخراجات کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ایک بھائی کو جو پڑھنے سے بھاگ چکا تھا چچا نے بڑی بھاگ دوڑ سے نارمل سکول گجرات کی جے۔وی کلاس میں داخل کرادیا تھا۔ دوسرا اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال میں جماعت دہم میں تھا۔ بھائی جب بھی خط لکھتے پیسے طلب کرتے۔ بڑا ہونے کے ناتے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا اور پھر میں ملازم بھی تو تھا۔ مجھے ہی وہ کہہ سکتے تھے۔

بی۔ٹی میں ہر جانب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پنجاب بھر سے آئے مختلف عمروں کے ہم جماعت تھے جن میں سے بیشتر "اباجان" بلکہ ایک دو داداجان بھی تھے۔ ایسے ہم جماعتوں نے بطور جے۔وی ایس۔وی او۔ٹی یا پی۔ٹی کے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ پختہ عمروں کو پہنچ کر وہ بی۔اے کر پائے تھے اب تدریسی زندگی کے تجربات کے طومار لے کر بی۔ٹی میں آئے تھے۔ دھیرے دھیرے ماحول میں مدغم ہو رہے تھے۔ کالج کے عملے میں تین تین چار چار ایم۔اے کی ڈگریاں لئے ہوئے پی۔ایچ۔ڈی ڈاکٹرز اور غیر ملکی ڈگریوں سے لیس اساتذہ تھے۔ اوپر سے ان دنوں کولمبو پلان اور فل برائٹ سکیم کے تحت امریکن اساتذہ کی ایک پوری ٹیم بھی سنٹرل ٹریننگ کالج میں موجود تھی۔ کوئی امریکا کی اِس یونیورسٹی سے آیا تھا اور کوئی اُس یونیورسٹی سے۔ وہ امریکی اپنے ملک کی کریم تھے۔ اپنی اپنی کارگردگی کے ثبوت میں وہ اپنی تصنیفات' مقالوں کی نقول اور تعلیمی رسالوں کی صورت میں ساتھ لائے تھے۔ بعض خودکار کیمروں' پروجیکٹروں اور فلموں سے بھی لیس تھے۔ میجک لینٹرن اور اسی قسم کے قدیم تدریسی آلات تو کالج کی اپنی لیبارٹری میں بھی موجود تھے۔ عظیم الشان لائبریری تھی۔ غرضیکہ میرے لئے یہ ایک بہت ہی مسحور کن اور دلنشین ماحول تھا کیونکہ میٹرک کے بعد میں کسی رسمی تعلیم کی درس گاہ میں پہلی بار آیا تھا۔ مجھے کالج کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

☆☆

ہوسٹل میں ڈارمیٹری کی زندگی بھی ایک نیا تجربہ تھی۔ پکا پکایا بروقت کھانا' کھلی جگہ پر سونا اور اونچی چھتوں والے کمرے میں رہنا۔ جس کمرے میں مجھے جگہ ملی اس میں ہم چھ طلبہ تھے۔ چودھری عبدالحمید کے علاوہ ظفر احمد تھا جو ملتان کے محکمہ تعلیم میں کسی ہیڈ کلرک کا بیٹا تھا۔ پکا سوشلسٹ تھا۔ اصغر علی گردیزی تھے جو خود محکمہ تعلیم میں کلرک تھے اور اب بی۔اے کرنے کے بعد بی۔ٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ان کا تعلق ملتان کے متمول خاندان سے تھا۔ ملک کرم الٰہی اعوان تھے جو ادھیڑ عمر سے بھی ڈھل رہے تھے۔ جے۔وی ٹیچر کے طور پر ۲۵ برس ملازمت کر

چکے تھے اوراب بی۔اے کرنے کے بعد بی۔ٹی کرنے کا موقع ملا تھا۔ بڑے ''منہ پھٹ اور بدلحاظ''، یعنی حقیقتاً کھرے آدمی تھے۔ ضلع میانوالی سے تھے۔ان کے بچوں کا خط آتا۔''ابا جی! ہم نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔امی کہتی ہیں تمہارے ابو پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔'' چھٹے رفیق محمد یحییٰ عیش لکھنوی تھے۔ مہاجر تھے اور بطور ان ٹرینڈ ٹیچر تلہ گنگ گورنمنٹ ہائی سکول میں تھے۔وہاں سے رخصت لے کر آئے تھے۔ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔سب عزیز واقارب ہجرت کے دوران شہید کر دیے گئے تھے۔اردو بولنے کی وجہ سے ادھر تلہ گنگ کے علاقے میں کوئی ان کو اپنی فرزندی میں قبول کرنے کو بھی تیار نہ تھا۔بی۔ٹی کے بعد چکوال کے ایک ساتھی نے ان کی شادی پوٹھوہار کے علاقے میں کروائی۔سنا ہے کہ اب صاحب اولاد، مطمئن اور خوشحال ہیں۔الحمدللہ۔

ہوسٹل کے ناظم خلیفہ عبدالحکیم صاحب بڑے سخت گیر اور قانونی تھے۔کوئی بیمار ہو کر بھی رخصت طلب کرتا تو کہتے کہ ہوسٹل کے قوانین میں چھٹی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔غور سے قوانین پڑھیں۔صبح پی۔ٹی میں شامل ہوں۔اگر بخار باقی رہا تو گراؤنڈ میں ہی لیٹ جانا۔کھانا بھی ہمیں وہ طلوع وغروب آفتاب کے پیمانے پر دیتے۔ان سے کہا گیا کہ سردیوں میں تو دن چھوٹے ہوتے ہیں شمسی پیمانہ چل سکتا ہے۔گرمیوں میں گھڑی کا استعمال کر لیجیے۔بولے، آپ نے ہوسٹل کے قوانین پڑھے ہیں۔''ہم نے پروفیسر عطاء محی الدین (والد ضیا محی الدین) وائس پرنسپل اور وارڈن ہوسٹل سے عرض کیا کہ خلیفہ صاحب کچھ باتوں پر ایسے ہی اڑ جاتے ہیں۔انھیں کم از معقول بات تو سن لینے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔ہوسٹل کے رولز کا حوالہ ہی دے کر چپ نہیں ہو جانا چاہیے۔پروفیسر صاحب نے ان سے بات کی۔جب ہم نے بات چیت کے نتیجے کے بارے میں ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ''خلیفہ صاحب نے پوری بات سن کر مجھے تیوری چڑھا کر دیکھا اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔''

ہر ڈار میٹری کا میس منیجر ہر ماہ اتفاق رائے سے طلبہ میں سے انتخاب کیا جاتا تھا اور وظیفے کے حوالے سے ہر منیجر کی خواہش ہوتی تھی کہ ماہوار خرچہ فی کس تیس روپے سے کم ہی رہے۔کبھی دو دو چار روپے کم یا زیادہ بھی ہو جاتے۔جس ماہ چودھری عبدالحمید کو میس منیجر منتخب کیا گیا تو اس ماہ فی کس خرچہ ۶ روپے دس آنے نکلا۔کیا زمانہ تھا۔ڈار میٹری کی طرف سے چودھری عبدالحمید کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

☆☆

اخبار میں پاک فضائیہ کی طرف سے اشتہار چھپا کہ پاک فضائیہ میں شامل ہو کر قومی خدمت بھی کیجئے اور آفیسر بھی بنیے۔ تعلیم بی۔اے اور عمر ۲۴ سال سے کم ہونا چاہئے۔ ابتدائی انتخاب کے لئے فضائیہ کے دفتر ایبٹ روڈ پر کام کے کسی بھی روز صبح آٹھ بجے تا دس بجے تشریف لائیں۔

☆☆

چودھری حمید نے مجھے اکسایا کہ یار ادھر انٹرویو دینے چلتے ہیں ممکن ہے ہمارا ''ٹل'' لگ جائے اور ہمارا مقدر سنور جائے۔ یہاں بی۔ٹی میں جتنے پرانے مدرس آئے ہیں وہ ہر موقع پر کہتے ہیں۔ ''من نہ کردم شما حذر بکنید'' ماسٹری' ٹیچری مدرسی بڑی ذلت کی نوکری ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ ہم لوگ پٹوار کا کورس کر لیتے' پولیس میں سپاہی بھرتی ہو جاتے۔ عمر گنوا چکنے کے بعد ہمارے پاس تو کوئی اور راستہ نہ تھا تم لوگ تو ابھی نوجوان ہو۔ سنبھل جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ کلرکی اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مجھے ایسے مایوس مدرسین سے اتفاق تھا نہ چودھری حمید سے' مجھے تو اس پیشے میں عزت اور سکون ہی نظر آیا تھا۔ ایسے ہی تو شاہجہان نے اورنگ زیب سے قید کے دوران چند شاگردوں کی طلب نہیں کی تھی اور پھر ہمارے حضور نبی اکرمؐ اپنے آپ کو معلم کہلاتے تھے۔ تاہم میں حمید کے ساتھ ایبٹ روڈ پر فضائیہ کے دفتر گیا۔

ابتدائی انٹرویو فلائیٹ لیفٹیننٹ عطاء اللہ نے لیا۔ اس نے میرے چہرے کو گھورا اور پوچھا۔ کیا تم جانتے تھے کہ تم نے آج انٹرویو کے لئے آنا ہے؟ میں نے انگریزی میں جواب دیا ''جی ہاں!'' اس پر فلائٹ لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''جب تم جانتے تھے کہ تم انٹرویو کے لئے آ رہے ہو تو پھر تم نے ''شیو'' کیوں نہیں کی۔ ہمیں آفیسرز درکار ہیں کلرک نہیں تم جا سکتے ہو۔ حمید کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

بی۔اے کرنے اور بی۔ٹی میں پڑھنے کے باوجود ہم فضائیہ کے افسر کو کلرک نظر آ رہے تھے۔ ہماری رسمی تعلیم میں بہتری کی گنجائش تھی تبھی ہم پڑھ رہے تھے لیکن ہماری غیر رسمی تعلیم ابھی انتہائی نامکمل تھی۔ ہم نے کبھی اپنے حلیے پر غور نہیں کیا تھا۔ ہم پیر کے دن دھلے کپڑے پہن کر اور حجام کی مہربانی سے حلیہ ٹھیک کرنے کے عادی تھے۔ باقی ہفتہ اسی حلیے کو باسی کرنے میں گزار دیا کرتے تھے۔ شاید یہ حال ان مدرسین کا تھا جو ساری عمر تدریس و تعلیم

میں گزارنے کے باجود اپنے پیشے سے شاکی تھے۔ میں نے اس چھوٹے سے واقعے سے سبق سیکھا اور مالی مشکلات کے باوجود اپنے معمولات کو نئے سرے سے بہتر انداز میں ترتیب دیا۔ اپنے انتخاب کردہ پیشے کو ایک باوقار اور باعزت حیثیت دینے کے لئے مثالی محنت سے کام کرنے کا عزم بھی کیا۔ میں نے باجڑہ گڑھی کے سفر کے دوران میں اپنے کھلاڑی ہو جانے کا جو فخر کیا تھا۔ مجھ پر اس شیطانی سوچ کا بھرم کھل گیا تھا میں اپنی ذات کی شش جہات سے ابھی مہا اناڑی تھا۔ اناڑی بن کر سوچنے ہی میں عافیت تھی۔

سہ ماہی ختم ہونے پر داخلی امتحانات ہوئے نتائج پر عملی تدریسی تربیت کے لئے مختلف ہائی سکول میں بھیجنے کی خاطر گروپ تشکیل دیے گئے تو اچھے نتائج کی بنا پر مجھے سنٹرل ماڈل سکول ہی میں تربیت کا موقع ملا جو ایک قسم کا انعام تھا۔ زیر تربیت معلمین کی عملی تربیت کی نگرانی ایک تو سکول کا مدرس کرتا اور دوسرے گروپ کے انچارج پروفیسر۔ شہر کے سکولوں کے طلبہ بھی بڑے کائیاں تھے۔ اچھے نظم وضبط کا مظاہرہ کر کے زیر تربیت معلمین پر احسان کرتے اور زیر لب مسکراتے تھے۔ میرے نزدیک یہ عملی تدریس کے اسباق پڑھانا تربیت کا کٹھن اور دشوار ترین مرحلہ تھا اس مرحلے سے کامیاب گزرنا ہماری خوش قسمتی تھی۔

اسباق کے اس پہلے دور کے بعد کالج میں پروفیسران اپنے طریقہ ہائے تدریس، تاریخ التعلیم، بچوں کی نفسیات، نظم وضبط مدرسہ، سمعی و بصری معاونات، تدریس اور معلم کی شخصیت کے متعلق پڑھاتے ہوئے اپنے مشاہدات کی روشنی میں راہنمائی کرتے۔ لیکچرز کے علاوہ تفویضی کام دیا جاتا۔ ہم بے حد مصروف رہنے لگے۔ اپریل مئی ۵۳ء تک سیشن نے ختم ہو جانا تھا کہ درمیان میں 'ختم نبوت' کے حوالے سے اعظم خان کا مارشل آ گیا تھا۔

☆☆

بی۔ٹی کی کلاس کے علاوہ سنٹرل ٹریننگ کالج میں سی۔ٹی کلاس بھی تھی۔ سی۔ٹی کا کورس دو سالہ تھا۔ جبکہ بی۔ٹی کا یک سالہ تھا غیر تدریسی لیکن ہم نصابی سرگرمیاں بھی ساتھ ساتھ شروع تھیں۔ مختلف عنوانات کے تحت ورکشاپس منعقد ہوتیں۔ مذاکرات منعقد کیے جاتے۔ سیمینارز ہوتے۔ امریکی پروفیسر پاکستان میں واقع دوسری درس گاہوں سے اپنے ساتھیوں کو سنٹرل ٹریننگ کالج میں بلاتے رہتے اور وہ اپنے اپنے مضمون کی روشنی میں ہمارے نصاب تعیم سے وابستہ اسباق اور موضوعات نکال کر لیکچرز دیتے۔ ایک ناقابل بیان علم وعرفان کا دھارا بہہ

رہا تھا۔ کم از کم میں ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اپنا اب تک کا حاصل کردہ علم اور تجربہ ماحول کے مقابلے میں بڑا حقیر نظر آ رہا تھا۔ اپنے زعم میں، میں تو عقل و دانش کی بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا لیکن اب واضح احساس ہو رہا تھا کہ سمندر کے مقابلے میں میرے دامن میں صرف چند قطرے ہی تھے اور اس پر اترانا میری حماقت تھی۔ میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ صفر ضرب صفر۔

مطالعے کا بھی ایک رخ اور مقام ہوتا ہے۔ کوئی سر پیر ہوتا ہے اور تدریس ایک مشکل ترین فن ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جسے کوئی ڈھنگ کا کام یا روزگار نہ ملا وہ مدرس بن گیا' یہ تدریس کے فن کی توہین ہے۔ اس فن کے حصول میں بڑی ریاضت درکار ہے۔ اس کی بہت سی جہتیں ہیں۔ جو مضامین ہم تربیت کے نصاب میں پڑھ رہے تھے وہ بہت محدود تھے۔ علم کی کوئی بھی شاخ لے لیں وہ بحر ناپیدا کنار ہے اور تدریس تو ایک ایسا شعبہ ہے جس کی ابتدا بنی نوع انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے خود آدم علیہ السلام کو مختلف چیزوں کے ناموں کی تعلیم دی۔

تاریخ التعلیم کے پروفیسر عبدالغفور چودھری نے نمونے کا ایک سبق ''ریڈنگ'' پر دیا۔ انھوں نے ایک پیرا انگریزی کی کسی درسی کتاب سے پڑھا۔ تلفظ' آواز کا زیر و بم اور الفاظ کے معانی کا انکشاف ان کے پڑھنے کے انداز ہی سے ہو رہا تھا۔ نئے پرانے جملہ طالب علم مدرسین عش عش کر اٹھے۔ اپنے فن میں کامل ہونا بڑی بات ہے اور بعض اساتذہ ہی ایسے تھے۔ مقام شکر ہے کہ ہم نے ایسے اساتذہ سے فیضان حاصل کیا۔

☆☆

اسی تربیت کے طفیل میں نے پہلی مرتبہ کوئلے اور نمک کی کانیں دیکھیں۔ سیمنٹ فیکٹری دیکھی۔ پہاڑوں کی زندگی کا نظارہ کیا۔ ابلتے چشمے اور زمین دوز کاریز دیکھیں۔ یہاں تک کہ اردگرد کی زندگی کو نئے تعلیمی تناظر میں دیکھا اور بہت کچھ پایا۔ میں اب تک کنویں کا مینڈک رہا تھا اور پھر بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھا کرتا تھا۔ میرا کتابی علم بھی اب مجھے سطحی لگ رہا تھا اور میں انگریزی شاعر پوپ کے اس خیال کو ذہن میں دہراتا رہتا کہ علم کے چشمے سے جی بھر کر پانی پیئو' ورنہ اس کو چکھو بھی نہیں۔ واقعی نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملاں خطرہ ایمان کی مثال میری صورت حال پر درست بیٹھتی تھی۔ مجھے بہت کچھ پڑھنا اور کرنا تھا۔

اپنے کمرے کے ساتھیوں کے علاوہ دیگر مختلف طبائع رکھنے والے طلبہ کے میل جول

سے ذہنی افق کافی وسیع ہو رہے تھے۔ کچھ ساتھی سرائیکی ادب میں اچھا نام رکھنے والے تھے۔ کچھ پوٹھوہار اور کوہستان نمک کی وادیوں کے باسی تھے۔ آزاد کشمیر اور مری کے بالائی حصوں کے احباب تھے۔ وادی سون سکیسر کے طلبہ بھی کافی تھے۔ کچھ شاعر تھے' کچھ احباب ادیب تھے۔ کچھ خوش گلو تھے' مقرر تھے' لطیفہ باز' ٹھٹھا مخول کرنے والے' جگت باز' مولوی صاحبان' نعت خواں بلکہ نعت گو غرضیکہ ہر قسم موجود تھی۔

میں ان دوستوں کو اچھی طرح جاننے کے ارادے سے ان سے بہت سوالات کرتا۔ ''افسانہ از افسانہ می خیزد'' والی بات ہوتی۔ میرے اندر ایک کہانی کارکروٹیں بدلتا رہتا۔ ظفر کی معیت میں' میں سوشلسٹوں کے اجلاسوں میں بھی جایا کرتا۔ مارکس اور لینن کے نظریات سے خود کو آشنا کرتا۔ حمید کے ساتھ فلم اور ڈرامے تک دیکھتا۔ گردیزی کے ذریعے محکمہ تعلیم کے دفاتر میں واقفیت حاصل ہوئی۔ ملک کرم الٰہی اعوان جن کو ہم مولانا کہتے تھے سے زندگی کے سنجیدہ معاملات پر بات چیت ہوتی رہتی اور وہ اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے نجی زندگی کے حوالے دیتے۔ عیش لکھنوی غزلیں کہتا جس سے ہم سب پر حزنیہ کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہم دل سے اس کے لئے دعا کرتے۔

سٹالن کے مرنے پر ظفر رو دیا تو ملک کرم الٰہی اعوان نے بڑی سنجیدگی سے ظفر سے کہا: ''دیوس! وہ خدا کا منکر ایک طاغوت مر گیا ہے تو' تو کیوں روتا ہے۔ اس نے تجھے کیا دیا ہے۔ اگر تیرا حقیقی باپ سنے کہ تو اس دجال اعظم کو عظیم باپ کہتا ہے تو وہ تمہاری ماں کو طلاق دے دے۔'' ظفر کا رونا بند ہو گیا اور ایک نئی لڑائی چھڑ گئی۔ مولانا اور شدید ہو گئے۔ برادری میں فتح بھی ان ہی کی ہوئی۔ ظفر کو شرمندہ ہونا پڑا۔

☆☆

یہاں سنٹرل ٹریننگ کالج میں جبال کے چودھری عبدالغنی جونیئر وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے صاحبزادے محمد اسلم سے بھی تعارف ہوا۔ انتہائی مخلص' دنیدار اور ہمدرد نوجوان تھا۔ اس نے عین عالم شباب میں ہی داڑھی رکھ لی تھی اور پنجگانہ نماز ادا کرتا۔ کبھی کبھی امامت بھی کراتا۔ مجھے اکثر کہتا۔ ''اوئے! جبال میں تجھے سب یاد کرتے ہیں اس کے ذریعے ہی میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی اطلاع کے لئے سکول میں درخواست بھیجی تھی کہ میں نے سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا اور میری حصولِ تعلیم کے لئے رخصت فلاں تاریخ سے

فلاں تاریخ تک منظور فرمائی جائے۔ ایسی رخصت ملنا ناممکن تھی لیکن یہ ایک اہتمام حجت چھٹیوں کے ایام کی تنخواہ لینے کا تھا۔ محمد اسلم کے چند اور عزیز جو جبال کے گردونواح کے دیہات کے باسی تھے اور سی۔ ٹی کے طالب علم تھے۔ ان کے سامنے جب بھی مجھ سے ملتا۔ ان کو پکار کر کہتا۔ ''اوئے محمد خان' اوئے نواز...... دیکھو اس قاضی کو' یہ ہے وہ جادوگر جو جبال میں میرے باپ تک کو بھی سحر زدہ چھوڑ آیا ہے۔ اس کو ہم نے ادھر جبال ہی میں لے جانا ہے۔'' اس کی اس قدر اپنائیت پر مجھے پیار آ جاتا۔ میں اسے کہتا کہ وہ اپنے گاؤں کے اسکول کو خود ہی کیوں نہیں سنبھالے گا تو وہ کہتا ہے۔ ''ہمارا شریکہ برادری ہے میں خواہ فرشتہ بن کے رہوں۔ شریکہ برادری والے مجھے شیطان ہی کہیں گے۔'' اس کی یہ بات سچ ہی تھی۔ گھر کی مرغی ہوتی بھی تو دال کے برابر ہی ہے۔

ایک روز میں نے تمہید باندھی کہ وہ میری دو ماہ کی تنخواہ تو چودھری شاہ محمد ہیڈ ماسٹر سے لے آئے۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ تو اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا: ''کتنی ہو گی تمہاری تنخواہ۔ تم ایف۔ اے۔ ہی تھے نہ اس وقت۔ مجھے رسیدی ٹکٹوں پر دستخط کر دو۔ باقی پیسوں کی پرواہ نہ کرو۔ یہ تین سو مجھ سے ابھی لے لو باقی حساب کتاب بعد میں کر لیں گے۔ اور ہاں! یہ تو تنخواہ کی بات ہے تمہیں اگر ضرورت پڑے تو کبھی کسی اور کو نہ کہنا صرف مجھے ہی کہنا۔ میرے باپ نے بڑی زمینیں اور کلیم خرید رکھے ہیں...... اور یار تجھے وہ شرما داس اور اجمل بڑا یاد کرتے ہیں۔ ماسٹر عبداللہ تو تیری صفتیں ہی کرتا رہتا ہے۔''

اسلم سے دوستی پر چودھری حمید پر میرا کارپوریشن سے رخصت پر جا کر نوکری کرنے کا راز فاش ہوا لیکن مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

الغرض جس قدر کردار مجھے بی۔ ٹی کرنے کے دوران میں ملے اور جن سے میں بے تکلف ہو کر ''تو۔ میں'' کے انداز میں گفتگو کر سکتا تھا۔ پھر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ پر کہیں بھی نہیں ملے' گو شمار کرنے کو تو بعد کی زندگی میں ہزاروں لوگوں' ہزاروں مدرسین اور دیگر ہزاروں قسم کے اہلکاروں' افسروں اور کارکنوں سے سابقہ پڑا اور ان سب سے میں نے سوائے چند کے بطرز احسن نبھاؤ کیا۔

پرنسپل مسٹر بی۔ اے ہاشمی کو داخلے کے دن دیکھا تھا۔ سال بھر نجانے وہ کہاں رہے۔ کبھی کوئی خطاب نہیں کیا۔ کوئی راؤنڈ نہیں لگایا۔ کوئی سبق پڑھایا نہ کسی سبق کی نگرانی کی۔ پھر

ان کی زیارت سالانہ کھانے پر ہوئی۔ پوری گراؤنڈ شامیانوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج میں بی۔ ٹی اور سی۔ ٹی میں پڑھنے والی طالبات کو بھی ان کے عملے سمیت مدعو کر رکھا تھا۔ امریکی پروفیسر اپنے اپنے کنبے ہمراہ لائے ہوئے تھے۔ کچھ آزاد خیال پاکستانی پروفیسر بھی اپنی بیگمات کے ہمراہ تھے۔ اس نسوانی ''ٹچ'' سے تقریب بڑی رنگین ہو گئی تھی۔ نجم نعمانی کہ شاعر، نعت خواں اور گلوکار بھی تھا' اس نے احسان دانش کی غزل ''بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے۔'' ترنم سے سنا کر ماحول پر سناٹا طاری کر دیا۔ ایک کونے میں قناتوں کے عقب میں کھانا پک رہا تھا۔ شاید گوشت دھویا جا رہا تھا اس لئے بہت سی چیلیں دائروں میں گراؤنڈ کے اوپر پرواز کر رہی تھیں۔ اچانک اس موقعہ پر ایک دھماکہ ہوا اور فضا سے ایک چیل بل کھاتی اس کالے برقعے میں ملبوس خاتون کی راہ میں آ گری جو ماہر تعلیم مسز ست نام محمود کے ہمراہ ٹاٹ بچھا کر بنائی گئی روش پر چلتی پنڈال کی سمت بڑھ رہی تھی۔

☆☆

چیل کو راستے سے ہٹایا گیا۔ پرنسپل بی۔ اے ہاشمی نمودار ہوئے اور جھک کر خاتون کو سلام کیا۔ پھر اس خاتون کی ہمراہی میں پنڈال میں داخل ہوئے تو سب حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ تخصیص نہیں ہو رہی تھی کہ لوگ پرنسپل کے اعزاز میں کھڑے ہوئے یا خاتون کے احترام میں۔ قریب سے دیکھا تو خاتون نے سیاہ رنگ کی جرابیں بھی پہن رکھی تھیں۔ اور ہاتھوں پر سفید دستانے بھی چڑھائے ہوئے تھیں۔

سٹیج پر چڑھ کر مسٹر۔ بی۔ اے ہاشمی نے ایک پانچ منٹ کی تقریر کی۔ اس تقریر میں کیا جادو تھا۔ کیا الفاظ تھے۔ مجھے یاد نہیں لیکن اس کا تاثر مجھے اب تک یاد ہے کہ ہم سب جو اس بات کے شاکی تھے کہ پرنسپل نے ہماری تربیت میں کوئی حصہ نہیں ڈالا۔ سال بھر بھی چہرہ نہیں دکھایا' کوئی حرف نہیں پڑھایا' گم سم رہ گئے۔ شاید وہ ہم سے دوری کا پورا وقت اس پانچ منٹ کے خطاب کی تیاری کرتے رہے تھے یہ ان کا الوداعی خطاب تھا۔ پھر انھوں نے کہا کہ اب لاہور کی نامور خاتون ماہر تعلیم ڈپٹی ڈائریکٹریس محکمہ تعلیم پنجاب ڈاکٹر مس خدیجہ فیروز الدین آپ سے خطاب کریں گی تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ خواتین ان سے زیادہ واقف تھیں۔

ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین پردے کے اندر رہ کر ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والی پہلی

مسلمان خاتون معلّمہ تھیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ پردہ تعلیم کے حصول میں رکاوٹ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے ابتدائیے میں کہا کہ مسٹر بی۔ اے ہاشمی پرنسپل نے میری آمد پر دھماکہ کر کے میرا منفرد انداز میں استقبال کیا ہے۔ وہ ایسے ہی انفرادی کارنامے سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی مہارت ہے کہ چیل کو میرے اوپر گرانے کے بجائے انھوں نے اسے میرے قدموں میں گرایا لیکن بچاری چیل کو جان سے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ امریکی خواتین پر رعب تو نہیں جما رہے۔

اس پر ایک بڑا قہقہہ پڑا پھر انھوں نے ہمیں مدارس میں جا کر تعلیم کے فروغ دینے کے بارے میں کچھ نصیحتیں کیں۔ ان کا لہجہ' زبان اور طرز خطاب ان کی شخصیت کی طرح ہی منفرد تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ پرنسپل صاحب اور مہمان خاتون میں سے عظیم کون ہے؟

محترمہ کھانے میں شمولیت سے معذرت کر کے تشریف لے گئیں۔ ہاشمی صاحب انھیں ان کی کار تک چھوڑنے گئے۔ کھانے کے دوران میں ہاشمی صاحب نے اپنے عملے کو بتایا کہ انھوں نے مہمان خاتون کو خوش آمدید کہنے کے لئے فائر کیا تھا چیل تو اتفاقاً ہی زد میں آ گئی۔

وائس پرنسپل عطامحی الدین نے بعد میں ہمیں بتایا کہ یہ پرنسپل کی کسر نفسی ہے۔ وہ ایک زبردست شکاری ہیں۔ اڑتی مرغابیوں کو وہ ایسے نشانے بھی لگا سکتے ہیں کہ وہ زخمی ہو کر ان کے پاؤں میں آ گرتی ہیں۔

☆☆

اجلاس کے اختتام پر کالج ہوسٹل کے وارڈن خلیفہ صاحب نے اعلان کیا کہ ہفتے کی رات دس بجے کی پسنجر ٹرین سے ہم گھوڑا گلی کے لیے روانہ ہوں گے۔ اسی رات سے بی ٹی کلاس کے لئے ہوسٹل بند کر دیا جائے گا' لہٰذا آنے والے پانچ دنوں کے اندر اندر بی ٹی کے طلبہ اپنے اپنے واجبات ادا کر کے پروویژنل سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں۔ شاید انہی دنوں میں انھیں وظیفے کی آخری قسط بھی ادا کی جائے۔ وہ بھی وصول کریں۔ وظیفے کا ذکر کرتے ہوئے خلیفہ صاحب ذرا مسکرائے تو ہم نے خوب تالیاں پیٹیں کہ وہ شخص مسکرا بھی سکتا تھا؟ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ پورے سال میں ہم نے خلیفہ صاحب کی پیشانی پر تیوریاں ہی دیکھی تھی۔

ہم سب پہلے سے جانتے تھے کہ اسکاؤٹس ماسٹرز ٹریننگ کورس کے لئے ہمیں پنجاب

بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کے گرمائی مرکز گھوڑا گلی (مری ہلز) میں تین ہفتے گزارنا ہیں۔ یہ کورس جملہ مدرسین کی تربیت کا لازمی جزو تھا اور اس کا ذکر کالج کے معلوماتی کتابچے میں بھی ''لازمی'' کے عنوان کے تحت کر دیا گیا تھا۔

اگلے چار دن بڑے نفسانفسی کے دن تھے۔ ہم اپنے کمرے کے چھ افراد بھی رات ہی کو اکٹھے ہو پاتے۔ ہر کوئی اس چکر میں تھا کہ وہ دوسرے سے پہلے پروویژنل سرٹیفکیٹ حاصل کرے اور سب سے پہلے اپنے روزگار کا بندوبست کرنے کے مراحل طے کرے۔ اور تو اور گہرے دوست بھی ایک دوسرے کو نہیں بتا رہے تھے کہ وہ کیا اور کس قسم کی بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ حمید چودھری بھی انہی میں سے ایک تھا۔ جیسا کہ آپ کو بتایا چکا ہے پوری بی ٹی کلاس میں کئی اعتبار سے رنگا رنگی تھی۔ قومی اسکولوں سے آنے والے غیر تربیت یافتہ مدرسین واپس انہی اسکولوں میں بہتر عہدوں اور اچھی تنخواہوں پر جانے والے تھے، بس وہی ذرا ست تھے۔ ان میں سے بعض انجمنوں کے صدور سے قرابت داری کی بنیاد پر مدارس کے سربراہ بننے والے تھے۔ بعض دور دراز کے پسماندہ علاقوں کے سرکاری اسکولوں کے مدرسین تھے جنہیں تربیت کے بعد اب رواں گریڈ ملنا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے دیہاتی مڈل اور ہائی اسکولوں میں بہت سی اسامیاں خالی تھیں۔ وہاں بھی تعلقات والے دوست براہ راست سینئر سکیل پانے والے تھے۔ ان میں چودھری محمد اسلم بھی تھے۔ نچلے گریڈوں والے یعنی جے وی، ایس وی اور جے اے وی وغیرہ اب سنیئر انگلش ٹیچر کا سکیل حاصل کرنے والے تھے۔ ان میں ملک کرم الٰہی بھی تھے۔ نئی امیدوں کی ایک یلغار نے سب کو زیر زبر کر رکھا تھا۔

ہر کہیں گریڈوں اور مستقبل کے چکروں کی سرگوشیاں تھیں، سفارشیں تلاش کی جا رہی تھی۔ انہی دنوں بعض دور دراز کے قومی اسکولوں کی طرف سے ''ضرورت اساتذہ'' کے قلمی اشتہار کالج کے نوٹس بورڈ پر بھی چسپاں کئے گئے تھے اور ان کی روشنی میں بعض ''مسکین'' اساتذہ مشتہرین سے ان کی قیام گاہوں پر جا کر ملازمتیں حاصل کرنے کی بات چیت کر رہے تھے۔ روٹی کمانے ہی کا سارا جھنجھٹ تھا۔

۱۹۵۳ء کے سال میں پورے لاہور ریجن میں اولین تقرر سید اصغر علی گردیزی کا ان کی پسند کے اسکول میں ملتان شہر میں ہوا۔ ایک تو وہ محکمے کے ملازم تھے۔ دوسرے ملتان ہی کے ملک فتح محمد اسٹیبلشمنٹ کے ہیڈ کلرک تھے جن سے ان کی یاد اللہ تھی۔ ملک فتح محمد محکمے کے

نابغہ تھے۔ اپنے کام کے ماہر تھے اور افسران بالا بھی ان کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی افسرانِ بالا ان کو خصوصی کاموں کے نام پر نوازتے رہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈز کے سر رشتہ ہائے تعلیم کے معتبر ہیڈ کلرکوں کی نسبت محکمہ تعلیم پنجاب کے ریجنل دفاتر کے اسٹیبلشمنٹ اسسٹنٹ کہیں بڑھ کر والا صفات تھے۔ ملک فتح محمد کے جانشینوں میں سے بھٹو دور کی آمد تک تین اور اسسٹنٹ ملک خادم حسین، سید طفیل حسین شاہ اور چودھری صدیق کنجاہی بھی ایسے ہی قد آور حضرات تھے۔ ایک سائل مدرس حضرو سے دفتر آتا یا رحیم یار خان سے ریل کا راتوں رات سفر کر کے دفتر پہنچتا۔ کام کا تعلق اسٹیبلشمنٹ سے ہوتا اور اتفاق سے اسسٹنٹ صاحب چھٹی پر ہوتے یا افسران نے انھیں کسی کام سے کہیں لاہور سے باہر بھیجا ہوتا تو ڈائریکٹر تک یہ کہہ دیتے کہ خادم حسین نہیں ہے لہٰذا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تین دن بعد آئیں۔ طفیل شاہ نہیں ہے اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ دو دن بعد آئیں۔ آپ اتنی اتنی دور سے آنے والوں کی......اور وہ بھی مدرسین کی حالت زار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اُن کے معاملات ڈویژن کی سطح پر، جہاں اس وقت سینئر کلاس ون انسپکٹر ہوتا تھا، حل نہیں ہو سکتے تھے تو ان ہی کو لاہور کا رخ کرنا پڑتا تھا۔

گردیشن لسٹ کی رو سے گردیزی ۱۹۵۳ء کے سال میں سرکاری مدارس میں سب سے سینئر شمار ہوئے۔ انگریزی مدرسین کی یہ سینیارٹی آنے والی تمام ترقیوں میں شمار ہوتی ہے اور اسے انٹر۔سی سینیارٹی کہا جاتا ہے۔ اس میں قبل دو پہر اور بعد دو پہر حاضر ہونے کا فرق بھی بعض اوقات بڑا اہم ہو جاتا ہے۔

حمید چودھری نے بھی انہی پانچ دنوں کے اندر اندر سرکاری اسکول میں تقرر کرالیا۔ انھیں یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ اسکاؤٹس ماسٹر کورس کی تکمیل کی ہفتے کے اندر اندر حاضری رپورٹ دیں گے۔ مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ اسکولوں ہی میں پڑھانے کا تھوڑا بہت تجربہ تھا لہٰذا میں نے لاہور ڈویژن کے انسپکٹر آف سکولز کو درخواست دی کہ مجھے ضلع سیالکوٹ کی تحصیل ڈسکہ کے کسی مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر لگایا جائے۔ انسپکٹر کے ہیڈ کلرک نے مجھے بتایا کہ میری درخواست اسامی کی تلاش اور چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ کی منظوری کے لئے سیالکوٹ بھیج دی گئی ہے۔ اس اثناء میں گردیزی صاحب نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ وہ مجھے بھی کسی سرکاری اسکول میں تعینات کرادیں گے اور انھوں نے اس سلسلے میں ملک فتح محمد سے بات کر لی ہے۔

میری عمر سے خاصے بڑے تجربہ کار اساتذہ نے بورڈنگ ہاؤس میں ایک فلسفہ تعلیم

پھیلا رکھا تھا جس کی تبلیغ وہ اپنے سے کم عمر ساتھیوں ''لونڈوں'' کو کرتے رہتے تھے کہ ''بھئی اگر ڈھنگ سے نوکری کرنی ہے تو کسی گورنمنٹ ہائی اسکول مین کرو' آہستہ آہستہ کسی مقام پر پہنچ جاؤ گے۔ اگر پیسہ کمانے کا خیال ہے' تو اپنا سکول کھول لو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر کسی شہری قومی اسکول میں میں نوکری کرلو۔ تنخواہ تو کم ہوگی لیکن ٹیوشن بہت زیادہ ہوگی۔ اور اگر عیش کرنا مقصود ہوتو ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول میں پڑھاؤ۔ تنخواہ تو کم ہوگی ہی لیکن ذمہ داری بھی کوئی نہیں ہو گی'' ان کا یہ فلسفہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔

چودھری اے ڈی نثار مالک وڈائریکٹر کشمیر سکولز لاہور نے اسی فلسفے سے متاثر ہوکر اپنا اسکول کھولا اور اب اس کے ثمر کی صورت میں مین ماشاء اللہ ایک اسٹیٹ کے مالک ہیں۔ سر کاری اسکولوں میں جانے والے بہت سے دوست محکمے میں نمایاں ہوئے۔ غیر ملکی وظائف پر باہر گئے۔ افسر بنے' لیکچرر بنے اور پروفیسر ہوئے۔ رہے میری طرح ڈسٹرکٹ بورڈز کی سروس مین جانے والے تو چودھری محمد اسلم کو اس کے جونیئر وائس چیئر مین باپ نے براہ راست ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تعینات کرادیا جبکہ مجھے مڈل اسکول جبال کی ہیڈ ماسٹری قبول کرنے کو کہتے رہے۔ فرق ملاحظہ فرمائیں مجھے ملنے والا عام پے سکیل جہاں ختم ہوتا تھا وہاں سے چودھری اسلم کا اسکیل شروع ہوتا تھا اور وہ ایک اچھے انسان اور دیندار ہونے کے باوجود خود کو اس فرق مراتب کا حقدار سمجھتے تھے۔

گھوڑا گلی روانہ ہونے سے دو چار گھنٹے قبل ہوسٹل پھر سے بھر گیا۔ وہ دوست جوان دونوں اپنا مستقبل سنوارنے کا بندوبست کر چکے تھے بڑے خوش تھے۔ اپنی کامیابی وکامرانی کی روداد یں ایک دوسرے کو سنا اور سن رہے تھے۔ میری تو ابھی درخواست ہی سیالکوٹ پہنچی تھی۔ چودھری اسلم میرے لئے اپنے والد چودھری عبدالغنی کے علاوہ عبداللہ صاحب' ماسٹر شاہ محمد صاحب اور برخوردار اجمل کا پیغام لائے تھے کہ میں جبال ہی آجاؤں اور بطور ہیڈ ماسٹر اب وہاں میری زیادہ عزت ہوگی۔ چودھری صاحب نے میرے لئے صرف عزت اور اپنے لیے قلعہ سوبھا سنگھ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے یہ انتخاب منظور نہ تھا۔ میری سوچ اب اپنے گاؤں پر مرتکز تھی۔ میں کسی نزدیکی مڈل اسکول میں کام کرنا اور رات کو اپنے گھر واپس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر ابھی مجھے لاہور کارپوریشن سے بھی فارغ ہونا تھا' لہٰذا میں ''دیکھا جائے گا'' پر تکیہ کیے بیٹھا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۸)

ملکہ کوہسار کی سمت سفر

رات دس بجے کے قریب راولپنڈی روانہ ہونے والی پسنجر ٹرین میں پوری کلاس کے لئے ایک بوگی بک تھی۔ لاہور میں گرمی جوبن پر تھی' تاہم پہاڑوں پر پائی جانے والی ٹھنڈ سے بچاؤ کے لئے ہم نے گرم بستر اور گرم کپڑے ساتھ لے لئے تھے۔ لاہور سے گاڑی دو گھنٹے لیٹ روانہ ہوئی۔ ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی وہ تین گھنٹے بعد وزیر آباد پہنچی تو وہاں جیسے سو ہی گئی۔

اس سے پہلے میں جغرافیہ گروپ کے ساتھ ایک مطالعاتی سفر کھیوڑہ کی نمک کی کان' ڈنڈوت کی میپل لیف سیمنٹ فیکٹری اور کوئلے کی کانوں کے مشاہدے کے لئے کر چکا تھا۔ ٹرین کا وہ سفر رات کی وجہ سے بغیر کسی تفریح اور لطف کے طے ہوا تھا۔ اب میں محکمہ ریلوے کی کارگزاری کا شکر گزار تھا کہ جب گاڑی گجرات سے آگے نکلی تو پو پھٹنا شروع ہو گئی۔ میں نے اپنی بے خواب آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے اور کھڑکی کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ گاڑی پر اسرار چکنی مٹی کی پہاڑیوں میں سانپ کے مانند بل کھاتے بڑی خوفناک لگتی۔ وہ دو مرتبہ سرنگوں میں گھسی' تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بتیاں روشن کرنا پڑیں۔ جہلم دریا عبور کیا تو مٹی کی بھربھری چٹانوں نے عجیب وغریب شکلیں اختیار کر رکھی تھیں۔ سب کچھ مختلف اور نیا نیا لگ رہا تھا۔

لیٹ روانہ ہونے والی اور راستے میں لیٹ لیٹ کر چلنے والی گاڑی راولپنڈی کے نزدیک علاقوں میں اب فراٹے بھرتی اڑی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن پر رکتی بعد میں تھی' پہلے روانگی کی سیٹی بجا دیتی۔ ساتھ ہی گارڈ اپنی وسل بجا دیتا۔ سبز جھنڈی اس نے اپنے ڈبے کے باہر مستقل طور پر لٹکا دی تھی۔ چند دوستوں کا خیال تھا کہ گاڑی کا گارڈ اور انجن کا ڈرائیور دونوں اندھراتے (رات کو نظر نہ آنا) کے مریض تھے اور اب دن کی روشنی میں ''لیٹ'' نکال رہے تھے۔ واقعی انھوں نے لیٹ نکال لی تھی۔ راولپنڈی پہنچنے پر گاڑی صرف ساڑھے تین گھنٹے لیٹ رہی تھی۔

اسکاوٹ کیمپ جانے کے لیے جلد ہی بسوں کا بندوبست ہو گیا اور میں پھر کھڑکی کے ساتھ نشست حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ گیارہ بج رہے تھے مگر شوق سفر میں بڑھتی گرمی کا احساس دب کر رہ گیا تھا۔ ملکۂ کہسار کی سرسبزی و شادابی کے تصورات میں کھویا میں راولپنڈی شہر کی پرہجوم سڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ جلد ہی بسیں بے آب و گیاہ اونچی نیچی ڈھلانوں پر دوڑنے لگیں۔ ایک اونچی جگہ درختوں کے جھنڈوں میں واقف دوستوں نے بتایا کہ وہ امام بری کا مزار ہے۔ اسی طرح راول جھیل کی طرف بھی اشارے ہی ہوئے تھے۔ گاڑیاں آہستہ آہستہ بلندیوں کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ کوئی گھنٹے بعد وہ موڑ آیا جس کے آگے یکایک ٹھنڈی ہوائیں ہمیں خوش آمدید کہنے گاڑیوں کے اندر گھس آئیں۔ الحمد اللہ! اللہ کی رحمتیں کس کس انداز میں انسانوں کو آرام جاں مہیا کرتی ہیں۔

چھارا پانی نامی مقام پر بسیں رکیں۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چشمے کا ٹھنڈا پانی پیا۔ یہ زندگی کا انوکھا تجربہ تھا۔ سبحان اللہ! اس قدر ٹھنڈا اور شفاف پانی، معدنیات سے بھرپور۔ چڑھائی کی وجہ سے گرم ہو جانے والے انجنوں اور ٹائروں پر بھی اسی پانی کی بالٹیاں الٹی گئیں۔ کچی پکی خوبانیاں بک رہی تھیں۔ دوستوں نے وہ خریدیں اور پھر دستیاب کھانے سے پیٹ بھر گئے اور بسیں پھر بل کھاتی، ٹھنڈی سڑکوں پر بلندیاں طے کرنے لگیں۔ دائیں طرف چیل کے دیو قامت درخت ڈھلانوں پر کھڑے نظر آتے۔ اوپر سفید مٹیالے بادل سایہ کیے ہوئے تھے۔ بائیں طرف نظر پڑتی تو بادل ہم سے نیچے وادیوں کے اوپر تیرتے دکھائی دیتے۔ کہیں کہیں گہرائی کا احساس خوف تک دلا دیتا۔ ''مری بروری'' نامی شراب کے کارخانے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور سب کی رائے تھی کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اس کو جلا دینا چاہیے تھا۔

لیجیے گھوڑا گلی آ گئی۔ بہت سے ساتھیوں نے اپنے بستر سروں پر رکھے اور اوپر کی سمت چڑھنے لگے۔ گو فاصلہ کم تھا لیکن راستوں کے پیچ و خم اور اترائی چڑھائی کی وجہ سے میل بھر ہو گیا۔ کیمپ میں انتظامیہ نے ہمارے کالج رول نمبروں کے مطابق آٹھ آٹھ کے ایک پٹرول (دستہ) کو ایک خیمہ الاٹ کر رکھا تھا۔ خیموں کے اندر گھس کر ہم بستر بھی نہیں کھول پائے تھے کہ وہ وسل بجی جس کے متعلق ہمیں پہلے سے بتایا گیا تھا کہ اس کے بجنے پر ہمیں اسمبلی میں حاضری کے لئے اسکاوٹ وردی پہننا ہو گی۔ ہمیں تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ نیند بھی آ رہی تھی مگر حکم بجا لانا بھی ضروری تھا۔ وردیاں پہن لینے کے فوراً بعد دوسری وسل بجی جو بلاوے کی وسل تھی۔ ہم

نشان زدہ دو نصف دائروں پر جا کر کھڑے ہوئے بگل بجا' پرچم لہرایا گیا۔ سلامی ہوئی۔ میاں عبدالرؤف سیکرٹری بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن پنجاب نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اسکاؤٹ ماسٹر ٹریننگ کورس کی غرض وغایت پر تقریر کی۔

ان کے بعد محمد اقبال قریشی سینئر انسٹرکٹر نے ہمیں وہ ہدایات دیں جن کی خاطر اس فوری اسمبلی کا انعقاد ضروری تھا۔ بتایا گیا کہ ہم کیمپ کی حدود سے بلا اجازت باہر نہیں جائیں گے۔ ہر پٹرول اپنا کھانا خود پکائے گا۔ کوئی قریبی دیہات میں سیر یا خرید وفرحت کے بہانے نہیں جائے گا۔ ہر اسکاؤٹ کیمپ کے قواعد وضوابط جو ایک تختے پر تحریر ہیں' پڑھے گا اور ان پر عمل کرے گا۔ کچھ ہی فاصلے پر ہونے والے گرل گائیڈ کیمپ کی سمت تو کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ ہر اسکاؤٹ اگلے دن کا پروگرام ذہن نشین کر کے سوئے گا۔ ہر پٹرول اپنا ایک لیڈر منتخب کرے گا جس کا رابطہ انتظامیہ سے ہوگا۔ رات کو کیمپ فائر میں حاضری ضروری ہوگی۔ دس بجے کے بعد ہر خیمے کی لالٹین بجھ جانی چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔ پھر قریشی صاحب نے ایک دو کاشن دے کر کھڑے ہمیں ڈسمس کر دیا۔

ہمارے پٹرول کا نام ''نادر'' تھا۔ ہم نے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے فٹ بال کے مشہور کھلاڑی قاضی افضل حسین کو اپنا پٹرول لیڈر منتخب کیا۔ اوروں کا تو علم نہیں لیکن میں ٹھنڈی فضا میں اتنا سویا کہ جب دال روٹی پک چکی' تب میری آنکھ کھلی۔ یہ کیمپ کی زندگی کی کرامت تھی کہ ساتھیوں نے مجھے سوئے رہنے دیا تھا ورنہ بعد میں تو قاضی افضل حسین کہیں سے لمبے لمبے ہزار پائے پکڑ لاتا اور میرے بستر کے قریب چھوڑ دیتا۔ میں ان سے خوفزدہ تھا۔ میری نفسیات میں یہ خوف موجود ہے کیونکہ بچپن میں ہمارے گھر کی کوٹھری میں سے ہزار پائے اکثر نکلتے رہتے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ چمٹ کر کھال کے اندر دھنس جاتے ہیں۔ مرزا ہادی بیگ رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں بھی ہزار پائے کے چمٹنے کا ایک واقعہ درج ہے۔ میں چیختا یا بھاگتا تو وہ ان کو ہاتھوں سے پکڑ کر دور پھینک آتا۔ میں آج تک حیران ہوں کہ وہ ہزار پائے سے ڈرتا نہ کراہت کھاتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا وہ ہزار پائے سے نہیں ڈرتا تو وہ اطمینان سے کہتا کہ یہ بے ضرر کیڑا ہے بس ذرا خوفناک نظر آتا ہے' تاہم میرا خوف تو اب بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح بچپن میں تھا۔

میں جماعت ہشتم میں بھی اسکاؤٹ ہوا کرتا تھا۔ اسکاؤٹ عہد اور اسکاؤٹ قوانین

مجھے تب سے یاد تھے۔ گیجٹ بنانا بھی جانتا تھا اور روٹی پکانا بھی۔ رسیوں سے خصوصی گرہیں بھی لگا سکتا تھا۔ پارہ چنار، سیالکوٹ اور مرالہ ہیڈ کے سات سات روزہ دو اسکاؤٹس کیمپوں میں خیمہ زندگی کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ خیمے کا رکھ رکھاؤ، بستروں کو تہ کر کے لگانا اور دیگر بہت سی باتیں مجھے پہلے سے معلوم تھیں۔ میں نے ''ٹنڈرفٹ'' کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ میری اس تربیت کا اعادہ ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ معلومات کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اسکاؤٹس ماسٹرز کورس میں ہائکنگ، اشاروں کی زبان، وسلوں کی زبان، پیغام رسانی، ابتدائی طبی امداد، خطرات میں گھرے لوگوں کی امداد، ناموافق حالات میں گزارہ کرنا، ذاتی تحفظ کی تدابیر غرض بہت کچھ شامل تھا۔ اسکاؤٹس کا ماٹو ہی ''المستعد'' ہے۔ ہر اسکاؤٹ کو روزانہ کم از کم ایک نیکی کرنے پر یقین رکھنا اور کرنا سکھایا جاتا ہے۔

جب میں اسکاؤٹ بنا تھا، تو میری ماں یہ سمجھی تھی کہ بیٹے کو جنگ میں لے جایا جائے گا۔ ماں کی اس بات کے حوالے سے میں نے اسکاؤٹس کیمپ کی مصروفیات کے بارے میں خط لکھا تو کیمپ سے واپسی پر ماں نے بتایا کہ اب اسے کوئی تشویش نہیں تھی کیونکہ پاکستان بن چکا ہے اور پاکستان اگر جنگ کرتا ہے تو وہ جہاد ہوتا اور جہاد میں شمولیت سے روکنا تو کفر ہے۔

کیمپ کے دوران ہمیں دو مرتبہ مری شہر جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ ایک مرتبہ میں چند دوستوں کے ساتھ پہاڑی پگڈنڈی سے لارنس کالج کے قریب سے گزر کر مری تک پہنچا اور پہاڑیوں کی خوب سیر کی۔ واپسی پر سڑک کے راستے بس کے ذریعے کیمپ پہنچا۔ دوسری مرتبہ سڑک کے راستے مری ہلز تک گیا اور اوپر والے راستے سے پیدل کیمپ میں واپس آیا۔ چیل کے درختوں، بڑے بڑے پتھروں کے اوپر بلوں سے باہر نکل کر بیٹھے گرگٹوں سانڈوں، گوہوں ادھر ادھر چرتے گدھوں کے علاوہ کوہستانی بلندیوں کا نظارہ تحیر خیز تھا۔ چشموں کے ٹھنڈے پانیوں اور صحت بخش معطر ہوا کے جھونکوں کا اپنا ہی مزہ تھا۔ ہم پر لارنس کالج گھوڑا گلی کی تعلیم اور اخراجات کی بڑی دھاک بٹھائی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں دو مرتبہ اس کے پاس سے گزرا تو اس کی دیواروں کے باہر مجھے غربت ہی غربت نظر آئی جبکہ ہم نے تربیت کے دوران مثالی اسکول کے بارے میں پڑھا تھا کہ اس کی چار دیوار نہیں ہوتی تاکہ اس کا رابطہ براہ راست معاشرے سے ہو۔ لیکن یہ ایک طبقاتی اسکول تھا۔ اس کا بڑا بھائی لاہور کی شاہراہ قائد اعظم پر ''ایچی سن'' کے نام سے موجود ہے۔

☆☆

پسنجر ٹرین رات کے اندھیرے ہی میں وزیر آباد پہنچی۔ میں نے بستر جس کے اندر مری سے خریدے گئے تحائف بندھے پڑے تھے' گاڑی سے اتارا اور دوستوں کو خدا حافظ کہا۔ میرے ساتھ کئی اور دوست بھی اترے جو پورا سال ہم جماعت تو رہے تھے شکلوں سے آشنائی بھی تھی لیکن بوجوہ ان کے حدود اربعے نامعلوم تھے۔ وہ دوسری ڈارمیٹریوں میں رہتے تھے' اس لئے اجنبیت آمیز آشنائی کی سی کیفیت تھی۔ ان کے بارے میں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا تھا کہ ان کا تعلق بھی وزیر آباد سیالکوٹ ریلوے لائن کے اسٹیشنوں کے گردنواح میں واقع دیہات سے ہے۔ اب سال بعد رات کے ملگجے اندھیرے اور زرد بلبوں کی روشنی میں ان سے تعارف ہو رہا تھا۔ میرا گاؤں پیلی والا ہے' سوہدرہ اسٹیشن کے قریب' میں کاکے والی کا رہنے والا ہوں' فلاں اسٹیشن پر اتروں گا۔ میں پھکلیاں بجوات جاؤں گا میں ہیڈ مرالے سے ادھر ڈھلے والی جاؤں گا وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے بیگانگی کا لبادہ سال بھر کیوں پہنے رکھا؟ بڑی دیر بعد ملازمت کرنے کے دوران اس پردہ داری کا سبب معلوم ہوا۔ یہ منوسمرتی کا کارنامہ تھا۔ ذات پات کا جھگڑا تھا۔ ''کتری'' کا تعلق بال کاٹنے والی برادری سے تھا۔ دھاریوالیہ بافندہ تھا۔ راگی ایک میرزادہ تھا۔ ان سے اگر کہا جاتا کہ فضیلت اس علم کی ہے جسے وہ حاصل کر رہے ہیں تو کوئی تسلیم نہ کرتا کیونکہ ان کے اردگرد کے معاشرے میں انسان کو انسان سمجھنے کا شعور ہی نہیں تھا۔

☆☆

علی الصباح پہلی گاڑی سے میں گاؤں کے اسٹیشن پر جا اترا۔ ابھی وہاں کوئی تانگہ وغیرہ نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنا بستر سر پر رکھا اور پرندوں کی چہکار سنتا گاؤں کی سمت جانے والی کچی سڑک پر چل دیا۔ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر دور تک سنی جانے والی کئی اذانوں کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ کھیتوں کی سمت جاتے مویشیوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی مترنم جھنکاریں نغمے بکھیر رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ کھیتوں کی سمت جا رہے تھے۔ میں ان سے علیک سلیک کرتا گھر کی جانب بڑھتا گیا۔ نماز کے لیے جاگی ہوئی ماں نے دروازہ کھولا۔ صدقے واری ہونے کے بعد اس نے اپنا پرانا جملہ دہرایا: ''تیری راتوں کو سفر کرنے کی عادت نہ گئی''۔

ماں سے ڈرتے میں نے بھی نماز پڑھی اور پھر اپنے بھائیوں کے پاس بچھی ماں والی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ بھائی بالترتیب جے وی اور میٹرک کے امتحانات دینے کے بعد گھر

آ چکے تھے اور نتائج کے منتظر تھے۔ میں نیم خوابیدہ تھا۔ بیدار ہونے پر وہ میری آمد کے متعلق ماں سے پوچھ رہے تھے اور ماں انھیں خاموش رہنے کا کہہ رہی تھی کہیں میں ان کی باتوں سے بیدار نہ ہو جاؤں۔ جب میں سویا تو خاصا دن چڑھے آنکھ کھلی۔

بستر کھولا گیا۔ خوبانیوں کو ماں نے دھویا۔ کچھ دعائیں بھی پڑھیں۔ انھیں محلے میں تقسیم کیا اور تھال بھر کے چچا کے گھر بھی بھیجیں۔ ساتھ ہی وہ منقش ہار اور لکڑی کی ٹکڑیوں سے بنا پرس بھی بھیجا جو میں نے خاص طور پر اپنی عم زاد کے لئے خریدا تھا۔ ماں کے لیے میں خصوصی تسبیح اور جائے نماز لایا تھا۔ وہ اور بھائی اپنے اپنے تحفے پا کر بہت خوش تھے۔

کارپوریشن میں میری رخصت بلا تنخواہ ختم ہونے والی تھی۔ ادھر ماں کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ نوکری پر لگتے ہی میں اس کی بہو کو گھر لے آؤں۔ بھائی بھی ماں کی بڑی پر جوش تائید کر رہے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ابھی بی ٹی کا سال ختم ہوا ہے۔ ملازمت ملے گی، قرض اتریں گے اور پھر ان کی خواہش پوری ہو گی۔ ماں ہر مسئلے کا کوئی نہ حل پیش کرتی رہی۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ اس سال کے اختتام تک ان کی بہو اس کے پاس آ جائے گی۔ چچا جان نے ملاقات پر بتایا کہ ان کی بات دفتر سر رشتہ تعلیم سیالکوٹ سے ہوئی ہے اور افسر مجاز نے کہا ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ انگلش معلم کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہائی اور مڈل اسکول میں بہ امید منظوری تقرر کا پروانہ دے سکتا ہے۔ میں دفتر جاؤں گا تو اسی وقت کام ہو جائے گا۔ فکر کی ضرورت نہیں۔

یکم مئی کو اپنی رخصت کے اختتام پر میں بلدیہ میں ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ پوچھنے والوں کو میں نے مطمئن کیا کہ بی ٹی کا امتحان ہوا ہے۔ نتیجہ نکلنے میں دیر ہے، جب نکلے گا تو پھر میں یہاں سے مستقلاً چلا جاؤں گا۔ لوگ بھی بڑے کائیاں تھے، کہتے کہ بعض لوگوں کے تو احکامات تقرر ''فکسڈ پے'' پر جاری بھی ہو گئے ہیں۔ میں بھی ایسا تقرر کرا سکتا تھا۔ ان بچاروں کو میرے منصوبے کا علم نہ تھا۔ میں ایک بار پھر دو جگہوں پر ملازمت کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بلدیہ سے تو اب رخصت مل نہیں سکتی تھی، تاہم ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملنے والی ملازمت چونکہ ہیڈ ماسٹری کی تھی، لہٰذا میں نے ایک حکمت عملی ''اِدھر ڈوبو، اُدھر ابھرو، اُدھر ڈوبو، اِدھر ابھرو'' کی تیار کی۔ مئی کا مہینہ کارپوریشن میں گزارا۔

☆☆

مئی ہی میں کارپوریشن کے شعبہ تعلیم نے میونسپل ہائی اسکول مزنگ کے لئے درخواستیں برائے سائنس ٹیچرز طلب کیں۔ میں سائنس ٹیچر تو تھا نہیں لیکن میں نے بھی درخواست دے دی۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی ملک گیر کمی کی وجہ سے صرف تین درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان دنوں ایک انگریز مسٹر آر۔ ڈی۔ ہاؤ چیئر مین لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ تھے لیکن ان کے پاس بلدیہ کے ایڈمنسٹریٹر کا اضافی چارج بھی تھا۔ بلدیہ میں ان کی ذہانت' لیاقت اور کارکردگی کا بڑا چرچا تھا۔ انھوں نے ہم تین امیدواروں کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو میں ایجوکیشن برانچ کا سپرنٹنڈنٹ بھی ہماری درخواستیں اور متعلقہ فائل لے کر حاضر تھا۔ اپنی باری پر میں نے مسٹر آر ڈی ہاؤ کو بتایا کہ میں شعبہ ٹیکس بلدیہ لاہور میں جونیئر کلرک ہوں' میں نے پرائیوٹ امیدوار کے طور پر پنجاب یونیورسٹی سے پچھلے سال بی اے کیا اور بلدیہ سے رخصت لے کر بی ٹی کیا ہے۔

ایک تو میں ان ٹرینڈ ٹیچر تھا' دوسرے بلدیہ کا حاضر سروس ملازم بھی۔ میں نے چچا فاروقی اسسٹنٹ سیکرٹری بلدیہ کو بھی انٹرویو کے متعلق بتا رکھا تھا۔ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ شعبہ تعلیم کو بلا کر پوچھا کہ کس کا انتخاب ہوا ہے۔ سپرنٹڈنٹ نے بتایا کہ ذوالفقار احمد کو موزوں ترین امیدوار قرار دیا گیا ہے لیکن صاحب نے لکھا ہے "چونکہ امیدوار بلدیہ کا ملازم ہے' لہٰذا میں اسکا کیریکٹر رول دیکھنا چاہوں گا"۔

☆☆

سپرنٹنڈنٹ چلا گیا تو فاروقی صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے کیریکٹر رول میں انھوں ہی نے میرے خلاف ایک رائے درج کر رکھی ہے۔ میں نے پوچھا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تم ایک مرتبہ لاہور چھوڑنے کی اجازت لئے بغیر گاؤں چلے گئے تھے۔ وہاں سے تم نے میڈیکل سٹوفکیٹ بھیجا تھا۔ میں نے تمہاری معطّلی کے لئے نیچے سے آئی ہوئی تجویز سے اتفاق نہ کیا' تاہم تمہاری رخصت منظور کر کے تمہارے کیریکٹر رول میں "لاپرواہ" کا اندراج کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں خاموش ہو رہا۔ پتہ نہیں کیا ہوا' کیسے ہوا' مجھے دو تین دن بعد احکاماتِ تقرر مل گئے۔ میں یہ احکامات لے کر اسکول پہنچا تو حاجی گلزار احمد صاحب ہیڈ ماسٹر نے مجھے اپنی میز کے قریب کھڑے رکھ کر احکامات پڑھے۔ مجھ سے پوچھا کیا میں بی ایس سی ہوں۔ میرے نفی میں جواب دینے پر انھوں نے میرے احکامات کا ایک گولہ بنایا اور بڑی نخوت سے اسے دفتر کے دروازے کی چک پر پھینکا اور انگریزی میں کہا: "

مجھے سائنس ٹیچر کی ضرورت ہے۔ آرٹس ٹیچر کی نہیں ...... سفارشی لوگ ...... جانے کہاں سے آ جاتے ہیں۔"

مجھے جتنی خوشی اپنے چناؤ پر ہوئی تھی اُس سے کئی گنا زیادہ دکھ ہیڈ ماسٹر کے رویے سے ہوا۔ میں نے اب زیادہ شدت سے خود ہی ہیڈ ماسٹر بننے کا ارادہ کر لیا۔ میرے ذہن میں "جنت کی غلامی سے دوزخ کی آزادی اچھی" کا مقولہ کلبلا اٹھا۔ مجھے بھی ان ہیڈ ماسٹروں جیسی آزادی اور کرسی درکار تھی جنہیں میں کٹھالہ' باجڑہ گڑھی اور جبال میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے دو دن کی رخصت اتفاقیہ لی اور سیدھا جمعے کے روز سیالکوٹ جا پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے اور کیا بات کرنی ہے۔ متعلقہ مہربان نے بتایا کہ مجھے میرے گاؤں کے کسی قریبی اسکول میں ہیڈ ماسٹر متعین نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قریبی ہائی سکول بھی سات میل کے فاصلے پر تھا۔ ہر مڈل اسکول میں ایک بی اے بی ٹی کی اسامی خالی پڑھی تھی لیکن ان پر ایس وی' جے اے وی اساتذہ سفارشات اور تعلقات کی وجہ سے استحقاق نہ رکھنے کے باوجود قابض تھے۔ کوئی کسی ممبر اسمبلی کا عزیز تھا۔ کوئی چیئر مین ڈسٹرکٹ بورڈ کا بندہ تھا۔ کوئی ووٹروں بھری برادری کا دولہا تھا۔ سوچ سوچ کے ہیڈ کلرک صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک بوڑھے خان صاحب جے اے وی ہیں۔ وہ مڈل اسکول کالا گھمناں کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ وہ گھر کے نزدیک ہائی اسکول جا کے چھٹہ جانے پر رضا مند ہیں۔ مجھے ان کی جگہ تعینات کیا جاسکتا ہے۔

میری رضامندی پر ہیڈ کلرک بابو رحمت اللہ نے میری درخواست پر کچھ لکھا۔ چھپے ہوئی تقرر نامے کو پر کیا اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے کمرے میں گئے۔ پھر ٹھیک گیارہ بجے احکامات تقرر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے اسکول کا محل وقوع پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ ابھی وہاں کے ایک مدرس ادھر آنے والے ہیں۔ مجھے ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔ پھر ہیڈ کلرک نے باہر پیپل کی چھاؤں میں جناح ٹوپی پہنے باتیں کرتے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سیالکوٹ تحصیل (غربی) کے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ہیں۔ مڈل اسکول کالا گھمناں انہی کے زیر انتظام ہے۔ میں ان سے بھی مل لوں۔ وہ ایک کالے کلوٹے لمبے تڑنگے قہقے لگاتے ہوئے شخص سے مصروف گفتگو تھے۔ ان کے قریب جا کر میں نے پوچھا:

"اجازت ہے سر:"

''فرمایئے۔'' ٹوپی والے شخص نے کہا۔

''میں آپ کے زیر سایہ مڈل اسکول کالا میں ہیڈ معلم تعینات ہوا ہوں'' میں نے عرض کیا۔

''تو پھر بیٹھیے......'' انھوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گیا تو انھوں نے میرا نام اور گاؤں وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ ساتھ ہی کہا کہ چلو خاں کی جان سفر سے چھوٹی۔ پھر پوچھا انھیں کہاں بھیجا گیا ہے؟'' میں نے ان کو احکامات دکھائے۔ پھر دوسرے صاحب جو سیالکوٹ شرقی کے اے ڈی آئی تھے' نے مجھ سے پوچھا کہ میں سال پہلے باجڑہ گڑھی میں ان ٹرینڈ ٹیچر تو نہیں تھا؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پتہ چلا کہ وہ مسٹر جیکب ہیں۔ میں ان کے نام سے آشنا تھا۔ میں ٹوپی والے شخص میر عبدالرحمن سے پوچھا کہ مجھے کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔ میرا سامان بھی لاہور میں ادھر ادھر پڑا ہے۔ مجھے کچھ دنوں کی فوری طور پر چھٹی درکار ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کل علی الصباح سکول حاضری دیں۔ حاضری رپورٹ کے ساتھ ہی مطلوبہ رخصت اتفاقیہ بھی بھیج دینا۔ انھوں نے مجھے اشارۃً بتایا کہ جے وی' ایس وی مدرسین بی اے' بی ٹی ہیڈ ماسٹر کو بہت کم گوارا کرتے ہیں۔ تجربہ ہے کہ وہ اس کے نقائص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کے مقولے پر عمل کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے کالے کے اسکول میں کوئی ''شیطان'' ماسٹر نہیں ہے۔ مزید بتایا کہ جب آپ چھٹی' میٹنگ یا سرکاری کام سے کہیں جائیں تو آرڈر بک پر تحریر کریں۔ اپنی عدم موجودگی میں اسکول کا انچارج مقرر کریں۔ اپنا ٹائم ٹیبل بھی دوسروں کا تفویض کر کے اسکول چھوڑیں۔ آرڈر بک پر تمام اساتذہ سے اطلاع یابی کے دستخط کرانا ہرگز نہ بھولیں۔ یہ گویا نظم و نسق مدرسہ کی عملی تربیت کا پہلا سبق تھا۔

میر صاحب نے شفقت فرمائی۔ میرے لیے چائے بھی منگوائی۔ جیکب صاحب ہنستے ہنساتے رہے کہ بھائی چائے کا کپ پی لو اور جتنے کپ اے ڈی آئی کے پیئو' ان کے برابر ایک ایک مرغی بھی تیار رکھنا۔ ادھر کالے کی طرف شکار بھی ہوتا ہے۔ میر صاحب کو مچھلی کا بڑا شوق ہے۔ میر صاحب آہستہ آہستہ مسکراتے رہے۔ اتنے میں وہاں ایک سادہ شخص کرتے پاجامے میں ملبوس' سر پر ٹوپی اور پاؤں میں بھاری چپل پہنے وارد ہوا۔ اس نے اپنے کرتے کی بڑی سی تھیلا نما جیب سے کاغذات کا پلندہ نکالا اور مشترکہ سلام کرنے کے بعد وہ پلندہ میر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ وہ سنٹر اسکولوں سے خود جا کر کاغذات مکمل کروا کر لایا

ہے۔میرے صاحب نے کاغذات تھامتے ہوئے کہا: ''بھئی فتح دین صاحب! اپنے نئے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہاتھ ملاؤ۔انھیں تمھاری متوقع آمد کے باعث ہی ادھر بٹھا رکھا تھا کہ تم آؤ اوران کو سنبھالو۔''

ماسٹر فتح دین کچھ زیادہ ہی خوش ہوئے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ''خوش آمدید'' کہا اور میرے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گئے۔

دفتر سے نکلنے سے پیشتر میں نے ایک بار پھر اچھے مہربان ہیڈ کلرک کا شکریہ ادا کیا اس نے کہا کہ شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ شکریہ تو آپ کا ہے کہ آپ نے بی۔ٹی کرنے کے باوجود بورڈ کی ملازمت میں آنا پسند کیا۔

میں نے اسے جواب دیا کہ شکریہ اس کے اخلاق، ہمدردی اور رویے کا ہے کہ انھوں نے میرا کام ترجیحی طور پر کیا وہاں انسپکٹر آف سکول میں ایک ہیڈ کلرک ہے جس نے میری درخواست ادھر اسامی کی تلاش میں بھیج رکھی ہے اور مجھے یہ کہتا ہے کہ ادھر سے درخواست آئے گی تو آرڈر ہوں گے جبکہ آپ نے آرڈر میرے ہاتھ میں تھما دیے ہیں وہ ہنسے اور کہا ان کا سابقہ بھی اس ہیڈ کلرک سے پڑتا رہا ہے وہ ہے ہی خبطی۔کاغذات اس کے میز پر پڑے ہوتے ہیں اور وہ جواب میں بھی یہی کہتا ہے کہ کاغذات آئیں گے تو کچھ کریں گے۔پھر ہیڈ کلرک نے ماسٹر فتح دین سے کہا کہ وہ میرا خیال رکھے۔ماسٹر فتح دین نے جواباً کہا کہ میری خدمت کرنا تو اس کے فرائض میں شامل ہے ''انھیں کھمنوں سے بھی بچانا۔'' میر صاحب نے تاکید کی۔اس پر فتح دین نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے میر صاحب سے کہا جناب یہ کوئی فتح دین یا خان صاحب تو نہیں۔ماشاءاللہ بی اے بی ٹی ہیں۔سب ٹھیک کر لیں گے۔ماسٹر فتح دین نے مجھے دوپہر کا کھانا بھی اپنی جیب سے کھلایا اور میرا پروگرام پوچھا۔میں نے اسے کالے جانے کا بتایا تو اس نے اسکول کے بند ہو جانے کا بتا کر مجھے رات اپنے گھر رکھنے کی پیش کش کی۔اس کا گھر سیالکوٹ شہر کے قریب موضع شتاب گڑھ میں تھا۔اسی موضع میں ماسٹر صاحب کو تھوڑی سی اراضی اور ایک کچا مکان الاٹ ہوا تھا۔وہ ضلع جموں کے مہاجر تھے۔

میں نے قدرے سوچا اور اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا۔اس پر فتح دین نے کہا کہ وہ کل علی الصباح سات بجے سیالکوٹ پہنچنے والی گاڑی سے سیالکوٹ سے پہلے آنے والے اگوکی اسٹیشن پر موجود ہوگا اور اپنی سائیکل پر یا سالم تانگے پر مجھے اسکول لے جائے گا۔اس نے بتایا

کہ اسکول اگوکی سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے اس کی تجویز مان لی اور مٹھائی کا ایک ڈبہ خرید کر دو بجے والی ریل گاڑی پر گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں فتح دین میرے ساتھ ڈھیر سی باتیں کر چکا تھا۔ وہ بتا چکا تھا کہ اس کے ضلع کے تمام افسروں سے نیاز مندانہ تعلقات ہیں۔ وہ سب کی خدمت کرتا ہے۔ میرا بھی سچا خادم ثابت ہو گا۔ آنے والے برسوں میں اس کا کہا ہر لفظ سچ ثابت ہوا۔ اب جب میں ماسٹر فتح دین کے متعلق سوچ اور لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے ہیں۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔

☆☆

ہم دونوں وقت سے قبل ہی اسکول پہنچ گئے۔ اساتذہ سے تعارف ہوا۔ پانچ مدرسین انصاری تھے، تین گھمن اور ایک فتح دین ایس۔ وی ارائیں تھا۔ میں ذات پات کے حوالے سے راجپوت کھوکھر تھا لیکن مولویوں کے گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر چچا جان کے اتباع میں قاضی کہلاتا تھا۔ بہت سے رشتے دار قاضی، قریشی، مفتی، صدیقی، فاروقی وغیرہ تھے۔ جو اب بھی مولوی اور امام مسجد رہ گئے تھے ان سے ہم نے بے اعتنائی برتنا شروع کر دی تھی۔ ہم ان کو اپنی تقریبات میں کم کم بلاتے تھے ناگزیر صورت ہی میں ان سے میل ملاقات کرتے۔ منوسمرتی کی ذات پات کی تقسیم ہمارے ہاں بھی اپنے ''کمال'' دکھا رہی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد تو یہ سلسلہ اب پھیلتا جا رہا تھا۔ بعد میں، میں بھی گاؤں چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ وہ آبا و اجداد کے بنائے مکانات اور زمینیں ہم نے بیچ ڈالیں۔ ان کی قبور کو نالہ ایک کے پانی نے ہموار کر دیا اور اب ہمارے بچے گاؤں سے آنے والے رشتہ داروں کو ''پینڈو پروڈکشن'' کہتے ہیں۔ الامان والحفیظ پکارتے رہنے کا موقع ہے۔

گھمن اپنے آپ کو چودھری اور زمیندار سمجھتے تھے۔ وہ ہیڈ کلرک کی برادری کے انصاری مدرسین پر بلاوجہ رعب جماتے تھے۔ اسی لئے ہیڈ کلرک نے مجھے گھمنوں سے بچانے کے لئے فتح دین کو ہدایت دی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کا سرخیل نواز گھمن میرا اور نیکلر مڈل کا ہم جماعت نکل آیا۔ اس نے مجھے پہچانا اور میں نے اسے اس کے لب کے اوپر موٹے سے تل اور خصوصی کھردرے نقوش سے پہچان لیا تھا۔ مجھے اس نے پورا پورا ''پروٹوکول'' دیا۔ لسی، چائے، دوپہر کا کھانا اور خصوصی گدی والی کرسی گھر سے منگوا کر دی۔ نواز گھمن نے اپنے اخلاق اور

تواضع سے مجھے گھمن گھیری میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے دوسرے مدرسین کے سامنے میری بڑی تعریف کی۔ ان کو بتایا کہ قاضی صاحب جب اس کے ساتھ پڑھتے تھے تو سو بٹا سو نمبر لیا کرتے تھے بس اب کالے کے اسکول کی قسمت بدل جائے گی۔ ہمیں ایسے ہی ہیڈ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اچھا ہوا کہ خاں صاحب سے ہماری اور ان کی ہم سے جان چھوٹ گئی۔

کالے کے اسکول کی قسمت بدلنا تو مستقبل کی بات تھی لیکن میری قسمت ضرور بدل گئی تھی۔ میں نے ماسٹر فتح دین کو اپنے احکامات تقرری برائے ریکارڈ ورپورٹ حاضری بنانے کے لئے دینا چاہے تو نواز نے جھپٹ لئے اور ساتھ ہی کہا کہ "ماسٹر فتح دین تو بس ڈاک لانے اور لے جانے والے ہرکارے ہیں۔ مدرسے کا لکھت پڑھت کا کام مولوی منظور حسین صاحب کرتے ہیں۔" اس نے مولوی منظور حسین صاحب کو میرے تقرر کے احکامات تھماتے ہوئے یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ وہ میرا نام رجسٹر حاضری پر بھی چڑھائیں۔ حاضری رپورٹ تیار کریں اور خاں صاحب کی فراغت کی رپورٹ بھی......اور خاں صاحب کو اطلاع بھی کریں کہ ان کا سفر ختم ہو گیا ہے۔

"کیا خاں صاحب آج اسکول نہیں آئیں گے۔" میں نے نواز گھمن سے پوچھا۔

"وہ کہہ گئے تھے کہ جمعے اور ہفتے کو نہیں آئیں گے۔ انھیں ڈسکہ کچہری جانا تھا۔"

میں نے بھی خاں صاحب کے نہ آنے کو کوئی اہمیت نہیں دی، تاہم میں نے آرڈر بک طلب کی اور اس میں لکھا:

"حکم نمبر ۱۲۳

من زیر دستخطی نے آج مورخہ ۶ جون کو قبل از دوپہر ڈی بی مڈل اسکول کالا کا چارج بطور ہیڈ ماسٹر سنبھال لیا ہے۔ تمام عملہ اس اطلاع کو نوٹ کرے۔ آئندہ کے لیے یہ بھی نوٹ کیا جائے کہ میری اسکول سے عدم موجودگی کی صورت میں حصہ مڈل کے ماسٹر فتح دین انچارج ہوا کریں گے کیونکہ وہ سینئر ترین ایس وی مدرس ہیں۔"

اس حکم کے نیچے میں نے دستخط کئے، مولوی صاحب کو اس حکم پر اساتذہ سے دستخط کروانے کے لیے کہا۔ سب نے دستخط کر دیے۔

یہ ہیڈ ماسٹری جو مجھے فکسڈ ۱۴۰ روپے ماہوار (ابھی بی ٹی کا نتیجہ نہیں نکلا تھا) پر ملی تھی، کوئی بڑا عہدہ نہیں تھی۔ پھر بھی میں ایک سو بیاسی طلبہ اور نو مدرسین میں ایک مرکزی نقطے پر کھڑا

تھا۔ یہ میری گزشتہ چوبیس برس کی زندگی کی کوششوں کا حاصل تھا۔ میں اپنی اس کامیابی کو ''فرام گڑ وکٹری اسٹینڈ'' قرار دے رہا تھا۔ میری ذہنی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مجھ پر رقت طاری تھی۔ وہ چیز جسے ''خوشی کے آنسو'' کہا جاتا ہے' بہنے ہی والے تھے کہ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا اور گداز کی کیفیت سے نکلنے کی خاطر نواز گھمن سے پوچھا:

''مڈل اسکول کی عمارت اس قدر چھوٹی اور مرمت طلب کیوں ہے؟''

اس نے بتایا کہ اسکول کو مڈل بنے ابھی صرف تین برس ہوئے ہیں۔ ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ سے کئی مرتبہ عمارت کی توسیع کے لئے درخواست کی ہے۔ وہ وعدہ کرتا اور بھول جاتا ہے۔ اور ہمارے سابق ہیڈ ماسٹر خاں صاحب بھی مراثیوں کا کٹا ہی تھے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ اس سال پہلی مرتبہ ہمارے اسکول کی آٹھویں جماعت کے سات طالب علم ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہوئے۔ ایک بھی پاس نہیں ہوا۔

اسکول کی اسی تعلیمی حالت پر میں نے رسماً افسوس کیا اور ہنستے ہوئے اس سے ''مراثیوں کا کٹا'' کی وضاحت چاہی۔ وہ ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بے تکلفانہ انداز میں بولا: ''اوہ...... جی دراصل دو بھینسیں تھیں۔ قریب قریب کھونٹے پر بندھی رہتی تھیں۔ انھوں نے ایک ایک کٹے کو جنم دیا۔ دونوں قریب قریب بیٹھے تھے کہ جاٹوں کی بھینس کے کٹے نے مراثیوں کی بھینس کے کٹے سے کہا کہ آؤ دوڑیں' اچھلیں کودیں۔ مراثیوں کے کٹے نے اسے جواب دیا کہ نہیں یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اونچی آوازوں سے ڈکراتے ہیں...... تو خاں صاحب بھی اس کوٹھڑی کے اندر ہی ٹوٹی کرسی پر بیٹھے باتیں بناتے رہتے تھے۔ کبھی دفتر تک نہیں گئے۔

پھر اس نے مزید رازدارنہ انداز میں بتایا کہ انہی کی برادری کے ایک فرد نے اسکول کی بہت سی زمین دبا رکھی ہے۔ اب آپ آ گئے ہیں تو اس زمین کو بھی واگزار کرائیں اور عمارت میں توسیع وغیرہ کے اقدامات کریں۔ خان صاحب تو ڈرتے ہی رہتے تھے۔

مڈل اسکول کالا ایک طرف گاؤں سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ دوسری طرف قبرستان پر مشتمل ٹیلے سے ملحق تھا۔ درمیان سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ خستہ حالت میں دو بڑے کمرے تھے جن کے شمال کی سمت برآمدہ تھا۔ برآمدے کی مغربی اور مشرقی بغلوں میں دو کوٹھریاں تھیں۔ ایک دفتر اور دوسری اسٹور کے طور پر استعمال کی جا رہی تھی۔ سامنے بہت بڑا صحن تھا جس میں پیپل اور بڑ کے درخت تھے۔

ضلع سیالکوٹ میں بڑی زمین داریاں یا جاگیرداریاں نہیں۔ آبادی گنجان ہے۔ زمین تقسیم در تقسیم کے عمل سے ایک ایک دو دو یا تین تین ایکڑوں اور بیگھوں کی ملکیتوں میں تبدیل ہو چکی ہے، لیکن جتنا چھوٹا زمیندار ہے اتنا ہی بڑا وہ چیمہ، چٹھہ، گھمن، ھنجرا، باجوہ، جنجوعہ اور چودھری ہے۔ زمیندارے کے علاوہ جس کے پاس کوئی ملازمت یا کاروبار ہے وہ بڑا بننے کا کوئی چکر چلا لیتا ہے۔ نواز گھمن کے بھائی بھی اگر زمین تقسیم کرتے تو ایک ایک ایکٹر سے بھی کم حصہ ملتا۔ باپ نے ان کو متحد رکھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ زمیندار بھی تھا اور مدرس بھی۔ اس کا ایک بھائی ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک تھا، ایک واہ فیکٹری میں تھا۔ اس کے والد منشی عنایت علی ریٹائرڈ سب پوسٹ ماسٹر تھے۔ لاہور ڈویژن کے انسپکٹر آف سکولز چودھری محمد صادق کے والد ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس تھے۔ منشی عنایت علی ان کے پرسنل اسسٹنٹ رہے تھے اس لیے ان کی شناسائی ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز سے بھی تھی۔ باپ کی اس آشنائی کے حوالے سے نواز گھمن نے مدرسین میں اپنا خاصا وقار بنا رکھا تھا۔ گاؤں میں ان کا گھرانہ متمول اور مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔

میں نے مولوی منظور حسین سے کہا کہ وہ میری ۸ر جون تا ۱۳ جون کی رخصت اتفاقیہ کا فارم بھرے۔ میں نے اسے کام کی نوعیت ذاتی درج کرنے کو کہا۔ اس نے تعمیل کی۔ میں نے چھٹی کے فارموں پر دستخط کیے۔ پھر آرڈر بک پر چھٹی کی اطلاع مدرسین کو کرائی۔ نواز گھمن کے گھر سے آنے والا کھانا ہم دونوں نے دفتری کوٹھری ہی میں بیٹھ کر کھایا۔ میں نے نواز گھمن کے اتفاقیہ طور پر دریافت ہو جانے کو اپنی کامیابی کی ضمانت سے تعبیر کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ میں انے اسے یہ بھی بتایا کہ گو مجھے پرائمری سے لے کر مڈل تک کے مدارس میں پڑھانے کا تجربہ ہے لیکن بطور ہیڈ ماسٹر یہ میرا پہلا موقع ہے اور جو عملی تربیت میں اس مڈل سکول میں حاصل کروں گا وہ ساری زندگی میرے ساتھ چلے گی۔ وہ بڑے انکسار سے مجھے اپنی کارکردگی کے قصے سناتا رہا۔ وہ مڈل اسکول سمبڑیال میں کبڈی کا اچھا کھلاڑی ہوا کرتا تھا۔ میں نے اس کی اسکول کی تعلیم کے دوران کامیابیوں کا ذکر کر کے اسے بہت خوش کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کرے گا۔

سہ پہر کو میں ماسٹر فتح دین کے ساتھ پھر سے اگوکی جانے کے لئے تیار تھا۔ جلد ہی مجھے گاڑی مل گئی۔ میری دونوں تعطیلات بھرپور طور پر استعمال ہوئی تھیں۔ میں اگلے دن سفر کر کے

سوموار کو وقت پر دفتر حاضر ہو سکتا تھا۔ ۱۳ر جون تک کا وقفہ اطمینان سے گزر سکتا تھا۔ اپنے اس کھیل کی میں نے چچا اور ماں کو بھی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ انھیں بتایا کہ میں کالے سے بھی ہفتہ کے روز ہی گھر آ سکتا ہوں۔ ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی دیا کہ میں ایم اے کی تیاری کر رہا ہوں' لہٰذا کبھی کبھی میرا لاہور بھی آنا جانا ضروری ہے۔ اب میری حیثیت ایسی ہو چکی تھی کہ مجھ سے کچھ زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی جاتی تھی۔

☆☆

جب تیرہ جون آیا تو پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب میں ہفتہ بھر کالا میں گزارنے کا کیا اہتمام کروں۔ جب میں نے دو یوم کی رخصت لی تھی تو مجھے یہ خیال آیا تھا کہ اگر میں رخصت استحقاقیہ حاصل نہیں کر سکتا تو رخصت اتفاقیہ تو جمع پڑی ہیں اور یہ افسر مجاز کی صوابدید پر ہے کہ وہ مجھے بیک وقت دس چھٹیاں دے سکتا ہے۔ میں پہلے تو چچا فاروقی کے پاس گیا اور انھیں بتایا کہ حاجی گلزار صاحب نے مجھے اسکول میں حاضر نہیں کیا۔ انھیں سائنس ٹیچر کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں وہ مجھے سفارشی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا: ''سفارشی تو وہ خود ہے۔ اسی کے سہارے وہ دوسرے کا حق مارے بیٹھا ہے۔ اگر وہ سفارش ہی چاہتا ہے تو یہ بھی معمولی بات ہے۔ میں اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیئر مین ملک غلام نبی کو جو اس کے بھی سفارش کنندہ ہیں' تمہارے لئے کہہ دیتا ہوں۔'' میں نے چچا سے کہا کہ ''نتیجہ نکلتے ہی مجھے سرکاری ملازمت مل جائے گی۔ رہنے ہی دیں' وہ خاموش ہو گئے۔ اصل میں' میں ان سے ٹیکس سپرنٹنڈنٹ میاں شفیع کو سفارش کرانا چاہتا تھا لیکن وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے سوچ لیا کہ میں خود میاں شفیع سے مل لوں گا۔ انہیں سفارش کرانے کی کیا ضرورت ہے؟

میں میاں شفیع صاحب کے پاس گیا۔ ان سے پوچھا کہ وہ مجھے چند منٹ دے سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ انتہائی سنجیدہ اور معاملہ فہم شخص تھے۔ میں میٹرک کر کے ان کے پاس آیا تھا اور جونیئر کلرک بنا تھا' لیکن اب بی اے بی ٹی ہو چکا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میں ان کی مہربانیوں سے اپنی اہلیت بڑھانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ رخصت مجھے مل نہیں سکتی' لیکن میں قسمت آزمائی کے لئے گلگت جانا چاہتا ہوں۔ وہاں آغا خانیوں کا ایک اسکول ہے اور اس میں ہیڈ ماسٹر کی ضرورت ہے۔ (ایسا ایک اشتہار دو ہفتے پہلے اخبارات میں چھپا تھا) آپ اپنے خصوصی اختیارات سے مجھے دس یوم کی رخصت اتفاقیہ مرحمت فرما دیں۔

"درخواست لکھ لاؤ...... یہ تو ہمیں پتہ ہی ہے کہ اب تمہیں کلرک نہیں رہنا ہے۔ جاؤ کیا یاد کرو گے۔"

میں اپنی سوچ پر حیران رہ گیا۔ مجھے بروقت آغا خاں اسکول کا خیال کیسے آ گیا تھا؟ کیا یہ کوئی غیبی قوت تھی جو میرے ذہن میں دفعتہً گھس آئی تھی؟ روحانی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ شیطانی ہی ہو سکتی تھی کیونکہ میرا مقصد کچھ نیک نہ تھا بلکہ چکروالا تھا۔ اس قوت نے ایک بار پھر میری راہنمائی کی۔ جب میں درخواست رخصت لکھنے لگا تو میں نے ۱۰ رجون کے بجائے رخصت پر جانے کی تاریخ ۲۱ جون لکھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے چھٹی منظور کر دی لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ ادھر گلگت کا راستہ بڑا خطرناک ہے ادھر ہی کوئی بندوبست کر لو۔ میں نے کہا دیکھتا ہوں مقدر میں کیا ہے؟ اور ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ منظور شدہ رخصت کی درخواست متعلقہ کلرک کے پاس باقاعدہ درج کروا کر بھجوائی کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

ان دنوں میں کوٹ خواجہ سعید کے قریب ایک متروکہ حوض اور مندر کے قریب بنے ایک کچے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یہ کوارٹر مجھے میرے لنگوٹیے ملک عبدالغنی ککے زئی نے لے کر دیا تھا۔ وہاں اس نے تیزاب کشید کرنے کی بھٹیاں لگا رکھی تھیں۔ پہلے تو میں اس کے پاس یونہی جا کر پڑ رہتا تھا، لیکن اب میں ذرا سہولتوں کے ساتھ رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ہوسٹل کی زندگی نے کھانا پکانے کی ہمت سلب ہی کر لی تھی۔ اب میں تنور کی دال روٹی کے بجائے کسی بہتر دکان سے کھانا کھاتا تھا۔ ملک کے ہاں گاؤں سے اکثر لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ بلکہ بہت سے گھروں سے بھاگے ہوئے گاؤں کے نوجوان لڑکے بھی اس کی تیزاب کی بھٹیوں پر آ کر پڑے رہتے تھے۔ وہ اکثر کو بھٹیاں جھونکنے، تیزاب کے ڈرم خالی کرنے اور بھرنے کے لئے صرف دال روٹی پر اپنے پاس رکھ لیتا تھا اور انھیں سمجھاتا تھا کہ خدا کا شکر کرو تم میرے پاس آ گئے ہو، بردہ فروشوں کے ہاتھ نہیں چڑھ گئے۔ اسی کے ایک آدمی کے ذریعے میں نے جمعے کو گھر اطلاع بھجوائی کہ میں لاہور میں ہوں۔ کچھ کام ہے اس لیے گھر نہیں آ ؤں گا۔ ہفتے کو میں نے اے ڈی آئی سکولز کے نام تار دیا کہ میں سخت بیمار ہوں۔ ہفتے بھر کی رخصت مزید دی جائے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ علیحدہ بھیجا جا رہا ہے۔

میں نے ۱۵ رجون سے ۲۰ رجون تک کا میڈیکل سرٹیفکیٹ نسبت روڈ کے ایک ریٹائرڈ کیپٹن ڈاکٹر سے پانچ روپے میں حاصل کر کے محفوظ کر لیا۔ ۲۰ رجون کو میں اپنے گھر جا پہنچا۔ اتوار کا دن گھر میں گزارا۔ ادھر ادھر دوستوں سے ملا اور پیر کی صبح اگوکی اسٹیشن پر جا اترا۔ وہاں سے تین روپے

میں سالم تانگہ کپور والی گاؤں تک کا لیا جو کالے کا ملحقہ گاؤں تھا اور کچی سڑک وہیں تک جاتی تھی۔ اسکول لگ چکا تھا۔ تمام اساتذہ کو میری بیماری کا علم ہو چکا تھا۔ سب باری باری میری صحت کے بارے میں دریافت کرنے آئے۔ نواز گھمن نے دل کی بات کہی کہ وہ سمجھا تھا کہ شاید میں نے کہیں بہتر ملازمت تلاش کر لی ہے۔ اسے علم تھا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں بی۔اے بی ٹی مدرسین کی کمیابی کی وجہ کم تنخواہ بھی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ دراصل لاہور میں تعلیم کے دوران میں اور کاموں میں بھی الجھا رہا ہوں۔ کرائے کے مکان کا ایک مقدمہ تھا' اس کی تاریخ ۱۵ ارتھی۔ تاریخ پر گیا تو جج نے پھر سے ۲۰ ر تاریخ دے دی۔ اب میں کرایہ خرچ کر کے آتا اور پھر جاتا تو کوفت کے علاوہ خرچہ بھی ہوتا۔ وکیل سے نہ مل سکتا تھا' اس لیے میں نے بیماری کی رخصت کا تار دفتر بھیجا تھا۔ چودھری ہونے کی وجہ سے وہ عدالتوں کے ہیر پھیر سے آگاہ تھا۔ اس نے مجھے کئی مشورے دینا چاہے لیکن میں نے اس کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا: ''چلو اب مجھے ایک کام کا دوست میسر آ گیا ہے۔ آئندہ پیشیوں پر میں تمہیں لاہور بھیج دیا کروں گا''۔

میں اپنی ان ناپسندیدہ حرکات کو نظر انداز کر کے اپنی آپ بیتی کو آگے بڑھا سکتا تھا لیکن ان کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ایسی گھناؤنی دلدلوں میں پھنسنے سے گریز کرنا ہی احسن ہے۔

ع...... من نہ کردم شما حذر بکنید

نظم و نسق مدرسہ کے علاوہ انگریزی کی تدریس کے لئے جماعت ششم تا ہشتم میرے ذمہ تھی۔ میں نے پوری دلجمعی کے ساتھ سلیبس کے مطابق کام کا آغاز کر دیا۔ خاں صاحب نے بڑے جامع انداز میں سلیبس پر مبنی تدریسی و تحریری کام ہفتہ وار تیار کر رکھا تھا۔ اس کے مطابق میں نے جائزہ لیا تو اپریل۔ مئی میں کوئی کام ہوا ہی نہیں تھا۔ جون کی بھی بائیس تاریخ ہو چکی تھی اور ابھی بہت سا کام کرنا تھا۔ میں نے طلبہ سے نرمی کے ساتھ بات چیت کی اور ان کو سہ پہر چار بجے سے سات بجے تک دوبارہ اسکول میں آنے پر راضی کر لیا۔ چھٹی جماعت میں بائیس' ساتویں میں گیارہ اور آٹھویں میں آٹھ طلبہ تھے۔ ساتویں پاس کرنے والے بیشتر طلبہ قریبی ڈی۔ بی ہائی اسکول گوہد پور مراد پور میں چلے گئے تھے کہ وہاں ان پر ورنیکلر فائنل کا امتحان دینے کی پابندی نہ تھی اور ہائی اسکول ہی ان کو نویں جماعت میں ترقی دے سکتا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۹)

'کالا' میں تجربات کا دور

دفتر والی کوٹھری کی الماری میں، میں نے کپڑوں کے دو جوڑے اور ہلکا پھلکا بستر رکھنے کا بندوبست کیا۔ سٹور والی کوٹھری میں شکر گڑھ کے دو جے وی مدرس بابو بشیر اور ماسٹر صدیق رہتے تھے۔ وہ میری چارپائی اپنی کوٹھری میں سنبھال دیتے۔ اس اسکول میں چپڑاسی نہیں تھا۔ صفائی بھی بچے خود ہی کرتے۔ نواز کی شدید مخالفت کے باوجود میں دونوں جے وی مدرسین کا ہانڈی وال بن گیا۔ نواز گھسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے سر پر جوتے مار لیتا تو بہتر ہوتا، مگر یہ کام نہ کرتا۔ میں نے اسے نرمی سے کہا کہ یہ روزمرہ کا معاملہ ہے۔ تمہارا تو حکم ہی چلنا ہے لیکن میری بھاوج اور بہنوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کھانا لانے والوں کو تین وقت کی پابندی کرنا پڑتی، لہٰذا وہ ناراض نہ ہو اور ہر جمعرات میری دعوت کر لیا کرے کہ میں بھی ایک پاپی درویش ہوں۔ وہ راضی ہو گیا۔ خاصی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ فتح دین اور انصاریوں نے میرے انکار کو نواز گھسن کی پہلی شکست قرار دیا تھا۔

منگل کی صبح میں ہر جماعت میں گیا۔ اساتذہ سے ان کی تدریسی ڈائری طلب کی۔ کسی نے لکھی اور بنائی ہوتی تو پیش کرتا۔ کسی نے بھی سلیبس کے مطابق کسی مضمون کا تدریسی کام کرایا تھا نہ تحریری۔ ہر مضمون کی درسی کتب کے اسباق کی مشقوں میں ایک مشق عملی کام کی تھی۔ کسی مدرس نے وہ مشق کبھی حل ہی نہیں کرائی تھی۔ باتوں اور بہانوں میں سب تیز تھے۔ سارا الزام انھوں نے خاں صاحب پر تھوپ دیا تھا کہ کبھی انھوں نے میری طرح ان کی راہنمائی ہی نہیں کی۔ میں نے اسکول کے اوقات کے بعد سب مدرسین کی ایک میٹنگ طلب کر لی۔ میٹنگ میں میں نے ان کو واضح طور پر بتایا کہ۔

۱)...... میں سب کا ہمدرد، دوست اور خادم ہوں لیکن فرائض منصبی میں کوتاہی برداشت نہیں کی

جائے گی۔ سلیبس کے چارٹوں کے مطابق تحریری وتدریسی کام مکمل کیا جائے۔

۲)......میں ہر منگل کے دن ہفتہ بھر کے مجوزہ کام کی ڈائری ملاحظہ کیا کروں گا اور اس کے مطابق روزانہ ایک جماعت کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ بھی لوں گا۔

۳)......رجسٹرات مدرسہ کی تکمیل اور ان میں اندراجات کی صحت کا بھی وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہوں گا۔

۴)......جماعت اول کا رجسٹر رفتار ترقی خصوصی توجہ کا مستحق پایا گیا ہے۔ جماعت اول کے انچارج کی ذمہ داری ہے کہ وہ رجسٹر رفتار ترقی کو مکمل رکھے۔ اس کی ہفتہ وار ڈائری اسی رجسٹر رفتار ترقی کی درست تکمیل ہوگی۔

۵)...... ہر جماعت کا روزانہ ایک پیریڈ تربیت جسمانی کا ہوگا۔ نواز گھمن اور منظور حسین نیا جنرل ٹائم ٹیبل تیار کریں۔

۶)......نواز گھمن صاحب اسکول کے پرائمری حصے میں کبنگ اور ماسٹر نذیر احمد حصہ مڈل میں اسکاؤٹنگ جاری کریں اور دونوں مذکورہ مدرسین کبڈی کی خصوصی ٹیم برائے شمولیت مڈل سکولز ٹورنامنٹ کی تیار کریں۔

۷)......رجسٹر حاضری مدرسین اور رجسٹری حاضری طلبہ اور ماہوار اعداد وشمار کے گوشواروں کی صحت کے ذمے دار ماسٹر فتح دین ہوں گے۔

۸)......رجسٹر داخل خارج، سرٹیفکیٹ فائل، رجسٹرات فنڈات، رجسٹر مال اشیاء، وزٹ بک، لاگ بک وغیرہ جن مدرسین کی تحویل میں ہیں، ان ہی کی تحویل میں رہیں گے، البتہ مولوی منظور حسین ان کی پڑتال کر کے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہیں، مجھے ہفتے کے دن رپورٹ دیں گے۔

۹)...... ہر مدرس ضابطہ تعلیم مجریہ ۱۹۳۴ء کی حدود اور وضاحتوں کے مطابق کام کرے گا۔ غیر تربیت یافتہ معلمین ضابطے کو خصوصی طور پر پڑھیں۔

۱۰)......قیمتی نہیں، لیکن مدرسین صاف ستھرا لباس پہن کر آئیں اور بچوں کے لئے نمونہ بنیں۔ بچوں میں ملیشیا کی وردی رائج کریں۔ منگل کے دن وردی پہن کر نہ آنے والے بچوں کو جرمانہ ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وردی رائج تو ہے مگر اسے پہننے کی پابندی نہیں ہو رہی۔

شاید کالے کے اسکول کے مدرسین کے لیے یہ معروضات انوکھی تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مدرسین نے میری

گزارشات کے مطابق کام شروع کر دیا۔ زمین میں ''جوترا'' لگا کر آنے والے گھسن اساتذہ نے بھی وقت پر اسکول آنا شروع کر دیا۔ پارچہ فروش، بھینسوں کو سنبھالنے والے اور دستی کھڈیاں چلانے والے مدرسین نے بھی میرے مقابلے میں تین سے سات بجے شام تک کام کرنا شروع کر دیا۔ ان پڑھ والدین جو بچوں کو گھر پہنچنے پر مختلف پیشہ وارانہ کاموں میں لگا لیتے تھے، بلبلا اٹھے۔ کام، کام اور کام کی لہر دوڑ گئی...... بلکہ میں نے دوڑا دی۔

اپنی اس ابتدائی سروس کے دوران میں نے ۲۲ر جون سے لے کر مع اتوار کے یکم جولائی تک دس دن جس پابندی اور محنت سے کالا اسکول کے طلبہ کو پڑھایا اور کام نہ کرنے پر ان کی ٹھکائی کی (بعد کی ساری سروس میں ایسا کام نہیں کیا)۔ اس کی دھوم ضلعی دفتر تک مچ گئی۔ بعض مڈل اسکول کے طلبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بعض اساتذہ تبادلے کروانے کا سوچنے لگے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ نئے ہیڈ ماسٹر کے پروگرام کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ نئی نئی باتیں کرتا ہے۔ میں نے ان سے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ بس انھیں پڑھانے کو کہا تھا۔ پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔ مدرس اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کی تدریس اس کے شاگردوں کے جوابات سے منعکس ہو۔ اگر وہ اس طرح نہیں پڑھا سکتا تو وہ ناکام مدرس ہے، خواہ پی ایچ ڈی ہی کیوں نہ ہو۔

یکم جولائی کو میری ''گلگت'' جانے والی رخصت اتفاقیہ دس یوم ختم ہو رہی تھی۔ کالا کے مدرسین کو بھی تھوڑا سا سانس لینے کی ضرورت تھی۔ میری پابندی اور قدرے سختی نیک نیتی پر مبنی نہ تھی۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر میں طلبہ کے لئے ''بلیسنگ ان ڈس گائیز'' بنا ہوا تھا۔ اب مجھے کوئی نئی چال چلنا تھی۔ شام کو میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں نے ماں کو بتایا کہ اصل میں میرا استعفیٰ چچا فاروقی نے ابھی منظور نہیں کیا۔ اسے منظور کرانے اور سرکاری نوکری کا پتہ کرنے مجھے لاہور جانا پڑتا ہے۔ ماں پر میں نے موجودہ نوکری اور سرکاری نوکری کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا۔ اگلے دن علی الصباح جب میں لاہور کے لئے روانہ ہونے لگا تو میں نے ماسٹر فتح دین کے نام ایک رقعہ لکھا۔ پہلے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ اسے اپنا بھائی بتایا اور کہا کہ میں ہفتہ بھر اسکول نہیں آؤں گا۔ میری اس غیر حاضری میں ہونے والے مدرسین کے ردعمل کو وہ نوٹ کرے۔ اسکول کا خیال رکھے۔ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے اور مجھے نو جولائی کو اگوکی ریلوے اسٹیشن پر ملے۔

اِدھر ڈوبے‘ اُدھر نکلے اور اُدھر ڈوبے اور اِدھر نکلے کی حکمت عملی کامیابی سے چل رہی تھی۔ بلدیہ میں‘ میں نے اپنا تبادلہ تہ بازاری میں کرالیا۔ انسپکٹر کو خوب کھلا پلا کر اپنا دوست بنالیا تھا۔ اسے بتا بھی دیا تھا بلکہ اسے پہلے ہی علم تھا کہ میں نے بلدیہ کو چھوڑ دینا ہے تو وہ مجھے ہفتہ ہفتہ بھر کی ”فرلو“ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مجھے بائیس جولائی کا انتظار تھا جس روز اسکول دو ماہ کے لئے برائے تعطیلات موسم گرما بند ہو جانا تھا۔ میں بخیر و خوبی پروگرام کے مطابق نو جولائی کو اگوکی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ماسٹر فتح دین موجود تھا۔ وہ اتنا اچھا اور تابع فرمان تھا کہ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ میں ہفتہ بھر کہاں رہا ہوں۔ اس نے صرف یہ پوچھا کہ خیریت تھی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے بتایا کہ میرے بعد تین دن تو اسکول معمول کے مطابق کام کرتا رہا۔ انگریزی کے پیریڈز میں بچے آموختہ دہراتے رہے ہیں۔ چوتھے دن اتوار تھا۔ پیر کے دن سبز پیر کے عرس کی وجہ سے حاضری کم تھی۔ نصف دن کے بعد اس نے چھٹی کرادی۔ باقی کے دو دن مدرسین ڈھیلے پڑ گئے اور قیاس آرائیاں کرنے لگے کہ اتنی جان مار کر محنت کرنے والے ہیڈ ماسٹر کو نہ جانے کیا ہوا ہے؟ اور اب آپ آ ہی گئے ہیں۔ مجھے علم تھا کہ مجھے اور کوئی نہیں تو نواز گھمن ضرور پوچھے گا کہ میں ہفتہ بھر کیوں نہیں آیا‘ لہٰذا میں نے ماسٹر فتح دین کو کہہ دیا کہ میں ایک ریفریشر کورس پر گیا تھا۔ مجھے ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے چچا جان کے ذریعے پیغام دے کر بلایا تھا۔ میں نے بڑی دیدہ دلیری سے رجسٹر کی حاضری پر ”ریفریشر کورس میں شمولیت“ لکھ دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی کوئی پڑتال نہیں کرے گا۔

انھوں نے مجھ سے یہ ضرور پوچھا کہ میں اب پچھلے اوقات میں کیوں نہیں پڑھا رہا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ اس اسکول سے تبادلے کرا لینے کی باتیں جو کرنے لگے تھے۔ میں اپنی مثال پیش کر کے ان سب کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ ہم اگر ڈٹ کر نیک نیتی سے اسکول کے اوقات ہی میں پڑھالیں تو کافی ہے۔

میں اب بھی پوری ذمہ داری سے تدریسی فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں نے اپریل سے لے کر جون تک کا سلیبس ختم ہی نہیں کیا بلکہ بچوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا۔ باقی مدرسین بھی کام کر رہے تھے۔ ہر ایک کی جماعت کا میں نے جائزہ لیا اور بہتری کے آثار پائے تو ان کو شاباش دی۔ ایک رسمی گفتگو میں‘ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ میرا اصل پروگرام تعطیلات کے بعد شروع ہو گا‘ لہٰذا جو صاحبان مجھ سے شاکی ہوں وہ تعطیلات کے دوران میں اپنے تبادلے

کرالیں۔

استحقاق بڑی بات ہے لیکن میں نے کچھ حرکات استحقاق کے بغیر بھی کیں۔ وہاں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ مثال کے طور پر مجھے اپنے قرض خواہوں کو مطمئن کرنا تھا۔ تعطیلات موسم گرما سے پہلے تین ماہ کی فیسیں اور اسکول فنڈز وصول کیے گئے۔ وہ مل ملا کر کل سات سو روپے کے قریب بنتے تھے۔ فنڈز میں نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیے کہ تعطیلات کے بعد ڈاک خانوں میں کھولے گئے کھاتوں میں جمع کرائیں گے۔ فیسوں میں سے ۱۴۰ روپے ماہوار کے حساب سے میں نے تین ماہ کی تنخواہ ۴۲۰ روپے رکھ لی۔ (۴۲۰ پر مسکرائیں نہیں) مولوی منظور حسین سے کہہ دیا کہ وہ ہر ماہ تنخواہ کی برآور بناتے وقت جمع شدہ فیس کا تیسرا حصہ وضع کرتا رہے۔ کچھ روپوں کی ماسٹر فتح دین کو ضرورت تھی' اسے دے دیئے۔ ماسٹر صدیق اور بابو بشیر نے اصرار کیا کہ انھیں ماہ حال کی تنخواہ ہی دے دی جائے کہ وہ کہاں سکھو چک (شکر گڑھ) سے چل کی تنخواہ لینے آئیں گے۔ ان کا واقعی حق بنتا تھا۔ لیکن یہ تو شیر کی مرضی تھی کہ وہ انڈا دے یا بچہ۔ اور مڈل اسکول کالے کا شیر اتفاق سے راقم الحروف تھا۔ شیر اپنی بھوک دوسرے جانوروں کی جان لے کر ہی مٹاتا ہے۔ مجھے تو ان مدرسین کی مجبوری پر ترس ہی آیا لیکن مولوی منظور حسین نے ان سے کہا کہ وہ ان کو دو دو ماہ کی تنخواہ دے کر گھر بھیجے گا۔''

''ایں یہ کیا؟ یہ چوسے ہوئے منہ والا کلوٹا۔ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔'' میں نے ایک لحظے کے لئے سوچا اور پھر مطمئن ہو گیا کہ چلو کوئی مدرس تعطیلات پر ناراضی سے تو نہیں جارہا' سب مدرسین پرانی روایت کے مطابق نہر اپر چناب پر گئے اور آم پارٹی کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ ماسٹر فتح دین اپنی ۱۹۴۵ء کی جموں سے خریدی ہوئی ہر کولیس سائیکل پر مجھے سمبڑیال نہر کے پل تک لے گیا۔ اس نے مولوی منظور حسین کی تعریف کی اور بتایا کہ نواز گھمن بھی ضروریات پوری کرنے کے لیے اکثر مولوی منظور حسین سے رقومات حاصل کرتا ہے اور پھر ماہ بماہ تنخواہ سے کٹواتا رہتا ہے۔ مولوی منظور حسین کی خوشحالی کا راز اس نے یہ بتایا کہ تنخواہ کے علاوہ اس نے ایک دستی کھڈی لگا رکھی ہے' گاؤں کا واحد امام مسجد بھی ہے۔ شادی ہو یا غمی اسے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور فلاں فلاں زمینداروں کی زمین پر پانی کے لئے لگائے گئے ڈیزل انجنوں میں بھی حصہ دار ہے۔

''واہ تیرے مولوی کی!'' میں نے دل ہی دل میں پھر اسے داد دی۔ ''تمہارے ساتھ

تو دوستی گانٹھنی چاہیے"

☆☆

اپنے منصوبے کے مطابق میں بلدیہ میں اطمینان سے کام کر رہا تھا۔ میرا ارادہ ۲۰ ستمبر کو مستعفی ہونے کا تھا۔ اس مقصد کے لئے مجھے ۲۰ راگست کو یعنی ایک ماہ پیشگی استعفیٰ پیش کرنا تھا' لیکن اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے استعفیٰ جلد ہی پیش کرنا پڑا۔ جس طرح میں نے اپنی غربت دور کرنے اور سفید پوشی قائم رکھنے کے لیے دو جگہوں سے کمائی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا' اسی طرح حمید چودھری نے بھی یہی منصوبہ بنایا تھا اور وہ بھی ۲۳ رجولائی سے بلدیہ میں حاضر ہو گیا تھا۔ اس کی بلدیہ سے لی گئی چھٹی بھی اکیس جولائی کو ختم ہوئی تھی۔

مسعود نامی ایک جونیئر کلرک ہم دونوں سے محض اس لیے جلتا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود ایف اے بھی پاس نہ کر سکا تھا۔ کچھ شیخی خورہ اور کمینی عادات کا مالک بھی تھا۔ اس نے حمید چودھری کے متعلق تو ٹوہ لگالی کہ نظامت تعلیم کے دفتر سے اس کے فلاں فلاں نمبر کے تحت احکامات تقرری مارچ کے آخری ہفتے میں جاری ہوئے ہیں اور وہ حضرو میں ۲۷ اپریل سے حاضر بھی ہو چکا ہے جبکہ وہ بلدیہ کے شعبہ صحت میں بھی کام کر رہا ہے۔ میرے متعلق بھی اس نے تحقیق کی لیکن نظامت تعلیم سے میرا کوئی تقرر نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ حسد کا مارا ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز کر دفتر گیا اور وہاں سے میرے متعلق یہی معلومات لایا کہ میری درخواست چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کو اس کی رضا جوئی کے لئے بھیجی گئی تھی جو ابھی تک واپس نہیں آئی' لٰہذا وہ میرے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت حاصل نہ کر سکا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں حمید چودھری کے خلاف بلدیہ اور محکمہ تعلیم کو اس مضمون کی گمنام شکایتیں موصول ہوئیں کہ حمید چودھری بیک وقت دو جگہوں پر ملازمت کر رہا ہے۔ حمید کو نہ جانے یہ مغالطہ کیسے ہو گیا کہ اس کے خلاف گمنام درخواستیں میں نے دی ہیں شاید اس لئے کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ بہر حال اس نے بلدیہ سے جان چھڑائی اور محکمہ تعلیم میں اپنے مستقبل کو محفوظ کر لیا۔ اچھی نیک نامی کی سروس کے بعد وہ بطور سینئر ماہر مضمون (فارسی) ریٹائر ہوا۔

خود تو حمید مجھ سے نہیں ملا لیکن ایک روز نوازش علی شاہ بل کلرک نے ہنستے ہنستے پوچھا کہ کہیں میں نے بھی تو ایسا چکر نہیں چلا رکھا جو حمید نے چلایا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ درخواستیں مسعود نے دی تھیں۔ مسعود کو تم پر بھی شک ہے۔ اس نے تمہارا چھٹیوں کا سارا کھاتہ حاصل کر رکھا ہے لیکن اسے تمہاری محکمہ تعلیم میں تقرری کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میں نے نوازش علی شاہ کو

مطمئن کیا اور اسے یہ توضیح پیش کی کہ سفارشی لوگ بی ٹی کا نتیجہ آنے سے پہلے ہی ان ٹرینڈ کی حیثیت سے بنیادی تنخواہ پر متعین ہو گئے تھے۔ ہماری باری نتیجہ آنے پر آئے گی جو بس آنے ہی والا ہے اور تب تک میں ادھر بلدیہ ہی میں ہوں۔ وہ قائل ہو گیا۔ اس نے دو چار گالیاں مسعود کی شان میں داغیں۔ پھر کہا کہ اگر اپنا یار حمید بلدیہ کے کھاتے سے کچھ مفاد اٹھا لیتا تو کونسی قیامت آ جاتی۔ خود یہ حرامی لائسنسوں کے کھاتے سے نہ جانے کتنا سور کھا رہا ہے۔

نوازش علی شاہ تو رواداری میں بات کر گیا لیکن میں چوکنا ہو گیا کہ مسعود کا کیا ہے' وہ کسی دن سیالکوٹ ہی جا دھمکے۔ اسے مجھ پر شک تو ہے ہی۔ اگر خدانخواستہ میری یہ چوری پکڑی گئی تو. میرے چچا فاروقی جو بلاشبہ میرے محسن ہیں' کیا سوچیں گے۔ گاؤں والے چچا کیا کہیں گے؟ ماں کیا کہے گی اور میری ہونے والی نصف بہتر کیا سوچے گی؟ بھائی کیا کہیں گے؟ جو سنے گا وہ تھو تھو ہی کرے گا۔ اس سوچ کے باوجود نیت کا فساد کم نہ ہوا۔ میں نے ۲۰ ستمبر کے بجائے بیس اگست کو بلدیہ سے فارغ ہونے کے لیے استعفیٰ پیش کر دیا۔

۲۰ اگست تک کا وقت میں نے سہمے سہمے ہی گزارا۔ جس روز فارغ ہوا تو استغفار کیا کہ اب کوئی ایسا گھپلا نہیں کروں گا جو ذہنی پریشانی کا اور جھوٹ در جھوٹ کا باعث بنے۔ حمید چودھری سے میں اس کے سسرال چوہٹہ مفتی باقر' اندرون دہلی دروازہ جا کر ملا۔ پہلے تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی بیگانگی کی باوجود میرے دل میں اس کی محبت ابھی تک قائم و دائم ہے تو وہ خندہ روئی سے ملا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے علم ہے کہ وہ مجھ سے کس بات پر خفا ہے۔ ''بھلے آدمی جس کشتی میں تم سوار تھے۔ اسی پر تو میں خود بھی تھا۔ میں کیسے اسے چھید کر سکتا تھا۔ نوازش علی سے جا کر پوچھو تمہارا بہی خواہ 'مسعود چھچھورا' ہے''۔ حمید کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مسعود کو وہ اچھی طرح بلکہ مجھ سے اور نوازش سے بھی بہتر جانتا تھا۔ وہ رہتا بھی تو چوہٹہ مفتی باقر میں تھا۔ جانے اس کی طرف اس کا خیال کیوں نہیں گیا تھا' شاید اس لیے کہ کمیں گاہ میں بقول شاعر دوست ہی ہوتے ہیں۔

دیکھا جو تیر کھا کے' کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

◆◆◆◆◆

(۱۰)

شادی اور نئے مراحل

کوٹ خواجہ سعید میں واقع کوارٹر خالی کر کے چابی میں نے ملک عبدالغنی کو تھمائی تو اس نے حیران ہو کر بے تکلفی سے پوچھا: ''کی گل اے بھا جی کدھر دفع ہو رہے او۔'' میں نے اسے بتایا کہ اپنا دانہ پانی لاہور سے اٹھ گیا ہے۔

''اٹھ کر کہاں اور کدھر چلا گیا ہے۔'' اس نے مزید پوچھا۔

''نہر اپر چناب کے کنارے...... کھمبرانوالہ گاؤں سے نصف میل مشرق میں کلووال سیالکوٹ سڑک پر کالا نامی گاؤں میں۔''

''تے تسی ہن پنڈ وچ رووَ گے' حیرانی دی گل اے'' اس نے ہاتھوں اور سر کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''میں ادھر ہیڈ ماسٹر بن گیا ہوں۔''

''ماسٹر امیر علی جیسا؟'' اس نے پوچھا۔ ماسٹر امیر علی گاؤں کا ان ٹرینڈ مڈل پاس نوجوان تھا اور لوئر مڈل سکول کی ایک دو جماعتوں پر مشتمل برانچ ٹھکووال کا واحد مدرس تھا۔ اپنے آپ کو ہیڈ ماسٹر کہلوا کر بہت خوش ہوتا تھا۔

''نہیں جناب! قریشی محمود الحسن جیسا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ایں! ماسٹر محمود جیسا' میں نہیں مانتا' کیا تمہیں انگریزی اخبار پڑھنا آتا ہے؟'' وہ واقعی حیران ہو رہا تھا۔

''صرف پڑھنا ہی نہیں آتا' سمجھ بھی لیتا ہوں۔''

وہ یکدم جھکا اور میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''یار' میں تو تمہیں وہ نالہ ایک

میں ننگا نہانے اور مچھلیاں پکڑنے والا زلفی ہی خیال کرتا تھا یا پھر برکت کشمیری کی طرح کا دفتر کا بابو۔ کیا تو واقعی ماسٹر محمود جتنا پڑھ گیا ہے؟ بی اے بی ٹی ہو گیا ہے؟ بھئی کمال ہے۔ وہ چھوٹا ممتاز قاضی ادھر سیالکوٹ میں ہمارے گھر ہی میں رہتا ہے۔ میں آؤں گا تو تمہارا اسکول دیکھوں گا۔ اپنی قسمت میں تو یہ 'ساڑ' ہی لکھا ہے۔'' اس نے جلتی ہوئی تیزاب کی بھٹی کی طرف اشارہ کیا اور سینے سے لگا کر میرے کندھے تھپک کر مجھے الوداع کہا۔ وہ قد کاٹھ میں مجھ سے دگنا نہیں تو ڈیوڑھا ضرور تھا۔ اس کی ٹھوڑی میرے سر کو چھو رہی تھی۔

الغرض میں کچھ تلخ اور کچھ شیریں یادیں اپنے دامن میں سمیٹے لاہور سے گاؤں پہنچا۔ اسکول میں ابھی تعطیلات تھیں اور پورا ایک ماہ باقی تھا۔ سوائے ادھر ادھر گھومنے' ناول پڑھنے یا فلمی رسالے دیکھنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ میں نے گھر کا اور گھر کے جملہ افراد کا اب قدرے گہری نظر سے جائزہ لیا۔ مجبوریوں اور محرومیوں کا ایک اژدھام تھا۔ ماں جھریوں سے آراستہ ہو رہی تھی اور اٹھتے بیٹھتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی تھی۔ پہلے کی نسبت خاصی دبلی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کا عزم و یقین پختہ تھا وہ اب بھی چرخہ کاتتی تھی' لیکن دوسروں کے لئے نہیں' ہمارے لئے چادریں کھیس وغیرہ بنوانے کے لئے۔ عبادات میں زیادہ وقت صرف کرتی اور پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ اب بھی محلے کی کافی لڑکیاں قرآن پاک پڑھنے آتی تھیں اور وہ ہی ہمارے گھر کا سارا کام کاج سنبھالے ہوئے تھیں۔

چھوٹا بھائی میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں پاس کر چکا تھا اور مزید پڑھنے کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا تینوں چھوٹے چھوٹے ماموں زاد بھائی بھی ماں کی تحویل میں تھے ان کی ماں نے عقد ثانی کر لیا تھا۔ چھوٹا تو بمشکل پاؤں پاؤں چلتا تھا اور سوکڑے کا مریض نظر آتا تھا۔ ماں کے بیان کے مطابق وہ دن بدن تندرست ہو رہا تھا اور یہ حقیقت تھی وہ جلد ہی سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ گول مٹول اور گلگوتھنا ہونے کے علاوہ وہ باتیں بھی بہت کرنے لگا تھا۔ اسے منجھلا بھائی اس کی ماں کے نئے گھر سے لایا تھا اور وہ بتاتا کہ جب وہ رات کو روتا تھا تو وہ 'بھائی' اسے کیسے ڈراتا تھا اور اس کی ماں اس 'بھائی' کو کچھ نہیں کہتی تھی بلکہ ہنستی تھی۔

منجھلے بھائی نے بھی درجہ اول میں جے وی کر لیا تھا لیکن بابو رحمت اللہ نے ''معاملہ واحد'' ہونے کے باوجود چچا کو اس کی ملازمت کے بارے میں مایوس کر دیا تھا۔ مہاجرین کی آمد کی وجہ سے نچلے درجے کی ملازمتیں اب کم پڑنے لگیں تھیں۔ سرکار کا حکم تھا کہ پہلے مہاجرین کو کھپایا جائے۔ منجھلے بھائی کو خوشنویسی وراثت میں ملی تھی۔ چچا ہی کے مشورے سے اس نے والد مرحوم کے شاگرد حکیم بشیر

احمد سے تھوڑی بہت فنکارانہ اصلاح لی اور اب وہ چچا جان کے برادرِ نسبتی محمد سرور قریشی کے تعلیمی پریس 'گرین وڈ اسٹریٹ' سیالکوٹ میں خوشنویسی کر رہا تھا بلکہ بقول قریشی صاحب اپنے جوہر دکھا رہا تھا۔ سیالکوٹ شہر کے مرکزی ہائی اسکولوں میں خصوصی طور پر جاری کی گئی جے وی کی جماعتوں کے طلبہ اور طالبات کے امتحانات ہونے والے تھے لہٰذا امیدواران متوقع مشقی اسباق کے لئے چارٹس، نقشے اور خاکے وغیرہ بھی بھائی ہی سے تیار کروا رہے تھے۔ بھائی کے ہاتھ کے تیار کردہ ان تدریسی معاونات کی دھوم مچ گئی تھی۔ کتابت کے ساتھ ساتھ وہ مصوری میں بھی درک رکھتا تھا۔

موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھائی نے ملک عبدالغنی کے والدین سے ان کے مکان کا تیسرا حصہ بارہ روپے ماہوار کرائے پر لے رکھا تھا لہٰذا وہ ہفتہ بھر شہر ہی رہتا تھا۔ گھر آتا تو بھی کام ساتھ اٹھا لاتا۔

اسی سال ہمارے چچازاد بھائی محمد مشتاق نے بھی درجہ اول میں میٹرک کیا تھا۔ چچا نے اس کے لئے بھی اور میرے چھوٹے بھائی کے لئے بھی "ملاں کی دوڑ مسجد تک" کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے لاہور میں چچا فاروقی کو لکھا تھا کہ ان دونوں کو بھی اگر ان کی وساطت سے کلرکی مل جائے تو وہ بھی لاہور رہ کر شاید اپنا مستقبل سنوار سکیں۔ چچا فاروقی نے جواب میں لکھا تھا کہ عنقریب بلدیہ میں آئندہ تقرریوں کے لئے ایک میرٹ لسٹ تیار کی جائے گی۔ برخورداران کی درخواستیں ان کو بھجوا دی جائیں۔ وہ ان کو امتحان کی تاریخ کے بارے میں اطلاع دے دیں گے۔ تب تک وہ میٹرک کی انگریزی کتاب غور سے پڑھیں اور ٹائپ کی مشق کریں' چنانچہ وہ دونوں وزیر آباد شہر ٹائپ کالج میں ٹائپ کی مشق کے لئے جا رہے تھے۔

گھر کی در و دیوار پر بھی حسرتوں کے ڈیرے تھے۔ وہ بھی توجہ کے طلبگار تھے۔ ایک متوسط درجے کے گھر میں جو کچھ ہونا چاہیے ہمارے گھر میں وہ بھی نہیں تھا۔ والد کے زمانے کے چینی کے برتن، شیشے کے گلاس اور اسی نوع کی نادر اشیاء ماں نے لکڑی کے بڑے سے صندوق میں بند کر رکھی تھیں کہ اولاد بڑی ہوگی تو استعمال کرے گی۔ ان کو صندوق سے نکالنے سے پہلے علیحدہ اور اچھے سے باورچی خانے کی ضرورت تھی۔

میں کرنے کے بہت سے کاموں کی ایک فہرست بنا رہا تھا۔ سب سے اولین کام وہ قرض حسنہ اتارنا تھا جو تعلیم کے دوران لیا گیا تھا۔ ماں کو اسی سال بھولا کر دینے کا وعدہ بھی مجھے یاد تھا لیکن اس کا ذکر میں نے اپنی فہرست میں نہیں کیا تھا۔ ان کاموں کی فہرست نہ جانے ماں

کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ پھر وہ خاموشی سے میری عدم موجودگی میں چچا کے گھر گئی۔ دیور بھابی نے جو فیصلہ کیا مجھے اس کی کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔ ہفتے کو بھائی آیا۔ ماں نے اس سے کھسر پسر کی وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ماں منجھلے بھائی کے ذمے دارانہ رویے سے بہت متاثر تھی۔ میری طرح وہ ماں سے حیل وحجت یا دلیل بازی نہیں کرتا تھا۔ ماں کی ہاں میں ہاں ملاتا اور جیسے وہ کہتی ویسے ہی کرتا تھا۔ میرے لیے بھی یہ خوشی کی بات تھی۔ میں اکثر ماں سے کہتا کہ اس کی منجھلے سے بڑی بنتی ہے تو وہ مسکراتی اور کہتی: ''ہاں! وہ میری سنتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے جہاں کہیں میں نے جانا ہوتا ہے تو ساتھ جاتا ہے۔ ذرا نزلہ' کھانسی ہو جائے تو دوڑ کر دوا لاتا ہے۔''

☆☆

عشاء کا وقت ہوا تو برادری کے دو بڑے پنچ حکیم بشیر احمد اور حکیم محمد احسن ہمارے گھر آئے اور میرے تمام دلائل رد کرتے ہوئے اور میری ایک بھی نہ سنتے ہوئے حکماً میری شادی کی تاریخ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۳ء مقرر کر ڈالی۔ میں نے بڑا احتجاج کیا کہ اسی روز تو اسکول کھلنے والا ہے' لیکن انھوں نے کہا کہ یہ تاریخ مولوی غلام رسول نے طے کی ہے۔ ان کی ملاقات پچھلے ماہ تمہاری ماں اور چچا سے ہو چکی ہے۔ ان دونوں کو بھی اس تاریخ سے اتفاق ہے۔ مجبوری تھی لہٰذا میں خاموش رہا۔ مولوی صاحب کا کہا ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ خود تشریف نہیں لائے تھے ورنہ وہ اپنے منحنی قد وقامت کے باوجود برادری کے ہر ٹال مٹول اور چوں چرا کرنے والے نوجوان کو جوتے لگانے کی دھمکی دیا کرتے تھے۔ جب پنچ چلے گئے تو ماں نے وضاحت کی کہ تمہارے چچا نے اپنی نئی بیگم کو دو ماہ سے میکے بٹھا رکھا ہے اور انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ جوان بیٹی کو گھر سے رخصت کرنے کے بعد ہی وہ اسے گھر لائیں گے اور اب جب میں پڑھائی لکھائی کر کے نوکر بھی ہو گیا ہوں تو مجھے گھریلو اور عائلی معاملات کا بھی کچھ شعور ہونا چاہیے۔ ماں نے یہ بھی بتایا کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ غریبی دعوے کے سارے انتظامات اس نے کر رکھے ہیں۔ بھائیوں نے برتن بجا کر برادری کے پنچوں کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ پنچ تو بس عمل کرانے والے بیلف ہی تھے جبکہ اصل فیصلہ تو ماں اور چچا ہی کا تھا۔

☆☆

خاصی باتیں کرنے کے بعد منجھلے بھائی نے ایک افسوس ناک خبر بھی سنائی کہ ملک عبدالغنی میرے دوست بلکہ لنگوٹیے کے سر کو تیزاب چڑھ گیا ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

لاہور سے بھاگ آیا ہے۔ باتیں بھی اوٹ پٹانگ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کا دل دھاگے کا گولہ بن گیا ہے اور جب دھاگہ ادھڑتا ہے تو اسے درد ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اور بہنیں پریشان ہیں۔ جب اسے سمجھایا جاتا ہے تو وہ ڈرامے کے انداز میں فلمی مکالمے بولتا ہے۔ حکیم ادریس کاندھلوی نے مراق اور حکیم جیلانی نے تبخیر تشخیص کی ہے۔ مجھے فکر ہوا۔ آخر لنگوٹیا تھا اور مہربان کام آنے والا شخص تھا۔ اگلے ہی دن میں شہر پہنچا۔ وہ مجھے ٹھیک ٹھاک طریقے سے ملا۔ میں نے اس کا حال پوچھا تو بولا کہ حال ٹھیک نہیں رہا ہے۔ دل کی جون بدل گئی ہے۔ اس فکر میں وہ دبلا بھی ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑا سر کھپایا کہ دل گوشت کا لوتھڑا ہے دھاگوں سے بنا ''کھدو'' نہیں ہے۔ میں اسے اپنے وقت کے نامور طبیب عبدالنبی شجر کے پاس لے گیا' لیکن ایک گھنٹے کی تقریر اور وضاحتیں سننے کے بعد بھی ملک نے یہی کہا کہ اس کا دل ادھڑ رہا ہے اور سوائے اس کے کوئی دوسرا اس مرض کو نہیں سمجھ سکتا۔ پھر اچانک وہ ''جس تن لاگے سو تن جانے ہو'' اونچی آواز میں گانے لگا۔ حکیم شجر صاحب شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

بعد کو گھر میں ہم دونوں دھوپ میں بیٹھے تھے اندر سے اس کی پریشان حال ماں باہر آئی تو اس نے گانا چھوڑ کر اچانک اونچی آواز میں ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کسی فلم کا مکالمہ بولا۔ ''ماں! تمنا تو یہ تھی کہ ٹھاکر کی ارتھی اس حویلی سے نکلتی۔'' اس نے اشارے سے اپنے گھر کو حویلی ظاہر کرتے ہوئے کہا ''مگر مجبوریاں اسے زندہ نکلوا رہی ہیں۔'' یہ مکالمہ بولتے بولتے وہ گھر سے باہر نکل گیا اس کی ماں رونے لگی اور مجھے بتانے لگی کہ غنیئے (غنی) کو کوٹ خواجہ سعید کے قریب کے کھنڈرات اور باغات میں سے کسی بدروح نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ میں جلدی سے باہر نکلا کہ ملک غنی کو ڈھونڈ کر لاؤں۔ دیکھا تو وہ مسجد کی بیرونی دکان پر کھڑا حافظ صاحب سے بڑی سنجیدگی سے اپنے مرض کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اس کی یہ حالت شورے کے تیزاب سے اٹھنے والے کاٹ دار دھویں سے ہوئی ہے۔

مجھے ملک عبدالغنی کا سوتیلا بھائی ملک محمد شفیع بھی ملا۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھا۔ سوتیلا ہونے کے باوجود عبدالغنی کا مہربان اور ہمدرد تھا۔ مجھے بھی بزرگانہ حیثیت سے پندونصائح کرتا رہتا تھا۔ میں اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اسے قدرت نے اتنا دیا تھا کہ سیالکوٹ کے مشہور سونی خاندان کے ''سونی محل'' کے عین بالمقابل خادم علی روڈ پر اس نے نیا نیا ''ملک محل'' تعمیر کرایا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ موچی دروازے کے باہر لاہور کیمیکل ورکس اور کوٹ خواجہ سعید میں تیزاب کے

سارے کاروبار میں اس کا سرمایہ لگا ہوا تھا برادر عزیز عبدالغنی تو بس کاروبار کا مختارِ عام تھا۔ خوب کھاتا پیتا اور اڑاتا رہا ہے میں نے اس سے دو ہفتے قبل حساب کتاب مانگا ہے تو اس کا دل ''ادھڑ نا'' شروع ہو گیا ہے۔ میں اسے بطور دوست کے کہوں کہ وہ اس ڈرامے کو بند کرے۔ بوڑھے ماں باپ بہنوں اور ہم بھائیوں کو پریشان کرنا چھوڑ دے۔ وہ اس سے حساب کتاب بھی طلب نہیں کرے گا۔ میں پھر سے ملک کے گھر گیا، تو وہ مجھے ایسے ملا جیسے اس کی اور میری ملاقات ابھی ابھی ہو رہی ہو۔ گاؤں کی باتیں کرتا رہا اپنی ماں کو بتاتا رہا کہ زلفی تو اب انگریزی اخبار بھی پڑھ لیتا ہے۔ بی اے بی ٹی ہو گیا ہے اور قریشی محمود کی طرح ہیڈ ماسٹر بن گیا ہے۔ موقع پاتے ہی میں نے اسے اس کے بھائی کا پیغام دیا تو پھر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ لہرا لہرا کر اونچی اور گرجدار آواز میں بولا: ''دیے میں بتی نہیں دیے کا تیل جلتا ہے۔ غنی اپنی بیماری کی بکواس کرتا ہے۔ ہی ہی ہی۔ اپنے بھائی شفیع سے ڈرتا ہے۔ ہی ہی ہی۔'' ایسے ہی واہی تباہی بکتا وہ گھر سے پھر باہر نکل گیا۔

یہی سوچتا ہوا کہ ملک عبدالغنی کو کیا ہوا؟ میں بھی گاؤں لوٹ آیا۔

میری شادی کی جو تاریخ زبردستی طے کی گئی تھی اس پر کاربند رہنے کے لیے میں بیس ستمبر ہی کو سیالکوٹ شہر چلا گیا تاکہ وہاں سے علی الصباح روانہ ہو کر وقت پر اسکول پہنچ سکوں۔ ملک عبدالغنی کو میں نے بتایا کہ کل شام میری شادی ہے۔ وہ اس کی بہنیں اور والدین بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیسی شادی ہے کہ تم ادھر گھوم رہے ہو۔ مایوں نہیں بیٹھے۔ مہندی نہیں رچائی کسی کو بلایا تک بھی نہیں۔ ممتاز (منجھلا بھائی) نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ گھر میں پہلی پہلی اور پہلے بچے کی شادی ہے اور بہن جی (میری ماں) نے بھی کچھ نہیں کیا۔ لاکھ مجبوریاں ہوں شادی پر تھوڑا بہت دھوم دھڑکا تو ہوتا ہی ہے۔ اگلے دن سوموار کو سکول دو ماہ کی تعطیلات کے بعد کھلا تو میں سکول پہنچا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے عملے کو بتایا کہ آج شام کو میری شادی ہے تو کچھ لمحے ان پر سکتہ ہی طاری رہا۔ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کس قدر احمق شخص ہے شام کو شادی ہے اور یہ ادھر ڈیوٹی ادا کر رہا ہے۔ نواز گھمن نے کہہ ہی ڈالا کہ ایسی شادی تو کمیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ رسوم و روایات سے بغاوت بدشگونی ہوتی ہے۔

جب ذرا وقت گزر گیا تو سب نے باری باری پوچھا کہ وہ شادی کے سلسلے میں میری کیا خدمت کر سکتے ہیں تو میں نے انھیں دعائے خیر کرنے کو کہا۔ پھر بھی ماسٹر فتح دین کی پیش کش تھی کہ وہ میرے ساتھ میرے گھر چلتا ہے۔ وہاں وہ مہمانوں کی خدمت کرے گا۔ نواز گھمن نے کہا کہ کچھ کام کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہو تو وہ دو چار کامے بھیجنے کو تیار ہے۔ مولوی منظور

حسین نے علیحدگی میں مجھے ضرورت کے مطابق مبلغات مہیا کرنے کی پیشکش کی۔ جواباً میں نے مولوی منظور حسین کو دو دن کی درخواست رخصت اتفاقیہ لکھنے کو کہا جبکہ نئی سائیکل والے مدرس سے دو دن کے لئے سائیکل عاریتاً لی۔ اس خلاف معمول رخصت پر میں جملہ اساتذہ سے ہاتھ ملا کر گھر کے لیے رخصت ہوا۔

شادی کی تقریب انتہائی سادہ تھی۔ یہاں تک کہ سہرا اور خوشبو تک بھی نہیں تھی۔ ڈھولک اور گانا بجانا بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس روز محرم الحرام کی گیارہویں تاریخ تھی۔ ہمارے ہاں تو کوئی مہمان تھا ہی نہیں۔ ماں تھی اور ہم بھائی۔ رشتہ داروں اور برادری کے لوگوں کو البتہ چچا نے بلا رکھا تھا۔ ہمارے اور ان کے رشتہ دار برادری اور دوست سانجھے ہی تو تھے۔ چچا کے ہاں کھانا بھی تھا۔ ہمارے علم کے بغیر گاؤں بھر کی جگت پھوپھی اللہ رکھی جو ہماری ہی برادری سے تھی نے تقریب کی سادگی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا۔ اس نے کہاروں کو ڈولی لانے کے لئے کہلا بھیجا۔ پھر اپنے پڑوسی دسوندھی شیخ کو اپنا بینڈ باجا بھی دلہن کے باپ کے گھر سے لے کر سسرال کے گھر تک بجاتے جانے کا حکم دیا۔ انھیں جو کچھ دینا تھا وہ بھی پھوپھی نے اپنی جیب ہی سے ادا کیا۔

میرے علم کے بغیر ماں نے ہمسائی پھوپھی فاطمہ کو ایک دیگ کھچڑی پکوار کھنے کا کہہ رکھا تھا۔ بھائی ایک پیٹرومیکس بھی لے آیا تھا کہ گاؤں کی جانی پہنچانی لڑکی محلے بھر کی عورتیں دلہن کے روپ میں دیکھنے آرہی تھیں۔ ایک ستم ظریف حق گو خاتون جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا یہ جملہ چست کیے بغیر نہ رہ سکی کہ چاند کو گہن لگا دیا گیا ہے۔ گہن میں تھا۔

ہمارے خاندانی حجام کی بیوی نے کھچڑی محلے کے ہر گھر میں ان دو دو لڈوؤں کے ساتھ تقسیم کی جو ٹوکری بھر کر ڈولی کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔

ایک مسلمان کی زندگی میں شب برات، لیلۃ القدر اور شب معراج بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان راتوں کی برکات کا گواہ خود خدا ہے۔ ایمان والے ان راتوں میں عرفان پاتے ہیں اور توشۂ آخرت تلاش کرتے ہیں۔ ان پر انوار راتوں کے بعد کچھ ایسی راتیں بھی ہیں جن کی اہمیت کے پیش نظر ان کا ذکر شعرا کے دیوانوں اور ادباء کی انشاء میں ملتا ہے۔ ان میں مشہور چاند کی چودھویں کی رات، تاروں بھری رات، شب ہجراں، شب غم، شب تنہائی اور مسیا کی رات وغیرہ شامل ہیں۔

ان راتوں میں سے ایک رات ایسی بھی ہے جس کے حوالے سے بے پناہ ادب تخلیق کیا گیا ہے جس رات کو جذب و اشتیاق کی وارداتوں کی کیفیات کو رقم کرتے کرتے قلم اب بھی

تھک جاتا ہے۔ اس رات کی طوالت زمان ومکاں کے فلسفے کے لیے ایک چیلنج ہے۔ طبیعات والے جب اس رات سے گزرے تو دسمبر و جنوری کے مہینوں کے باوجود انھوں نے اس رات کو مختصر ترین قرار دیا۔ اہل دل کے لئے تو اس رات کی طوالت چھلک کے مصداق ہے ؎

تیری کمر کے باب میں چھلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے اس نکتے کو طبیعت جس کی گٹھل ہو

چھلک اس (x) علامت کو کہتے ہیں کہ وجود کے لحاظ سے موجود بھی ہے اور اس کے معنی ''نہیں'' کے ہیں۔ سونسوانی لغت میں شادی کی پہلی رات کو ''شب عروس'' کہتے ہیں۔

شادی نصف ایمان ہے۔ سنت نبویؐ ہے، اسوہ حسنہ ہے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک ایک دوسرے کا ہو کر جینے کا پیمان وفا ہے۔ ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ بعض کے نزدیک شادی بھور کے لڈوؤں کی مانند بھی ہے۔ کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اور میری عم زاد کاٹھ کے پلنگ پر گٹھڑی بنے بیٹھی تھی۔ میں نے چھ سال قبل اسے دس گیارہ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔

میں اسے بتا رہا تھا کہ میں نے اسے گودوں کھلایا ہے۔ وہ مجھ سے دس برس چھوٹی ہے۔ چچی مرحومہ کے کہنے پر میں اسے کھیلانے کے لئے نالہ ایک کی ایک شاخ کے پل پر لے گیا تھا۔ اسے میں نے پل پر بٹھایا اور خود دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ نالے میں گر گئی ہے نالے میں پانی بہت کم تھا۔ پھر بھی پل کے نیچے خاصا پانی تھا۔ میں نے چیخ ماری اور پانی میں اتر گیا، لیکن مجھ سے پہلے ہی بھینس نہلانے والے دین دار نے اسے پکڑ لیا تھا اور وہ خوف سے رو اور ہچکیاں لے رہی تھی۔ بچوں نے میرے گھر پہنچنے سے پہلے گھر میں صرف اس قدر خبر پہنچائی تھی کہ ثرو نالہ ایک کے پل سے پانی میں گر گئی ہے۔ میں جب پریشان حال عورتوں میں پہنچا تو انھوں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

میں اسے بتا رہا تھا کہ بڑی ہو کر وہ ایسی چھپی، ایسی چھپی کہ بس آج ہی دستیاب ہوئی ہے تو کسی اور ہی انداز میں۔ میں نے اسے بتایا کہ میری ماں اسے پا کر بڑی خوش ہے۔ میری اس بات پر وہ خاموش نہ رہ سکی اور گھونگٹ کی اوٹ سے کہا: ''مجھے علم ہے کہ بے جی تو خوش تھے اور ہیں لیکن آپ تو شادی سے ہی ناخوش تھے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے۔''

''تم نے یہ بکواس کہاں سے سنی تھی۔ میں تو تمہیں بڑے اچھے طریقے سے شان بان

سے لانا چاہتا تھا۔ اس لیے ٹال مٹول کر رہا تھا۔'' میں نے وضاحت پیش کی۔ ''قسم لے لو' میں تمہیں پا کر بے حد خوش ہوں' لیکن میری اولین خواہش یہ ہے کہ میری ماں کبھی ناخوش نہ ہو۔''

''میری تو یہی کوشش ہوگی' لیکن اگر کوئی خاص بات ہے تو مجھے بتا دیں۔''

میں پھوہڑ مرد سے بتانے لگا کہ ہمارے گھر کی مالی حالت کیا ہے؟ ہم بیس سال کے عرصے سے یتیم چلے آ رہے ہیں۔ ماں نے پہلے ہم یتیموں کو پالا پھر جب تمہاری امی کا انتقال ہوا تو تم تین بہن بھائیوں کی نگہداشت میں دادی کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اب تین یتیم بھتیجے اس کی ذمہ داری بن گئے ہی۔ گزشتہ سال کے اخراجات نے ہمارا کچومر نکال دیا ہے۔ چھوٹا بھائی دن رات محنت کر رہا ہے تو گھر چل رہا ہے......

اسی رواداری میں' میں یہ بھی کہہ گیا کہ شادی پر تمہیں پہنائے گئے کچھ زیورات مانگے کے ہیں۔ اسی لیے تو میں شادی التوا میں ڈال رہا تھا۔

شب عروسی میں میری یہ تقریر میرے اناڑی پن پر مبنی تھی۔ میں عائلی زندگی کی الف بے سے بھی واقف نہ تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ مرادوں والی رات بدشگونی کی باتیں دودھ میں مینگنیاں ڈالنے کے مترادف تھیں۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت' جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ منہ سے نکلی بات واپس نہ آ سکتی تھی۔ وہ اداس سی ہو گئی۔ اسے میرا سچ ناگوار گزرا تھا۔ ناگوار گزرنا ہی چاہیے تھا۔ جانے ایک نوجوان لڑکی شادی سے پہلے اپنے نئے گھر کے متعلق کیسے کیسے رنگ محل تعمیر کرتی ہے اور اس میں رانی بن کر رہنے کے لئے کتنے سہانے خواب دیکھتی ہے۔

وہ شوہر سراسر احمق ہوتا ہے جو پہلے ہی مکالموں میں سچ بولنے پر اتر آتا ہے اور پھر ساری عمر جھوٹ بولنے میں گزار دیتا ہے۔

ثرو کا گھونگھٹ خود بخود ہی سرک گیا تھا۔ اداس ہونے کے باوجود مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ ایسی باتیں جن کا تعلق میرے ماضی کی ان باتوں سے تھا جن کو وہ نہیں جانتی تھی اور اس کے ماضی کی ان باتوں سے تھا جن کو میں نہیں جانتا تھا...... پھر کچھ مستقبل کی باتیں تھیں۔ حال کے لمحات ان باتوں میں شامل نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس ارمانوں بھری رات میں بھی بے حال نہ ہو سکا۔ گو مجھے یہ تاریخ اور یہ تاریخی رات ہمیشہ ہی یاد رہی ہے۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ میری شب عروسی والی تلخ و ترش باتیں میری بیوی کو بھی حرف بحرف یاد ہیں۔ اپنی تمام تر محبتوں

اور قربانیوں کے باوجود وہ ہر سال یہ طعنہ ضرور دیتی ہے کہ میرے پاس اس کے لئے کوئی تحفہ اور کوئی پیار کا بول نہیں تھا۔ تاہم اسے کبھی شادی کا دن یاد نہیں رہتا جبکہ مجھے یاد ہوتا ہے۔

دو دن کی رخصت گزارنے کے بعد جب میں واپس اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو بوندی کے لڈوؤں کے ایک تھیلے کے علاوہ میرے دامن میں اپنے چچا اور اب سسر محترم کے چند خصوصی سودمند پند و نصائح بھی تھے۔ لڈوؤں کے تھیلے کو تو میں نے سب اساتذہ کو پیش کیا۔ جواباً انھوں نے مجھے مبارک بادیں دیں اور میری نئی نئی ازدواجی زندگی کے حق میں نیک دعائیں کرتے ہوئے انھیں کھایا۔ میں بھی ان کے ساتھ لڈو کھاتے ہوئے ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ سب کے سب مدرسین سوائے ماسٹر نذیر احمد اور نواز گھمن کے مجھے انتہائی مسکین قسم کی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ نواز گھمن کے چہرے پر کرختگی کے علاوہ ایک مردانہ وجاہت بجی اور مسکراہٹ چھائی رہتی تھی جبکہ نذیر کی آنکھوں میں بڑی پراسرار چمک اور گہرائی تھی۔ میرے نزدیک ان کی یہ انفرادیت اس احساس کی عکاس تھی کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے اساتذہ سے برتر خیال کرتے تھے۔ وہ تھے بھی برتر...... مثل مشہور ہے کہ وہ انسان نہیں محض ایک ''کدو'' ہے جو کسی کا کچھ بگاڑ سکے نہ کچھ سنوار سکے۔ چچا نے ایس وی ٹیچر ہونے کی وجہ سے ذاتی مشاہدے کی بتیس سالہ سروس کے تجربے کی بنا پر جو نکتے کی بات بتائی تھی وہ یہ تھی کہ بلدیاتی سکولوں کے جے وی اور ایس وی مدرسین انگریزی کے استاد کو ہیڈ ماسٹر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ گو وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے' لیکن وہ خود کو الگ اکثریتی طبقہ شمار کرتے ہیں۔ جبکہ انگریزی کے استاد کو اقلیت سمجھتے ہیں۔

ایسے مدرسین کی خوشامدانہ باتوں میں نہ آنے ہی میں عافیت ہے۔ نیز میں اپنے افسران سے بنا کر رکھوں اور ماتحتوں سے بھی جمہوری برتاؤ کروں۔ بیشک اپنی مرضی ہی کروں لیکن ان سے مشورہ ضرور کروں۔ کوئی بھی مقام ہو وہاں مقامی اور پردیسی ہونے کا فرق بھی ہوتا ہے لہٰذا پھونک پھونک کر قدم اٹھانا میرے لیے مناسب رہے گا۔ یہ باتیں میرے تحت الشعور میں تو تھیں لیکن تعطیلات سے پہلے شعور میں نہ آئی تھیں۔ چچا نے بروقت راہنمائی کر کے بہت سی مثبت سوچوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ ان میں ایک سرکاری اسکول میں ملازمت کرنے کی سوچ بھی تھی۔ چچا نے میری پیدائش پر میرا نام ہی ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے نام پر رکھا تھا اور میرے لیے اسی منصب کی دعا بھی کی تھی۔ ان کا خواب میرے سرکاری ملازمت میں جائے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے خود بھی آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ میں نے اسی روز بذریعہ خط اصغر علی گردیزی کو سرکاری ملازمت

کے بارے میں اپنی سرگوشی یاد دلائی اور اپنی شادی کی بھی اطلاع دی۔

☆☆

حالات پر غور و خوض اور اخراجات گھٹانے کے لیے میں نے اسکول ہی میں قیام کیا۔ ہفتے کو چھٹی کے بعد گاؤں چلا جاتا اور پیر کے روز آ جاتا۔ بابو بشیر اور ماسٹر صدیق میرے ساتھ احترام کا ایک فاصلہ رکھتے۔ کھانا پکا کر اور لگا کر مجھے کھانے کے لئے بلاتے۔ ہم گپ شپ لگاتے ہوئے کھاتے۔ میں مسلسل سوالات سے ان سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتا رہتا۔ وہ پچھلے ایک سال سے زائد عرصے سے مڈل اسکول کالا میں تھے۔ ان کی ایک ہی تمنا تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کا تبادلہ شکر گڑھ تحصیل میں ہو جائے۔ شکر گڑھ تحصیل کے بہت سے مدرسین ضلع سیالکوٹ کی دیگر تحصیلوں میں تھے اور سب کو واپس گھر کے قریب جانے کا فطری جنون تھا۔ کوئی اسامی تحصیل شکر گڑھ میں نکلتی تو اس کی باقاعدہ بولی لگتی۔ بشیر اور صدیق نے بھی متعلقہ افراد کو تین تین تنخواہوں کی پیش کش کر رکھی تھی۔ ان کی مہیا کردہ مقامی اور غیر مقامی نوعیت کی معلومات میرے لیے بے حد مفید ثابت ہو رہی تھیں۔

اساتذہ کے خاندانی پس منظر، بعض طلبہ کے احوال و کوائف، ادھر ادھر مسلسل نظر آنے والے افراد کا شجرہ نسب اور ان کی سرگرمیاں، گاؤں کے نیک و بد افراد وغیرہ کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا۔ بعض افراد کے معاشقوں کا بھی پتہ چلا۔ نواز گھسن ایک میرزادی سے محبت کرتا تھا۔ وہ اکثر ایک شانِ بے نیازی اور ایک پروقار چال چلتی ہوئی اسکول کے قریب سے گزرتی تھی۔ وہ شادی کے وعدے کے بغیر گھسن کو گھاس ڈالنے کو تیار نہ تھی اور گھسن بھلا میرزادی کو چودھرانی کیسے بنا سکتا تھا۔

اور تو اور انھوں نے مجھے مولوی منظور حسین کے عشق بلاخیز کا قصہ بھی سنایا۔ مولوی موصوف کے پاس ایئر فورس کا ایک مخصوص کمبل تھا۔ ایک رات جب وہ اپنی محبوبہ کے گھر تھے تو کھڑاک ہونے پر وہاں سے بھاگ نکلے۔ کمبل وہیں رہ گیا۔ کمبل رقیبوں کے ہاتھ لگ گیا۔ طے ہوا کہ علی الصباح اگر مولوی صاحب اپنے مخصوص کمبل کے بغیر مسجد میں اذان اور امامت کے لیے تشریف لائیں تو ان کے بازو اور ٹانگیں توڑ دی جائیں۔ محبوبہ نے رقیبوں کو یقین دلا دیا تھا کہ مولوی اس سے ملنے نہیں آیا تھا اور کمبل خدا جانے کس کا ہے۔"

مولوی صاحب کو علم تھا کہ ماسٹر بشیر کا ایک رشتہ دار بالکل اسی قسم کا کمبل اوڑھے ایک دو مرتبہ بشیر کے پاس آیا تھا اور وہ پرائمری اسکول منڈیر شریف میں ماسٹر تھا۔ مولوی صاحب بھاگے بھاگے بشیر اور صدیق کے پاس آئے۔ اپنی بپتا سنائی اور کہا کہ صبح کی اذان سے پہلے ان

کے پاس وہ ایئرفورس کا کمبل ہونا چاہیے اگر وہ کمبل کے بغیر یا کوئی دوسرا کمبل اوڑھے مسجد گئے تو ان کی جان بھی جاسکتی ہے۔ دونوں مدرسین راتوں رات بشیر کے رشتہ دار کے پاس پہنچے اور مولوی صاحب کا مطلوبہ کمبل لے آئے۔ علی الصباح وہ اطمینان سے کمبل اوڑھے جنگل گئے۔ واپس آ کر اذان دی اور حسب معمول نماز پڑھائی۔ گھات میں بیٹھے رقیبوں کو مولوی صاحب کے حسن تدبر سے شکست ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ مولوی صاحب بال بچے دار دبلے پتلے اور کالے کلوٹے متشرع انسان ہیں۔ وہ کونسی خوبی ہے کہ وہ پاگل رنگڑوں کے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ان پر مر مٹی؟''

''جناب! مولوی صاحب کے حسن قرآءت پر......''

جی ہاں' حسن قرآت ...... ان کی محبوبہ مسجد سے آنے والی آواز سن کر مبہوت ہو جاتی تھی اور وہ اکثر مولوی صاحب کی دھیمی آواز میں ان سے قرأت سنا کرتی تھی اور پھر حسن قرأت کے مالک مولوی کو ہمیشہ کے لیے اپنا ہی بنالینا چاہتی تھی۔

ع...... صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا للہ

میں نے مولوی صاحب کی قرأت سنی۔ سبحان اللہ! مولوی کو اللہ نے اس حسن قرأت سے نواز رکھا تھا کہ اگر اس دور میں ٹی وی ہوتا تو آج مولوی منظور حسین کو قاریوں کا امام مانا جاتا کیونکہ سیالکوٹ کے مشہور علامہ یعقوب کی رنگ پورہ روڈ والی مسجد میں حسن قرأت کے مقابلے میں مولوی منظور حسین کو پہلا انعام دیا گیا تھا۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میں نے مولوی منظور حسین کو طبقہ قُرأ سے متعارف کرایا۔

اسی عملی یونیورسٹی میں جس کا نام مڈل اسکول کالا تھا میری تربیت کسی اندرونی راہنمائی کے تحت ہو رہی تھی۔ ہر پرانی سوچ...... خام' ہر پرانا عمل ...... حماقت' ہر مشاہدہ ...... ادھورا اور ہر ادراک...... ناقص محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کیسی تبدیلی تھی؟ درس گاہوں کا سابقہ تجربہ اور بی ٹی کی ساری تربیت اس یونیورسٹی کی عملی تربیت کے سامنے صفر نظر آ رہی تھی۔ اصطلاحی زبان میں' میں ایک دیہاتی معاشرے کا لیڈر تھا میں طلبہ' ان کے والدین' اسکول کے اساتذہ' مرکز کے ملحقہ اسکولوں کے اساتذہ اور عام لوگوں کی راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ میری اس خام راہنمائی کے معاوضے میں وہ سب مجھے بہت کچھ لوٹا رہے تھے۔ میری اپنی تربیت ہو رہی تھی۔ میں اب پیدا ہوا تھا۔ میرے

اردگرد ایک جیتا جاگتا دیہی معاشرہ تھا۔ چھوٹے بڑے، پڑھے لکھے، جاہل اور گنوار افراد تھے۔ طلبہ تھے مدرسین تھے، اسکول کو درودیوار تھے، شجروثمر تھے۔ ہر قسم کے مویشی تھے، چرند پرند تھے، پھیلے ہوئے اور مختلف فصلوں کا بار اٹھائے کھیت تھے۔ ندی، نالے، رہٹ، بیلنے، جوہڑ اور پگڈنڈیاں تھیں۔ حشرات الارض تھے۔ مضر صحت کیڑے مکوڑے اور مفید و غیر مفید مکھ اور مکھیاں تھیں۔ میں ان سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن کالے میں یہ سب میرے استاد اور راہنما ثابت ہو رہے تھے۔ جس طرح بی ٹی میں جا کر میں نے جاہل ہونے کا شعور حاصل کیا تھا بالکل اسی طرح کالے کی زندگی جو میرے دیکھے بھالے قافلوں، مرحلوں، راستوں اور منزلوں سے آراستہ تھی مجھے مزید جاہل ثابت کر رہی تھی۔ میں ہر چیز کو نئے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ گنہگار کو شاید روشنی کی کوئی ہلکی سی نئی کرن عطا فرمائی تھی۔ مجھے اپنی چالاکیاں، پھرتیاں اور درفنطنیاں حماقتوں کی صورت میں نظر آنے لگی تھیں۔

پردۂ غیب سے ایسے ایسے اسباب پیدا اور ایسے ایسے نئے واقعات جنم لے رہے تھے جو بظاہر معمولات کا ایک حصہ تھے لیکن ان میں میرے مستقبل کی تربیت کا سامان تھا۔ ایسے واقعات کی چند جھلکیاں پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہونا یقینی ہے۔

اسکول کی عمارت کے سامنے لمبا سا صحن ایک گراؤنڈ سے ملحق تھا۔ صحن کی آخری حد پر بڑ کا درخت تھا جس پر بہت سے انواع واقسام کے پرندے رہتے تھے۔ علی الصباح وہ دانہ دنکا چگنے اڑ جاتے اور پھر اسکول بند ہونے پر طلبہ کی روانگی کے بعد لوٹتے۔ رات کو میں اور میرے دونوں ہانڈی وال صحن سے آگے کی گراؤنڈ میں سوتے۔ گراؤنڈ سے ورے کچا راستہ تھا۔ اس سے آگے ایک جوہڑ تھا۔ جو مغرب سے مشرق کی طرف پھیلتا ہوا گاؤں سے آگے نکل گیا تھا۔ مشرقی حصے کو مختلف مقاصد کے لیے گاؤں والے استعمال کرتے جبکہ مغربی حصے کو اسکول کے سامنے ہونے کی وجہ سے طلبہ استعمال کرتے۔ چھٹی کے بعد جوہڑ کے اس حصے میں انواع و اقسام کے آبی جانوروں کی اکثریت آ جمع ہوتی۔ کبھی کبھی آوارہ مرغابیاں بھی ماسٹر نواز گھمن کے دو چار کارتوس ضائع کرنے آ بیٹھتیں اور شکاری کا منہ چڑا کر اڑ جاتیں۔

ایک روز ماسٹر نواز نے مجھے نشانہ لگانے کو کہا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں نے ایک داؤ کھیلنے ارادہ کر لیا۔ اپنے خالہ زاد شکاری بھائی کی میٹرک کی تعلیم کے دوران دی گئی ہدایات کو لاشعور سے شعور میں لایا۔ میں نے بندوق کو ہاتھ میں پکڑ کو تولا۔ اس کا چیمبر کھول کر دیکھا۔ چار نمبر کا کارتوس موجود تھا۔ جب تک کہ میں نشانہ باندھوں مرغابیاں پر تول کر اڑ

پڑیں۔ میں نے بھی نالی کو بلند کیا اور ساٹھ درجے کا زاویہ بنتے ہی لبلبی دبا دی۔ چار میں سے دو مرغابیاں بل کھاتی زمین میں آ گریں۔ صدیق اور بشیر نے ان کو پکڑ کر ذبح کیا جبکہ نواز گھمن حیرت سے بت بنا کھڑا رہا۔ ماسٹر صدیق نے اس کو حیرت سے یہ کہہ کر نکالا کہ اس نے تو قاضی صاحب کو آج تک شکار نہیں کھلایا۔ آج قاضی صاحب کی طرف سے اس کی دعوت ہے۔

شکار کی باتیں ہوئیں۔ مولوی منظور حسین کے پاس بھی ایک نالی امریکن ونچسٹر بندوق تھی۔ مشہور تھا کہ مولوی صاحب نے ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر جب تلیئروں پر فائر کیا تو بندوق کے دھچکے سے وہ مینڈھ کی پچھلی طرف اور بندوق اگلی طرف جا گری۔ تلیئر تو کیا ہاتھ لگنے تھے مولوی صاحب کو کئی دن میٹھے تیل کی مالش کی گئی۔ تب ان کے کندھے کا درد ختم ہوا۔

بغیر مشق کے یہ جو نشانہ پرنسپل سنٹر ٹریننگ کالج مسٹر بی اے ہاشمی جیسے ماہر شکاری کی طرز پر مجھ سے اتفاقاً لگا تھا خدا کا انعام تھا۔ اس عمل سے اللہ کو میری عزت بڑھانا مقصود تھی۔ چند ہی روز بعد اڑتے اڑتے جھپٹ کر مچھلیاں پکڑنے والے ماہی گیر پرندوں کا ایک غول مولوی منظور والی مسجد کے جنوب میں واقع جوہڑ پر اترا۔ اس بیٹھے ہوئے غول پر مولوی منظور کے کہنے پر مجھے ایک اور چھ نمبر کا کارتوس داغنے کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اتفاق سے سولہ سترہ پرندے کھیت رہے تھے۔ پہلا نشانہ اگر اتفاق تھا تو یہ ہرگز اتفاق شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غرض میرے نشانچی ہونے کی دھاک بیٹھ گئی۔ مجھے نواز گھمن نے مولوی صاحب کی ونچسٹر خریدنے کی ترغیب دی۔ لہٰذا میں نے اپنے مہربان اور دوست ایڈیشنل انسپکٹر پولیس محمود الحسن انصاری ایم اے ایل ایل بی جو بھٹو دور میں ایس پی سیالکوٹ تھے اور مسٹر کھر کے ہیڈ مرالے کے علاقے میں ڈی پورٹ ہونے کے بعد اس کی مدد کر کے معتوب ہوئے۔ اور میں جن کی انسپکٹری کے بجائے ان کی تعلیمی اہلیت سے زیادہ متاثر تھا کے ذریعے لائسنس بنوا کر مولوی صاحب سے ان کی بندوق ادھار خرید لی۔ وہ خود بھی بندوق سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اکتوبر کے مہینے کے باوجود گرمی اور حبس تھا۔ البتہ رات ٹھنڈی تھی۔ ان دنوں انتہائی سردی کی راتوں میں ہی اندر سویا جاتا تھا۔ اوس سے گھبرا کر اندر سونے کا کوئی رواج نہ تھا۔ ہم تینوں ابھی بڑ کے سائے سے ہٹ کر رضائیاں اوڑھ کر سوتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ پرندوں کے ساتھ بڑ پر ہوائی مخلوق بھی رہتی ہے۔ مقامی عامل شاہ صاحب (نام یاد نہیں آ رہا) نے اس مخلوق کو رات کے وقت بڑے ٹیلے اور ٹیلے سے بڑ کی طرف آتا جاتا دیکھا تھا۔ میرا ہوائی مخلوق

پر یقین نہ تھا لیکن رات کے وقت بڑ ٹیلہ اور جوہڑ کے کنارے کھڑے درخت پر اسرار ضرور نظر آتے تھے۔ ایک رات مجھے کابوس نے آ دبوچا۔ لگا جیسے میں جاگ رہا ہوں اور کوئی نظر نہ آنے والی شے کبھی میری کمر سے کمر ملا کر لیٹ جاتی ہے۔ کروٹ بدلتا ہوں تو دوسری طرف سے ساتھ چپک جاتی ہے اور با قاعدہ بوجھ ڈالتی ہے۔ میں خوف کے عالم میں اونچی آواز میں لاحول پڑھتا ہوں کہ خوف پر فتح پاؤں لیکن آواز نہیں نکل پاتی۔ ایسے میں مجھے ماسٹر صدیق نے ہلا کر جگایا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ اب مجھے سمجھ آیا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خوف کے مارے پسینے میں شرابور تھا۔ صبح اسکول میں میرا چرچا کم لیکن کابوس اور عامل شاہ صاحب کا چرچا زیادہ ہوا۔ منشی محمد شفیع جب عامل شاہ کو مجھے دم کرنے کے لیے بلا کر لایا تو عامل شاہ نے رات کو مدھم لالٹین چارپائی کے قریب رکھنے کا حکم دیا اور اسکول کے گرد چکر لگا کر حصار کھینچا۔

مشہور تھا کہ عامل شاہ صاحب نے مرشد کے کہنے پر نفسانی خواہشات سے بچاؤ کی خاطر اپنے اعضائے نسلی کاٹ کر پھینک دیے تھے جو لوگ ان کو لہولہان اور بے ہوشی کے حالت میں مسجد کے غسل خانے سے اٹھا کر لائے تھے وہ ان کے اس کارنامے کی تشہیر اور تائید کرنے کے لیے زندہ سلامت تھے۔ مجھے اس روایت کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

دو دن بعد ہی رات کو اچانک بارش آ گئی۔ میں نے اپنا بستر اٹھایا اور برآمدے کی سمت چل دیا۔ ماسٹر صدیق لالٹین کی لو اونچی کر کے مجھے راہ دکھانے کی خاطر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بڑ سے آگے نکلا تو عمارت کی سفید دیواروں پر عقب سے پڑنے والی روشنی سے میرا بڑا سا متحرک سایہ دیوار پر نمودار ہوا۔ اپنے ہی سائے کے بارے میں سمجھنے میں مجھے ایک آدھ منٹ لگا ہوگا لیکن اس ایک آدھ منٹ کے اندر اندر ہی میں پسینے سے نہا گیا تھا اور میرے دل کی دھڑکن مجھے خود سنائی دینے لگی تھی۔ اپنے سائے ہی کو میں بڑ پر رہنے والی ہوائی مخلوق کی جھلک سمجھا تھا۔

اسکول کے موسم سرما کے اوقات ۱۶ اکتوبر سے نافذ العمل ہوئے تب تک میں دوپہر کے وقت بڑ کی چھاؤں میں لیٹنا پسند کرتا رہا جبکہ بشیر اور صدیق کھلے کمرے میں آرام کرتے تھے۔ وہ میری پسندیدہ جگہ پر مجھے چارپائی ڈال دیتے تھے۔ کبھی میری آنکھ لگ بھی جاتی لیکن بیشتر اوقات میں جاگتا ہی رہتا اور بڑ کی گمبھیرتا، اس کی شفا بخش گولڑوں، پتوں، چھال، بل کھاتی موٹی موٹی شاخوں، لٹکتی داڑھیوں اور دودھ کی خاصیتوں کے بارے میں سوچتا رہتا۔ حکیموں کے خاندانوں کی قرابت داری اور صحبت میں ان کی حویلی میں اس پراسرار درخت کے بارے میں ہونے والی باتوں کے

ذریعے میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ کئی ٹوٹکے بھی مجھے یاد تھے۔ بڑ پر آنے والے پرندے اور ان کی عادات خواہ مخواہ مشاہدے میں آ جاتیں۔ بعض پرندے پتوں میں چھپ کر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ طوطے ٹیں ٹیں کرنے کے بجائے عجیب سی دبی دبی زبان بولتے۔ ایک دوسرے سے چونچیں لڑاتے اور ان کو جکڑ کر سروں سے بلند کرتے۔ کبھی چونچیں ایک دوسرے کے پروں میں چھپاتے اور گھنٹوں باہمی رفاقت کا اظہار ایسی ہی حرکات سے کرتے رہتے۔ مینائیں گھنے پتوں میں چھپی ٹہنیوں پر بیٹھی اپنی چونچیں اپنے پروں میں چھپا کر سو جاتیں۔ اوپر کی شاخوں پر کوئے بھی کاں کاں کرنے کے بجائے عجیب آوازوں سے کوں کاں کرتے اور پر پھڑ پھڑاتے۔ کسی شاخ سے فاختائیں بھی "گھگو گھوئیوسف کھوہ" کی آواز لگاتیں اور مسلسل لگائے چلی جاتیں۔ بلبلیں شاخ شاخ پھدکتی اور گولیں توڑتی نظر آتیں۔ گلہریاں درشت آواز میں چڑ چڑ کرتی تنوں پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتیں۔

بھولا بھالا فاختہ اور کبوتر نما جانور ہریل خاموشی سے پتوں میں سرسراتا ہوا پکی ہوئی گولیں تلاش کرتا اور ان کو کتر کتر کر نیچے پھینکتا رہتا۔ بندوق خریدنے کے بعد میں نے اس معصوم جانور کا بڑا شکار کیا۔ اس کا گوشت لذت میں کمال رکھتا ہے۔ کالے کالے موٹے چیونٹے بڑی مصروف حالت میں بڑ کے اردگرد سرگرداں رہتے۔ پکی ہوئی گولیں ان کی من پسند خوراک ہوتی۔ اکثر خوراک کے معاملے میں آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ آخر طاقتور کمزور پر غالب آ جاتا اور اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا اس طرح یہ لڑائی اختتام پذیر ہوتی۔ جہاں بڑ کا درخت ہو وہاں یہ مخلوق ضرور پائی جاتی ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ جہاں کالے چیونٹے موجود ہوں ان کے بلوں کے نیچے کالے بچھو بھی ہوتے ہیں۔

◆◆◆◆◆

(۱۱)

سانپ کہانی

اکتوبر کا دوسرا ہفتہ تھا' باہر خنکی اور اندر حبس تھا۔ مولوی منظور کی اذان کی آواز آئی تو میں نے اٹھنا چاہا لیکن کسل مندی کے تحت کھیس اوڑھ کر اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ پھر نیند کی جھپکی آگئی۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو نماز کا وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے اپنا بستر لپیٹا اور دفتر والی کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ بستر کو تو میں نے میز پر ٹکایا اور خود حبس محسوس کر کے میں نے کھڑکی کھولی۔ پٹ کے ساتھ ازار بندوں جیسی رسیوں کا ایک گولا دھپ سے فرش پر گرا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے کھڑکی میں رسی یا ازار بند وغیرہ قسم کی کیا چیز رکھی تھی کہ وہ گولہ کھلنا شروع ہوا اور ملگجے اندھیرے میں سفید سفید' فٹ فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کے سنپولیے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ گارے اور روڑے کی بنی ہوئی موٹی دیواروں کی دراڑوں میں نہ جانے وہ کہاں چھپ گئے اور میں راستہ صاف پا کر پیر پٹختا کوٹھری کو کھلا چھوڑ کر مسجد میں چلا گیا۔ تاہم میں اندر ہی اندر خوف سے دہل کر رہ گیا تھا۔

کالا کے لوگوں کے لیے یہ سانپ معمول کے کیڑے تھے۔ آبی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کو زہریلے نہیں سمجھتے تھے گو نظر آنے پر ان کو مار بھی ڈالتے تھے۔ اس روز سارا دن سانپوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ چھوٹے' بڑے' اڑنے والے' راستہ روک کر بیٹھنے والے اور سپیروں کے سانپوں کی' وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی قصے کہانیوں میں نواز گھمن نے مڈل کی تعلیم کے دوران میں ہونے والے ان دو محبت کے ماروں کا واقعہ دہرایا جن کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور ہم نے ان کی لاشوں کو ہزاروں لوگوں کے ساتھ جنازے کے وقت دیکھا تھا۔

☆☆

گوندل گھرانے میں تایا کی لڑکی اور چچا کا لڑکا اکٹھے کھیلتے جوان ہوئے تو دونوں ایک

دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ ماں باپ ان کی محبت کی راہ میں دیوار نہیں بنے۔ انھوں نے دونوں کی منگنی کر دی۔ اب لڑکی صرف منگیتر سے گھونگھٹ نکالے کھیتوں میں یا رہٹ پر کام کرنے جاتی۔ نوجوان رحمت بھی وہیں ہوتا موقع ملتے ہی وہ شانو سے کہتا: ''اری کوئی نہیں دیکھ رہا۔ ذرا گھونگھٹ پلٹ دے۔'' وہ کہتی خدا تو دیکھ رہا ہے۔ اب برات کے دن تک یہ گھونگھٹ میرے اپنے ہاتھوں سے نہیں اٹھے گا۔ اسے تم ہی اٹھاؤ گے۔ بڑا بھاری ہے۔''

پھر اچانک یوں ہوا کہ ایک دن شانو نے گھر لے جانے کے لئے سوکھے اُپلے ٹوکرے میں ڈالے اور خود کسی اور کام میں الجھ گئی۔ اسی اثنا میں ایک کلر اٹھا پھن دار سانپ ٹوکرے میں گھس گیا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر اس نے ٹوکرا سر پر رکھا۔ ایک ہاتھ سے ٹوکرا سنبھالا اور دوسرے سے گھونگھٹ نکالا اور پھر اسی ہاتھ سے دودھ کا کرمنڈل تھام لیا۔ اسے علم تھا کہ راستے کی پلی کے کنارے رحمت پانی لگا رہا ہے اور وہاں سے اس نے گھونگھٹ نکال کر ہی گزرنا ہے۔ ابھی وہ پلی سے ذرا دور ہی تھی کہ رحمت نے دیکھ لیا کہ ٹوکرے میں اپلوں کے اوپر ایک پھن دار ناگ بیٹھا ہے۔ وہ اپنی لاٹھی اٹھا کر شانو کی سمت بھاگا اور اسے للکار کر کہا کہ اپلوں کے اوپر ناگ بیٹھا ہوا ہے لہٰذا وہ ٹوکرے کو فوراً سر سے گرا دے۔ وہ سمجھی کہ آج رحمت کو انوکھا مذاق سوجھا ہے لہٰذا وہ خاموش چلتی رہی۔

رحمت نے آگے بڑھ کر لاٹھی سے ٹوکرا اس کے سر سے گرا دیا۔ سانپ بھی بڑا پھرتیلا نکلا۔ پیشتر اس کے کہ اسے لاٹھی سے کچلا جائے اس نے رحمت کو ڈس لیا۔ اس نے سانپ کو تو مار ڈالا لیکن خود بھی نیلا پیلا ہو کر زمین پر گر گیا۔

لڑکی کو جب حقیقت نظر آئی تو وہ گھبرا گئی۔ ہونے والے شوہر کو زمین پر پڑا دیکھ کر وہ اس کا سر دبانے، رونے پیٹنے اور شور مچانے لگی۔ پھر اسے رحمت کے جسم سے زہر چوس کر پھینک دینے کے لئے سانپ کے ڈسنے کے زخم سے کئی بار خون کو چوس کر تھوکا۔ رحمت کو آفاقے کے بجائے اس کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو گئی اور لوگوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے بے ہوش ہو کر لڑکے کے پاس ہی گر گئی اور چند گھنٹے بعد وہ بھی مر گئی۔ کسی سیانے نے کہا کہ اسے مرحوم کا زخم چوسنے پر زہر چڑھ گیا تھا۔ کسی نے کہا، نہیں سپنی تعاقب میں تھی اس نے بدلے میں لڑکی کو مار ڈالا ہے۔ سانپ کے ڈسنے سے ہونے والی دونوں ہلاکتوں کا واقعہ تو حقیقت تھا لیکن واقعہ کیسے ہوا اس میں اختلاف رہا۔ غالب خیال یہی رہا کہ سانپ کا زہر ہی دونوں ہی

کی موت کا سبب بنا۔

اسکول میں موجود سانپوں اور سنپولیوں سے بچوں کو محفوظ کرنے کی خاطر ان کے والدین سے کچھ چندہ حاصل کیا گیا۔ اس سے اسکول کے در و دیوار کی درزیں سمینٹ سے بند کرائی گئیں۔ ڈی ڈی ٹی بھی لا کر چھڑکی گئی۔ جب بڑ کے پر پیچ بڑے سے تنوں اور جڑوں پر ڈی ڈی ٹی کا فوارہ چلایا گیا۔ تو سرخ، سفید، بھورے، گول مٹول، بیضوی، کیڑے مکوڑوں، سونڈیوں اور مکھ اور مکھیوں کے ڈھیر لگنے لگے۔ بچے اساتذہ اور والدین تو حیران تھے ہی لیکن میں بھی کچھ کم حیرت زدہ نہ تھا۔ اللہ کی مخلوق کس کس رنگ میں اور کہاں کہاں رہ رہی تھی۔

یونیسکو کی طرف سے سائنس کی تدریس اور تجربات کے لئے ملے ہوئے سامان سے ایک الماری بھری پڑی تھی۔ اس سامان میں بڑی نادر اشیاء تھیں۔ ہر قسم کے تھرمامیٹر بھی تھے۔ میں نے ٹیلے پر ایک رصدگاہ بنانے کا سوچا۔ ایسی رصدگاہ مڈل ماڈل اسکول سمبڑیال میں قریشی محمود الحسن ہیڈ ماسٹر نے بنوائی تھی۔ نواز گھمن نے میرے اس خیال کی بڑی تائید کی۔ لیکن رصدگاہ بنانے سے پیشتر ٹیلے کے مغربی پہلو کو کھود کر والی بال کی ایک گراؤنڈ پیدا کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔ رصدگاہ کی جگہ کا تعین کیا گیا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں کھودنے کا نقشہ بھی تیار کر لیا گیا۔ نواز گھمن تدریسی کاموں کے بجائے ایسے کام کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس نے چونے سے لکیریں لگوا کر چوتھی جماعت سے اوپر کی تمام جماعتوں کے دس دس بچوں کے گروپ بنائے۔ ہر بچے سے دس کڑاہیاں روزانہ مٹی کھدوانے پر اتفاق ہوا۔ تربیت جسمانی کا گھنٹہ اس مقصد کے لیے وقف کر دیا گیا۔

☆☆

ٹیلہ کسی پرانی آبادی کے مسمار ہونے کی وجہ سے وجود میں آیا ہوا نہ لگتا تھا۔ ٹوٹے برتنوں اور گھریلو اشیاء کے بجائے ٹیلے میں سے سیپ اور گھونگے برآمد ہوئے جو اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ مٹی کسی آبی گزرگاہ کی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں کہ ٹیلہ آخر کس طرح وجود میں آیا۔ میرا خیال زلزلے سے ابھر آنے والی چٹانوں کی طرف جاتا رہا۔ ہندی لغت میں بھی کالا کے معنی سیاہ ہی نکلے۔ البتہ غوطہ مشن کے پادری نے میری تسلی کی کہ یہ جو گاؤں کے تین اطراف میں لمبے چوڑے جوہڑ ہیں ان کی تخلیق کے لیے مٹی کو ادھر ڈھیر کیا گیا ہوگا۔ آبادی کے پختہ مکانات وجود میں آنے پر مزید مٹی بھی ادھر ہی پھینکی گئی ہوگی۔

☆☆

سانپوں کی دریافت کے بعد میں زیادہ تر سیالکوٹ شہر جانے لگا تھا۔ ملک عبدالغنی کے گھر کے قریب ہی ایک بڑا سا علیحدہ مکان صرف ۲۵ روپے ماہوار پر مل گیا تھا۔ والدہ، بیوی اور بھائی سب ہی شہر آ گئے تھے۔ ایک روز جب میں سکول آیا تو اساتذہ کرام نے خلاف معمول اسکول میں چھٹی کر رکھی تھی اور دھوپ میں بیٹھے تھے ماسٹر صدیق اور بشیر کے پاس اکثر بیٹھا نظر آنے والا صادق ڈوگر موضوع بحث تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اساتذہ کھڑے ہو گئے، جبکہ بابو بشیر میرے پاؤں میں گر گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ بمشکل اسے اٹھا کر سب نے تسلی دی۔ وہ تو ہچکیاں لیتا رہا۔ ماسٹر صدیق نے بتایا کہ کل میرے اسکول سے چلے جانے کے بعد صادق ڈوگر کتے مارکہ بوتل چڑھا کر اسکول میں آ کر زبردستی آپ والی چارپائی پر لیٹ گیا۔ جب صدیق کوٹھری میں روٹی پکا رہا تھا تو اس نے سکھوں والی کرپان نکالی اور کمرے کے اندر سے کنڈی لگا کر بشیر کو ڈرا کر اس سے زیادتی کرنا چاہی۔ اندر بشیر چیخا اور باہر میں، اتفاق سے ایک دو راہگیر بھی آ گئے تو صادق ڈوگر کھڑکی کی راہ بھاگ گیا۔ انھوں نے رات بھی نواز گھمن کی بیٹھک میں گزاری تھی۔ گاؤں بھر میں پوری بات پھیل چکی تھی۔ ماسٹر بشیر ساری رات روتا رہا تھا۔ ہم پردیسیوں کا کون والی وارث ہے۔ انھوں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی اور اب وہ سب میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

میں نے ماسٹر بشیر احمد کی طرف سے ہیڈ ماسٹر کے نام درخواست لکھوائی۔ جملہ مدرسین کے بیانات لکھے اور ہر ایک مدرس کے بطور شہادت کے دستخط کرائے۔ ان دو راہگیروں کو بھی تلاش کیا گیا لیکن انھوں نے چیخنے چلانے اور شور کی تو تائید کی لیکن بھاگنے والے کی شناخت سے انکار کیا۔ سب کے بیانات لینے کے بعد میں نے اپنی طرف سے ایک درخواست ضلعے کے ڈپٹی کمشنر، ایس پی پولیس اور تھانہ صدر کے تھانیدار کو لکھی۔ درخواست کے ساتھ میں نے جملہ اساتذہ اور گواہوں کے بیانات لگائے۔ فوٹو سٹیٹ کا رواج نہ تھا۔ نقول تیار کرنے میں وقت لگتا تھا۔ ایک ہی کاربن کاپی تیار ہوئی تھی اسے میں نے اپنے ریکارڈ میں رکھا۔ تین مدرسین درخواستیں دینے کے لئے شہر بھیجے۔ تھانیدار کو بھیجی جانے والی درخواست میں نے اپنے دوست اور ہمسائے ایڈیشنل انسپکٹر پولیس محمود الحسن انصاری کے ذریعے تھانے پہنچانے کو کہا۔ انصاری صاحب نے درخواست پر لکھا کہ وہ شام کو تھانہ صدر خود برائے تفتیش آئیں گے تب تک ملزم

صادق ڈوگر اور اگر کوئی اس کا حمایتی بھی ہو تو اس کو بھی تھانے میں حاضر رکھا جائے۔

تین بجے کے قریب سپاہیوں سے بھرا ایک تانگہ صادق ڈوگر کی گرفتاری کے لیے کالا آ پہنچا۔ ڈوگر کہیں بھاگ گیا۔ جو حمایتی اس کی سفارش کرنے یا پولیس سے معاملہ کرنے آئے انچارج اے ایس آئی نے ان کو بھی بٹھالیا گاؤں کے نمبرداروں کو بھی مصیبت پڑ گئی۔ اے ایس آئی نے ایک مرتبہ مجھ پر بھی طنز کی کہ جی ہیڈ ماسٹر کو بھی اب دفعہ ۳۰ کے مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ باقاعدہ بیانات لے کر درخواست داغی ہے اور افسران پر تنقید بھی کی ہے۔ اس کی ان باتوں سے میں اے ایس آئی سے بھی الجھ پڑا کہ میں اس کے رویّے کی رپورٹ بھی ایس پی صاحب کو کروں گا۔ اس کی تو جیسے ماں ہی مر گئی۔ وہ میری منتیں سماجتیں کرنے لگا۔

صادق ڈوگر کا قصہ گو تحریری معافی نامے، چھترول اور مُک مکا سے طے ہوا۔ لیکن نشانے بازی کی طرح اب میرے اثر و رسوخ کی دھاک بھی ایسی بیٹھی اور میرے درخواست لکھنے کے ڈھنگ کا ایسا چرچا ہوا کہ گھسن بھی دبک کر رہ گئے۔

اگلے روز اسکول معمول کے مطابق لگا۔ ماسٹر بشیر بڑا خوش تھا۔ بار بار کہتا کہ افسر ہوں تو آپ جیسے۔ حالانکہ مجھے اپنی افسری کی حقیقت معلوم تھی۔ میں محض -/۱۴۰ روپے ماہوار پر ڈسٹرکٹ بورڈ کا ملازم تھا۔ مدرسین کے حق میں پولیس صرف انصاری صاحب کی وجہ سے متحرک ہوئی تھی۔ اسی مبارک دن ہم نے ٹیلہ کھودنے کا آغاز کیا۔ ٹیلے کی اسکول سے ملحق مغربی ڈھلوان پر چٹھہ برادری کے صاحب نامی جاٹ کے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ اب جب میں نے نواز گھسن کو ان کی کھونٹیاں اکھاڑنے کو کہا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ کھونٹے اکھڑوانے کا کام میں خود ہی کرواؤں۔ لہٰذا میری موجودگی میں بچوں نے مویشی باندھنے کے کھونٹے اکھاڑے اور باری باری ان کو صاحب کے گھر کے سامنے کھلی جگہ پر گاڑ کر مویشی وہاں باندھ دیے۔ بعد میں انصاری لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ قدرت کی مہربانی تھی کہ صاحب نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا ورنہ اسی موضوع پر تو صاحب کئی بار مرنے مارنے پر اتر چکا ہے۔

اس حقیقت کے آشکار ہونے سے پہلے ایک اور بہت بڑا واقعہ ہوا۔ اشتمال کے تحصیلدار اسکول میں فروکش ہوئے۔ ماسٹر نذیر نے مجھے سرراہے کے انداز میں تجویز پیش کی کہ پٹواری سے اسکول کے خسرہ اور کھتونی نمبر اور ان کا نقشہ حاصل کیا جائے۔ تحصیلدار کے کہنے پر پٹواری نے معلومات مع دستاویزات مہیا کر دیں جن میں اسکول کی زمین کا نقشہ ایک مستطیل

شکل میں ایک ایکڑ اراضی پر مشتمل تھا جبکہ اسکول کے قبضہ میں اصل زمین مع عمارات ذوذلقہ کی شکل میں تھی۔ میں نے تحصیلدار صاحب سے صورت حال بیان کی۔ انھوں نے گرداور اور پٹواری سے کہا کہ وہ جریب سے پیمائش کر کے پتہ چلائیں کہ باقی جگہ کدھر گئی؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اسکول کی عمارت کے عقب اور مغرب میں واقع کھیتوں میں اسکول کا کوئی تین کنال رقبہ شامل نکلا۔ تحصیلدار نے خود پیمائش کی تصدیق کی بچے، اساتذہ اور اشتمال کے لیے حاضر کسان ساری کارروائی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تحصیلدار نے بچوں کو ایک قطار کی صورت میں اسکول کی اراضی کی اصل حد پر کھڑا کیا اور مجھ سے پوچھا "کیا اب مستطیل بن رہی ہے ہیڈ ماسٹر صاحب"۔

"بالکل بن رہی ہے جناب"...... میں نے جواب دیا۔

تحصیلدار نے بچوں سے کہا کہ وہ اپنے سامنے سے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اٹھا کر اپنے پاؤں کی جگہ رکھیں اور پیچھے ہٹ جائیں۔ جب بچے پیچھے ہٹ گئے تو تحصیلدار ہی نے پھر انہی سے کہا کہ وہ مزید ڈھیلے اٹھا اٹھا کر لائیں اور نئی مینڈ تیار کریں۔ جب بچے ایسا کر رہے تھے تو صاحب نامی چٹھہ جاٹ موقعہ پر آ گیا اور اس نے تحصیلدار سے استفسار کیا کہ وہ اس کی اراضی کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ تحصیلدار نے جواب دیا کہ وہ اس کی اراضی کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا بلکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اسکول کی اراضی کے ساتھ کر رہا ہے اور اب تک صاحب اس اراضی سے جو فائدہ حاصل کر چکا ہے وہ اسی کو ہضم کرے۔ صاحب کی حمایت میں بھی کافی دیہاتی اکٹھے ہو گئے اور وہ ماسٹر نذیر سے الجھنے لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نذیر اور نواز کرا رہے ہیں۔ تحصیلدار کو غصہ آ گیا۔ اس نے انھیں سمجھایا کہ یہ اراضی اسکول کی ہے۔ شاملاٹ کی نہیں کہ وہ اس پر جھگڑا کریں۔ اس پر صاحب نے کہا کہ شاملاٹ پر بھی تو ان ماسٹروں نے قبضہ کر لیا۔ پٹواری درمیان میں بول پڑا اور اس نے صاحب سے کہا۔ "اب بھی تمہارے مویشی شاملاٹ پر ہی بندھے ہوئے ہیں۔ تم اسکول کے ہمسائے ہو تمہیں تو اسکول کا خیال رکھنا چاہیے۔ ورنہ اسکولوں کا محکمہ تم سے کھایا پیا بھی اگلوا لے لگا۔"

بات بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ تحصیلدار نے اپنے ریڈر سے کہا کہ وہ تھانہ صدر جائے۔ وہاں سے حفاظتی گارڈ مع ہتھکڑیاں لے آئے۔ جب اس امر کا حکم نامہ بھی تحصیلدار نے لکھ دیا تو صاحب معافی مانگنے پر اتر آیا۔ تحصیلدار نے صاحب کو مزید سمجھایا کہ وہ تو وہاں آیا ہی اشتمال

اراضی کی خاطر ہے اگر اسے اپنی اراضی کم نظر آتی ہے تو اس کے بجائے وہ اسے پلکھو نالے کے قریب دگنی اراضی دینے کو تیار ہے۔ صاحب کو علم تھا کہ طاقتور زمیندار اشتمال میں کیا کیا گھپلے کراتے ہیں۔ وہ تحصیلدار کے ہاتھ جوڑنے لگا کہ کہیں وہ ایسا غضب نہ ڈھادے کہ نیائیں (گاؤں سے ملحق زمین) کی اراضی کی جگہ اسے کوئی دور کی اراضی ڈال دے۔ اس نے پٹواری اور گرداور سے بھی یہی بات کی بلکہ کچھ نذر نیاز بھی پیش کی اور جان چھڑائی۔

اسکول کے رقبے میں اضافے پر میں بڑا خوش تھا۔ یہ نیک نامی بھی میرے نصیب میں لکھی تھی۔ میرے ساتھ صاحب کا مکالمہ بھی نہیں ہوا تھا' پھر بھی اس نے مجھ سے معافی مانگی اور دبی زبان سے کہا کہ آپ کا اور ہمارا کوئی شریکہ تو ہے نہیں لیکن نواز اور نذیر سے تو ہماری چلتی چلی آ رہی اور چلتی ہی رہے گی۔

☆☆

نومبر کا آخری ہفتہ تھا۔ میں پورے نو بجے اسکول پہنچ گیا۔ ٹیلے کی کھدائی ہو رہی تھی۔ اس پر نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ معمول کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماسٹر فتح دین کے ساتھ اصغر علی گردیزی اور ظفر اقبال اپنے بی ٹی کے ہم جماعت اور روم میٹ چلے آ رہے ہیں۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ میں نے کرسی سے اچھل کر دونوں کی پذیرائی کی۔ انھوں نے بتایا کہ رات وہ احسان قریشی صابری پرنسپل کمرشل انسٹی ٹیوٹ سیالکوٹ کے مہمان تھے۔ انھوں نے نے ہی دفتر صدر محکمہ تعلیم کے ذریعے ماسٹر فتح دین کا کھوج نکالا ہے۔ ماسٹر صاحب نے تمہاری ساری وارداتوں کی تفصیل ہمیں سنائی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ تم شادہ شدہ بھی ہو گئے ہو۔ تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔ شاید گردیزی صاحب کو وہ خط نہیں ملا تھا جو میں نے شادی کے بعد سرکاری ملازمت کے لئے ان کو لکھا تھا۔ نواز گھمن اس موقع پر پھر کام آیا اور اس نے دو مرغ ذبح کرائے اور گھر میں عمدہ کھانا تیار کروا کر مہمانوں کی تواضع کر کے مجھے احسان مند کیا۔

دونوں دوست میرا گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں ضلع جہلم میں تعیناتی کا پروانہ لائے تھے۔ انہی سے مجھے علم ہوا کہ ہمارا بی ٹی کا نتیجہ تو ستمبر کے آخری عشرے میں نکل چکا ہے اور میں درجہ دوم میں امتحان پاس کر چکا ہوں اور دسمبر کی تعطیلات میں سنٹر ٹریننگ کالج میں تقسیم اسناد کی تقریب بھی منعقد ہونے والی ہے۔ لیجئے! میں کس قدر بے خبر جا رہا تھا۔ میں نے دونوں دوستوں کے ہاتھ دبا دبا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ گردیزی کا خصوصی طور پر کہ اس نے اپنا وعدہ پورا

کر دیا تھا۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ماسٹر فتح دین کو بتا دیا تھا کہ وہ میرے گورنمنٹ سروس میں احکامات تقرری لائے ہیں اور ماسٹر فتح دین نے کانا پھوسی کر کے سب انصاریوں کو یہ خبر سنا دی تھی کہ بس اب قاضی صاحب ان کے پاس مہمان ہی ہیں۔ سہ پہر کو سالم تانگے پر مہمان میرے ساتھ ہی شہر آئے۔ ان کے کپڑے لتے اور بیگ وغیرہ صابری صاحب کے گھر پر ہی پڑے تھے۔ انھوں نے راتوں رات سفر کر کے ملتان پہنچنا تھا۔ وہ مجھ تک بغیر کسی پروگرام کے پہنچے تھے۔ مزید چھٹی نہ تھی۔

☆☆

کالے کے مدرسین اور نواز گھمن کے والد منشی عنایت اللہ کے علاوہ چند اور احباب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کالا کپور والی کو چھوڑ دوں گا؟ میں چھوڑنا چاہتا تھا مگر چند مجبوریاں سد راہ بھی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے گھریلو اور اسکول کے ماحول میں الجھا دیا تھا۔ بوچھال کلاں تھا بھی تو بہت دور۔ وہاں سے ہفتہ وار بھی آنا مشکل تھا۔ میں اسکول آ اور جا رہا تھا لیکن کسی کو واضح طور پر یہ نہیں بتا پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے خود بھی معلوم نہ تھا۔ ماسٹر فتح دین اس حق میں تھا کہ مجھے ضرور موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مولوی منظور حسین نے بھی مجھے یہی کہا تھا کہ نواز گھمن کی باتوں اور پیشکشوں کو قبول کر کے میں کوئی غلط فیصلہ نہ کروں۔ چچا جان نے تو کہا تھا۔ ''دفع مارو جی۔ بورڈ کی نوکری۔ یہ بھی کوئی نوکری ہے۔'' میں اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ گھر والوں سے جدا ہونا پڑے گا۔ ہائی اسکول میں ماتحتی کرنا ہوگی۔ مرضی سے اٹھنا بیٹھنا اور آنا جانا بھی نہیں ہو سکے گا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کالا اسکول کا تقریباً ایک ہزار روپیہ میرے ذمے تھا۔ میں نے کسی کو بھی اعتماد میں لیے بغیر ذاتی استعمال کے لیے اسکول کے فنڈز میں سے ڈاک خانے سے کچھ روپے نکلوا کر خرچ کر رکھے تھے۔

اگر مجھے کالا سے جانا تھا تو مجھے اس کا فیصلہ جلد ہی کرنا تھا۔ ۳۰ر نومبر کے بعد احکامات تقرری نے از خود منسوخ ہو جانا تھا۔ غور خوض کے بعد غالباً ستائیس نومبر ۵۳ء کو میں نے سب کو فیصلہ سنا دیا کہ میں بوچھال کلاں نہیں جا رہا۔ مرنا جینا کالے ہی میں ہوگا۔

اسی شام مولوی منظور حسین اور ماسٹر فتح دین میرے گھر پہنچ گئے اور اس تفصیل کے طلبگار ہوئے جس کی بنا پر میں نے کالے ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بھی اپنے اس فیصلے سے شکست کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اپنی تمام کمزوریوں کو دونوں مدرسین کے سامنے کھول کر

رکھ دیا۔ بھیدوں اور رازوں کا بوجھ اتر گیا تو میری طبیعت جیسے ہلکی ہوگئی۔ چلو کالے سے دو افراد تو ایسے میسر آئے جن کو میری اصل ضرورتوں سے آگاہی ہوئی۔

ماسٹر فتح دین نے کہا کہ میرے جانے کی صورت میں جب تک کسی نئے ہیڈ ماسٹر کی تقرری نہ ہوگی، تب تک اصولی طور پر وہ ہی انچارج ہیڈ ماسٹر ہوگا لہٰذا وہ میری جملہ مالی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے۔ مولوی منظور حسین نے کہا کہ مسلمان بھائی کی مدد کرنا وہ اپنے دین ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ مجھے ہزار تو کیا دو ہزار بھی دینے کو تیار ہے۔ اتنی معمولی سی بات کے لئے مجھے گورنمنٹ سروس کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے رات بھر سوچنے کی مہلت مانگی اور اگلے روز اسکول سے غیر حاضر رہنے کی اطلاع بھی ان کو دی۔ اگلے دن دونوں صاحبان پھر آئے اور مجھے ڈاک خانے میں رجسٹرات فنڈ کے مطابق کھاتہ برابر کرنے کی پاس بک دکھائی۔

''یہ پاس بک تو میری تحویل میں تھی۔'' میں نے حیرانی کے عالم میں کہا۔

''میں نے اس کو آپ کی الماری سے رات ہی کو نکالا ہے۔'' مولوی منظور حسین نے کہا۔

''وہ کیسے، وہ تو مقفل تھی۔''

''مقفل؟ نواز گھمن کے ہوتے ہوئے کوئی چیز بھی مقفل نہیں رہ سکتی''۔ الماری کا پچھلا تختہ آسانی سے اکھڑ بھی جاتا ہے اور پھر اپنی جگہ پر جم بھی جاتا ہے۔ اوپر نیچے دو ہی تو کیل ہیں۔'' مولوی صاحب نے سنجیدگی سے بتایا۔

یہی وہ موقعہ تھا جب مولوی منظور حسین نے بتایا کہ گو والی بال گراؤنڈ کھودنے اور اسکول کی زمین قبضے میں آنے سے بھلا اسکول کا ہوا اور نیک نامی آپ کی، لیکن اس میں بعض افراد کا مفاد کار فرما تھا۔ نواز اور نذیر اپنا سیاسی کھیل کھیل رہے تھے۔ بارے ان کو اپنے حریف کو نقصان پہنچانے کا موقع ملا ہے۔ تحصیلدار اشتمال کی آمد کی وجہ سے ہی نواز نے اس روز رخصت لی اور نذیر کو اراضی کا شوشہ چھوڑنے کے لئے کہہ گیا۔ وہ تو آپ کے مقدر تھے کہ معاملات سیدھے ہوگئے ورنہ گھمن تو جمالو کی طرح دور کھڑے تماشا دیکھتے اور ٹھنی ہیڈ ماسٹر اور صاحب کی رہتی۔ صاحب ہارتا تو خوش ہوتے۔ آپ کی سبکی ہوتی تو ان کا کیا بگڑتا؟

ان پراسرار انکشافات سے مجھے جہاں انصاریوں اور گھمن برادری کی اندرونی کشمکش کا اندازہ ہوا وہاں میں کچھ کچھ ماسٹر فتح دین اور مولوی منظور حسین انصاری کو بھی سمجھ رہا تھا۔ ماسٹر فتح دین کا دفتر سررشتہ تعلیم میں آنا جانا تھا۔ بی ٹی استاد کم کم دستیاب تھے۔ ویسے بھی کالا کوئی

دل پذیر مقام نہ تھا۔ لہٰذا میری عدم موجودگی میں وہ نامعلوم مدت تک ہیڈ ماسٹر رہ سکتا تھا۔ انصاری برادری یہ سمجھتی تھی کہ میں نواز گھمن سے سابقہ دوستی اور اس کے والد کے انسپکٹر آف سکولز سے تعلقات کی وجہ سے ان کے مخالف دھڑے کا فرد ہوں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نذیر کی بیوی فلاں گاؤں کے فلاں چودھری کی بہن ہے اور اس فلاں چودھری کی بیوی میرے گاؤں کے اس چیمہ خاندان کی بیٹی ہے جو اب نیلی بار میں نہری مربعوں پر آباد ہے اور آج کل وہ لیڈی میکلگن ٹریننگ کالج میں سی۔ٹی (جے۔ایس۔) کر رہی ہے۔

میرے لیے یہ جملہ معلومات نئی تھیں۔ انہی کوائف کی وجہ سے انصاری بھائی یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ میں نواز اور نذیر کی مٹھی میں ہوں اور ان کی مٹھی کا مطلب انصاری برادری کی زیردستی ہے۔ یہ کیسی مقامی سیاست تھی؟ اکٹھے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے کتنی منافقت تھی۔ مجھ پر کیا کیا کچھ کھل رہا تھا۔

☆☆

ملک غنی نے جب سنا کہ میں بوچھال کلاں جا رہا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا ہمارے گھر آیا اور میری ماں سے یوں مخاطب ہوا: ''بہن جی! جس جگہ کا نام ہی بھونچال کلاں یعنی بڑا زلزلہ ہے اسے آپ وہاں کیوں بھیج رہی ہیں؟'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماں نے کہا کہ اسے نوکری چاکری کے معاملات کی خبر نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ وہ نوکری اچھی ہے تو اچھی ہی ہوگی۔ ورنہ میرا تو اصول ہی یہ ہے کہ گھر کی آدھی (روٹی) پردیس کی پوری سے بہتر ہوتی ہے۔ پھر وہ میری بیوی سے مخاطب ہوا: ''بہن، تو ہی اسے سمجھا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو تم لوگوں کی شادی کو ہوئے ہیں اور تم اسے بھونچال کے حوالے کر رہی ہو۔'' وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دل پر ہاتھ رکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ لو جی! اپنا تو ''کھدو'' اب اونچا بولنے سے ہی ادھڑنے لگتا ہے۔''

وہ پہلے سے کمزور ہو رہا تھا اور اب اس کے بھائی نے بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے ڈاکٹروں کو دکھایا تھا جنہوں نے اسے فشارِ خون کا مریض بتایا تھا۔ ادویات بھی تجویز کی تھیں لیکن وہ حکیموں کے خمیرے اور جلابوں سے علاج کروا رہا تھا۔ انھوں نے اسے تبخیر معدہ اور گیس کے مرض کے چکر میں ڈال رکھا تھا۔

اگلی صبح ملک غنی اور منجھلے بھائی نے مجھے جہلم جانے والی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس پر

بٹھایا۔ ملک غنی پھر خوشگوار حالت میں تھا۔ وہ اپنے ملنے والے ساتھیوں کو بتا تا رہا کہ جی یہ اپنے بھائی بی اے بی ٹی ہیں۔ انگریزی اخبار پڑھ اور سمجھ لیتے ہیں۔ تین ماہ پہلے ان کا دانہ پانی لاہور سے اٹھ گیا تھا تو یہ ادھر گھمنوں کے کالے میں آ گئے۔ اب ان کا دانہ پانی ادھر سے بھی اٹھ گیا ہے اور یہ ''بھونچال کلاں'' میں جا رہے ہیں۔ دعا کرو جی کہ خدا کسی کا دانہ پانی اس عمر میں دنیا سے نہ اٹھائے۔

''وہ بھونچال کلاں کدھر ہے؟'' ملنے والے نے استفسار کیا۔

''اللہ ای جانے...... بھاہوری جہلم سے چکوال جائیں گے۔ پھر وہاں آگے خشک پہاڑوں کی درمیان بھونچال کو تلاش کریں گے۔'' پھر وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوا: ''جاتے ہی خط لکھ دینا۔ اپنا حال لکھنا نصیحتیں نہ لکھنا۔''

مجھے ان بھول بھلیوں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کیا اور رازداری کے وعدے پر اپنے اس فیصلے سے میں نے دونوں مدرسین کو آگاہ کر دیا۔ ۲۸ر نومبر کو میں آخری بار کالا مڈل سکول میں گیا اور میں نے اپنے سابقہ فیصلے کی تردید جاری کی اور اعلان کر دیا کہ میں کالا سے جا رہا ہوں۔ بچوں سے بھی ملا۔ کئی چہرے اداس ہوئے۔ نواز گھمن اور چوہدری نذیر احمد نے بھی بر سبیل محبت ناراضگی کا اظہار کیا اور پھر میری کامیابی کی دعا بھی کی۔ انہی دونوں نے پانچ کلو بڑا گوشت پکوا کر میری الوداعی ضیافت بھی اسی دوپہر کو کر ڈالی۔ میں نے ۳۰ر نومبر ۱۹۵۳ء کی سہ پہر سے مڈل سکول کالا سے فارغ سمجھے جانے کی اطلاع آرڈر بک پر چڑھائی۔ اس اطلاع میں محکمہ کے مناسب احکامات تک سینیارٹی کے لحاظ سے ماسٹر فتح دین کے انچارج مدرسہ ہونے کی شق بھی شامل کی اور لکھا کہ میں نے ان کو ہی چارج دیا ہے۔

''بغض معاویہ'' کتنے کام کی شئے ہے۔ نذیر اور نواز نے اس کے ذریعے مجھ سے سکول کی حدود میں توسیع کا نیک کام کرایا اور مولوی منظور حسین اور ماسٹر فتح دین نے میرا مستقبل محفوظ کیا۔ اللہ ان کو ذاتی خواہشوں کے پردے میں چھپی نیکی کی جزا دے۔ میں نے ماسٹر فتح دین سے کہا کہ وہ میرا استعفیٰ ایک ہفتہ انتظار کے بعد دفتر میں جمع کرائے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا دل بوچھال کلاں میں نہ لگے اور مجھے واپس کالے ہی میں آنا پڑے۔

◆◆◆◆◆

(۱۲)

بوچھال سے فرار

جہلم سے بس براستہ سوہاوہ چکوال پہنچی۔ چکوال سے خوشاب جانے والی بس تیار ملی۔ راستہ پہاڑی تھا۔ ایک ایسا مقام بھی آیا کہ بس کو شدید چڑھائی کے لئے پہلے گیئر میں ڈالنا پڑا۔ دن کے بارہ بجے کے قریب میں بوچھال کے اڈے پر اترا۔ اپنا بستر اور بکس ایک چائے والے کے خیمے پر رکھ کر اسکول پہنچا۔ وہاں اسکول کے عملے میں تین اساتذہ بی ٹی کے ہم جماعت نکل آئے ان میں ملک سکندر خاں اور ملک اللہ یار تو مقامی تھے جبکہ بشیر چغتائی (بعد میں ایچی سن کالج میں انگریزی معلم) گجرات کا رہنے والا تھا۔ بی ٹی کے دوران ان دونوں ملکوں سے صرف چہرہ شناسی تھی جبکہ چغتائی کی بذلہ سنجی اور انگریزی میں روانی کی وجہ سے خاصی آشنائی تھی۔ وہ ایک ایسا کردار تھا جو ہر معاشرے میں اپنا مقام خود بنالیتا ہے۔ یہاں بھی وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ خاصا بے تکلف تھا اور انگریزی میں ہی ''بک بک'' کررہا تھا۔ الٹے سیدھے سوالات پوچھے چلے جارہا تھا اس کی بیوی ان دنوں گجرات گئی ہوئی تھی لہٰذا میں دو دن اسی کے گھر ٹکا رہا۔ اس نے جن لڑکوں کے ذریعے اڈے کے ملک سے بستر اور بیگ منگوایا تھا ان کو میرا سامان اپنے ہی گھر لانے کو کہا تھا۔

اسی شام میں نے تینوں دوستوں کے ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب قاضی عبدالسلام کی خدمت میں حاضری دی۔ انھوں نے چائے پلائی اور چغتائی کو میری حاضری رپورٹ وغیرہ مع اسناد کی نقول انسپکٹر اسکولز راولپنڈی ڈویژن کو بھیجنے کے بارے میں کہا۔ چغتائی نے میرے بارے میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتایا کہ مجھے کچھ کہانیاں وغیرہ لکھنے کا بھی خبط ہے۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا پھر تو ان کا جی ادھر خوب لگے گا۔ میدانی علاقوں کی نسبت پہاڑی علاقوں میں ہوا پانی زیادہ صاف ملتا ہے اور دماغ کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان کی اس بات سے مجھے باجرہ

گڑھی کی گیرٹ کی رہائش یاد آئی حالانکہ اب میں مری کی پہاڑیوں کے برابر اونچائی پر تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ مری کی پہاڑیاں سر سبز و شاداب تھیں جبکہ کوہستان نمک کا یہ سلسلہ بے آب وگیاہ تھا۔ رات کھانے پر چغتائی کے ہاں دونوں ملک بھی آ گئے۔ ملک سکندر نے بتایا کہ مائی کی خدمات سمیت ملک خانو کا مکان قاضی صاحب کے لئے صرف دس روپے ماہوار پر حاصل کرلیا ہے۔ 'مائی کا مطلب بے بے ہے بھئی' چغتائی نے انگریزی میں کہا: ''غلط نہ سمجھنا'' اس نے مجھے کہا اور ساتھ ہی ملک سکندر کو بتایا ابھی یہ دو تین دن ادھر ہی رہے گا اور کل ہم دال روٹی ملک سکندر کے ہاں اور پرسوں اللہ یار کے ہاں کھا کر مہمان نوازی کا دائرہ مکمل کریں گے۔ ایک طرح سے چغتائی نے میرا مکمل چارج حاصل کرلیا تھا۔

اگلے روز چغتائی نے رواں تبصرہ کے ساتھ مجھے اسکول کی عمارت دکھائی۔ اردگرد کے پہاڑوں سے واقفیت بہم پہنچائی۔ کچھ مقامی رسم ورواج سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تبصرہ بھی کیا گوتھک طرز تعمیر والے مکان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ خاص طور پر اس نے بابا مہدی کے مرقد اوران کی شخصیت پر سنجیدہ گفتگو کی۔ بعد میں میرے ساتھ ہاتھ اٹھا کر مرقد پر فاتحہ خوانی بھی کی۔

بابا مہدی وہ عظیم انسان تھا جس نے بوچھال کو بوچھال کلاں بنایا تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں برما فرنٹ پر رہا تھا۔ جنگ کے اختتام پر حکومت برطانیہ نے اسے اس کے کمانڈنٹ کی سفارش پر جنگی خدمات کے عوض ایک مربع اراضی دینا چاہی تو اس نے اراضی کے بجائے اپنے گاؤں کے لیے ایک پرائمری اسکول حاصل کیا۔ اس اسکول میں بابا مہدی اساتذہ کے دوش بدوش اپنے آخری سانسوں تک پڑھاتا رہا۔ باباجی کی کوششوں سے اسکول پرائمری سے مڈل ہوا۔ قیام پاکستان کے تیسرے سال اسکول کو ہائی کر دیا گیا۔ بابا اس قربانی اور لگن کی وجہ سے لوگ اسے ولی اللہ مانتے تھے اور مرحوم کے لیے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

بابا مہدی کا ایک پوتا عباس سنگاپور میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھا۔ وہاں وہ خوب دولت کما رہا تھا جب بابا مہدی کو احساس ہوا کہ اس کا آخری وقت قریب آرہا ہے تو اس نے اپنے پوتے کے نیک اور پاکیزہ جذبات کو ابھارتے ہوئے اسے لکھا کہ وہ بوچھال کلاں آجائے اور دادا کی جگہ لوگوں کی خدمت کرنے کا کام سنبھالے۔ پوتے نے دادا کی فہمائش کا مثبت جواب دیا اور وہ سنگاپور سے اپنا کاروبار سمیٹ کر

پاکستان آ گیا۔ یہاں وہ بابا مہدی کی زندگی ہی میں سیٹھ عباس کے طور پر مشہور ہوا اور پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی منتخب ہوا۔ بابا مہدی نے پوتے سے کہا کہ وہ ایم پی اے ہونے کے حوالے سے نیکی کا پہلا کام یہ کرے کی ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول کو معہ اس کے موجود عملے کے حکومت پنجاب کی تحویل میں دے دے کیونکہ بورڈ کے حالات اکثر خراب رہتے ہیں اور اساتذہ بھی سیاست کا شکار ہوتے ہیں۔ سیٹھ عباس نے بابا کی یہ فہمائش بھی پوری کر دی تھی۔

سیٹھ عباس اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر راولپنڈی میں مقیم تھا لیکن وہ ہر اتوار اپنے گوتھک ٹھرز کے مکان میں حاضر ہوتا۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے میں اپنی خدمات پیش کرتا۔ اردگرد کے بہت سے دیہات میں اس نے علاقے کی فلاح و بہبود کے کئی منصوبے شروع کرا رکھے تھے۔ ان کی نگرانی بھی کرتا۔ اپنے گاؤں کے لیے اس نے حال ہی میں ایک منصوبہ فراہمی آب کا مکمل کرایا تھا۔ بارہ آنے فی روپیہ اپنی جیب سے ادا کر کے اس نے محکمہ آب رسانی سے تین ہزار فٹ بور کرا کر پینے کے پانی کے حصول کی خاطر ایک ٹیوب ویل لگوایا تھا۔ گو ٹیوب ویل زیادہ پانی نہیں دے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی تین ٹوٹیاں کام کر رہی تھیں۔ ایک اسکول میں ایک تھانے میں اور ایک عامتہ الناس کے لیے عین گاؤں کے درمیان نصب کی گئی تھی۔

☆☆

سکندر خاں نے جو مکان میرے لیے حاصل کیا تھا۔ اس کی بھی ایک کہانی تھی۔ تیسرے روز علی الصباح ہی چغتائی نے ہنستے ہنستے مزاح میں کہا: ''بھئی قاضی! ایک دن مہمان دوسرے دن مہمان، تیسرے دن وبال جان...... آج ہی اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور اس مکان میں ڈیرہ جماؤ جو میری درخواست پر سکندر خان نے بڑی کاوش اور سفارشوں سے تمہارے لیے بک کرا رکھا ہے۔''

میں نے کہا: ''بھئی! میں تو خود بڑا بے تاب ہوں کہ اپنے گھر جا کر سکون سے رہوں۔ یہاں تو تم نے ضمنی ہائی اسکول کھول رکھا ہے۔'' اس کے گھر کے ایک حصے میں مضافات سے آنے والے طلبہ قیام پذیر تھے۔ چونکہ ان دنوں چغتائی کے بچے گجرات میں تھے، لہٰذا وہ بے دھڑک سارے گھر میں دندناتے پھرتے تھے۔ گو وہ ہماری خدمت بھی بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے، پھر بھی ایک ہجوم سا لگتا تھا۔ کچھ وہ تھے بھی سب پانچ سے چھ فٹ کے درمیان قد کے۔ غربت و افلاس کے باوجود چاک و چوبند، صحت مند اور جفاکش۔ ان میں سے دو طلبہ کو بلا کر چغتائی نے کہا کہ وہ اس مکان میں جائیں جو ملک سکندر نے ماسٹر جی کے لیے لیا ہے۔ اس

کو صاف کریں اور ماسٹر جی کا بستر اور بکس ادھر پہنچادیں۔ ایک لڑکے نے جواب دیا کہ مکان تو پہلے ہی مسجد کے مانند صاف ہے اور چمک رہا ہے۔ خانو ملک کی بہن اور بھانجی اس کو ہر وقت صاف کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ان کی گفتگو میں کوئی دخل نہیں دیا' مگر مسجد کی صفائی کی تشبیہ سے چونکا ضرور۔ لڑکے میرا سامان لے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد دو بڑی بڑی چابیاں لاکر مجھے تھما دیں۔ ایک بیرونی اور دوسری اندرونی دروازے کی۔ اسکول جاتے ہوئے تھوڑا سا چکر کاٹ کر چغتائی مجھے مکان دکھانے لے گیا۔ کوئی ساٹھ فٹ لمبی پتھروں کی دیوار میں ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ اسے کھولا۔ سامنے کوئی تیس فٹ لمبا چوڑا صحن تھا۔ دونوں بازوؤں پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ دائیں طرف دو منقش دروازے دو کمروں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ بائیں طرف ایک ہی بڑا سا کمرہ تھا۔ اس کا اندازہ بھی اسی طرح سے چوب کاری کیے ہوئے بڑے دروازے اور ایک چھوٹے سے دروازے سے ہوا۔ صحن میں اس کمرے سے ملحق سیڑھیاں تھیں۔ نچلی سیڑھی کے قریب پیلو کا ایک بوڑھا پیڑ بھی کھڑا تھا۔

بڑے کمرے کا کنڈا کندہ کاری سے آراستہ موٹی سی لکڑی کی چوکھٹ کے اوپر تھا۔ میرا ہاتھ وہاں تک بمشکل پہنچ رہا تھا' تاہم چغتائی نے اپنے لمبے قد کی وجہ سے آرام سے کھول لیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی لیکن مضبوط میز پر میرا بکس پڑا تھا اور اس کے اوپر میرا بندھا ہوا بستر۔ کمرہ اس قدر آراستہ پیراستہ تھا کہ میں واقعی حیران رہ گیا۔ لکڑی کی چھت کے شہتیر اور بالوں پر رنگ برنگ پھول نما چھوٹے چھوٹے گول' مربع اور مستطیل شکلوں میں آئینے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بھی اسی قسم کے آئینوں اور ٹوٹی ہوئی اور ثابت رنگ برنگ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑوں سے ملتانی آرٹ کے انداز میں گل بوٹے اور بیلیں نقش کی گئی تھیں۔ کچھ ایسے چمکتے ہوئے طغرے بھی دیواروں پر گوندھی ہوئی مٹی سے ابھار کر بنائے گئے تھے جیسے فریموں کے اندر چسپاں ہوں۔ فریموں پر عام رنگ چڑھائے گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں علم ہوا' خانو ملک ٹرک ڈرائیور تھا اور جن اشیاء سے شوقین مزاج ڈرائیور ٹرکوں کو باہر کی طرف سے آراستہ کرتے ہیں' مکان زیادہ تر انہی سے سجایا گیا تھا۔ شاید اسی آرائش کی وجہ سے طلبہ نے اسے مسجد قرار دیا تھا۔ میں حیرت زدہ کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ باہر سے اس کی دیواریں پتھروں اور بڑی بڑی دراڑوں سمیت نظر آ رہی تھی لیکن اندرونی طور پر لیپی پوتی اور سجاوٹ سے فروزاں تھیں۔ چغتائی نے بھی اس مکان کو اندر سے پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کی آرائش پر

اش اش کر اٹھا اور اس نے کمرے کو شیش محل قرار دیتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنی نور جہاں کو ادھر ہی لے آؤں۔ اسی اثنا میں خانو ملک کی بوڑھی بہن عرف مائی بھی آ گئی۔ مختصراً اس نے میرا انٹرویو لیا اور بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے یہ شیشے جیسا مکان اپنے بھائی کو کرائے پر اٹھانے کے لئے رضامند کیا ہے لہٰذا میں اسکول کے بچوں کے ہاتھوں اس کی زینت خراب نہ ہونے دوں۔ میری بجائے چغتائی ہی نے مائی کی تسلی کرائی کہ وہ مطمئن رہے۔ میں نے مائی کو ضروریات اور کھانے وغیرہ کے لیے دس روپے دیے اور چغتائی کے ساتھ اسکول چلا گیا۔

اسکول کے اوقات کے درمیان ملک سکندر خاں نے دو بااعتماد لڑکوں کو میرے گھر بھیجا کہ وہ کمرے کو ہرمل کی دھونی دیں اور پھر مائی سے اچھی سی دو چار پائیاں لے کر کمرے میں ڈال دیں۔ انھوں نے مائی کو یہ پیغام بھی بھیجا کہ نئے ماسٹر صاحب کے لئے رات کے کھانے کا کوئی انتظام نہ کرے کیونکہ ماسٹر جی ابھی دو دن سکندر خان اور دو دن ملک اللہ یار خاں کے ہاں مہمان ہوں گے۔ اس نے چغتائی اور ملک اللہ یار کو بھی کھانے کی دعوت دی تو اللہ یار نے کہا: ''بھئی چغتائی تو پردیسی ہے۔ لیکن ہم جو مقامی ہیں ہمیں تو تین تین دن قاضی کو مہمان رکھنا چاہیے ورنہ ہم نام ہی کے ملک کہلائیں گے۔

''تمہارا حق مجھ سے دگنا بنتا ہے۔ چار چار دن مہمان رکھوتا کہ قاضی یہ نہ کہے کہ اسے بوچھال میں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا۔'' قہقہے کے ساتھ بات آئی گئی ہوگئی۔

رات دیر تک محفل جمی رہی۔ ہوسٹل کے زمانے کی اور بالخصوص خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے نظم و نسق کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہ نظم و نسق جس کے باعث ہم خلیفہ صاحب کے ''جانی دشمن'' تھے۔ اب ہم اس کی تعریف کر رہے تھے اور خلیفہ صاحب کو بہترین الفاظ میں یاد کر رہے تھے کہ یہ اس شخص کی ہمت اور دانائی تھی کہ پنجاب کے گوشے گوشے سے آنے والے مختلف النوع اور مختلف العمر مستقبل کے معمارانِ قوم کو ایک کنبے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب تینوں دوست مجھے ہر طرف چھائے ہوئے سناٹے اور چاندنی میں نہائے ہوئے مکان کے دروازے پر چھوڑ گئے۔ کمرے کے دروازے کی ایک آدھ درز سے اندر جھانکتی روشنی کو دیکھ کر مجھے سردیوں میں بھی پسینہ سا آ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید مائی یا بچوں نے سرِشام میری سہولت کی خاطر کوئی چراغ یا لالٹین روشن کر دی ہے۔ لکڑی کی موٹی دہلیز پر پاؤں جما کر میں نے کڑی جیسا تالہ کھولا' کنڈا کھولا۔ ڈرتے ڈرتے بھاری دروازے کو دھکیلا

تو سامنے میز پر مٹی کے تیل کا بڑا سا خوبصورت ''ٹیبل لیمپ'' روشن تھا جس کا نچلا حصہ گلدان جیسا تھا۔ بڑی سی گول شفاف چمنی کے اندر ایک آتشیں گلاب کھلا اور ایک کشادہ سی چارپائی پر میرا بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ بچھی چارپائی پر میرا بکس اور کچھ فالتو سامان جس میں کتب بھی شامل تھیں، پڑا تھا۔ وہ چارپائی مجھے کچھ غیر معمولی سی لگی۔ رنگیں پایوں کے علاوہ اس کا بان چمڑے کے تسموں کا تھا۔ ادوائن بھی چمڑے کی چوڑی اور مضبوط پٹیوں کی تھی۔ میں نے دوسری چارپائی پر بچھا گدا اٹھا کر دیکھا، وہ بھی ویسی ہی تھی۔ اس کے پائے بھی رنگین تھے۔ میں لباس تبدیل کیے بغیر ہی اس انوکھی چارپائی پر گر گیا۔ تنی ہوئی چارپائی کی ایک خصوصی لچک نے میرے جسم کو بڑا سکون بخشا۔ اچانک میری نظر چھت پر پڑی تو یوں لگا جیسے میرے سامنے آسمان ہے، چھت نہیں۔ لیمپ کی لو سب آئینوں سے منعکس ہو رہی تھی۔ دیواروں کا عالم بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کمرے کے جو کونے لیمپ سے ذرا دور تھے وہاں انعکاس شعاع سے بے روشی کے دائرے پراسرار طریقے سے ایک دوسرے کے محیطوں کو کاٹتے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ مجھے کونے میں دیوار پر پڑنے والا اپنا مہیب سایہ نظر آیا تو میں فوراً اکڑوں ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لیمپ کو اس کی کمر سے تھاما۔ لیمپ اٹھاتے ہی سارے دائرے متحرک ہو گئے۔ چوڑیوں کے رنگوں کا انعکاس شبنم کے قطروں پر پڑنے والی سورج کی کرنوں جیسا ہو گیا جیسے چھوٹے چھوٹے ہیرے جگمگا اٹھے ہوں۔ میری نظر چاروں دیواروں کی طرف اٹھ گئی۔ روشنی میں چوڑیوں سے بنے بیل بوٹے دن کی نسبت واضح نظر آ رہے تھے۔ اپنے اردگرد پھیلی یہ خوبصورتی مجھے پراسرار لگ رہی تھی اور میں اندر ہی اندر ڈر سا رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ لیمپ اٹھا کر چھوٹے سے دروازے کے راستے اس غسل خانے میں گیا جس کا تصور ان دنوں شہروں میں موجود نہیں تھا۔ خانو ملک ڈرائیور نے غرقی کھود کر آج کے دور کا غسلخانہ بنا رکھا تھا۔ اگرچہ پانی کا انتظام گھڑے اور بالٹی کے ذریعے کیا گیا تھا۔ لاہور کارپوریشن کی ملازمت کے دوران میں صرف اوڈین سینما، میں ایسا غسل خانہ ہوا کرتا تھا اور جب بھی میں نو آنے کی کلاس میں فلم دیکھتا تھا تو یہ صاف ستھرا غسل خانہ ضرور استعمال کرتا۔ الغرض جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو میز تک آتے آتے میرے اردگرد روشنیوں کے دائرے اور جگمگ جگمگ کرتی رنگدار کرنیں گھومتی رہیں۔ میں نے لیمپ

کی لو مدھم کرنے کے بجائے اسے فوراً پھونک مار کر گل کر دیا۔ مٹی کے تیل کے دھوئیں کی ایک ناگوار سی بو سارے کمرے میں پھیل گئی اور میں فوراً بستر میں دبک گیا۔

کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ شمال مشرقی کونے میں چھت کے قریب سیمنٹ کی ایک جالی لگی تھی۔ سردی کے باوجود میں نے دروازے کو کھلا چھوڑ دیا تھا کہ تازہ پہاڑی ہوا آتی جاتی رہے۔ مشرق مغرب کے رخ سے بچھائی گئی چارپائی شمالی دیوار کے ساتھ تھی۔ بستر کے اندر سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن بارہ بج جانے کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر کھلے دروازے سے چاند کی روشنی اندر آنے لگی اور کمرہ مزید پراسرار ہو گیا۔ صحن میں دن کے وقت میں نے دو گھڑے سیڑھیوں کے پاس پڑے پائے تھے۔ میں بستر سے نکل کر ان تک گیا اور پانی پیا۔ واپس آ کر میں نے دروازے کو بند کر دیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ جلد نیند لانے کی جتنی مشقیں مجھے یاد تھیں جیسے الٹی گنتی، لمبے سانس لے کر روکنا یا ماضی کے خوشگوار لمحوں کی یادوں کو دہرانا، سب کر ڈالیں، مگر نیند نہ آئی۔ رات کے اس سمے میں کسی دوست کے پاس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے حبس کا احساس ہوا تو میں نے پھر دروازہ کھول دیا۔

☆☆

رات کے آخری دو پہر رہ گئے ہوں گے کہ چاندنی کمرے سے نکل گئی۔ اب وہ صحن میں لگے پیلو کے پیڑ کے چھدرے پتوں، ٹہنیوں اور تنے کا ایک نقش صحن میں بنا رہی تھی۔ سردی کی پروا کیے بغیر میں نے دو تین چکر صحن کے لگائے۔ مجھے خود اپنا کردار اور سایہ عجیب لگ رہے تھے۔ کوئی نفسیاتی حربہ میرے کام نہیں آ رہا تھا۔ جب ٹھٹھرنے لگتا تو بستر میں آ دبکتا۔ رضائی اوڑھتا تو بڑی فرحت محسوس ہوتی۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند نے آ لیا اور اس میں بھی میں الٹے پلٹے خواب دیکھتا رہا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ باہر سیر کو نکلا تو جلد ہی لوٹ آیا۔ گرم چادر اور سوئیٹر کے باوجود خنکی قیامت کی تھی۔ ہلکی سی ہوا بھی چلنے لگی تھی۔

اسکول جانے کے وقت تک میں سوچتا رہا کہ اکیلے رہنے کی عادت کے باوجود رات بھر میں کیوں نہیں سو سکا۔ نئی بات تو بس شادی ہی تھی۔ کیا میری اس ساری بے چینی میں میرے لاشعور کا ہاتھ تو نہیں تھا۔ لاشعور کے باوا آدم ڈاکٹر فرائیڈ کے حوالے سے تو میرا یہ حال کسی نفسیاتی مہیج کا شاخسانہ ہی تھا۔ مجھے شدت سے ثریا یاد آئی۔ اگر وہ ادھر ہوتی تو اس نادر لیمپ کی روشنی سے جگمگا اٹھنے والے شیش محل میں نور جہاں اور ممتاز محل سے ہرگز کم نہ لگتی خواہ چولہا

جھو نکتے وقت وہ خانو ملک کی بہن ہی نظر آتی۔

میں نے اپنی رات بھر کی کیفیت کا ذکر سکندر خاں سے کیا تو مجھے پتہ چلا کہ کمرے کی سجاوٹ خانو ملک کی بھانجی اور ملک کی بیوی نے اس کی شادی سے پہلے مل کر کی تھی۔ خانوں ملک فوج میں سمندر پار رہ چکا تھا غرقی والے غسل خانے کا ڈھنگ بھی وہ وہیں سے سیکھ کر آیا تھا اور سیٹھ عباس نے بھی اپنے گوتھک طرز کے محل میں خانو ملک کی راہنمائی میں بڑی سی غرقی بنوائی تھی اور دوسرے لوگ بھی اب اس اختراع کو اپنا رہے تھے۔

سکندر خان نے مزید بتایا کہ خانو ملک کے والدین اور بھائی نہیں تھے۔ مائی نے اسے پالا تھا۔ اس کی بیوی اس کی چچا زاد تھی۔ پرائمری تک تعلیم یافتہ تھی لیکن گاؤں کی خواتین میں بڑی مقبول تھی۔ دونوں کی منگنی جنگ عظیم دوم سے پہلے ہو چکی تھی۔ شادی ۱۹۵۲ء میں ہوئی اور اسی سال اپریل میں وہ زچگی کی حالت میں مرگئی۔ تین دن بعد اس کی بچی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ گاؤں میں زچہ مرکز تو موجود تھا' لیکن زچگی کے وقت وہاں' خون بند کرنے والا ٹیکہ دستیاب نہ تھا۔ نرس نے بہت کوشش کی لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ خود ملک بھی عین اس وقت ٹرک لے کر ادھر پہنچا جب اس کی بیوی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس نے اسے فوراً چکوال لے جانا چاہا لیکن بانو بیگم کو اٹھانے کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔''

ان معلومات سے مجھ پر ''فوراً سے پہلے'' کی اصطلاح واضح ہوئی۔

سکندر خان نے یہ بھی بتایا کہ اسی کمرے سے وہ ماسٹر ثناءاللہ جس کی جگہ میرے احکامات تقرر جاری ہوئے ہیں' چیخیں مارتا ہوا دوڑتا سڑک پر پہنچا اور کسی ٹرک پر بیٹھ کر خوشاب چلا گیا۔ اس نے ماسٹر ثناءاللہ کہ کہانی مجھے جان بوجھ کر ڈرانے کے لئے نہیں سنائی تھی بس رواداری ہی میں سب کچھ بتا گیا۔ مائی کی بیٹی اس گھر کو آباد دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے شرط باندھ رکھی ہے کہ جب تک اس کا ماموں اس گھر کو پھر سے آباد نہیں کرتا' تب تک وہ بھی منگنی کے باوجود اپنا گھر آباد نہیں کرے گی۔ وہ بھی بانو کی طرح ہی جوان اور ذہین ہے۔ اس نے میری طرح ہی ماسٹر ثناءاللہ کو پڑتل کی چارپائیاں مہیا کیں۔ ٹیبل لیمپ جلا کر دیا۔ وہ بھی میری طرح روشنیوں کے اسرار میں کھویا رہا تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ زیبو ماسٹر ثناءاللہ کے لیے غسل خانے میں پانی رکھنے آئی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ غسل خانے کے بیرونی دروازے سے داخل ہوئی۔ اس کا ہیولا اندرونی دروازے میں دیکھتے ہی ثناءاللہ نے یہ سمجھا کہ اس سجے سجائے

کمرے میں واقعی خانو ملک کی بیوی کی روح رہتی ہے اور اسی سے ڈرتے خانو ملک نے اس کے مرنے کے بعد اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔

میں یہ داستان سن کر اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گیا لیکن میں نے ملک سے اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔ اس دن کسی وجہ سے تفریح کے بجائے چھٹی ہی کر دی گئی۔ سکندر خان نے اپنے گھر سے چائے اور پکوڑے منگوائے۔ وہ کھا پی کر میں سیر ہو گیا' گھر آتے ہی بستر میں گھس گیا اور خوب سویا۔ دن کی روشنی میں دروازہ بند کر کے سونے میں بھی مجھے حبس محسوس نہیں ہوا' بلکہ بیداری پر فرحت کا احساس ہوا۔

بیدار ہونے پر میں ضرورت سے غسل خانے میں گیا تو میں نے وہاں پانی گرم کرنے کے لیے آتشدان کے نیچے لکڑیاں اور سلور کے بڑے سے برتن میں پانی بھرا ہوا پایا۔ ماچس پاس ہی پڑی تھی۔ میں حیران ہوا۔ شاید صبح بھی یہ سب کچھ موجود تھا اور میں نے خیال نہیں کیا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ مائی نے یہ اہتمام غسل کی خاطر میری غیر حاضری میں کیا ہوگا۔

میں نے آتشدان میں آگ جلائی۔ میں نہانا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں سکندر خاں کا بھائی مجھے کھانے کے لئے اپنے گھر لے جانے کے لیے آ گیا۔ میں نے تھوڑی دیر کے لیے اسے بیٹھنے کو کہا۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ دوسری چارپائی سے میرا بکس اٹھا کر ایک چھوٹی سی میز پر رکھ دیا گیا تھا۔ دیوار میں نصب لکڑی کی دو بڑی بڑی کھونٹیوں کے اوپر ایک رنگین چوبی کھونٹی لٹکائی گئی تھی اور میرے کپڑے اس پر لٹکے ہوئے تھے۔ یقیناً مائی کے پاس کمرے کی دوسری چابی موجود تھی اور وہ یا اس کی بیٹی کرایہ دار کا خصوصی خیال رکھ رہی تھی۔

میں غسل خانے اور کمرے کا درمیانی دروازہ بند کر کے پانی کے گرم ہونے کا انتظار کرنے کے لیے اپنے بستر کی طرف لوٹنے لگا تو سکندر کے بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں دروازہ کھلا ہی رکھوں۔ اس سے بڑا کمرہ بھی گرم ہو جائے گا بلکہ رات کو بھی میں یہ درواز کھلا ہی رکھوں۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں ماسٹر ثناءاللہ کی طرح کسی روح کا دیدار نہیں کرنا چاہتا۔

رات کو جب میں کھانا کھا کر لوٹا تو بالکل کل کی طرح ٹیبل لیمپ روشن تھا اور روشنی کے انعکاس کا عمل جاری تھا۔ میں نے لیمپ سمیت میز کو گھسیٹ کر اپنی چارپائی کے ساتھ لگایا۔ غسل خانے کا دروازہ بند کیا اور کمرے کے بڑے دروازے کے دونوں پٹ بھی بھیڑ دیے۔ رضائی میں دبک کر میں عزیز احمد کا ناول ''گریز'' پڑھنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ناول کے دو صفحے پڑھ

چکنے کے بعد بھی میرے پلے کچھ نہیں پڑا بلکہ میں ان انوکھی باتوں پر غور کرتا رہا ہوں جو میں نے بوچھال میں محسوس کی تھیں۔ وہاں گوشت سستا تھا۔ سنگترے، مالٹے اور گنے تول کر بکتے تھے۔ پوٹھوہار کی زبان بھی پنجابی تھی لیکن ماجھے اور دوابے کی زبان سے مختلف تھی۔ جب میں نہار رہا تھا تو مائی آئی اور سکندر کے بھائی نے اس سے پوچھا کہ زیبو کدھر ہے تو مائی نے اسے جواب دیا تھا: ''وہ چیڑے پھنڈن گئی ہے'' (کپڑے دھونے گئی ہے)۔ میں مائی کا جواب نہیں سمجھ پایا تھا اور بعد میں سکندر کے بھائی سے پوچھا تھا کہ مائی کیا کہہ رہی تھی۔ میں اس گھڑی کے متعلق بھی سوچتا رہا تھا جو میں نے دو ہفتے پیشتر خریدی تھی اور وہ صبح سے رکی پڑی تھی۔ میں اسے سکندر خان کو دے آیا تھا کہ وہ کل چکوال جانے والا تھا، وہاں سے اسے ٹھیک کروالائے۔

☆☆

میں اپنے روزمرہ کے کاموں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مجھے دیے گئے تھے۔ گزشتہ روز کی اس چائے کا ذائقہ بھی سوچ کے ذریعے محسوس کر رہا تھا جو دوپہر کو پی تھی۔ اسکول سے آتے ہوئے میں نے کوہستان نمک کے خشک پہاڑوں کے طولانی سلسلے پر نظر ڈالی تھی۔ ان میں سے پنہاریوں کی ایک قطار گھڑے اٹھائے وادی میں اتر رہی تھی۔ انھیں شاید زیادہ پانی کی ضرورت تھی جو ٹیوب ویل کی ٹونٹی سے نہیں ملا ہوگا۔ ایک ڈھلان سے ویسی ہی ایک قطار وادی سے اوپر کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پہلے روز سچ ہی کہا تھا کہ میں پہاڑی علاقے میں خوش رہوں گا۔ میری معلومات میں اضافہ ہوگا، میری طبیعت موزوں رہے گی اور میں کچھ تخلیقی کام کر سکوں گا۔

میں نے پھر سے ناول کے دونوں صفحات پڑھے۔ کچھ سمجھ میں آئے تو سہی لیکن اب میں ناول کے بجائے کچھ اور پڑھنا چاہ رہا تھا۔ روح کے متعلق! اور یہ خیال مجھے روشنی کے پراسرار دائروں میں گھرے غسل خانے کے دروازے کو دیکھ کر آیا تھا اور کالا اسکول کی لائبریری سے لائی ہوئی چند کتابوں میں ایک کتاب ''حقیقت روح'' بھی تھی۔ میں نے میز پر پڑی کتابوں میں سے اسے تلاش کیا تو وہ جلد ہی مل گئی اور میں پڑھنے میں محو ہو گیا۔ لکھا تھا:

''انسان کے فانی ہونے کا شور و غوغا محض لاعلمی ہے۔ اصل چیز روح ہے جس کا رشتہ لافانی کے ساتھ ہے، گویا جو کچھ ہمیں نظر رہا ہے وہ ایک سراب ہے۔ ایک سیمیائی نمود ہے۔ صورت و پیکر کی شعبدہ گری ہے۔ اصل حقیقت کو عنصری نقاب میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ورنہ

ہم تو روح مجرد ہیں۔ لامکانی، لازمانی اور لافانی ہیں۔'' اتنا پڑھنا تھا کہ کمرے کا دروازہ چرچرایا۔ ہوا کا ایک زبردست ٹھنڈا جھونکا اندر گھس آیا۔ لیمپ بجھتے بجھتے بچا اور اس کی لو کپکپائی تو روشنیوں کے دائرے بھی لرز کر رہ گئے۔ غسل خانے کا دروازہ بھی ذرا سا بجا تو اس میں کسی ہیولے کو دیکھ کر مجھے یقین سا آ گیا کہ جھونکا دراصل بانو کی روح کی آمد تھی۔ دن کے اوقات میں زیبو مجھے حیران کر رہی تھی اور اب...... میں کپکپاتا ہوا صحن میں نکلا۔ ہوا بالکل بند تھی لیکن درخت کے بہت سے گرے ہوئے زرد پتے صحن میں بکھر کر رہ گئے۔ کوئی بگولہ گزرا تھا۔ دن کو بھی میں نے کئی بگولے دیکھے تھے۔ اس یقین کے باوجود کہ کوئی غیر معمولی یا ماورائی بات نہیں، پھر بھی مجھے افسردگی نے آن لیا۔ میں دن میں سویا رہا تھا، لہٰذا نیند ابھی کوسوں دور تھی۔ مجھے ابھی ابھی ''حقیقت روح'' میں پڑھا آخری جملہ یاد آ رہا تھا ''ہم لامکانی، لازمانی اور لافانی ہیں۔'' اب میری تنہائی ایک عفریت کے مانند مجھے خوفزدہ کر رہی تھی۔ میرے پاس کوئی ہمت بندھانے والا بھی نہیں تھا۔ میری کیفیت پھر کل رات جیسی ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بچو جی، ابھی تو یہ بوچھال کی چوتھی رات ہے اور تنہائی کی دوسری رات۔ تمہیں تو پتہ نہیں کب تک ادھر اسی مکان ہی میں رہنا ہے۔ یہاں کرائے پر مکان مشکل ہی ملتے ہیں۔ تم شاید اس قدر صاف ستھرا اور سجا سجایا مکان پا بھی نہ سکو۔ چغتائی کا مکان تم نے دیکھا ہی ہے۔ میں اپنی توجیہہ سے سنبھل کر اندر آیا، دوازے کو کنڈا لگا کر بند کیا اور پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ ورق الٹا تو وہاں ''لائبریری مڈل اسکول کالا نمبر ۲۳۷'' کی مہر لگی نظر آئی۔ اسی مہر کے سہارے میں کالا جا پہنچا۔ چند لمحے وہاں گزارنے کے بعد پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوا تو اس کے صفحات پر مہر اور الفاظ کو غائب کرتی ہوئی میری بیوی کی شبیہ ابھری جو دو ماہ گزر جانے کے باوجود مجھ سے شرماتی تھی۔ گویا اب میں سیالکوٹ میں تھا۔

مجھے ننھا سا ماموں زاد بھائی یاد آیا جس کی آٹھ بچے جننے والی ماں نے اسے چھوڑ کر عقد ثانی کر لیا تھا۔ یہ بھائی توتلی زبان میں باتیں کر کے گھر بھر کو کشت زعفران بنائے رکھتا تھا۔ ماں اور بھائی یاد آئے۔ میں نے سوچا رات کے اس سمے وہ کیا کر رہے ہوں گے۔ ''سو رہے ہوں گے'' اندر ہی سے جواب آیا۔ میں تو نہیں سو پا رہا تھا، کس کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا؟ اس سوچ کے ساتھ ہی میری توجہ پھر سے کمرے کی آرائش و زیبائش، برتنوں کی قطاروں، خانو ملک اور اس کی بیوی بانو، زیبو کی ماں مائی اور ماسٹر ثناء اللہ کی طرف پلٹ گئی اور میں نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔

پریشان ہو کر میں نے لیمپ کی لو نیچی کر دی اور کتاب رکھ کر چھت کی طرف منہ کر کے چت لیٹ گیا۔ سر پر مفلر باندھا گردن تک رضائی اوڑھی اور کروٹ بدل کر چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔ ساتھ ہی مجھے جماہی سی آئی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ پاؤں چلا کر میں نے رضائی کو جسم سے اتارا اور لیمپ کی لو کو اونچا کیا۔ میں خواب کے متعلق سوچنے لگا جس میں کوئی مجھے پہاڑ کی ڈھلان سے نیچے گرانے کے لیے لے جا رہا تھا اور میں دہشت زدہ ہو کر اس طاقتور شخص سے گتھم گتھا ہو رہا تھا اور اسی کشمکش میں میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ کابوس کی طرح نہیں تھا۔ میں تازہ ہوا اور سردی محسوس کرنے کے لیے دروازے کا کنڈا کھول کر باہر نکل آیا۔ سترہویں اٹھارہویں کا چاند ہر طرف روشنی پھیلا رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں پر دھند چھا رہی تھی۔ سڑک پر سے دو تین ٹرکوں کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے چاند کی طرف منہ اٹھا کر سوچا کہ یہی چاند میرے گاؤں پر بھی اسی طرح روشنی بکھیر رہا ہوگا۔ گھروں کی چھتیں اور گلیاں یونہی چاندنی میں نہا رہی ہوں گی۔ گھر کے صحن میں لگے دھریک کے پیڑ سے چھن کر آنے والی چاندنی نے صحن میں ایسے ہی نقشہ بنا رکھا ہوا جیسے پیلو کے پیر سے چھن کر آنے والی چاندنی نے یہاں بنا رکھا ہے۔ مگر وہاں گھر کے صحن میں زرد پتوں کی بڑی بہتات ہوگی' کیونکہ اب گھر تو خالی پڑا ہے۔ سب شہر میں ہیں۔

میرا پسینہ خشک ہو گیا۔ سردی کا احساس بڑھنے لگا۔ میں پھر سے کمرے میں آ گیا۔ لیمپ کی روشنی نیچی کی۔ دروازے کو بھی کھلا ہی رہنے دیا اور پسینے سے بھیگ جانے والا لباس تبدیل کر کے پھر سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ یادوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اپنے گاؤں کی چاندنی راتوں میں ہم "لکن میٹی" کھیلا کرتے تھے۔ گاؤں سے باہر نکل جاتے اور خشک نالہ ایک کی ٹھنڈی ریت پر پاؤں چھاپتے تھے۔ دن کے وقت اسی ریت پر منشی محمد علی صاحب ہم سے خوشنویسی کرایا کرتے تھے۔ تھک کر خاموشی سے گھروں میں آ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتے۔ کیا زمانہ تھا' کوئی فکر تھی نہ تشویش' بچپن تو ہے ہی طلسم کدہ۔

عنفوان شباب میں بھی دوستوں کی وجہ سے یہ چاندنی راتیں یونہی زندہ تھیں۔ اب تو بس مخصوص دوست رہ گئے ہیں۔ بطور مدرس میرے لئے بچے ہی سب کچھ ہیں۔ بوچھال کلاں کے اسکول کی دیواروں پر بچوں کے متعلق مشاہیر کے اقوال لکھے گئے ہیں' لیکن اس سے تو مجھے

والٹئیر کا قول یاد آ رہا ہے۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔''

میں بھی تو سرکاری نوکری کے چکر میں جکڑا ہوا اس پراسرار کمرے میں محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ بلخ و بخارا کے محلوں کے بجائے بابل کا چوبارہ ہی عظیم ہوتا ہے۔ میں واپس سیالکوٹ چلا جاؤں گا۔ میں کونسا کشتیاں جلا کر یہاں وارد ہوا ہوں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول میں میری اسامی موجود ہے۔ اس خیال سے مجھے سکون نصیب ہوا اور میں کالے کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

☆☆

میں ابھی بستر ہی میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ چغتائی نے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجبوراً اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا تو اس نے مجھے سخت سست کہنے میں اپنی ''کنگز انگلش'' استعمال کی۔ اس نے بتایا کہ راجہ سکندر کو آج چکوال جانا ہے اس لیے اس کے ہاں جلدی جلدی ناشتہ کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے تو ابھی تیاری میں وقت لگے گا۔ میں اسے اسکول سے آ کر لیتا ہوں۔ تب تک وہ اپنا انگریزی کا ''زیرو پیریڈ'' ختم کرے۔ پنجاب کے دیگر علاقوں کی طرح پوٹھوہار کے علاقے میں بھی پاکستانی طلبہ کے لیے انگریزی سب سے بڑی تعلیمی رکاوٹ تھی' لہٰذا چغتائی دسویں جماعت کو اسکول کے اوقات سے قبل ایک گھنٹہ پڑھاتا تھا۔

سہ پہر تک اسکول میں وقت اچھا گزر گیا۔ لیکن گزشتہ رات کے اپنے فیصلے کی روشنی میں' میں اب ہر شے پر الوداعی نظر ہی ڈال رہا تھا۔ کشمکش صرف یہ تھی کہ مجھے باقاعدہ سب کو آگاہ کر کے یہاں سے جانا چاہیے یا خاموشی سے۔ پھر میں نے خاموشی سے ماسٹر ثناء اللہ کی طرح گم ہو جانے ہی کا فیصلہ کیا۔ جوں جوں رات قریب آتی گئی' توں توں میری وحشت بڑھتی گئی۔ لیکن تسلی یہ تھی کہ اے تنہائی! آج میں تیرے قابو نہیں آؤں گا۔

ہم نے ملک سکندر کے ہاں کھانا کھایا۔ وہ ابھی چکوال سے نہیں لوٹا تھا۔ اس کے بھائی نے بتایا کہ آج رات شاید وہ نہ ہی آئے' لہٰذ میں نے مائی کو دیے ہوئے بیس روپوں اور گھڑی کی بھی قربانی دی اور رات کے ابتدائی حصے میں اپنا بستر باندھا' بکس تیار کیا۔ اور احتیاطاً ایک درخواست لکھ کر لیمپ کے نیچے رکھ دی۔ 'مبادا'' ...... اور یہ مبادا (یعنی ایسا نہ ہو کہ ......) اب تک مجھے پریشان کیے رکھتا ہے۔

میں نے خوشاب کی سمت جانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے میں بکس اٹھا کر سڑک پر پہنچایا اور

اسے ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ رکھ آیا۔ پھر میں بستر لینے آیا۔ بستر نکال کر میں نے لیمپ جلتا رہنے دیا۔ دروازے کو مقفل کیا اور چابی تالے کے اندر ہی رہنے دی۔ باہر کے دروازے کا صرف کنڈا لگایا اور سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ بس ملنے کی توقع نہیں تھی لہٰذا ٹرکوں کو ہی ہاتھ سے رکنے کے اشارے دینے لگا۔ تین چار ٹرکوں کے بعد آخر ایک ٹرک رک گیا اور میں ڈرائیور کو صرف پانچ روپے دے کر خوشاب گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر جا اترا۔ بستر پاس تھا۔ رات خوب سویا۔ صبح پہلی بس سے سرگودھا پہنچا' وہاں سے براستہ شیخوپورہ اور گوجرانوالہ ایک بجے دن سیالکوٹ جا پہنچا۔ میں تانگے پر گھر کی سمت جا رہا تھا کہ اسٹیشن کے قریب ملک غنی نے مجھے سالم تانگے پر دیکھ کر ''روکو روکو'' کا شور مچا دیا۔ تانگہ رکتے ہی وہ پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میں نے اس سے خیر خیریت پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ تو جیسے تھا ویسے ہی اب بھی ہے لیکن میں بتاؤں کہ مجھے کیا ہوا جو بستر بوریا اٹھائے آ گیا ہوں؟

میں نے بس اتنا کہا: ''یار میں وہاں ڈر گیا تھا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

تانگے سے اتر کر اس نے میرا بکس پکڑ لیا اور مجھ سے آگے چلتا گیا۔ گھر کا دروازہ میری بجائے اس نے کھٹکھٹایا اور اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں پہلے میری ماں سے کہا: ''لو بہن جی۔ کل میں نے کہا تھا نا کہ وہ وہاں نہیں ٹک سکتا۔ آ گئے ہیں جناب بی اے بی ٹی صاحب۔'' پھر میری بیوی سے مخاطب ہوا: ''لے بہن! سنبھال اپنے میاں کو۔ تو فکر مند تھی نا کہ کہاں چلے گئے ہیں میاں صاحب۔''

ماں اور بیوی دونوں ہنستی رہیں اور پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا میں واپس آ گیا ہوں تو میں نے کہا کہ اب میں آپ لوگوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ وہاں ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ میں سخت مشکل سے وہاں چند راتیں گزار سکا ہوں۔ ماں نے کہا کہ میں نہ کہتی تھی کہ پردیس کی ساری سے گھر کی آدھی (روٹی) اچھی ہے۔ بیوی نے میری واپسی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ بس دو چار بار آنکھیں ملا کر مسکرا کر رہ گئی جیسے کہہ رہی ہو کہ جناب! آپ کی واپسی کا سبب میں ہوں۔ شاید لاشعور میں وہی تھی۔ فرائیڈ جیت گیا تھا۔ بانو اور زیبو کے متعلق سوچتے سوچتے میں ثروت تک بھی پہنچ رہا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۱۳)

لاشعور اور شعور

اب لاشعور تو مطمئن تھا' شعور پریشان کیے ہوئے تھا۔ اگر مجھے واپس ہی آنا تھا تو کالا میں اعلان کر کے نہیں جانا چاہیے تھا۔ پہلے بھی تو میں ہفتہ ہفتہ بھر غائب ہو ہی جاتا تھا۔ اب میں کس منہ سے کالے جاؤں لیکن کہیں نہ کہیں جانا تو تھا ہی۔ اگلے دن میں ضلعی دفتر تعلیم میں گیا...... سیدھا اس شخص کے پاس جس کے پاس میں جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے جب یہ بتایا کہ میرا استعفیٰ تو دو دسمبر ہی کو ایک ماہ کی ضبطی تنخواہ کے ساتھ منظوری کے لیے انسپکٹر آف سکولز کو بھیجا جا چکا ہے تو مجھے اپنی بجائے مولوی منظور اور ماسٹر فتح دین پر بڑا غصہ آیا کہ وہ کس قدر طوطا چشم نکلے تھے۔ میں نے تو ان کو کچھ اور سمجھایا تھا اور انھوں نے کیا کیا؟ میرا کالے جانا اور ضروری ہو گیا کہ میں منشی عنایت اللہ کو لے کر انسپکٹر آف سکولز کے پاس لاہور جاؤں۔

اگلے دن میں کالا پہنچ گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میر صاحب کی جگہ محمد خاں کلیم اب اس حلقے میں بطور اے ڈی آئی سکولز تعینات ہو کر آ چکے ہیں اور انھوں نے مجھ سے سابقہ آشنائی کی خاطر ملنے کے لیے پہلا دورہ ہی مڈل اسکول کالا کا رکھا تھا۔ مجھے صدر دفتر میں کسی نے اس تبدیلی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ حالانکہ ایسی تبدیلی کی خبر بڑی اہم ہوتی ہے۔ انھیں میرا لکھا ہوا استعفیٰ ڈاک رجسٹر میں پڑا مل گیا۔ وہ اس پر یکم دسمبر کا نمبر لگوا کر ساتھ لے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس میں اساتذہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اور اے ڈی آئی علاقہ بھی حق بجانب تھے۔ اس پریشانی کے عالم میں نواز گھمن نے میری حوصلہ افزائی کہ کہ اس کی محبت اور چاہت مجھے واپس کھینچ لائی ہے۔ اس کے والد صاحب اگلی صبح میرے ساتھ لاہور انسپکٹر آف سکولز کے دفتر گئے۔ چودھری محمد صادق صاحب ان سے آشنائی کے انداز سے "آ بھئی

چودھری'' کہہ کر ملے تو سہی لیکن اپنی عادت کے خلاف انھوں نے کوئی فوری فیصلہ نہیں کیا۔ میری درخواست استعفیٰ واپس لینے پر مبنی تھی۔ انھوں نے ہیڈ کلرک کو بلا کر کہا کہ اگر میرا استعفیٰ دفتر میں آ چکا ہو تو اسے اس درخواست کے ساتھ منسلک کر کے کارروائی کی جائے۔ ہیڈ کلرک چودھری نذیر احمد کی میرے ساتھ ''تو تو میں میں'' تقرر کے سلسلے میں ماہ مئی کے آخری دنوں میں ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں سیالکوٹ بھیجی ہوئی میری درخواست برائے ملازمت کبھی واپس نہ آئی تھی۔

ہیڈ کلرک نے انسپکٹر صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی مجھ سے کہا کہ ہم نے تو آپ کا تقرر کیا ہے اور نہ تقرر کی منظوری دی ہے۔ پھر استعفیٰ منظوری کے لیے ہمیں کیوں بھیجا گیا؟ بہرصورت ہم دیکھیں گے۔ منشی صاحب پھر چودھری صاحب کے کمرے میں گئے اور ہیڈ کلرک کی بات ان تک پہنچائی۔ انھوں نے ضلع سیالکوٹ سے متعلق ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ان کی طرف سے تاحکم ثانی مجھے کالا میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرنے کا حکم نامہ لکھ دیں۔ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز مجھے نصیحتیں کرتے رہے کہ میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر ڈسٹرکٹ بورڈ کی سروس میں واپس آ کر دھکے کھانے کی غلطی کیوں کر رہا ہوں۔ کل کو میرا تبادلہ سیالکوٹ بھی ہو سکتا تھا۔ میری بجائے منشی صاحب ہی جواب دیتے رہے۔ اپنی دانست میں ہم کامیاب لوٹے تھے۔ مدرسین نے میری واپسی کو اب تسلیم کر لیا تھا اور میں پھر سے دس دن پہلے والی کرسی پر براجمان تھا۔ اگرچہ میں اندر سے مطمئن نہیں تھا۔ انسپکٹر آف سکولز میری درخواست پر میری دس دن کی چھٹی منظور کر کے استعفیٰ کالعدم قرار دے سکتا تھا' مگر ایسا نہیں ہوا تھا جبکہ مناسب کارروائی کا حکم ہمیشہ نامناسب کارروائی ہی ثابت ہوتا ہے۔

منشی عنایت اللہ کا احسان اٹھا کر میں اب کسی عزت نفس یا انا کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاحکم ثانی کی بات ایک التوا تھا جس کی وجہ سے میری تنخواہ جاری نہ رہ سکتی تھی۔ میں ذہنی طور پر پریشان تھا۔ جب بھی صدر دفتر سے رابطہ کیا' وہاں سے انتظار کرنے کا جواب ہی ملا۔ ان سے کہا کہ وہ انسپکٹر آف سکولز کو یاددہانی کرائیں تو وہ کہتے کہ کیا آپ نے اپنے استعفیٰ کی واپسی کی درخواست ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کی معرفت بھیجی ہے۔ اسی کشمکش میں ۱۹۵۳ء اپنے اختتام کو پہنچ گیا' تاہم اس سال کے آخری ماہ میں منجھلے بھائی کو بھی سیالکوٹ میونسپلٹی کے اسکول میں ملازمت مل گئی۔ چھوٹے بھائی نے بھی لاہور کارپوریشن میں میرٹ لسٹ پر آنے کے لیے

امتحان دیا۔ میرٹ لسٹ پر اس کا نمبر تو پچانوے آیا۔ تاہم امید بندھی کہ کسی نہ کسی روز اس کو بھی روزگار مل ہی جائے گا۔ اب وہ ٹائپنگ کی مشق سیالکوٹ ہی میں کر رہا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے کہا کہ وہ دارالعلوم شہابیہ ہی میں داخلہ لے لے اور کوئی دینی کورس کر لے یا ایف اے ہی کی تیاری پرائیویٹ طور پر کرے تو وہ ناراض ہو گیا اور میری غیر حاضر میں راولپنڈی میں گاؤں کے ایک ٹھیکیدار کے بیٹے کے پاس چلا گیا جو اس کا دوست تھا۔

☆☆

پچھلے دنوں بھائی نے اپنی بھاوج کے ذریعے یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ اس کی بھی شادی کی جائے۔ کہاں کی جائے؟ اس کی نشاندہی بھی اس نے کر دی تھی لیکن ہم نے اسے برسر روزگار ہونے تک ایسے ارادے سے باز رہنے کی نصیحت کی تھی۔ اسے اس بات کا رنج بھی تھا۔ اس کی اس حرکت سے ایک نئی پریشانی نے جنم لے لیا تھا۔

میں کالا آ جا رہا تھا۔ کام بھی کر رہا تھا۔ سالانہ معائنے شروع ہو چکے تھے۔ جماعت ہشتم کا امتحان مڈل سٹینڈرڈ یکم فروری سے شروع ہونے والا تھا۔ جماعت کی انگریزی سخت کمزور تھی۔ بچے پختہ بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ انگریزی سے اردو ترجمہ یا جملے میں اسم، فعل، صفت اور حروف جار یا عطف کی شناخت کر سکتے تھے۔ میں ان کو پڑھاتا، محنت کرنے کی تلقین کرتا۔ ان کو چند مضامین، کہانیاں، خطوط اور درخواستیں وغیرہ رٹائیں۔ لیکن میں خود کو مطمئن نہیں پا رہا تھا۔ میرا اسکول جانے کو جی نہیں چاہتا تھا، لیکن میں منشی عنایت اللہ کے زیر احسان تھا۔ وہ جب پہلی بار میرے ساتھ لاہور گئے تھے تو انھوں نے آمد و رفت کا میرا خرچہ خود ہی برداشت کیا تھا۔ اب دوبارہ ابتدائے سال میں ان کو پھر لاہور جانے کا کہا تو انھوں نے باوجود پیش کش کے خرچہ نہیں لیا تھا۔

وہ مایوس لوٹے تھے۔ ہیڈ کلرک نے رجسٹروں اور فائلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے کہا تھا کہ انھوں نے میری درخواست پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سیالکوٹ سے رپورٹ مانگی ہے۔ اس نے مزید کہا تھا کہ آپ کو کس بات کی فکر ہے؟ چودھری صادق صاحب آپ کے عزیز ہیں؟ منشی عنایت اللہ نے ہیڈ کلرک کی لہجے کی کاٹ کو محسوس کر کے اس کی کچھ خبر بھی لی تھی۔ ان کو توقع تھی کہ اب جلد ہی مثبت جواب آئے گا لیکن محمد خاں کلیم کے حوالے سے جو خبریں رازدارانہ انداز میں مجھے ماسٹر فتح دین لا کر دے رہے تھے، ان کی روشنی میں مجھے منفی

جواب بھی جلد آنے کی توقع نہ تھی۔ انسپکٹر آف سکولز کے ہیڈ کلرک کی دیانتداری کی خاصی شہرت تھی لیکن ساتھ ہی وہ ''قلم کی مار'' دینے میں بھی خاصے مشہور تھے۔

جنوری میں مڈل اسکولوں کے ضلعی ٹورنامنٹ آ گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ساتویں جماعت کا ایک طالب علم محمد اشرف دوڑوں، اونچی لمبی چھلانگوں، نیزہ بازی اور گولہ پھینکنے جیسے تمام کھیلوں میں میدان مارتا چلا گیا۔ کھیلوں کی ذمے داری چونکہ نواز گھمن کی تھی، وہ اس کی ساری کامیابیاں اپنے کھاتے میں ڈال رہا تھا۔ اس کی بڑی واہ واہ تھی، حالانکہ اس کی تیار کردہ رسہ کشی، کبڈی، فٹ بال، والی بال اور ہاکی کی ٹیمیں اپنے اپنے پہلے مقابلے ہی میں ہار چکی تھیں۔

ٹورنامنٹ کے دنوں میں اسکولوں میں خوب ہلچل رہتی ہے۔ ہیڈ ماسٹر اور تربیت جسمانی کے اساتذہ کھلاڑیوں پر یونین فنڈ سے آمدورفت، خوراک اور ضیافتوں پر خوب خرچ کرتے ہیں۔ دیہاتی مڈل اسکولوں میں رواج ہے کہ کھانے پینے کا خرچہ کھلاڑی طلبہ ہی سے خشک راشن کی صورت میں لیا جاتا ہے کیونکہ وہاں فنڈز بہت کم ہوتے ہیں۔ پھر بھی خرچ تو ہوتا ہی ہے۔ میری غیر حاضری کے دوران ماسٹر فتح محمد نے بطور ہیڈ ماسٹر فنڈز اپنے نام تبدیل کرا لیے تھے۔ نواز گھمن اس سے جملہ اخراجات وصول کر رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ''تاحکم ثانی'' کچھ نہیں کر سکتا سوائے پڑھانے کے۔

میں ٹورنامنٹ کے تقسیم انعامات کی تقریب میں موجود تھا۔ طالب علم محمد اشرف کو ضلعی چیمپئن قرار دیا گیا تھا، لہٰذا اسے ٹرافی اور اسکول کو اعزازی شیلڈ دی گئی کانلے پارک میں ڈپٹی کمشنر شہزاد عالمگیر نے انعامات تقسیم کیے تو انھوں نے محمد اشرف کو خصوصی طور پر تھپکی دی اور اس کو تربیت دینے والے مدرس کو دیکھنا چاہا۔ نواز گھمن آگے بڑھا۔ خوب تالیاں بجیں اور ڈپٹی کمشنر نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کو حکم دیا کہ وہ نواز گھمن کو ایک سو روپیہ خصوصی انعام دیں۔ ماسٹر فتح دین تقریب میں شامل نہیں ہوئے۔ انھوں نے نواز گھمن سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ضلعی چیمپئن کو اسکول سے اس کے قریبی گاؤں تک ہار پہنا کر اور بینڈ باجے کے ساتھ جلوس کی صورت میں لے جائیں گے اور اب خرچہ دینا تو درکنار ماسٹر فتح دین خود ہی غائب ہو گئے تھے۔ اے ڈی آئی صاحب بھی مجھے دبی زبان سے کہہ چکے تھے کہ حقیقی ہیڈ ماسٹر تو وہ ہے، اسے اس تقریب میں آنا چاہیے تھا۔

میں نے اے ڈی آئی صاحب کی اس گفتگو سے اپنی سبکی محسوس کی۔ لہٰذ میں چائے میں

شریک نہیں ہوا، حالانکہ مجھے ضلعی اے ڈی آئی برائے تربیت جسمانی قاضی عبدالحمید مرحوم نے خصوصی طور پر چائے نوشی پر ملنے کو کہا تھا۔ وہ میرے عزیزوں میں سے تھے۔ نواز گھمن بے حد خوش تھا۔ اس نے بھی مجھے اپنے ساتھ چائے پر کھینچ لے جانے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے بہانہ کر دیا اور اس کا انتظار گیٹ پر کیا۔ وہاں اس نے فتح دین کی غیر ذمہ داری کا گلہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ فتح کے موقع پر معافی دینا اسوہ حسنہ ہے۔ وہ اس حقیقت سے انکار تو نہ کر سکا لیکن اس نے کہا کہ وہ کل اسکول میں بتائے گا کہ فتح دین کیوں نہیں آیا۔

میں اپنے گھر چلا گیا۔ وہاں گاؤں سے ہوتا ہوا انسپکٹر آف سکولز راولپنڈی کی طرف سے ایک تادیبی حکم آیا ہوا تھا کہ میں وجہ بیان کروں کہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں سے وجہ بتائے اور اجازت لیے بغیر غیر حاضر کیوں ہوا ہوں اور اگر میں تین یوم کے اندر اندر حاضر مدرسہ نہیں ہوا تو میرے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ میں نے بوچھال کے دوستوں کو سیالکوٹ پہنچتے ہی لکھ دیا تھا کہ وہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس لیے میں وہاں سے کسی کو پریشان کیے بغیر چلا آیا۔ ملک سکندر کو یہ بھی لکھا تھا کہ وہ میری گھڑی بذریعہ ڈاک پارسل بھیج دے اور مائی سے بھی دس روپوں کا حساب کر لے، لیکن اس نے مجھے خط لکھا نہ گھڑی بھیجی۔ اللہ یار سے بھی پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ چغتائی کئی سال بعد ملا۔ خط پا کر میں نے سوچا کہ تھوڑی سی شرمندگی کی بات تو ہے لیکن جو لوگ اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں یا اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کر لیتے وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر سوچا کہ جانے والے کہیں گے کیسا متلون مزاج انسان ہے۔ سو جوتے بھی کھا رہا ہے اور سو پیاز بھی۔ چچا کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ میں بوچھال سے واپس آ گیا ہوں۔ انھوں نے ناراضی میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ سیالکوٹ آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ مجھے چھوڑ اپنی بیٹی سے بھی ملنے نہیں آئے۔ اپنے کردار و عمل سے میں نے ان کا خواب بھی بکھیر دیا تھا۔ میں نے بھی ان کا اتباع کیا اور تمام معاملات میں خاموشی اختیار کر لی کہ دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

اگلی صبح مجھے نواز گھمن نے ماسٹر فتح دین کی آمد سے پہلے ہی بتایا کہ ماسٹر فتح دین اپنے وعدے کے مطابق فنڈ کے پیسوں کا انتظام نہیں کر سکا۔ لہٰذا وہ تقریب سے غیر حاضر رہا۔ جبکہ انعام یافتہ کھلاڑی کو اس نے فتح دین کے قرض کے کھاتے میں سے خرچ کر کے پورے اعزاز کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا تھا اور اس کے گھر والوں نے جلوس میں شامل بچوں اور بڑوں میں

تقریباً ایک من مٹھائی تقسیم کی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر جلوس اور مٹھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ ماسٹر فتح دین نے اسے مطلوبہ رقم ڈاک خانے سے نکلوا کر کیوں نہیں دی تھی؟ میں نے نواز گھمن سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ میں خود ہی ماسٹر فتح دین سے پوچھوں تو مجھے نہ صرف اس کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کا علم ہو جائے گا بلکہ اس کی ذات میں چھپی چالاکی اور ہوشیاری کا پتہ بھی چل جائے گا۔ چونکہ میں ٹورنامنٹ کی کسی بھی سرگرمی میں ملوث نہیں رہا تھا' لہٰذا میں نے ماسٹر فتح دین سے کچھ نہیں پوچھا۔

☆☆

وقت کا پنڈولم ٹک ٹک کر کے چلتا رہا۔ میں لحہ بہ لحہ خود کو اپنے آپ سے لڑتا بھڑتا محسوس کرتا رہا حتیٰ کہ فروری کا مہینہ سر پر آ پہنچا۔ اگلا مرحلہ آٹھویں کے بچوں کے امتحان کا تھا۔
یکم فروری سے مڈل سٹینڈرڈ کا امتحان سیالکوٹ شہر کے ایک مرکز میں شروع ہوا۔ میں نے نواز گھمن ہی کو طلبہ کے ساتھ امتحان دلوانے کی ذمے داری سونپ کر بھیجا۔ مجھے آٹھ میں سے صرف ایک بچے کے پاس ہونے کی امید تھی۔ اپنے اپنے مضمون کے پرچوں کے دن ماسٹر فتح دین اور مولوی منظور حسین بھی طلبہ کی راہنمائی کے لیے شہر گئے۔ میں نے بھی انگریزی کے پرچوں سے قبل رات گئے تک بچوں کو پڑھایا' سمجھایا اور ہدایات دیں۔ میں نے انگریزی کے دونوں پرچوں کے بعد امتحانی پرچے تمام طلبہ سے تحریری طور پر بھی حل کروائے تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ کتنے بچے پاس ہو سکیں گے۔ بچوں کی حالت یہ تھی کہ سوائے اس ایک طالب علم کے باقی طلبہ دونوں پرچوں میں بیس فیصد بھی نمبر حاصل نہ کر سکے۔ مایوسی کے اس عالم میں انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن کی چٹھی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے نام آئی اور اس کی نقل مجھے بھی موصول ہوئی جس میں تحریر تھا کہ میرا استعفیٰ واپس کیا جا رہا ہے اور مجھے ماہ نومبر ۵۳ء کی تنخواہ حاصل کرنے کا حق ہے اور مجھ پر خصوصی مہربانی کرتے ہوئے یکم دسمبر ۵۳ء تا ۳۱ر جنوری ۵۴ء میری رخصت بلا تنخواہ منظور کی گئی ہے اور یکم فروری سے میں اپنی اسامی پر بطور ہیڈ ماسٹر کام کروں گا۔ یہ فطرت کا حساب کتاب تھا یا انسپکٹر آف سکولز کے دفتر کے ہیڈ کلرک کی دینداری اور پرہیزگاری کا انعام کہ میری دو جگہوں پر ملازمت کر کے حاصل کی جانے والی آمدنی کا حساب کتاب برابر ہو گیا تھا بلکہ مجھے ایک نادیدہ رسوائی اور دیدہ خسارے کا سامنا بھی تھا۔
یہ حکم پانچ یا چھ فروری کو موصول ہوا تھا۔ لہٰذا اگلے دن میں اعتماد کے ساتھ اسکول پہنچا۔

میں نے آرڈر بک پر نومبر کے بعد اپنا پہلا حکم جاری کیا اور اساتذہ سے یہ درخواست کی کہ وہ میرے پہلے حکم کو بھی پڑھیں اور اس کے مطابق کام کریں۔ میں نے مدرسین کو واضح طور پر بتایا کہ پچھلے دو ماہ میں ان سے اخلاقی اپیلیں ہی کرتا رہا ہوں جن کا کوئی موثر جواب مجھے موصول نہیں ہوا تھا۔ اب چونکہ میں فلاں فلاں حکم اور مراسلہ نمبر اور تاریخ کے مطابق عبوری ہیڈ ماسٹر نہیں رہا' لہٰذ میں ہر کام کی رفتار کا اور دیگر انتظامی امور کا باضابطہ جائزہ لوں گا اور کسی بھی تادیبی کارروائی سے گریز نہیں کروں گا۔

اساتذہ باری باری مجھ سے ملنے آتے رہے اور مجھے رسمی سی مبارکبادیں بھی دیتے رہے۔ میں دفتر میں تھا جب ماسٹر فتح دین اندر آئے اور اپنے سر سے ٹوپی اتار کر مجھ سے کہا: ''آپ کہیں تو میں سب کے سامنے بھی یہ ٹوپی آپ کے قدموں میں رکھنے کو تیار ہوں لیکن اگر بطور اپنے نائب کے' مجھے کچھ عزت دیں تو یہ ٹوپی میں یہیں آپ کے قدموں میں رکھ دیتا ہوں۔'' وہ ٹوپی کو میرے قدموں میں رکھنے کے لیے جھکے تو میں نے ان کو تھام لیا اور ان سے کہا: ''آپ معلم ہونے سے پہلے انسان ہیں اور یہ انسانیت کی توہین ہے کہ آپ جیسا بزرگ مجھ جیسے خام کار جوان کے آگے یوں جھکے۔ آپ تشریف رکھیں اور بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟''

انھوں نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور بتایا کہ اس نے ٹورنامنٹ پر جتنا خرچ کیا ہے وہ سود خور پٹھانوں سے قرض لے کر ماسٹر نواز کو دیا ہے۔ تقریب کے دن بھی انھیں ماسٹر نواز کو سو روپے دینے تھے لیکن چونکہ مہینے کی پہلی تاریخیں تھیں' اس لیے ساہوکار پٹھان انھیں نہ مل سکا۔ وہ وصولیاں کرنے گیا ہوا تھا۔

''آپ نے ڈاک خانے سے پیسے کیوں نہ نکلوائے؟'' میں نے پوچھا

''ڈاک خانے میں صرف دس روپے پڑے ہیں۔ میں نے یونین فنڈ اور ریڈ کراس فنڈ کے کل روپے نکلوا کر اے ڈی آئی علاقہ کو دے دیے تھے۔ انھوں نے بینڈ کے علاوہ کچھ اور ضروری اشیاء خرید کر دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ کچھ خرید کر دینے سے بھی ٹال مٹول کر رہے ہیں اور پیسے بھی واپس نہیں دیے۔ ساتھ ہی یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کسی مدرس یا آپ سے اس لین دین کا ذکر کیا تو وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیں گے۔ اب میں نے دفتر میں آپ کے احکامات کی بازگشت سنی تو میں ان کے پاس گیا مگر انھوں نے میری ٹوپی کی پروا بھی نہیں کی اور کہا: ''یہ تمہارا اور ہیڈ ماسٹر کا معاملہ ہے۔ میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔''

وہ پھر رونے لگے۔ واقعی وہ اس قدر سادہ تھے کہ انھوں نے محض اے ڈی آئی کی خوشنودی کے لیے اسکول کا فنڈ جو حقیقتاً طلبہ کا اثاثہ ہوتا ہے اپنے سے بڑے محافظ کو تھما دیا تھا۔ آج کے دور میں جب ایک ایس وی یا سی ٹی ٹیچر ابتدا ہی میں ہزاروں میں تنخواہ لیتا ہے وہ اس وقت کے ایک سوبیس آخری حد کی تنخواہ لینے والے شخص کی مجبوریوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ماسٹر فتح دین کو تسلی دی اور ان سے پوچھا: ''آپ نے مولوی صاحب سے یا کسی اور شخص سے قرض حسنہ وغیرہ لے کر ٹورنامنٹ پر خرچ کیوں نہ کر لیا؟'' اس کا جواب معقول تھا کہ اگر وہ ان سے قرض طلب کرتے تو وہ بھی پوچھتے کہ ٹورنامنٹ کا تعلق فنڈز سے بنتا ہے وہاں سے نکلواؤ۔ اس طرح راز کی بات کوٹھے چڑھ جاتی۔

''اب جب آپ قرض لے ہی چکے ہیں تو پھر فوری پریشانی کی وجہ کیا ہے؟

''وجہ یہ ہے کہ اب آپ کے نام فنڈز منتقل ہوں گے اور وہاں منتقل کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ اس بات کا آپ کے علم میں ہونا ضروری تھا۔''

میں نے اسے مزید تسلی دی کہ میں فی الحال فنڈز وغیرہ کی کوئی بات نہیں کروں گا نہ کوئی فوری ضرورت ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ اگر سالانہ معاینہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے کیا تو پھر کیا ہوگا؟ اب میں کھلکھلا کر ہنسا اور ان کی تسلی کی کہ اے ڈی آئی کو اپنا کیا دھرا یاد ہے۔ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کی بجائے خود ہی سالانہ معائنہ فرمائیں گے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

محمد خاں کلیم، مشہور گلوکار اور شاعر طفیل ہوشیار پوری صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے بھائی کے جاری کردہ ماہنامہ ''محفل'' کے مدیر اعلیٰ رہے۔ وہ بڑے ملنسار، منکسر المزاج، خوش گفتار اور حلیم الطبع انسان تھے۔ لوگ فٹ پاتھ پر چلتے ہیں۔ وہ انکسار میں فٹ پاتھ کے ساتھ بنی پگڈنڈی پر اتر جایا کرتے تھے۔ میں جب مڈل اسکول سمبڑیال میں زیر تعلیم تھا تو وہ وہاں غیر تربیت یافتہ معلم تھے۔ لہٰذا بلاواسطہ وہ میرے بھی معلم ہوئے اگرچہ براہ راست میں نے ان سے کوئی درس نہیں لیا۔ وہ اس زمانے میں بھی بڑے خوبصورت اشعار کہا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے آپ کو نعت رسولؐ تک محدود کر رکھا ہے۔ اقبالؒ کی نظم ''ٹیپو کی وصیت'' پر ان کی تضمین کے چند اشعار مجھے اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

گرداب میں الجھنے سے قطرے کی آبرو
موجوں سے کھیل عشرت ساحل نہ کر قبول

کشت امل کو خونِ نگاہ وجگر سے سینچ
جس پر گرے نہ برق وہ حاصل نہ کر قبول
پنہاں سرود ساز میں ہے آرزوئے دوست
جس دل میں آرزو نہ ہو وہ دل نہ کر قبول

کلیم صاحب ایک اچھے اور متواضع انسان تھے لیکن ان کے اندر کا یہ عیب تھا کہ وہ مقروض رہتے اور شاہ خرچ بھی تھے۔ اگر ان کو شفیق و مہربان برادر بزرگ طفیل ہوشیار پوری کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہوتا تو جانے ان کی حالت کیا ہوتی۔ میں چاہت کے باوجود ان سے اس لیے ناراض تھا کہ وہ میرے چچا مرحوم کے ساتھ سمبڑیال میں غیر تربیت یافتہ معلم رہے تھے اور بعد میں بھی خاصے تعلقات رہے تھے مگر ان کی فوتیدگی پر تعزیت کے لیے بھی نہیں آئے۔ انتہائی لطیف انسانوں کی طبائع میں بھی کوئی نہ کوئی گوشہ "نامعقولیت" کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس گوشے سے واقف ہوتے ہیں لیکن تسلیم نہیں کرتے۔ میرے اپنے اندر بھی شاید ایسے گوشے موجود ہوں گے۔

☆☆

سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہونے کے بعد مڈل سکول کالا میں کام کرنے کی جو لگن اور کیف تھا وہ کم ہو چکا تھا۔ بوچھال سے اپنے فرار کے متعلق سوچتا تو "باز آید پشیمانی" والا شعر یاد آتا اور میں آہ بھر کر رہ جاتا۔ گھمن اب یہ سمجھنے میں بخل نہیں کر رہا تھا کہ میں اس ہی کے بزرگ کی وجہ سے واپس آیا تھا۔ میں ان کے اس خیال کو جھٹلاتا بھی نہیں تھا۔ میں اگر اپنے ذرائع استعمال کرتا تو شاید میری ایک دن رخصت بھی بلاتنخواہ نہ ہوتی۔ سب جانتے تھے کہ میں سکول میں حاضر رہا تھا اور یہ بھی سب کے علم میں تھا کہ حکم نامہ میری دو ماہ کی چھٹی بلاتنخواہ منظور کر رہا تھا جو انسپکٹر آف سکولز کے پہلے احکامات کے سراسر خلاف بات تھی۔ انصاری سمجھتے تھے کہ میں اب پوری طرح گھمنوں کے زیر احسان ہوں جبکہ مولوی منظور حسین کا میں الگ قرض دار تھا۔

اے ڈی آئی صاحب کا حکم نامہ آیا کہ مڈل سکول کالا کا سالانہ معائنہ ۲۷ر فروری کو ہو گا۔ میں نے معائنے کی تیاری کے لئے سٹاف کی ایک میٹنگ بلائی اور اپنے گزشتہ دو ماہ کے تمام مشاہدات کا ذکر کر کے اساتذہ کو شرمندہ کیا۔ ساتھ ہی میں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ میں

گزشتہ دو ماہ ذہنی طور پر سکول سے غیر حاضر رہا ہوں اس کی تصدیق سکول میں میری جسمانی طور پر حاضری کے باوجود انسپکٹر آف سکولز کے احکامات نے کر دی ہے۔ ان احکامات کی روشنی میں معائنے کے سلسلے میں میری ذمہ داری آپ لوگوں کے مقابلے میں ایک فیصدی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا آپ ہی کو معائنے کے روز اپنا کیا کرایا بھگتنا ہوگا۔

میری اس صاف گوئی کا اساتذہ پر مثبت اثر ہوا۔ انھوں نے معائنے کے روز علاقہ افسر کو دکھانے کے لئے اپنی ڈائریاں مکمل کیں۔ بچوں کا تحریری و تقریری کام سلیبس کے چارٹوں کے مطابق کرایا۔ وردی کے بارے میں سختی کی۔ ٹیلے کی جو کھدائی اور کٹائی شروع کی تھی اسے مکمل کیا۔ اس سلسلے میں اہل دیہہ سے بھی افرادی امداد حاصل کی۔ والی بال کی گراؤنڈ تیار ہوئی تو ٹیلے کی طرف جو دیوار بنی اس کے عمودی رخ کو ڈھلوان بنا کر وہاں پتھروں سے قومی پرچم بنایا ان پتھروں پر سلور اور سبز پینٹ کیا۔ پورے پرچم کی لمبائی اڑتالیس فٹ تھی۔ پرچم کی اتنی دھوم مچی کہ کالا تو کالا' قرب و جوار کے دیہاتوں کے مرد اور عورتیں بھی اسے دیکھنے آئیں۔ عمارت کو نئے سرے سے اندر اور باہر سے سفیدی کرائی گئی اور اشعار' اقوال' آیات قرآنی اور حدیث نبویؐ کے علاوہ نصاب پر مبنی اتنی تعداد میں تحریریں لکھوائیں کہ پڑھنے والا تھک جائے تو بھی ختم نہ ہوں۔ میرا اساتذہ پر یقین محکم ہو رہا تھا کہ یہ اگر چاہیں تو مرضی کے مطابق طلبہ اور ماحول میں انقلاب لا سکتے ہیں۔

زمین کا جو ٹکڑا صاحب جاٹ سے حاصل کیا تھا اس کے کنارے کنارے ہر طالب علم نے توت' شیشم' کیکر یا دھریک کا ایک ایک پودا لگایا تھا۔ پودے کے ساتھ ہر لڑکے نے اپنے نام کی پرچی آویزاں کی۔ ہر پودے کا قد بچے کے قد سے مشروط تھا۔ ان درختوں کے خودرو پودے بہ افراط مل جاتے ہیں۔ والدین نے خوشی خوشی اپنے بچوں کی مدد کی۔ دو سو کے قریب پودے لگائے گئے۔ ہر لڑکے سے دو دو اینٹیں بطور عطیہ لی گئیں اور ٹیلے پر ۶×۸×۸ مربع فٹ کی رصد گاہ تعمیر کی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم درجہ حرارت ماپنے کے تھرمامیٹر کے علاوہ خشک اور تر گولی کے تھرمامیٹر آویزاں کیے۔ بیرومیٹر بھی لٹکایا۔ شہر سے آرٹسٹ بلوا کر چھت پر دب اکبر اور قطبی ستارے کا منظر پیش کیا گیا۔ باہر کونے پر مرغ بادنما نصب کیا جس کے بارے میں سب پوچھتے کہ یہ مرغا کیوں لگایا گیا ہے۔ صرف ماسٹر فتح دین کو اس کا مصرف معلوم تھا۔

چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے ہمیں پریشانی تھی مگر میری پوری توجہ معائنے پر تھی کہ میری سربراہی میں یہ مدرسہ کا یہ پہلا معائنہ تھا۔

۲۷ر فروری کو جب کلیم صاحب معائنے کے لیے تشریف لائے تو وہ ایسا انقلاب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان سے پرچم کشائی کرائی گئی۔ مارچ پاسٹ پیش کیا گیا۔ بچوں نے قومی ترانہ اور دیگر ترانے پیش کیے۔ محمد اشرف کی ٹرافیاں اور اسکول شیلڈ کا تو ان کو علم تھا لیکن اب جب اس ہونہار لڑکے نے اپنے ہاتھوں سے یہ اعزاز اے ڈی آئی ہی کو تحفتاً پیش کر دیے تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے محمد اشرف کو فنڈ سے ۲۵ روپے کا انعام دینے کے لیے مجھے لاگ بک میں تحریری حکم دیا۔ ان سے رصدگاہ کا افتتاح کرایا گیا۔ مڈل کا امتحان دے کر فارغ ہونے والے ایک طالب علم نے اے ڈی آئی صاحب کو آلات رصدگاہ کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ معائنے کی بعد ضیافت بھی خوب ہوئی۔ صاحب موصوف نے ادیبانہ انداز میں اچھی لاگ بک لکھی اور اساتذہ کو بہتر اور بہترین ریمارکس دیے۔ اساتذہ کی حوصلہ افزائی کرنے کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگلے دن کے لئے چھٹی کا اعلان بھی ہوا۔

کلیم صاحب نے فنڈز اور دیگر معاملات کے رجسٹروں کا معائنہ نہیں کیا بلکہ کہا کہ جہاں ٹرینڈ گریجوایٹ ہیڈ ماسٹر ہو وہاں تو معائنہ بھی محض تکلف ہے، لیکن وہ یہ گلہ کرنا نہیں بھولے کہ میں نے جلسہ تقسیم انعامات کی تقریب کے دن ہی ان سے رسمی ملاقات کی تھی۔ مجھے بوچھال سے واپس آتے ہی ان سے رابطہ کرنا چاہیے تھا اور اگر میں ان سے ملاقات کر لیتا تو وہ مجھے واپس بوچھال جانے پر ضرور راضی کر لیتے کیونکہ وہ خود بھی ڈسٹرکٹ بورڈ ہی سے گورنمنٹ ملازمت میں آئے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ میں جب دو ماہ ادھر حاضر رہا ہوں تو اپنی غیر حاضری کے مفروضے اور رخصت بلا تنخواہ کے حکم کے خلاف درخواست دوں۔ کلیم صاحب سے تجدید تعلقات سے مجھے خوشی بھی ہوئی لیکن انھوں نے ماسٹر فتح دین سے بغیر رسید کے جو قرض لیا تھا اس پر افسوس دل میں باقی تھا۔

یکم مارچ کو جب میں اسکول پہنچا تو وہاں ۹۹۰ روپے کا ایک منی آرڈر میرا منتظر تھا جبکہ اسی دن چھوٹے بھائی کا ایک ''قہرنامہ'' بھی موصول ہوا۔ گویا یہ دن میرے لیے حیرانی و پریشانی کا دن تھا۔

میرے بھائی کے خط کے پس منظر کو میری سرگزشت سے جانا جا سکتا ہے، لیکن

۹۹۰ روپے کے منی آرڈر کے متعلق ہر قاری سوچے گا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں سے آ ٹپکا؟ تو جناب! مجھے پھر ماضی میں لوٹنا ہوگا اگرچہ بیشتر دانا لوگوں نے کہا ہے کہ ماضی ایک مردہ ہے اس کو گہرا دفن کر دو۔ میرے خیال میں دانا لوگوں کو یہ مشورہ اسی لیے دینا پڑا کہ ہم ماضی کو دفن نہیں کر پاتے، میں بھی نہیں کر پایا۔

☆☆

ہمارے گھر کی بوسیدہ شمالی دیوار میں ایک بوسیدہ الماری کے اندر عمر رسیدہ کتب پڑی تھیں۔ ان میں ایک نئی کتاب کی کئی جلدیں بھی رکھی گئی تھیں۔ اس نئی کتاب کا نام ''احکامات شریعت'' تھا۔ میں اس کتاب کا مطالعہ دو وجوہات کی بنا پر کرتا تھا۔ ایک تو اس کی زبان بڑی سادہ اور آسان فہم تھی۔ نویں جماعت کا طالب علم ہونے کے باوجود اسے سمجھ سکتا تھا۔ دوسرے اس کے مرتبین میرے مڈل تک کے استاد حضرت مولانا محمد اسماعیل زمانی اور دوسرے میرے حقیقی پھوپھا حکیم محمد شریف قریشی مالک ومختار قریشی دواخانہ اور قریشی بک ڈپو، ڈسکہ تھے۔ اس کتاب میں دیگر مختلف عنوانات کے تحت بے شمار دینی مسائل کا ذکر تھا۔ کچھ مسائل امام مسجد کے بارے میں بھی تھے۔ ان میں امامت کے منصب کے حوالے سے ایک انکشاف یہ تھا کہ امام حاکم ہوتا ہے جبکہ پیشہ ور غسال محکوم ہوتا ہے اور غسال کبھی حاکم نہیں ہوسکتا اس لیے امام مسجد کو پیشہ وارانہ انداز میں میت کو غسل دینے سے انکار کر دینے کا حق حاصل ہے۔

مجھے قطعی علم نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے کہ فقیہہ اس ضمن میں کیا فرماتے ہیں۔ بہرحال چوک والی مسجد کے امام صاحب نے جو میرے قریبی عزیز اور بزرگ تھے نے یہ حق استعمال کر کے ایک معیت کو غسل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر گاؤں میں کافی ہلچل ہوئی تھی۔ میں نے اپنے چچا جان کی اجازت کے بغیر یہ کتاب امام صاحب کی حمایت میں مسجد میں جمع پڑھے لکھے اہلِ محلہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس کے بعد منشی فضل کریم اور اللہ دتہ ٹھیکیدار میرے ''علم و فضل'' کے قائل ہو گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ میں اپنے بزرگوں سے بڑھ چڑھ کر پڑھ لکھ رہا ہوں۔

اس واقعے کے بعد منشی فضل کریم کو اس کتاب کی ضرورت آ پڑی۔ انھوں نے کتاب کے ''باب الطلاق'' کو میرے ساتھ مل کر پڑھا۔ کچھ اصطلاحات کے معانی ہم نے لغت میں تلاش کیے۔ وہ ایک ایسی خاتون سے شادی کرنا چاہتے تھے جس کی طلاق کا مسئلہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے فراخدلی سے کتاب ہی انھیں تحفتاً دے دی تھی۔

ان کا مسئلہ حل ہو گیا اور انھوں نے اس خاتون سے شادی بھی کر لی۔ بچے ہوئے اور جب تک میں نے بی۔ اے کیا ان سے میرے تعلقات برخورداری اور بزرگی کے دائرے سے نکل کر دوستانہ ہو چکے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے مسائل سمجھتے تھے۔ جب بھی میں گاؤں جاتا تو وہ مجھے اکثر اپنے ہاں بلا لیتے اور اپنے حالات اور فروعی دینی مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے۔ مطلقہ سے نکاح کرنے کے بعد وہ دینی معاملات میں کچھ ترقی پسند ہو چکے تھے کیونکہ چچی ''منشی صاحب کی بیوی'' اور منشی صاحب دونوں مختلف مذہبی عقیدے کے تھے۔

ڈیل ڈول کے لحاظ سے منشی صاحب انگریز جرنیل لگتے تھے۔ خاندانی پیشہ بڑھئی کا تھا اور وہ مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ لکڑی کے رنگین کام کے بڑے ماہر تھے۔ رنگین لٹو بنانے کی وجہ سے وہ بچوں میں بھی بڑے مقبول تھے۔ بڑی عمر کے لوگ بھی ان کی کاریگری کے معترف تھے۔ وہ باقاعدہ اجرت پر رنگین پایوں والے پلنگ' چارپائیاں' پیڑھیاں' ڈنڈے کونڈے' مدانیاں' گڈے' واکر' اور گلی ڈنڈے تک تیار کرتے۔ کارخانے کے احاطے میں انھوں نے لکڑی کو گول صاف ستھرا کرنے اور رنگ چڑھانے کے لئے دستی خراد لگا رکھا تھا جو لکڑی کے ایک بڑے سے پہیئے سے چلایا جاتا تھا۔ پہیئے کو گھمانے کے لئے گاہک اپنا آدمی بھیجتا تھا۔ وہاں ایک خراس (آٹا پیسنے کی بڑی چکی) بھی لگا ہوا تھا۔ زمیندار اپنا بیل جوت کر خراس چلاتے اور آٹا پیس کر لے جاتے۔ اس سارے کاروبار اور تنخواہ وغیرہ سے کچھ بچا بچا کر منشی جی نے اپنی اولاد کے لئے بہت کچھ جمع کر رکھا تھا۔

منشی صاحب کے باقی بھائی زمینداروں کے کام ''سیپ'' پر کرتے تھے۔ آلات کشاورزی کے علاوہ زمینداروں کی اپنی مہیا کی ہوئی لکڑی سے ان کی ضرورت کی اشیاء بناتے اور ''منجی (چارپائی) پیڑھی'' کی مرمت وغیرہ کرتے۔ ربیع اور خریف کی فصلوں پر جنس کی صورت میں ان کو معاوضہ دیا جاتا۔ جانے کیا بات تھی کہ منشی جی کی بہنیں اور بھائی کنوارے ہی بوڑھے ہو چلے تھے۔ ان کی شادیاں نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ایک بہن کی شادی ہوئی بھی تو وہ دو بچوں کے ساتھ طلاق لے کر بھائی بہنوں کے پاس ہی آ رہی۔ منشی جی نے از خود مطلقہ سے جو شادی کی اس بنا پر وہ اپنی ماں' بہنوں اور بھائیوں کے معتوب ہوئے۔ لہٰذا وہ اب عرصے سے چوب کاری کے سانجھے کارخانے کے احاطے میں ایک کوٹھڑی میں رہ رہے تھے۔

منشی صاحب کو اچانک دمہ کا مرض لاحق ہو گیا۔ بچوں اور خاندانی کشمکش کی وجہ سے

انھیں یہ خدشہ ہو گیا کہ اب ان کا دم واپسیں ہے اور ان کی بیوی بچوں کا حشر نشر قریب ہے۔ وہ اس موضوع پر بھی میرے ساتھ کافی گفتگو کرتے اور میں انھیں دلاسا بھی دیتا اور حکیم صاحب سے دوا بھی لا کر دیتا۔ اکثر مجھ سے وعدہ لیتے کہ میں ان کے خیال کے مطابق ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں کا خیال رکھوں گا کیونکہ منشی جی کے خیال میں بی۔ٹی کرنے کے بعد میرا معاشرے میں کچھ مقام بن جانا یقینی تھا۔ میں انھیں یقین دلاتا کہ اول تو ان کو ابھی کچھ نہیں ہو گا اور ان کی زندگی میں ہی بچے کچھ نہ کچھ بن جائیں گے۔ تعلقات بڑھانے اور کچھ نیکی کی خاطر انھوں نے بی۔ٹی کے دوران میں از خود مجھے مالی امداد کی پیش کش کی۔ شرط یہ رکھی کہ ہمارا ضامن صرف اللہ ہے اور میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ ہمارے درمیان کوئی لین دین ہوا ہے۔ یہاں تک کہ میں اپنی والدہ کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ اصل راز داری ان کو اپنے کنبے سے مطلوب تھی۔ بات ہونٹوں سے نکلے تو پھر کوٹھے چڑھ جاتی ہے۔ میں ضرورت مند تو تھا ہی لہٰذا ان کی پیش کش قبول کر لی۔

☆☆

وہ مجھے لے کر خراد کے بڑے پہیئے کے پاس گئے۔ چند قدم ناپے اور دیوار میں نصب ایک کھونٹی کی سیدھ میں جگہ کھودنے کو کہا۔ میں نے کدال لے کر ڈیڑھ فٹ گہرا گڑھا کھودا، تو وہاں سے ایک انتہائی زنگ آلودہ سگریٹوں کا ٹین کا چھوٹا سا ڈبہ برآمد ہوا۔ ان دنوں اچھی نسل کے سگریٹ کو سو سو کی تعداد میں ایسے ڈبوں ہی میں محفوظ کر کے بیچا جاتا تھا۔ خالی ڈبے حکیم لوگ اپنی معجونیں اور خمیرے محفوظ کرنے کے لئے اور خواتین مرچ مسالے رکھنے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ منشی جی نے ڈبے کو کھولنا چاہا، تو وہ خستگی کے باعث پچک گیا، بھربھرا زنگ گرا تو اس میں سوراخ نظر آنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ منشی جی کا خزانہ ہے۔ میں نے احتیاط سے ڈبے کو دو حصوں میں تقسیم کیا کیونکہ ڈبے کی حالت غیر دیکھ کر منشی صاحب کی اپنی حالت بھی غیر ہو چکی تھی۔ اندر سے سو سو روپے کے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے، لیکن زنگ نے انھیں دیمک کر طرح کھا لیا تھا۔ کھولنے پر وہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ منشی جی کو دمہ کا دورہ پڑا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ میری مدد کرتے کرتے انھیں خود میری مدد کی ضرورت پڑ گئی۔

میں نے زنگ خوردہ نوٹوں کے رول بمشکل کھولے۔ ہر نوٹ الگ الگ کیا۔ پھر ان نوٹوں کو لاہور لے آیا کہ شاید سٹیٹ بینک آف پاکستان سے تبدیل ہو سکیں۔ بینک افسر نے

بتایا کہ اس قدر خستہ نوٹ پشاور کے سٹیٹ بینک سے تبدیل ہوں گے۔ افسر کی ہدایت پر میں نے ہر نوٹ کو سلوفین کے کاغذ پر سلمٰی ستارے کی طرح جوڑنا شروع کیا۔ میری محنت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہر تعطیل کا دن میں ان پر صرف کرتا۔ ستمبر ۵۲ء سے ابتداء کر کے مارچ ۵۳ء میں ان کی ترتیب لگی پھر اس خیال سے کہ لگائی گئی ترتیب قابو میں رہے سلوفین کا ایک اور پرت شفاف غیر ملکی گوند سے اس پر چسپاں کیا جیسے آج کل لیمینیشن کی جاتی ہے۔ لاہور سٹیٹ بینک کے افسر نے ان پر بڑی سی مہر ثبت کی پھر میں نے نوٹوں کو سٹیٹ بینک پشاور بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا۔ ساتھ ایک درخواست میں ساری صورتحال بیان کی۔

۹۹۰ روپے کا منی آرڈر پشاور سے آیا تھا۔ لاہور اور بیگو والے سے ہوتا ہوا کالا پہنچا تھا۔ مردہ نوٹ ہی زندہ نہیں ہوئے تھے بلکہ اس منی آرڈر نے مجھے بھی حیات نو اور اعتماد بخشا تھا۔ میں نے فوراً مولوی منظور حسین کا قرض اتارا جو رقم بچی اس سے کئی اور کام لیے۔ من ہی من میں' میں اس غیبی امداد سے بہت خوش تھا۔ میں نے ایک مدرس کے ذریعے منشی فضل کریم صاحب کو رقم کی وصولی اور خرچ کر دینے کی اطلاع بھیجی تو پیامبر کے مطابق وہ سجدے میں گر گئے اور کہلا بھیجا کہ رقم نصف میری ہے باقی نصف جب کبھی ہو میں ان کو ادا کر دوں۔

میرے لیے یہ خبر اور تسکین کا باعث ہوئی کہ مولوی منظور حسین نے میری ادا کردہ قرضے کی رقم ماسٹر فتح دین کو دے دی تا کہ وہ اسکول فنڈ کے کھاتے درست کر لے۔ مولوی صاحب سے متاثر تو میں پہلے ہی تھا' لیکن اب اس کی عزت میری نظروں میں مزید بڑھ گئی۔ میں نے دل سے خدا کے حضور دعا کی کہ وہ مجھے بھی دوسروں کے کام آنے کی توفیق دے۔ یہ بیسویں صدی کا انصاری' انصار مدینہ کی روایات پر چل رہا تھا۔

میں نے منشی فضل کریم صاحب کا قرض ۱۹۵۵ء میں چکانے کے قابل ہوا۔ دمہ کے مرض کے باوجود منشی صاحب کا انتقال ۷۳ برس کی عمر میں ہوا۔ تب تک وہ اپنے دو بیٹوں کو پی۔ٹی۔سی کروانے کے بعد مدرس تعینات کرا چکے تھے۔ بیٹی کے ہاتھ بھی پیلے کر دیئے تھے۔ انھیں یا ان کی اولاد کو میری خدمات کی کبھی ضرورت نہ پڑی۔ ان کا احسان باقی ہے۔

بھائی کے قہرنامے کا یہ فقرہ اس کی وفات کے بعد بھی مجھے یاد آتا رہتا ہے کہ وہ کتا نہیں کہ دھتکارو تو دم دبا کر پیچھے ہٹ جائے اور چمکارو تو دم ہلاتا آ کر پاؤں پر لوٹنے لگے۔ بھائی تو باز و ہوتے ہیں میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا۔ میرا قصور یہی تھا کہ میں نے اسے پڑھنے کو کہا تھا

اور یہ حقیقت بتائی تھی کہ جب تک کوئی فرد روزی کمانے کے قابل نہیں ہوتا کوئی شخص اپنی بیٹی اس سے نہیں بیاہتا۔ میں تو خود کو ماں اور بھائیوں کے لئے ہی وقف سمجھتا تھا اور اب بھی دوسروں کے کام آتے رہنا ہی میرا ایمان ہے۔

منی آرڈر کے ذریعے ملنے والی رقم اور بھائی کا تلخ خط کئی دنوں تک خوشی اور غمی کا سنگم بنا رہا۔ میں نے خط ماں کو دکھایا تو اس نے مجھے بتائے بغیر بھائی کے نام اس کے ایک دوسرے دوست کی معرفت خط لکھا کہ اگر اس نے یہی رویہ رکھا جس کا اظہار اس نے اپنے خط میں کیا ہے اور جلدی گھر لوٹ کر نہیں آیا تو اسے 'بتری دھاریں' نہیں بخشے گی۔ میرا مشاہدہ ہے کہ ''بتری دھاریں'' نہ بخشنے کی دھمکی پنجابی معاشرے میں کارگر ثابت ہوتی ہے' اس سے مراد ''دودھ بخشنا'' ہے ہفتے بعد ہی بھائی پھٹے کپڑوں کا بکس اٹھائے اور بوسیدہ سا لباس پہنے واپس آ کر سب سے گلے مل کر رو رہا تھا اور ہر ایک سے معافی مانگ رہا تھا۔ وہاں وہ اینٹیں اٹھانے کا کام کرتا رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں کے رونے نے سارے منظر کو رقت آمیز بنا دیا۔

میں نے اس کی مناسب دلجوئی کی اور اسے اپنے ذاتی تجربے سے سبق سیکھنے کی فہمائش کی پھر اسے ٹائپ سیکھنے پر آمادہ کیا اور یاد دہانی کیلئے چچا فاروقی کو لاہور میں خط لکھا کہ بھائی کی ملازمت کا کہیں نہ کہیں بندوبست جلد فرمادیں۔ اگر ان کے اپنے دفتر کی ''میرٹ لسٹ'' پر اس کا نام دور ہے تو کسی اور پرائیویٹ کمپنی یا فرم میں اس کے روزگار کا بندوبست فرمادیں۔

◆◆◆◆◆

(۱۴)

امتحانی پرچوں کا تعاقب

اسکول کا کام معمول کے مطابق چل رہا تھا کہ مجھے گھمن اور ماسٹر فتح دین نے تجویز پیش کی آٹھویں جماعت کا امتحان دینے والوں کی تعلیمی حالت کا مجھے علم ہی ہے' بہتر ہوگا کہ ہم ان کے پرچہ جات کے پیچھے جائیں اور پرچے جانچنے والوں کی منت سماجت کریں' ہوسکتا ہے کچھ بہتر صورت نکل آئے۔ ان دنوں ورنیکلر فائنل کا امتحان پورے پنجاب کی سطح پر ہوتا تھا۔ جس کا اہتمام رجسٹرار محکمانہ امتحانات' محکمہ تعلیم' پنجاب کرتا تھا۔ امتحانی مراکز تحصیل کی سطح پر قائم کیے جاتے تھے۔ ہر مرکز کا ناظم اے۔ ڈی۔ آئی سکولز ہوتا تھا۔ وہ ہر پرچے کی جوابات کی کاپیاں مہر بند کر کے بذریعہ ڈاک یا بذریعہ ریل پارسل براہ راست ممتحنوں کو بھجواتا تھا۔ مراکز کے ناظم پوری رازداری سے کام لیتے تھے پھر بھی نائب ناظم' نگران' پوسٹ ماسٹر اور اسٹیشن ماسٹر صاحبان یہ بتا دیتے تھے کہ پرچہ جات کس کو کہاں بھیجے جا رہے ہیں۔' میرے پاس بھی ممتحنوں کی فہرست ماسٹر فتح دین لے کر آئے تھے۔ میرے لیے پرچوں کے پیچھے جانے کی بات بالکل نئی اور انوکھی تھی۔ فہرست بتا رہی تھی کہ محکمے نے پنجاب کے ایک کونے کے امتحانی مرکز کے پرچے دوسرے کونے میں بھیجنے کی پوری کوشش کی تھی تا کہ پرچے جانچنے والے ممتحنوں تک رسائی ممکن ہی نہ رہے۔ ان دنوں سیالکوٹ سے وہوا جانے کے لئے سارے پنجاب کا جغرافیہ دیکھنا پڑتا تھا۔

مجھے انگریزی کے پرچوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ پرچہ 'اے' ضلع ملتان کے ایک ہائی اسکول کے استاد کے پاس تھا جبکہ پرچہ 'بی' ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول سنگھوئی' ضلع جہلم کے پاس تھا۔ میں سنگھوئی کا نام پڑھتے ہی چونک کر رہ گیا۔ ایک بار پھر مزید مجھے ماضی میں لوٹنا پڑا جب میں قیام پاکستان کے فوراً بعد لاہور آیا تھا اور محکمہ بجلی میں میٹر کلرک تعینات ہوا تھا۔ مجھے قلعہ

لچھمن سنگھ راوی روڈ پر تاپ کور کا متروکہ مکان بطور سرکاری ملازم کے الاٹ ہوا تھا۔

اس مکان میں میرے ساتھ چند واقف کار اور نیم دوست بھی عارضی طور پر رہائش پذیر تھے۔ ان میں ایک نوجوان اشفاق بھی تھا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کس محکمے کا ملازم تھا۔ اس کا ایک دوست زردار خاں ہندوستانی فوج میں سپاہی تھا۔ وہ اپنی سرکاری رائفل سمیت ہندوستان سے بھاگ کر پیدل پاکستان پہنچا تھا اور اشفاق اسے عارضی قیام کے لیے میرے مکان میں لے آیا تھا۔ میں نے اس کی مہاجرت کے حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کیا، لیکن چند ہی دنوں بعد اس نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔

پہلے اس نے مسروقہ رائفل کسی کے ہاتھ بیچی۔ پھر اس نے کئی لوگوں کو سستی سائیکلیں مہیا کرنا شروع کر دیں۔ اکتوبر نومبر ۱۹۴۷ء میں نئی درآمدی ہرکولیس اور فلپس سائیکل نوے روپے میں عام دستیاب تھی۔ متروکہ جائدادوں سے چوری کردہ اور چوروں سے خریدی گئیں بے شمار اشیاء جگہ جگہ واقع کباڑ خانوں اور نیلام گھروں سے بہت سستی دستیاب تھیں۔ زردار خاں کا کہنا تھا کہ وہ میکلوڈ روڈ کے ایک نیلام گھر کے دروازے پر بیٹھتا ہے اور جو لوگ وہاں مختلف النوع مال بیچنے آتے ہیں، وہ ان سے سستے داموں سائیکل خرید لیتا ہے کیونکہ وہ سائیکل کے اچھے برے ہونے کی پہچان رکھتا ہے۔ تاہم چند دن بعد بھید کھلا کہ وہ سائیکل خریدتا نہیں بلکہ روزانہ ایک کے حساب سے سائیکل چراتا یا اٹھاتا ہے۔ میں نے بھی اس سے چمکدار بی۔ ایس۔ اے سائیکل پچیس روپے میں خریدی تھی جو اس نے میرے ہی دفتر کے سائیکل اسٹینڈ سے اٹھائی تھی۔ سائیکل ایک اے۔ ایس۔ آئی کے زیرِ استعمال تھی جو کئی دن سے بادامی باغ سے بھارت بلڈنگ آ رہا تھا۔ بادامی باغ کا تھانہ ایک متروکہ عمارت میں قائم کیا گیا تھا اور اس اے۔ ایس۔ آئی کو اس میں بجلی بحال کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ اتفاقات زندگی میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ نفسیات والے کہتے کہ اتفاقات دراصل ہمارے لاشعور ہی کا کارنامہ ہوتے ہیں اور وہ ہی اتفاقات کو تخلیق کر کے ہماری مدد کرتا ہے۔ اتفاق سے وہ اے۔ ایس۔ آئی میری سب ڈویژن کے میٹر انسپکٹر کے پاس آیا کرتا تھا، تھانہ بادامی باغ کا میٹر کلرک بھی میں تھا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ کل جب اے۔ ایس آئی دفتر آیا تھا تو اس وقت زردار خاں بھی وہاں موجود تھا اور اب یہ بھی اتفاق تھا کہ میں کل کی خریدی ہوئی سائیکل پر دفتر جا رہا تھا کہ اے۔ ایس۔ آئی بھی اچانک تیز تیز کوئی اور سائیکل چلاتا میرے قریب سے گزرا اور

پھر مجھے پہچان کر میرے ساتھ ساتھ میری رفتار سے چلنے لگا۔ پہلے تو اس نے میٹر انسپکٹر کے بارے میں گلہ شکوہ کیا' متعلقہ لائن سپرنٹنڈنٹ پر تنقید کی اور اچانک پوچھا:

''یہ سائیکل آپ نے کہاں سے لی ہے؟''

''نیلام گھر سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کب خریدی ہے؟''

''کل ہی خریدی ہے' پورے پچیس روپے نقد ادا کیے ہیں۔''

''کل ہی میری سائیکل چوری ہوئی ہے اور آپ مانیں یا نہ مانیں یہ سائیکل جس پر آپ سوار ہیں' یہ مجھے بارہ آنے اپنی سائیکل معلوم ہوتی ہے۔''

بڑی عجیب بات ہے کہ پولیس تھانیدار کی سائیکل چوری ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

جب وہ مزید کچھ نہ بولا تو میں نے از خود کہا ''مگر یہ آپ کو سولہ آنے اپنی کیوں معلوم نہیں ہو رہی؟''

''یہ کوئی عجیب بات نہیں' چوروں کو بھی مور پڑ جاتے ہیں۔ تھانے میں بہت سی سائیکلیں پڑی ہیں جو متروکہ مکانات سے اُچکوں نے اٹھائی تھیں۔ ان سے پولیس نے برآمد کیں اور اب ہم ہر اچھی سائیکل اپنے استعمال میں لا رہے ہیں۔ خریدی ہوتی تو مجھے پوری شناخت ہوتی۔ اسی لیے آپ کی سائیکل کو بارہ آنے اپنی سمجھ رہا ہوں۔ ویسے آپ نے خواہ مخواہ پچیس روپے ضائع کیے۔ ادھر تھانے میں آ جاتے' میں آپ کو سپرداری پر اچھی سی سائیکل دے دیتا۔''

بعد ازاں وہ تھانے کی بجلی کی بحالی کی بات کرتا رہا اور میں افسوس کرتا رہا کہ مجھے ایسی سائیکل مفت میں مل سکتی تھی' لیکن اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ مجھے زردار خاں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ اشفاق اور زردار خاں کی باتوں سے مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ ضلع جہلم کے سنگھوئی نامی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کے والد کا نام شہباز خاں ہے۔ میں نے چپکے سے تین پیسے والا خط شہباز خاں والد زردار خاں بمقام سنگھوئی ضلع جہلم لکھا کہ زردار خاں فلاں جگہ لاہور میں مقیم ہے۔ ساتھ ہی میں نے دوستوں سے کہا کہ میں اپنے بھائیوں اور والدہ کو لاہور لا رہا ہوں' لہٰذا وہ اپنا اپنا ٹھکانہ کر لیں۔ سب نے کہا وہ دو چار روز میں ایسا کر لیں گے۔ زردار خاں کا والد شہباز خاں بھی میرا خط ملتے ہی فوراً میرے گھر آ پہنچا۔ وہ بڑا پریشان تھا اور اپنے بیٹے رزدار خاں کی زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ رو رو کر

بیٹے سے مل چکنے کے بعد اس نے بیٹے سے پوچھا کہ اس نے اپنے زندہ ہونے اور لاہور پہنچنے کی اطلاع گھر والوں کو کیوں نہیں دی۔ اپنے باپ کو اس نے یہ بتایا کہ وہ فوج سے بھاگ کر چھپتے چھپاتے خستہ حال ادھر پہنچا تھا اور اب وہ لاہور میں محنت مزدوری کی خاطر رک گیا تھا تا کہ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے لئے کچھ تو لے کر جائے۔ بھارت سے تو وہ اپنی تنخواہ بھی نہیں لا سکا۔ بہر کیف تیسرے دن وہ اپنے والد کے ساتھ اپنے گاؤں چلا گیا۔ اسے آخری لمحے تک یہ معلوم نہ ہوا کہ اس کے باپ کو اطلاع دینے والا میں تھا۔

باپ نے بیٹے کے جذبے کی تعریف کی اور بتایا کہ اس کے بارے میں سب عزیز بے حد پریشان تھے' اس نے تو کسی کو خط بھی نہیں لکھا۔ بیٹے کو لے جاتے وقت شہباز خاں نے اپنی زبان میں میری میزبانی کی بڑی تعریف کی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ان سے ملتا رہوں گا اور سنگھوئی میں ان کا مہمان بنوں گا۔ زردار خاں نے بھی کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ چھ سال بعد زردار خاں اور شہباز خاں سے سنگھوئی میں جا کر ملاقات کرنے کا کیسا اتفاق ہوا تھا۔

☆☆

جہلم شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر مغرب میں ایک پہاڑی نالے کے کنارے پر سنگھوئی ایک قصبہ نما بستی ہے۔ مجھے اور نواز گھمن کو عصر کا وقت جہلم ہی میں ہو گیا تھا۔ پوچھتے پوچھتے ہم اس اڈے پر پہنچے جہاں سے سنگھوئی کے لئے تانگے ملتے تھے۔ ہمیں ملنے والا تانگہ آخری تانگہ تھا۔ سفر کے دوران سواریوں نے ہمیں شہباز خاں کے متعلق بتایا کہ سردار شہباز خاں اچھا زمیندار ہے اور اس کا بیٹا زردار خاں ادھر جہلم چھاؤنی میں قیام پذیر ہے۔ چھوٹا بیٹا کالج میں پڑھتا ہے۔ سائیکل پر روزانہ سنگھوئی سے آتا جاتا ہے۔

اسکول اور ہیڈ ماسٹر کے متعلق پوچھنے پر پتہ چلا کہ ہیڈ ماسٹر بیچارا پردیسی ہے اور اسکول میں رہتا ہے۔ ایک تانگہ سوار ہمیں نالے کے ٹخنے ٹخنے رواں پانی میں سے گزار کر شہباز خاں کے مکان پر لے گیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ شہباز خاں اور اس کے بیٹے نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ایک کمرے میں چارپائیوں پر بٹھا کر پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کون ہوں اور میری اس کی ملاقات کہاں ہوئی تھی تو وہ چارپائی سے اٹھ کر میرے ساتھ بغلگیر ہوا۔ اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت سے اس کی دلی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے زردار خاں کی تین سال ہوئے شادی کر دی تھی اور وہ فوج میں حاضر ہو گیا

تھا۔ پہلے کوہاٹ پھر راولپنڈی رہا اور آج کل جہلم ہی میں ہے، ہفتے اتوار کو آتا ہے۔

ہم نے اسے کام بتایا تو بجائے سردار کے، اس کے چھوٹے بیٹے نے کہا ''آپ آرام کریں، کھانا کھائیں، سو جائیں، صبح ہیڈ ماسٹر اور پرچے ادھر ہی حاضر کر دیں گے۔'' نوجوان کے لہجے میں بے خوفی، جرأت اور اکھڑ پن تھا۔

''ہم نے سنا ہے کہ ہیڈ ماسٹر اسکول ہی میں رہتا ہے۔ ہم اس سے ابھی جا کر ملتے ہیں۔ کام ہمارا ہے، ہمیں ہی ملنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

شہباز خاں نے ہماری تائید کی اور اپنے بیٹے بہرام خاں سے کہا کہ جا کر ہیڈ ماسٹر کو بتا آئے کہ سردار شہباز کے مہمان اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور سردار نے کہا ہے ان کا کام جائز ہو یا ناجائز ضرور کرنا ہے۔ واپسی پیغام آیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے منتظر ہیں۔

کھانے سے قبل ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علیک سلیک، تعارف اور رسمی گفتگو کے بعد اپنا مدعا زبان پر لائے۔ انھوں نے بچوں کے رول نمبر پوچھے اور لالٹین اٹھا کر ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد آٹھوں پرچے لا کر ہمارے سامنے رکھ دیے اور کہا ''میں پرچے دیکھ چکا ہوں۔ آپ ان کو دیکھ لیں اور جہاں ممکن ہو خود ہی مزید نمبر دے لیں۔'' سوائے ایک لڑکے کے باقی فیل تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے انھیں جو دو چار نمبر دیئے تھے خیرات ہی میں دیے تھے۔ سوائے سرد آہ بھرنے کے میں کچھ کر سکا نہ گھمن۔

جب لازمی مضمون کی یہ حالت تھی تو باقی اختیاری مضامین کے پیچھے دوڑنا محض حماقت تھی۔ یہ فیصلہ میں نے اور گھمن نے کھانا کھانے اور چارپائیوں پر کروٹیں بدلتے ہوئے کیا۔ میرا پہلا سال ہی ناکامی سے دوچار ہو رہا تھا۔ معقول بہانے موجود ہونے کے باوجود میں افسردہ ہو گیا۔ نتیجہ آنے پر قرب و جوار کے مڈل اسکولوں کے ایس۔ وی اور جے۔ اے۔ وی ہیڈ ماسٹر صاحبان یہ کہنے میں کوئی تکلف نہ برتتے کہ دیکھو جی! کالا کے بی۔ اے، بی۔ ٹی ہیڈ ماسٹر نے انگریزی کا خصوصی اور دیگر مضامین کا عمومی نتیجہ کیا دکھایا ہے؟ مجھے اپنی بدنامی کا اندیشہ تھا۔ نتیجہ بارہ فیصد تھا جو سرکاری طور پر مئی ۵۳ء کے وسط تک سامنے آنے والا تھا۔ متوقع ناکامی کا آسیب مجھے اکثر پریشان رکھتا۔

☆☆

انھیں دنوں نواز گھمن کا سب سے بڑا بھائی عبیداللہ چودھری واہ کینٹ سے ریٹائرمنٹ لے کر گاؤں آیا۔ اس کی اہلیت کے متعلق میں پہلے بھی کافی کچھ سن چکا تھا۔ اب وہ میرے ساتھ

اٹھ بیٹھ رہا تھا۔ وہ میٹرک پاس تھا لیکن اخبار ''پاکستان ٹائمز'' پڑھتا تھا۔ انگریزی فرفر بولتا تھا۔ اسے حالات حاضرہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ وہ اکثر موضوعات پر میرے ساتھ گفتگو کرتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بات چیت میں اس کے برابر نہیں تھا۔ طبعاً بھی میں مقرر نہیں ہوں۔ لکھ کر میں شاید اپنا مافی الضمیر زیادہ وضاحت سے بیان کر سکتا ہوں۔ مکالمے میں تو اب بھی کمزور ہوں۔ کئی باتوں کا معقول اور موزوں جواب مجھے وقت گزر جانے کے بعد ہی سوجھتا ہے۔ موقع گزر جائے تو پھر تیر بھی تکا بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری عمر الفاظ لکھتے گزری ہے لیکن لفظ 'لفظ کے معانی (پھینکنا) مجھے اڑسٹھویں سال میں معلوم ہوئے۔ خیر مجھے موصوف عبیداللہ نے خوب خوب تول لیا تھا۔ اس نے مجھے سرے انگلستان سے شائع ہونے والے رسالے ''اسلامک ریویو'' کے کچھ شمارے مطالعے کے لیے دیے اور کہا کہ مندرجات پر گفتگو بعد میں ہو گی۔ میں نے ان رسائل میں سے ''میں نے اسلام کیوں قبول کیا'' کے سلسلے کا زیادہ مطالعہ کیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد عبیداللہ ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے مرکزی دفتر میں سینئر کلرک بھرتی ہو گیا۔ اب وہ میرے ساتھ اور بھی زیادہ اعتماد کے ساتھ ہمکلام ہوتا۔ کبھی کبھی وہ تعلیم کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتا۔ اس کی گفتگو اخلاقی کم اور قانونی زیادہ ہو جاتی۔ اس کے بھائی بھی اس کے بارے میں کچھ ایسا پروپیگنڈہ کر رہے تھے جیسے وہ بورڈ کا کلرک نہ ہو ممبر ہو۔ وہ لوگوں کے ساتھ چھوٹی بڑی کچہریوں میں ان کا کام کرانے کے لئے آتا جاتا اور ایک سیاسی مغ بچے کا کردار ادا کرتا۔ اس کی اپنی گھمن برادری کے کچھ نوجوان البتہ اس کے سماجی کارکن بننے کو ڈھونگ قرار دیتے تھے اور اس کے خلاف بھی بولتے تھے۔

میرے ساتھ سکول، کھیل، سیاست کی باتیں کرتے کرتے وہ کچھ مذہبی رواداری، اخلاقی اقدار، اطمینان قلب اور خدمت الناس کی باتوں تک بھی آ جاتا۔ کبھی کبھی میرے کردار و عمل کو موضوع بنا لیتا۔ کبھی انسانی فطرت کی ڈگمگاہٹ اور فیصلے کرنے کی خام قوتوں پر بحث کرتا۔ کبھی اسلام میں فرقہ بندی اور نفس امارہ کو سدھارنے کی تحریکوں کا ذکر کرتا۔ مجھے بھی اپنے مطالعے پر کچھ اعتماد تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی گفتگو میں گیرائی اور گہرائی کا احساس ہوتا۔ جیسے وہ میٹرک نہیں یونیورسٹی کی آخری جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔ مرعوبیت کے احساس تلے میں اب خود اپنے کردار و عمل میں بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ مبادا عبیداللہ کہیں مجھ پر کھلم کھلا حرف گیری نہ کرنے لگے۔

☆☆

کوئی دو ماہ کا عرصہ گزرا ہوگا کہ نواز گھمن علی الصباح ہی اپنی جماعت کا تدریسی کا کام چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھا اور اس نے پوچھا ''بھائی عبیداللہ آپ سے خاصی گوٹھ رکھتا تھا۔اس نے آپ کو کوئی دعوت تو نہیں دی؟''

''کیسی دعوت؟ کیا وہ وہ کوئی تقریب منعقد کر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جی' آج کل وہ دعوت ایمان دے رہا ہے۔''

''کھل کر بات کرو یار' میں نہیں سمجھا۔''

''بھائی عبیداللہ قادیانی ہو چکا ہے۔جب دو ماہ پیشتر وہ گھر آیا تھا تو اس سے پہلے مرتد ہو چکا تھا۔اب اس نے ماں باپ' بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کو بھی ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔کل سے گاؤں میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ابا جان نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔''

وہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں کیا کیا کچھ سوچتا رہا کہ عبیداللہ کے بحث مباحثے اور سرے کا ''اسلامک ریویو'' اور اس کے بلند کرداری کے مظاہرے سارے تبلیغی مشن کی دعوت ہی لیے ہوئے تھے پورے گاؤں میں اس کا کوئی ہم نوا نہ رہا تھا۔ بیوی بچوں نے بھی اس کی دعوت ایمان کو قبول نہیں کیا تھا لہٰذا وہ یکا یک منظر سے غائب ہو گیا۔نواز کا خیال تھا کہ وہ اس مہربان کے پاس چلا گیا ہے جس نے اسے ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں ملازم کرایا تھا۔ بورڈ کا سیکرٹری پاکستانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ کا رشتہ دار تھا۔

میں جو مان لینے' دوسروں پر بھروسہ کر لینے اور دوسروں کی ظاہری محبت کا جواب بھی دلی خلوص اور محبت سے دینے والا تھا ایک شاطر مبلغ سے قدرت کی مہربانی سے بچ گیا تھا ورنہ وہ دلائل کے جس سمندر میں مجھے بہائے لیے چلا جا رہا تھا۔اس کی لہروں کے مقابلے میں میری حیثیت پرِ کاہ تھی۔

☆☆

نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا۔مدرسین میری راہنمائی میں باقاعدگی سے تدریسی کام کر رہے تھے۔میں سلیبس کے مطابق ان کے کام کی پڑتال کرتا۔نگرانی کی ڈائری میں اپنے تاثرات درج کرتا۔مدرسین کو آمادۂ کار رکھنے کے لئے میں خود بھی اپنے تدریسی کام کی ڈائری لکھتا اور بعض اوقات مدرسین سے بھی کہتا کہ وہ چھٹی اور ساتویں جماعت میں اپنی استطاعت کے مطابق میری تدریس انگریزی کا جائزہ لیں۔اپنی تدریس کے جائزے کے

لئے میں نے ایک ہائی اسکول کے انگریزی مدرس اور ایک تجربہ کار جے۔ اے۔ وی ہیڈ ماسٹر کو بھی اپنے اسکول آنے کی باری باری دعوت دی۔ ان کے بے لاگ تبصرے کی روشنی میں طالب علموں کی بہتری کے لیے ہر ممکن اقدام کیا۔

ان کی رائے گو میری ذاتی رائے سے مطابقت نہ رکھتی تھی لیکن امتحانی نکتہ نظر سے کہ دیہاتی سکولوں میں انگریزی کی تدریس کے بارے میں ان کا نچوڑ یہ ہے کہ ننانوے فیصد بچے انگریزی کے افعال کا استعمال درست طور پر کبھی نہیں سیکھ سکتے۔ تھوڑی سی محنت سے وہ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑے سے واحد جمع' مذکر مونث' مترادف اور متضاد الفاظ کے ساتھ اگر ان کو دس مضمون' دس کہانیاں' پانچ خط اور پانچ درخواستیں رٹا دی جائیں اور رٹائی بھی' مولا بخش' کی مدد سے کی جائے تو بچے کبھی مڈل کے امتحان میں فیل نہیں ہوتے اور یہ سب کچھ سکھانے کے لئے چھٹی' ساتویں اور آٹھویں کے تین سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔

اس بات پر بھی اکثر مدرسین سے تبادلہ خیالات ہوتا کہ قیام پاکستان سے پہلے مڈل کے امتحان کے پرچہ جات ٹیکسٹ بک بورڈ کے منظور کردہ ہر مضمون کی واحد کتاب سے نہیں آتے تھے بلکہ مضمون میں واقعی صحیح درک پیدا کی جاتی تھی۔ عبداللہ صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل سکول ساہووالہ تو مروجہ نصاب کو پاکستانی عوام کے خلاف سازش قرار دیتے تھے۔ ان کی بات کا وزن آج بھی قائم ہے کہ وطن عزیز پاکستان کے ارباب حکومت نے تعلیم پر کافی ظلم کیا ہے کہ اب تک شرح خواندگی ۲۳ فیصد ہے اور خواندگی کی تعریف صرف کسی شخص کا اپنے دستخط کر لینا ہے۔

میں جب کسی جماعت کی تعلیمی رفتار کا جائزہ لیتا' تو اپنی رائے اور جائزے میں کئے جانے والے اقدامات بھی اپنی نگرانی کی ڈائری میں درج کرتا۔ ایک غیر تربیت یافتہ مدرس غلام علی انصاری برادری سے تھے۔ ابھی نوجوان ہی تھے' لیکن کسی بیماری کی وجہ سے بوڑھے نظر آتے تھے۔ سب انھیں بابا جی کہتے تھے مصنوعی بڑھاپے کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بڑے پریشان رہتے تھے۔ میٹرک ان ٹرینڈ ٹیچر تھے۔ میں نے ان کی جماعت دوئم کا جائزہ لیا اور نگرانی کی ڈائری میں لکھا کہ ماسٹر صاحب ذرا چوکس ہوں' تجربہ کار ''بوڑھا مدرس'' ہونے کے باوجود ان کی جماعت کی ترقی کی رفتار انتہائی غیر معیاری ہے۔ کم از کم وہ اسکول کے اوقات میں تو شادی کے بارے میں نہ سوچا کریں۔ یہ مزاحیہ سی تنبیہ تھی۔

ماسٹر صاحب نے پڑھ کر نگرانی کی ڈائری میں اطلاع یابی کے کالم میں دستخط کرنے سے

انکار کر دیا۔ میں نے نگرانی کی ڈائری الماری میں رکھ دی۔ مدرسین کو پتہ چل گیا کہ ماسٹر غلام علی نے کیا حرکت کی، لیکن فوری طور پر انھوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وقفہ کے دوران جب وہ اکھٹے ہوئے تو بقول ماسٹر فتح دین سب کی متفقہ رائے تھی کہ ہیڈ ماسٹر سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے کام کا جائزہ تو بے شک لیں، زبانی کلامی جس قدر سرزنش چاہئیں کریں، لیکن نگرانی کی ڈائری میں اندراجات سے ہمارے خلاف دستاویزی ثبوت تیار نہ کریں۔

ماسٹر فتح دین نے مجھے یہ بات رازدارانہ انداز میں بتائی۔ لیکن میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا تربیت کے دوران انھوں نے مدرسین کے فرائض اور صدر معلم کے فرائض کے بارے میں نہیں پڑھا تھا کہ مدرسین ہفتہ وار اسباق کی ڈائری لکھیں گے جبکہ صدر معلم نگرانی کی ڈائری کے علاوہ اپنے تدریسی کام کے بارے میں بھی مدرسین کی طرح ڈائری لکھنے کا پابند ہوگا۔ جب میں ڈائری لکھتا ہوں تو مدرسین کیوں نہ لکھیں۔ غالباً میری یہ فہمائش ماسٹر فتح دین نے باقی مدرسین کے گوش گزار بھی کر دی اس لیے کسی نے میرے ساتھ اس سلسلے میں بات نہیں کی۔ در پردہ ان کی ہمدردیاں غلام علی کے ساتھ تھیں۔

میں نے ماسٹر غلام علی سے بھی کسی قسم کی جواب طلبی نہیں کی۔ وہ پہلے ہی الجھا ہوا تھا، میں اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً میری خاموشی کے بارے میں بھی مدرسین میں باہم کچھ تبادلۂ خیال ہوا ہوگا۔ تیسرے روز ماسٹر فتح دین نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ ماسٹر غلام علی کہتا ہے کہ اگر ہیڈ ماسٹر نے اس کے خلاف کوئی رپورٹ کی تو وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سے ملاقات کر کے بتائے گا کہ ہیڈ ماسٹر اس کے کام میں تو کیڑے نکال رہا ہے، لیکن مائی بھنگن کے بیٹے کے فیل ہونے کے بارے میں اے۔ ڈی۔ آئی صاحب نے جس تحقیق کا حکم دیا تھا اس کے بارے میں ہیڈ ماسٹر نے کچھ نہیں کیا، تو کیوں نہیں کیا؟ پھر گلو کو پاس بھی کروا دیا، کس طرح؟

غصے کی لہر میرے رگ وپے میں دوڑ گئی، لیکن میں نے کوسک کوہ پیاؤں کے اس اصول کو یاد کیا کہ تھوڑی سی برداشت اور...... یہ قول اسکول کی تزئین کے دوران میں نے برآمدے میں لکھوایا تھا۔ میں نے الٹا ماسٹر فتح دین سے کہا کہ وہ مجھے ایسی باتیں کیوں بتاتے ہیں جو مجھے نواز گھمن یا مولوی منظور حسین بتانے کی جرأت نہیں کرتے۔ کیا اسے میرے واپس آنے کا دکھ ہے کہ میرے واپس آنے سے اس کی ہیڈ ماسٹری چھن گئی ہے، کیا وہ مجھے سکول کے عملے سے لڑانے کی کوشش کر رہا ہے؟ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆

گلو کا قصہ یہ تھا کہ اس کی ماں اسکول کی پرانی خاکروبہ تھی۔ وہ اسکول کے کمروں میں کبھی کبھی جھاڑو لگاتی تھی۔ پانچ روپے ماہوار پر وہ ہر روز سکول آ سکتی تھی نہ پورے سکول کی صفائی کر سکتی تھی، باتونی بھی بہت تھی۔ جب تک جھاڑو لگاتی رہتی، کوئی سنے نہ سنے وہ گاؤں کی خاص خاص باتیں اور مدرسین کے گھریلو حالات، گاؤں کے کسی جعلی چودھری کی چودھراہٹ اور اپنی تنخواہ پر تقریر کیے جاتی۔ سب جانتے تھے کہ اگر کسی نے اس کی بات کا جواب دے دیا یا اس کی گفتگو میں ہوں، ہاں کر دی تو پھر مائی خاکروبہ اس کی دو چار گھنٹے جان نہیں چھوڑے گی۔

سالانہ معائنے کے دوران اے۔ ڈی۔ آئی کلیم صاحب نے مائی بھنگن کے لڑکے گلو کو کوئی نظم سنانے کو کہا تو وہ کھڑا ہو گیا، لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ کلیم صاحب نے اس سے کتاب سننا چاہی تو بھی وہ خاموش کھڑا رہا۔ الغرض اس سے جو کچھ بھی پوچھا گیا، زمین جنبد نہ جنبد گل محمد والی بات رہی۔ وہ مسلسل اسکول کی عمارت کو گھورتا رہا۔ اب کلیم صاحب نے انچارج مدرس سے پوچھا کہ کیا یہ لڑکا گونگا ہے یا بہرہ ہے، کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتا! یہ جماعت پنجم میں کیسے پہنچ گیا ہے؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ جواب میں انھیں یہ بتایا گیا کہ وہ اسکول کی خاکروبہ کا لڑکا ہے اور رعایتی پاس ہوتا رہا ہے۔

''سخت نالائق لڑکا ہے'' کلیم صاحب نے کہا اور آگے بڑھنے لگے، تو گلو بول اٹھا ''جی مجھے نالائق ماسٹر نواز نے بنایا ہے۔ میں پہلی جماعت ہی سے ان کے گھر میں کام کرتا رہا ہوں۔ یہ مجھے کہتے تھے کہ بھنگی کے پتر نے بھنگی ہی رہنا ہے، پڑھ لکھ کر نمبردار نہیں بننا۔ چل گھر جا کر فلاں کام کر، میں تیری حاضری لگا دوں گا اور پاس بھی کروا دوں گا۔ چوتھی جماعت میں ایک گھمن سے جان چھوٹی تو دوسرے گھمن کے ہاتھ چڑھ گیا۔ ماسٹر نواز کے گھر والوں نے جو کچھ سکھایا تھا وہ اب ماسٹر نذیر کے گھر کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے چوتھی جماعت سے پاس کر دیا۔ اب کہتے ہیں سنٹر کے امتحان سے بھی تجھے پاس کرا دیں گے، مگر سو روپیہ لگے گا۔''

اے۔ ڈی۔ آئی بھی خاموشی سے لڑکے کو بولتے سن رہے تھے جس نے کبھی بات نہیں کی تھی اور جو زمین سے نظر نہیں اٹھاتا تھا۔ اے۔ ڈی۔ آئی صاحب نے پوچھا ''کیا تم نے سو روپیہ دے دیا ہے۔''

''میری ماں کہتی ہے کہ وہ سو روپیہ کی جگہ میرے فیل ہونے پر تمام ماسٹروں اور گھمنوں

کا سیاپا کرے گی۔"

گلو کی اس بات پر اے۔ڈی۔آئی نے مجھے کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب! اس لڑکے کی زندگی برباد ہو گئی اور یہ بربادی لانے والے مدرسین ہیں۔ اس امر کی تحقیق کریں اور رپورٹ کریں۔" اسی واقعے کا حوالہ ماسٹر غلام علی نے دیا تھا۔ یہ دوسری سرسری باتوں کی طرح ایک سرسری بات تھی۔ گو واقعی یہ توجہ دینے کا معاملہ تھا' لیکن ایسا کرتا کون؟ (ہر مضمون میں صفر نمبر لینے کے باوجود اے۔ڈی۔آئی صاحب ہی سے گلو کو پاس کروایا گیا کہ میں اس نالائق لڑکے سے اسکول کی جان چھڑانا چاہتا تھا اور اساتذہ اس کی ماں کے واویلے سے ڈرتے تھے)

☆☆

میں اپنا کام اپنی دانست میں ایمانداری سے کر رہا تھا۔ میں نے اپنی "تعلیقات" کی پوتھی کو کھولا اور یہ سبق دہرایا کہ ضمیر کو صحت مند رکھنے کے لیے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہو' تو تمہارے اندر ایسی روحانی بالیدگی پیدا ہو گی کہ تم دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گے۔ میں اندر سے کتنا بھی کھوکھلا تھا تاہم دیہی معاشرے میں میرا ایک مقام تھا۔ اس معاشرے کے اڑھائی سو بچے ہر وقت مجھ پر نظریں جمائے رکھتے اور میرا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ مدرسین بھی مجھے ظاہری سہی مگر عزت دیتے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جو آتے جاتے مجھے سلام کرتے اور میرے ساتھ بات کر کے فخر محسوس کرتے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کسی سے تعرض نہیں برتوں گا۔ ماسٹر غلام علی کو میں نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ انھیں دنوں مولوی منظور حسین نے مجھے بتایا کہ ماسٹر فتح دین نے اس کا قرضہ واپس کر دیا ہے۔ وہ اپنی فریاد لے کر کلیم صاحب کے بڑے بھائی طفیل ہوشیار پوری سے ملا تھا اور انھوں نے اسی وقت جتنے روپے ماسٹر فتح دین نے بتائے' اسے ادا کر دیے۔ اس سے بھی حیران کن خبر یہ دی کہ "باباجی" کی شادی ہو رہی ہے' آئندہ اتوار کو بارات ہے۔ مجھے بھی بارات اور ولیمہ میں شامل ہونے کی خصوصی دعوت ہے۔

ماسٹر غلام علی کا گھر آہڈ انگور میں تھا۔ میں بھی اس کی شادی میں شریک ہوا۔ میں نے اسے اس کے عزیز و اقارب اور سب دوستوں سے بڑھ کر سو روپیہ سلامی دی' تو اس نے سہرے کی لڑیوں کو ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور نمی تھی۔ بارات اس کے سسرال پہنچی۔ اس کے سسرال والوں نے بھی میری خاصی عزت افزائی کی۔ بار بار پوچھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، میں آرام کرنا تو نہیں چاہ رہا وغیرہ وغیرہ۔ بارات سے فارغ ہو کر میں نے دولھا میاں سے گھر جانے کی اجازت لینا ضروری سمجھا۔ وہ عزیز و اقارب میں گھرا بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور

اسے کہا ''اچھا بھائی غلام علی! یہاں سے شہر نزدیک ہے مجھے اجازت دو، تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔خوش رہو اور جتنے دن چاہے چھٹی کرو۔'' ذرا توقف کے بعد کہا ''اپنی صحت کا بھی خیال رکھنا۔''

اب جواب میں اس نے جو کہا وہ میرا قلم صحیح لکھ سکے تو بڑی بات ہوگی۔ اس نے سر پر سے گلے دار مشہدی لنگی سہروں سمیت اتاری' اس کا شملہ نیچے کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے بولا ''افسر مائی باپ ہوتے ہیں۔ میری پگڑی، ہاتھوں اور آنکھوں کو دیکھئے یہ میرے دل کی ترجمانی کر رہے ہیں۔''

میں نے اس کی پگڑی اس کے سر پر درست کر کے رکھی' اسے گلے سے لگایا۔ وہ بلک بلک کر میرے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑا۔ میں نے اسے تھپکی دی اور کہا ''میری وجہ سے تمہارا دل دکھا' مجھے معاف کر دو۔'' سوائے مدرسین کے کوئی نہ سمجھ سکا کہ کیا بات ہے۔ تھا بھی یہ پیار کا منظر، کوئی کیا سمجھتا!

☆☆

تعطیلات موسم گرما آئیں اور گزر گئیں۔ مولوی منظور حسین کو مقامی ہونے کی وجہ سے سرکاری ڈاک وغیرہ کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ تعطیلات کے دوران دو مرتبہ میرے پاس آئے۔ برسات کا موسم خوب رہا تھا' ہلکا سا سیلاب بھی آیا تھا۔ تعطیلات کے دوران مجھے ماسٹر فتح دین نے بھلی خاندان کی ایک لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے کہا تھا۔ تیس روپے ماہوار پر، یہ میٹرک کی انگریزی اور ریاضی کی پہلی ٹیوشن تھی جو میں نے ملازمت کے بعد پڑھانا شروع کی۔ اس لڑکی کی وجہ سے مجھے اس کے ننھیال کے چھ بچوں کی ٹیوشن بھی سو روپیہ ماہوار پر مل گئی۔ ملک عبدالغنی نے جب یہ دیکھا کہ میں صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتا ہوں اور دس بجے لوٹتا ہوں تو اس نے استفسار کیا کہ میں کہاں جاتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں ایبٹ روڈ پر ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں۔ ایبٹ روڈ رنگ پورہ روڈ سے کم از کم میل بھر کا فاصلہ ہے۔ اس نے کہا ''بھا جی مجھے تو کشمیر سرجیکل والوں' راجہ سپورٹس والوں اور چمڑے کے سوداگر کبیر علی نے کئی بار پوچھا ہے کہ تمہارے گھر پر جس بی۔ اے، بی۔ ٹی کی تختی لگی ہے کیا وہ ہمارے بچوں کو پڑھا دیا کرے گا' تو میں نے تو ان سے یہی کہا ہے کہ وہ ہیڈ ماسٹر ہے اور ہیڈ ماسٹر تو ٹیوشن نہیں پڑھاتے۔''

اس انکشاف پر میں دل کے بجائے پہلو میں ادھڑنے والا کھدور کھنے والے شخص کو کیا کہہ سکتا تھا۔ معقول الفاظ میں یہی کہا کہ تم نے جس طرح اپنے رزق پر لات مار رکھی ہے اسی طرح میرے رزق پر بھی لات مار دی ہے۔ اسی شام وہ کشمیر سرجیکل کے مالک کو میرے پاس

لے آیا۔ اس کے تین بچے تھے جو کانووینٹ میں ابتدائی جماعتوں میں تھے۔ اس نے خود ہی مجھے ان بچوں کو ڈیڑھ گھنٹہ پڑھانے کی فیس دوصد روپے پیش کی اور یہ بھی کہا کہ ٹیوشن مسلسل چلے گی۔ میں نے اسی شام بچوں سے ملاقات کی اور ان سے تدریس کا وقت مغرب اور عشاء کے درمیان طے کیا۔ وہ صبح کا وقت مانگتے تھے' لیکن میں نے مجبوری ظاہر کر دی کہ میں جن بچوں کو صبح پڑھا رہا ہوں' ان سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ میں تعطیلات کے دوران انھیں پڑھانے کا اخلاقی طور پر پابند بھی تھا۔ ان سے معاہدہ ہی اس قسم کا تھا۔

بعد ازاں مجھے احساس ہوا کہ سیالکوٹ پانچویں دہائی میں بھی اساتذہ کے لیے بڑی کھلی آغوش رکھتا تھا۔ میں ایک معروف ترین کاروباری مدرس بن گیا۔ بورڈ کی ملازمت آمدنی کے حوالے سے ہیچ نظر آنے لگی۔ تعطیلاتِ موسم گرما کے بعد میں اپنی نئی سائیکل پر قیمتی نئے کپڑے، جوتے اور گھڑی پہن کر اسکول پہنچا تو اساتذہ تو اساتذہ طلبہ نے بھی مجھے قدرے حیرت سے دیکھا۔ دوسروں کی بات چھوڑیئے، میں خود بڑا پُر اعتماد تھا۔ میرے قرضے اتر رہے تھے اور اپنی ذات کے علاوہ گھر کی مجموعی حالت بھی کینچلی بدل رہی تھی۔

تعطیلات کے بعد اسکول پہنچتے ہی دو اندوہناک خبریں سننے کو ملیں۔ ماسٹر غلام علی کا اسکول کھلنے سے تین روز قبل انتقال ہو گیا تھا۔ بقول مولوی منظور حسین اسے شادی ''لڑ'' گئی تھی۔ سوائے افسوس اور فاتحہ خوانی کے مرنے والے کے حق میں زندہ رہ جانے والے کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم نے بھی یہی کچھ کیا۔ دوسرا سانحہ جماعت ہشتم کے ایک جواں سال طالب علم احمد سائیں کی الم ناک موت تھی۔ دوسرے کئی غریب لڑکوں کی طرح وہ بھی تعطیلات کے دوران مرالہ راوی نہر کی کھدائی میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ نہ جانے کیسے مٹی ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینکنے والی کرین کی کدال کی زد میں آ گیا کہ چوٹ لگتے ہی دم توڑ گیا۔

ہم اساتذہ نے اسمبلی میں طلبہ کے ساتھ مل کر دونوں مرحومین کے لیے فاتحہ خوانی کی۔ اگلے روز قرآن خوانی کا پروگرام بنایا' اسکول بند کر دیا گیا۔ باقاعدہ آرڈر بک میں سب کچھ درج کیا گیا۔ ہم پہلے سائیں کے والدین کے پاس گئے اور تعزیت کی۔ پھر ہم آہڈ انگور ماسٹر غلام علی کے گھر گئے۔ اف خدایا! اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے علاوہ بیوی کے بین سن کر کلیجہ منہ کو آتا رہا۔ اس کا باپ دیر تک میرے گلے لگ کر روتا رہا۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ وہ بتاتا رہا کہ غلام علی میرا ذکر بڑے احترام سے کرتا تھا۔ وہ پرانی بیماری کی وجہ سے اکھڑا اکھڑا رہتا تھا' لیکن اسے یہ احساس

شدت سے رہا تھا کہ اس نے میرے سرکاری نوعیت کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی اور میں اس کی بیماری کے باوجود اس سے نبھاؤ کرتا رہا تھا۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ یہ غلام علی کی برخورداری تھی کہ وہ میرے متعلق اچھے جذبات رکھتا تھا حالانکہ میں نے اس پر کوئی خصوصی مہربانی نہیں کی اور نہ ہی میں کسی پر مہربانی کرنے کی استطاعت یا اختیار رکھتا تھا اور نہ اب رکھتا ہوں۔

☆☆

اب مجھے اسکول سے واپسی کی جلدی ہوتی۔ ایبٹ روڈ تک جانے کے میل بھر کے فاصلے سے ہونے والی ۱۳۰ روپے ماہوار آمدنی کے بجائے اب مجھے محلّہ دھار وال میں دو گھروں میں جا کر پڑھانے سے ساڑھے چار سو روپے مل رہے تھے۔ چھوٹے بچوں کی تدریس اور پچھلی پڑھائی میں اب میرا چھوٹا بھائی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ بھائی چونکہ طبیعت کا سخت تھا اس لیے بچے اس سے ڈرتے تھے، لیکن بچوں کے والدین کا خیال تھا کہ استاد اگر ذرا سخت گیر ہو تو تبھی بچے کچھ پڑھتے ہیں، لہٰذا وہ کامیاب جا رہا تھا۔ دوسرا بھائی چونکہ دھاروال محلے ہی کے بلدیہ کے اسکول میں معلم تھا، لہٰذا اس کی وجہ سے بھی ''بچوں کا ٹیوشن مرکز'' ایسا کامیاب ہوا کہ ہماری اوسطاً مجموعی ماہوار آمدنی ڈیڑھ ہزار روپیہ تک پہنچ گئی۔ چھوٹا بھائی اب کسی سے نہیں جھگڑتا تھا۔ سوچا جائے تو بیروزگاری، غربت اور خواہشات بھی بیماریاں ہی ہیں اور وہ انہی بیماریوں میں مبتلا تھا۔ غم کا بہترین علاج بھی مصروفیت ہی بتایا گیا ہے۔

اب میں مستقبل کے ''قریہ خواب'' کے بجائے ''شہرِ خواب'' میں رہنے لگا تھا۔

میں ایم اے کرنا چاہتا تھا۔ بوچھال کلاں سے بھاگ آنے کے باوجود مجھے ان دوستوں پر رشک آتا جو سرکاری ملازمت میں تھے۔ ان پر بھی رشک آتا تھا جو شہری اسکولوں میں تھے اور ''بیٹھکیاں'' (اپنے گھر میں ٹیوشن گروپوں میں پڑھانا) لگاتے تھے۔ اور خاصے خوشحال تھے۔ خوش حالی کے علاوہ ان کے موقع بہ موقع کام آنے والے لوگوں سے تعلقات بھی تھے۔

☆☆

کالا میں اب مجھے مقامی لوگ بھی پہچاننے لگے تھے۔ کیوروالی کالا کا ایک ضمنی گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں مڈل اسکول کی پہلی دو جماعتوں پر مشتمل برانچ تھی۔ برانچ اسکول کے قریب ہی ایک ریٹائرڈ ٹیچر چودھری غلام نبی بی اے ایس اے وی رہتے تھے۔ ان سے میرا تعارف محمد خاں کلیم نے کرایا تھا جب وہ سرسری معائنے کے لیے تشریف لائے تو ان کے ہاں ہم نے چائے پی تھی۔ ماسٹر

صاحب کے ایک صاحبزادے فوج کی ایجوکیشن کور میں کرنل تھے۔فوج میں جانے سے پہلے وہ اسلامیہ ہائی اسکول سمبڑیال میں انگریزی کے استاد رہے تھے۔ میں نے ان کے بیٹے کو تصویر سے شناخت کرلیا تھا۔ لائق استاد کے طور پر شناخت رکھتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو بیٹے پر بجا طور پر فخر تھا' زیادہ تر اسی کی باتیں کرتے تھے۔ اب جب کبھی وہ مجھے سرِ راہ ملتے تو میں سائیکل سے اتر کر احترام سے ان سے مصافحہ اور معانقہ کرتا۔ کبھی وہ مجھے بٹھا لیتے۔ لسی، دودھ اور چائے سے تواضع کرتے۔ اسی طرح وہاں کے پادری صاحب بھی بڑے شیریں زباں اور متواضع تھے۔ ان کی بیٹی شانتی بڑی اچھی چائے بناتی تھی۔ مجھے پادری صاحب کے گھر کی چائے بڑی پسند تھی جبکہ میرے اسکول کا عملہ میرے پادری کے گھر سے چائے پینے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی اطلاع (میرے اب تک جاسوس بن جانے والے) ماسٹر فتح دین نے دی۔ میں ایک روز دانستہ ماسٹر فتح دین کو بھی پادری صاحب کے ہاں لے گیا اور فہمائش کر کے چائے پی۔ پادری صاحب کو میں نے فہمائش کا پس منظر بھی بتایا تو پادری صاحب مسکرا دیے۔

ایک روز جب میں اسکول سے رخصت پر تھا' تو پادری صاحب میری غیر حاضری میں چائے کا ایک تھرماس لے کر "تبلیغی مشن" پر اسکول پہنچ گئے۔ اپنی تبلیغی زبان استعمال کر کے انھوں نے جملہ مدرسین کو چائے پلا ڈالی اور اگلے دن دانستہ میرا راستہ روک کر "اساتذہ کو مسلمان" کرنے کا واقعہ سنایا۔ میں بظاہر تو مسکراتا رہا' لیکن میں نے سوچا کہ اگر عیسائی پادری ہی مسلمانوں کو مسلمان کرنے لگے تو پھر مسلمانی کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ میں نے جاتے ہی مدرسین سے کہا کہ وہ اب عیسائی پادری کی چائے پی کر میری طرح عیسائی ہونے کے بجائے "مسلمان" کیوں کر ہوئے ہیں؟ سوائے شرمندگی کے ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولوی صاحب کچھ تاویلات اور پیچیدہ روایات سناتے رہے اور کھسیانے چہروں سے کہا کہ چائے واقعی پینے کے قابل تھی' پتہ نہیں چلا کہ اس میں الائچی کا مزہ تھا یا افیون کی لاگ' لیکن اس کے بعد میں کبھی بھی شانتی کے ہاتھ کی بنی چائے پینے نہیں گیا' حالانکہ پادری صاحب نے مجھے کئی بار دعوت بھی دی۔ مجھے اس کی "مسلمان" کرنے والی بات بری لگی تھی گویا اس نے کہا تھا کہ میں تمام مدرسین کو عیسائی بنا آیا ہوں۔

◆◆◆◆◆

(۱۵)

اونچے کردار کی میرزادی

سکول مڈل ہو یا ہائی، ہیڈ ماسٹر کے بعد سکول کی فعال، متحرک اور اہم شخصیت پی ٹی آئی ہوتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر عموماً پی ٹی آئی صاحبان ہی کے ذریعے غیر نصابی سرگرمیوں کو زندہ رکھتے ہیں۔ کالا کوئی بڑا اسکول نہیں تھا، لیکن پھر بھی نواز گھمن اسکول کے پی ٹی آئی کی طرح نمایاں شخصیت تھا۔ ایک دن نواز گھمن نے مجھے بڑے عجیب انداز میں کہا کہ ''وہ میرے قریب رہ کر اور دل کی باتیں کر کے کافی سکون محسوس کیا کرتا تھا اور اب چونکہ میں ''کماؤ پوت'' بن گیا تھا اس لیے کالا میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔ سکول کے اوقات کے بعد وہ دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ کوئی دوست یار ہی نہیں کہ دل کی بات کی جائے۔'' میں نے پوچھا کہ وہ دل کی بات بتائے تو سہی؟ اس نے کہا کہ میں پہلے ہی سے جانتا ہوں۔ میں نے تکا ہی لگایا کہ وہ میرزادی والی بات تو نہیں کر رہا اور یہ تکا تیر ہی ثابت ہوا۔

''ہاں! اسی کی بات کر رہا ہوں۔ پہلے تو وہ مجھے گھاس نہیں ڈالتی تھی کہ میں بھی لفنگے زمینداروں کی طرح محض اس سے آنکھ مچولی کھیلنا چاہتا ہوں۔ جب سے اس نے بھائی عبید اللہ کے متعلق ہمارا فیصلہ سنا ہے وہ ہمیں سچے اور پکے مسلمان سمجھنے لگی ہے۔ اس نے مجھے کہلا بھیجا ہے کہ اس کا باپ اس کی شادی جس جگہ کر رہا ہے اس کے متعلق بھی ایک مرتبہ افواہ اڑی تھی کہ وہ بھی مرزائی ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ جانتی ہے کہ وہ لچ لفنگ ہی ہے۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہی ہے۔''

''کس قسم کی مدد؟''

''یہی کہ میں اس سے نکاح کر لوں۔''

''تو پھر......''

''جہاں تک میرا تعلق ہے' میں تو تیار ہوں' لیکن چودھری کہلوانے والے میرزادی کو ایک داشتہ یا خادمہ کے طور پر تو قبول کر سکتے ہیں، بہو بنا کر نہیں لا سکتے۔ میں سخت ذہنی الجھن میں گرفتار ہوں۔''

''کیا تم دونوں کے درمیان اس موضوع پر بات چیت ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں سندر پور میں پیروں کے ہاں قوالیاں سننے گیا تھا۔ وہ وہاں اپنے ماموں کے گھر آئی ہوئی تھی۔ ایک لڑکی کے ذریعے اس نے مجھے پنڈال سے ایک طرف بلا کر کہا کہ 'چودھری نواز، تو مجھ سے محبت کرتا ہے نا۔' میں نے جواب دیا کہ بہت' تو اس نے کہا کہ 'مرد بن، میرے ساتھ نکاح کر لے یا پھر محمود پور میں ہونے والی میری شادی رکوا دے۔''

دیہاتی معاشروں میں میرزادیوں کی حیثیت بہت ہی پست ہوا کرتی تھی۔ مجھے برادریوں کے تفاوت کا شعور تھا؛ چنانچہ میں نے نواز گھمن سے کہا کہ ''رات بھر وہ بھی سوچے اور میں بھی سوچتا ہوں' کل پھر اس موضوع پر بات ہوگی۔ باقی رہی میرے ''کماؤ پوت'' ہونے کی بات تو جب تم کہو میں اسی وقت کالا میں رک سکتا ہوں۔ اب تو اسکول کی مرمت بھی ہو گئی ہے میں ادھر کسی بھی کمرے میں سو سکتا ہوں۔'' ٹیوشن والے بچوں سے میں نے پہلے ہی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر میں کسی روز انھیں نہ پڑھا سکوں تو میں اس ناغے کی کسر اتوار کے دن نکال دیا کروں گا۔ بیوی کو بھی سمجھا دیا تھا کہ اگر کسی روز میں کالے سے نہ آ سکوں تو میرا فکر نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ تھی کہ سردیوں کے موسم کے باعث کبھی کبھی میرا جی سائیکل چلانے کو نہ چاہتا تھا اور میں خوب آرام کرنا چاہتا تھا۔ ایک رات میں اسکول میں رک گیا جبکہ اسی رات نواز گھمن نے اسکول کے اتھلیٹ اشرف کے چچا کی برات میں جانا تھا۔ نواز نے مجھے اپنے بھتیجے جو چوتھی جماعت کا طالب علم تھا' کے سپرد کیا تا کہ وہ میرا بستر اور کھانا گھر سے لائے حالانکہ اسکول میں ماسٹر بشیر اور صدیق موجود تھے' وہ میرے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔ میرے رکنے کا مقصد خصوصی تھا۔

مجھے علم تھا کہ میرزادی کا باپ گاؤں کا چوکیدار ہے۔ وہ دو ایک مرتبہ گاؤں کا چکر لگا کر 'جاگتے رہنا' کی ہانک لگاتا اور پھر جا کر سو رہتا تھا۔ میں نے نواز گھمن کے بھتیجے کے ہاتھ ہی اسے کہلا بھیجا کہ وہ ہانک لگانے جانے سے پہلے میری بات سن جائے۔ وہ آیا اور کہنے لگا:

''میں سمجھا ماسٹر صاحب ٹانگیں دبوانا چاہتے ہوں گے' لہٰذا ایک آدھ گھنٹہ تو ان کی

خدمت کروں۔ اس لیے جلد ہی آ گیا ہوں۔'' جب وہ آیا تو اسی وقت میں ماسٹر بشیر اور ماسٹر صدیق کے پاس بیٹھا تھا۔ میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں جہاں میرا بستر بچھا تھا' آ گیا اور اسے بتایا کہ میں نے اسے ٹانگیں دبوانے کے لیے نہیں کچھ باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے۔ اس نے بڑے تحمل سے میری ساری بات سنی۔ وہ خاصا ذہین شخص لگ رہا تھا۔ اس نے کہا ''جناب یہ چودھری لوگ بڑے چھچھورے ہوتے ہیں۔ یہ نواز گھمن بھی بڑا چھچھورا ہے۔ مجھے علم ہے کہ شبو کا نواز سے کوئی جوڑ نہیں۔ شبو خود بھی جانتی ہے کہ ایک میراثن کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ وہ تابعدار لڑکی ہے' طفیل شاہ صاحب کی بیوی کی شاگرد ہے۔ میں اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کرنے والا ہوں جو فوج میں نائیک ہے۔ شبو نے جو بات چیت نواز سے کی ہے' میری مرضی سے کی ہے۔ اس کا مقصد نواز سے پیچھا چھڑانا ہے۔ وہ کسی نہ کسی بچے، کسی نہ کسی کمی کمین کے ہاتھ اسے ملاقات کے پیغامات بھیجتا تھا۔ منشی جی کی عزت کی خاطر میں نے ان سے کچھ نہیں کہا حالانکہ میں ان سے کہنے ہی والا تھا کہ ان کا بڑا بیٹا منکر رسول ہو گیا۔ آپ چاہیں تو میں شبو کو بھی بلا کر اپنی بات کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر نواز واقعی مرد کا بچہ ہے، تو آئے سامنے' روایت توڑے اور مسلمان ہے تو منشی صاحب کے ذریعے مجھے گلے لگا لے۔ میں نے تو شبو کو گھر سے رخصت کرنا ہی ہے۔''

اس نے مزید کہا'' جناب' شبو جانتی ہے کہ موری کی اینٹ چوبارے نہیں چڑھتی، ٹاٹ کا پیوند مخمل میں نہیں لگتا' لہٰذا اسے اونچے خواب دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ ہم نے اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ کبھی نسل میں کوئی پڑھ لکھ گیا تو کہیں دور شہر میں جا کر شاید ماضی کو گم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔''

وہ چلا گیا اور میرے ذہن میں ماضی کا لفظ گونجتا رہ گیا۔ ''ماضی مردہ ہے اسے دفن کر دو۔'' میرے دماغ نے کہا اور دل نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دل نے کہا۔ زندگی تو ہے ہی یادوں کا مجموعہ۔ یادیں مقدس ہوتی ہیں۔ یادوں کا احترام کرنا ہی انسانیت ہے۔ ہر کسی نے ایک نہ ایک دن یاد بن کر رہ جانا ہے۔ موت تاک میں ہے۔ کردار ختم ہو جاتے ہیں۔ صرف ان کی یادیں زندہ رہ جاتی ہیں۔ اور وہ بھی کب تک؟

''جاؤ! شبو کے ابا...... اور سنو شبو بیٹی ...... تم اپنی نسل سے ماضی کو دفن کرنے ہی کی نصیحت کرنا۔ تمہارا ماضی قابل فخر نہیں ہے۔ مگر...... مگر اے دیہاتی اور کمین باپ کی بیٹی......

تمہاری سوچ تمہارا کردار تو سنہرے حروف میں لکھ کر محفوظ کرنے کے قابل ہے۔ ماضی تاریخ ہے۔تاریخ کو بھولنے والے داغدار اور آلودہ تاریخ ہی کو جنم دیتے ہیں۔"

تیسرے دن نواز سے ملاقات ہوئی، تو میں نے اسے تبلیغی، اخلاقی اور کچھ مذہبی زبان استعمال کرتے ہوئے اس بات پر قائل اور مائل کرلیا کہ وہ شبو کی استانی کو لکھ کر پیغام بھیجے گا کہ وہ شبو کی تربیت کرنے والی خاتون اور شبو کی عظمت کو سلام کرتا ہے۔ شبو اسے بڑا بھائی سمجھے اور کسی بھی قسم کی مدد کے لیے سچے دل سے پکارے۔اس کی سابقہ کوتاہیوں کو اچھی بہن کی طرح معاف کردے۔حیرت کی بات یہ ہوئی کی نواز نے مجھے ہی کہا کہ میں ہی اسے "معافی نامہ" لکھواتا جاؤں وہ لکھتا جائے گا۔ واقعی جو میں نے لکھایا اس نے وہی لکھا اس پر ماسٹر بشیر اور صدیق دونوں نے گواہی کے دستخط کئے اور پھر میری مہر لگا کر میرے دستخط بھی بطور گواہ ہوئے۔ تحریر کو ایک لفافے میں بند کیا اور اس نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ ہی اسے شبو کے والد کو پہنچایا تا کہ وہ خود طفیل شاہ کی بیوی سے پڑھانے کے بعد کسی اور کو پڑھائے یا پڑھ کر سنوائے۔

☆☆

اب نواز کے اور میرے تعلقات میں بڑی گہرائی پیدا ہوگئی۔ ہم ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہنے لگے تھے۔ مجھے میلوں ٹھیلوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ مجھے اردگرد بلکہ دور دراز کے دیہات میں میلوں، عرسوں، کبڈی کے مقابلوں اور دنگل دکھانے لے جاتا۔ بعض اوقات ہفتے یا جمعرات کی شب کھدائی کے لیے نہر پر لگے خیموں میں مزدور لوگ جشن مناتے۔ گانے بجانے والے طائفے، رقاصائیں اور گلوکار بلاتے۔ رات بھر ہنگامہ رہتا۔ وہ مجھے ایسی تقریبات میں لے جاتا۔ مشہور لوک فنکار عالم لوہار کو میں نے اسی کی معیت میں سنا۔ اس طرح میں ہفتے میں دو دن کالا رہنے پر مجبور ہو جاتا۔ میری اَنا مجھے مجبور کرتی کہ میں نواز پر یہ ثابت کروں کہ مجھے دوستی کی زیادہ پرواہ ہے پیسے کی نہیں حالانکہ دل سے میں ٹیوشنوں پر اپنی بڑھتی ہوئی غیر حاضریاں محسوس کر رہا تھا۔

اچانک گاؤں میں شرطیں لگانے کا رواج چل نکلا۔ جسے دیکھو شرط لگا رہا ہے۔ بچے تک اس کاروبار میں ملوث تھے۔ اس رواج کی ابتدا نہر پر کھدائی کا کام کروانے والے ایک ٹھیکیدار نے کوئی پرچی نکال کر کی تھی۔ بچے ایک چھوٹی سی ڈکشنری سے اردو یا انگریزی کے الفاظ منتخب کر لیتے اور آپس میں شرط لگاتے کہ اس کے معنی فلاں مدرس کو آتے ہیں یا نہیں۔ وہ

مدرس سے معنی پوچھتے اور ہارتے جیتتے۔ ایک غیر شعوری سا اثر سب نے قبول کر رکھا تھا۔

میں کالا ہی میں ماسٹر بشیر کے پاس اس کی رہائشی کوٹھڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ سالن تیار کرنے کے لیے آلو چھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نصف سیر کا آلو پکڑا ہوا تھا۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ اگر ماسٹر بشیر یہ آلو کچا کھا جائے تو پانچ روپے انعام ...... وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گیا بسم اللہ پڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آلو کھا گیا۔ میں پانچ روپے ہار چکا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اسے کہہ دیا کہ اگر وہ قبرستان والے ٹیلے پر بنی رصدگاہ کی چھت پر ایک رات سو کر گزار دے تو دس روپے انعام۔ اس نے بستر اور ایک زائد کمبل اٹھایا اور صدیق کی مدد سے چھت پر چڑھ گیا۔ صدیق نے اسے منع بھی کیا، لیکن وہ دس روپے جیت کر ہی رہا۔

ٹھٹھرتی رات کے پچھلے پہر ہم عالم لوہار کو سن کر آ رہے تھے۔ چار مدرسین کے علاوہ اور دیہاتی لوگ بھی تھے۔ اچانک اسکول کے قریب والے جوہڑ کے پاس پہنچ کر ماسٹر بشیر نے نواز سے کہا کہ اگر وہ اس وقت جوہڑ میں ڈبکی لگائے، تو وہ اسے دس روپے دے گا۔ دوسرے لوگوں نے بھی دس، پانچ فی کس دینے کا اعلان کیا۔ القصہ سو روپیہ جمع ہو گیا، لیکن کوئی بھی پانی میں اترنے کو تیار نہ ہوا۔ کسی نے میرا نام بھی لیا کہ قاضی صاحب بھی نہر میں خوب چھلانگیں لگاتے ہیں۔ وہ بھی مقابلے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ تھا تو جان پر کھیلنے کا عمل، لیکن میں نے یہ معرکہ سر کرنے کی ٹھانی اور نواز سے کہا کہ تم سو روپیہ اکٹھا کرو، میں پانی میں غوطہ لگاتا ہوں۔ گھپ اندھیرا ابھی تھا۔ میں نے کپڑے اتارے اور پانی میں کود گیا۔ ایک کے بجائے دو غوطے لگائے۔ پانی کے اوپر کہرا جما ہوا تھا، لیکن اندر سے نیم گرم تھا، لہٰذا میرے غوطے بھی طویل تھے۔ میں پانی کا یہ راز جانتا تھا، لیکن ایسا اس وقت ہی ہوتا تھا جب دن میں خوب دھوپ رہی ہو۔ ایسا صرف ساکن پانی میں ہوتا ہے۔ چلتے پانی کا درجہ حرارت اوپر کی اور نچلی سطح پر ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ میں بھی شرطیں باندھ کر جوئے کا شکار ہو رہا تھا ماحول یا صحبت کا اثر اسے ہی کہتے ہیں۔

☆☆

دسمبر کی تعطیلات سے پہلے ایک رات کی بات ہے کہ میں لحاف میں لپٹا گہری نیند سو رہا تھا، کہ اسکول کے کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟

جواب میں بجائے کسی انسانی آواز کے ایک گھوڑی ہنہنائی۔ علاقے میں مشہور تھا کہ دستک کے بعد اگر دستک دینے والے سے پوچھا جائے کہ کون ہے اور جواب میں گھوڑی ہنہنائے تو سمجھ لو کہ باہر لالو ڈاکو کھڑا ہے۔ شاید وہ گھوڑی کی لگام کھینچتا تھا اور گھوڑی ہنہناتی تھی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے اندھیرے میں سات فٹ کا سایہ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ تاریکی کا حصہ تھا۔ گھوڑی اس کے ساتھ برآمدہ میں کھڑی تھی۔ اس نے طاقتور ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور...... اور...... میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ اس نے گھوڑی کو ''شش شش'' کہا، میں دروازے پر ہی کھڑا تھا کہ وہ اندر کمرے میں گھسا، بنچ پر پڑی لالٹین کی لو اونچی کی اور دوسری طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

''بیلیا...... ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا پرانا دوست ہوں گو ہم پندرہ بیس برس سے نہیں ملے، لیکن مجھے تمہارا نام اور تمہارے چہرے کے تو تلے (چیچک کے داغ) ہمیشہ یاد رہے ہیں۔ اس وقت تو تم بہت دبلے پتلے اور 'ماڑ کو' ہوا کرتے تھے، اب خاصے 'ارنے بھینسے' ہو رہے ہو...... دوڑ لگایا کرو۔ موٹاپا تو نری بیماری ہے، اتنا پڑھ لکھ کر بھی تمہیں صحت کا احساس نہیں......'' وہ بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا جنہیں سن کر میرا خوف تو کم ہوا، لیکن حیرت بڑھ گئی تھی۔ میری زبان ابھی تک گنگ تھی۔

اس نے اپنے چہرے پر بندھا ڈھاٹا کھولا اور پھر اسے سر پر پگڑی کی طرح باندھتے ہوئے مجھے کہا:

''آرام سے بستر پر بیٹھ جاؤ۔ کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے اور تم مجھے کوستے رہو کہ اچھا آیا تھا پرانا بیلی، ملاقات کو۔'' ایک لحظہ رک کر اس نے اپنی ٹارچ کی روشنی اپنے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا ''لو بھئی، زلفاں مجھے پہچانو۔'' میں اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ٹارچ بند کرتے ہوئے پوچھا ''کچھ سمجھ آئی ہے؟''

''نہیں'' میں بمشکل بولا۔ ''لیکن یہ جو تم نے زلفاں کہا ہے تو اس نام سے مجھے صرف اور صرف مولوی محمد علی پکارا کرتے تھے جو پہلی جماعت میں میرے استاد تھے۔

''صرف تمہارے استاد تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں، وہ تو ہمارے باپوں کے بھی استاد تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ان کے ساتھ اپنے گاؤں کوٹ میراں سے آیا کرتا تھا۔ پانچویں جماعت میں

داخل ہوا تھا اور دو سال تمہارے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم لائق لڑکوں میں شمار ہوتے تھے جبکہ میں انتہائی نالائق اور احمق ہوا کرتا تھا۔''

وہ چند لمحے لالٹین کی لو اوپر نیچے کرتا رہا۔ پھر اس نے میز کو ڈھولک کے مانند انگلیوں سے بجاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے اسے شناخت کرلیا ہے یا نہیں؟ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مجھے شریف، حبیب، رحمت اللہ، شفیع اور بٹھل تو یاد آ رہے ہیں مگر وہ یاد نہیں آ رہا۔''

''تمہیں اپنے ماسٹر قریشی افضل صاحب تو لازمی یاد ہوں گے۔ انھوں نے ایک مرتبہ تمہارا گھونگھٹ کھولا تھا۔'' گھونگٹ کا لفظ سنتے ہی میری ہتھیلیوں میں کھجلی ہونے لگی۔ ماضی کی موٹی اور گانٹھ دار سرکنڈے کی ضربوں کی میٹھی میٹھی آنچ ہتھیلیوں سے سرک کر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اس غیبی حرارت نے مجھے حوصلہ اور جرأت عطا کی۔ میں واضح طور پر سمجھ گیا کہ وہ یقینی طور پر کوئی پرانا ہم جماعت ہی ہے۔ یہ 'زلفاں' اور 'گھونگٹ' کی بات کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے، وہی کرسکتا ہے جسے میرا اور اپنا بچپن یاد ہو۔ ایسی ہی آنچوں کی کٹھالیوں سے گزرنے کے بعد مجھ جیسے نادار اور یتیم بچے نے مثبت تعلیم حاصل کی تھی۔

ان محسوسات کے باوجود میں اس کی شناخت نہیں کر سکا۔ میں پانچویں اور چھٹی جماعت کے ہم جماعتوں میں سے کوئی لال خاں، کوئی لال دین یا لعل بخش تلاش کرنے لگا۔ تبھی وہ کوئی آج کا لالو ہوسکتا تھا۔

مجھے مایوس پاکر اس نے کہا کہ وہ مجھے اپنی حماقت کا ایک واقعہ سناتا ہے شاید تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔ ساتھ ہی اس نے اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا کہ میں اس قدر بھلکڑ اور پھسڈی لڑکا تو نہ تھا اور اگر ایسا ہوتا تو ہیڈ ماسٹر کیسے بنتا۔ وہ میرے عہدے سے خاصا متاثر لگ رہا تھا۔ اس نے کہا ''تمہیں یاد ہوگا کہ جماعت پنجم میں ماسٹر قریشی صاحب نے گھوڑے پر مضمون لکھنے کو کہا تھا اور سوالات و جوابات کے ذریعے یہ ذہن نشین کرایا تھا کہ مضمون کس طرح لکھنا ہے اور اس میں کیا کیا کچھ لکھنا ہے۔ میں نے چوتھی جماعت اپنے گاؤں سے کی تھی اور وہاں پرائمری میں مضمون کا لفظ بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے کاپی پر ایک گھوڑے کا خاکہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ماسٹر جی علیحدہ علیحدہ بیٹھے مضمون لکھنے والے طلبہ کی کاپیاں ان کے پاس جا کر دیکھ رہے تھے۔ ان کو کچھ سمجھاتے یا شاباش دیتے جب وہ مجھ تک پہنچے تو میں نے اپنی کاپی ان کے

ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا تھا ’’جی میں نے گھوڑے کی دم، ٹانگیں، پیٹ، گردن، ایال اور کان تو بنا لیے ہیں بس اس کا لمبوترا سا منہ نہیں بن رہا۔ اس پر ماسٹر جی نے بغل سے سرکنڈا نکالا اور پوری جماعت سے کہا ’’لو بھئی! ادھر دیکھو...... یہ نئی گھوڑی دانت دکھانے لگی ہے۔‘‘ مجھے ہاتھ آگے کرنے کے لیے سرکنڈ کے ٹھوکے سے ہی اشارہ کیا اور دائیں بائیں ہاتھ پر ایک ایک ضرب لگانے کے بعد مجھے مضمون لکھنے اور خاکہ بنانے کا فرق سمجھایا تھا۔‘‘

میرا ذہن روشن ہوا۔ ’’نئی گھوڑی دانت دکھائے۔‘‘ ہم نے ایک لڑکے کی چھیڑ بنائی تھی۔ قریشی صاحب جس کو پہلی بار ساز دیتے تھے اسے گھونگٹ اٹھانا کہتے تھے اور جو لڑکا نیا نیا اسکول میں آتا اسے سزا دیتے وقت ’’نئی گھوڑی دانت دکھائے‘‘ کہا کرتے تھے۔

’’تو تم کوٹ میراں کے حیدر ہو...... حیدر علی...... مگر یہ...... یہ تم‘‘ میں حیران ہو رہا تھا۔ حیدر علی تو ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر میز کے کونے سے ٹکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر چھاتی سے لگا لیا۔ خوب بھینچا۔ میں بمشکل اس کی چھاتی تک پہنچ رہا تھا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ کھل سا گیا تھا۔

وہ مجھے بتاتا رہا کہ میرا نام ہمیشہ سے اس کے لاشعور میں جاگزیں رہا ہے۔ چھٹی جماعت کے فوراً بعد وہ ایم بی ہائی اسکول کی انگریزی کی خصوصی کلاس جونیئر سینئر میں داخل ہوا تھا۔ جونیئر کلاس پاس کرنے کے بعد اسے ہفتم میں داخل کر لیا گیا۔ ہشتم سے لے کر دہم تک اس نے تعلیم گوجرہ منڈی میں حاصل کی۔ ایف اے اس نے لائل پور (فیصل آباد) سے کیا، لیکن کسی درسگاہ میں اسے میرے نام کا کوئی طالب علم نہ ملا تھا۔ وہ میرا گہرا دوست بھی نہیں تھا کہ میں اسے یاد رہتا۔ یہ میرے نام کا اعجاز تھا کہ نام کی انفرادیت سے میں اسے یاد تھا۔

’’یار تم مجھے اس قدر یاد کرتے رہے تو پھر مجھے ملنے آئے اور نہ ہی کبھی مجھے بلایا؟ میں تو دوستوں کی قدر کرنے والا شخص ہوں۔‘‘

’’میں نے بتایا نا کہ میں کوٹ میراں سے چلا گیا تھا۔ دراصل میرے باپ چودھری نتھے خاں نے میانی کی ایک بیوہ زمیندارانی سے شادی کر لی تھی۔ بیوہ کے ساتھ ایک گیارہ سالہ لڑکا اور نو سالہ لڑکی بھی ہمارے گھر آ گئی تھی۔ باپ کہتا کہ اس نے شادی زمین کی خاطر کی ہے۔ میری ماں کہتی نہیں، وہ چڑیل ماضی میں میرے باپ کی محبوبہ رہی تھی اور اب بیوہ ہونے کے بعد

دونوں نے پرانی محبت کی تجدید اور ماضی کے وعدوں کو ایفا کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا ہے۔ بہر کیف کل کل اور ہاہا کار سے تنگ آ کر میرے باپ نے ماں سے پوچھا کہ وہ بتائے، وہ کیا کرے؟ مگر بیوہ کو طلاق دینے کی بات وہ نہیں سنے گا۔ ماں نے ہم دونوں بھائیوں کے مستقبل کی خاطر بار میں مربعوں پر جانا پسند کیا یوں میں ادھر سے کٹ کر رہ گیا۔''

''اب تم نے میرا کھوج کیسے نکالا۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مولوی منشی محمد علی کے ذریعے۔ تم تو ان سے نہیں ملے، اس کا مولوی صاحب کو گلہ ہے، لیکن تمہارا کوئی ماسٹر فتح دین اپنی بیوی کے علاج کے لیے مولوی صاحب کے پاس شہاباں میں جاتا رہتا ہے۔ اسی نے ان کو بتایا کہ اس کے ہیڈ ماسٹر کا نام یہ ہے اور وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے گھر کے بیرونے میں مطب کھول رکھا ہے۔ فتح گڑھ، میانی، کوٹ بیگو والے، واں اور بھاڑے چک سے آنے والی عورتوں کی وجہ سے وہ شہاباں میں عورتوں کے حکیم کے طور پر خاصے مشہور ہیں۔ ان کا مطب حکیم خادم علی سے بھی زیادہ چلتا ہے......''

مجھے حیرانی ہوئی کہ ماسٹر فتح دین جو گھر باہر کی ہر بات مجھے اکثر سناتا رہا ہے اس نے مجھے مولوی محمد علی سے ملنے کی بات کیوں نہیں کی تھی۔

ابھی وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اس کی گھوڑی ہنہنائی۔ وہ ایک منٹ کہہ کر باہر نکل گیا تو میں ایک بار پھر سے نالہ ایک کے کنارے اپنی مادر علمی میں پہنچ گیا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں نے اسکول میں کبھی بھی کسی استاد سے پڑھائی کے سلسلے میں مار نہیں کھائی تھی۔

قریشی صاحب مجھے اکثر سرکنڈا لانے کو کہا کرتے۔ میں جو سرکنڈا لاتا وہ بڑا جاندار، موٹا اور چھوٹی چھوٹی گانٹھوں والا ہوتا تاکہ جسے لگے اسے اگر نانی نہیں تو ماں تو ضرور یاد آئے۔ مجھے اس قدر اعتماد تھا کہ مجھے تو کبھی سزا ملنا ہی نہیں ہے، لہٰذا دوسروں کا تماشہ تبھی بھرپور مزہ دے گا جب انھیں مضبوط ''مولا بخش'' سے سابقہ پڑے گا۔ جب نئی گھوڑی نے مضمون لکھتے ہوئے دانت دکھائے تھے تو اس روز میرا ہی لایا ہوا سرکنڈا ٹوٹ گیا تھا جو میں ہندوؤں کے مرگھٹ کے قریب ایک سرکنڈوں کے جھنڈ سے لایا تھا۔ میرا گھونگٹ الٹنے سے قبل انھوں نے خاموشی سے دو لڑکوں کو ایک چھوٹی چھوٹی گانٹھوں والا موٹا سا سرکنڈا لینے بھیجا تھا۔ بٹھل اور حیدر علی بھاگ کر مذکورہ صفات والا سرکنڈہ لائے تھے۔

کیا بچپن اور کیا کمینگی تھی کہ ہم اپنے ہی ہم جماعتوں کو پٹتے اور بلبلاتے دیکھ کر خوش

ہوا کرتے تھے۔

قریشی صاحب نے سرکنڈے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے تولا اور پھر مجھے ہاتھ آگے نکالنے کو کہا کہ وہ سرکنڈے کو آزمائیں۔ میں نے ہاتھ آگے کر دیا۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ وہ واقعی اس کی آزمائش میری ہتھیلی پر کر ہی ڈالیں گے۔ دونوں ہتھیلیوں پر دو دو ضربیں لگانے کے بعد انھوں نے سرکنڈے کو میری پشت پر بھی آزمایا۔ میں رو رہا تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے کیا کیا ہے؟ اس پر انھوں نے میرا ہفتے وار جائزے کا حساب کا پرچہ میرے سامنے کیا جس پر موٹی سرخ پنسل سے صفر بٹا صفر لکھا ہوا تھا۔ قریشی صاحب کہہ رہے تھے:

''تم نے کچھ نہیں کیا؟ تم نے تو بیڑا غرق کر دیا ہے میری محنت کا بھی اور اپنی ذہانت کا بھی...... تم نے کچھ نہیں کیا؟ سزا کے دکھ کے بجائے اب مجھے صفر بٹا صفر نے ذہنی طور پر بھی پریشان کر دیا...... لیکن اس وقت، ٹھنڈی رات کی عجیب و غریب صورت حال میں مجھے ماں باپ کے پیار سے استاد کی مار کے بہتر ہونے والے اشعار یاد آئے۔

ایک لڑکے کی بسم اللہ خوانی ہوئی
اسے لکھنے کو لوح چاندی کی ملی
کسی شوخ نے اس پر یہ مصرعہ لکھ دیا
ہے ماں باپ کے پیار سے مار استاد کی بھلی

حیدر علی واپس آ گیا اور بولا ''میں نے گھوڑی کی لگام نہیں اتاری تھی۔ وہ اس کی گردن سے پھسل کر اس کے پاؤں میں پھنس گئی تھی۔ وہ اسے درست کرنے کے لیے مجھے بلا رہی تھی۔ جب تک ہم جانور کو نہ سمجھیں جانور بھی ہمیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔''

میں نے اس کی منطق آمیز بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو بچپن میں الجھا ہوا تھا۔ حیدر علی نے سمجھا کہ میں دل میں یہ سوچ رہا ہوں کہ زمیندار، کھاتا پیتا اور پڑھا لکھا حیدر علی، لالو کیوں بن گیا ہے؟ واقعی مجھے یہ سوچ بھی آئی تھی۔ اب جب اس نے یہی کچھ کہا کہ کیا میں اس کے متعلق سوچ رہا ہوں تو میں نے کہا ''تم نے میرے دل کی بات کو صحیح جانا ہے۔ ہاں، بتاؤ تو کیا مجبوری تھی......''

''لمبی کہانی ہے، لیکن میں تمھیں ضرور سناؤں گا۔ مجھے تم سے اور بھی کافی باتیں کرنا ہیں، لیکن اس وقت میں تمھیں صرف اس قدر بتاتا ہوں کہ لالو فرضی اور وقتی نام ہے۔ لال خاں

جو اپنے شریکوں کا قاتل ہے۔ ایک مفرور ہے۔ پار کے جنگلوں میں رہتا ہے۔ میرے جیسے چھوٹے چھوٹے قانونی مجرم گزر اوقات کے لیے لالو کا سا انداز اختیار کر کے چھوٹے موٹے ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اس کی دہشت کو نقدی میں تبدیل کراتے رہتے ہیں۔ میں یہ بھیس کبھی کبھی بدلتا ہوں۔ بال بچے دار ہوں‘ شہر ہی میں رہتا ہوں۔ میں نے اپنے لڑکے کا نام تمہارے نام کا بوجھ سر سے اتارنے کے لیے ذوالفقار حیدر رکھا ہے۔ اس کی عمر دو سال ہے‘ لیکن بڑا تیز طرار‘ چاک و چوبند اور ذہین ہے۔“

”اللہ اس کی عمر دراز کرے اور وہ ایک اچھا انسان بنے۔“ میری اس دعا پر اس نے ”آمین“ کہا۔

کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ بچپن کی اور اسکول کی بہت سی یادوں کو تازہ کیا۔ پھر وہ اٹھا اور مجھے بے تکلفی اور گستاخی معاف کہتا ہوا بولا ”یار! ذرا اپنے بجوؤں کو تو جگاؤ۔ وہ تاجے کو جانتے ہیں اور تاجا دروازے پر اپنی ٹارچ سے کئی بار روشنی پھینک چکا ہے۔ وہ اس کو بلا لائیں۔“

میں نے اسے کہا ”یار میرے استادوں کو بجو نہ کہو۔ یہ ان کی بے عزتی ہے۔ تمہارے تاجے کو میں بلا لاتا ہوں۔“ وہ ہنسا اور بولا ”جس طرح کسی افسر کی دوستی یا کسی چودھری سے واقفیت کبھی کبھی کام آ جاتی ہے۔ اسی طرح ڈاکوؤں اور بستہ ب کے مجرموں سے بھی میل جول بڑے کام آتا ہے۔ تم بیٹھو‘ میں خود ہی تاجے کو اشارہ دیتا ہوں وہ ابھی آ جاتا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا اور ٹارچ کی روشنی جلدی جلدی تین مرتبہ پھینکی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک پستہ قد‘ گٹھے جسم کا شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے اس شخص کو کئی بار سڑک سے گزرتے دیکھا تھا۔ وہ کھانے پینے کا سامان اٹھائے ہوئے تھا۔

”تم نے اتنی دیر لگا دی۔ میرا تو بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔“

”کیوں پھر؟“ تاجے نے لالو سے کچھ رمزیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں بھئی! سجن ہی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”تمہاری دلی خواہش پوری ہوئی۔“ تاجے نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا ”یہ کئی ماہ سے آپ سے ملنے کو تڑپ رہا تھا‘ لیکن آپ کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ آپ ادھر کب ٹھہرتے ہیں۔ آج ہمارے مخبروں نے آپ کے یہاں ہونے کی اطلاع دی اور ملاقات ہو گئی۔“

''ملاقات تو ہوگئی ہے پیارے، لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہیڈ ماسٹر ہم بدمعاشوں کا سجن بیلی ہے۔''

''لیکن یہ تو میں پہلے ہی صدیق اور بشیر کو بتا چکا ہوں، مگر وہ اسے راز ہی رکھیں گے۔ ان کو علم ہے کہ لالو کا راز کھولنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

تاجے نے کھانے کا سامان کھولا۔ بھنے ہوئے بکرے کے گوشت کے علاوہ چھ سات روسٹ بٹیر بھی تھے۔ اب پھر حیدر علی نے مجھ سے کہا کہ کیا میں نہیں چاہوں گا کہ میرے ماتحت بھی اس ''سحری'' کو چکھیں۔ میں انھیں بلانے کے لیے اٹھا تو تاجے نے مجھ سے کہا کہ میں بیٹھا رہوں۔ وہ تیزی سے اٹھا اور ان کو جا کر بلا لایا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے جاگ رہے تھے کیونکہ ان کی آنکھوں میں نیند کے سائے نہیں تھے۔ شاید وہ ہی میرے مخبر بھی تھے۔ ان کی حیدر علی سے سلام دعا ہوئی۔'' حیدر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اب بھی اس سے ڈر رہے ہیں۔ صدیق نے کہا ''سانپ اور چور کی دہشت تو ہوتی ہے اور آپ تو چوروں سے اوپر کی شے ہیں۔ ہم تو آپ کے نام ہی سے خوف کھاتے ہیں۔ تاجا آپ کی جی داری کی بڑی تعریف کرتا ہے اور ہم پر آپ کی خوب دھاک بٹھاتا ہے۔''

حیدر علی ہنسا۔ مدرسین نے کچھ برتن ان کو لا کر دیے تو تاجے نے ان میں کھانا ڈالا۔ کھانا شروع ہوا تو تاجے نے صدیق اور بشیر سے پوچھا کہ کیا انھوں نے شیشے کے گلاس منگوائے ہیں یا نہیں؟

ماسٹر بشیر اٹھا اور اس نے یہ کہنے کے ساتھ کہ ابھی تک وہ گلاس نہیں منگوا سکے انھیں سائنس کے سامان کی الماری سے تین صاف و شفاف بیکر اٹھا کر لا دیے اور کہا ''آج پھر آپ لوگ انھی کو استعمال کریں۔'' تاجے نے اپنی ڈب سے ٹھرے کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

''ہیڈ صاحب!'' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میں ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔ پہلی مرتبہ میں نے جب ان سے گلاس مانگا تھا تو وہ سلور کا ایک گندہ سا گلاس اٹھا لائے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس مقدس شے کو اتنے غلیظ برتن میں ڈالنا اس کی بے عزتی ہے۔ تب انھوں نے مجھے یہ بیکر لا کر دیے تھے۔ کیسے اچھے شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ بچوں کو تجربات کر کے تو دکھاتے نہیں، لیکن میں نے ان دونوں پر تجربہ کر ڈالا ہے یہ دو دو گھونٹ بھی نہیں سہہ سکے تھے۔''

دونوں مدرسین کھسیانے ہو کر رہ گئے۔ ان باتوں کے دوران تاجے نے تینوں بیکروں میں تھوڑا تھوڑا ٹھرا ڈالا۔

"تم نے کبھی یہ کڑوا پانی چکھا ہے۔" حیدر علی نے مجھ سے پوچھا۔

"آج تک تو مجھے میرے رب نے اس حرام شے سے محفوظ ہی رکھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"حرام سے وہی بچتا ہے جس کو حرام ملے ہی نہیں۔ تمہیں موقع ہی نہیں ملا ہو گا۔ مولویوں کی اولاد سے جو ہوئے۔" حیدر علی نے کہا۔ میں خاموش ہو گیا تو تاجے نے کہا "چلو ہیڈ صاحب! آج تجربہ ہی سہی۔"

"تم لوگ شوق فرماؤ۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔ "میں تمہیں روک نہیں سکتا اس لیے کہ میرے پاس کوئی اختیار نہیں۔"

"اختیار کی بات نہ کرو، ہم لوگ اختیار کی دھجیاں اڑا کر ہی خوش ہوتے ہیں۔ میرے باپ چودھری نتھے خاں آف کوٹ میراں کے پاس بڑے اختیارات ہیں، لیکن میں اس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ مولوی محمد علی مجھے دوزخ سے ڈراتے رہتے ہیں۔ میں ان کی بھی نہیں مانتا کیونکہ میں خود دوزخ ہوں بلکہ دوزخ کا فرشتہ ہوں۔ مجھے آگ ہی سے تسکین ہوتی ہے۔ یہ گوشت اور یہ ٹھرا میری اندر کی آگ کو سہہ گنا کر دیتے ہیں۔"

"ہیڈ صاحب! ہمارے ہیڈ کا دل نہ دکھائیں۔ آپ ساتھ نہ دیں گے تو محفل نہ جمے گی۔ چکھ لیں ورنہ یہ بہک بہک کر نئی نئی باتیں کرنے لگے گا۔" تاجے نے کہا۔

"نہیں تاجے رہنے دے۔" حیدر علی نے کہا۔ استادوں نے تو دوسروں کو بھی نصیحت کرنا ہوتی ہے کہ یہ حرام شے ہے۔ تمام خباثتوں کی ماں ہے۔ اگر یہ خود ہی اس سے دل بہلانے لگیں تو پھر ان کا دین اور دنیا میں کونسا مقام رہ جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بیکر اپنے اندر انڈیلا۔ پھر دوسرا اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "بیلیا...... یہ تیرے نام کا......" پھر اس نے یکا یک کہا "نہیں، تیرے نام کا نہیں، شیطان کے نام کا...... بستہ ب کے نام کا...... بھائی تیرا نام تو اب میرے بیٹے کا نام ہے اور......اور......"

"اور تم نہیں چاہتے کہ تمہارے بیٹے کا نام بھی اس آتش سیال کے حوالے سے لیا

جائے۔اختیارات اور دوزخ کی بات تو دور کی ہے تم تو اپنے آپ ہی سے ڈر گئے ہو......''

اس نے بیکر فرش پر گرا کر توڑ دیا اور بوتل اٹھا کر دروازے پر دے ماری۔اٹھا اور ڈھاٹا باندھتے ہوئے تاجے سے کہا کہ چل یہاں سے دفعان ہو۔میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔وہ مجھ سے کترا کر دروازے کی سمت بڑھا اور اندھیرے میں جا کر بولا ''زلفاں! میں نے تم سے ہاتھ نہیں ملایا اس لیے کہ میں حرام شے پی کر ناپاک ہو گیا ہوں۔میں تم سے پھر ملوں گا۔کہیں اور......''

وہ دونوں چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد ہم تینوں میں بشیر اور صدیق تاجے اور لالو کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔میں نے حیدر علی کا اصل نام ان دونوں کو نہیں بتایا۔انھیں خود ہی بہت کچھ معلوم تھا۔انھوں نے بتایا کہ لالو جو اصل ڈاکو' قاتل اور مفرور ہے خود تو کہیں بیلے کے جنگلوں میں جموں توی' چناب اور مناور توی کے درمیان بجوات کی علاقے میں رہتا ہے۔اس کے کئی چیلے چانٹے اب لالو ہی بن گئے ہیں۔اس کے نام کی دہشت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی رات اور ایک ہی وقت میں ایک ڈاکہ تو لالو ڈالووالی میں ڈالے اور دوسرا گھکا متر میں۔یہ کالے کا صاحب اور یار ڈوگر دونوں اس لالو کے مخبر ہیں۔یہ تاجا تو گگے کا رہنے والا ہے۔پھیری لگا کر منیاری کا سامان بیچتا ہے اور یار بیلی ڈاکوؤں کا ہے۔ہم نے تو آپ کو بھی نہیں بتایا کہ یہ لوگ بڑے عرصے سے ادھر ہی سے گزر رہے ہیں۔ہم نے تاجے کے ساتھ آج تیسرا لالو دیکھا ہے۔ادھر رک کر پیتے ہیں اور پھر نہر کے پل پر اکھٹے ہو کر واردات کے لیے نکلتے ہیں۔حیدر علی نے بھی لالو کی اصلیت کے بارے میں کچھ ایسا ہی بتایا تھا۔گویا اس نے میرے ساتھ سچ بولا تھا۔

☆☆

دل کا غبار نکل چکا تو میں نے ان کو بچا ہوا کھانا صبح کے لیے سنبھال کر رکھنے اور بیکر دھونے کے لیے کہا۔وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں بھی کھنڈا لگا کر بستر میں دبک گیا۔خوب نیند آئی۔بچوں کے بولنے کی آواز سن کر ہی میری آنکھ کھلی اور کمرے کا دروازہ کھولنے سے پیشتر ہی میں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ماسٹر بشیر نے چائے تیار کر رکھی تھی۔گھسن کے گھر سے میرا ناشتہ بھی آ چکا تھا' لیکن میں نے حیدر علی کا چھوڑا ہوا بٹیر کھانے کو ترجیح دی۔

میرے نام کے زمزمے نے ذوالفقار حیدر کی شکل میں اس کی باغیانہ سوچ پر کاری

ضرب لگائی تھی اور اس کے اندر کے الاؤ پر بارش کی پھوار کا سا اثر کیا تھا۔ وہ مجھے اپنے سے بہتر اور پاکیزہ خیال کر رہا تھا۔ ڈاکو اندر سے کس قدر کھوکھلا تھا اور اپنی نسل کے بارے میں اپنے آپ سے ڈرا ہوا تھا۔

"اب جب وہ ملے گا تو اور ہی قسم کی باتیں ہوں گی۔" میں نے سوچا۔

سارا دن حیدر علی ہی میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ جب میں ٹیوشنز وغیرہ پڑھا کر گھر پہنچا تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اور کچھ گپ شپ کی خاطر میں نے ملک غنی کو لالو ڈاکو کی اسکول میں آمد کے متعلق بتایا۔ بھائی، ماں، غنی کی ماں اور بہنیں جو میرا بیان سن رہی تھیں۔ سب حیرت زدہ تھے اور مجھ سے کرید کرید کر پوچھتے رہے کہ اس نے کیا کیا اور کیا کچھ کہا۔ میں نے ان کو صرف اس قدر بتایا کہ وہ پہلے بھی ادھر آتا رہا تھا وہاں بیٹھ کر کھانا وغیرہ کھاتا اور چلا جایا کرتا تھا۔ اب کے بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے ملک غنی سے بچپن کی باتیں شروع کر دیں تاکہ میں اسے حیدر علی تک لے جا سکوں۔ حیدر علی نے مجھے "مولویوں کی اولاد" بھی کہا۔ زمانہ کس قدر بدل گیا تھا۔ مولوی کہلانا بھی باعث فخر نہ تھا تو ان کی اولاد کہلانا کون پسند کرتا۔ میں تو اب قاضی صاحب بن چکا تھا۔

☆☆

کل ہی کی تو بات تھی کہ میں ساتویں اور ملک غنی نویں میں پڑھتے تھے۔ بزرگوں کو ہم نے پیر نادر شاہ صاحب (والد لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ رفاقت حسین اور سید سرفراز حسین ریٹائرڈ ممبر ریونیو بورڈ) کے زور خطابت کے بارے میں باتیں کرتے سنا تو ہم دونوں نے ایک جمعہ ان کی مسجد میں جا کر پڑھا۔ شاہ صاحب نے ویران پڑی مسجدوں کا نقشہ کھینچا کہ وہاں وضو کے لیے پانی ہے نہ نمازیوں کے لیے صفیں۔ دن کو گلہری اور رات کو جنگلی بلیاں وہاں رہتی ہیں۔ پھر بتایا کہ ایسی مسجدوں کو آباد کرنا بڑا ہی ثواب کا کام ہے۔ حج بیت اللہ سے بھی بڑھ کر۔ ان کے خطبے سے متاثر ہو کر ہم دونوں نے سکھوں کے دھرم شالا کے قریب کی تنگ گلی میں واقع ایک چھوٹی سی ویران مسجد کو آباد کرنے کا پروگرام بنایا۔ مسجد کے اردگرد مسلمانوں کے گھر نہ تھے۔ آخری کونے میں چند ارائیوں کے گھر تھے لیکن ان کی توجہ مسجد کی طرف نہ تھی۔ چند اور ہم عمر دوست بھی ہماری جدوجہد میں شامل ہو گئے۔

ملک غنی مسلمانوں کی گلیوں میں جا کر کنستر بجا بجا کر ڈھنڈیا پیٹتا ''دلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے۔ دھرم شالہ کے سامنے کی مسجد آپ کو پکار رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے اے مسلمانو! جس طرح تم نے مجھے ویران کیا ہے۔ ڈرو کہ اسی طرح خدا تمہارے گھر ویران نہ کر دے۔'' نتیجہ یہ لکلا کہ مسلمان مسجد کی طرف متوجہ ہوئے اور مسجد میں نماز پڑھنے آنے جانے لگے۔ ہم بھی وہیں اہتمام اور پابندی سے نماز پڑھتے۔ گاؤں بھر کی چچیاں، ممانیاں، خالائیں اور پھوپھیاں ہماری مدد جنس کی صورت میں کرتیں جسے بیچ کر ہم مسجد کا سامان خریدنے کے لئے پیسے حاصل کر لیتے۔ ہماری راہنمائی چچا فضل درزی اور مستری غلام حسین معمار کرتے۔ دونوں پکے نمازی اور دیندار بزرگ تھے۔

مساجد کی آبادی کی اور بالخصوص دھرم شالہ کے سامنے کی مسجد کی آبادی کی تحریک میں زور پیدا کرنے کے لیے ہم نے عید میلاد النبی کی رات جوش و خروش سے منانے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ اس موقع پر محمدی پور مدینہ ضلع گجرات کے نومسلم خطیب المشہور مولوی دیندار صاحب کو بلایا جائے۔ ان کی آواز بڑی گھن گرج والی اور سریلی تھی۔ ان کا چرچا بھی خوب تھا۔ وہ سیدھے سادے سامعین کو جدھر چاہے ادھر ہانک لے جانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ خاص طور پر جب وہ معراج النبیؐ کے حوالے سے پنجابی میں ہاتھ لہرا اور جھوم کر یہ بول ادا کرتے

محمدؐ پیارا بڑی شان والا
سنے جوڑیاں عرشاں تے چڑھ جان والا

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی شان ہے کہ وہ جوتوں سمیت عرش بریں پر جا پہنچے)

تو پہلا مصرعہ وہ لوگوں کو ساتھ ملا کر پڑھتے۔ کہتے، پڑھو اور زور سے پڑھو۔ اور پھر تان اُٹھا کر دوسرا مصرعہ پڑھتے تو لوگ نعرۂ ہائے تکبیر اور نعرۂ ہائے رسالت بلند کرتے۔ ہم اپنی دانست کے مطابق کفر گڑھ میں آوازِ حق بلند کرنے کی دعوت لے کر مولوی دیندار صاحب کی خدمت میں ان کے گاؤں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمارے دینی جذبات اور تبلیغی کوششوں کو سراہتے ہوئے سبحان اللہ، کہا۔ ہمیں دودھ کی میٹھی لسی پلائی اور پھر کہا ''برخوردارو! تم ابھی بچے ہو کیا تمہارے گاؤں میں بزرگ لوگ نہیں ہیں۔ ان کو میرے پاس آنا چاہیے تھا۔ جب کسی عالمِ دین کو بلایا جاتا ہے تو اس کو خرچہ پانی بھی دیا جاتا ہے۔ میں ویسے بھی میلاد پر بڑا مصروف ہوں۔ چاند کی بارھویں کو تو میں نے کوٹ میراں جانا ہے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارا گاؤں تو

وہاں سے صرف دو میل ہے۔ ہم آپ کو لینے آ جائیں گے۔ رہا خرچہ پانی تو ہم نے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ کرائے سمیت ہم آپ کو پچیس روپے دیں گے۔ ہم نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ہم نے سامعین کے لیے دو دیگیں چاول پکانے کا بندوبست بھی کر رکھا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسجد میں آئیں' لہٰذا مولوی صاحب مطمئن رہیں۔ ان کی تقریر سننے کے لیے سامعین بھی کافی ہوں گے۔ گو ہمیں یہ تشویش دامن گیر تھی کہ ڈھیر سارے سامعین بیٹھیں گے کہاں؟ مسجد تنگ، گلی تنگ، اردگرد ہندوؤں اور سکھوں کے مکانات...... مسجد کے عین سامنے سکھوں کا جنج گھر تھا۔ ہم نے مستری غلام حسین کو ساتھ لے کر گرنتھی دیوان سنگھ سے بات کی تو اس نے بخوشی جنج گھر استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ان دنوں مذہبی یا سیاسی تعصب کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ رواداری موجود تھی۔ جلسے کی رات خود گرنتھی دیوان سنگھ نے مولوی دیندار کی پوری تقریر خاموشی سے سنی اور اس طرح سر ہلاتا رہا جیسے مولوی صاحب کا ہر بول اس کے دل و دماغ میں اترتا جا رہا ہے۔ اس نے ہمارا پرشاد (نیاز کے چاول) مجمعے میں چکھ کر ہمارے دل موہ لیے۔ ہم ان کا پرشاد حلوہ پوری کبھی نہیں چکھتے تھے۔

مولوی دیندار جب بارھویں ربیع الاول کو کوٹ میراں گئے تو اپنی عشق مصطفٰی سے رچی بسی تقریر کے دوران انھوں نے بیگو والے کے ان دو بچوں کی دینی جدوجہد کا ذکر کر کے سامعین کو بڑی غیرت دلائی اور انھیں اگلی شب ہمارے گاؤں میں ہونے والی تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی کہ وہ وہاں پہنچیں اور دیکھیں کہ کفر گڑھ میں دین اسلام کا غلغلہ کس طرح بلند ہوتا ہے۔

ہماری تقریب کو جاندار بنانے اور اس میں حصہ ڈالنے کے لیے حیدر علی کے باپ نے دو مزید دیگیں پکانے کا سامان گدھے پر لدوا کر کمہار اور حیدر علی کے ساتھ بھیجا تھا۔ مولوی دیندار صاحب کو شاید ہمارے نام بھی یاد رہے تھے لہٰذا میرا نام سن کر حیدر علی بڑا خوش ہوا تھا اور خصوصی طور پر سامان لے کر میرے ہی گھر پہنچا تھا۔ یہ میری اور حیدر علی کی آخری ملاقات تھی۔

دل ادھڑنے والے ملک غنی کا ذہن آزمانے کے لیے میں نے اس سے پوچھا ''ملک! کیا تمھیں اس کا نام یاد ہے جو کوٹ میراں سے دیگوں کا سامان لے کر آیا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں آ رہا۔'' باوجود خبطی اور ذہنی طور پر پریشان ہونے کے اس نے بتایا کہ اس کا نام حیدر علی تھا اور وہ تمہارے ساتھ چھٹی جماعت تک پڑھتا رہا تھا۔ اس کے باپ کا نام تھے خاں تھا جو

ذیل دار، سفید پوش نمبردار اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا۔ میں نے جب ملک غنی کو بتایا کہ حیدر علی ہی اب لالوڈا کو بن چکا ہے تو وہ سخت حیران ہوا اور ساتھ ہی کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

☆☆

ماں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ چھوٹا بھائی بھی پاس ہی تھا۔ ماں نے کہا ''چھوٹی عمر میں تو تم مسجدیں آباد کرتے، جلسے کرتے، جلوس نکالتے، اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے تھے اب تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ علی الصباح اٹھ کر حاجات ضروریہ سے فارغ ہو کر پھر سے سو جاتے ہو۔ ذرا بھی خدا کا خوف نہیں رہا۔ سب ایک جیسے ہی ہو۔ غنی بھی اب فلموں کے مکالمے سناتا ہے تب کنستر بجا بجا کر سحری کے لیے لوگوں کو جگایا کرتا تھا' ماں بچاری سچ ہی کہہ رہی تھی۔ ہمارا وہ ذوق وشوق کہاں چلا گیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی۔

غنی کی ماں بھی تخت پوش پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی، بولی ''بیٹی! اب یہ سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ پہلے ہماری بات مانتے تھے اور ثواب کمانے کا شوق رکھتے تھے، اب ہم کو خبطی سمجھتے ہیں اور بندگی سے گریز کرتے ہیں۔ خدا ان بچوں کو ہدایت دے۔

میں نے ذہن میں طے کر لیا تھا کہ اتوار کے روز مولوی محمد علی صاحب سے ملوں گا اور حیدر علی کے متعلق وہ کچھ پوچھوں گا جو اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ لہٰذا اس مرحلے پر مولوی محمد علی صاحب کا تعارف بے جا نہ ہوگا۔

مولوی محمد علی صاحب قصبہ بیگووالہ اور اس سے ملحقہ دیہات کی اسّی فیصد خواندہ مردوں کی دو نسلوں کے استاد تھے۔ انھوں نے قصبہ کے لوئر مڈل سکول ہی میں اپنی ساری ملازمت کا عرصہ گزارا اور صرف پہلی جماعت کے ادنیٰ اور اعلیٰ فریقوں ہی کو پڑھایا۔ ان کے چھوٹے بڑے تمام شاگردوں کو ان کا بڑا احترام تھا۔ ماں باپ ضد کرتے، چیختے چلاتے اور روتے بچوں کو ان کے پاس چھوڑ کر چلے جاتے اور وہ ان بچوں سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آتے کہ دو چار روز ہی میں بچے گھر کے بجائے اسکول آنا پسند کرنے لگتے۔ مولوی صاحب اپنے کم سن طلبہ کے لئے فارسی کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھے ؎

درس ادیب گر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

(استاد کا سبق محبت کا چشمہ ہو تو بھگوڑے طلبہ کو جمعے (چھٹی کے دن) کو بھی اسکول آنے پر مائل کر دیتا ہے)

بچوں کو اسباق ذہن نشین کرانے کے لیے انھوں نے ۳۵-۱۹۳۴ء کے دور ہی میں اپنے ہاتھوں سے کئی سمعی بصری معاوفاتِ تدریس مقامی طور پر تیار کر رکھے تھے۔ ان معاونات میں کھو کر بچے کھیل ہی کھیل میں بہت کچھ سیکھتے۔ حروف تہجی کو ذہن پر مرتسم کرنے کے لیے انھوں اپنی ہی تشبیہات وضع کر رکھی تھیں۔ جیسے الف ڈنڈے کی طرح، بے کھرلی کی طرح...... لکھنے کی مشق تختی کے علاوہ زمین پر، دھول پر اور نالہ ایک کی ریت پر کراتے۔ ہندسہ نویسی اور عملی زندگی میں ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انھوں نے ہلکے پھلکے گیت بنا رکھے تھے۔ پہلے وہ گاتے پھر بچے ان کے پیچھے پیچھے دھراتے۔ جب گیت بچوں کو یاد ہو جاتے تو ان کے ساتھ مل کر گاتے۔ بھاری وجود کے باوجود چاک چوبند تھے۔ بعض اوقات بچوں کے ساتھ ہاتھوں سے زنجیر بنا کر دائرہ بنا کر ناچ بھی لیتے۔

بچوں کو بڑی محبت سے نہانے، منہ ہاتھ دھونے اور صاف ستھرا رہنے کی تلقین اور ایسا کرنے کے فوائد بھی سمجھاتے۔ اس کے باوجود اگر کبھی کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو وہ خود ہی اس کا علاج کرتے۔ گھر جا پہنچتے۔ بچوں کے ماں باپ کو انھیں بٹھانے کی جگہ نہ ملتی۔ اتنی ہمدرد اور شفیق ہستی کو اپنے گھر پا کر لوگ نہال ہو جاتے۔ وہ مدرس بھی تھے اور طبیب بھی، لیکن کوئی مریض مدرسے کے اوقات میں ان سے نہ مل سکتا تھا۔ ہنگامی صورت حال میں مریض نالہ ایک کے پل پر بنی بادے کی کٹیا کے قریب شیشم کے پیڑوں کے نیچے ان کا انتظار کرتے۔

انھوں نے ہر بچے کا کوئی نہ کوئی پیارا نام اس کے نام سے مطابقت رکھتا، رکھا ہوا تھا۔ مجھے تو 'زلفاں' کہا کرتے تھے۔

ان کی وضع قطع اور شخصیت بھی سب پر بھاری تھی۔ سفید براق، لمبی ڈاڑھی، کشمیری چائے جیسا گلابی چہرہ، سر پر سفید عمامہ، ہاتھ میں چاندی کے گول دستے والی چھڑی اور کرتے پر پہنی واسکٹ کی جیب سے جیبی گھڑی کی لٹکتی سیاہ ڈوری ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ شاید ہی انھوں نے کبھی چھٹی کی ہو یا دیر سے آئے ہوں۔ وہ کس قدر پڑھے ہوئے تھے، ان کے پاس کون سی سند تھی۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن انھوں نے کبھی پہلی کے علاوہ کوئی جماعت نہیں پڑھائی اور نہ ہی وہ اول مدرس بن کر یا ہیڈ ماسٹر بن کر کسی اور اسکول میں گئے۔

☆☆

ان کا گاؤں پگڈنڈیوں کے راستے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ پگڈنڈیوں کے علاوہ کوئی کچا پکا راستہ نہ تھا۔ ایک روز علی الصباح خبر آئی کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا کیا مرد اور کیا عورتیں۔ ان سے ان کے گاؤں کو جانے والی ساری پگڈنڈیاں بھر گئیں۔ اتنی مخلوق فتح گڑھ پہنچی کہ گاؤں کے باہر سوگواروں کا ایک میلہ لگ گیا۔ ہر لب پر افسوس اور ہائے کا لفظ تھا اور ہر آنکھ نمناک تھی۔ فضا میں بھی سناٹا اور سوگواری محسوس ہو رہی تھی۔ مسجد کے قریب ان کے گھر کے کھلے صحن میں ان کے ساکت جسم کو رکھ دیا گیا تھا۔ سرگوشی چل رہی تھی کہ ان کا آدھا جسم ٹھنڈا اور آدھا گرم ہے۔ نبض ساکت اور دل بند ہو چکا ہے۔ بیگو والے کے خاندانی طبیب حکیم محبوب عالم ان کے جسم کے معائنے کے لیے پہنچے۔ انھوں نے آتے ہی ایک آئینہ طلب کیا۔ دم بھر میں کئی آئینے پیش کر دیے گئے۔ ان میں سے حکیم صاحب نے ایک چھوٹے سے صاف اور چمکدار آئینے کا انتخاب کیا۔ ہجوم کو ان کی چارپائی سے دور کر دیا اور آئینے کو مولوی صاحب کے منہ اور نتھنوں پر الٹا رکھ دیا۔ چند ساعتوں کے بعد آئینے کو ملاحظہ کیا۔ پھر نبض محسوس کی۔ پھر آئینے کو صاف کر کے دوبارہ پہلے کی طرح رکھا اور ان کے سینے کو مختلف سمتوں سے دبایا۔ پھر کچھ محسوس کر کے وہ ان کے جسم کو یہاں وہاں سے دباتے ہی چلے گئے۔ لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ مولوی صاحب کا پیٹ اوپر نیچے ہونے لگا تھا گویا ان کی سانس چلنے لگی تھی۔ حکیم صاحب نے اب آئینے پر ان کے سانسوں کی نمی دیکھنے کی بجائے لوگوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ''آپ لوگوں کو مبارک ہو، مولوی صاحب زندہ ہیں۔''

میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھا۔ میں یہ نہ جان سکا کہ مولوی صاحب کو کیا ہوا تھا، لیکن لوگوں کو ایک دوسرے کو بتاتے سنا کہ ان کی روح غلطی سے قبض کی گئی تھی اور عالم برزخ میں ان کی شناخت نہ ہونے اور غلطی پر ڈانٹ پڑنے پر عزرائیل علیہ السلام ان کے جسدِ خاکی میں ان کی روح پھر سے داخل کر گئے تھے کہ ابھی تو انھوں نے حج کرنا ہے۔'' واللہ علم بالصواب۔

☆☆

مولوی صاحب کے حج بیت کا فریضہ ادا کرنے کا ذکر بھی بڑا چشم کشا ہے۔

موسم گرما میں جب سکول میں تعطیلات ہو جاتیں تو وہ کسی زمیندار سے ایک دو بیگھ

زمین بٹائی پر چاول کاشت کرنے کے لیے لے لیتے۔ ایسا اور لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ جتنی افرادی قوت چاول کی کاشت کرنا چاہتی اسے زمیندار خوشی سے زمین دے دیتے تھے۔ ورنہ ان کی زمین بیکار پڑی رہ سکتی تھی۔ ایسی زمین میں ہل جوت کر زمین کو نرم کرنے کی ذمہ داری زمیندار کی ہوتی۔ بارشیں ہونے لگتیں اور ندی نالوں میں طغیانی آ جاتی تو زمین بٹائی پر لینے والے اپنا کام شروع کر دیتے۔ چاول کے پودے کی پنیری بھی زمیندار ہی مہیا کرتا۔ پنیری بونا، کھیت میں پانی لگانا اور تال (گھاس) نکالنا زمین لینے والے کا کام ہوتا۔ تال نکالنا مشکل ترین کام ہوتا۔ حبس، گرمی، تپتا پانی اور سر پر دہکتا سورج کام کرنے والے کو بے حال کر دیتا۔ اسی کام کے خوف ہی سے زمیندار زمین بنائی پر دیتے تھے۔

مولوی صاحب نے یہ کام نہ جانے کتنے برسوں تک کیا۔ پیسہ پیسہ جوڑا اور پھر اہلیہ کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا۔ جہاز پر ان کی ملاقات سیالکوٹ کے ایک تاجر کتب سے ہوئی۔ وہ مولوی صاحب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی صاحبزادی بغیر کسی تحقیق و تردد کے مولوی صاحب کی بہو بنا دی۔ بعد میں اسی بہو کی وجہ سے ان کا صاحبزادہ بھی سیالکوٹ میں تاجر کتب بنا۔ ریٹائر ہونے کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے بھی گاؤں سے شہر میں ہجرت کر لی تھی اور اب وہ طباعت کا پیشہ اپنائے ہوئے تھے۔

☆☆

اتوار کو مولوی صاحب سے ملنے کا پکا پروگرام تھا کہ علی الصباح ہی ماسٹر فتح دین، اے ڈی آئی، محمد خاں کلیم کا پیغام لے کر آ گئے کہ آج مجھے کلیم صاحب کے ساتھ محمود الحسن انصاری انسپکٹر پولیس کے ہاں ایک تقریب میں جانا ہے۔

الغرض دس بجے کلیم صاحب سے ملا۔ کچھ دیر شعر و شاعری ہوتی رہی۔ پھر ہم ٹھیک گیارہ بجے انصاری صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ وہاں ان کے آبائی شہر ملتان سے تین موسیقار آئے ہوئے تھے۔ شہر کے اور بھی چند معززین مدعو تھے۔ سارنگی، طبلے اور ہارمونیم پر پکے راگوں کی دھنیں سنا سنا کر موسیقار خود تو بے حال ہوتے رہے اور سامعین کو بیزار کرتے رہے کیونکہ پکے راگ سننے کا کوئی بھی عادی نہ تھا۔ اگر بعد میں پُر تکلف کھانے کا بندوبست نہ ہوتا تو شاید کچھ مدعوئین بیزاری کی وجہ سے اٹھ کر بھی چلے جاتے۔

ایک دھن پر کسی نے داد دی "کیا فن ہے، بھئی کمال ہے۔"

''پکے راگ سننا بھی بڑا فن ہے۔ سننے والوں کا بھی کمال ہے۔'' انصاری صاحب نے خود ہی کہا۔

''ہم تو جی پہلے ہی اناڑیوں سے کہہ دیتے ہیں۔ بھاگ جاؤ یا پھر برداشت کرو۔ آپ نے اچھے برداشت کرنے والے سامعین مہیا کئے ہیں۔ آپ کا بڑا شکریہ''۔ ایک بزرگ موسیقار نے جواب دیا۔

انصاری صاحب نے کیا اچھے سامعین اکٹھے کرنے تھے۔ یہ تو ان کی مہمان نوازی کی وجہ سے اکٹھے ہو گئے ہیں'' کسی اور نے لقمہ دیا۔

''بھئی میں تو پولیس کے ڈر سے چپکا بیٹھا رہا ہوں۔'' ایک صاحب بولے۔

محفل اچھی رہی، لیکن میرا پورا دن ضائع ہو گیا۔ میں بھی اپنے افسر کی فہمائش کے آگے مجبور تھا اور یہ فہمائش تھی بھی محبت کی۔ انہی کی وجہ سے مستقبل میں میرے تعلقات انصاری صاحب سے بڑھے، کچھ وہ نکلے بھی اپنے جیسے ذوق وشوق کے۔

وہ ایک اچھے انسان تھے۔ میرے کئی کام جو دراصل دوسروں کے تھے انھوں نے کئے، لیکن میرے ایم۔اے کرنے میں بھی ان کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔ وہ خود ایم۔اے، ایل ایل بی تھے اور میں ان کی اس ذاتی اہلیت سے بڑا متاثر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ذاتی اوصاف اور اہلیت ہی فخر کی چیزیں ہیں، باقی عہدے اور افسری تو آتی جاتی رہنے والی عزتیں ہیں۔

جب میں نے ۱۹۵۷ء میں ایم۔اے کیا تو وہ جھنگ میں خفیہ پولیس کے انسپکٹر تھے۔ انھوں نے مجھے مبارک باد کا خط لکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ان سے میری ملاقات ۱۹۶۹ء میں لاہور میں ہوئی یہاں وہ پرانی انارکلی میں ڈی۔ایس۔پی تھے۔ پھر وہ ایس پی ہو گئے اور اخباروں کی خبروں میں ان کا تذکرہ پڑھنے کو ملا۔

◆◆◆◆◆

(۱۶)

ایک انوکھے منشی جی

ماسٹر غلام علی مرحوم کی جگہ ایک ادھیڑ عمر کے کوٹ شلوار کے ساتھ ٹائی لگانے والے چون سال کے مدرس کو نارووال کے قریب ان کے کسی قریبی گاؤں سے تبدیل کر کے کالا بھیجا گیا۔ وہ ایک ٹرنک اور بستر تانگے پر لادے اسکول پہنچے تانگے والے کو انتظار میں کھڑا کر کے خود سیدھے میرے دفتر میں آئے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ کیا اسکول کی عمارت اتنی ہی ہے؟ اور کیا اسکول میں ان کی رہائش کی گنجائش ہے؟ اگر ایسا ہے تو الحمدللہ۔ ورنہ وہ تانگے سمیت اپنے سسر ممبر ڈسٹرکٹ رانا دلفریب خاں کی ماں کے پاس جاتے ہیں۔ بڑے اکھڑ آدمی لگ رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو سے تھوڑا سا محظوظ بھی ہوا۔ میں نے کہا'' حضرت ادھر دو استاد مستقلاً رہتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی رہ لیتا ہوں، لیکن اگر آپ کے سسر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہیں اور آپ کی زوجہ محترمہ کی دادی ادھر ہی کہیں قریب ہے تو ان کے پاس رہنا زیادہ مفید رہے گا۔

''تو پھر میں ٹیلے ہی پر اس کوٹھڑی میں بستر اور ٹرنک رکھ لیتا ہوں کیونکہ میرے سسر کی ماں کئی برس ہوئے قبرستان ہی میں مقیم ہے۔ میں ان کی تلخی کی تہہ تک پہنچ رہا تھا۔ کئی ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ تھوڑی سی انا، تھوڑی سی غیرت یا تھوڑی سی خودداری رکھنے والے مدرسین کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور ان کو دور دراز تبدیل کرا کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کرتے تھے۔

موضع جبال میں میرے ہانڈی وال منشی احمد دین جے وی مدرس کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ ماسٹر دلدار علی سے بھی کوئی ممبر ناراض تھے اور ان کا تبادلہ ان کے گھر سے پچاس میل دور کرا دیا تھا۔ وہ اسے اپنا سسر کہہ کر غصے اور نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے ماسٹر بشیر کو بلا کر ان کا سامان رصدگاہ کے بجائے کوٹھڑی میں رکھوایا۔ ان کو تسلی دی کہ وہ کوئی فکر نہ

کریں۔وہ بھی بڑا جفا کیش شخص تھا اس نے کہا کہ گزشتہ تین سال سے ان کا سسر کئی چمچوں کو ان کے پاس بھیج چکا ہے کہ وہ اس سے صلح کر لیں، لیکن اب میری سروس گیارہ ماہ رہ گئی ہے (ان دنوں ریٹائرمنٹ کی عمر پچپن سال تھی) ادھر ہی کٹ جائے گی، مگر میں اسے جوتی کی نوک پر ہی رکھوں گا۔

پتہ چلا کہ اشتمال اراضی میں ان کی خاندانی ملکیتی اچھی زمین کے ٹکڑے کے عوض تین گنا بنجر زمین دلا کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر نے ان پر جو احسان کیا تھا انھوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔عدالتوں سے وہ جیت چکے تھے اور اب ممبر صاحب نے ریونیو بورڈ میں اپیل دائر کر رکھی تھی اور وہاں بھی اسے شکست نظر آ رہی تھی۔ ماسٹر صاحب بھی بہت سے قاعدے قانونوں سے آگاہی رکھتے تھے۔کوئی مربع بھر زمین کے واحد مالک تھے اور ان کا ایک بیٹا فوج میں افسر تھا جس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ اسے زمینداروں کے معاملات کا کیا علم۔یہ بھی بتایا کہ ان کا بیٹا ممبر کے شریکوں کے ہاں ہی بیاہا ہوا ہے، لیکن انھوں نے کبھی بیٹے کو اپنے معاملات کے متعلق نہیں بتایا۔دوسرا بیٹا نارووال میں آڑھتی تھا۔خوب کما کھا رہا تھا۔تیسرا زمیندارہ کر رہا ہے۔خوش ہے۔پچھلے سال ان کی اپنی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اب وہ ''دم کا دم' نہ دکھ نہ غم'' کے مصداق اپنا بستر اور ٹرنک اٹھا کر جہاں تبادلہ ہو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ بھی معلوم ہوا کہ موصوف خاصے مجلسی آدمی ہیں۔بشیر اور صدیق نے بتایا کہ ان کو محکمہ تعلیم کے افسران، تحصیل کے اہلکاروں اور چودھریوں، ذیلداروں، سفید پوشوں اور نمبرداروں کی ایسی ایسی کہانیاں یاد ہیں جن کو وہ ہمیں سناتے اور ہنساتے نہیں تھکتے۔ جب انھیں صدیق اور بشیر نے میرے متعلق بتایا کہ وہ بھی کتابیں اور رسالے پڑھنے کے علاوہ نئی نئی باتیں سننے سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں تو ماسٹر دلدار علی نے کہا کہ انھیں تو ساری سروس میں کسی ایسے آدمی کی تلاش ہی رہی ہے جو ان کی باتیں سنے اور انھیں تول سکے۔ میں نے صدیق اور بشیر سے کہا کہ وہ ماسٹر دلدار علی کو کہہ دیں کہ وہ آیندہ سنٹر میٹنگ پر کوئی سچی، انوکھی اور محکمے کے حوالے کی داستان سنانے کے لیے تیار رہیں۔

موصوف سے پوچھا گیا کہ کیا اس علاقے میں ان کے کوئی واقف کار مدرس تعینات نہیں۔انھوں نے کہا کہ ہیں۔ان کا نام ماسٹر رحیم بخش ہے۔ جب وہ جے وی میں تھے، تو وہ ایس وی میں تھا۔ہم دونوں میراثی نہیں، لیکن ہم جگت باز مشہور تھے۔خدا نے ہمیں حاضر دماغی

کی صلاحیت بخشی ہے۔ میں تو ادھر ادھر بڑی جگہوں پر رہا ہوں' لیکن وہ پہلے کلو و دال میں تھا جب مرالہ ہیڈ ورکس کا اسکول مڈل بنا تو تب سے وہ وہاں ہے۔ مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ''اس سے ملنے کا ارادہ ہے۔ وہ بھی میری عمر ہی کا تھا ایسا نہ ہو کہ ریٹائر ہو گیا ہو۔'' پرائمری اسکول چٹی شیخاں کے اول مدرس بھی دلدار علی کے ایس وی کے ساتھی نکلے۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ ماسٹر رحیم بخش کے تو ابھی دو سال رہتے ہیں۔ وہ نارمل اسکول گکھڑ کی اور ماسٹر رحیم بخش کی باتیں کرتے اور خوش ہوتے رہے۔

ماسٹر صدیق اور بشیر کو ان سے کچھ شکایات تھیں۔ ایک شکایت یہ تھی کہ وہ علی الصباح بیدار ہو جاتے تھے اور ان سے بھی کہتے تھے کہ اٹھو۔ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو خیر نہیں اٹھتے تھے لیکن وہ مسجد میں نماز ادا کر کے واپس آ کر اونچی اونچی آواز میں ذکر کرتے تھے۔ پھر وہ دہی کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ ماسٹر بشیر کو ان کے لیے دہی جمانا پڑتا تھا کیونکہ گاؤں میں دودھ دہی کی دکان نہیں تھی۔ دودھ بیچنے کا بھی رواج نہ تھا' لہٰذا باری باری طلبہ کے گھروں سے منگوایا جاتا۔ اس کے علاوہ وہ جب ماضی کی باتیں سنانے لگتے تو ان کو سونے نہ دیتے۔ انھیں اردو اور پنجابی کے اتنے ضرب الامثال یاد تھے کہ ہر موقع پر بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے۔ دوسروں کا ادب کرتے تھے اور ان سے اپنا ادب واحترام کرانا جانتے تھے۔ مختصراً یہ کہ ان کے گن شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔

پڑھاتے بھی خوب تھے۔ ان کی جماعت کے بچے خوب تیز ہو رہے تھے لیکن انھوں نے اپنی تدریسی ڈائری کبھی خود نہیں لکھی۔ ماسٹر صدیق سے لکھوائی اور درس و تدریس کبھی سلیبس کے مطابق نہیں کی۔ ان کے اپنے ہی طریقہ ہائے تدریس تھے۔ بہر کیف وہ ایک کامیاب انسان' معلم اور بہترین رفیق کار تھے۔

☆☆

سینٹر میٹنگ کے دن ماسٹر دلدار علی نے اپنی یادداشتوں کی پوتھی کھولی اور انھوں نے دو پنڈتوں کی سچی کہانی سنائی۔ ایک پنڈت معمولی مدرس تھا جبکہ دوسرا سر رشتۂ تعلیم ضلع سیالکوٹ کا ضلعی انسپکٹر۔ پنڈت رام داس مدرس اپنے گھر کی پالی گائے کے دودھ سے تیار کردہ خالص گھی کا ایک کنستر لے کر ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے گھر حاضر ہوا۔ جب گھی شرف قبولیت پا چکا تو رام داس نے صاحب کی خدمت میں اپنے تبادلے کی درخواست بھی پیش کی۔ پنڈت جی نے درخواست اپنے

گھر میں موجود چپڑاسی کو تھمائی کہ دفتر میں انھیں یاد دلائے کہ منشی رام داس کا تبادلہ آج ہی کرنا ہے۔

آج ہی تبادلہ کرنے کی وجہ بھی بڑی معقول تھی جسے رام داس نے زبانی زبانی پنڈت جی کے گوش گزار کیا۔ ''جناب ماتا پتا بوڑھے ہیں۔ ان کو سنبھالنے والا سوائے میرے اور میری پتنی کے اور کوئی نہیں۔ پتنی کو ماں باپ کے پاس چھوڑتا ہوں تو وہ ناراض ہو جاتی ہے کہ اس کے پھیرے میرے ساتھ ہوئے ہیں میرے ماتا پتا کے ساتھ نہیں۔ وہ میرے ہی ساتھ نرک یا سورگ میں رہنا چاہتی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لاتا ہوں تو ماتا مجھے سراپ دیتی ہے۔ باپو الگ طعنے دیتا ہے کہ کیا اس نے مجھے اسی لیے پالا پوسا تھا کہ بوڑھی عمر میں وہ دردر بھٹکتا پھرے۔

چپڑاسی گھی کا کنستر رسوئی میں چھوڑ کر آیا تو پنڈت جی نے رام داس سے مصافحہ کیا اور اسے یقین دلایا کہ اس کے گھر کے نزدیک ترین خالی آسامی تلاش کر کے اس کے احکامات تبادلہ جاری کر دیے جائیں گے۔

پورا ہفتہ گزر گیا مگر احکامات تبادلہ رام داس کو موصول نہ ہوئے۔ وہ پنڈت جی سے گھر پر ملنے گیا۔ اس مرتبہ وہ خالی ہاتھ تھا' لہٰذا پنڈت جی نے نندو کے ذریعے کہلا بھیجا کہ وہ دو گھنٹے بعد ان سے دفتر میں ملے۔ رام داس دفتر پہنچا اور سارا دن پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا۔ دفتر کے اہلکاروں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ دن تو صاحب کے دورے کا دن تھا۔ یہی کہتے رہے کہ پنڈت جی ابھی آتے ہیں' مایوس ہو کر رام داس گھر لوٹ گیا۔

دو تین دن مزید انتظار کر کے رام داس پنڈت جی سے ان کے دفتر میں ملا تو پنڈت جی نے رام داس کو بتایا کہ اے ڈی آئی حلقہ کورس پر گیا ہوا ہے۔ کل واپس آ رہا ہے' اس کے آتے ہی تبادلے کے احکامات جاری ہو جائیں گے۔ پورا ہفتہ پھر سے گزر گیا تو رام داس پھر دفتر جا دھمکا۔ اب کے پنڈت جی نے ذرا تلخ لہجے میں رام داس کو سمجھایا کہ انھیں صرف اس کے تبادلے کے حکم جاری کرنے کا کام ہی نہیں اور بھی بہت سے سرکاری کام ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ہیڈ کلرک کو بلا کر پوچھا کہ منشی رام داس کے تبادلے کا کیا بنا ہے؟ تو ہیڈ کلرک نے کہا کہ وہ ابھی معاملہ پیش کرتا ہے۔ پنڈت جی نے رام داس سے ایک دو دن اسکول ہی میں احکامات کے پہنچنے کا انتظار کرنے کو کہا اور دفتر کے چکر لگانے سے سختی سے منع کر دیا۔

ہیڈ کلرک منشی رام داس پر الگ ناراض ہوا۔ ''آ جاتے ہیں افسران سے ملنے' ان مدرسوں کو وقت کی ذرا بھی قدر نہیں' بھاگے دوڑتے ہیں شہر کو مدرسہ خالی چھوڑ کر...... اور پھر

سیدھے بنگلے پر جا پہنچتے ہیں...... ان کو 'پراپر چینل' کا بھی علم نہیں۔"

الغرض احکامات آنے تھے نہ آئے۔ گھی کا کنستر ضائع ہوتا دیکھ کر رام داس سخت رنجیدہ خاطر تھا۔ اس کی بیوی نے تو یہ تک کہہ دیا کہ وہ کنستر بیچ کر چسکا لگا چکا ہے، خوامخواہ افسر کو دینے کی بات بنا رہا ہے۔ طیش میں آ کر اتوار کے دن رام داس نے پنڈت جی کو پھر بنگلے ہی پر جا کر ملنے کا پروگرام بنایا۔ ساتھ ہی سوچا کہ گھر سے سترہ میل کے فاصلے پر تو وہ پہلے ہی بیٹھا ہے اور کیا ہو گا؟ وہ دو چار میل اور دور پھینک دیا جائے گا، مگر اب کے وہ پنڈت جی کو کھلی کھلی اور کھری کھری سنائے گا۔

پنڈت جی اس وقت دھوتی باندھے برامدے میں بچھی چار پائی پر نیم دراز تھے۔ رام داس کو آتے دیکھ کر غصے سے بولے "رام داس! تم میری ناف چیڑ کر میرے اوپر ہی سوار ہو گئے ہو، بھاگ جاؤ، کل دفتر میں ملنا۔ اتوار کے دن بھی آرام نہیں کرنے دیتے۔"

رام داس اس اچانک حملے سے گھبرا گیا تاہم اس نے بیوی کے طعنے یاد کئے اور کہا "جناب! مہینہ پہلے بھی تو میں گھر پر ہی ملا تھا۔ میری پتنی کہتی ہے کہ میں گھی بیچ کر چسکا لگا چکا ہوں۔ اگر افسر کے پاس پہنچایا ہوتا تو اب تک کام ہو جاتا۔"

"کس گھی کی بات کرتے ہو؟ وہ جو ملیچھوں کے گھروں سے اکٹھا کر کے لائے تھے۔ لے جاؤ اسے بھی......" پنڈت جی نے غصے میں نندو کو آواز دی۔ اس کے آنے پر پنڈت جی نے اسے کہا "وہ ملیچھوں کے گھروں والے گھی کا کنستر منشی رام داس کو واپس کر دو اور اسے کہو کہ آئندہ مجھے نظر نہ آئے۔"

نندو اندر گیا اور منشی رام داس والا خالی کنستر لا کر اسے تھماتے ہوئے بولا "پلید شے کو افسروں کی نذر نہیں کرتے، تم تو خود بھی پنڈت ہو۔"

پنڈت جی اس اثناء میں اندر جا چکے تھے۔ رام داس کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر پنڈت مرلی دھر کو کوسنے لگا۔ جب تھک گیا تو نندو اسے دلاسہ دے کر سڑک تک چھوڑ گیا۔ واپس اپنے گھر جا کر وہ سب کے سامنے رو ہی دیا کہ اس کی نہ صرف بے عزتی ہوئی ہے بلکہ گھی کو بھی پھینک دیا گیا ہے، اس کا تبادلہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجبور ہے لہٰذا اب وہ سارے کنبے کو ہی نندگڑھ لے جائے گا۔ کل وہ اسکول پہنچتے ہی گاؤں میں کوئی گھر تلاش کرے گا۔

رام داس کو گھر تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے تبادلے کے احکامات

اتوار کے دن خصوصی طور پر نندو کے ذریعے مرکزی سکول میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ اسے اس کے اپنے ہی گاؤں آدم کے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ احکامات پر اجراء کی تاریخ ایک ہفتہ قبل کی درج کی گئی تھی۔

اگلی اتوار گھر کے بنے بوندی کے لڈوؤں کی ٹوکری لیے وہ پھر صاحب کے بنگلے میں پہنچ گیا اور پنڈت مرلی دھر نے اسے پیڑوں کی لسی کے ساتھ دو بوندی کے لڈو بھی کھلائے اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کے گھی کی تعریف کی اور پوچھا کہ کیا قیمتاً ویسا گھی پھر سے مل سکتا ہے؟ پھر راز داری سے رام داس سے پوچھا کہ وہ دھرم سے بتائے کہ اس نے کتنے بابوؤں اور کتنے مدرسین کو یہ بتایا ہے کہ پنڈت مرلی دھر کو ناف چیڑ نے کے لیے پورے ایک کنستر گھی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر خالی کنستر بھی واپس مل جاتا ہے۔ دوبارہ بھر کر لانے کے لیے......رام داس کچھ سمجھا' کچھ نہیں سمجھا۔ پرنام کیا اور لوٹ گیا۔

☆☆

تجسس اور انتظار کے باوجود حیدر علی لوٹا تھا اور نہ ہی میں منشی محمد علی صاحب سے ملنے جا سکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مصروفیت اللہ کی نعمت ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں، لیکن اس قدر بھی مصروفیت کیا کہ صبح سے لے کر رات دس بجے تک کام کرو اور درمیان میں بارہ میل سائیکل پر سفر بھی کرو۔ کیا زندگی تھی ماسٹر دلدار علی کی کہ چون برس کی عمر میں بھی کھلنڈرا بچہ لگتے تھے۔ میں ان کی زندگی کے اس آزاد اور درویشانہ پہلو سے بڑا متاثر ہو رہا تھا۔ میں بھی ان کی سی بے فکری چاہتا تھا' لیکن دلدار علی نے ہی باتوں باتوں میں مجھے سمجھایا کہ میری عمر کام کرنے کی ہے۔ مجھے کام سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ جب جی چاہے ایک دو چھٹیاں کر لیا کروں۔ یہی تو مدرسین کی عیاشی ہے کہ چھٹیاں خوب ملتی ہیں اور مرضی سے بھی کی جا سکتی ہیں۔

ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اتوار کے ساتھ سوموار اور منگل کی چھٹیاں لیں اور بیوی کے ساتھ گاؤں چلا گیا۔ اڑوس پڑوس اور چچا کے ہاں خوب مہمانیاں کھائیں۔ تازہ دم ہو کر چوتھے روز اسکول پہنچنے کے لیے جونہی میں کپور والی سے آگے گزرا' تو مجھے بینڈ بجنے کی آواز سنائی دی۔ کالے کے اسکول میں تو کوئی بینڈ نہیں تھا۔ ''یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔'' میں نے سوچا۔

اسکول پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سارے بچے ٹیلے والی والی بال گراؤنڈ کے چاند تارے

والی ڈھلوان کے اوپر بیٹھے ہیں۔ اساتذہ کرام اور حقوں کی نے منہ میں دبائے کئی دیہاتی بینڈ بجتا دیکھ اور سن رہے ہیں۔ مجھے آتا دیکھ کر ضلع کے اکلوتے بینڈ ماسٹر سید کرم حسین شاہ نے ڈرم کوٹتے دلدار علی اور طنبورے بجاتے گھسن کو اپنی کلارینٹ لہرا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر ان سے کہا ''سلو مارچ...... سلامی کی دھن۔'' اس دھن کو بجا کر بینڈ ماسٹر صاحب میری طرف بڑھے اور میرے ساتھ مصافحہ کیا۔

''سرکار' آپ کدھر...... اور یہ بینڈ' کیا چکر ہے؟ میں نے پوچھا۔

''دفتر میں بیٹھ کر عرض کرتا ہوں۔'' شاہ صاحب نے فرمایا۔

''اپنے الفاظ واپس لیں۔ آپ عرض نہیں کریں گے۔ فرمائیں گے۔ آپ میرے بزرگ بھی ہیں اور استاد بھی......''

''مگر اس وقت تو آپ ہیڈ ماسٹر ہیں اور میں بینڈ ماسٹر۔'' انھوں نے کہا اور ہم دونوں دفتر میں آ بیٹھے۔

کلیم صاحب نے اسکول کے سپورٹس فنڈ کے کھاتے سے پچاس روپے ماہوار ادائیگی پر بینڈ سیالکوٹ شہر کی جانی پہچانی فرم سے خرید کر دیا تھا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کو کہہ کر بینڈ ماسٹر صاحب کو بھی ایک ماہ کے لیے اسکول بھیجا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پچھلے سال ٹورنامنٹ میں اسکول کے واحد اتھلیٹ نے جو شیلڈ جیتی تھی آئندہ سال بھی ہمارے ہی اسکول کے پاس رہے۔ شاہ صاحب نے دو دنوں کے اندر اندر بینڈ اور اس کے فوائد کے بارے میں دو چار موٹی موٹی باتیں دلدار علی اور گھسن کے علاوہ ساتویں جماعت کے چند طلبہ کو سمجھائی تھیں۔ میں ان کا مظاہرہ دیکھ ہی چکا تھا۔ ٹورنامنٹوں کا آغاز ہونے سے پہلے شاہ صاحب ایک مزاحیہ قوالی

بڑے شوق سے نورِ نظر' لختِ جگر پیدا کرو
مگر ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی پیدا کرو

تیار کرنے' خاموش ڈرل کا ایک گروپ تیار کرنے اور اسکول میں ایک ڈراما کرنے کا پروگرام وضع کر رکھا تھا۔ دلدار علی پہلے ہی سے شاہ صاحب کے خاص جان پہچان والے تھے۔ گھسن بھی ان کو جانتا تھا۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت کی تعلیم کے دوران میں وہ ماڈل سکول سمبڑیال میں مستقلاً بینڈ ماسٹر تعینات تھے۔ جب ماڈل اسکول اپنے خصوصی ساز وسامان اور نوادرات کے ساتھ ستراہ تبدیل ہوا تو وہ وہاں چلے گئے۔ ستراہ ہی سے ماڈل اسکول کی سکیم ختم ہو گئی تو اب

انھیں ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کسی بھی بینڈ رکھنے والے مڈل اسکول میں ایک ماہ کے لیے بھیج دیتے تھے۔ کلیم صاحب بھی چونکہ سمبڑیال میں غیر تربیت یافتہ معلم رہے تھے اس لیے وہ بھی شاہ صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے جسے شاہ صاحب ''بندہ پروری'' قرار دیتے تھے۔

سید کرم حسین شاہ، خانپور سیداں کے سادات گھرانے سے تھے۔ کسی زمانے میں وہ ایک پارسی تھیٹر میں میوزک ماسٹر تھے۔ پھر انھوں نے اپنا ایک سرکس بنالیا جسے ملایا، سنگاپور اور جاپان تک لے گئے۔ ہانگ کانگ میں جا کر انھوں نے سرکس کو بیچ دیا اور فوج میں بھرتی ہو گئے۔ وہاں وہ بینڈ میں کلارینٹ ہی بجایا کرتے تھے اور اسے ''پپی'' کہا کرتے تھے۔ کثیر العیال تھے اس لیے کئی پریشانیوں کا شکار تھے۔ پھر بھی ان کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں غموں کو دل پر لگانے لگوں تو پھر میں ''پپی'' نہیں بجاسکتا۔ ان کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ ان کے سر پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ چمکتی تانبے ایسی ٹانٹ تھی لیکن جب وہ اپنے گھر جاتے تو اپنی بیٹیوں سے کہتے ''ذرا میرے سر سے جوئیں تو نکال دو۔'' بیٹیاں ہنستیں، تو کہتے ''چلو پھر کنگھی ہی کر دو۔'' وہ اور قہقہے لگاتیں۔ وہ ان کو ہنسانے ہی کے لیے ایسی باتیں کرتے تھے۔

کالے ہی کا لطیفہ ہے کہ دیہاتی حجام سے وہ شیو کرا رہے تھے۔ کند استرے کی وجہ سے حجام نے ان کے چہرے پر کئی کٹ لگا دیے۔ جب حجام فارغ ہو چکا تو شاہ صاحب نے اسے روکتے ہوئے کہا ''بھئی، پرہیز وغیرہ تو بتاتے جاؤ۔''

میرے استاد وہ اس لیے تھے کہ میں نے ان سے ساتویں جماعت میں طنبورہ بجانا سیکھنا چاہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم شیشم کی ٹہنیوں سے ڈگے بنالاؤ، پہلے تمھیں زمین پر دھن نکالنا سمجھاؤں گا۔ پھر ساگوانی نفیس ڈگوں سے طنبورے کی نازک کھال پر ضربیں لگانے کا ڈھنگ بتاؤں گا۔ میں نے اسکاؤٹ ماسٹر صاحب سے اسکاؤٹنگ کا کلہاڑا لیا اور ریلوے لائن کے قریب ایک شیشم کے درخت پر جا چڑھا۔ دیہاتی لڑکے عموماً درختوں پر چڑھنا لاشعوری طور پر سیکھ جاتے ہیں۔ میں نے دو بڑے تنوں کے سنگم پر ایک پاؤں جمایا۔ دوسرا پاؤں ایک مضبوط شاخ پر رکھا اور پھر کلہاڑا آسانی سے زد میں آ جانے والی شاخ پر آزمایا۔ وہ آسانی سے کٹ گئی۔ مین نے اسے پکڑ کر نیچے پھینکا۔ مبادا وہ از خود گرتی ہوئی کہیں دوسری شاخوں میں پھنس کر نہ رہ جائے، لیکن احتیاط کے باوجود وہ نچلی ٹہنیوں میں پھنس کر رہ گئی۔ اب میں نے ایک اور شاخ کو تاکا۔ مجھے اندازہ نہ ہوا کہ میں نے مضبوط شاخ سے اپنا پاؤں اٹھا کر نسبتاً کمزور شاخ پر

رکھ لیا ہے۔ اب جو کلہاڑا چلایا تو وہ اوپر کی شاخ کاٹتا ہوا اس شاخ کو بھی کاٹتا چلا گیا جس پر میرا پاؤں ٹکا ہوا تھا۔ شیخ چلی والی بات ہوگئی۔ میں چکرا کر نیچے گرا۔ شومئی قسمت کہ میں نے گرتے ہوئے جس شاخ کو تھامنے کی کوشش کی وہ وہی شاخ تھی جسے میں نے کاٹ کر نیچے پھینکا تھا اور وہ ٹہنیوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ میں دھم سے زمین پر گرا۔ مجھے ہوش تھا۔ وہ ٹہنی اب بھی میرے ہاتھ میں تھی، مگر کلہاڑا کہیں اوپر ہی الجھ کر رہ گیا۔ اسٹیشن سے بہت سے لوگ مجھے اٹھانے کو لپکے۔ ابھی وہ مجھ تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ دو سیر وزن کا کلہاڑا میرے پیٹ سے دو انچ کے فاصلے پر زمین پر آ گرا۔ لوگ قدرت کی مہربانی کی داد دینے لگے کہ اگر کلہاڑا دو انچ پرے گرنے کے بجائے بچے کے پیٹ پر گرتا تو یہ ختم ہو جاتا، جبکہ کلہاڑا اگر اس وقت گرتا جب وہ سب مجھ تک پہنچ چکے ہوتے، تو ان میں سے کسی ایک کو لے ڈوبتا۔ میرے بائیں ہاتھ میں شدید درد ہونے لگا۔

اپنی جگہ سے ٹلا ہوا ہاتھ ڈاکٹر، جراحوں، پہلوانوں اور قسم قسم کے معالجوں سے علاج کرانے کے بعد تین ماہ میں جا کر سیدھا ہوا۔ اب بھی دائیں اور بائیں کلائیوں کی ہڈیوں میں نمایاں فرق موجود ہے۔ شاہ صاحب کو بھی یہ بات یاد تھی انھوں نے میرے دونوں ہاتھ اور کلائیاں ملاحظہ کیں اور کہا ''شکر ہے کہ زیادہ فرق نہیں ہے۔''

''لیکن خدا کے لیے اب کسی بچے کو شیشم کے ڈُگے بنا کر لانے کو نہ کہیۓ گا۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور مجھے بتایا کہ میری عدم موجودگی میں اساتذہ نے ان کی بڑی عزت کی ہے۔ ان کے رہنے کا انتظام مسجد کے حجرے میں کر دیا گیا ہے کیونکہ اسکول میں گنجائش کم ہے۔

کچھ دن بینڈ غیر معمولی طور پر سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا۔ پھر قوالی، پی ٹی شو کا چرچا رہا۔ ہمارا سلسلہ بخوبی چلتا رہا۔ اساتذہ خوب متحرک تھے۔ دلدار علی نے باتوں باتوں میں سب مدرسین کی خوب اصلاح کی تھی اور اپنا ایک خصوصی مقام پیدا کر لیا تھا۔

☆☆

لاشعوری طور پر مجھے حیدر علی کا انتظار رہتا تھا۔

مصروفیت نے مجھے مولوی محمد علی صاحب کے پاس نہیں جانے دیا تھا۔

شہر میں ہمارا ٹیوشن مرکز خوب چل رہا تھا۔ ماں بھی خوش تھی۔ بھائی بھی شاداں و فرحاں تھے کہ اچانک عبدالغنی کی ماں نے اپنے مکان کو رہن رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ غنی کی بیکاری اور

بیماری کی وجہ سے ان کی گزر بسر نہیں ہو رہی تھی۔ میں تین ہزار روپے میں ان کو اپنے حصے کی رہائش گروی لینے کو تیار تھا، لیکن ان کا مطالبہ پانچ ہزار کا تھا۔ میں اتنے روپے نہیں دے سکتا تھا، لہٰذا انھوں نے لجاجت اور شرمندگی سے ہمیں کوئی اور مکان تلاش کر لینے کو کہا۔

سالانہ امتحانات قریب آ رہے تھے اور مجھے آٹھویں جماعت کی انگریزی پھر سے غیر معیاری معلوم ہو رہی تھی۔ ادھر ٹورنامنٹ کا ہنگامہ شروع ہونے والا تھا۔ رہائش کی تبدیلی سے ہمارے ٹیوشن سنٹر پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ ایم اے کرنے کا فکر الگ دامن گیر تھا۔ یہ خیال بھی میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا کہ میں سرکاری ملازمت سے بھاگ کر مہا غلطی کر چکا ہوں۔ دیہات میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میرے ان خیالات میں شدت دلدار علی نے پیدا کی۔ اس نے کہا کہ اگر میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت میں ہزاروں کارنامے بھی کر دکھاؤں تو میری زیادہ سے زیادہ ترقی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر ہی ہوگی اور وہ بھی جانے کب۔ جبکہ سرکاری ملازمت میں جا کر میں اے ڈی ائی، ڈی آئی اور انسپکٹر تک بن سکتا ہوں۔ تنخواہ بھی معقول ہوگی اور عزت بھی۔

میں نے دلدار علی کی باتوں سے بڑا اثر قبول کیا اور زندگی کے چلن کو بدلنے کے متعلق سوچنے لگا۔ خاموشی سے ایک خط پھر سے گردیزی صاحب کو لکھا کہ مجھے سرکاری ملازمت ترک کرنے کی اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہوتا رہتا ہے اور میں پریشان ہوں، لہٰذا وہ پھر سے اپنے تعلقات استعمال کریں اور مجھے کہیں بھی ملازمت دلائیں۔ ان کا جواب آیا کہ میں اپنی درخواست لاہور جا کر ریجنل ڈائریکٹر کے دفتر میں جمع کراؤں۔ وہ ملک فتح دین کو کہہ دیں گے۔ میں جب اپنی درخواست جمع کرانے لاہور گیا تو اپنے چچا فاروقی سے بھی ملا اور ان سے پوچھا کہ چھوٹے بھائی کا میرٹ نمبر ملازمت کے لیے آیا ہے یا نہیں۔ انھوں نے متعلقہ ہیڈ کلرک جنرل کو بلا کر پوچھا، تو اس نے بتایا کہ بس دس گیارہ نمبر اوپر رہ گئے ہیں اور اسے امید ہے کہ مئی ۵۵ تک سرفراز احمد کی تقرری کے احکامات جاری ہو جائیں گے۔

انہی ایام میں جب میں بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور بڑا افسردہ بلکہ آزردہ آزردہ محسوس کر رہا تھا۔ ہم نے رہائش تبدیل کر لی تھی۔ ہمیں سول اسپتال کے قریب بجلی محلے میں مکان ملا تھا۔ یہاں سے مجھے کالا تقریباً ایک میل نزدیک ہو گیا تھا، لیکن میں ٹیوشن سنٹر پر نہیں جا سکتا تھا۔ میری بیوی بھی اس نئے مکان میں آ کر خوش نہ تھی، ماں کو بھی مکان پسند نہ تھا۔

یہاں سے شہاباں قریب تھا' لہٰذا میں ایک اتوار کو مولوی صاحب کی دعائیں لینے ان کے مطب میں جا حاضر ہوا۔ وہاں حیدر علی بڑی مسکین حالت میں کامدار کرتہ پہنے اور تہ بند کے لڑ چھوڑے کوئی دوائی کھرل کر رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اپنا مسکراتا ہوا چہرہ سمیٹے کھڑا ہو گیا اور دو قدم میری طرف بڑھ کر بڑے تپاک سے میرے ساتھ بغل گیر ہوا۔ وہی پہلی ملاقات جیسا خلوص اس کے بازوؤں نے میرے اندر منتقل کر دیا۔ ایک ڈاکو کے اندر ایک پرانے ہم جماعت کے لیے اس قدر محبت ایک انوکھی بات ہی تھی۔ وہ خود بھی تو انوکھا ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک مسکین سا دیہاتی اپلوں کی ڈھیر میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر اس نے کھنکھارہ بھرا اور کہا ''مولوی صاحب' زلفاں آیا ہے۔''

مولوی صاحب نے اپنی نظر جلتے اپلوں کی طرف سے ہٹا کر ہماری ٹانگوں پر مرکوز کر دی۔ پھر بیٹھے بیٹھے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا اور حیدر علی سے پوچھا ''کہاں ہے شیطان؟''

''ادھر ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ چھوٹے شیطان کو تلاش کر رہے ہیں۔ شیطان بڑا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' یقیناً وہ چھوٹا شیطان اپنے بیٹے کو کہہ رہا تھا۔

مولوی صاحب کھڑے ہو گئے۔ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ عمر نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ویسا ہی پہلے جیسا ڈیل ڈول تھا۔ انھیں مجھے شناخت کرنے میں چند لمحے لگے۔ پھر میرے سر اور کندھوں پر معانقہ کے دوران میں ہاتھ پھیرا اور شکایت کی کہ میں ان سے اتنے برسوں بعد کیوں ملا ہوں جبکہ انھوں نے مجھے پیغام بھی بھیجے تھے۔ ''ماشاءاللہ! حیدر علی' یہ مولوی محمد حسین کا پوتا ہے جو دور کے رشتے سے میرے ہم زلف تھے۔ برس گزرنے' میری اس سے ملاقات حکیموں کے ہاں شادی پر ہوئی تھی۔'' وہ ذرا رک گئے اور مجھ سے پوچھا ''کیا نام تھا اس لڑکے کا جس کی برات پر ہم کوٹلی گئے تھے اور جہاں ہم سب نے پیسٹریاں کاغذوں سمیت نگل لینے کی کوشش کی تھی......''

واقعے کی یاد سے مولوی صاحب اور میں دونوں ہنس پڑے۔ میں نے بتایا کہ اس کا نام اشرف تھا۔ وہ خوش ہوئے اور کہا ''اس کے تو اب تین بچے بھی ہیں حساب کر لو کہ تم اب کتنے عرصے بعد ملنے آئے ہو۔'' میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔

''ادھر تخت پوش پر بٹھاؤ اپنے بیلی کو......ادھر دھواں ہے' میں ابھی آ رہا ہوں منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر۔'' مولوی صاحب نے حیدر علی سے کہا اور وہ میرا ہاتھ تھامے برآمدے میں پڑے ایک بڑے سے تخت پوش کی طرف بڑھا اور مجھے فہمائش کی کہ جب مولوی صاحب میرے ساتھ اس کے متعلق کوئی بات کریں تو میں کوئی جواب نہ دوں بلکہ وہ خود جواب دے گا۔ مولوی صاحب سے بہت کچھ چھپانا مقصود ہے۔'' اور ہاں! تم بھی کوئی راز کی بات مولوی صاحب سے نہ کہہ بیٹھنا۔ مولوی صاحب اب ڈھنڈورا بن چکے ہیں۔ جب سے استانی جی بہری ہوئی ہیں تب سے مولوی صاحب ہر بات ہمہ شمہ کو سناتے رہتے ہیں۔ تمہیں ابھی تجربہ ہو جائے گا۔''

اندر سے واپس آ کر مولوی صاحب نے میری ماں' بھائیوں' چچا اور ان کے اہل وعیال کی خیریت دریافت کی۔ میں بار باران سے ان کی صحت کے متعلق پوچھتا رہا تو وہ الحمد اللہ کہہ کر یہ بتانے لگتے کہ ہماری استانی کی طبیعت کس کس حوالے سے اور کس کس وجہ سے خراب ہے۔ میں نہ رہ سکا تو کہا کہ جب وہ عورتوں کے معالج مشہور ہیں تو پھر وہ اپنی اہلیہ کا علاج کیوں نہیں کر پائے۔ انھوں نے ایک لمبی سی آہ کھینچی اور کہا ''بچہ! تو پڑھا لکھا ہے' سمجھ دار ہے بس ''گھر کی مرغی دال برابر'' کی مثل پر یقین رکھ اور اس کی (استانی جی کی) بیماری اور علاج کا نہ پوچھ۔ علاج میں طبیب پر مریض کے یقین کا بڑا دخل ہوتا ہے میں اسے گئو دنتی کے سفوف سے لے کر جواہر دار خمیرے کھلا چکا ہوں بس اللہ کی بندی ویسی کی ویسی ہے۔''

پھر اور باتیں ہوئیں جن کے دوران میں میں ان کے مطب کا جائزہ لیتا رہا۔ اردگرد پڑی پوٹلیوں کے علاوہ ایک الماری میں کچھ شیشیاں اور بوتلیں پڑی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ چند کونڈیاں اور ڈنڈے کھڑے تھے۔ کسی میں رنگدار تو کسی میں سفید' کسی میں سیاہ تو کسی میں بھورے رنگ کی دوائیاں سفوف' لئی یا پڑیوں کی صورت موجود تھیں۔ کچھ ادویات آنچوں پر تھیں' کچھ گولیوں کی شکل میں سوکھ رہی تھیں۔ دو تین ادھیر عمر کے افراد کچھ کوٹ اور چھان رہے تھے گویا مطب خوب چل رہا تھا۔

''شریف بچے!'' مولوی صاحب نے آواز دی اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص حکم لینے ان کے تخت پوش کے قریب آ کھڑا ہوا۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا ''دیکھ! بچہ آیا ہے' محبت سے ملنے آیا ہے۔ دوا لینے نہیں آیا۔ اندر جا اور کوار گندل کے حلوے کے ساتھ دودھ پتی بنا کر لا۔''

وہ اندر چلا گیا تو وہ مجھے اور حیدر علی کو گھیکوار کے حلوے کی شفا بخش خاصیتوں سے آگاہ

کرتے رہے۔ پھر اچانک انھوں نے حیدر علی سے پوچھا کہ اس کی ماں کی دوائی کی تیاری کس مرحلے میں ہے۔ اس نے مرحلے کی وضاحت کی۔ پھر مولوی صاحب نے دوا کے حوالے سے حیدر علی کے اوصاف بھی بیان کیے کہ وہ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ اپنی ماں کی بھی اس نے بڑی خدمت کی اور اب یہ اپنی سوتیلی ماں جو اس کی ساس بھی ہے کی بھی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ اس کی اس نئی ماں کا اپنا سگا بیٹا اپنی ماں کی اتنی پروا نہیں کرتا جتنی یہ کرتا ہے۔ وہ آدھے سر کے درد سے بے حال ہو جاتی ہے لیکن میری دوا کے لیپ سے اسے آرام آ جاتا ہے، مگر ہے نا عورت ذات، ناقص العقل...... دوا اسی وقت منگواتی ہے جب پہلی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اسے درد کا دورہ آن نہیں پڑتا۔

اچانک انھوں نے گفتگو کا رخ بدلا اور حیدر علی سے پوچھا "اس بڑے زلفاں سے آج ہی ملے ہو یا پہلے بھی اس سے تمھاری ملاقات رہی ہے۔ تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" یہ ایسا موقع تھا جہاں حیدر علی نے اپنے حسب منشاء جواب دینا تھا۔

"جی یہ تو ادھر لاہور ہی پڑھائیاں کرتا رہا ہے۔ میری اس سے ملاقات کہاں ہونا تھی۔ چند روز ہوئے اس سے اسٹیشن پر اچانک ملاقات ہوگئی۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن یہ مجھے پہچاننے سے انکاری رہا۔ جب آپ کا حوالہ دیا تو پھر کہیں جا کر اسے حیدر علی یاد آیا۔ حیدر علی نے میری طرف دیکھا کہ میں اس کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کی کوشش میں کچھ کہنے والا تو نہیں ہوں۔ میں اس کی خواہش کے مطابق خاموش تھا۔

شریف بچہ۔ چائے اور کوار گندل کا حلوہ لے کر آ گیا تو مولوی صاحب نے خود کچھ نہیں کھایا پیا۔ حیدر علی کو میرا ساتھ دینے کے لیے کہا اور خود بے شمار ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں کر کے اپنی طبیعت کا بوجھ اتارتے رہے۔ واپسی کی اجازت لی تو انھوں نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ مطب کے دراوزے پر آ کر انھوں نے مجھے رخصت کیا اور ملتے رہنے کو کہا۔ حیدر علی میرے ساتھ سڑک تک آنے پر مصر ہوا۔ دو موڑ ہی تو تھے۔ انھیں کاٹنے کے بعد میں نے اسے اپنے گھر کا دیسی ساخت کا دروازہ دکھایا اور رسماً اسے گھر تک چلنے کی دعوت بھی دی جسے اس نے مستقبل کے کسی دن کے لیے قبول کیا۔

☆☆

بینڈ ماسٹر صاحب کو کالے میں آئے ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ انھوں نے

میرے اس ارادے سے اتفاق کیا تھا کہ ڈرامے کی پیش کش کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے کیونکہ امتحانات قریب آپہنچے تھے لیکن کلیم صاحب نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کی تائید سے لکھ کر یہ حکم بھیجا کہ امتحانات کو مارچ کے دوسرے ہفتے میں ختم کر لیا جائے اور ۲۳ مارچ کی شب ڈرامہ ضرور اسٹیج کیا جائے کیونکہ سابقہ پروگرام کے تحت ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے علاوہ کئی شہری اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان بھی ان سے ڈرامہ دیکھنے تشریف لانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔

شاہ صاحب ایک کامیاب ڈرامہ ''عدل جہانگیری'' کے نام سے ہمارے گاؤں میں پیش کر کے بڑی داد و تحسین وصول کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا وہی ڈرامہ دھرایا جائے اور انہی اداکاروں کو بلایا جائے۔ اداکار طالب علم ہی تھے۔ میں ان کے حق میں تھا لیکن ڈرامہ میں اپنا لکھا ہوا...... وہی میٹرک کی تعلیم کے دوران اسلامیہ ہائی اسکول میں سمبڑیال میں قاضی عطااللہ ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ لگنے والا ڈرامہ ''غلام'' ہی پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں حالات کی وجہ سے دیوبند نہیں جا سکا تھا لیکن میں نے اپنی تعلیم اور تجربات کی روشنی میں اسی ڈرامہ کی اصلاح کر لی تھی۔ میرے اندر کے فنکار کی تسلی و تشفی کے لیے یہ ضروری تھا تاہم میں نے اب اس ڈرامے کو نئے سرے سے نئے حالات کی روشنی میں لکھا تھا اور آغا حشر کے اشعار اور مکالموں سے خوب استفادہ کیا تھا۔

میں ڈرامے سے صرف لوگوں کو محظوظ ہی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس مقصد کے لیے اسٹیج کرنا چاہتا تھا کہ اسکول سے حال اور مستقبل میں فیض حاصل کرنے والے لوگوں سے ''اپنی مدد آپ کے تحت'' اسکول کی خستہ حالی دور کرنے کی اپیل کروں۔ ماہرین تعلیم کی تحقیقات کے مطابق طلبہ کی ذہنی' اخلاقی' معاشرتی اور تعلیمی نشوونما کے لیے اسکول کی عمارت' اس کے محل وقوع اور ماحول کا پرکشش ہونا ضروری ہے۔ اس حوالے سے کالے کے اسکول میں کام کرنے کی کافی گنجائش موجود تھی۔ عدم کشش اور عدم مواصلت ہی کا نتیجہ تھا کہ ان دنوں پہلی جماعت میں داخل ہونے والے سو دیہاتی بچوں میں سے صرف بیس بچے پرائمری پاس کرتے تھے جبکہ لڑکیاں پانچ فیصد پرائمری تک چلتی تھیں۔ تعلیمی اصطلاح میں ''ڈراپ آؤٹ'' کی شرح بہت ہی زیادہ تھی۔

مدرسین شاہ صاحب کے ہم خیال تھے۔ وہ عدل جہانگیری کی کہانی اور کامیابی کے بارے میں شاہ صاحب کی زبانی بہت کچھ سن چکے تھے۔ ایک اچھے قصہ گو کی طرح انھوں نے

انھیں بتایا تھا کہ ڈرامے کی شب گاؤں بھر کی خواتین پنڈال کے اردگرد کی چھتوں پر جمع ہو گئی تھیں۔ بعض مالکان مکانات کو چھتوں کی کڑیاں بیٹھ جانے کا خوف لاحق ہو گیا تھا' لہٰذا پنڈال کے ایک حصے میں چادریں تان کر ان کے لیے علیحدہ انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پٹرومیکس بھی اپنی ساری روشنی اسٹیج پر ہی پھینک رہے تھے۔ تمام ریہرسلوں میں نور جہاں بیگم کا طپنچہ' دغنے پر بڑی پھسپھسی آواز نکالتا رہا تھا۔ جبکہ مکالموں کی سج دھج اور گھن گرج زیادہ بارعب تھی۔ ایلومینیم کا بنا یہ طپنچہ (پستول) بڑی مشکل سے دستیاب ہوا تھا اور اسی سے گزارا کرنا تھا۔ اصل ڈرامے کے دوران میں جب 'فرط غیرت سے نور جہاں بیگم نے طپنچہ داغا تو اس زور سے دھماکہ ہوا کہ اگلی پچھلی تمام کسریں نکل گئیں۔ کئی دیہاتی عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے خیال میں جو کشتۂ' خاک پر ڈھیر ہوا تھا وہ واقعی مر چکا تھا۔

ہمارے مجوزہ ڈرامے 'غلام' میں طپنچہ داغنے کی کوئی اداکاری نہ تھی۔ اس کے باوجود میں شاہ صاحب سے توقع کر رہا تھا کہ ڈرامہ کامیاب ہو۔ ''عدل جہانگیری'' والے بہت سے طالب علم اداکار شام ڈھلے کالا پہنچ جاتے۔ رات بھر مشقیں ہوتیں۔ علی الصباح سب واپس اپنے اپنے سکولوں یا گھروں کو چلے جاتے۔ ایک دو رات مجھے بھی رکنا پڑا کیونکہ ڈرامے کے اختتام پر ''اپنی مدد آپ'' پر تقریر کے لیے مجھے خود بھی ایک کردار نبھانا تھا۔

ہم نے ڈرامے کی خاصی ٹکٹیں بیچ لی تھیں۔ نہر پر کام کرنے والے مزدوروں نے سب سے زیادہ ٹکٹیں خریدی تھیں۔ وہ بڑے خوش تھے کہ ایک روپے میں وہ تین گھنٹے لوشے (خوشیاں) لوٹیں گے۔ ڈرامے کے تین مناظر بڑے سلیقے اور نظم و ضبط کے تحت گزر گئے۔ ان مناظر کے ساتھ ساتھ تین مزاحیہ تمثیلیں بھی پیش کی گئیں تو لوگ قہقہے لگا لگا کر نڈھال ہو گئے۔ چوتھا منظر شروع ہونے لگا تو ہیروئن کے باپ ملک عبدالغنی کا دل ادھڑنے لگا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر پیدل ہی شہر کی سمت ہو لیا۔ وقت ایسا تھا کہ کوئی بھی اس کے پیچھے جانے کو تیار نہ تھا۔ شاہ صاحب پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ چودھری نواز گھسن جو جملہ مشقیں دیکھتا رہا تھا کو ہیروئن کا باپ بنا کر پردہ اٹھا دیا گیا۔ سکرپٹ کے مطابق وہ کبڑے عمر رسیدہ باپ کی اداکاری کرتے ہوئے مائیکروفون پر کامیابی سے مکالمات ادا کر رہا تھا کہ اچانک اسے قبرستان کا ٹیلہ گاؤں بھر کی عورتوں سے بھرا نظر آیا۔ اردو مکالموں کے درمیان اس نے پنجابی میں گاؤں کی عورتوں سے کہا ''بیبیو! تسی گھراں نوں خالی چھڈ کے ڈرامہ ویکھن آ گیاں او۔ ایتھے لگے دے سارے

چور' ڈاکووی آئے ہوئے نیں۔'' (تم خواتین! گھروں کو خالی چھوڑ کر ڈرامہ دیکھنے آ گئی ہو۔ یہاں لگنے کے سارے چور ڈاکو بھی آئے ہوئے ہیں) پھر اس نے مردوں سے کہا کہ وہ ڈرامہ بند کرتا ہے' لہٰذا وہ گھروں کا چکر لگا ئیں۔

اس ایک کردار اور اس کے بولے دو مکالموں نے کامیاب چلتے ڈرامے' بہترین گانوں کی پلے بیک گائیکی اور ہنسنے ہنسانے کی پیش کی گئی تمثیلوں سے مسحور کن فضا میں کھلبلی مچا دی۔ ڈرامے کے اندر ایک ایسا ڈرامہ چل نکلا جس کی مشق کی گئی تھی نہ ہدایت کاری۔ سکتے کے عالم میں بیٹھے لگنے کے نوجوانوں نے کھڑے ہو کر اور اپنی لمبی لاٹھیاں لہرا کر للکارا مارا۔ ''ہت تیرے بڈھے کی...... ہم جانتے ہیں تو کون ہے؟ تجھ سے ابھی نمٹ لیتے ہیں۔ تم ہمیں چور اور ڈاکو کہتے ہو' تم سارے کالے والے اچکے' اٹھائی گیرے اور گنڈی چھورے ہو۔'' پھر انھوں نے لاٹھیوں سے پردے گرا دیے۔ ایک پیٹرومیکس کو توڑ دیا۔ تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگ اور کوئی ادھر۔ اساتذہ' میں اور کلیم صاحب اسکول کے اک کمرے میں بند ہو گئے۔ عورتیں الگ شور مچاتیں گھروں کو لوٹ گئیں۔ میں نے اور کلیم صاحب نے تو باقاعدہ نوافل پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ جس کی حکمت عملی نے افسران اور شہری ہیڈ ماسٹر صاحبان کو یومِ جمہوریہ کی شہری تقریبات کے سلسلے میں ٹاؤن ہال سیالکوٹ میں لازمی طور پر حاضر کر کے ڈرامے کا ہنگامہ دیکھنے آنے ہی نہیں دیا تھا۔

افراتفری کے اس عالم میں لاؤڈ اسپیکر پر بڑی دلکش آواز میں مولوی منظور حسین نے تعوذ اور تسمیہ کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی۔ تلاوت ختم ہوئی تو ماسٹر دلدار علی نے بڑی مترنم لیکن گمبھیر اور تلاوت سے پیدا ہونے والے سکوت اور احترام سے بھرپور استفادہ کرنے والے لہجے میں حضرت اقبالؒ کی نظم ''مردِ مسلمان'' پڑھنا شروع کی۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان' نئی آن
گفتار میں' کردار میں' اللہ کی برہان.

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

جب وہ اس شعر پر پہنچے

فطرت کا سرود ازلی، اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا، صفت سورہ الرحمٰن

تو اس وقت نعرہ تکبیر بھی گگے والوں ہی نے لگایا اور پھر سے بیٹھ گئے۔ اشعار کی ہم آہنگی میں دلدار علی کے ساتھ شاہ صاحب کی کلارنیٹ بھی درد بھری سریں بکھیرتی رہی۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور انوکھا تجربہ تھا کہ میں نے علامہ اقبال کے اشعار کے سحر اور ایک ''پپی'' کے سروں سے ایک بھرپور ہنگامہ فرو ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے موسیقی کے اثرات کے بارے میں ''تان سین'' اور ''بیجو باورا'' نامی فلمیں دیکھی تھیں لیکن میں یہ کبھی تعین نہیں کر سکا تھا کہ موسیقی بارش برسا اور دیے جلا سکتی ہے۔ بی اے میں ٹموتھی نامی ایک موسیقار کے بارے میں بھی پڑھا تھا کہ اس نے ایک دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساز بجایا تو حاضرین رونے لگے، دوسرا ساز بجایا تو ہنستے ہنستے پاگل پن کی حد کو جا پہنچے۔ تیسرا ساز بجایا تو ایک دوسرے سے لڑنے اور الجھنے لگے۔ یہاں ساز بھی تھا اور آواز بھی۔ میرا پختہ یقین ہے کہ کلام اقبال کو چند لوگ ہی معنی کے لحاظ سے سمجھ پائے ہوں گے، لیکن آواز کے سحر نے ان کو مسحور اور الفاظ کی نشست و برخاست نے اان کو حیران کر دیا تھا۔ کلارنیٹ کی افسردہ آواز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

یہ دو عمر رسیدہ اشخاص تھے جن کے اندر نوجوانوں سے زیادہ حوصلہ اور اعتماد تھا۔ جن کو اپنی اپنی ذات اور اپنی اپنی صلاحیت پر بھرپور اعتماد تھا۔ جب پھر سے انھوں نے مجمع کو جما لیا تو شاہ صاحب نے حاضرین کو بچوں سے ٹورنامنٹ والی قوالی سنوائی۔ دلدار علی نے وہ کردار بھی ادا کیا جس کی ذمہ داری مجھ پر تھی لیکن اس نے اپنے انداز میں ان لوگوں کو شرمندہ کیا جو ایک چھوٹی سی غلطی کو برداشت نہیں کر سکے تھے۔ اس پر مجمع سے ''معافی معافی'' کے الفاظ بلند ہوئے۔ نواز نے بھی گگے والوں سے اسپیکر پر معافی طلب کی۔ فضا پھر سے خوشگوار ہو گئی۔ ڈرامہ تو دوبارہ جاری نہ ہو سکا، لیکن جب قومی ترانہ بجا اور سنا کر حاضرین سے کہا گیا کہ پروگرام ختم ہوا تو ترانے کے احترام میں کھڑے کیے گئے لوگ دلدار علی سے کچھ اور سننے کے لیے تقاضا کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے موقع محل کے مطابق لوگوں کو ہیر وارث شاہ کا کوئی حصہ سنایا۔

◆◆◆◆◆

(۱۷)
میری غیر رسمی تعلیم جاری تھی

غیر رسمی تعلیم اور سیکھنے کے عمل سے انسان کبھی بھی فارغ نہیں ہوتا، لیکن یہ جو رسمی تعلیم ہے یہ خواہ ابتدائی ہو، خواہ ثانوی، خواہ کلیاتی اور خواہ جامعی، بہر حال اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ موضع کالا کی غیر رسمی تعلیم میری جامعی تعلیم تھی کیونکہ میں مڈل اسکول کالا کو یونیورسٹی کہا کرتا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ ستاروں سے آگے بھی کئی جہاں آباد ہیں اور مجھے طلب صادق میں انہی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جانا چاہیے۔ کالا میں اب میری تعلیم کافی ہو چکی تھی۔ دلدار علی کا کہنا تھا بھریا میلہ ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اجڑے میلے کو دیکھ کر یادیں بھی اجڑ جاتی ہیں۔ جب میں کالا چھوڑنے کے لیے منصوبہ سازی کر رہا تھا تو کئی مثبت اور منفی امکانی سوچیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ ان سوچوں میں چند ایسے واقعات بھی تھے جن کا سیاق و سباق تو اب ذہن میں دھندلا سا رہ گیا ہے، تاہم ان کا ذکر نہ کرنا قارئین سے زیادتی ہوگی۔

موضع کالا میں میری غیر رسمی تعلیم میں دلدار علی نے مجھے اپنے ذاتی تجربات سنا سنا کر خاصا اضافہ کیا بلکہ محکمہ تعلیم کے ہر پہلو سے روشناس کرا دیا تھا۔ نواز گھمن کی دوستی پر بھی مجھے فخر تھا۔ مولوی منظور حسین نے اپنے عمل سے مجھے دوسروں کے کام آنے کی تربیت دی تھی۔ بشیر اور صدیق نے میری بلا غرض خدمت کر کے مجھے بردباری سکھائی تھی۔ ماسٹر فتح دین بھی اپنی ذات میں ایک درویش صفت انسان تھا۔ اس نے مولوی محمد علی سے اپنی اپنی ملاقات کا ذکر میرے ساتھ محض اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے بتانا پڑتا کہ اس کی بیوی پر جنات کا سایہ ہے کیونکہ جنوں نے اس کی بیوی کی زبان ہی سے یہ پیغام دے رکھا تھا کہ اگر اس نے کسی سے یہ ذکر کیا کہ ہم نے تمہاری بیوی کو اپنی محبوبہ بنا رکھا ہے تو وہ اس کی گردن توڑ دیں گے۔ میرے ساتھ وہ مولوی صاحب سے ملاقات کا ذکر کرتا تو اسے سچ کی پاداش میں جن ہلاک کر دیتے۔

ماسٹر فتح دین کا ایک قصہ اپنے مقام پر نہیں سنایا جاسکا۔ وہ یہ تھا کہ ماسٹر صاحب نے اپنے دو رشتہ داروں کو ان کی ضروریات کے تحت ایک پٹھان سود خور سے قرض لے کر دے رکھا تھا۔ ایک رشتے دار تو دس فیصد منافع ہر ماہ مقررہ تاریخ پر پٹھان کو ادا کر دیتا تھا جبکہ دوسرا رشتہ دار قرضے ہی کی وجہ سے کہیں گم ہو گیا۔ کثیر العیال ہونے کی وجہ سے خود ماسٹر صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ گندم کے بجائے باجرہ اور مکئی کی روٹیاں کھاتے تھے ان دنوں یہ دونوں جنسیں گندم سے کہیں سستی تھیں پھر بھی پوری نہیں پڑتی تھی۔ وہ قرضہ کا سود بھی ادا نہ کر سکے تو کئی پٹھان اکٹھے ہو کر آئے اور ماسٹر فتح دین کو لے جا کر انھوں نے اپنے ڈیرے پر بند کر دیا کہ اس کے رشتے دار یا تو ان کے مقروض کو پکڑ کر لائیں گے یا پھر منافع ادا کر کے ماسٹر جی کو لے جائیں گے۔ ماسٹر فتح دین نے پٹھان کو سمجھایا کہ اس کے رشتہ دار سب جموں کشمیر کے مہاجر ہیں اور حکومت پاکستان سے ملنے والے راشن پر گزارہ کرتے ہیں ان کی یہ استطاعت کہاں کہ وہ اسے چھڑانے آئیں۔ الٹا انہی کو اسے وقت پر دال روٹی کھلانا پڑے گی۔ جو سراسر ان کا نقصان ہو گا۔ وہ اسے کچھ دن کی مہلت دیں۔ لہٰذا انھوں نے مہلت دے کر ماسٹر صاحب کو رہا کر دیا۔

مئی جون کے انتہائی گرمی کے موسم میں ماسٹر فتح دین اسکول سے بلا اطلاع غائب ہو گئے۔ میں نے ان کی خیر خبر لینے کے لیے ماسٹر صدیق اور بشیر کو ان کے گھر شتاب گڑھ بھیجا۔ وہ خبر لائے کہ ان کے بچے بھی گھر میں ماں اور باپ دونوں کو رو رہے ہیں کیونکہ باپ کے بعد ماں بھی ان کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ بشیر اور صدیق ساہوکار پٹھان سے بھی ملے تو اس نے اپنی زبان میں انھیں کہا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کس وجہ سے روپوش ہوا ہے۔ اگر وہ قبر میں بھی چلا جائے گا تو بھی وہ اپنا پیسہ نہیں چھوڑے گا۔ نیز وہ ادھر اس کے اسکول میں آ کر بیٹھ جائے گا۔ دونوں مدرسین نے اسے سمجھایا کہ وہ اسکول میں آنے کی بات نہ کرے وہاں لڑکے اس کا مار مار کر بھرکس نکال دیں گے۔

اسی روز جب میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں ایک اونچی لمبی مناسب طور پر موٹی عورت مجھے ملنے کے لیے موجود تھی۔ وہ ماسٹر فتح دین کی بیوی تھی اور اپنی بپتا میری بیوی اور ماں کو سنا چکی تھی۔ چھوٹا بھائی اس کی خاطر پٹھان سود خور سے بھڑ جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ مقروض تب ہی کسی قرض خواہ سے بھڑ سکتا ہے جب وہ قرض ادا کر دے۔ قصہ کوتاہ اس خاتون نے یہ بھی بتایا کہ ماسٹر صاحب پٹھانوں کے ڈر سے دن بھر کماد کے کھیتوں میں چھپے رہتے ہیں۔ رات بھی اپنے بھائی کے گھر گزارتے ہیں۔ ان کی گمشدگی کا راز بھی صرف وہ ہی

جانتی ہے۔ وہ ہی ان کو جنگل جانے کے بہانے ان پانی چھپا کر دے آتی ہے۔ گرمی اور کھیت کے اندر حبس سے وہ بیمار ہو گئے ہیں' لہٰذا میں ان کے لیے کچھ کروں۔

اگلے روز میں نے ماسٹر دلدار علی اور مولوی منظور حسین کو پٹھان کے پاس شہر بھیجا۔ انھوں نے وہی کیا جو کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ دونوں اس کے گاؤں گئے اور ''دم کٹے شیر'' کو کچھار سے نکال کر اسپتال لے گئے۔ ماسٹر صاحب کی بیماری تو قرضہ تھی اس کے ادا ہو جانے کے بعد وہ چاک چوبند ہو گئے' لیکن اسی روز ان کی بیوی عین سہ پہر کے وقت شہر کو جانے والی پگڈنڈی پر بیہوش گری پائی گئی۔ یہی وہ موقع تھا جب جنوں نے اسے اپنی محبوبہ بنا لیا تھا۔ ماسٹر فتح دین اس کی دوا اور دعا کے لیے مولوی محمد علی کے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ کئی معجونیں کھانے اور کئی گھونٹے پینے کے بعد بھی نیم تندرست ہوئی۔ نیم اس لیے کہ قرض کی ادائیگی کے بعد سکول آنے پر ماسٹر فتح دین نے اس کی صحت کو تشویشناک بتایا جبکہ مولوی محمد علی صاحب کے خیال میں گہری سوچوں اور آزمائشوں نے اس کا ذہن اور معدہ ماؤف کر دیا تھا اور اسے خیالی ہیولے نظر آتے تھے جو ہرگز جن نہیں تھے۔

☆☆

میری غیر رسمی تعلیم کا اپنے مقام سے ہٹا ہوا ایک اور واقعہ بھی اپنے اندر کچھ وزن رکھتا ہے جس کے پڑھنے سے اگر بہتوں کا نہیں تو کچھ کا بھلا ہو سکتا ہے۔ اس واقعے کا تعلق میرے گہرے یار نواز گھمن سے ہے۔

شہر میں کوئی میلہ یا نمائش تھی۔ ترقی دیہات کے محکمے نے دیہات سے کچھ ٹیمیں کھیلے مقابلے کے لیے طلب کر رکھی تھیں۔ میرے ہیرو یار نے بھی ایک ٹیم ترتیب دے رکھی تھی اور اس کو لے کر مقابلوں میں شرکت کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک ہی میر زادی کی شادی کی ڈھولک بجنے لگی۔ کشتی' کبڈی اور کھیلوں سے غیر حاضری اس کے لیے ممکن ہی نہ تھی جبکہ منہ بولی بہن کی شادی کے سارے انتظامات کی ذمہ داری بھی رواجاً' اخلاقاً اس کے گھر والوں نے چودھری نواز گھمن کے سپرد کر دی تھی۔ وہ کچھ غیر معمولی انتظامات سے اپنی اہمیت اور اپنے کردار کو اجاگر کر کے اپنے مداحین کو حیرت زدہ بھی کرنا چاہتا تھا' کشمکش کے ان دنوں میں وہ تیزی سے ادھر ادھر آنے جانے کیلئے اپنے اتھلیٹ شاگرد اشرف کے ہاں سے گھوڑی بھی مانگ لایا تھا۔ ماسٹر دلدار علی اسے گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر ''بلے بلے او مرزے یار'' کہتا تو وہ اسے کہتا ''ذرا مجھے فارغ ہو لینے دے چودھری۔''

قدرت جانے کیوں اس نیک دل نوجوان سے ستم ظریفی برتنے پر اتر آئی تھی۔ اس کی ٹیم

مقابلوں میں تیسرے نمبر پر رہی تھی۔ مصروفیت کی وجہ سے اس نے میرزادی کی شادی کے سلسلے میں کئی اشیاء مہیا کرنے کی ذمہ داری اشرف کو سونپی تھی جو اس سے کماحقہ پوری نہ ہوئی تھیں۔ پھر ڈولی اٹھنے اور جلسہ تقسیم انعامات کا وقت اور دن بھی آپس میں پیچ کھا گئے۔ تقسیمِ انعامات میں شمولیت کے لیے نواز میرے لیے ایک دعوت نامہ بھی لایا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی تقریب میں تھا کہ وہ تین بجے کے قریب کانلے پارک سے غائب ہوگیا۔ اس نے میرزادی کی ڈولی اٹھتے وقت شیخ نوردین کا بینڈ بجوانا تھا، کچھ گولے داغنے تھے۔ پھر نہر کے پل پر برات کو روک کر اس کو الوداعی چائے اور مٹھائی پیش کرنا تھی۔ ایسا کرنا برات اور دولہا کی عزت افزائی میں شامل تھا اور یہ ایک رواج بھی تھا۔ جب وہ کپور والی گاؤں پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ برات اور ڈولی ابھی ابھی گزری ہے اور پل پر پہنچا ہی چاہتی ہوگی۔ اس نے گھوڑی کو کھیتوں میں سے دوڑایا اور برات اور ڈولی سے پہلے نہر کے پل پر پہنچ گیا۔ برات اور ڈولی والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے دوست کی دونالی بندوق سے چار ہوائی فائر کیے اور پھر کہاروں کو رک جانے کے لئے للکارا۔

کہاروں نے ڈولی کو کھیت میں رکھا اور دوڑ لگا دی۔ کچھ براتی بھی خوفزدہ ہو گئے کہ شاید برات کو لوٹنے کے لیے ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ دولہا اور نواز دونوں اپنی اپنی گھوڑیاں دوڑا کر ڈولی کے پاس پہنچے تو دولہا نے للکارتے ہوئے نواز سے پوچھا "اوئے بدمعاشا! کیا بات ہے۔"

"بات یہ ہے بھائی جان! کہ میں نے برات کے لیے چائے پانی کا انتظام کر رکھا ہے۔ چاچے کو اطلاع بھی دی تھی۔ میرا ایک منٹ بھی انتظار نہیں کیا گیا اور ڈولی اٹھوا دی گئی ہے۔" دولہا میاں خاصے پریشان ہوئے لیکن اسے میرزادی کی چھوٹی بہن جو برات کے ساتھ بہن کے سسرال جا رہی تھی نے بتایا کہ سب خیریت ہی ہے اور بھائی جان ڈاکو نہیں گاؤں کے چودھری ہیں۔ برات اور ڈولی کو اس احاطے میں لے جایا گیا جہاں دودھ اور مٹھائی ان کے منتظر تھے۔ یار لوگوں نے کئی دن اس واقعے کو مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ ماسٹر دلدار علی خاص طور پر مرزے یار (نواز) اور اس کی لکّی (گھوڑی) کی کارگزاری کو اپنے مخصوص انداز میں اساتذہ کو سنا کر انھیں محظوظ کرتا رہا۔

☆☆

میں ایم اے او سکول کے لیے درکار مدرسین کے ایک اشتہار کے مطابق ایم اے او کالج لاہور کی عمارت میں ہونے والے انٹرویو کے امیدواران میں حاضر تھا۔ وہاں میری

ملاقات سید بشیر حسین شاہ نامی ایک شخص سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ اسلامیہ ہائی اسکول میترانوالی ضلع سیالکوٹ میں مدرس ہے اور وہ ایس وی معلم کی آسامی کے لیے انٹرویو دینے آیا ہے۔ میرے کوائف جاننے کے بعد وہ ذرا کھلا تو اس نے بتایا کہ وہ سکول کا معلم ہونے علاوہ انجمن اسلامیہ میترانوالی کا کرتا دھرتا بھی ہے۔ وہاں ایک انگریزی مدرس کی آسامی ایک مدرس کے سی ایس پی افسر منتخب ہو جانے کی وجہ سے خالی ہوئی ہے۔ حقیقتاً وہ اس اسامی کے لیے اپنے انٹرویو کے بہانے ایک ٹرینڈ انگریزی مدرس تلاش کرنے آیا ہے۔ باتوں کے بہت سے اینچ پیچ کے بعد اس نے مجھے کہا کہ اگر میں ایک سو نوے روپے تنخواہ قبول کروں تو وہ مجھے اپنے اسکول میں یکم اپریل سے حاضر کر سکتا ہے اگرچہ اسکول یکم سے دس اپریل تک بند ہوگا۔

اپنی موجودہ آسامی پر میں ایک سو چالیس روپے ماہوار لے رہا تھا۔ سرکاری اسکول میں سینئر انگلش ٹیچر کو ۱۶۵ روپے ماہوار ملتے تھے جبکہ حالات کے لحاظ سے ۱۹۰ روپے ماہوار اچھی پیشکش تھی۔ میں نے سوچا کہ کالے کا بھریا میلہ مناسب وقت پر چھوڑنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مجھے اسے قبول کر لینا چاہیے پھر جب سرکاری ملازمت ملے گی دیکھا جائے گا۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ سید بشیر حسین شاہ نے مجھ سے منیجر اسکول کے نام ایک درخواست لی۔ ساتھ ہی یکم اپریل سے رپورٹ حاضری بھی بنوالی۔ مجھے انجمن اسلامیہ کی طرف سے منیجر کا خالی دستخط شدہ فارم میرے کوائف درج کرنے کے بعد تقرر نامہ کی صورت میں تھما دیا۔ میں جب گھر پہنچا تو ماں نے خوشخبری سنائی کہ چھوٹے بھائی کا تقرر نامہ لاہور سے کل ہی آیا تھا اور کل ہی چھوٹا بھائی لاہور چلا گیا ہے۔ وہاں وہ اپنے ہم نام دوست حکیم بشیر احمد کے بیٹے سرفراز احمد کے پاس رہے گا۔

۳۱ مارچ کو سالانہ امتحانات کے نتائج کے بعد مڈل اسکول کالا بھی موسم بہار کی تعطیلات کے لیے سات اپریل تک بند کر دیا گیا۔ اسی تاریخ کو واپس سیالکوٹ آ کر کرائے کا مکان خالی کر کے ہم سب اپنے گاؤں آ گئے۔ منجھلے بھائی کو تو بہر حال شہری رہنا تھا اس نے اپنا ڈیرہ تعلیمی پریس ہی میں لگا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رہائش کی اس تبدیلی سے مجھے کئی بچتیں مطلوب تھیں۔ خاص طور پر یہ کہ میں اپنے گاؤں سے روزانہ میترانوالی آ جا سکتا تھا۔

ماسٹر فتح دین اور دلدار علی بھی اپنے گاؤں جانے کے لیے کالا سے واپسی کے سفر میں میرے ساتھ تھے۔ کوٹلی بہرام پہنچ کر ایک دوسرے سے ہفتہ بھر کے لیے جدا ہونے کی خاطر ہم ایک کھوکھے پر رک گئے کہ چائے کی پیالی پی جائے۔ یہاں میں نے دونوں مدرسین کو اپنے مستقبل کے فیصلے سے

آگاہ کیا تو دلدار علی نے میرے فیصلے سے بھرپور اختلاف کیا اور بتایا کہ انھیں نارووال کے ایک قومی اسکول میں پڑھانے کا تجربہ ہے۔ ایسے اسکولوں میں کوئی باشعور مدرس اپنا ضمیر زندہ نہیں رکھ سکتا۔ ہر قسم کی بدعنوانی دیکھتا ہے اور ہر قسم کی زیادتی برداشت کرتا ہے لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتا۔ اندر ہی اندر کڑھتا ہے اور اگر کڑھنا ضبط نہ کر سکے تو اسے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں جانے کی عمر کی حد گزر جاتی ہے تو ایسے ادارے خاصے نامہربان ہو جاتے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ اگر میں کسی سرکاری اسکول میں جاتا تو اسے خوشی ہوتی۔ تنخواہ میں چند روپوں کا اضافہ میرا اصل مدعا نہیں ہونا چاہیے۔ فتح دین نے کوئی رائے نہیں دی بس اتنا کہا کہ میں کالا ہی میں اچھا تھا خوب وقت گزر رہا تھا۔

میں حیدر علی یعنی لالو ڈا کو بتانا چاہتا تھا کہ اب اس سے میری ملاقات کالے میں نہیں ہو سکے گی۔ میں اس کی تلاش میں مولوی صاحب کے پاس جا پہنچا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان کو علم ہے کہ حیدر علی کہاں رہتا ہے۔

''اپنے قریب ہی رہتا ہے۔ پہلے تو وہ ادھر چھاؤنی میں رہا کرتا تھا لیکن پچھلے سال اس کی ساس بیمار ہوئی تو پھر مجبوراً انھیں میرے قریب ہی مکان خریدنا پڑا۔ ادھر میں بھی قریب تھا اور سول اسپتال بھی۔ کوئی جراحی کا معاملہ تھا۔ میں تو جراحی کرتا نہیں۔''

''وہ عموماً کس وقت گھر پر ملتا ہے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''راتوں کو ہی ملتا ہے...... آج کل تو راتوں کو بھی مصروف رہتا ہے۔''

میں سمجھا کہ شاید مولوی صاحب جانتے ہیں کہ وہ راتوں کو کیا کرتا ہے۔ میں نے تائیداً کہا ''جی ہاں! اس کا کام ہی ایسا ہے۔''

''نہیں ایسا تو نہیں، وہ تو ڈیوٹی کے بعد گھر آ جاتا تھا، لیکن جب سے شیخ ابرار نے تیل گھر کو صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تب سے اس کی کچھ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔''

میں چونکا کہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ شیخ ابرار سٹی انسپکٹر پولیس کا نام تھا اور تیل گھر سیالکوٹ کے بازار حسن کو کہتے تھے۔ ان دنوں خواجہ صفدر صدر سٹی مسلم لیگ شہزادہ عالمگیر ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ اور مسٹر خلیل الرحمٰن سپرنٹنڈنٹ پولیس کے باہمی تعاون سے سیالکوٹ کے بازار حسن کو بند کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں خاصی مہم چل رہی تھی۔ سٹی انسپکٹر پولیس شیخ ابرار احمد اس مہم میں بڑے فعال تھے۔ انھوں نے مقامی پولیس کو دن رات متحرک کر رکھا تھا۔ کسبیاں گرفتاریاں دے رہی تھیں

اور مجسم احتجاج بنی ہوئی تھیں۔ ایسے بینرز بھی دیکھنے میں آئے جن میں طوائفوں کی طرف سے علماء، انتظامیہ اور سیاسی کارکنوں سے درخواست کی گئی تھی کہ ہمارے ساتھ نکاح کرو۔ ہم توبہ کرتی ہیں مگر ہمیں چار دیواری تو دو۔ ہمارا گند اپنے پاکیزہ محلوں تک نہ لے جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

تماش بین طبقہ تو ایک طرف عام لوگ بھی جلوس اور مظاہرے دیکھنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پولیس دن رات اس مخصوص علاقے میں موجود رہنے پر مجبور تھی۔

''تو کیا' میں نے مولوی صاحب سے پوچھا'' حیدر علی پولیس میں ہے۔''

''تم کو نہیں معلوم۔ وہ سپیشل پولیس میں سب انسپکٹر ہے۔''

میرے پاس کچھ مزید کہنے کو نہیں تھا۔ میں مولوی صاحب کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے تو اسے لالو ڈاکو کے بھیس میں دیکھا ہے۔ فوراً میرا ذہن ایسی کہانیوں اور فلموں کی طرف پلٹ گیا جن میں کئی پولیس افسر ڈاکوؤں، چوروں اور بدمعاشوں کے سرغنہ نکلے تھے۔ کیا وہ ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا؟ ایسے ہی خیال میرے ذہن میں سے گزرا۔ شاید اسی لیے اس نے میرے ساتھ اپنی ملاقات کو ریلوے اسٹیشن پر کی سرراہے ملاقات بتایا تھا اور سچ مولوی صاحب کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ تو خود ایک امیر آدمی کا بیٹا اور سینکڑوں ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ اسے بھلا ایسے گھناؤنے دھندے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر اس کی شراب نوشی اور تاجے جیسے لوگوں سے میل جول کے کیا معنی تھے؟

میں نے یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے وہ سراغ رسانی کے اس اصول پر عمل کر رہا ہو کہ چور کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے چور ہی لگانا پڑتا ہے۔ بہرحال میں شش و پنج میں تھا اور مولوی صاحب کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ پھر بھی میں نے مولوی صاحب سے محتاط الفاظ میں اس کے احوال و کوائف دریافت کیے تو مولوی صاحب اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ اتنے بڑے زمینداروں کے بیٹے غیر اخلاقی اور غیر شرعی شوق پال لیتے ہیں لیکن نتھے خاں کی اولاد بڑی نیک ہے۔ بڑی چودھرانی مرنے سے پہلے اپنی سوتن کی بیٹی کو اپنی بہو بنا کر بچوں کو ایک کر گئی۔ فتح علی اور افسر خاں زمیندارہ کرتے ہیں۔ حیدر علی پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے۔ اللہ نے اسے چاند سا بیٹا دیا ہوا ہے جس کا نام اس نے زلفاں ہی رکھا ہے۔ میں نے اس نام کی مخالفت کی تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ یہ نام اس کے دماغ میں بچپن سے بیٹھا ہوا ہے۔ بڑی رازداری سے مولوی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ آج کل میں اس کے گھر ایک اور

مہمان آنے والا ہے اسی لیے چودھرانی آ کر بیٹی کو کوٹ لے گئی ہے۔ وہ بھی شیخ ابرار کی اردل میں خوش ہے۔ آئے گا تو میں اسے تمہاری آمد کا بتاؤں گا۔

میرا تجسس ختم نہیں ہوا تاہم اس بات چیت سے مجھے خیریت ہی نظر آئی۔

☆☆

موسم بہار کی تعطیلات کے دوران ہی میں ماسٹر فتح دین نے میرے اسلامیہ ہائی اسکول، میترانوالی چلے جانے کی خبر کالا پہنچا دی تھی۔ اساتذہ کے علاوہ مجھے جو بھی ملا اس نے اس خبر کی تصدیق چاہی۔ اپنی اپنی ائے کا اظہار بھی کیا۔ منشی عنایت علی بھی تشریف لائے اور انھوں نے مجھے کہا کہ ایک جگہ پڑا پتھر بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ لڑھکتا پتھر ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ ان کا اپنا فلسفہ تھا۔ میں نے کچھ اپنی مجبوریاں بیان کیں اسکول کو ایک بار پھر میں نے ماسٹر فتح دین کے سپرد کیا اور نم آنکھوں سے ساتھیوں کو الوداع کہا۔

گیارہ اپریل ۵۵ء کو میں نے میترانوالی اسکول میں حاضری دی۔ بس مجھے یوں لگا جیسے میں ایک وسیع وعریض جوہڑ سے نکل کر کنویں میں گر جانے والا مینڈک بن گیا ہوں۔ کنویں کے مالکان کئی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر وہ سید بشیر حسین شاہ المشہور گوڈی شاہ کی صلاحیتوں کے معترف اور قائل ہیں اور انھوں نے کنویں کا سیاہ وسفید اس کے سپرد کر رکھا ہے۔ بعد میں یہ احساس بھی غالب رہا کہ میں پورے ضلعے میں پھیلے بورڈ کے مدرسین کی وسیع برادری سے کٹ گیا ہوں اور میں نے کثرت کا نہیں قلت کا انتخاب کیا ہے۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر قاضی ابوسعید رحمت اللہ تھے۔ میری حاضری کے وقت وہ رخصت پر تھے۔ بارعب شخصیت کے علاوہ اچھے مقرر اور باعلم شخص تھے۔ قاضی اعظم ان کے بھتیجے تھے جو انہی دنوں سول سروس کا امتحان پاس کر کے بطور اے ایس پی زیر تربیت تھے۔ میں ان ہی کی خالی کردہ اسامی پر حاضر ہوا تھا۔ ان کی اس کامیابی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی اہمیت میں گرانقدر اضافہ ہوا تھا۔

تعلیمی طور پر دیگر مدرسین سے فوقیت رکھنے کی وجہ سے مجھے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر پکارا جانے لگا۔ شاہ صاحب نے مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے چق لگے مخصوص کمرے میں ان کی کرسی پر بٹھا دیا۔ انجمن اور شاہ صاحب کچھ مدرسین کو فارغ کرنا چاہتے تھے جو تھے تو غیر تربیت یافتہ، لیکن چار سے پانچ سال کا تدریسی تجربہ رکھتے تھے۔ بیچاروں نے ماضی میں شاہ صاحب کے بارے میں کہیں کچھ کہہ دیا تھا کہ بطور ایس وی مدرس کے تو اس نے اپنی

تنخواہ ایک سو پچاس روپے مقرر کر رکھی ہے جبکہ انجمن کے کلرک کے طور پر تین سو روپے لیتا ہے۔ گھپلوں کا کوئی شمار ہی نہیں، داخلہ فیس، جرمانے، منظور شدہ فنڈاتؒ کے علاوہ مسجد فنڈ، عمارت فنڈ، امداد باہمی فنڈ، پرچہ فنڈ اور دوبارہ داخلہ فنڈ نہ جانے کون کون سے فنڈ اکٹھے کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ذاتی عناد کی بنا پر شاہ صاحب نے انجمن کو بتایا تھا کہ اسکول کی سالانہ امدادی گرانٹ غیر تربیت یافتہ افراد پر ساڑھے بارہ فیصد ملتی ہے جبکہ تربیت یافتہ افراد پر ۷۵ فیصد۔ وہ انجمن کے مفاد میں غیر تربیت یافتہ مدرسین کو آہستہ آہستہ فارغ کروا رہے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ان کے ارادوں میں آڑے آ رہے تھے۔ پہلے دو دنوں کے اندر اندر شاہ صاحب نے انجمن کی کارروائی کا رجسٹر مجھے دکھا کر چار مدرسین کو میرے ہاتھوں فارغ کرایا۔ میں بھی مجبور تھا۔ میری تکیل ابھی ابھی شاہ صاحب نے تھامی تھی۔ بات کرنے کا بھی یارانہ تھا۔

بعد میں میں نے کئی باضمیر اساتذہ کو کہتے سنا کہ شاہ نے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کو مہرے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے خصوصی طور پر درآمد کیا ہے۔ اس وقت میرے دلی رنج وغم کی انتہا نہ رہی جب سیالکوٹ شہر سے لائے گئے عربی مدرس امیر علی صاحب (بعد میں لیکچرار عربی گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج، سیالکوٹ) نے مجھے یہ بتایا کہ جن مدرسین کو میں نے فارغ کیا تھا ان میں سے ایک مدرس کرم داد کو فارغ کر کے شاہ نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا اس کو قدرت کی طرف سے مل کر رہے گی۔ کرم داد بے حد نیک، خوددار اور ایماندار استاد تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ آزمائش کی کس منزل میں تھے۔ امیر علی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے کبھی ان کے پاؤں پر نظر ڈالی تھی؟ میں متعجب ہوا کہ ان کی ملازمت سے فارغ ہونے کا ان کے پاؤں سے کیا تعلق ہے؟

انھوں نے وضاحت کی کہ موجودہ وقت میں کرم داد کے ہاں بیماری، مفلسی اور تنگ دستی ہے۔ میں اگر اس کے پاؤں پر نظر ڈالتا تو مجھے اس کے ایک پاؤں میں اور قسم کا جوتا اور دوسرے میں اور قسم کا جوتا دیکھتا۔ ایک پر اس نے پرانے کپڑے کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ پوچھنے پر بتاتا ہے کہ پٹی والا پاؤں زخمی ہے اور زخم خراب ہو گیا ہے جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس نے دو قسم کے جوتے پہنے کا جواز پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ خوددار ہے کسی سے اپنی حالت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ راز صرف مولوی ابوبکر کو معلوم ہوا کہ انھوں نے کرم داد کے پاؤں کو دیکھ کر کہا، ''یار کرم داد کل تم نے دائیں پاؤں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور آج بائیں پر باندھ لی ہے کیا چکر ہے۔''

''چکر کو راز ہی رہنے دو ابوبکر۔ میرے پاؤں کے بجائے میرے چہرے پر امیدوں کی

رونق دیکھو۔'' کرم داد کے اس جملے کی وضاحت عربی مدرس نے یوں کہ کہ اس ظالم شاہ نے اس کے چہرے سے امیدوں کی رونق چھیننے کی کوشش کی ہے۔

☆☆

وجہ کوئی بھی تھی۔ شاہ صاحب کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ان کے گھر سے بلاناغہ گیارہ بجے چائے کی ایک تھرماس آتی۔ وہ اہتمام سے ایک کپ مجھے بھی پیش کرتے۔ چائے بے حد مفرح اور لذیذ ہوتی۔ مجھے چائے کا انتظار رہتا اور دل ہی دل میں سوچتا کہ شاہ صاحب کہیں لاہور کے میونسپل لائبریرین ملک فتح شیر کی طرح ڈوڈھی والی چائے تو نہیں پیتے اور مجھے بھی اس کا عادی بنادیا ہے۔ میں نے ان سے کئی بار پوچھا کہ آپ کی چائے کا ذائقہ اور اثر فرحت بخش کیوں ہے تو وہ مسکرا کر مجھے ٹال جاتے۔ کافی عرصے بعد غالباً تعطیلات موسم گرما سے پہلے انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی چائے ییلو لیبل پتی سے بنتی ہے اور اس میں اوولٹین شامل ہوتی ہے جو صرف فرحت بخش ہی نہیں توانائی بخش بھی ہے۔ سچی بات ہے کہ اس وقت تک میں نے ییلو لیبل کا نام بھی نہ سنا تھا اور نہ ہی تلاش سے مجھے دستیاب ہوئی تھی۔

جس طرح عملے میں شامل مولانا قسم کے بزرگ اور ناصح قسم کے فاضلین شاہ صاحب سے نہیں بگاڑ سکتے تھے میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ہی انجمن کے اسکول میں زندہ رہ سکتا تھا۔ یہ قدرت کی مہربانی تھی کہ وہ مجھ پر مہربان تھے۔ ان کا کوئی عزیز سیکنڈری بورڈ میں تھا' لہٰذا انھوں نے وقت نکل جانے کے باوجود مجھے میٹرک ۱۹۵۵ء کے امتحان میں انگریزی کا نائب ممتحن تعینات کرادیا۔ اسکول کے اندر تعلیمی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں مجھے نامزد کرتے۔ کوئی مشورے کی بات ہوتی تو ہیڈ ماسٹر کو نظر انداز کر کے میرے ساتھ مشاورت کرتے۔

☆☆

عملے میں ایک ریٹائرڈ مدرس قاضی محمد انور تھے۔ وہ میرے چچا کے ہم زلف تھے۔ جوانی میں بڑے جوشیلے ہوا کرتے تھے۔ خاکساروں میں آگے آگے' تحریک خلافت میں پیش پیش' رضا کاروں میں سالار ضلع۔ کسی بھی قسم کی وردی پہن کر' کمر میں تلوار باندھ کر اور پرچم اٹھا کر دوسروں کے آگے آگے چلتے۔ میں نے ان کی ایسی کارگزاریوں کی کئی تصاویر دیکھیں۔ عملے میں وہ میرے بہت قریب تھے۔ ان کے بعد امیر علی عربی ٹیچر اور اشرف یزدانی فارسی استاد تھے۔ جن سے میں کھل کر باتیں کر سکتا تھا۔ وہ اندرون کی بھی بہت سی باتیں جانتے تھے۔

ایک ماسٹر نور محمد تھے جو ریاضی میں بڑے ماہر تھے۔ ایف ایس سی اور غیر تربیت یافتہ تھے۔ ان کے مقابلے میں میں انگریزی میں تو نمبر ایک پر تھا لیکن ریاضی میں انھیں جو مہارتیں حاصل تھیں۔ میں ان کے سامنے جم نہیں سکا۔ میری تحویل میں نہم اور دہم کے فریق الف تھے جبکہ اس کے پاس انہی جماعتوں کے فریق ب تھے۔ مجھے ریاضی میں اپنی کمزوری کا احساس تھا' تاہم شاہ صاحب کا اصرار تھا کہ میں نور محمد کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے ریاضی کا مضمون ضرور پڑھاؤں۔ میں کافی تیاری کے بعد ریاضی کے اسباق پڑھاتا لیکن کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اٹک جاتا تھا۔ میں نے شاہ صاحب سے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو انھوں نے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ تعطیلات موسم گرما میں انھوں نے میری طرح ہی ایک سائنس ماسٹر کو کسی انٹرویو سے اڑایا اور اسے میری جماعتوں کی ریاضی کی تدریس تفویض کر کے میری جان چھڑائی

ریاضی سے فارغ ہو کر میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ سکول کی لائبریری سے رجوع کیا تو مطلب کی کئی کتب دستیاب ہوئیں۔ سٹاف روم میں اساتذہ کی گپ شپ سے بھی استفادہ ہوا۔ ایک بات مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک وضع دار دینی مدرس کا صاحبزادہ یورپ سے فرنگن بہو لے آیا تھا۔ ان کی بہو اپنے بچے کو ڈبے کے دودھ کی بجائے اپنا دودھ پلاتی تھی اور ایسا کرنے سے پہلے گرم پانی میں ڈبوئے تولیے سے اپنی چھاتیاں صاف کرتی تھی اور بچے کو گود میں لے کر بیٹھ کر دودھ پلاتی تھی' لیٹ کر نہیں۔ اس کی ساس اور نندیں اس کے اس عمل کی شاکی تھیں جبکہ خود مولوی صاحب اس کی سچی ممتا کی تعریف کرتے تھے اور اکثر اس کی کئی انوکھی خصوصیات کا ذکر سٹاف روم میں بھی کر جاتے تھے۔

میری ریاضی میں کمزوری سے آشنا ہونے کے باوجود شاہ صاحب نے اپنے بلا کے ذہین اور روشن آنکھوں والے لاپروا اور شریر بیٹے اشرف عرف اچھو کو میری سپرداری میں دیا کہ میں اسے غیر نصابی سرگرمیوں سے نصابی سرگرمیوں کی طرف مائل کروں۔ اشرف سے بے تکلفی ہوئی تو صاف گوئی میں وہ میرے سامنے باپ پر بھی چوٹ کر جاتا۔ اسے تمام اساتذہ' انجمن کے ممبران اور وغیرہ وغیرہ کے سب 'اندرونے' 'بیرونے' معلوم تھے۔ کون کس پانی میں ہے' کون کہاں کھڑا ہے اور کون کیا ہے؟ وہ یہ سب کچھ جانتا تھا۔

ایک روز یوں ہوا کہ فیسوں اور فنڈز کی وصولی سے بھری شاہ صاحب کی صندوقچی اتفاقاً کھلی رہ گئی۔ کسی نے اس میں سے کچھ رقم اڑا لی۔ خود شاہ صاحب کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کتنی رقم کم ہوئی

ہے کبھی وہ اڑھائی سو بتاتے اور کبھی ہزار بارہ سو۔ گورکھے چپڑاسی پر انھوں نے اپنی کوتاہی کا غصہ نکالا' تو وہ اپنی روایتی بڑبڑاہٹ میں بول اٹھا۔ ''اتنی زور اوری اچھو کو دکھاتا تو تم کو چور کا پتہ چل جاتا۔''

گورکھا متروکہ باقیات میں سے تھا۔ ہر ایک کو تم کہہ کر مخاطب کرتا۔ آ گا پیچھا کوئی نہیں تھا۔ بس اکیلی جان تھا۔ شاہ صاحب نے غصے میں گورکھے کو دو تھپڑ جڑ دیے۔ چھٹی کے بعد بڑی رازداری سے اشرف نے گورکھے کو سچ بولنے کی پاداش میں پٹنے پر پانچ روپے کا انعام دیا۔ اشرف نے شریر چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے میرے استفسار پر مجھے بتایا کہ جب سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو ذرا ٹیڑھی کرنا ہی پڑتی ہیں۔ وہ ایسا ہی سیدھا اور ٹیڑھا لڑکا تھا۔

☆☆

اس واقعے کے بعد شاہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ صندوقچی کے بجائے اب کلرک کے کمرے میں آہنی سیف رکھا جائے۔ اس میں نقدی اور دستاویزات زیادہ محفوظ رہیں گی۔ سکول کی پرچیز کمیٹی کے ممبران مولوی ابوبکر اور قاضی انور کو نظر انداز کر کے گوجرانوالے سے سیف خریدنے کے لیے شاہ صاحب مجھے ساتھ لے گئے۔ واپسی پر جملہ مدرسین اور طلبہ نے سیف کی زیارت کی۔ قاضی انور صاحب نے اسے کھول کر اور بند کر کے دیکھا اور منہ لٹکا کر کہا ''خریدا تو ہے مگر بیکار ہے۔ مجھ جیسی سطحی سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی بھی شخص اس سیف کو پانچ منٹ میں کھول کر اس کا پیٹ صاف کر سکتا ہے۔''

انور صاحب کی یہ سرگوشی سارے سکول میں پھیل گئی۔ شاہ صاحب تک پہنچی تو انھوں نے کہا ''یہ انجمن کی غلطی ہے کہ ساٹھ سال کے ریٹائرڈ اور اکٹھی دو بیواؤں کے بوڑھے شوہر کو نوکری دے رکھی ہے۔ میں سیف بند کرتا ہوں' وہ کھول کر دکھائے' میں اسے ہزار روپیہ پیش کروں گا یا پھر وہ نوکری چھوڑ کر اپنے گھر بیٹھ کر کشتے تیار کرے' خود کھائے اور بیویوں کو کھلائے۔'' قاضی انور کی کیمیا گری کا سکول میں بھی خوب چرچا تھا۔

قاضی انور نے جواباً کہلا بھیجا ''میں ہزار روپیہ نہیں لوں گا بلکہ شاہ کو میرا تیار کیا ہوا کشتہ کھانا ہوگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ دیکھیں گے کہ کون اس کو ہضم کرتا ہے۔''

اس قسم کی نوک جھونک کے بعد طے ہوا کہ سب مدرسین تفریح کے وقفے کے دوران میں کلرک کے دفتر کے باہر جمع ہوں۔ وہاں قاضی انور صاحب اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ شاہ صاحب نے اپنے کمرے میں سیف رکھوا کر چابیوں سے بند کر دیا اور قاضی انور صاحب کو

پانچ منٹ کے لیے اکیلے کمرے میں جانے دیا۔ انھوں نے اندر سے دراوزہ بند کرلیا۔ وہ گھنٹی بجانے والا لکڑی کا ہتھوڑا اپنے ساتھ اندر لے گئے تھے۔ انھوں نے ہتھوڑے کو ایک بار میز پر، دوسری بار سیف پر اور پھر تیسری بار دروازے پر مارا۔ دروازہ کھلا تو قاضی انور صاحب باہر نکل آئے جبکہ شاہ صاحب اور مدرسین اندر گئے۔ سیف کھلا پڑا سب کا منہ چڑا رہا تھا۔

حیرت کی ایک لہر اس سرے سے اس سرے تک پھیل گئی۔ شاہ صاحب کا برا حال تھا۔ ان کے سر کے بال تک کھڑے ہو گئے تھے۔ اسکول کے بند ہونے تک کئی مدرسین، میرے اور شاہ صاحب کے علاوہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے قاضی صاحب سے 'لاک ماسٹری' فن کے بارے میں پوچھا لیکن انھوں نے سب کو یہی کہا کہ برسوں کا سیکھا فن وہ لوگوں کو چلتے چلتے' سر راہے کیسے سکھا سکتے ہیں؟

سکول بند ہو گیا تو قاضی انور صاحب شاہ صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ وہ اپنے سیف کی بیرونی چابیاں گنیں۔ انھوں نے گن کر بتایا کہ تین تین چابیوں کے دو سیٹ موجود ہیں۔ یہ دیکھیے۔ قاضی انور صاحب نے ان کو تین چابیوں کا تیسرا سیٹ پیش کیا جو انھوں نے سیف کا ملاحظہ کرتے وقت اٹھا لیا تھا۔ ساتھ ہی شاہ صاحب کو بتایا کہ سیف کے ہمراہ بیرونی تالوں کی چابیوں کے تین تین سیٹ تھے۔ دو سیٹ محفوظ رکھیں ایک کو استعمال میں لائیں۔ میں اور شاہ صاحب دونوں حیران تھے کہ ہم نے چابیوں کے سیٹوں کی تعداد پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب نے جھک کر قاضی انور کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور ہنستے ہوئے بولے "ہم آپ کو ایسے ہی تو گرو نہیں مانتے۔"

"آپ ماشاءاللہ خود گرو گھنٹال ہیں۔" انور صاحب کا جواب تھا۔

☆☆

اسلامیہ ہائی اسکول میتر انوالی کئی دیہات اور قصبوں کے درمیان واقع تھا اور بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ نزدیک ترین دوسرا ہائی اسکول تین میل کے فاصلے پر پبلک ہائی سکول گھڑتل تھا جو متروکہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ اسلامیہ ہائی اسکول کی انجمن مالدار تھی؛ طلبہ کی تعداد بھی معقول تھی۔ فیسوں کی آمدن اس قدر تھی کہ اساتذہ کی تنخواہیں بخوبی بروقت ادا ہو سکتی تھیں، لیکن تنخواہوں کی بروقت ادائیگی نہ کرنے میں کسی مصلحت سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر مدرس کی پہلی ہی تنخواہ اسے دو اڑھائی ماہ بعد ملتی تھی۔ اس عرصے میں اضافہ تو ہو سکتا تھا، کمی نہیں۔ بہرکیف میری استدعا پر شاہ صاحب مجھے ہر ماہ کی پہلی دوسری تاریخ کو کسی نہ کسی مد سے تنخواہ دے دیتے تھے۔ میں

نئے سرے سے اب پھر سے تنخواہ ہی کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت جیسی آزادی تھی نہ سربراہی۔ میں نئی قسم کی الجھن میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا اس الجھن میں جس کا ذکر دلدار علی نے کیا تھا۔ ہر سمت ضمیر کا بحران تھا۔ میرے فیصلے تلخ ثمر ہی حاصل کر رہے تھے۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ میں مختلف اوسط درجے کے رسائل میں افسانہ نویسی کی مشق بھی کرتا رہتا تھا۔

ابھی تعطیلات موسم گرما کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ دلدار علی مجھ سے ملنے کے لیے سکول میں آئے۔ میرا پیریڈ اس وقت جماعت دہم میں تھا۔ میں نے ایک بچے کو انھیں سٹاف روم میں بٹھانے کو کہا۔ فارغ ہو کر جب میں دلدار علی سے ملا تو انھوں نے ہاتھ ملاتے ہی کہا ''لگتا ہے کہ یہاں آپ بوجھ تلے ہیں۔''

''ماتحتی اور سربراہی میں فرق تو ہوتا ہی ہے۔ کیا آپ یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ میں جماعت چھوڑ کر فوراً آپ کے پاس نہیں آیا۔''

''نہیں، یہ بات تو بے قاعدگی کی ہوتی۔ دراصل اس خشخشی ڈاڑھی والے شخص نے مجھے یہ کہا تھا کہ ہم سکول کے اوقات میں کسی استاد کو خواہ اس کا وقت خالی ہی کیوں نہ ہو کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے۔'' اس کا اشارہ شاہ صاحب کی طرف تھا۔ ساتھ ہی دلدار صاحب نے پوچھا ''یہ شخص ہے تو واحد لیکن جمع متکلم کے صیغے میں بات کیوں کرتا ہے؟ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کی گرائمر درست کروں۔''

میں نے ٹال دیا کہ جانے وہ کس موڈ میں تھا۔ بھلا آدمی ہے۔ بہر کیف دلدار علی کا اندازہ بڑا درست تھا۔ دباؤ میں تو میں تھا ہی۔ دلدار علی مجھے بتانے آئے تھے کہ انھوں نے تعطیلات کے دوران ہی ریٹائر ہو جانا ہے اور اب ان کے مہربان ممبر نے ان کا تبادلہ پھر سے اسی سکول میں کرا دیا ہے جہاں سے وہ آئے تھے۔ اب جب وہ واپس جا رہے تھے تو وہ مجھے ملنے اور اپنی یادداشتوں کا مجموعہ دینے آئے تھے کہ میں ان کی یادوں کو اپنی کہانیوں میں (استادی دکھا کر) کسی نہ کسی انداز سے دوسروں تک پہنچاؤں اور زندگی میں ایک بار ان سے ملنے ان کے گاؤں ضرور آؤں۔ (افسوس! جب ۱۹۷۶ء میں ان کے گاؤں گیا تو مجھے اس مرد دلیر کی فاتحہ خوانی ہی کرنا پڑی۔ تاہم ان کی یاد اس نئی صدی میں بھی باقی ہے)۔

ہیڈ ماسٹر قاضی ابوسعید رحمت اللہ خاصے قدیم وضع کے معلم تھے۔ نظم و نسق مدرسہ، تنظیم

مدرسہ اور درس وتدریس کا مکمل شعور رکھتے تھے۔ بلاوجہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے لیکن جب کرتے تو دوسرے کو لاجواب کر دیتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا کوئی خصوصی تعلق قائم نہیں ہوا حالانکہ ان کے آبائی گاؤں دھامونکے درویش کے میں میری بھی عزیز داری تھی۔ میں ان سے کوئی نہ کوئی ٹانکا ملا سکتا تھا لیکن مجھے اس کی ضرورت نہ تھی اور انھیں بھی کیا ضرورت تھی۔

ان کے بچے بڑے مودب اور با اخلاق تھے۔ مجھے ان سے کئی سال بعد بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے ہی مجھے پہچانا۔

قاضی انور کی طبیعت میں خاصی بذلہ سنجی پائی جاتی تھی۔ ویسے بھی ان کا مشاہدہ بلا کا تھا۔ وہ کچھ عرصہ درویشی کی تلاش میں بھی رہے تھے۔ ان سے ان کے ماضی کی باتیں سننے میں مجھے خصوصی دلچسپی تھی۔ کیمیا گری پر بات چیت شروع ہوتی تو ختم ہی ہونے کو نہ آتی۔ اسی شوق میں وہ غریب چلے آ رہے تھے تاہم کبھی کبھی وہ کیمیکلز خریدنے سیالکوٹ جاتے۔ رات وہاں آزاد ہند فوج کے جرنیل ولی محمد کے سرائے نما ہوٹل میں قیام کرتے۔ اگر تین نہیں تو کم از کم دو فلم شو ضرور دیکھتے۔

ایک مرتبہ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ بھائی کی قیام گاہ ہونے کے باوجود میں نے ان کے ساتھ سرائے میں رات گزاری۔ رات بھر میں نے کھٹملوں کی موجودگی سے وہ ''مزے'' اڑائے جو میں کارپوریشن کی ملازمت کے دوران موچیوں کی دکان میں اڑا چکا تھا لیکن قاضی انور خوب سوئے۔ دن چڑھے بھی انکھ نہ کھلی تو پتہ چلا کہ جناب چینی بیگم (افیون) کے بھی شوقین ہیں جو مچھر یا کھٹمل ان کو کاٹتا وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

☆☆

اسکول کے پتے پر مجھے ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرف سے بورڈ کے اولین امتحان میٹرک کے انگریزی بی کے پرچہ جات موصول ہوئے۔ قواعد وضوابط کے مطابق میں نے آخری دس رول نمبرں کی جوابی کاپیاں جانچیں اور جانچ کے معیار کی منظوری کے لیے انھیں اپنے ممتحن اعلیٰ میاں محمود علی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول لائل پور کو بھیجا۔ انھوں نے نہ صرف میرا معیار نامنظور کیا بلکہ لکھا کہ میں مزید کاپیاں اس وقت تک نہ جانچوں جب تک کہ میں ایک اور دس کاپیوں کی قسط بھیج کر معیار کی منظوری حاصل نہیں کر لیتا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی مثال یاد آ کر رہ گئی۔ بہر کیف میں نے دس پرچوں پر مشتمل ایک اور قسط تیار کی اور اسے لے کر

خود میاں محمود علی صاحب سے ملنے لائل پور جا پہنچا۔ میاں صاحب کہیں لاہور آئے ہوئے تھے تاہم ان کے بچوں اور اسکول کے ملازمین نے مجھے کھانا اور چارپائی بستر مہیا کر دیا۔ دوسرے دن میاں صاحب اسکول کے وقت سے پہلے ہی اپنے سرکاری گھر میں پہنچ گئے۔ کچھ ہدایات کے ساتھ پرچے جانچنے کا میرا معیار منظور کیا اور جلد کام ختم کر لینے کو کہا۔ کچھ باتیں ادھر ادھر کی کیں اور مجھے بتایا کہ وہ مستقل طور پر لاہور میں اپر مال پر رہتے ہیں۔ تعطیلات موسم گرما کے دوران میں میں نے اقساط خود ہی لاہور جا کر میاں صاحب کے حوالے کیں۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ سیالکوٹ کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز مقرر ہوئے ہیں اور جلد ہی وہاں چارج لینے والے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کچھ روایتی سی معلومات بھی حاصل کیں۔ میں چونکہ اب صرف تدریس سے وابستہ تھا اور وہ بھی ایک قومی سکول میں لہذا انتظامیہ سے کوئی سروکار نہ تھا پھر بھی میں اس بات اور اتفاق پر خوش ہوا کہ بطور ممتحن اعلیٰ متعارف ہونے والے محکمہ تعلیم کے ایک گزٹیڈ افسر سے میری جان پہچان ہوئی ہے۔ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ میں اگر ان کی اپنے ضلعے کے حوالے سے کوئی خدمت کر سکوں تو وہ مجھے یاد فرمائیں۔ میرے سکول اور گھر کا پتہ تو ان کے پاس ہے ہی۔ ساتھ ہی میں نے یہ عرض کیا کہ ضلعی تعلیمی سربراہ کی حیثیت سے شاید مجھے ان کو کبھی نہ کبھی تکلیف دینا پڑے۔

انھوں نے کمال مہربانی سے کہا کہ وہ میرا کوئی بھی جائز کام کر کے خوش ہوں گے۔ میں جب چاہوں ان سے ان کے دفتر میں ان سے مل سکتا ہوں۔

پرچوں کی جانچ کے دوران مجھے علم ہوا کہ پرچے کسی انتہائی نالائق طلبہ پر مشتمل امتحانی مرکز کے ہیں۔ تحریر سے یہ بھی واضح ہو رہا تھا کہ پرچہ جات لڑکیوں کے ہیں۔ زیادہ تعداد فیل ہو رہی تھی۔ مجھے تو بورڈ اور ممتحن اعلیٰ کی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ میں نے وقت پر جانچ کا عمل مکمل کر لیا تھا۔ پرچہ جات ممتحن اعلیٰ کو پہنچا دیے تھے۔ نتائج کی فہرست کی ایک نقل میرے پاس تھی۔

میں میترانوالی سے تپتی دوپہر میں اپنے گاؤں کے قریب نالہ ایک کے پل پر پہنچا تو وہاں ایک واقف تانگے والے نے مجھے روک کر کہا کہ صبح ہی سے ایک کاروالا میرے انتظار میں کمیٹی گھر میں بیٹھا ہے۔ میں اسے مل کر گھر جاؤں۔ اس کا ڈرائیور بابو درزی کی دکان پر آپ کی گلی میں آپ کا منتظر ہے۔

کاروالا لحیم شحیم شخص لاہور کا ایک کاروباری آدمی تھا۔ اس کی بیٹی کنیئرڈ سکول کی طالبہ

تھی اور اس نے وہاں کے مرکز ہی میں امتحان دیا تھا۔ جانے اس نے نئے تشکیل شدہ ثانوی تعلیمی بورڈ کے پہلے ہی سیکریسی دفتر میں سے کیسے یہ ٹوہ لگالی تھی کہ اس مرکز کے پرچہ جات کا نائب ممتحن میں ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تو پرچہ جات بھیج چکا ہوں تو اس نے ''آوارڈلسٹ'' دیکھنا چاہی۔ میں نے اسے دکھادی۔ اس کی بیٹی فیل تھی۔ وہ مایوس ہوا اور اس نے مجھ سے ممتحن اعلیٰ کا پتہ پوچھا جو میں نے بھول پن ہی میں اسے بتا دیا۔ وہ سرد آہ کھینچ کر رہ گیا۔ شاید وہ میاں محمود علی کو جانتا تھا اور ان سے اس کو کسی گڑبڑ کی توقع نہ تھی۔

☆☆

تعطیلات موسم گرما کا آغاز ہوا تو شاہ صاحب نے اشرف کو میرے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ وہ میری ہر طرح سے خدمت کریں گے میں ان کے ''اچھو'' کو سدھار دوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ان کا بچہ ذہین ہے' سمجھدار ہے۔ گفتگو کرنا اور اپنا مقام پیدا کرنا جانتا ہے۔ آپ متفکر نہ ہوں تو انھوں نے کہا کہ نصاب کا تو اسے ایک لفظ بھی یاد نہیں۔ وہ تعطیلات موسم گرما میں میرے پاس گاؤں پہنچ جایا کرے گا اور میں اس کی راہنمائی کیا کروں گا۔

مرتا' کیا نہ کرتا۔ میں نے حامی بھرلی۔ وہ تعطیلات میں میرے گھر آنے لگا۔ سب سے گھل مل گیا۔ میری ماں کا پوتا' بیوی کا چھوٹا بھائی' ماموں زاد بھائیوں کا ماموں غرض ہر ایک کا کچھ نہ کچھ ہوتا سوتا بن گیا۔ سب سے اس نے رشتے استوار کر لیے۔ مجھ سے تو جو وہ پڑھتا سو پڑھتا وہ میرے ماموں زاد بھائیوں کا استاد بن گیا۔ ان کو خوب رسمی اور غیر رسمی تعلیم دینے لگا۔ پھر چند دنوں بعد وہ اپنے باپ کی امام بخش اینڈ سنز کی بنی ''اسکندر'' نامی بندوق اور کارتوس ساتھ لانے لگا۔ میرے لیے راستے سے فاختائیں' کبوتر اور ہریل وغیرہ شکار کر لاتا۔ میں اسے بہت سمجھاتا اور بندوق لانے سے منع کرتا' لیکن وہ آسانی سے سدھایا جانے والا نہ تھا۔

☆☆

ایک دن اس نے میری غیر حاضری میں میری بیوی سے کہا کہ یہ کس قدر اچھا ہوتا کہ قاضی صاحب ہمیشہ ہی ادھر میترانوالی میں ملازمت کرتے۔ وہ کیوں ایک سال کے لیے ادھر آئے ہیں؟ بیوی نے جب یہ بات مجھ سے کی تو باوجود ذہن میں موجود کھلبلی کے میں ذرا سا چونک کر رہ گیا۔ میں نے موقع پاتے ہی اشرف سے اس سال بھر کی ملازمت کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ جب ماسٹر وجیہہ الدین بی اے ٹریننگ کے لیے گئے تھے تو پہلے ابا ایک

بی ایس سی فیل ماسٹر تلاش کر کے لائے۔ اس نے پورا ماہ رمضان ہمارے گھر کی بیٹھک میں گزارا۔ گرم پانی کے بغیر وضو نہ کرتا تھا۔ میں نہ صرف ان کے لیے گرم پانی تیار کرتا جبکہ میری ماں سحری افطاری پر اس پردیسی کا خصوصی خیال رکھتی۔ عید سے قبل اس نے ابا جی سے تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے قسط وار ادا کرنے کے لیے ادھار لیے۔ تھوڑا بہت ادھار اس نے اساتذہ اور دکانوں سے بھی لے رکھا تھا۔ عید کے بعد وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ ابا نے اس کے خلاف پولیس میں پرچہ بھی کرایا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ تب ابا آپ کو تلاش کر لائے۔ ابا سے آپ نے وجیہہ الدین کے واپس آنے تک ہی ادھر کام کرنے کا وعدہ کیا ہے؟

یہ کس قدر غلط بیانی تھی۔ مجھے تو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ میں قاضی اعظم صاحب کی آسامی پر لایا گیا ہوں۔ ایک آدھ دن میں اداس سا رہا۔ پھر میں نے اپنے دوست سید اصغر علی گردیزی کو لکھا کہ انھوں نے میری سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی درخواست کا کیا بنایا ہے تو انھوں نے لکھا کہ وہ میرے بارے میں غافل نہیں ہیں۔ محکمہ کچھ ضرورت سے زیادہ تقرریاں کر چکا ہے اور زائد افراد کو بہاولپور ڈویژن میں کھپا رہا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ مجھے کہیں گھر کے قریب ہی جگہ ملے۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ اب کہ اگر میری تقرری جہنم میں بھی ہوگی تو میں وہاں بھی جانے سے گریز نہیں کروں گا۔ مجھے دلدار علی کی باتیں یاد تھیں۔

ایک روز اشرف ڈار سے بچھڑی اکیلی مرغابی کا شکار کر کے لایا۔ اپنے باپ کو شکار کھلانے کے بجائے اس نے مجھے مرغابی کھلانا افضل سمجھا۔ میں اس سے شکار کی تفصیل پوچھتا رہا۔ مثلاً کونسا کارتوس استعمال کیا' کتنے فاصلے سے ہدف لیا' گھات کتنی دیر لگائی وغیرہ وغیرہ۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ میں نے اس کی کارگزاری میں اتنی دلچسپی لی ہے۔ اپنے والد شاہ کے متعلق اس نے کہا کہ اگر وہ مرغابی لے کر اپنے گھر جاتا تو مرغابی دیکھ کر دیکھ کر پہلے اسے گالیاں دیتے کہ وہ بغیر اجازت بندوق کیوں لے گیا تھا۔ پھر کھاتے ہوئے کہتے ''بس پرندے کے گوشت کی کیا بات ہے؟ سب گوشتوں سے اعلیٰ ہے۔ وہ گوشت کی تعریف کرتے۔ مجھے کبھی داد نہ دیتے۔'' میں اس کی نفسیات سمجھ رہا تھا۔ وہ باپ کی شفقت بھری توجہ سے محروم بچہ تھا۔

☆☆

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ بابو رحمت اللہ کا خصوصی ایلچی میرے پاس گاؤں میں آیا کہ مجھے میاں محمود علی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز بلا رہے ہیں۔ پرچوں کا معاملہ تو ختم ہو چکا تھا

تاہم ضلعی حاکم تھے۔ میں ان سے ملا تو انھوں نے کہا کہ ایک نائب ممتحن بوجہ بیماری اب تک پرچہ جات نہیں جانچ سکا ہے۔ اس سے سارے پرچے واپس لے لیے گئے ہیں۔ میں ان پرچوں کو بھی دن رات لگا کر جانچ دوں مگر یہ کام میں ان کے دفتر میں بیٹھ کر کروں گا۔ میں کئی دن پرچے جانچنے سیالکوٹ جاتا رہا۔ وہاں میاں صاحب کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ کتنے بڑے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی ایک معذور خاتون سے شادی کی تھی۔ ان کا یہ اقدام خالص انسانیت کی بنیاد پر تھا۔ کوئی تحریص یا لالچ شامل نہ تھی۔ ایثار ہی ایثار تھا۔ وہ اب بھی ایثار ہی کر رہے تھے کہ اہلیہ کی وفات کے بعد بچوں کو ماں بن کر پال رہے تھے۔ دو بچے ان کے ساتھ ہی دفتر سے ملحقہ کمرے میں رہتے تھے۔ میری ان سے خاصی گپ شپ ہوتی۔ کافی شریر اور ذہین بچے تھے۔ ان دنوں میں میاں صاحب میرے اور بھی قریب آ گئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ میں ان کے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

☆☆

حیدر علی کے متعلق مجھے علم تو ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں بلکہ سپیشل پولیس کا اہلکار ہے۔ پھر بھی اس کے بارے میں کئی سوالات میرے ذہن میں تھے۔ پرچے جانچنے کے کام کی روزانہ کی مقررہ تعداد پوری کر لینے کے بعد میں شہر میں ادھر ادھر بھی چکر لگا آتا تھا۔ مثلاً ایک روز عبدالغنی کی خیر و عافیت دریافت کرنے گیا تو وہ کافی آزردہ تھا۔ بولا:

''کتھے ٹر گئے او بھا جی! میرے مرن تے ای آنا سی۔ ممتاز وی گواچ گیا اے''

اس محبت بھری سرزنش کا میں کیا جواب دیتا؟ اس کی ماں نے بتایا کہ اب وہ مکان بیچ رہے ہیں تا کہ عبدالغنی کو لاہور لے جائیں۔ وہاں اس کا علاج کرائیں اور پھر اگر مقدر یاوری کرے تو غنی کو کسی کام کاج میں لگائیں۔

اگلے روز میں بھائی سے ملا اور اسے کہا کہ وہ عبدالغنی سے ملتا جلتا رہا کرے۔

سٹی انسپکٹر پولیس کا دفتر بھی قلعہ پر تھا۔ ایک روز میں نے شہر کے بازارِ حسن (تیل گھر) کے خاتمے کی مبارکباد دینے ایڈیشنل انسپکٹر پولیس محمود الحسن انصاری کے پاس گیا۔ وہ حسب روایت تپاک سے ملے۔ میں نے مبارک باد دی تو کہنے لگے ''شہر کی اس طہارت کا سہرا شیخ ابرار کے سر پر ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا ادھر کوئی حیدر علی بھی پولیس ملازم ہے؟

''کوئی حیدر علی؟'' انھوں نے حیرانگی سے کہا۔ ''حیدر علی تو آج کل مقامی اخبارں کا

عنوان بنا ہوا ہے۔ اس نے نہ صرف تیل گھر صاف کرنے میں نمایاں کام کیا ہے بلکہ اس نے لالو تیلی کو گرفتار کر کے ترقی بھی پائی ہے...... آپ اس کو کیسے جانتے ہیں۔"

"وہ میرا اہم جماعت بیلی ہے اور میں اسے لالو ڈاکو کی حیثیت سے پہچانتا ہوں۔"

"لیجیے! ابھی حاضر کر دیتے ہیں آپ کے بیلی کو۔" انھوں نے گھنٹی بجاتے ہوئے اردلی کو حیدر علی کو بلانے کے لیے کہا۔ پھر وہ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

چند لمحوں بعد بوٹوں کے ٹکرانے کی آواز آئی تو انصاری صاحب نے کہا "لیجیے ملزم حاضر ہے۔"

حیدر علی مجھے اپنے افسر کے پاس بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا' تاہم اس کے معانقے اور مصافحے میں پہلی دونوں ملاقاتوں جیسی ہی گرم جوشی تھی۔

اس نے انصاری صاحب سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ مجھے گرفتار کر لے۔ اس پر انصاری صاحب نے کہا "سب کو ایک ہی لاٹھی سے تو نہ ہانکو' ہاں پیار کی کڑیاں لگانے کی تمھیں اجازت ہے۔"

انصاری صاحب کی اجازت سے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا اور کہا کہ میں اپنے آپ کو اگلے چوبیس گھنٹوں کے لیے گرفتار سمجھوں۔ میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے بتانا شروع کیا کہ اس نے مصروفیت کے باوجود میرا کہاں کہاں تعاقب کیا ہے؟ بارے آج گوہر مقصود حاصل ہوا ہے اور اچھے موقع پر ہوا ہے۔

وہ مجھے اپنے نئے تعمیر شدہ مکان میں چھاؤنی والی سڑک پر لے گیا۔ اس کی بیوی دوسرے بیٹے کی ولادت کے بعد ابھی کوٹ میراں ہی میں تھی۔ گھر میں دو ملازم موجود تھے۔ دوپہر کا کھانا وغیرہ ہوٹل امیلیا سے منگوایا۔ رات کا گھر پر بنوایا۔

اس نے مجھے اپنے ذاتی حالات کی تفصیل بتائی کہ اس کا والد اسے وکیل یا تحصیلدار بنانا چاہتا تھا۔ وہ دونوں میں سے کوئی بھی نہ بن سکا۔ پولیس میں آنا اس کی اپنی ترجیح تھی۔ اے ایس آئی بھرتی ہونے پر اس کے باپ نے اس سے عہد لیا تھا کہ وہ سگریٹ تک بھی نہیں پیئے گا۔ رشوت کو خنزیر سمجھے گا' مظلوم کی مدد کرے گا اور اگر اسے کوئی افسر ایسا کرنے پر مجبور کرے تو وہ نوکری پر لات مار دے گا۔ حاجتمندوں کی مدد کھلے دل سے کرتا رہے گا۔ ہفتے میں ایک بار باپ سے ملنے ضرور آئے گا۔ مولوی محمد علی صاحب سے بھی ملتا رہے گا اور جب تک وہ جواب نہ

دیں اپنا اور کنبے کا علاج انہی سے کرائے گا۔

باپ کی اور بھی بہت سی شرائط کے متعلق اس نے بتایا جو مجھے اب یاد نہیں آ رہیں۔

لالو ڈاکو کی بات چلی تو اس نے میرے شکوک وشبہات رفع کیے۔ وہ میرا تعاقب بھی اسی لیے کرتا رہا تھا کہ وہ مجھے چوبیس گھنٹے کے لیے اغوا کر کے لے جائے اور ساری باتیں بتا کر مجھے حالات سے پیدا ہونے والی بدگمانی سے نکالے۔اس نے بتایا۔

''لالو ذات کا تیلی ہے' کرائے کا قاتل ہے۔اس نے کم از کم چھ قتل کیے ہیں۔ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا یا پولیس اس سے اغماض برت رہی تھی۔ تاج محمد پولیس کا باقاعدہ مخبر اس کے ٹھکانوں تک پہنچ گیا تھا۔ لالو کا بھی اپنے مخبروں کا ایک جال ہے۔ جب اسے شبہ ہوا کہ تاج محمد پولیس کا مخبر ہے تو اس نے تاج محمد سے سوال جواب کیا۔ ظاہر ہے تاج محمد نے تو انکار ہی کرنا تھا۔ لالو تذبذب میں پڑ گیا تاہم وہ ضمانتاً اور امانتاً تاج محمد کی بہن کو اپنے چمچوں کی مدد سے اٹھوا لے گیا۔ تاج محمد کے ماں باپ تو خاموشی کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے پولیس نے بھی تاج محمد کی کوئی مدد نہ کی۔اس نے اپنے دل کی پھانس سے مجبور ہو کر اکیلے ہی لالو سے ٹکرا کر مر جانا چاہا تو میں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انصاری صاحب نے خصوصی طور پر ایس پی صاحب سے اجازت لے کر لالو تیلی کی گرفتاری کا معاملہ میرے سپرد کر دیا۔ میں نے جھگیاں مراد میں قیام کر کے خود لالو کا بھیس بدلا۔ تاج محمد کو دوہرا کردار ادا کرنے کی ذمے داری سونپی۔ ایک طرف وہ پولیس کا مخبر تھا تو دوسری طرف لالو کا۔

کالے میں بھی ایک مفرور محسن لالو تیلی کا ساتھی ہے۔ تاج محمد کا خیال تھا کہ کالے میں بھی ایک خفیہ اڈا قائم کیا جائے۔ پہلی بار بھی وہ تمہارے مدرسین سے میری ہدایت کے مطابق ہی ملا تھا۔ دوسری دفعہ اس نے وہاں مجھے خود چلنے کو کہا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نے جب ضروری معلومات حاصل کیں تو تمہارا نام سامنے آ گیا' بچپن جاگ اٹھا اور پھر کالا جانا ناگزیر ہو گیا حالانکہ میں کالے میں اپنا اڈا قائم نہ کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

''پھر جو ہوا اس سے تم آشنا ہی ہو۔''

میں نے پوچھا......اور وہ تمہاری مے نوشی؟''

''ہاں......وہ بھی ڈرامہ ہی تھا۔ دراصل ڈاکو لوگ اندر سے کمزور ہوتے ہیں۔ انھیں حوصلے کے لیے نشیلی اشیاء اور خصوصاً ٹھرے کی بڑے ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی نفسیاتی

بیماری ہے۔ میں نے وہ ٹھرا عرق گاؤزبان' شربت انجبار اور جنجر (ادرک) کی بوتلیں ملا کر تیار کیا تھا۔ اسے تمہارے سامنے پی کر میرا جی متلا اٹھا تھا۔ مجھے قے آ رہی تھی اس لیے بھاگ گیا تھا۔ تاج محمد عرف تاجا بھی اس کی اصلیت نہیں جانتا تھا۔ تمہارے مدرس بھی مغالطہ کھا گئے...... بلکہ لالو تیلی کا پورا جتھہ اسے انمول قسم کی شراب سمجھ کر خوش ہوتا رہا۔

تاجا جھانسا دے کر لالو تیلی کو اپنے دو ساتھیوں سمیت بہلول پور کی ایک پلیا کے پاس لانے میں کامیاب ہو گیا جہاں میرے تین لال فیتے والے حوالدار چھپے ہوئے تھے۔ ان تینوں نے لالو تیلی کے دونوں ساتھیوں کو قابو کیا جبکہ لالو تیلی کی میرے ساتھ دست بدست لڑائی ہوئی۔ میں جھٹکے سے اس کی کلائی کا جوڑ اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاجے نے اچانک اس کی ناک پر مکا مارا تو لالو تیلی حیرت کے گرداب میں ڈوب گیا۔

''تو نے تاجے' تو نے اپنی بہن کے خصم کو مارا۔ تجھے زندہ چھوڑوں گا نہ تیری بہن کو......''

''تیلی اور راجپوت کا کیا رشتہ ہے کتے!! یہ تیری بدمعاشی تھی جس نے ہم کو مجبور کر دیا تھا...... لیکن دیکھ لے میں بے غیرت نہیں ہوں۔''

لالو تیلی اور اس کے ساتھیوں کی مشکیں کسنے کے بعد ہم نے مقامی آبادی سے مدد حاصل کی۔ وہ لالو کے نام ہی سے کانپ اٹھے تاہم جب انھیں یقین دلایا گیا کہ ہم ڈاکو نہیں پولیس والے ہیں تو آہستہ آہستہ چند نوجوان لالو کے لیے مزید رسیاں لانے اور لاٹھیاں لے کر پہرہ دینے کے لیے کھڑے ہونے پر تیار ہو گئے۔ تاج محمد ایک سائیکل لے کر گیا اور قریبی رینجر کی چوکی سے مسلح گارڈ لے آیا۔ یوں یہ معرکہ سر ہوا۔

باہم ملتے رہنے اور بیویوں کو ملانے کا پروگرام طے کر کے اگلی صبح ہم دونوں قلعے پر آئے۔ وہ اپنے دفتر چلا گیا جبکہ میں پرچے جانچنے میں مصروف ہو گیا' لیکن اس روز کے بعد مجھے حیدر علی کی ہمت اور جرأت کے حوالے سے اپنے ذاتی تحفظ کا احساس بڑا غالب رہا۔

◆◆◆◆◆

(۱۸)

مچھلی اور مرغابی کا شکار

پرچے جانچنے کے ان دنوں میں میں نے اشرف کو چھٹی دے رکھی تھی لیکن مجھے پتہ چلا کہ وہ دو تین مرتبہ گھر آ کر میرے بارے میں پوچھ چکا ہے اور میری بیوی نے اس کو بتایا ہے کہ میں فلاں تاریخ تک فارغ ہو سکوں گا۔ پرچوں کا کام ختم کرنے کے بعد میں نے حیدر علی سے پھر ایک ملاقات کی اور اسے اس خدشے سے آگاہ کیا جس کی نشاندہی اچھو نے کی تھی۔ اگرچہ وہ پریشانی کی بات نہ تھی پھر بھی مجھے شاہ جی کی سیاست اچھی نہ لگی تھی۔ وہ صاف گوئی سے بھی کام لے سکتے تھے۔ حیدر علی نے خالص پولیس والوں کے انداز میں کہا وہ وہاں میترانوالی میں فلاں بھیڑ جیسے ڈھیلوں والے راجے، فلاں بھس میں چنگاری چھوڑنے والے بھٹی اور فلاں لال بجھکڑ پیرومرشد وغیرہ وغیرہ سب کو جانتا ہے۔ جو میرے یار پر ہاتھ ڈالے وہ اپنا بازو ہی تلاش کرتا رہ جائے گا۔"

"بس بس اتنی بھیانک باتیں نہ کرو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا باپ خود انجمن کو منہ مانگا چندہ دیتا ہے کیا ان کو کہنے کی ضرورت ہے۔" اس نے پوچھا۔

"مجھے تو خود وہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تو بس تمہیں سکول انتظامیہ کی چالاکیوں اور سیاست کی بات بتائی تھی۔"

"چلو چھوڑو! میں چند دنوں تک بیوی بچوں کو گاؤں سے لا رہا ہوں، بولو تم میرے ہاں کب لاؤ گے، تم بھابی کو......"

"ابھی نہیں، وہ بھی منزل میں ہے......"

"اچھا، اچھا، سمجھا۔ اس نے خوش ہو کر میرے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔

میں گھر پہنچا تو اگلے دن ہی اشرف آ گیا۔ میں اسے پیار و محبت سے ملا اور بیوی کی حالت کے پیش نظر میں نے اسے اسکول کھلنے تک یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ میں لاہور جا رہا ہوں۔ حقیقتاً میں نے لاہور جانا بھی تھا۔ میں ایم اے اردو کی تیاری کر رہا تھا اور مجھے کچھ کتب ملک فتح شیر لائبریرین میونسپل لائبریری اور کچھ چغتائی صاحب لائبریرین سنٹرل ٹریننگ کالج سے لانا تھیں، لیکن میں چند دن مزید لاہور نہ جا سکا۔

☆☆

اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے ۱۶ر ستمبر ۵۵ء کو مجھے بیٹے سے نوازا۔ بیٹے کی آمد کے ساتھ ہی میری سوچوں کا انداز بھی بدل گیا۔ شاید میرے لاشعور میں بھی وہی تلاطم برپا ہوا ہوگا جیسا حیدر علی کے ذہن میں ہوا تھا۔ مجھے بابر نام بڑا پسند تھا۔

مسلمان ہونے کے ناتے سے نام رکھنے سے پہلے، بلکہ بچے کے گلے میں دنیا کی رزق کی کوئی بھی شے عرق، شربت یا شہد ٹپکانے سے پہلے بچے کے کان میں اذان کی آواز پہنچانا ضروری تھا۔ ماں نے مجھے مولوی فضل احمد کو بلانے کو کہا۔ مولوی صاحب بے داغ کردار کے مالک تھے، لیکن وہ شخص جسے میں شرافت ونجابت کے حوالے سے قصبے بھر میں اول درجے کا انسانی پیکر میں فرشتہ شمار کرتا تھا وہ میاں محمد حسین (میرے دادا کے ہم نام) تھے۔ میں ان کو بلا کر لایا تھا۔ ماں خوش اور حیران ہوئی اور مجھ سے پوچھا کہ مجھے اس ولی اللہ کا خیال کیسے آیا۔ ہر باپ اپنی اولاد کے لیے نیک تمنائیں ہی رکھتا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کے کانوں میں اللہ کا نام پھونکنے کے لیے نیک اور سچی آواز کا انتخاب کیا تھا۔ اذان کے بعد میں نے اس کا نام ابوالحسام بابر رکھا۔ یہ نام میرا مستقبل تعمیر کرنے والے ہاشمی صاحب کے بیٹے کا تھا اور میرے ذہن میں ان کی رفاقت سے بس کر رہ گیا تھا۔

دوسری بات جو میرے ذہن میں بیٹے کے حوالے سے تازہ تازہ جاگزیں ہوئی تھی۔ وہ میتر انوالی کی فرنگن کے بچے کو دودھ پلانے کے آداب سے متعلق تھی جسے کسی نہ کسی طرح شرماتے شرماتے میں نے نئی نویلی ماں کے کانوں میں ڈال ہی دیا۔

بیٹے کی ولادت سے چند روز بعد سکول دوبارہ کھل گئے۔ میں خود کو ایک زیادہ ذمے دار اور دنیاوی لحاظ سے خوش بخت انسان محسوس کر رہا تھا۔ اپنی دلی خوشی کے اظہار کے لیے لڈوؤں کا ڈبہ لے کر سکول پہنچا۔ قریباً دو سال پہلے ایسا ہی ڈبہ لے کر میں کالا پہنچا تھا۔ لڈوؤں کے

پردے میں دراصل ہم اپنی دلی خوشیاں دوسروں کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اگلے روز مجھے بھی چائے کے ساتھ چم چم نامی مٹھائی کھلائی۔ وجہ یہ بتائی کہ انھوں نے پولیس کے ایک افسر کے ذریعے ویلکم کی بنی دونالی بندوق اور تین سینکڑے کارتوس ضلع کے مال خانے سے کوڑیوں کے بھاؤ خریدے ہیں۔

اپنی خوشی میں شراکت کی بنیاد پر میں ملک عبدالغنی، حیدر علی، مولوی محمد علی، محمود الحسن انصاری اور میاں محمود علی صاحب کو نہیں بھولا۔ ان کو بھی مٹھائی بھجوائی۔ کالا اسکول کے عملے کے لیے بھی ماسٹر فتح دین کے ذریعے ایک وزنی ڈبہ بھیجا۔ ماسٹر فتح دین کے یاد دلانے پر کلیم صاحب کو بھی اپنے خوشی میں شریک کیا۔ سب نے مبارک بادیں نچھاور کیں۔ جواباً میں دعاؤں کا طالب ہوا۔

''لو بھا جی، اب ابا جی بھی بن گئے ہیں۔'' ملک عبدالغنی کا تبصرہ تھا۔ دلدار علی کو میں صرف خط کے ذریعے اطلاع ہی دے سکا اور اس سے دعا کا طالب ہوا مگر اس نے جواب میں ڈاک پارسل کے ذریعے نومولود کے لیے کپڑے اور چاندی کا جھنجھنا بھیجا۔

ان دنوں پورے ضلعے میں اسلحہ کی خرید بڑھ رہی تھی۔ ہر ایک کو شکار کا خبط تھا میتر انوالی کیوں کسی سے پیچھے رہتا۔ شاہ صاحب کی ویلکم کا تذکرہ تو روز ہی ہوتا۔ ایک دن یوں ہوا کہ موضع گوجرہ سے آنے والے پی ٹی آئی صاحب کو راستے میں کسی آوارہ کتے نے پنڈلی پر کاٹ کھایا۔ ان کی چیخ پکار سننے اور مرہم پٹی کے دوران ہی تقریباً سبھی اساتذہ اپنی دیسی، بدیشی، ایک نالی اور دونالی بارہ بور کی بندوقیں نکال لائے تھے کہ ظالم کتے کو ہلاک کیا جائے۔ شاہ صاحب نے قرعہ ڈالا کہ کون نشانہ لگائے گا۔ قرعہ مولوی ابوبکر کے نام نکلا۔ ان کو صرف ایک آنکھ سے نظر آتا تھا اور اس پر بھی موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے ایل جی کے کارتوس سے ایسا نشانہ لگایا کہ کتے کا بھونکنے کے لیے کھلا ہوا منہ ایک کراہ کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

دن بھر نشانہ بازی کا چرچا رہا۔ شاہ صاحب کی عدم موجودگی میں قاضی انور صاحب نے ان کی نشانہ بازی کی تعریف یوں کی کہ کتا بلی تو ان کے نشانے سے فوراً مر جاتے ہیں لیکن مرغابی، کبوتر، فاختہ، تلیئر اور تیتر وغیرہ گھر جا کر اپنے عزیزوں کو بتا کر کہ گوڈی شاہ کے نشانے سے ہوشیار رہنا کی نصیحت کر کے مرتے ہیں۔ بہر کیف شاہ صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں

اڑتی مرغابیوں کو گرا اور پرندوں کی ڈار سے ایک ہی فائر سے پندرہ سولہ پرندے کھیت کر چکا ہوں تو انھوں نے مجھے نومبر کی پہلی ہی اتوار کو ستراہ چھمب میں شکار کی دعوت دی۔ میں بھلا ان کی دعوت کو کیسے ٹال سکتا تھا بلکہ یہ تو ایک اعزاز تھا۔ دوسرے سارے اساتذہ بھی تو بندوقوں کے اور شکار کی اچھی روایات کے حامل تھے تاہم میں نے پوچھا کہ ابھی تو ستمبر ہے انھوں نے اتنی دور کی تاریخ کیوں رکھی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تب تک پردیسی پرندے آ جاتے ہیں۔

''لیکن ساتھ ہی سردی بھی تو آ جاتی ہے۔ پھر پانی میں کون اترے گا۔'' قاضی انور صاحب نے کہا۔ تب شاہ صاحب نے اگلے ہی اتوار کو ستراہ چلنے کا پروگرام بنا دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا آبائی گاؤں ستراہ کے قریب ہی ہے۔ ان کی بھاری گدی ہے اور قرب و جوار میں تمام گاؤں میں ان کے مریدین ہی مریدین آباد ہیں۔

ستراہ تک کا سائیکل کا سفر گکھڑ اور نوکھر برانچ نہروں کی صاف ستھری پٹڑیوں پر بارہ میل سے کم نہ تھا۔ مخالف ہوا کے باعث ہم یعنی میں، شاہ صاحب، قاضی انور اور برخودار اشرف تھک ٹوٹ کر ستراہ پہنچے تو نہر کی پٹڑی پر ہی ہمارا استقبال شاہ صاحب کے مریدین نے کیا اور بڑے احترام کے ساتھ ہماری سائیکلیں اور بندوقیں اپنی تحویل میں لے لیں۔ خالص دودھ سے بنی دودھ پتی اور گرما گرم جلیبیوں سے ہماری تواضع کی۔ رات کو بھی مچھلی کے شکار سے بنے کھانوں سے تواضع کی۔ شاہ صاحب کو ہر مرید کچھ نہ کچھ بات بتا کر ہماری معلومات اور اپنی سعادت بڑھا رہا تھا۔

☆ کل ٹاپو بڑا کامیاب رہا۔ دو بوریاں مچھلی پکڑی۔

☆ ایک اژدہا قسم کا سانپ کئی بڑی مچھلیاں اٹھا لے گیا۔ مارا نہیں جا سکا۔

☆ نالہ کناروں سے اچھل کر بہہ رہا ہے ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔

☆ مرغابیوں کی ڈاریں عین نالے کے رواں پانی پر اترتی ہیں اور غوطے لگا کر اڑ جاتی ہیں۔

☆ کل ایس پی صاحب آئے تھے آدھے گھنٹے میں درجن بھر مرغابیاں شکار کر کے لے گئے۔

☆ بس جی مزہ تب ہے کہ منہ اندھیرے نالے کے قریب پہنچا جائے۔ ہم نے آڑ بنا رکھی ہے۔

میں باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔ اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے میں نے بھی کچھ سوالات کیے اور پھر جوابات غور سے سننے کا اخلاقی تقاضا بھی پورا کیا۔ میں ٹاپو کے بارے میں بڑا متجسس تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے ایک زیادہ ہی جوشیلے شکاری سے ٹاپو کے متعلق پوچھا تو

اس نے بتایا کہ آج رات بھی ٹاپو لگایا جائے گا۔ آپ خود دیکھ لینا۔

مریدین نے مزید بتایا کہ ہم نے اگر مرغابی کا شکار کرنا ہے تو رات ہمیں ٹاپو کے قریب بنی سرکنڈے کی جھونپڑی میں گزارنا ہوگی۔ شکار کا موسم نہ ہونے کے باوجود چھمب میں کچھ ڈاریں موجود ہیں۔ وہاں شاہ صاحب کی شان کے مطابق انتظام کر دیا گیا ہے۔

جب ہم جھونپڑی تک پہنچے تو کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ روشنی کا ذریعہ لالٹینیں ہی تھیں۔ راستے میں بعض جگہ کیچڑ اور پانی سے بچنے کے لیے درختوں کے بڑے بڑے تنے رکھے ہوئے تھے۔ ان پر سے ہم سنبھل سنبھل کر گزرتے رہے۔ قاضی انور تو ان پر بیٹھ کر گزرے۔ شاہ صاحب ان کو طنز کرتے رہے کہ اگر وہ کشتہ کھا کر آتے تو جوانوں کی طرح کھڑے کھڑے بلاخوف تنوں پر سے گزر جاتے۔

☆☆

ٹاپو کے مقام پر نالہ کے دونوں کنارے گو خشک تھے لیکن پانی ان کے برابر بہہ رہا تھا۔ جدھر سے پانی آ رہا تھا ادھر کچھ گز دور وہ کناروں سے اچھل کر سارے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ کچھ آگے جا کر بھی اسی طرح پھیل گیا تھا۔ نالے کی گہرائی پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ سفیدے کے درخت کے دو لمبے چھ انچ موٹے تنے دونوں کناروں پر اس طرح رکھے گئے تھے کہ وہ بہتے پانی کو چھو رہے تھے۔ ان کے اوپر سرکنڈے کی چلمن بچھائی گئی تھی۔ بالائی سمت پر پڑے سفیدے کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے ایک ویسی چلمن نالے کی تہ میں بچھے گارے میں گاڑی گئی تھی۔ نالے کا پانی اس میں سے پن کر بہہ رہا تھا۔ اس نازک سے پل کے اوپر دو لالٹینیں رکھ دی گئیں۔ سب لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر میں مچھلیاں پانی کے اندر والی چلمن سے ٹکرا ٹکرا کر اچھلنے لگیں جب وہ اچھلتیں تو ان کا رخ بہاؤ کی سمت ہوتا۔ ان کی بدقسمتی اور مچھیروں کی خوش قسمتی کہ وہ اچھل کر پانی میں گرنے کے بجائے پل سا بناتی چلمن کے اوپر گر کر تڑپنے لگتیں۔ نوکدار یا کیل لگی بانس کی چھڑیوں سے مناسب وقفے کے بعد مچھلیوں کو اٹھا لیا جاتا۔ مچھلیوں کی آمد اور اچھال میں شاید کچھ دخل لالٹینوں کی روشنی کا بھی ہو گا۔ کانٹے اور جال سے تو میں نے خود بھی مچھلیاں پکڑی تھیں، لیکن یہ سلسلہ میرے لیے انوکھا تھا۔ میری غیر رسمی تعلیم میں یہ تجربہ ایک گرانقدر اضافہ تھا۔

اگلی صبح بہتے پانی میں تیرتی اور اڑتی مرغابیوں پر کارتوس داغنے اور چار مرغابیاں

پکڑنے کا اعزاز بھی مجھے ہی حاصل ہوا۔ ستراہ کے شکاریوں میں اتفاق سے کارگر ہونے والے میرے نشانے کا بڑا چرچا رہا جبکہ بشیر حسین شاہ نے مجھے اپنا استاد تسلیم کر کے مجھ سے باقاعدہ نشانہ بازی کی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ میں نے انھیں کچھ داؤ پیچ (نہ جانے وہ کیا تھے) سکھائے تو پھر پرندے گھر جا کر اور عزیزوں کو شاہ صاحب کے نشانے سے بچنے کی تلقین کر کے مرنے کی بجائے وہاں ہی گرنے لگے۔ جہاں ان کو گرانا مقصود تھا۔

☆☆

انتہائی پرسکون اور ظاہر طور پر خوشگوار ماحول میں سکول کے نوماہی امتحانات ہوئے۔ اس دوران میں میرے ساتھ کوئی ایسی بات شاہ صاحب یا کسی اور مدرس نے نہیں کی جیسی اشرف نے کی تھی۔ شاہ جی کا اشرف حیرت انگیز طور پر سکول کے اس امتحان میں سینکڑوں لڑکوں میں سے دسویں گیارھویں نمبر پر آیا تھا۔ شاہ صاحب اسے میری تدریس کا کرشمہ بتا رہے تھے لیکن میں یہ جانتا تھا کہ میں نے اشرف کو کیا پڑھایا تھا۔ یا تو وہ واقعی محنت کرتا رہا تھا جیسے وہ مجھے کہتا تھا کہ کر رہا ہے یا پھر اس نے بوٹی چلائی تھی۔

جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا میں نے اپنے طور پر سنجیدگی سے اس کنویں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ سرکاری ملازمت جوئے شیر لانے کے مترادف نظر آ رہی تھی۔ جب شاہ صاحب نے ماہ جنوری کی تنخواہ مجھے دی تو ان کے منہ سے ایک ذومعنی جملہ نکلا کہ انجمن مجھے پہلی ہی تاریخ کو تنخواہ دینے کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کے متعلق سوچ رہی ہے۔ لہجے کی کاٹ سے مجھے اس جملے کے اندر چھپے معانی واضح طور پر سمجھ میں آ گئے۔ گوڈی شاہ خود ہی انجمن تھا۔ بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔

''انجمن کو میرے علاوہ دیگر اساتذہ کے متعلق بھی سوچنا چاہیے۔ ان کو بھی میری ہی طرح پیسوں کی ضرورت رہتی ہوگی۔'' مجھے یقین ہے کہ شاہ صاحب کو میرا لہجہ بھی ضروری محسوس ہوا ہوگا کیونکہ انھوں نے اپنی توجہ پیسے گننے پر مرکوز کر دی۔

سالانہ امتحانات کے دنوں میں میں نے دو تین رخصتیں لیں اور شہر جا کر بھائی کے پاس ٹک گیا۔ ایک دن میں مسلم ہائی سکول کے شاہ صاحب کی طرح کرتا دھرتا کلرک رستم علی سے ملا تو اس نے مجھے اپنے سکول میں گورنمنٹ کی تنخواہ پر ملازمت دینے کی حامی بھر لی۔ ایک اشتہار کے جواب میں کوئٹے کے ایک قومی سکول سے مجھے ۲۵۰ روپے ماہوار کی پیشکش ہوئی

لیکن گھر سے اس قدر دور جانا مجھے گوارا نہ ہوا۔ میں تو بوچھال کلاں سے بھاگ آیا تھا۔ کوئٹے سے بھاگتا تو خرچ بھی کافی اٹھتا۔

مارچ کی آخری تاریخوں میں، میں میاں محمود علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بابو رحمت اللہ انصاری کے پاس جاتے میں جھجک رہا تھا کہ وہ سوچیں گے کہ یہ شخص کس قدر متلون مزاج ہے کہ کہیں ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں۔ کلیم صاحب کی رائے بھی مجھے بتوسط ماسٹر فتح دین پہنچ چکی تھی کہ میں کہیں جم کر نوکری نہ کرنے کی وجہ سے اپنے ابتدائی گریڈ پر ہی ریٹائر ہو جاؤں گا۔ یہ بھی ان کی پیشن گوئی تھی کہ میں میٹر نوالی میں زیادہ عرصہ نہیں گزار سکوں گا۔ ان سب ہی خواہوں کو پھلانگ کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے قدرت نے میاں صاحب کی صورت میں ایک نجات دہندہ مہیا کیا تھا۔ میں نے ان سے عرض کی کہ مجھے پھر سے ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت ملازمت درکار ہے۔ انھوں نے بلا تامل کہا "یہ کونسا مشکل کام ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کو یہ علم ہوتا کہ میرا ورنیکلر فائنل ۱۹۵۵ء کا انگریزی کا نتیجہ ۱۹۵۴ء کی طرح ساڑھے بارہ فیصد ہی رہا تھا تو شاید ان کو میری تقرری مشکل نظر آتی۔

انھوں نے بابو رحمت اللہ کو بلایا اور وہ مجھے دیکھتے ہی سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس نے بھی قسم قسم کے مدرسین میں عمر گزاری تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ جی، یہ مڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹری مانگیں گے۔ اس کے لیے ان کو دور جانا ہوگا۔ اگر یہ شہر کے نزدیک رہنا چاہتے ہیں تو پھر ان کو گھوئیں کے میں تعینات کیا جاسکتا ہے؟ میں نے ہاں کر دی۔ دل میں یہ تھا کہ میرا کوئی دن بھی بیکار نہ گزرے۔ چند منٹ بعد ہی یہ احکامات جاری ہوئے کہ میں ہیڈ ماسٹر ڈی بی ہائی اسکول گھوئیں کے کو ملوں۔ اگر وہ میری خدمات کو پسند کریں تو انہی کے توسط سے درخواست بھیجوں اور خود کو اسی دن سے حاضر سمجھوں۔

گھوئیں کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور اس دور کی فعال شخصیت چودھری عبدالغنی کا گاؤں تھا۔ انھوں نے اپنے گاؤں کے ڈی بی ہائی اسکول کے لیے اچھی ابتدائی تنخواہ پر اپنے ہی علاقے کا ایک لائق اور فعال ہیڈ ماسٹر ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کا نام نذیر احمد طور تھا۔ وہ پنجاب بھر کے اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں اور انتظامی عہدیداروں میں واحد ایم اے ایم ایڈ تھے۔ جوانی کے ایام میں انھوں نے دکنی ہند میں ملازمت کر رکھی تھی اور بنگلور یونیورسٹی سے ایم ایڈ کیا تھا۔

ان سے میرا انٹرویو بڑا کامیاب رہا۔ میں نے اپنے تمام احوال وکوائف اور ذہنی شکوک و شبہات کا ذکر بھی مکمل طور پر کیا۔ انھیں یہ بھی کہا کہ میں نے مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹری کی ہے اس لیے میری کچھ انا بھی ہے اور پھر انجمن کے ہائی اسکول کے کچھ تلخ تجربات بھی ہیں۔ وہ مسکرائے اور انھوں نے مجھے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر چودھری نبی احمد کے سپرد کیا کہ وہ میری معروضات سنیں اور حقائق کی روشنی میں جواب دیں۔ انھوں نے بتایا کہ چیئرمین کے گاؤں کا سکول ہونے کے باوجود یہاں کوئی سیاسی مداخلت نہیں ہوتی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایسے معاہدے کے بعد ہی یہاں آئے ہیں۔ یہاں تک کہ چیئرمین نے اپنے چچا مہر الٰہی کو بھی سکول ہذا میں مداخلت سے منع کر رکھا ہے۔ سکول کا باقی عملہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا منتخب کردہ ہے۔ بس اپنا ٹائم ٹیبل پڑھانے اور پرسکون رہنے کی پابندی ہے۔ کسی قسم کی بیگار نہیں لی جاتی۔ عملہ وافر ہونے کی وجہ سے ٹائم ٹیبل بھی ہلکا ہوگا۔

طے ہوا کہ اگر میں چاہوں تو ۳۱ر مارچ کو میترانوالی سے قبل دوپہر فارغ ہو کر اسی دن بعد دوپہر حاضر ہو جاؤں تو تعطیلات موسم بہار بھی میرے کھاتے میں پڑ جائیں گی۔ اگر انجمن مجھ سے ایک ماہ کا نوٹس طلب کرے تو میں یکم مئی کو بھی حاضر ہو سکتا ہوں۔

۳۱ر مارچ تک دو ملازمتیں میری جیب میں تھیں لیکن میں مسلم ہائی اسکول کو بھی کنواں ہی خیال کرتا تھا چنانچہ میں ڈی بی ہائی سکول کے بارے میں سنجیدہ تھا۔

میں اپنی سبکدوشی کے لیے شاہ صاحب کی بجائے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کرنا چاہ رہا تھا جبکہ وہ ہال میں تالیوں کی گونج میں نتائج کا اعلان کر رہے تھے۔ شاہ جی کا اشرف نویں کے سالانہ امتحان میں دوم آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے انعام میں سند دیتے ہوئے کہا ''اس لفنگ پوت کی نمایاں کامیابی سیکنڈ ہیڈ ماسٹر صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔''

برخوردار خود ہی پڑھنے میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میرا کوئی کارنامہ نہ تھا۔

اپنے بیٹے کا نتیجہ سن کر شاہ صاحب مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ گورکھے کے ذریعے مجھے ہال سے بلایا۔ اوولٹین والی چائے کی پیالی پیش کی۔ بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ انجمن اسلامیہ مجھے پہلی تاریخ کو تنخواہ نہیں دے سکتی۔ قاعدے کے مطابق انجمن نے آپ کو ایک ماہ کا نوٹس نہیں دیا لہٰذا آپ کو مارچ اور اپریل کی دو تنخواہیں دے کر فارغ کیا جا رہا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے کہا ''بسم اللہ فرمائیے''۔

☆☆

میں نے تنخواہیں وصول کیں۔ کسی سے ملنا ضروری نہیں سمجھا۔ سائیکل پکڑی اور گھر کی راہ لی۔ ان کے لیے خس کم جہاں پاک ہوا اور میں کنویں سے نکل آیا۔ کھانے کے لیے پیسے موجود تھے۔ پورا مہینہ کتابیں پڑھتے اور آرام کرتے گھر میں گزارا۔ بچہ سات آٹھ ماہ کا ہو رہا تھا اس کی موجودگی میں گھر پہلے سے کہیں زیادہ پر رونق اور حسین تھا۔

یکم مئی ۱۹۵۶ء کو میں پھر سے اس برادری میں آ شامل ہوا جو ضلع کے ہر قصبہ اور گاؤں تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب گاؤں ہوگا جہاں کوئی بھی مدرس نہ ہو۔ میرا ایمان ہے کہ مدرس خواہ غریب ہو یا امیر اپنے دوسرے مدرس بھائی کے لیے اپنے بازو اور دروازے وا رکھتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بچوں میں رہتے رہتے اس کی فطرت سرپرستانہ ہو جاتی ہے۔

نبی احمد چیمہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے بعد دوسرے خوش پوش شخص تھے۔ میں نے اچکن پہننا تو بی ٹی میں شروع کی تھی اور ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا لباس اب بھی پہنتا تھا۔ یہاں آ کر غیر ملکی موزوں لباس پہننا اور ٹائی وغیرہ لگانا انہی سے سیکھا۔ ان کی معلومات بھی بلا کی تھیں۔ زراعت سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ سکول کے باغیچے، روشیں، درخت، سبزہ اور پھول ان کی توجہ کے شاہکار تھے۔ موضع دلچیکے میں ان کی تین ایکڑ زمین تھی جس سے وہ دوسروں کی نسبت تین گنا زیادہ کمائی کر رہے تھے۔ وہ بتاتے کہ مٹروں کی قبل از وقت کاشت، پانی کی نالیوں کے کنارے بوئے گئے گل لالہ کے پودے اور ننھی ننھی کیاریوں میں اگائی گئی مرچیں، سبزیاں، ہلدی اور مونگ پھلی کی فصلیں نقد آور ثابت ہوئی ہیں۔ گاؤں والے ان کی تقلید کر رہے ہیں اور ان کے گاؤں میں زرعی انقلاب آ رہا ہے۔

ان دنوں ان کی بیگم سی ٹی (جے ایس) کر رہی تھیں۔ ان کا منصوبہ بیرون ملک چلے جانا کا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق نومبر ۵۶ء میں آغا خانی مشن کے تحت ممباسہ چلے گئے۔ وہاں ان سے میری خط و کتابت رہی۔ انھوں نے لکھا کہ ان کی رہائش کے باتھ روم مدھوبالا (اس دور کی مشہور ایکٹریس) کے باتھ روم جیسے ہیں۔ وہ دو ایک مرتبہ پاکستان بھی آئے مگر ان کے بچے پاکستانی ماحول اور آب و ہوا نہ اپنا سکے۔ میاں بیوی مزید غیر ملکی اسناد حاصل کر کے اب مستقلاً برطانوی ہو چکے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کو میں نے اپنے چھپے ہوئے چند افسانے پڑھنے کو دیے، تو انھوں نے سکول سے میری ادارت میں بچوں کے لیے ایک ماہوار رسالہ 'شاہین' نکالنے کی خواہش کا اظہار

کیا۔ چنانچہ سرورق پر کتابچہ لکھ کر ہم نے ڈیکلریشن حاصل کرنے تک جون اور جولائی کے دو شمارے نکالے۔ ڈیکلریشن حاصل کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز، لاہور ڈویژن کو لکھا تو انھوں نے لکھا کہ سکول سے میگزین نکالنے کی کیا ضرورت اور کیا جواز ہے؟ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواباً لکھا کہ جب لاہور میں بیٹھے محکمہ تعلیم کے افسران اعلیٰ سکول میگزین کی افادیت سے نابلد ہیں اور ہم دیہاتیوں سے ضرورت اور جواز پوچھتے ہیں تو ہم بوڑھے طوطے کیا بتا سکتے ہیں؟ برہمی ظاہر کرنے کے لیے اس خط پر انسپکٹر آف سکولز نے چیئرمین کو لکھا۔ چیئرمین کے دفتر نے وہ مراسلہ برائے وضاحت سکول میں بھیج دیا جہاں ہم نے رسالہ شائع کرنے کے ارادے کے ساتھ مراسلے کو بھی دفن کر دیا۔

تعطیلات موسم گرما کا آغاز ہوا تو میرا ارادہ ایم اے کی تیاری کے لیے لاہور جا کر چھوٹے بھائی کے پاس رہنے کا تھا کہ پہلے ہی ہفتے مجھے بخار نے آ دبوچا۔ گاؤں کے تمام طبیب اور عطائی ڈاکٹر میرا بخار اتارنے میں ناکام ہو گئے۔ تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ جسم کا رنگ بدل گیا اور توانائی نام کی کوئی شے باقی نہ رہی تو مجھے بھائی لاہور لے آئے۔ ہم چچا فاروقی کے ہاں ٹھہرے اور ان سے استدعا کی کہ وہ مجھے کسی اسپتال میں داخل کرائیں۔ اگلے دن میں میو اسپتال میں تھا۔ وہاں میرا ایک پھوپھی زاد بھائی ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ مجھے اس کے ایم بی بی ایس کر لینے کا علم ہی نہ تھا کیونکہ خوشحالی اور خستہ حالی کی بنیادوں پر ہمارا باہم رابطہ خوشی غمی کے مواقع ہی پر ہوتا تھا۔ یہ ان کی مہربانی اور خاندانی شرافت تھی کہ انھوں نے میری ہر طرح سے مدد کی۔ بہرکیف اٹھارہ دن اسپتال میں رہنے کے بعد میرا بخار ٹوٹا۔ چھوٹا بھائی اسپتال میں میرے پاس رہا۔ وہی اسپتال سے فارغ ہونے پر مجھے گاؤں لے گیا۔ تعطیلات موسم گرما کے ختم ہو جانے کے باوجود میں اسکول نہ جا سکا۔ ڈاکٹر نے ایک ماہ آرام کرنے اور علاج جاری رکھنے کے لیے کہا تھا۔

چودھری نبی احمد کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری دو ماہ کی تنخواہیں اور اپنی جیب سے قرض حسنہ کے طور پر دو سو روپے بھجوائے۔ چودھری نبی احمد نے مزید پیش کش کی۔ ''بیماری کے فوائد'' لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بیماری کے دوران میں پیاروں کی شناخت ہوتی ہے اور فرصت میں اپنے متعلق سوچنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ میں خوش قسمت تھا عزیز، دوست اور رشتہ دار سب فکر مند ہوئے تھے اور انھوں نے ہر قسم کا تعاون پیش کیا تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو بیل

بوٹوں والی چادریں بچھانے اور موتی ٹکے سرہانے دینے والی خاتون بھی اپنے شوہر کے ساتھ ان اٹھارہ دنوں میں تین بار میری عیادت کے لیے میو ہسپتال آئی۔ میری والدہ اور بیوی بچہ چند دن اسی کے ہاں مقیم رہے۔

☆☆

ہیڈ ماسٹر صاحب سے اپنے پہلے انٹرویو میں یہ طے ہوا تھا کہ میں تعلیمی سال کے دوران ان کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے یہ عہد نبھایا۔ جونہی ۱۹۵۷ء کے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو میری تحریک پر حیدر علی نے بابو رحمت اللہ سے کہا کہ وہ مجھے کسی مڈل سکول میں بھیج دیں۔ میں نے حیدر علی سے کہا تھا کہ میں کچھ ادبی ذہن اور لکھنے لکھانے کا شوق رکھتا ہوں لیکن پھر میں نے ایم اے (اردو) کا داخلہ بھی بھیج رکھا ہے' لہذا میرا گزر اب ہائی سکول میں اور بالخصوص چیئرمین بورڈ کے گاؤں میں مشکل ہے۔ اس نے جواباً کہا تھا کہ ہم رحمت اللہ کے سینکڑوں کام کرتے ہیں وہ ہمارا کام کر کے خوش ہوگا۔

حیدر علی نے اپنے آدمی کو بھیجا کہ وہ جا کر بابو رحمت اللہ سے کہے کہ حیدر سلام بھیج رہا ہے۔ ''سلام دینا اور سلام بھیجنا'' دفتری اصطلاح ہے۔ سلام دینا سے مراد ہے کہ میں سفارش کر رہا ہوں اور سلام بھیجنا کا مطلب ہے کہ ملاقات کا وقت دو۔ جواب میں رحمت اللہ صاحب خود ہی حیدر علی کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہنستے ہوئے' ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے۔

''حکم؟'' بابو رحمت اللہ نے حیدر سے کہا۔

حیدر علی نے مجھے کہا کہ میں بات کروں تو رحمت اللہ نے حیدر علی کو بتایا کہ ان کا اور ان کے چچا جان کا تو میں پرانا خادم ہوں۔ پھر ان کی ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب سی بھی بڑی گہری بات چیت ہے یہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ تو حیدر علی نے کہا کہ دراصل یہ مجھے کچھ بڑا بنانے کی فکر میں ہے حالانکہ میں اس کا تابع ہوں۔ اس کی تو ہمارے افسروں سے بھی دوستی ہے لیکن اس نے دل کی بات مجھے کہہ کر میری عزت افزائی فرمائی ہے کیونکہ ہم دونوں لوئر مڈل اسکول کی تعلیم کے دوران نالہ ایک میں اکٹھے ننگے نہاتے رہے ہیں گویا لنگوٹیئے ہیں۔ ان کا تبادلہ کسی اچھے مڈل اسکول میں کر دیں۔

''علی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ محکمے کی حکمت عملی تو ہر مڈل اسکول میں ٹرینڈ

گریجوایٹ ہیڈ ماسٹر لگانے کی ہے لیکن اچھے' آزاد اور آسان رسائی رکھنے والے اسکولوں میں سفارشی' ایس وی' او ٹی جے' اے وی اور سی ٹی وغیرہ بیٹھے ہیں ان کی مرضی کے بغیر یا اُن کے سفارشی ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ اور چیئرمین وغیرہ کی مرضی کے بغیر ان پر ٹرینڈ گریجوایٹ ہیڈ ماسٹر بٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اگر کسی سکول میں ایسا کر بھی دیا جائے تو ماتحت بننے والا ہیڈ ماسٹر نئے ہیڈ ماسٹر سے تعاون نہیں کرتا بلکہ الٹا ان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ آپ کو خود گگے والی کے سکول کا تجربہ ہے کہ ایس وی قادر بخش نے چودھری سردار علی کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ وہ دفتر میں آ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا تھا کہ اسے ہیڈ ماسٹری نہیں چاہئے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن وہ چودھری بھی تو ان پڑھ ہی تھا۔ جانے اس نے کیسے اتنا پڑھ لیا تھا۔''

میں خاموش بیٹھا دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔ رحمت اللہ نے حیدر علی کو مزید بتایا کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے پانچویں جماعت کے وظیفے کا جو امتحان لیا ہے وہ پرچوں کی جانچ کروانے والے ہیں۔ ان کا خیال ان کو اس کام میں شامل کرنے کا ہے۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر ہائی سکول گھوئیں کے کو چٹھی بھی لکھ دی ہے۔ اپریل کا مہینہ ادھر گزر جائے گا۔ مئی اور جون دو ماہ یہ اور گھوئیں کے میں کاٹ لیں تاکہ نئے بی ایڈ اساتذہ آ جائیں تو پھر ان کو اچھے مڈل اسکول میں تعینات کریں گے۔ فی الحال ان کو گھوئیں کے سے نکالنا بھی مشکل ہے۔ چیئرمین کا گاؤں ہے اور عملے کی کمی کا شکار ہے۔ کوئی بھی مرضی سے وہاں نہیں جاتا۔''

حیدر علی نے بابو رحمت اللہ سے کہا کہ وہ خود چیئرمین سے مل لے گا۔ اسے وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ تو رحمت اللہ نے کہا کہ انکار وہ بھی کب کر رہا ہے۔ اچھے اسکول کی بات کر رہا ہے۔ اگر ان کو محض مڈل اسکول چاہیے تو وہ ابھی احکامات جاری کروا دیتا ہے۔ چیئرمین سے وہ خود بھی کئی بہانے بنا سکتا ہے۔ میں نے پیشکش کی کہ میں تعطیلات موسم گرما تک انتظار کر لیتا ہوں۔ تو حیدر علی تھوڑا سا ناراض ہوا۔

''ایک تو یار تم خود ہی ڈھیلے پڑ جاتے ہو۔ نفسیات کا اصول ہے کہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔''

بہر حال یہ طے ہو گیا کہ میں فوری طور گھوئیں کے نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے واپس جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب کو ساری منصوبہ بندی بتا دی۔ وہ بھی بڑے کائیاں آدمی تھے۔ انھوں نے

کہا ''ایک ماہ تو آپ کا دفتر میں لگ جائے گا۔ اگلا ماہ آپ کو امتحان کی تیاری کرنا ہوگی کیونکہ جون میں پندرہ دن کے لیے آپ ایم اے کا امتحان دینے بھی لاہور جائیں گے لہٰذا میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ نہم' دہم کا کوئی پیریڈ لینے پر اصرار نہ کریں۔''

''جناب' میں نے کب اصرار کیا ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''آپ نے نہیں کیا' درست ہے' لیکن ٹرینڈ گریجوایٹ انگریزی مدرسین چھوٹی جماعتوں کو پڑھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب...... آپ میری ڈیوٹی گھنٹیاں بجانے پر لگا دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن جب میرا تبادلہ ہو تو یہ پھڈا نہ ڈالئے گا کہ تعلیمی سال کے اختتام سے پہلے مدرس کو فارغ نہیں کیا جائے گا۔''

وہ ہنس دیے اور کہا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ اپنے سال بھر کے منصوبوں میں میرا نام ہی نہیں لکھیں گے۔''

ابھی میں وظیفے کے امتحان کے کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے دائیں گردے میں شدید درد اٹھا۔ اس رات میں ٹھہرا ہوا بھی حیدر علی کے ہاں تھا۔ بڑے ٹوٹکے آزمائے۔ اینٹ گرم کر کے تولیے میں لپیٹ کر درد کے جگہ ٹکور کی گئی لیکن آرام نہیں آیا۔ مولوی محمد علی صاحب کے پاس گئے تو انھوں نے دوا مکئی کے بھٹے کے بالوں والے ابلے پانی کے ساتھ کھانے کو کہا' لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ درد اس قدر شدید تھا کہ کسی پل قرار نہ تھا۔ نہ بیٹھنے سے آرام ملتا نہ لیٹنے سے چین آتا ایک طرح کی ''رولنگ پین'' تھی۔ آخر سول اسپتال سے مارفیا کا انجکشن لگوایا تو کچھ افاقہ ہوا۔ دن چڑھے پھر وہی کیفیت ہوگئی۔ اب وہ مجھے ٹرنک بازار میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے پھر انجکشن لگایا اور اس اس خیال سے کہ درد گردہ نہیں ہے' پیٹ کا درد ہے۔ انیما کیا جس سے مجھے حیرت انگیز طور پر افاقہ ہوا۔ تین چار دن بعد میں سکول گیا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے کسی کام کے لیے کچھ واقف کاروں سے راہ نمائی کے لیے لاہور بھیج دیا۔ میں خود بھی لاہور جانا چاہتا تھا۔ وہی امتحان کے سلسلے میں۔

مجھے یاد ہے کہ میں اوڈین سینما' ایبٹ روڈ میں کوئی انگریزی فلم دیکھ رہا تھا۔ وقفے کے دوران میں پیشاب کی خاطر بیت الخلا میں گیا' تو میرا پیشاب بند ہوگیا' بڑی تکلیف ہوئی۔ فلم

ادھوری چھوڑ کر میں ڈاکٹر کی تلاش میں بھاگا۔ نسبت روڈ پر ایک ریٹائرڈ کیپٹن ڈاکٹر ہی نزدیک تھا۔ اسے میں نے صورت حال بتائی تو اس نے ایک برتن دے کر مجھے ایک ملحقہ کمرے میں بھیج دیا اور کہا کہ میں بائیں پہلو پر لیٹ کر پیشاب کروں۔ پیشاب آرام سے آ گیا اور مجھے تکلیف سے نجات ملی تو مجھے اپنے آپ کا ہوش آیا۔

''کیا آپ کو کبھی دردِ گردہ ہوا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''درد تو ہوا تھا' لیکن ڈاکٹر نے اسے درد گردہ تسلیم نہیں کیا۔ انیما سے ختم ہوا۔'' میں نے ساری تفصیل بتائی۔

''میری تشخیص یہ ہے کہ آپ کو درد گردہ ہی ہے۔ کوئی پتھری تھی' اب وہی پتھری گردے سے مثانے میں منتقل ہوگئی ہے آپ بیٹھ کر پیشاب کریں گے تو رکاوٹ رہے گی' لیٹ کر کریں گے تو پتھری ایک طرف ہٹ جائے گی۔ آپ ایکسرے کروائیں۔''

میں نے ایکسرے نہیں کروایا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں رات گزاری۔ واقعی لیٹ کر ہی پیشاب کیا جا سکا۔ اگلی صبح میں پھر سے اپنے پھوپھی زاد کے پاس میو اسپتال پہنچ گیا۔ وہ مجھے آپریشن تھیٹر میں لے گیا۔ اس نے میرے مثانے میں سلاخ سے ''ساؤنڈنگ'' کی اور کہا کہ پتھری نہیں ہے۔ دوائی لکھ دی۔ میں جلدی سے اپنے کام کاج سے فارغ ہوا۔ کیفیت وہی رہی۔ اب ہر مقام پر لیٹ کر ہی فارغ نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے زبانی کہہ دیا کہ میں جب تندرست ہو جاؤں تو اسکول آ جاؤں۔ تب تک میں رخصت بھیج دوں۔

میں نے شہر سیالکوٹ میں بھائی کے کمرے میں بستر بچھا لیا۔ بیوی بچہ بھی وہاں آ گئے۔ والدہ بھی چکر لگا گئیں۔ میں نے چند دن تکلیف اٹھانے کے بعد ڈاکٹر کا علاج شروع کیا۔ پیشاب میں خون بھی شامل نکلا۔ اب ایکسرے کرانا ضروری ہو گیا کہ آپریشن کی تیاری کی جائے۔ پہلو کے بل لیٹ کر فارغ ہونے لگا تو پیشاب نہ آیا۔ میں نے ذرا زور لگایا۔ گو میری چیخ نکل گئی لیکن ایک چنے کے برابر نوکدار پتھر نکل کر برتن میں گرا اور پھر میں بغیر کسی تکلیف کے فارغ ہو گیا۔

میں تو اسے معجزہ ہی کہوں گا۔ اللہ کا خصوصی کرم کہوں گا کہ کوئی بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ اتنا بڑا پتھر پیشاب کی نالی کی راہ خارج ہو سکتا ہے۔ مولوی محمد علی اور کیپٹن ڈاکٹر کی تشخیص صحیح رہی تھی۔ میں نے وہ پتھر سنبھالے رکھا اور جب جون میں میں ایم اے کا امتحان دینے

لاہور آیا تو پھر کیپٹن ڈاکٹر سے ملا اور۔ اسے خراج تحسین پیش کیا۔ اس نے میری تھوڑی سی ''ہسٹری'' سنی اور کہا کہ مجھے یہ پتھر ٹائیفائیڈ کے دوران میں زیادہ اینٹی بائیوٹک ادویات کھانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایسی ادویات کے ساتھ پانی وافر مقدار میں پینا چاہیے اور دہی کا استعمال نہیں بھولنا چاہیے۔

میں ڈاکٹر مذکور کی ہدایت پر اب تک عمل کر رہا ہوں اور اللہ کی مہربانی سے پھر مجھے کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی۔

☆☆

گوڈی شاہ جی کا ''اچھو'' بڑا اچھا بچہ ثابت ہوا۔ اس نے میرے ساتھ گھوئیں کے میں بھی رابطہ رکھا۔ میرے ہانڈیوال ماسٹر احمد دین صاحب جبال ہی سے ریٹائر ہو کر گاؤں واپس آئے۔ مجھے ملنے آئے تو میں نے گلہ کیا کہ میں تو کب سے ادھر ہوں۔ میں نے ان کو پیغام بھی بھیجا تھا وہ کیوں ملنے نہیں آئے۔

''اس لیے کہ آپ کو بھی میری طرح باغی قرار نہ دے دیا جائے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''تو پھر کیا ہوتا' میں بھی آپ کی طرح کون سا گھر میں بیٹھا ہوں۔'' وہ میرے جواب سے خوش ہوئے۔

انھوں نے میری دعوت کی۔ ماضی کی یادیں تازہ ہوئیں۔ انھوں نے میرے اس خیال کو پسند کیا کہ میں ہائی سکول سے مڈل سکول میں جانا چاہ رہا ہوں۔

تعطیلات موسم گرما کے دوران ہی میں میرے احکامات تبادلہ جاری ہو گئے اور میں ستمبر میں سکول کھلنے پر صرف ایک دن کے لیے ہائی اسکول میں گیا' لیکن ہیڈ ماسٹر اور عملے نے دوپہر کو ایک شاندار الوداعی تقریب کا اہتمام کیا۔

ہیڈ ماسٹر ڈی بی ہائی اسکول گھوئیں کے نے فراغتی پرچہ جاری کرنے کے ساتھ ہی کہا کہ مجھے نئے مڈل اسکول میں جانے سے پہلے صدر دفتر جانا ہوگا کیونکہ میرے تبادلے کے احکامات میں ناگزیر حالات کے تحت کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔ تعمیل حکم میں صدر دفتر پہنچا تو مجھے بابو رحمت اللہ نے انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ جس جگہ آپ کی مرضی کے مطابق تبادلہ کیا گیا تھا وہاں کے ہیڈ ماسٹر کا ریٹائرمنٹ میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے اس نے درخواست گزاری

ہے کہ اسے یہ آخری سال اسی جگہ رہنے دیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ وہ شخص دفتر کے ایک اہلکار کا رشتہ دار تھا، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے خاندانی حالات کی وجہ سے اس گاؤں سے فوراً جانا چاہتا تھا۔ بیچارے نے اپنی بیٹی کی شادی اسی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں میں کی تھی اس کا داماد جو یکا یک امیر بننے کے چکر میں فراڈ کر بیٹھا تھا اور اب جیل کی ہوا کھا رہا تھا۔ بیٹی کے باپ کو ہر کسی کا ''ماسٹر جی! شرافت علی نے کیا کیا؟'' کا جواب دینا پڑتا تھا اور اسے یہ سب کچھ برا لگتا تھا۔

میں گھوئیں کے سے تو فارغ ہو ہی چکا تھا، حیدر علی سے ملنا چاہا، تو پتہ چلا کہ وہ ٹریننگ پر سہالا گیا ہوا ہے۔ میاں محمود علی بھی ترقی پا کر بطور ہیڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل اسکول، لوئر مال لاہور جا چکے تھے۔ محمود الحسن انصاری صاحب کو بھی اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد سی آئی اے جھنگ میں انسپکٹر تعینات کر دیا گیا تھا۔ تنہائی محسوس کرتے ہوئے میں نے تجربے اور مہم جوئی کے طور پر سرحدی دیہات کانپور پلوڑہ میں جانے کی ہامی بھر لی۔ وہاں کے ایف اے پاس انگلش ٹیچر نے سی ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا تھا، اس کی جگہ انگریزی مدرس بھیجنا مطلوب تھا۔ وہاں کے لیے میرے احکامات صادر کرتے ہوئے بابو رحمت اللہ نے کہا کہ وہاں کا ایس وی ہیڈ ماسٹر پیر فضل حسین سابقہ فوجی ہے۔ ذرا اکھڑ مزاج ہے۔ وہ اپنی تنزلی سے تلملائے گا لیکن میں اس سے کھل کر کہہ دوں گا کہ اسے بھی فوری طور پر اوٹھیاں مڈل اسکول میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ پھر وہ خاموش ہو جائے گا۔ اوٹھیاں کا نام لینا اسے خاموش کرنے کی کل ہے۔

احکامات پر دستخط کرانے کے لیے بابو صاحب نے مجھے نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر ظہور الحق فاروقی کے سامنے پیش کیا۔ گٹھے ہوئے جسم کے بھاری بھرکم ڈسٹرکٹ انسپکٹر کا تعلق اچھرہ لاہور کی بی مارکہ خضاب کمپنی کے مالکان فاروقی صاحبان سے تھا۔ انھوں نے کرسی سے اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ ساتھ ہی کچھ اس قسم کے الفاظ تیزی سے کہے کہ وہ ان لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نو۔ ،نوں کو ملک وقوم کا بڑا اثاثہ سمجھتے ہیں جو دیہاتوں میں تعلیم کی شمع فروزاں کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔

''تم نے، برخودار کون سے مضمون میں ایم اے کیا ہے؟''

''اردو میں جناب۔''

''کونسے درجے میں؟''

''دوم میں جناب۔''

''خوب! جب چاہو کالج میں جا سکتے ہو' ماشاء اللہ'' ساتھ ہی انھوں نے کھڑے کھڑے احکامات پر دستخط کر دیے اور انگریزی میں میرے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ میں نے اس مختصر سی ہی ملاقات میں فاروقی صاحب کے متعلق اندازہ لگایا کہ وہ حرکات اور گفتگو میں بڑے متحرک شخص ہیں۔

☆☆

صدر دفتر سے فارغ ہو کر میں بھائی کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ تنہائی میں اپنے ماضی پر نظر ڈالی۔ میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں تک پہنچا ہوں؟ پہنچا کہاں تھا ابھی تو میں ابتدائی منزلوں ہی میں تھا! گھوئیں کے میں گزارے وقت سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا؟ نئے نئے افراد سے ملا تھا اور بقول عمر خیام ''میں نے جوں جوں زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی' میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا''۔ میں بھی حیرت زدہ تھا۔ میترانوالی میں قیام سے مجھے کیا حاصل ہوا تھا؟ مختصر جواب یہ ہے کہ میں پہلے کی نسبت اپنے آپ کو تجربہ کار اور 'سیانا' محسوس کر رہا تھا۔ نظم و نسق مدرسہ میں سیاسی حکمت عملی اپنا سکنے کے اہل تھا۔ کچھ زیادہ ذمہ دار بھی ہو چکا تھا۔ عیالی ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ ۱۹۵۷ء کے وسط میں اللہ نے مجھے ایک اور بیٹے سے نوازا تھا۔ یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ میری ماں سجدے کرتے نہیں تھکتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے گھر کے آنگن میں ستائیس برس بعد پھر سے پھول کھلے ہیں اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے۔ میں نے سوچا میری مجاہدہ ماں نے بیوگی کے بائیس برس کسی قدر استقامت سے گزار لیے ہیں۔

اسی سال تعطیلات کے دوران لاہور کارپوریشن کا میرا کلرک ساتھی اور بی ٹی کا ہم جماعت میرے گاؤں آیا۔ اس نے ''پاکستان ٹائمز'' انگریزی اخبار اٹھا رکھا تھا۔ ایم اے کا نتیجہ ڈویژن کے حساب سے شائع ہوا تھا۔ فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے رول نمبر پہلے اور تھرڈ ڈویژن آخر میں درج کیے گئے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا ''یار! میں نے اخبار اٹھاتے ہی تمہارا رول نمبر تھرڈ ڈویژن میں تلاش کیا اور نہ پا کر سخت رنجیدہ اور مایوس ہوا کہ تم اس بار بھی ایم اے نہیں کر سکے۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو سیکنڈ ڈویژن والوں میں تلاش کرتے ہیں۔ غلطی بھی تو ہو سکتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ ان میں تمہارا رول نمبر موجود تھا۔''

یہ اس کا بات کرتے ہوئے مزاح پیدا کرنے کا انداز تھا۔ حالانکہ میں نے پہلی بار ہی

امتحان دیا تھا اور اللہ کی مہربانی سے سیکنڈ ڈویژن حاصل کی تھی۔ ذاتی ترقی کے زینے ایک ایک ہی کر کے قدم اٹھانے ہی سے طے ہوتے ہیں۔ آگے کی سمت میرا یہ قدم بھی مثبت رہا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے ماں کی دعاؤں کا کرشمہ میری بہتری کی صورت نمودار ہو رہا تھا۔

گھوئیں کے میں ملازمت کے دوران اسکول کے ایک مدرس کی اعانت سے میں نے سیالکوٹ شہر کے ایک دیندار گھرانے میں منجھلے بھائی کو چھوڑ کر چھوٹے بھائی کی شادی کر دی تھی۔ اس کے سسرال والوں نے اسے اتنی محبت دی تھی کہ وہ لاہور سے سیالکوٹ آ کر ہفتہ بھر ان کے ہاں گزار جاتا لیکن ہم سے ملنے گاؤں تک نہ آتا۔ اگر کبھی منجھلے بھائی سے سر راہے ملاقات ہو جاتی اور خبر ماں تک پہنچتی تو ماں کو افسوس ہوتا۔ میں ماں سے کہتا کہ آپ کو اس بات پر خوش رہنا چاہیے کہ آپ کا بیٹا خوش ہے' اولاد کی خوشیاں ہی ماں کی خوشیاں ہونا چاہئیں۔ ماں کہتی کہ تم ٹھیک کہتے ہو' لیکن اولاد کا بھی تو فرض ہے کہ وہ اپنی خوشیوں میں ماں باپ کو بھی شریک کرے۔ اس گھر میں باپ تو ہے نہیں۔ ماں نے ہی باپ کا کردار بھی ادا کیا ہے' اسے اولاد کی بے رخی سے دکھ نہیں ہوگا' تو اور کیا ہوگا؟

خوشیوں' کامیابیوں اور ملال کی کئی صورتوں کا اعادہ کرتے کرتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ سہ پہر کے بعد بھائی کی آمد پر میری آنکھ کھلی۔ اتنی پیاری نیند کے بعد میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ بھائی کو میں نے بتایا کہ میرے تبادلے کے احکامات تبدیل ہو گئے ہیں اور اب مجھے اگلے روز سے کاں پور پلوڑہ حاضر ہونا ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بھائی پھر کام پر چلا گیا اور رات کو دیر سے آیا۔ وہ ابھی سو رہا تھا کہ میں نے رنگ پورہ روڈ سے دن بھر کے لیے ایک روپے کے عوض سائیکل کرائے پر لی اور صدر بازار جا پہنچا۔ وہاں اپنا من پسند ناشتہ کیا اور اللہ کا نام لے کر سیالکوٹ چھاؤنی کے باہر کھلے میدانوں تک جا پہنچا۔ وہاں سے لال کرتی میں سے ہوتے ہوئے مجھے اس کچی سڑک پر چڑھنا تھا جو سرحدی تھانے اور فوجی چوکی چیراڑ کی سمت جاتی تھی۔ اسی پر موضع کاں پور پلوڑہ پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

☆☆

میدانی پگڈنڈیوں کی بہتات کے باعث میں بارش کے پانی کی وجہ سے ایک متروک راستے پر جا چڑھا۔ صاف ستھرا نظر آنے والا راستہ اچانک دلدلی گار میں تبدیل ہو گیا۔ میں

ٹھٹھکا، اِدھر اُدھر نظر ڈالی، کوئی شخص آ رہا تھا نہ جا رہا تھا، لیکن درختوں کا وہ جھنڈ سامنے تھا جس کی آڑ میں گل بہار نامی گاؤں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ راہ کی بجائے کراہ پر ہوں، لیکن اس اثنا میں وہ سریش جیسی لیکن چکنی گار سائیکل کے مڈگارڈوں کے اندر بری طرح پھنس گئی، پہیئے جام ہو گئے۔ نیچے پاؤں رکھنے کی دیر تھی کہ دونوں بوٹوں کا وزن بھی من من بھر کا ہو گیا، اگر آپ کبھی سائیکل پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہوں تو آپ کو میری مایوسی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنا وہ 'سیانا پن'، جس کا جائزہ میں کل بھائی کے کمرے میں لیٹے لیٹے لے رہا تھا، بڑا حقیر نظر آیا کہ سامنے کی ویرانی سے میں راستے کی گمبھیرتا کا اندازہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہاں کسی کو آواز دینا صحرا میں گلا پھاڑنے کے مترادف تھا۔

کچھ دیر میں ہمت ہارے روہانسا سا کھڑا رہا پھر میں نے سوچا کہ آگے کی بجائے واپسی کا قدم اٹھانا ہی موزوں رہے گا، لیکن یہ واپسی کا قدم اٹھے کیسے؟ قریبی بے برگ و بار درخت کے نیچے تھوڑی سی گھاس نظر آئی جبکہ میرے آگے بھی گھاس کا میدان تھا، مگر وہ ساری دلدل ہی تھی۔ میں نے بوٹوں سے پاؤں نکالے، سائیکل کو چھوڑا، تو گارے میں دھنسنے کے باعث وہ کھڑی رہی۔ میں گھاس تک گیا اور وہاں سے ایک شکستہ ٹہنی کا ٹکڑا تلاش کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ننگے پاؤں میں ادھر ادھر آسانی سے حرکت کر سکتا ہوں۔ ایک ایک کر کے میں نے بوٹ گارے سے آزاد کرائے اور ٹہنی کی مدد سے ان سے گارا اتارا اور تسموں کے ساتھ سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا دیے۔ پھر سائیکل کو صاف کیا اور پورا زور لگا کر اسے اکھاڑا اور کندھے پر اٹھا کر اس جگہ تک پہنچا جہاں زمین گیلی تو تھی لیکن دھنسو نہیں تھی۔ اس سارے عمل کے دوران دن تپنا شروع ہو گیا تھا، پیاس محسوس ہونے لگی۔ زبان ہونٹوں پر پھرتا میں اس دلدلی ماحول سے نکلا، ننگے پاؤں ہی سائیکل پر بیٹھا اور اس مقام پر پہنچا جہاں سے میں نے راہنمائی حاصل کی تھی۔ اب مجھے ایک دھوبی میلے کپڑوں کا گٹھڑ گدھے پر لے جاتے ملا۔ اس نے کہا کہ اچھا کیا جو تو آگے نہیں بڑھا ورنہ کسی دلدلی جوہڑ میں ڈوب سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ کیا تو یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ پھیلی ہوئی گھاس کے خطے میں کوئی مویشی چر رہا ہے نہ کوئی شخص گھاس کاٹ رہا ہے؟ میں کیا جواب دیتا، ویسے بھی اس کا ''تو'' کر کے مجھے مخاطب کرنا کھٹک رہا تھا۔ پھر اس نے ایک جوہڑ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ اس میں اپنے ہاتھ پاؤں دھو لوں، سائیکل کو بھی صاف کر لوں اور پھر وہ دور نظر آنے والے آتے جاتے لوگوں کی قطار میں شامل ہو جاؤں، یہی

راستہ صحیح ہے اور وہ درختوں کی قطار والی سڑک صاف ہے۔ گو کچی ہے، مگر پتھر ہے۔

''بابو، یہ مٹی ہی ایسی ہے...... گیلی ہو تو گوبر، سوکھی ہو تو لوہا۔'' دھوبی نے مجھے اب بابو کہہ کر پکارا تو میں خوش ہو گیا

بہر حال میں نے گل بہار پہنچ کر سڑک کے کنارے لگے ایک نلکے سے پانی پیا، منہ پر چھینٹے مارے، تازہ دم ہوا اور مزید پون گھنٹہ سائیکل چلا کر اور راستے میں راہنمائی حاصل کرتا مڈل اسکول کاں پور پلوڑہ جا پہنچا۔ یہ دو جڑواں گاؤں تھے جیسے کالا کپورو والی تھے۔ اسکول کی عمارت مناسب سی تھی۔ بوسیدہ چار دیواری میں ایک پھاٹک لگا ہوا تھا۔ سامنے آمد و رفت کا عام کشادہ سا راستہ تھا۔ دوسری سمت ایک میدان میں درختوں کے سایوں میں دو تین جماعتوں کے بچے بیٹھے تھے۔ دروازے کے اندر کی سمت ایک دیوار کے سائے میں سارے مدرسین جمع تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے درمیان معمولی سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ان میں سے ایک نوجوان مجھ تک پہنچا۔ اس اثنا میں، میں سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کر چکا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نوجوان نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نیا انگریزی مدرس ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ وہ مجھے اس کوٹھڑی تک لے گیا جو دفتر کہلاتی تھی۔

◆◆◆◆◆

(۱۹)

کاں پور پلوڑہ میں

سابقہ ہو جانے والے ہیڈ ماسٹر نے بڑی خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا۔ اسے قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ اس کی ہیڈ ماسٹری ختم ہو گئی ہے۔ اسکول کے نائب قاصد سائیں کو اس نے گھر سے شربت لانے کے لیے بھیجا۔ مدرسین جواب اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے تھے، ان سے میرا تعارف ایک 'راؤنڈ' لگوا کر کرایا۔ پھر میری طرف سے اسکول کا چارج سنبھالنے کے بارے میں آرڈر بک پر ایک حکم لکھا جس کے آخر میں انھوں نے از خود ہی لکھ دیا کہ جملہ امور حسب سابق ہی سر انجام پاتے رہیں گے البتہ اب پیر فضل حسین شاہ ایس وی اسکول کے سیکنڈ ماسٹر ہوں گے۔

میں نے آرڈر بک پر دستخط کیے۔ دیکھا کہ پیر صاحب اچھے خوش خط مدرس ہیں اور ان کی ضرورت مجھے اکثر پڑتی رہے گی۔ میرا نام لکھنے کے بعد انھوں نے نیچے حکم نامے کے مطابق ایم اے بی ٹی بھی لکھا۔ یہ کوئی دھاک بٹھانے والی بات نہیں تھی اس ایم اے بی ٹی لکھنے میں دبی سی نفرت کا اظہار تھا جو ورنیکلر اساتذہ انگریزی مدرسین سے رکھتے تھے۔ اپنے خفیہ کوڈ کے ذریعے پیر صاحب نے دوسرے مدرسین کو "ایویں ای" یعنی میرے کچھ بھی نہیں ہونے کی اطلاع دی تھی۔ مجھے پہلے سے اس ایم اے کو "ایویں ای" کہنے کی اصطلاح کا علم نہیں تھا۔

☆☆

میرے پاس ۱۹۸۷ء کی نو تاریخ کا جاری کردہ ہیڈ ماسٹر ہائی سکول کاں پور کا تصدیق شدہ سروس سرٹیفکیٹ پڑا ہے اور یہاں میں زندگی میں اتفاقات کے در آنے یا پیدا ہونے والی عجیب و غریب صورتحال کے حوالے سے اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ سرٹیفکیٹ میں انگریزی میں لکھا ہے کہ قاضی ذوالفقار احمد ایم اے بی ٹی سینئر ٹیچر ڈی بی مڈل اسکول کاں پور میں بطور ہیڈ ماسٹر

نومبر ۱۹۵۷ء سے تیس اکتوبر ۱۹۵۸ء تک تعینات رہے۔ یہ اسکول ۱۹۷۷ء میں بطور ہائی سکول اپ گریڈ ہوا۔"

یہ سرٹیفکیٹ بطور ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جاری کرنے والے وہ صاحب تھے جنہوں نے ماسٹر قادر بخش ایس وی کے ہاتھوں زچ ہو کر مڈل اسکول گگے والی کی ہیڈ ماسٹری چھوڑنے کے لئے صدر دفتر میں آ کر ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور جن کے متعلق حیدر علی کی رائے تھی کہ وہ بھی تو ان پڑھ چودھری ہے۔

اس نیک، پرہیز گارہ، سادہ اور خاموش کارکن مدرس کی ماسٹر قادر بخش ایس وی نے اس قدر کردار کشی کی تھی کہ الاماں...... اس کے متعلق مشہور کیا گیا کہ وہ اس قدر ان پڑھ، بونگا، مجہول اور غیر مہذب ہے کہ تعلیم کے شعبے میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ اس کے متعلق مشہور کیا گیا کہ:۔

● .... اس نے ہیڈ مرالہ کے ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر لاہور ڈویژن کے انسپکٹر آف سکولز چودھری محمد صادق سے کہا "سر! آپ تھک گئے ہوں گے، میں آپ کی ٹانگیں وبادوں"۔ تو انسپکٹر صاحب نے اسے کہا کہ وہ انسان ہے یا گدھا۔ مقصد شریف آدمی کو گدھا، کہنا تھا۔

● .... جب اس کی شادی کی بات فلاں چودھری کے ہاں چل رہی تھی تو چودھری نے کچھ شرائط اس کے بزرگوں کو پیش کیں اور انھوں نے تسلیم کر لیں تو اس نے کہا کہ اس کی بھی ایک شرط ہے۔ سسرال والے یہ ضمانت دیں کہ ان کی بیٹی شادی کے بعد اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ تو نہیں جائے گی۔

● .... وہ کہتا ہے کہ وہ جب چاہے آج تک اسکول میں آنے والے افسران کے خلاف مقدمات درج کرا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے بے ضابطگیوں سے سکول کے فنڈات کو کھایا نہیں بلکہ لوٹا ہے۔

● .... ایس وی ٹیچروں کو وہ "ستھرے ویہڑے" جے وی ٹیچروں کو "جنگلی ویہڑیاں" او ٹی ٹیچروں کو "وٹوانی ماسٹر" اور پی ٹی ماسٹروں کو "سیٹی ماسٹر" کہتا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

● .... اس نے مجھے سکول کا انچارج بناتے ہوئے لکھا "میں اے ڈی آئی کی میّت (معیت) میں دفتر جا رہا ہوں۔ قادر بخش ایس وی انچارج مدرسہ ہوں گے۔

● .... چھٹی لینے کا کوئی بہانہ نہ ملا تو لکھ بھیجا کہ میں دردزہ میں مبتلا ہوں۔

اصل بات یہ تھی کہ گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا آوارہ مویشیوں کا پھاٹک تھا۔ ماسٹر

قادر بخش پھاٹک کا انچارج بھی تھا اور اپنے بچوں سمیت پھاٹک سے وابستہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی مہیا کردہ رہائش میں رہتا تھا۔ پھاٹک کا ماہوار الاؤنس پانچ روپے تھا۔ ہیڈ ماسٹر اسے سکول کا کام کرنے کو کہتا، تو وہ اسے احمق اس لیے قرار دیتا کہ وہ جب تک سرکاری ذخیروں میں چرتے آوارہ مویشی پکڑ کر نہیں لائے گا تو کمائے گا کیسے؟ پھاٹک میں بند کئے مویشیوں کو جرمانے سے رہا کیا جاتا تھا اور ان کے مالکان سے ان کے چارے کا خرچ بھی لیا جاتا تھا۔ سابقہ ہیڈ ماسٹر کی طرح قادر بخش نے اس نیک نیت ہیڈ ماسٹر کو بھی اپنا پتی دار بنانے کے لئے کچھ حصہ پیش کیا تو اس نے قادر بخش کو بددیانت، خائن اور اصل ڈیوٹی سے غیر حاضر باش کہا تھا۔ لہٰذا وہ ہیڈ ماسٹر کی فرض شناسی کے خلاف تھا۔ اس نے ہیڈ ماسٹر کو نظر انداز کر کے اوپر تعلقات قائم کر لیے تھے اور اس بیچارے کی کردار کشی کی مہم شروع کر رکھی تھی۔

☆☆

کاں پور کے سکول کے عملے پر بلا مبالغہ 'کہیں کی اینٹ' کہیں کا روڑا' بھان متی نے کنبہ جوڑا' کی مثال صادق آتی تھی۔ ہر مدرس اپنی ہی ڈھب کا تھا۔ ان کی دلچسپی اسکول سے تنخواہ لینے میں زیادہ اور تدریسی کام کرنے میں کم تھی۔ سابقہ ہیڈ ماسٹر پیر سید فضل حسین شاہ اور اب سیکنڈ ماسٹر گرانڈیل شخص تھا۔ بڑے سے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں اور ان میں ہپناٹائز کرنے کی قوت کبھی کبھی مجھے بھی نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیتی۔ جس طرح استاد محترم مولوی محمد علی عورتوں کے حکیم مشہور تھے' موصوف کاں پور کے قرب و جوار میں عورتوں کا ڈاکٹر ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنی آستین میں ایک لکڑی کے دستے والی ریتی کے لوہے سے بنی دیسی قسم کی لمبی سی چھری رکھتے تھے۔ کبھی اس چھری کو گاڑ کر' کبھی اس سے زمین پر لکیریں کھینچ کر اور کبھی مریضوں کے جسم پر پھیر کر دم کرتے۔ دوائیاں بھی دیتے۔ جب باتیں کرتے تو کہتے کہ مقدر نے مار دیا ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ ریاست جسدن کے جو دکنی ہند میں ہے' دیوان تھے۔ اب تو وہ خوش لباس بھی نہیں تھے۔ البتہ ان کے بڑے بڑے کانوں میں سونے کی دو ننھی ننھی بالیاں موجود تھیں جنہیں وہ راجہ صاحب کی عنایت بتاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کئی سال برطانوی فوج میں رہنے کا بھی ذکر کرتے' کبھی کسی گاؤں کا ڈیرہ دار بھی بن جاتے۔

ایک روز باتوں باتوں میں انھوں نے اوٹھیاں کا قصہ خود ہی بیان کر دیا کہ قیام پاکستان کے دو سال بعد بھارت سے آ کر وہ اوٹھیاں میں مدرس تعینات ہوئے۔ وہاں ادھیڑ

عمری کے باوجود انھوں نے ایک نوجوان مریضہ سے اس کی سوتیلی ماں کی مرضی سے شادی کر لی کیونکہ اس لڑکی کا علاج ہی شادی تھا۔ اس پر اس کے بھائی اور باپ ان کو جان سے مارنے پر تل گئے۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر دفتر صدر گئے۔ پورا ماجرا بیان کیا اور دفتر نے ان کو فی الفور کاں پور تبدیل کر دیا۔ میں نے بھی موقعہ پا کر اوٹھیاں بھیجنے کی دھمکی کا راز کھولا تو کہنے لگے دفتر والے انھیں مذاق میں وہاں بھیجنے کی بات کرتے ہیں مگر انھیں دفتر والوں کا احسان یاد ہے ورنہ وہ چار بچیاں کہاں سے حاصل کرتے۔ پہلی راجپوتنی تو سرحد کے اس پار ہی رہ گئی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''ترنتارن کے قریب دو بچوں سمیت سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوئی، میں بچ گیا۔''

پیر فضل حسین بھی اندر سے دکھی انسان ہی نکلا۔ وہ ادھر سے کچھ بھی ادھر نہیں لا سکا تھا۔

پیر فضل حسین میرا با اعتماد رفیق کار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک شاہ صاحب تھے جو مجاہد فورس میں بھی کوئی عہدہ رکھتے تھے۔ ان کو بارڈر پولیس کی طرف سے ایک رائفل بھی دی گئی تھی جس کو وہ اکثر بلاوجہ داغتے رہتے۔ ایک ماسٹر غلام محمد سدا کا کنوارا شخص تھا' وہ گھوڑیوں کی خرید و فروخت سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ ایک نوجوان چھاؤنی سے آتا تھا' غیر تربیت یافتہ مدرس تھا۔ وہ گاؤں بھر کے لیے منیاری کی اشیا خرید کر لاتا۔ عورتیں اکثر اس کی تلاش میں سکول تک آ جاتیں۔

باقی مدرسین بھی ایسے ہی تھے۔ ان سب کا سردار ایک ماسٹر ملک تھا جو سابقہ فوجی تھا۔ وہ دفتر میں بھی آنا جانا رکھتا تھا۔ مڈل سکول کاں پور بھی سنٹر سکول تھا۔ وہ سنٹر بھر کے اساتذہ کے دفتروں میں الجھے اور لٹکے کام کراتا اور جب اسے سکول سے جانا ہوتا تو وہ کسی بڑے آدمی کا نام لیتا کہ اس نے اسے بلایا ہے۔ اکثر وہ سٹی مسلم لیگ کے صدر خواجہ صفدر کا نام لیتا۔ میں جانتے ہوئے بھی خاموش رہتا اور اسے جانے کی اجازت دے دیتا۔ وہ پنجاب ٹیچرز یونین کا مرکزی سطح پر بھی عہدیدار تھا۔ بات اچھی کر لیتا تھا اور کسی بھی شخص کے بارے میں اچھی یا بری ہوا باندھنے کے فن کا بھی ماہر تھا۔

☆☆

انھی ایام میں میرے ساتھ ذاتی نوعیت کا ایسا حادثہ ہوا جس نے میری زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بقول حکیم الامت کہ غم جوانی کو لذت خواب سے جگا دیتا ہے میرا دوسرا بیٹا جس کی عمر تین چار ماہ کے درمیان تھی اچانک بیمار ہو گیا۔ پانی پیتے نہیں تھکتا تھا۔ اس کی ماں پانی کی

پیالی اس کے منہ سے لگاتی تو پیچھے ہٹانے پر چیخنے چلانے اور رونے لگتا۔ میں کال پور میں تو ٹھہرتا نہیں تھا بھائی کے کمرے میں شہر آجاتا تھا اور روزانہ سائیکل پر جواب میں نے سیٹھ شفیع برادر بزرگ ملک غنی سے قسطوں پر لے لی تھی سکول آجارہا تھا۔ میں سکول جاچکا تھا جب میری بیوی بچے کو لے کر شہر پہنچی۔ بھائی بھی اس وقت تک اپنے سکول جاچکا تھا اس کے ہمراہ میرا ماموں زاد بھائی تھا۔ وہ دو دروازے میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچی اور ماموں زاد کو میرے بھائی کو بلالانے کو بھیجا۔ ڈاکٹر نے دوائی بھی دی۔ ٹیکہ بھی لگایا اور بچہ قدرے پرسکون ہوگیا۔

ماں نے گاؤں سے ایک آدمی میرے پاس بھی بھیجا تھا۔ وہ سیدھا سکول پہنچا۔ میں بھاگم دوڑ شہر آیا۔ بھائی کے سکول گیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی بھاوج کے ساتھ ہے۔ بچے کو آرام ہے اور وہ گاؤں جارہے ہیں۔ میں بھی گاؤں جانے کے لئے اسٹیشن پر پہنچا۔ وہ سب مجھے اسٹیشن ہی پر مل گئے۔ بھائی مجھے دیکھتے ہی رونے لگا۔ میں سمجھ گیا۔ کہ بچہ ٹھیک نہیں ہے۔ بیوی بچے کو اٹھائے ایک دیوار کے ساتھ خاموش کھڑی تھی۔ میں روتے ہوئے اس کے قریب گیا اور بچے کو اس سے لینا چاہا تو بھائی نے بتایا کہ وہ بچے کو کسی کو نہیں دے رہی۔ وہ سکتے کے عالم میں تھی۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو وہ ہم سے پہلے گاڑی میں سوار ہوئی اور بچے کو نشست پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے اور اس کا منہ تکنے لگی۔ گاؤں کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو وہ بچے کو سمیٹ کر اتری اور تانگے پر بیٹھ گئی۔ گھر پہنچی تو بچے کو میری ماں کو تھمادیا اور خود کھڑی رہی۔ ماں کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ رونے پیٹنے لگی۔ محلے بھر کی عورتیں اکٹھی ہوگئیں کسی نے میری بیوی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ بڑے بچے نے ماں کی حالت دیکھ کر رونا شروع کردیا۔ وہ توتلی زبان میں مجھے پوچھتا ''امی کو کیا ہوا' بھائی کو کیا ہوا' یہ سب کیوں رورہے ہیں؟''

چچا بھی آگئے۔ اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر وہ گاؤں کے طبیبوں کو بلالائے۔ سب نے یہی کہا کہ کوشش کرو یہ روئے۔ یہ سکتے کے عالم میں ہے۔ دوائی کھانا تو الگ اس نے بقول میری والدہ صبح سے کچھ کھایا تھا نہ پیا۔ سخت مجبوری اور پریشانی کا عالم تھا۔ بیوی کی حالت کے پیشِ نظر جلدی میں بچے کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

دانا اور سیانی بزرگ عورتوں نے تشخیص کیا کہ مریضہ کی حالت ایک تو شدت غم سے ایسی ہے۔ دوسری اس کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہیں اور پھٹی جارہی ہیں گو اس نے کچھ کھایا پیا نہیں لیکن فطرت اپنا کام کررہی ہے۔ کسی حکیم سے دودھ نکالنے کا پمپ منگوایا گیا اور عورتوں نے اس

کی چھاتیاں خالی کیں۔ اس کا بخار فوراً اتر گیا۔ بخار کو "دودھ کا بخار" بتایا گیا۔ بچے کے مرض کو عطش 'پیاس' کا مرض کہا گیا۔ سب نے کوشش کی کہ مریضہ روئے لیکن وہ نہ روئی' اس کی حالت بھی نہیں سنبھلی۔ رات کو بڑے بچے نے مچل مچل اور رو رو کر برا حال کر لیا اور ماں کے ساتھ سونے پر اصرار کرنے لگا۔ رشتہ دار عورتیں اسے ماں کے ساتھ لیٹنے نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا میں نے چیخ کر کہا کہ بچے کو ماں کے ساتھ لیٹنے کیوں نہیں دیتے۔ قصہ کوتاہ بچے کو ماں کے ساتھ لٹا دیا۔ پہلے تو وہ روتے روتے سو گیا۔ پھر دو گھنٹے بعد بیدار ہوا اور امی' امی کی رٹ لگا دی۔ میں نے سنا کہ جب وہ 'امی' کہتا ہے تو اس کی ماں "ہوں" سے اسے جواب دیتی ہے۔ بچے کے رونے اور ماں کی ہلکی سی ہوں کی آواز سن کر والدہ بھی تسبیح پڑھتی آ گئی تو اس نے بہو سے کہا کہ وہ اب دوسرے بچے کو کیوں ہلکان کر رہی ہے۔ ہوش میں آئے' اسے سنبھالے۔ بچوں کے بارے میں میری ماں کی ڈپٹ سے میری بیوی خوش ہوا کرتی تھی۔ اس کے لاشعور میں تھا کہ دادی اپنے پوتوں کا رونا بسورنا برداشت نہیں کر سکتی لہٰذا یہ ڈپٹ پیار کی ڈپٹ ہوتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر میری بیوی چیخیں مار کر رونے لگی کہ اس کا "خاوے باوے" کہاں ہے' وہ شہر میں گم ہو گیا ہے' کدھر ہے' لاؤ' یہ گھر میں کون لوگ آئے ہیں۔ ابا جی کو لائیں' وہ (میں) کدھر ہیں؟

بیوی کو ہوش تو آ گیا' لیکن حواس بجا نہ تھے۔ لیٹے لیٹے بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے پھر رونا شروع کر دیا اب سب اسے خاموش ہونے کو کہہ رہے ہیں مگر وہ روئے چلی جا رہی ہے۔ چچا جان نے کچھ آیات پڑھ کر دم کیا۔ اسے کچھ کھانے کو دیا جو تھوڑا بہت اس نے نگل لیا اور پھر نڈھال سی ہو کر چارپائی پر گر گئی۔ لیٹے اور سوئے ہوئے بڑے بیٹے کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس سے پوچھنے لگی "کیا تم نے پانی پی لیا ہے؟ تیرا پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔" اور پھر رونے لگی۔

میں تو پریشان تھا ہی' باقیوں کو بھی کب چین تھا۔ ماں نفلوں پر نفل پڑھے جاتی اور دعائیں مانگتی۔ یا اللہ' اپنا دیا ہوا کھلونا تو تو نے لے لیا ہے۔ اس لڑکی پر اپنا رحم فرما۔ اسے صبر اور سکون دے۔"

تین ماہ میری اہلیہ بیمار رہی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ میں نے اپنے غم کو غلط کرنے کے لئے بچے کے بارے میں "خاوے باوے" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جو ایک ہفتہ روزہ میں شائع ہوا۔ دراصل وہ افسانہ حقیقت پر مبنی کیفیتوں کا ایک مجموعہ تھا اس لئے اسے بڑی پذیرائی

ملی۔ مجھے دلاسہ دینے کے لئے لکھے گئے رسالے کے قارئین کے خطوط ایڈیٹر نے مجھے میرے گاؤں کے پتے پر ارسال کر دیئے۔ افسوس وہ افسانہ نایاب ہو چکا ہے۔ بات بھی تو بڑی پرانی ہے۔ اب بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو مجھے ''خاوے باوے'' شدت سے یاد آ رہا ہے۔ اساتذہ کی خاصی برادری اس سانحے پر میری دلجوئی کرنے میرے پاس آتی رہی۔ زندگی کے اس پہلو سے براہ راست مڈبھیڑ سے میں عرصے تک بقاوفنا کے فلسفے میں الجھا رہا۔ کتابیں میری ساتھی بن گئیں۔ ہر فرصت کا لمحہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھتے گزارتا۔ کئی ابہام رفع ہوئے کئی نئے ابہام ابھرے تاہم پڑھنا میری زندگی ہوگئی۔ کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔

☆☆

۱۹۵۷ء کی آخری سہ ماہی میں بلدیاتی سکولوں کے اساتذہ نے پنجاب ٹیچرز یونین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سکولوں میں علامتی ہڑتال کی۔ ان کا متفقہ مطالبہ تھا کہ بلدیاتی مدرسین کی تنخواہیں اور مراعات سرکاری سکولوں کے اساتذہ کے مساوی ہونا چاہئیں۔ علامتی ہڑتال کے دوران حکومت پنجاب کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر ان کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو وہ ۱۹۵۸ء کے ماہ اکتوبر میں اسکولوں کو بالکل بند کر دیں گے اور تبھی کھولیں گے جب ان کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے۔ ساتھ ہی مرکزی قیادت نے پنجاب ٹیچرز یونین کے مرکزی، ڈویژن اور ضلعی الیکشن فوری طور پر کرانے کا پروگرام بھی دیا کہ نئی قیادت پورے دم خم کے ساتھ اساتذہ کے حقوق ان کو دلوا سکے۔

مرکزی قیادت پنجاب ٹیچر یونین کے بانی محمد علی باجوہ کے ہاتھ میں تھی۔ پورے پنجاب کے اساتذہ نے اسی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا۔ بعض ڈویژنوں میں بھی ایسا ہی ہوا لیکن ضلعی سطح پر بعض اضلاع میں اساتذہ کی دھڑے بندیاں کھل کر سامنے آئیں۔

ضلع سیالکوٹ میں ضلعے اور تحصیل کی سطح پر اساتذہ کو پنجاب ٹیچرز یونین کے قائدین سے اختلاف تھا۔ سید خادم حسین ایس وی، مڈل سکول جوڑیاں کے ہیڈ ماسٹر، ضلعی صدر تھے۔ ان کے خلاف ایک بھرپور مہم کا آغاز ہوا۔ ان کی اپنی برادری یعنی ایس وی ٹیچرز نے ان سے کہا کہ وہ نئے انتخابات میں متفقہ طور پر چودھری ثناء اللہ ہیڈ ماسٹر مڈل سکول بوگرے کو ضلعی قیادت کے لیے نامزد کر رہے ہیں، لہٰذا وہ یونین کے آئندہ انتخابات میں امیدوار نہ ہوں، لیکن سید صاحب بوجوہ انتخاب لڑنے سے باز نہیں آئے۔

انگریزی مدرسین نے جو بالخصوص ہائی سکولوں میں تھے نے پنجاب ٹیچرز یونین کی تحریکات میں پہلی بار بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ پہلے بلدیاتی ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر اپنے ماتحت ایس وی اور جے وی وغیرہ اساتذہ کو یونین سے دور ہی رکھتے تھے۔ اب پنجاب ٹیچرز یونین نے ''پیرٹی'' کی تحریک چلائی تھی، اگر اسے منظور کرلیا جاتا تو اس میں سب سے زیادہ مفاد ہائی سکولز کے ہیڈ ماسٹروں اور انگریزی کے اساتذہ ہی کو ملتا، لہٰذا ضلع بھر کے ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں اور انگریزی اساتذہ نے صدارت کے لیے محمود الحسن قریشی ہیڈ ماسٹر ڈی بی ہائی سکول کوٹلی لوہاران کو ان کی مرضی اور ایما کے بغیر اپنا متفقہ امیدوار نامزد کیا۔ قریشی صاحب میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ پورے جنون سے پڑھانے کے علاوہ وہ تقریر کے فن میں بھی بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ ایم اے (فارسی) تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اساتذہ میں ورنیکلر اور اینگلو کی تخصیص ہو۔ سب کو بلدیاتی اداروں کے اساتذہ اور سب کو یکساں محترم خیال کرتے تھے، لیکن ان کو مجبوراً اپنے ہم مرتبہ دوستوں کی مرضی کے سامنے جھکنا پڑا۔

مقررہ تاریخ پر سٹی مسلم لیگ ہال شہر سیالکوٹ، ضلع بھر کے اساتذہ سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ چناؤ بجائے خفیہ پرچی کے کھلے بندوں ہاتھ اٹھا کر دکھانے سے ہونا تھا۔ پہلے مرکزی قائدین نے تقاریر کیں۔ اساتذہ کے مطالبات اور یونین کے منشور کو موضوع بنایا گیا۔ مولانا غفاری جنرل سیکرٹری پنجاب ٹیچرز یونین نے یونین کی تاریخ اور کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ پھر متوقع قائدین کو اپنے بارے میں کہنے کا موقع دیا گیا۔ سید خادم حسین ضلعی صدر بھی اچھے خاصے مقرر تھے لیکن اساتذہ نے بیک آواز ان کے مائیک پر آتے ہی ''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ'' کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ خادم حسین نے کہا ''بھائیو! میں اپنے بیٹھنے کا اعلان کرنے ہی کھڑا ہوا ہوں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں آپ اساتذہ کے مطالبے پر اپنے برادری بھائی چودھری ثناء اللہ کے حق میں بیٹھ رہا ہوں۔ السلام علیکم۔''

ہجوم نے شکریہ، شکریہ کہا اور تالیاں بجائیں۔

محمود الحسن قریشی کا استقبال بھی ''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ'' کے نعروں سے ہوا تو انھوں نے کہا ''اساتذہ کرام! میں خود کھڑا ہوا تھا نہ خود بیٹھوں گا۔ میں تم لوگوں پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دس سال پہلے قیام پاکستان کے وقت جتنے مسلمان شہید ہوئے، جتنی عصمتیں برباد ہوئیں، جتنا اجاڑ اکھاڑ مچا اس کی اصل وجہ ہمارا ''مسلمان'' ہونا تھا۔ غریب مسلمان، امیر مسلمان، اچھا

مسلمان، برا مسلمان، چودھری مسلمان، کمین مسلمان، کلرک مسلمان، منشی مسلمان، تندرست مسلمان، بیمار مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے کیسوں اور بودی والوں نے ہم پر ظلم ڈھائے...... اب پاکستان میں یا پنجاب میں اگر بلدیاتی ادارے ہم مدرسین کے ساتھ جو سوتیلی ماں کا سلوک کر رہے ہیں تو وہ انگریزی، فارسی، عربی اور ڈرائنگ ماسٹری کی تخصیص سے نہیں کر رہے ان کا یہ برا سلوک پوری اساتذہ برادری سے ہے اور بھائیو! ہم سب ایک ہی شے ہیں۔ استاد ہیں......"

قریشی صاحب نے آدھ گھنٹے تک ایسی مدلل تقریر کی کہ مجمعے پر افسوں طاری ہو گیا۔ وہ بیٹھ گئے تو چودھری ثنا اللہ کو مائیک پر بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ بھائیوں نے قریشی صاحب کی باتیں سنیں۔ کیا انھوں نے کچھ غلط کہا ہے؟ سب نے کہا کہ نہیں، اب چودھری ثنا اللہ نے جو الفاظ کہے ان سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس نے کہا "تو میرے پیارے اساتذہ بھائیو! کیوں متفقہ طور پر ہم قریشی صاحب کو ضلعی صدر تسلیم نہیں کر لیتے۔ میں ان کا نام نامی ضلعے بھر کے جملہ اساتذہ کی راہنمائی کے لیے تجویز کرتا ہوں......"

ہجوم بپھر گیا۔ کوئی ثنا اللہ کو داد دے رہا، کوئی بیداد کا اظہار کرتے ہوئے گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی ہاں اور کوئی ناں کہہ رہا ہی۔ کچھ اساتذہ ٹولیوں میں نعرے لگاتے باہر نکل رہے ہیں۔ کچھ باہر سے اندر آ رہے ہیں۔ امیدواران اور مرکزی قائدین مبہوت بیٹھے ہیں۔ شاید سوچ رہے ہیں کہ معماران قوم کس کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ دو چار منچلے اساتذہ ایسے بھی تھے جو اسٹیج پر چڑھ گئے اور انھوں نے مائیک پر الیکشن کے ملتوی ہونے کا اعلان کر دیا۔ سنجیدہ اور مسکین طبیعت، اساتذہ اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے۔

میرے مزاج کی پہنائیوں میں بھی ایک عفریت رہتا ہے ایسے مواقع پر وہ کبھی کبھی بے قابو ہو جاتا ہے۔ غصے سے میرا وجود کانپنے لگتا ہے اور الفاظ بچھوؤں کے ڈنک بن بن کر میرے ہونٹوں سے گرنے لگتے ہیں۔ اس جلسے میں مخصوص اساتذہ کی بھوں بھوں اور میں میں سن کر میں اپنے اندر کے عفریت پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے ان دو عظیم انسانوں کو دیکھا جو "ہونقوں" کی بہتری کے لیے اپنی انا کی قربانی دینے پر تیار تھے اور یہ چھوٹے ذہنوں کے مدرسین، سیاسی کنکھجورے بنے، طبقات میں الجھے، پڑھے لکھے جاہل اودھم مچائے ہوئے تھے۔ میں نے جرات کی اور اسٹیج پر چڑھ گیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ان اساتذہ کے ہجوم میں میرے مہربان

استاد بھی ہیں اور میں ''جمعہ جمعہ آٹھ دن'' قبل اس برادری میں شامل ہوا ہوں۔ میرے پاس دلدار علی جیسا گلا بھی نہ تھا کہ علامہ کے کلام کا سحر پھونکتا...... تاہم غصے کی لہر مجھے کچھ کہنے یا پٹ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا' کس طرح کہا' کیونکر کہا' لیکن میں نے یہ ضرور کہا تھا ''اے قوم کے معمارو! اے نانہجارو! اے قسمت کے مارو...... یہ تم کس اخلاق کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ ارے تم معلم ہو' اور جانتے ہو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو معلم کہا ہے۔ یہ ہڑبونگ مچا کر تم حضور کی کس سنت پر عمل کر رہے ہو۔ تم میں جو سنجیدہ ہیں' تمہاری نسبت زیادہ علم رکھتے ہیں' تمہیں پھٹی نگاہوں سے تک رہے ہیں کہ تم انسان ہو یا جانور۔ اور یہ قائدین جو مرکز سے تشریف لائے ہیں تمہارے کردار و عمل کی یہ تصویر جہاں جائیں گے ساتھ لے جائیں...... ایسا نظارہ تو تیل گھر والیوں نے اپنے جلوس میں بھی پیش نہیں کیا تھا...... یہ دیکھو! تمہاری حالت دیکھ کر بابا جناح کی تصویر رو پڑی ہے...... میں نے ہال میں آویزاں قائداعظم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی جیسے رو ہی پڑا۔

میں نے دیکھا کہ مجمع میری زہریلی باتیں سن رہا ہے۔ ایک خاموشی طاری ہوگئی۔ جانے میں کیا کہہ رہا تھا کہ مجھے موثر پا کر کسی مرکزی عہدیدار نے سرگوشی کی کہ میں اپنی بات کو الیکشن کے انعقاد کی طرف لے جاؤں...... میں نے مجمعے سے کہا کہ ان کو یہی ملال ہے نا...... کہ ایک ایس وی مدرس نے ایم اے بی ٹی کو صدارت کے لیے کیوں نامزد کیا ہے۔ میں بھی ایم اے بی ٹی ہوں لیجئے میں قریشی صاحب سے پوچھے بغیر چودھری ثناءاللہ ایس وی کا نام ضلعی صدارت کے منصب کے لیے تجویز کرتا ہوں۔

قریشی صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر کہا ''میں تائید کرتا ہوں۔''

کسی اور نے کہا وہ تائید مزید کرتا ہے...... ہاتھ کھڑے ہوئے۔ سارے ہال نے ہاتھ اٹھا دیے۔

چودھری ثناءاللہ نے مجھ سے مائیک لیا اور کہا ''دوستو! ہم نے ایک لمبی ہڑتال کے لیے حکومت کو چیلنج دے رکھا ہے' اگر ہڑتال کی نوبت آ گئی تو میں ایسے نوجوانوں'' چودھری نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ ''اور قریشی صاحب جیسے مدبر بزرگ کے مشوروں کے بغیر کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں گا' لہٰذا میں قریشی صاحب سے

درخواست کروں گا کہ وہ اساتذہ برادری کی خاطر نائب صدارت کا عہدہ قبول کرلیں۔"

پھر تالیاں بجیں اور الیکشن کا مرحلہ بخیر و عافیت طے ہوا۔

☆☆

میں نے زندگی میں اپنے اس گاؤں کا ماحول دیکھا ہوا تھا جس میں، میں پیدا ہوا اور پھلا پھولا۔ پھر میں کٹھالہ گناں، باجڑہ گڑھی، جبال، کالا گھمناں، میتر انوالی، گھوئیں کے سے ہوتا ہوا اب کاں پور میں تھا۔ میرے اپنے گاؤں اور میتر انوالی کی معاشرت تو ایک جیسی تھی لیکن باقی گاؤں ایک ہی ضلعے اور بعض ایک ہی تحصیل میں ہونے کے باوجود کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ کاں پور بھی اپنی نوعیت کا گاؤں تھا۔ یہاں سے مقبوضہ کشمیر کی سرحد قریب تھی۔ دریائے جموں توی، دریائے چناب کے معاون کی حیثیت سے اس کے بائیں بازو پر بہتا تھا۔ درمیانی علاقہ بجوات کہلاتا ہے۔ کائی اور سرکنڈے کے جنگلات کو صاف کر کے دو آبے کی کچھ زمین کاشت کی جاتی۔ اگر آسمان اور دریاؤں کی روانی موافق رہے تو کاشتکار کو کچھ مل جاتا ورنہ اس کا ڈالا ہوا بیج بھی ضائع ہو جاتا۔

کاں پور میں غربت اور جہالت میرے دیکھے ہوئے باقی دیہات سے زیادہ تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی حالت دیکھتا تو کڑھتا۔ ننگے پاؤں اور سردیوں میں سوت کی چادریں اوڑھے سکول آنے والے معصوموں کو دیکھ کر میں ان کے والدین کی مجبوریوں کا اندازہ کرتا۔ پیر فضل حسین کے دم درود اور کھٹی مٹھی گولیوں سے علاج کرانے والے لوگوں کے بارے میں سوچتا، وطن کے لوگ کس قدر مجبور تھے۔ پھر پریشان ہو کر سر کو جھٹکتا اور کتاب کھول لیتا کہ کہیں اور پہنچ جاؤں اور اپنی سوچوں کا رخ بدل لوں۔

فروری ۱۹۵۸ء میں ضلعی غیر نصابی سرگرمیوں اور سالانہ کھیلوں کے مقابلہ جات کے بعد تقسیم انعامات کا ایک کامیاب جلسہ جناح پارک میں ہوا۔ میں بھی اس جلسے کی تقریبات میں بطور ہیڈ ماسٹر مڈل سکول مدعو تھا۔ میں نے اس مرتبہ خاصی دلچسپی سے تقریب کا جائزہ لیا تو مجھے کھیلوں، تقریروں، ڈراموں، جسمانی کرتبوں اور نمائشی اسٹالوں کی ایک ایک شے پسند آئی۔ میرے جی میں آیا کہ میں بچوں، اساتذہ اور دوسرے منتظمین کو خراج تحسین پیش کروں۔ میں نے خاصے ادیبانہ انداز میں تقریب کے انعقاد کی روداد لکھی اور اسے سررشتہ تعلیم ضلع سیالکوٹ کے ہفتہ وار "راہنمائے ترقی" میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ اگلے ہی شمارے میں وہ روداد چھپ

گئی۔ ظہور الحق فاروقی ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر اقبال قریشی کے ذریعے مجھے دفتر بلا بھیجا۔ میں حیران تھا کہ آخر انھوں نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟

وہ حسب عادت پھرتی سے اپنی نشست سے اٹھے۔ دو قدم بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ پہلے معانقہ کیا اور پھر مصافحہ اور یک طرفہ ہی بولنے میں مصروف ہو گئے۔ ''میں تمہارا بڑا مشکور ہوں...... اگرچہ تم نے میرا نام نہیں لکھا' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ خراج تحسین تم نے مجھے ہی پیش کیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا ہے کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کی کارکردگی مضمون نگار نے ان کے کھاتے میں ڈال دی ہے...... سمجھے والے سمجھ جاتے ہیں...... اس دفتر کے دروازے تمہاری لیے ہر وقت اور ہر کام کے لیے کھلے ہیں...... تم نے کس قدر اچھا لکھا ہے۔ میرے اے ڈی آئیوں اور دفتر میں کوئی ایسا نہیں لکھ سکتا۔ میں تمہارا پیش کردہ ''ٹریبیوٹ'' ہمیشہ یاد رکھوں گا...... اور ہاں میں اگلے ماہ تمہارے اسکول کا خود سالانہ معاینہ کروں گا...... اپنی سہولت کی تاریخ اے ڈی آئی برائے تربیت جسمانی کو بتا دو...... وہی میرا دورے کا پروگرام بناتا ہے۔''

اور بھی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے محمد خاں کلیم کے بتانے پر کہ انھیں گزشتہ دنوں بڑا دکھ پہنچا ہے۔ ننھے خاوے باوے کے لیے فاتحہ خوانی کی اور رسمی ہمدردی کے جملے بھی کہے۔

☆☆

لیجیے، ضلعی ناظم تعلیم مڈل سکول' کاں پور پلوڑہ میں تشریف لائے ہیں۔ ان کی پیشگی اطلاع کی بنیاد پر سالانہ امتحانات مؤخر کر کے سکول کی ممکنہ تزئین و زیبائش کی گئی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حلقے کے اے ڈی آئی سے بڑا کوئی افسر اس سکول آ رہا ہے۔ ان کی آمد سے قبل اساتذہ کے کہنے پر ایک ایکڑ زمین جو ایک زمیندار کے ناجائز قبضے میں تھی حیدر علی کے توسط سے واگزار کرائی گئی اور یہ میرا بہت بڑا ''کارنامہ'' تھا۔ اساتذہ بڑے حیرت زدہ تھے۔ وہ تو مجھے ''ایویں ای'' خیال کرتے تھے۔ میں نے ان کو یہ بھی بتایا تھا کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے مجھے کیوں دفتر بلایا تھا اور لکھنے لکھانے کے فن میں میرا کتنا نام ہے۔ اب وہ اجتماعی طور پر بھی اور فرداً فرداً بھی ملتجی ہو رہے ہیں کہ ان کی عزت میرے ہاتھ میں ہے۔ میں ان کی اسناد پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر سے اچھے ریمارکس لکھواؤں۔ مجھے بھی ان سے شکوہ نہیں رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے کچھ تو سکول ہی میں رہ کر معاینے کی تیاری کر رہے تھے اور کچھ علی الصباح آتے اور رات گئے واپس جاتے۔ سکول کو ملنے والی اراضی میں واقع ایک متروکہ کنویں کی اینٹیں اکھڑوا کر

بیرونی صحن میں ایک کمرہ بھی کھڑا کر دیا تھا جو اگرچہ مکمل نہیں ہوا تھا، لیکن اساتذہ کی کارکردگی کا مظہر تو تھا ہی۔

تعلیمی حالت اچھی نہیں تھی، لیکن تحریری کام کی کاپیاں چند ہی دنوں میں تیار کر لی گئیں۔ بچوں کو ملیشیا کی وردی میں بھی ملبوس کر دیا گیا۔ ملک صاحب نے اسکاؤٹس کا بھی ایک ٹروپ تیار کر لیا۔ جسے خصوصی طور پر تربیت دی گئی کہ انھوں نے صاحب سے مصافحہ بائیں ہاتھ سے کرنا ہے۔ سلیوٹ کیسے کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

فاروقی صاحب چونکہ ہیڈ ماسٹر یا اساتذہ پر بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں تھے۔ چائے کی پیالی تو پی لیتے تھے اور جب کوئی ان سے ملنے جائے اسے چائے کی پیالی پلا کر ''عرض معاوضہ گلہ ندارد'' پر عمل کرتے تھے۔ کھانا وہ کسی مدرس سے اور نہ ہی ہیڈ ماسٹر سے کھاتے تھے لیکن اے ڈی آئی صاحب کی بریفنگ سے ہم اساتذہ جانتے تھے کہ ہمیں اپنے افسر کو کھانا کس طرح کھلانا ہے۔ ہم گاؤں سے کوئی ریٹائرڈ ملازم، کھاتا پیتا زمیندار یا کوئی اور معزز فرد تلاش کرتے وہ گاؤں کا سرکردہ فرد بن کر صاحب سے ملنے آتا اور اپنے ہاں صاحب کو کھانا کھانے معزز مہمان کی حیثیت سے آمادہ کر لیتا۔ بعض ایسے لوگ بھی دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں جو واقعی افسران کی مہمان داری کرتے ہیں لیکن بسا اوقات مدرسین ہی اس قدر راشن وغیرہ ان کے ہاں پہنچا دیتے کہ مدرسین کا اور کھانا پکانے والے گھر کا اپنا بھی جشن ہو جاتا۔ کاں پور میں ایک سابقہ فوجی کے گھر کھانا پکوایا گیا تھا۔ فوجی کی بیگم کی مدد پیر فضل حسین کی بیوی المشہور اوٹھیاں والی نے کی۔

فاروقی صاحب نے جملہ جماعتوں کا چکر لگایا۔ ہر جماعت میں دو چار سوالات طلبہ سے پوچھے۔ تحریری کام کی کاپیوں کے مضمون وار لگے ڈھیروں کو دیکھا۔ ایک آدھ کاپی اٹھا کر اس کے اوراق پلٹے۔ بہر کیف جو خراج تحسین میں نے انھیں ''راہنمائے ترقی'' کے ذریعے پیش کیا تھا اس کا احسان انھوں نے اچھی لاگ بک لکھ کر اتار دیا۔ پھر انھوں نے اساتذہ اور طلبہ سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں بھی انھوں نے میری تعریف کی۔ خطاب کے بعد جب وہ میرے اے ڈی آئی علاقہ اور کھانے کی دعوت دینے والے صوبیدار کے ساتھ کھانے کی خاطر اس کے گھر جانے کے لیے گیٹ پر پہنچے تو وہاں تماشائیوں کے طور پر کھڑے چند افراد میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ''صاحب جی...... سلام'' کہہ کر فاروقی صاحب سے ہاتھ ملایا اور کہا:

''صاحب جی...... آپ نے اس شہدے کی تعریف تو کی جو گلے میں لیر (چیتھڑا)

باندھے پھرتا ہے۔'' اس نے مجھے شہدا اور میری ٹائی کو لیر کہا تھا۔ ''پر صاحب جی! آپ نے سرکار می سانڈوں کی تعریف نہیں کی جو گاؤں میں قتل عام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ انعامات کے مستحق تو وہ تھے لیکن آپ نے سارے انعامات بچوں کو دے ڈالے ہیں۔ انصاف نہیں فرمایا آپ نے''۔

فاروقی صاحب دیہاتی کی بات کو نہیں سمجھے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا کہ میں واضح کروں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، لیکن مجھے خود اس کی بات کا سر پیر نہیں ملا تھا۔ باقی لوگ بھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ جب فاروقی صاحب نے مجھے پوچھا کہ یہ دیہاتی باوا کیا کہتا ہے تو میرے جواب سے پہلے ہی دوسرا دیہاتی پھر بول اٹھا ''اس کو کیا پتہ جی...... ادھر کیا ہووے، یہ شہر سے صبح آوے ہے اور دوپہر کو واپس بھاگ جاوے ہے۔ ملک سے پوچھو، شاہ سے پوچھو، پیر سے پوچھو یہ ادھر کیا کچھ کرت ہیں۔ یہ لوگوں کے گھروں میں گھسیں ہیں۔ بہو بیٹیوں کو تاکے ہیں اور تیل گھر سے اُٹھ آنے والی گشتیوں کے ساتھ موجیں مناویں ہیں...... ماسٹر نہیں سانڈ ہیں۔ اوپر سے ہمیں آنکھیں دکھاویں ہیں۔''

موضوع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فاروقی صاحب نے دیہاتیوں کے دو نمائندوں، مجھے، اے ڈی آئی علاقہ اور صوبیدار کو ساتھ لیا اور واپس دفتر میں آ بیٹھے کہ بات کی تہ تک پہنچیں۔ انھوں نے دیہاتیوں سے پوچھا ''آپ کو اگر مدرسین سے کوئی شکایت تھی تو کیا کبھی پہلے آپ نے کوئی عرضی پرچہ بھیجا؟ اب بھی جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سب کچھ لکھ کر دیں۔ ایک مچھلی جل کو گندا کرتی ہے۔ جو ماسٹر اخلاق سے گری ہوئی حرکات کرتا ہے اس کا نام لکھیں۔ ہم تحقیق کریں گے اس کو سزا دیں گے کہ سکول کا اور اساتذہ کا نام بدنام نہ ہو۔''

دیہاتی عرضی پرچہ لکھنے چلے گئے اور ہم کھانا کھانے۔

وہ دیہاتی لوٹ کر نہ آئے۔ صوبیدار نے بتایا کہ یہ اس زمیندار کے لڑکے اور بھتیجے تھے جس سے سکول کی پوری ایک ایکڑ زمین واپس لی گئی تھی اور ان کی الزام تراشی زیادہ تر ماسٹر ملک کے بارے میں تھی وہ سمجھتے تھے کہ اسی نے اپنے اثر و رسوخ سے زمین سکول کو دلوائی تھی۔

☆☆

فاروقی صاحب نے میری مرضی سے جملہ مدرسین کو اچھے ''ریمارکس'' دے کر مجھے اپنا معترف کر لیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا اور ہوا۔ پیر فضل حسین نے درخواست دی کہ اس کا تبادلہ

اوٹھیاں کر دیا جائے۔ فاروقی صاحب ''اوٹھیاں'' کا پس منظر نہیں جانتے تھے لیکن میں اور اے ڈی آئی صاحب چونک کر رہ گئے۔ پیر صاحب کی بیوی کے بھائیوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ فاروقی صاحب نے پیر صاحب کی درخواست رکھ لی۔ میری بھی دلی خواہش تھی کہ پیر صاحب کاں پور سے چلے ہی جائیں تو اچھا ہے کیونکہ میں ان کی آنکھوں سے خوف کھاتا تھا اور وہ ایک طرح سے مجھے اپنے اوپر حاوی نظر آتے تھے۔ بعض مدرسین نے سرگوشیوں کے انداز میں مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ پیٹھ پیچھے میرے متعلق اچھی بات نہیں کرتے گو میرے روبرو انھوں نے کبھی کوئی غلط بات یا اختلافی حرکت نہیں کی تھی۔

میرے مشاہدے میں آیا کہ اساتذہ کرام اے ڈی آئی اور ڈی آئی کی خوشامد کر کے اپنے کام نکلوا لیتے ہیں اور افسران خوشامد کو پسند کرتے ہیں۔ کاں پور کے اساتذہ نے اس ''خوبی'' کا کچھ حصہ مجھے بھی عطا کیا۔ میں خود بھی ان کی چاپلوسی کی باتیں پسند کرنے لگا تھا اور خود بھی اس سے کام لینے میں پختہ ہوتا جا رہا تھا۔

بہر کیف سکول سے روانہ ہونے سے پیشتر فاروقی صاحب نے مجھے کہا کہ دیہاتی میرے خلاف تو نہیں تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس لیے کہ میں یہاں رہتا نہیں۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ وہ اس صورت حال سے حیران نہیں ہوئے۔ ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے لوگ دوسروں کو پریشان کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ کئی سال مختلف علاقوں میں اے ڈی آئی رہے ہیں۔ ان کا ذاتی تجربہ ہے کہ جب سے معلّمی کے افضل پیشے کو حصولِ روزگار کے طور پر اپنایا جانا شروع ہوا، تو کئی ''للو پنجو'' اس پیشے کی تقدیس کو مجروح کرنے کے لیے اس میں گھس آئے ہیں۔ فاروقی صاحب نے مزید کہا: وہ روایتی مدرس نہیں بن سکے بلکہ انھوں نے تو درس وتدریس کی روایات کو تہس نہس کر دیا ہے۔

فاروقی صاحب نے مدرسین سے یہ بھی کہا:

''میں ذاتی طور پر ایسے بے شمار مدرسین کو جانتا ہوں جو سمگلر ہیں، چور ہیں، غنڈے ہیں اور اگر خود قاتل نہیں تو قاتلوں کے ساتھی ہیں۔ وہ اپنے سکول میں داد و دہش سے اپنے سر معلم کو راضی رکھتے ہیں اور اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان سے ان کے فرائض منصبی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھے گا۔ اگر سر معلم ان کے ڈھب پر نہیں آتا تو وہ جھوٹی درخواستوں اور عدم تعاون سے اس کو پریشان کر دیتے ہیں۔ وہ یا تو خاموش ہو جاتا ہے یا پھر اپنا تبادلہ کرا کر بھاگ

جاتا ہے۔ رہا محکمہ تو محکمہ تعلیم کو اسی لئے ''مرلی محکمہ'' کہا جاتا ہے کہ وہ کام کرنے والے اساتذہ اور سر معلم کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس سکول کے اساتذہ کے بارے میں اے ڈی آئی صاحب نے جو بریفنگ دی ہے وہ کوئی اچھی نہیں ہے ہم لوگوں کو یہاں بتیس دانتوں میں رہنے والی زبان کی طرح رہنا ہو گا...... میں نے دیہاتیوں کے ہنگامے کے باوجود تمہاری مرضی کے مطابق ریمارکس دے کر تمہاری مدد کی ہے...... اللہ حافظ۔''

وہ تشریف لے گئے۔ صوبیدار کے ہاں سے بقیہ کھانا منگوا کر اساتذہ نے بھی کھایا۔ دورے پر کیا خرچ آیا۔ اس کا حساب کیا گیا۔ مساوی حصے کے علاوہ مجھے ایک اضافی حصہ بھی اس لیے دینا پڑا کہ سالم تانگے کا کرایہ خرچے میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

☆☆

مارچ کا تیسرا ہفتہ جا رہا تھا کہ مجھے ملتان سے گردیزی صاحب کا خط آیا۔ باقی باتوں کے علاوہ انھوں نے لکھا تھا کہ میرے تقرر کے احکامات گورنمنٹ ہائی سکول' الہ آباد' ضلع رحیم یار خاں کے لیے جاری ہو چکے ہیں۔ مجھ تک پہنچ چکے ہوں گے۔ میں فوراً حاضر ہونے کا اہتمام کروں۔ میں بڑا خوش ہوا۔ پیر صاحب کو سکول کا انچارج بنا کر ہدایت کی کہ وہ ۳۱ / مارچ کو طلبہ کو نتیجہ سنائیں گے جبکہ میں ہفتے بھر کی رخصت پر آج ہی لاہور جا رہا ہوں۔

اگلے دن میں بیوی اور بچے کے ہمراہ لاہور پہنچا۔ بیوی اور بچے کو بھائی کے ہاں چھوڑا اور خود میں اس سے اگلے دن کراچی ایکسپریس کے ذریعے لاہور سے شام پانچ بجے الہ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ الہ آباد ضلع رحیم یار خان کی تحصیل خانپور سے پہلے ایک بڑا قصبہ ہے۔ اگلے دن علی الصباح گاڑی وہاں پہنچی۔ اسٹیشن سے تانگے پر بیٹھ کر سکول پہنچا۔ دیوان مرید حسین ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھوں نے مجھے سفر کی تھکن کی وجہ سے پورا دن آرام کرنے کو کہا۔ تاہم میں نے اپنی اسناد سکول کی مشین پر ٹائپ کیں۔ حاضری رپورٹ کے ساتھ ان کو منسلک کرنا ضروری تھا۔ چند دوسرے ''پردیسی'' اساتذہ نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مجھے بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔ بہاولپور ریاست کے باشندے دوسری ڈویژنوں سے آنے والوں کو پردیسی کہتے تھے۔

دوپہر گزری تو میرے اندر ایک ہلچل سی برپا ہو گئی۔ ''یا اللہ' میں کہاں آ گیا ہوں' سرائیکی بولی والے لوگ' جگہ جگہ بکتی پنڈ (کھجور)' ریگزار اور چند کھجوروں کے پیڑ' اڑتے

بگولے...... وہاں شمال میں چمکتی دھوپ میں برف پوش ہمالیہ کی نظر آنے والی چوٹیاں تھیں نہ آنکھوں کوتازگی بخشنے والی ہریاول...... سکول کے سوا باقی گھریلو عمارات ایسی لگتی تھیں جیسے دھول سے اٹی ہوں...... بچے بھی ایسے نہ تھے جیسے میرا بابی تھا...... اور یوں منفی سوچ کے ساتھ ساتھ سب کچھ بگڑتا چلا گیا۔ میں نے خاموشی سے بستر اٹھایا' سڑک پر آیا اور تانگے پر بیٹھ کر اسٹیشن پہنچا۔ شام کے پانچ بجے تو کراچی ایکسپریس ڈاؤن کی جڑواں بہن کراچی ایکسپریس اپ اسٹیشن پر آ رکی۔ اگلی صبح جس وقت میں اللہ آباد اسٹیشن پر اترا تھا تقریباً اسی وقت لاہور اسٹیشن پر آ اترا۔ بھائی کے گھر پہنچا اور اسی دن بیوی بچے کو لے کر اس سوچ کے ساتھ میں اپنے گاؤں پہنچا کہ اپنے ہم جماعتوں سے سرکاری ملازمت سے بھاگ کر میں پانچ سال پہلے ان سے جونیئر ہوا تھا اور اب دوبارہ بھاگ کر میں ان سے مزید جونیئر ہو گیا...... میں کیا ہوں؟ میں اندر سے اس قدر مضطرب کیوں ہوں۔ کیا میں واقعی ''ایو پی ای'' تو نہیں ہوں۔

چار دن دوسری بار سرکاری ملازمت سے بھاگنے کا ملال رہا اور پھر میں کال پور جا پہنچا۔

☆☆

تعلیم' مرتبے اور سوچ کے اختلاف کے باوجود میں بود و باش اور درس و تدریس میں سب کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک آدھ مدرس کے ساتھ میں کبھی کسی سرحدی محافظوں کی چوکی پر چلا جاتا' کبھی ایسے ہی کسی دوسرے گاؤں میں جا نکلتا' یونہی درختوں کے کسی ذخیرے میں پہنچ جاتا اور اپنے مشاہدات میں اضافہ کرتا رہتا۔ دو مرتبہ میں پیر فضل حسین کے علاوہ سب اساتذہ کے ساتھ توی اور چناب کے دوآبے میں پائے جانے والے جنگلوں میں سوز' گوند اور نیل گائے کے شکار کے لیے بھی گیا' گو کوئی شکار نہ ملا' لیکن سیر خوب ہوئی۔

ایک روز میں اپنا معمول کا راستہ چھوڑ کر ماسٹر غلام محمد کی گھوڑی پر بیٹھ کر پورن بھگت کے کنوئیں پر بھی گیا۔ وہاں ان دنوں بھی اردگرد کی مسلمان عورتیں منتیں ماننے آتی تھیں۔ واپسی پر میں نے غلام محمد کی دیسی ساخت کی بندوق سے ایک برگد کے پیڑ سے دو ہریل مار گرائے۔ ان میں سے ایک کو معمولی طور پر چھرا لگا تھا۔ اسے بہت بھاگ دوڑ کے بعد غلام محمد نے قابو کیا۔ اسے ذبح کرنے کی خاطر میں نے ہریل کو اس کے مضبوط پروں اور گردن سے دبوچا' تو اچانک میری نظر اس کی سرخ اور چوڑی آنکھوں پر پڑی۔ ان آنکھوں میں ایسی التجا تھی جیسے مظلوم پرندہ کہہ رہا ہو کہ ظالم میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے...... میں تو خوراک بھی وہ نہیں کھاتا جو تم لوگ

کھاتے ہو۔ مجھے ذبح مت کرو...... میں نے اور غور اس کی آنکھوں میں جھانکا' تو اس کی التجا مزید واضح ہوتی چلی گئی اور میرے دل کی کیفیت بدلتی چلی گئی۔ مجھے اپنا ''خاوے باوے'' یاد آ گیا۔ مین نے چاقو غلام محمد کی طرف پھینک دیا اور دائیں ہاتھ سے ہریل کے پر سنوارے۔ پھر اسے برگد کے پیڑ کے ایک تنے پر بٹھایا وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا اور اوپر کے گھنے پتوں میں چلا گیا...... میں آج تک اس کی آنکھیں نہیں بھولا اور تب سے میں نے گھریلو مرغ تک کو ذبح نہیں کیا...... مجھے یاد ہے کئی ماہ تک میں نے گوشت کھانا بھی چھوڑے رکھا۔

☆☆

تعطیلات موسم گرما کے بعد پنجاب ٹیچرز یونین نے پورے پنجاب کے بلدیاتی مدارس مین ہڑتال کرادی۔ میں نے چند اور دوستوں کے ساتھ قریشی محمود الحسن نائب صدر کی معاونت کی۔ کوٹلی بہرام (سیالکوٹ کا ملحقہ گاؤں) میں ایک مدرس کے گھر میں ہم نے اطلاعاتی مرکز قائم کیا۔ ایک سکول سے سائیکلوسٹائل کی مشین منگوائی۔ ہاتھ سے سٹینسل کے کاغذ پر ہم پنجاب بھر کے سکولوں کی ہڑتال کی خبروں کا خلاصہ' پنجاب ٹیچرز یونین کے قائدین کے بیانات اور ہڑتال کی صورت حال پر روزانہ ایک خبر نامہ شائع کرتے۔ ہڑتال کے دنوں میں ملک میں سیاسی ابتری کا دور بھی عروج پر تھا۔ حکومت کے خلاف جلسے جلوس عام ہو رہے تھے۔ سردار عبدالقیوم خان کی سرکردگی میں مسلم لیگ نے گجرات کے قریب قومی شاہراہ پر دس میل لمبا جلوس نکالا تھا۔ قوم کا ہر طبقہ ہڑتال کے ذریعے مطالبات پیش کر رہا تھا۔ گداگروں کا مطالبہ تھا کہ انھیں حقارت کی بجائے عزت سے خیرات دی جائے جو کسی صورت میں دس پیسے سے کم نہ ہو۔ اخباری نمایندے ہمارے مرکز پر آتے اور ہم انھیں گھڑی گھڑائی خبروں کا پرچہ تھما دیتے۔ اگلے روز وہ قومی اخباروں میں ان کے نامہ نگاروں اور نمایندوں کے حوالے سے شائع ہوتیں تو دوسرے اضلاع کے مراکز کو بھی پتہ چل جاتا کہ سیالکوٹ میں پنجاب ٹیچرز یونین کس قدر منظم انداز میں کام کر رہی ہے۔

ہڑتال کا ہنگامہ جاری تھا کہ ملک میں جنرل ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا۔ سب کچھ' حتیٰ کہ سیاستدانوں کے ذہن بھی' سن ہو کر رہ گئے۔ ہم نے مارشل لاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے اور مستقبل سے اچھی توقعات وابستہ کرتے ہوئے خبر نامے کا آخری شمارہ شائع کیا۔ مرکز کو بند کیا اور اگلے روز حسب الحکم مارشل لاء اپنے سکولوں میں واپس پہنچ گئے۔

☆☆

یہ مارشل لاء کی 'برکات' تھیں کہ کئی ممنوعہ اجناس اور اشیا دستیاب ہونے لگی تھیں۔ میرا کنبہ جو سرخ امریکن گندم کھاتا اور چورا چائے پیتا تھا خیر سے دیسی گندم کھانے اور یلیو لیبل چائے پینے لگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں خورونوش کا یہ اتفاقیہ حاصل ہونے والا معیار برقرار رکھنے کی توفیق بخشی، لیکن خود یلیو لیبل کا وہ ''فلیور'' نہیں رہا جو مارشل لاء کے دنوں میں تھا۔

ابھی مارشل لاء کی تازگی باقی تھی کہ مجھے بابو رحمت اللہ نے بلا بھیجا اور بتایا کہ قصباتی مڈل سکول ساہووالہ خالی ہو رہا ہے۔ کیا میں وہاں جانا پسند کروں گا؟ ساہووالہ میرا ننھیالی گاؤں تھا۔ بچپن کا آدھے سے زیادہ قیمتی دور ہم نے وہاں ہی گزارا تھا۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی اور یہ بھی کہا کہ اس سے بہتر کوئی اور سکول ہو ہی نہیں سکتا۔ بابو رحمت اللہ نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا کہ جب تک وہ احکامات تیار کرتا ہے تب تک میں حیدر علی سے مل آؤں یا پھر فاروقی صاحب کے پاس بیٹھوں وہ مجھے یاد کر رہے تھے۔

میں فاروقی صاحب سے ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میرے لیے ایک اچھے، آباد اور قصباتی سکول کا انتخاب کیا ہے۔ ''دیکھو! انکار نہیں کرنا، تم وہاں کے لیے موزوں ہو۔'' میں نے کہا ''جناب! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اچھا سکول خالی ہونے پر آپ کو میرا ہی خیال آیا۔ آپ جیسے عالی ظرف لوگ ہی ایسی قدر شناسی اور بندہ پروری کی سوچ رکھتے ہیں۔''

میرے احکامات کے ساتھ ہی پیر فضل حسین کے احکامات تبادلہ بھی جاری ہوئے اور مجھے ہدایت کی گئی کہ میں پیر کو فارغ کرنے کے بعد خود فارغ ہوں گا۔

اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ میرے حقیقی چچا کو جو ان دنوں مرالہ مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے ان کی خواہش کے مطابق میری جگہ کال پور میں ہیڈ ماسٹر تعینات کیا گیا۔ ان کے احکامات تین روز بعد جاری ہوئے۔ مرالے میں وہ بھرپور وقت گزار رہے تھے۔ ان کے اس انتخاب پر میں حیرت زدہ تھا۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ محکمہ انہار نے ان سے وہ کوارٹر خالی کرا لیا تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھے۔ مرالہ میں اور کوئی مکان ملتا نہیں۔ بچوں کو انھوں نے گاؤں چھوڑا ہے اور سر دست کال پور کا مڈل سکول ہی خالی ملا، لہٰذا انھوں نے وہی قبول کر لیا۔

◆◆◆◆◆

(۲۰)

ننھیالی گاؤں سے بہاولپور

میں یکم نومبر ۱۹۵۸ء کو مڈل سکول ساہووالہ میں تھا۔

میرے حقیقی ماموں کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ نے عقد ثانی کر لیا تھا۔ ان کے بچے میری والدہ کے پاس تھے۔ ان کا مکان اور ان کے چچازاد بھائی (ماموں حکیم محمد اسماعیل) کا مکان ایک ہی رقبے میں واقع تھے اور لطف کی بات یہ تھی کہ ان دو مکانات کے گرد چاروں طرف گلی تھی۔ حقیقی ماموں کا حصہ اس مکان میں ایک تہائی تھا جبکہ ماموں حکیم صاحب کا حصہ دو تہائی۔ خالی ہونے کی وجہ سے ایک تہائی کا مکان بھی دوسرے ماموں کی تحویل میں تھا لیکن میرے ساہووالہ میں بطور ہیڈ ماسٹر آنے سے ان کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ انھوں نے ایک تہائی حصہ مکان صاف ستھرا کر کے مجھے رہنے کے لیے دے دیا۔

اس اثناء میں اللہ نے مجھے تیسرا بیٹا عطا کیا تھا۔ رب العالمین نے ماں کے غم اور باپ کی محرومی پر مرہم رکھنے کے علاوہ بوڑھی دادی کو لوریاں سنانے کا موقعہ مہیا کر دیا تھا۔ ماں بھی میرے اپنے ماں باپ کے گاؤں میں تبدیلی پر خوش تھی۔ محلے کی عورتیں ایک دوسرے کو میرے بارے میں بتاتی تھیں کہ میں بی بی رحمت بی بی کا بیٹا، بی بی فضل بی بی کا نواسہ اور فضل احمد کا بھانجا ہوں۔ اس تعارف سے مجھے بھی خوشی ہوتی تھی کہ میرے حوالے سے لوگ ان کو بھی یاد کر رہے تھے جو اب دنیا میں نہیں تھے۔

قصبے کا سکول ہونے کی وجہ سے سکول بہت عمدہ طریقے سے چل رہا تھا۔ سوائے کمرہ ہائے جماعت کے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہر کام خواہ درس تدریس کا تھا یا غیر نصابی سرگرمیوں کا بطرز احسن ایک مقررہ طریقے پر ہو رہا تھا۔ تدریسی کام کے حوالے سے میں صرف آٹھویں جماعت کو انگریزی پڑھاتا تا باقی وقت انتظامی امور کے لیے وقف تھا۔ سابقہ ہیڈ ماسٹر نے سکول

ہی کو بہترین طور پر ''سیٹ'' نہیں کر رکھا تھا بلکہ عملے کو بھی خوب ''سیٹ'' کیا ہوا تھا۔ عملہ تھا بھی تھوڑا سا ضرورت سے زیادہ لہٰذا اہتمام ضمنی کام بخوبی سرانجام پاتے تھے۔

گاؤں میں مقتدر شخصیتیں تین چار ہی تھیں، لیکن قصبہ ہونے کی وجہ سے تھوڑا سا خوشحال شخص بھی بڑھ بڑھ کر بولتا تھا۔ ذیلدار محمد شفیع باجوہ ہمارے محلّہ دار اور سرکاری درباری شخصیت تھے۔ ان کے دو بیٹے پی سی ایس تھے۔ وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے نوجوان اسپیکر محمد انور بھنڈر کے سسر بھی تھے۔ فضل احمد وڑائچ تھے انھوں نے بلدیاتی انتخابات میں کامیاب ہو کر اپنا مقام پیدا کیا تھا۔ ایک چودھری نذیر احمد المعروف پریذیڈنٹ تھے۔ ان کے بھتیجے وغیرہ اعلیٰ سول سروس میں تھے۔ تینوں اچھے خاصے زمیندار بھی تھے۔ لوگوں کے کام کمائی کی خاطر نہیں دعائیں لینے کی خاطر اور غریب پروری کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر کرتے تھے۔ اللہ ان کی قبروں کو روشن فرمائے۔ بھلے لوگ تھے۔ چھچھورے اور اخلاقی طور پر پستہ قامت ہرگز نہ تھے۔ یہ تینوں مقتدر افراد میرے ننھیال کے محلے کے باسی تھے اور پورے کنبے سمیت میرے ماموں حکیم محمد اسماعیل کے سوا کسی سے علاج نہیں کراتے تھے۔ حکیم صاحب ان کے خاندانی طبیب تھے اور بلا تکلف ان کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔

وہ شفیع سیٹھ جس سے میں نے قسطوں پر سائیکل لی تھی اسی سے میں نے ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو بھی اقساط پر حاصل کر لیا تھا۔ یہ ریڈیو بھی اس دور کے حوالے سے میری شہرت کا باعث بنا۔ پورے قصبے میں ایک دو ریڈیو ہی اور تھے۔ جن تین گھرانوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے ہاں بھی ریڈیو نہیں تھے۔ اس ریڈیو کے طفیل ماموں صاحب کی بیٹھک بڑی آباد رہنے لگی۔ رات کے دس بج جانا تو معمولی بات تھی۔

طلبہ کے والدین بھی اکثر اپنے بچوں کے بارے میں پوچھنے یا مسئلہ حل کرنے آتے جاتے رہتے۔ کچھ ساہووالہ اور بیگووالہ تاریخی حوالے سے راجہ سلوان کے قصے کے کرداروں سے منسوب تھے۔ دونوں قصبے بھی تھے۔ دونوں کو نالہ ایک سیراب کرتا تھا۔ دونوں کے ریلوے اسٹیشن تھے۔ دونوں قصبات سے یکساں فاصلے پر درمیانی سٹیشن اور تجارتی منڈی سمبڑیال تھا، لہٰذا مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں خواب کے سے دس سال گزار کر واپس اپنے ہی بچپن کے ماحول میں لوٹ آیا ہوں۔

بیوی بچے بھی ادھر ہی آ گئے تھے۔ ماں کا جب جی چاہتا ادھر آ جاتیں، جب جی چاہتا

گاؤں چلی جاتیں، لیکن وہ زیادہ تر گاؤں ہی میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ وہاں ماموں زاد بھائی بھی توزیرِتعلیم تھے۔ وقت بڑی خوش اسلوبی سے اور ہنستے کھیلتے گزر رہا تھا۔ میں ایم اے انگلش کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک وقت نے بتایا کہ وہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔

☆☆

میں اسے دھما کا نہیں ایک گھپلا ہی کہوں گا جو میرے ساتھ ہو گیا۔ اس کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں ہو گا یوں سمجھیے کہ ایک پڑھی لکھی ۲۲ سالہ خاتون نے اخلاق، انسانیت اور مذہب کے نام پر بہت سے تاریخی، اخلاقی حوالے دے کر اور رو رو کر مجھ سے ایک ناگوار قسم کی مدد مانگی، میں نے خود کو اخلاقی بلندیوں پر ثابت کرنے کے لیے اور اپنے قلم کار یا فنکار ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی حمایت میں بلند کر دیا، تو بہت سے لوگ میرا ہاتھ ہی کاٹنے پر تل گئے۔ میں وعدے کا مارا حقیقت سے پردہ اٹھانا گناہ سمجھتا رہا۔ مقصد مدد کے لیے پکارنے والی کو بچانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری جملہ اہلیتیں اور صلاحیتیں منفی انداز میں زیرِ بحث آنے لگیں۔ ماں، بیوی اور بھائی تک میرے ووٹ نہ رہے۔

قصبے کے تینوں مقتدر افراد اور خود ماموں حکیم نے مجھے کہہ دیا کہ میری وجہ سے ان کا فخر سے بلند سر نگوں ہو گیا ہے۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ صرف دو آدمی تھے جو حقیقت جانتے تھے میں صورت حال میں پوری پوری راہنمائی کے لیے ایک صاحب کے پاس گیا۔ ان دنوں ان کا تقرر بطور اسسٹنٹ انسپکٹر بہاولپور ڈویژن ہو چکا تھا اور وہ رخصت پر ڈسکہ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بیماری کی جگہ سے ہٹ جانے کو فرار نہیں کہا جاتا۔ انھوں نے مجھے مہر عبدالحمید رجسٹرار محکمانہ امتحانات، لاہور ریجن، لاہور کے نام ایک رقعہ دیا اور ساتھ ہی درخواست برائے تقرر ہمراہ لے جانے کے لیے کہا۔ میں نے ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔

اس دوران میں مزید یہ ہوا کہ سکول کے ایک سینئر ورنیکلر ٹیچر ریٹائر ہوئے تو میں نے ذاتی طور پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب سے مل کر اپنے ماموں زاد بھائی کو اس خالی ہونے والی آسامی پر ایک دُور کے سکول سے تبدیل کرا لیا۔ ملحقہ گاؤں کمال پور کے ایک مدرس دیر سے اس امید پر ایک دُور دراز کے سکول میں بیٹھے تھے کہ ساہووالہ میں آسامی خالی ہو تو وہ وہاں تبادلہ کرائیں۔ اسامی خالی ہونے پر میری دخل اندازی سے اس کو مایوسی ہوئی، تو اس نے اپنے حقیقی بھانجے جے وی مدرس جو میرے ہی ماتحت تھا سے مل کر میرے خلاف ایک لمبی چوڑی

درخواست مارشل لاء حکام کو دی۔ الزامات میں فنڈ کھانے، طلبہ سے پیسے بٹورنے، ناجائز داخلہ خارجہ فیس لینے، مری اسکاؤٹس کیمپ میں شمولیت کے لیے طلبہ سے راشن اکٹھا کرنے اور ٹورنامنٹ میں کھلاڑیوں کو ریفریشمنٹ نہ دینے مگر ریفریشمنٹ کا خرچہ ڈالنے اور سکول کی زیب وزینت کے لیے ڈسٹرکٹ بورڈ سے گرانٹ لینے کے باوجود طلبہ کے والدین سے عطیات جمع کرنے کے الزامات عائد کیے۔ میں لرز کر رہ گیا۔ مارشل لاء آخر اپنی ایک دہشت رکھتا تھا۔

لے دے کر میرے پاس حیدر علی ہی تھا، لیکن میں اس قدر گھٹیا الزامات میں ملوث ہونے کی بابت بتا کر اپنے ہی بارے میں اسے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں پولیس بھی فوجی مراکز کے ماتحت تھی تاہم میں نے سیالکوٹ کے تاجران کتب شاہ اینڈ سنز کے مزمل بھائی سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ مارشل لاء کے مرکز میں شکایات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور فوجی حکام تمام درخواستیں متعلقہ محکموں کو بھجوا رہے ہیں۔ رشوت کے کیس براہ راست انٹی کرپشن کے محکمے کو بھیجے جا رہے ہیں۔ اس نے تسلی دی کہ وہ میرے خلاف دی جانے والی درخواست کی ٹوہ لگائیں گے۔

تیسرے دن میں جب دوبارہ ان کے پاس گیا، تو انھوں نے بتایا کہ میرے خلاف واقعی درخواست موجود ہے، لیکن درخواست دہندہ نے اپنا نام نہیں لکھا بلکہ درخواست چند معززین کی طرف سے ہے اور مارشل لاء مرکز نے اسے برائے مناسب کارروائی اینٹی کرپشن کو بھیجا ہے اور وہ عباس نامی انسپکٹر کے پاس ہے جو ان کی خاصی جان پہچان والا ہے۔ کل وہ ان کی دکان پر آیا تھا اور وہ کہہ گیا ہے کہ چند دن میں رپورٹ دے گا۔ میں فکر نہ کروں۔ کہنے کو تو میں نے بہت اچھا کہہ دیا لیکن میرا تردد اور پریشانی کم نہ ہوئی۔ زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ اگر کسی بھی مجاز افسر نے تحقیق کی تو اس گھپلے کا ذکر بھی ضرور آئے گا جو میرے ساتھ ہوا تھا اور جس میں میری حیثیت راز افشا نہ کرنے کی وجہ سے ملزم کی ہو چکی تھی۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ میں اس سارے ہنگامے سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا میں سوچتا کاش کہ میں بوچھال کلاں سے نہ بھاگا ہوتا، کاش کہ میں الہٰ آباد ہی میں ٹک گیا ہوتا۔ کاش کہ میں ننھیال کے گاؤں نہ آیا ہوتا اور کاش کہ میں نے زندگی کے متعلق فنکارانہ رویے کے بجائے تجارتی یا تھالی کے بینگن کا سا رویہ اپنایا ہوتا۔

میں خودترسی کا مریض ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن میں ریلوے اسٹیشن کے بنچ پر اکیلا بیٹھا اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ سیالکوٹ جاؤں یا بیگو والہ...... دونوں گاڑیوں کا کراس سمبڑیال ہوتا تھا اور ابھی سمبڑیال کی سمت جانے

والی گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ ایک بوڑھا سا شخص لاتقنطو من الرحمتہ کا اللہ کا ورد کرتا ہوا میرے پہلو میں آ بیٹھا۔ جب تک وہ بیٹھا رہا یہی ورد کرتا رہا۔ میرے ساتھ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گاڑی آئی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے سیالکوٹ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہٰذا بنچ ہی پر بیٹھا رہا۔ لاشعوری طور پر میں بھی وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ مجھے ان الفاظ پر یقین کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر تم سچے ہو اور تم نے جو کچھ کیا ہے اس میں تمہاری نیت نیک تھی تو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس خاموش مکالمے سے مجھے یک گونہ تسلی سی ہوئی۔

سیالکوٹ میں مزمل شاہ صاحب میرے منتظر تھے انھوں نے کہا کہ اینٹی کرپشن انسپکٹر میرے خلاف آنے والی درخواست لے کر ضلعی دفتر تعلیم میں گیا تھا۔ وہاں سے اس نے جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھی کہ کسی ہیڈ ماسٹر یا ٹیچر کے خلاف اسی نوع کے الزامات ہی لگائے جاتے ہیں۔ الزامات میں اصل شق یہ تھی کہ کیا سکول کی تزئین و آرائش کے لیے ڈسٹرکٹ بورڈ نے سکول کے ہیڈ ماسٹر کو کوئی گرانٹ دی تو ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر نے کہا ہے کہ وہ کبھی کسی ہیڈ ماسٹر کو گرانٹ نہیں دیتے بلکہ اپنے انجینئرنگ کے شعبہ سے سارے کام کرواتے ہیں۔ اس پر مسٹر عباس نے مارشل لاء حکام کو رپورٹ بھیج دی ہے کہ درخواست گمنام تھی پھر بھی تحقیقات کی گئی۔ سب الزامات بے بنیاد ہیں۔ مزید برآں محکمہ تعلیم کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے ہیڈ ماسٹر کی کارکردگی کی تعریف کی ہے۔

فوراً ہی میرے رگ و پے میں اعتماد بھرا خون دوڑنے لگا۔

☆☆

ساہووالہ میں قیام کے دوران میں نے ''خاوے باوے'' نامی افسانے کے بارے میں آنے والے خطوط ایک دوست کی معرفت مکتبہ الادب گارڈن ٹاؤن' لاہور کو دکھائے تو مکتبہ والوں نے بلا معاوضہ میرے افسانوں کا مجموعہ ''اجالے کی تلاش'' کے عنوان سے شائع کیا۔ جس کے ٹائٹل کو میرے استاد محترم قاضی عطااللہ صاحب نے سخت ناپسند کیا۔ اس میں آنکھ کے اندر ایک عورت رقصاں تھی۔

۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء دونوں ورنیکلر فائنل امتحانات میں میرے سکول کے نتائج نوے فیصد سے اوپر رہے تھے۔ میں بڑا مطمئن تھا لیکن گھپلے والے اثرات ابھی باقی تھے۔ جب ہم فنکارانہ رویہ اپناتے ہیں تو ہمارا کام کچھ دینا ہوتا ہے لینا نہیں ہوتا میں اپنی جذباتی طبع کے پیش نظر قربانی کا بکرا بنا تھا اور خاتون نے اپنے گناہ کے ثمر سے نجات حاصل کر لی تھی۔

☆☆

جون ۱۹۶۰ء کے آخری ہفتے میں ایک اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ مہر عبدالحمید صاحب نے تیسری بار مجھے گورنمنٹ سروس دلا دی تھی۔ ۲؍جولائی ۱۹۶۰ء کو ہفتہ کا دن تھا۔ اسی روز لاہور ریجن کے سرکاری مدارس تعطیلات موسم گرما کے لیے بند ہونے والے تھے' لہٰذا میں یکم جولائی کی صبح سکول کا چارج اپنے ماموں زاد ایس وی بھائی کو دے کر علی پور ضلع مظفر گڑھ کے لیے روانہ ہوا۔ ملتان سے علی پور تک کا سفر رات ہو جانے کے باعث میں نے ٹرک پر طے کیا۔ نیم شب کو میں علی پور میں تھا۔ ٹرکوں کے ایک ہوٹل پر چارپائی لے کر لیٹ گیا۔ علی الصباح اپنا حلیہ درست کر سکول جا حاضر ہوا۔

عین تعطیلات ہونے کے دن میری پہلی حاضری پر سکول کے ہیڈ ماسٹر منظور قریشی کچھ چیں بجبیں ہوئے' لیکن جب میں نے بتایا کہ میرے احکامات ہی ۲۵؍جون کے جاری شدہ ہیں اور اس میں فوری طور پر حاضر ہونے کو کہا گیا ہے۔ اس میں بعد از تعطیلات حاضر ہونے کی شرط لاگو نہیں کی گئی۔ نیز یہ احکامات اسسٹنٹ انسپکٹر بہاولپور ڈویژن نے مہر عبدالحمید رجسٹرار کے ذریعے جاری کروائے ہیں تو قریشی صاحب کو چپ ہی لگ گئی۔ مہر صاحب ملتان کے رہنے والے تھے اور قریشی صاحب بھی ملتان ہی کے شہری تھے جبکہ ان دنوں ضلع مظفر گڑھ بہاولپور ڈویژن میں شامل تھا اور میں حوالہ ڈویژن کے اسسٹنٹ انسپکٹر کا بھی دے رہا تھا۔ انھوں نے سیف الرحمٰن سیکنڈ ماسٹر کو میری رپورٹ حاضری تیار کرنے کو کہا اور مجھے دستی تھماتے ہوئے کہا کہ میں واپس سیالکوٹ ملتان کے راستے کی بجائے بہاولپور کے راستے جاؤں اور رپورٹ انسپکٹر آف سکول کے دفتر میں دیتا جاؤں۔

☆☆

ضلع کے مدرسین کی برادری سے نکل میں پنجاب بھر میں پھیلی اس برادری کا ممبر بن چکا تھا جسے جنرل کیڈر کہا جاتا ہے۔ کیا میں اس برادری ہی کا رکن رہوں گا؟ مجھے رہنا ہی ہوگا کیونکہ اس بار میں کشتیاں جلا کر آیا تھا۔ تعطیلات کے لئے اپنے گھر براستہ بہاولپور واپس جانے کی ہیڈ ماسٹر صاحب کی تجویز میرے لیے دو طرح سے اچھی تھی۔ ایک تو میں اپنے دوست سے ملاقات کے علاوہ اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کر سکتا تھا دوسری وہاں سے سمہ سٹہ نامی ٹرین پر بیٹھ کر سیدھا اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر جا کر اتر سکتا تھا۔ ایک رات میں اپنے دوست کا مہمان رہا۔ اتوار کی شام میں سمہ سٹہ پر بیٹھا۔ ٹرین ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی جب ملتان کی راہ خانیوال پہنچی تو سال کی پہلی مون سون نے ہر سو ٹھنڈک پھیلا دی۔ میں گاڑی کی برتھ پر لیٹا کبھی سو جاتا' کبھی جاگ پڑتا۔ اس روز میں اس گاڑی پر

بہاولپور سے سوار ہو کر گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ میں برسوں اسی گاڑی میں بلاٹکٹ سفر کر کے ڈی بی مڈل سکول سمبڑیال اور پھر اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال پڑھنے جاتا رہا ہوں۔

یہ گاڑی سمہ سٹہ سے روانہ ہو کر ملتان، خانیوال لائل پور، وزیر آباد ہوتی ہوئی نارووال تک اب بھی جاتی ہے۔ ذرا بھی بوڑھی نہیں ہوئی۔

☆☆

تعطیلاتِ موسم گرما کے بعد علی پور میں ابھی دو ہی روز گزرے تھے کہ بہاولپور کے صادق ڈین سکول سے ایک مدرس آیا۔ اس نے میرے ساتھ ملاقات کی اور بتایا کہ ضلع مظفر گڑھ کو پھر سے ملتان ڈویژن میں شامل کیا جا رہا ہے اور وہ اسی ضلع کا رہنے والا ہے۔ اگر میں اس سے باہمی تبادلہ کرا لوں تو وہ اپنے گھر کے قریب آ جائے گا اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا جبکہ میں تو سیالکوٹ ضلع کا رہنے والا ہوں۔ میرے لیے علی پور ہو یا بہاولپور...... چولہے کی اوٹ پردیس والی بات ہے۔ میں نے اس کی تجویز پر فوری صاد کیا کہ میں اس طرح براہ راست بذریعہ ریل اپنے گاؤں سے منسلک ہو سکتا تھا، لہٰذا ایک درخواست باہمی تبادلہ بنام ڈویژنل انسپکٹر آف سکول، بہاولپور لکھی گئی۔ ہم دونوں نے دستخط کیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی سفارش کی کہ وہ اس باہمی تبادلے پر معترض نہیں ہیں۔ وہ بضد ہوا کہ میں خود بھی اس کے ساتھ چلوں تا کہ ذاتی طور پر مل ملا کر احکامات جاری کرائے جائیں۔

راستے میں اس نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صادق ڈین ہائی سکول اس کے تبادلے کی سفارش نہیں کریں گے کیونکہ موصوف کو تصنیف و تالیف کا شوق ہے اور وہ ان کے لیے بطور محرر بھی کام کرتا ہے۔ احکامات تبادلہ جاری ہو گئے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے واقعی اس مدرس کو فارغ کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً سفارش کرائی گئی بلکہ ان سے کہا گیا کہ وہ نئے آدمی کا (یعنی میرا) محرری کے حوالے سے امتحان لے لیں، چنانچہ میرا امتحان جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم پر دو پیرے لکھوا کر لیا گیا۔ میں نہ صرف امتحان میں پاس ہوا بلکہ انھوں نے مجھے اپنے سابقہ محرر سے خوشخط بھی قرار دیا۔ انھوں نے مجھے فراغت رپورٹ کے بغیر ہی حاضر کر لیا اور اس نوجوان کو فارغ کرتے ہوئے تاکید کی کہ وہ میری فراغت رپورٹ مع ایل پی سی، میرا بستر اور صندوقچہ علی پور سے بھجوائے گا تو اس کی ایل پی سی جاری کی جائے گی۔ تبادلے کی خوشی میں وہ ہر شرط تسلیم کر رہا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صادق ڈین ہائی سکول چودھری یوسف علی قائم بلا کے حقہ نوش تھے۔ مشہور تھا کہ انھیں فل برائٹ سکالرشپ کے تحت امریکہ کی ہاورڈ یونیورسٹی میں جانا پڑا تو وہاں بھی حقہ

ساتھ لے کر گئے اور ہوائی جہاز کے اندر دوران پرواز بھی اس سے شغل فرماتے رہے۔ دفتر میں حقے کی نے ایک سوراخ میں سے ملحقہ باتھ روم سے آتی تھی جسے وہ تقریباً ہر وقت ہاتھ ہی میں تھامے رکھتے تھے اور وقفے وقفے سے دو تین چھوٹے چھوٹے کش لیتے رہتے۔

میرے ہی گاؤں کے انگریزی کے ایک معلم منظور احمد میو اسی سکول میں تعینات تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں قضائے الٰہی سے ان کا عین جوانی کے عالم میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے حوالے سے بھی ہیڈ ماسٹر نے میرے ساتھ طویل گفتگو کی اور مجھے سمجھایا کہ سابقہ ریاست کا مراعات یافتہ طبقہ ابھی تک ریاست کے صوبہ پنجاب میں ادغام کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ذرا سی بات پر ان کے پندار کو ٹھیس لگ جاتی ہے اور ان کی انا مجروح ہو جاتی ہے' لہٰذا مجھے زبان کو قابو میں رکھنا اور نفسیاتی طور پر طلبہ کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا۔ انھوں نے مجھے منظور احمد مرحوم کی جماعت ہی کا انچارج بنا دیا اور صرف انگریزی کی تدریس ہی کا کام تفویض کیا۔ میرا باقی وقت انھوں نے اپنے کام کے لیے بچا لیا۔

وہ خود مجھے لے کر جماعت نہم الف کے کمرے میں گئے۔ طلبہ سے مختصر تعارف کرانے کے بعد انھوں نے مجھے اپنا مزید تعارف خود کرانے کے لیے کہا۔ جب میں نے طلبہ کو بتایا کہ میں ان کے مرحوم استاد کے گاؤں ہی کا رہنے والا ہوں اور مرحوم سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے اس لیے پیشتر اس کے کہ میں مرحوم کے حوالے سے مزید باتیں کروں' آیئے ہم پہلے ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ سب طلبہ نے ہاتھ اٹھا لیے۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد ان سے اپنا تفصیلی تعارف کرایا اور آخر میں ان سے کہا کہ اگر وہ مجھ سے کچھ مزید پوچھنا چاہتے ہیں تو ان کو اجازت ہے۔ انھوں نے جو کچھ پوچھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مرحوم منظور احمد طلبہ میں خاصا مقبول تھا اور طلبہ اسے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں نے طلبہ سے پوچھا کہ وہ کیسے پڑھاتے تھے' کیسے تفویضی کام کی پڑتال کرتے تھے اور کام چوروں یا شرارتی لڑکوں سے کیسے پیش آتے تھے۔ لڑکوں نے کھل کر باتیں کیں۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں بھی تعلیم و تدریس کے معاملے میں ان کی بہترین خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔

چند دن تو میں حمید صاحب کے ہاں ہی ٹھہرا پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے تبادلے کا اہتمام کر چکے ہیں اور احکامات کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اگر ان والا کرائے کا مکان رکھنا چاہتا ہوں تو رکھ لوں ورنہ ہوسٹل میں منتقل ہو جاؤں۔ میں ان کے تبادلے کا سن کر اداس سا ہو

گیا۔ تاہم بددل نہیں ہوا۔ میں نے ہوسٹل میں جانے کے بجائے ماڈل ٹاؤن میں دو کشادہ کمروں اور باورچی خانے پر مشتمل کھلے صحن والا ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فاخر کلرک کو ہوسٹل سے دو چار پائیاں، دو کرسیاں اور ایک میز مہیا کرنے کی ہدایت کی۔ چند دنوں بعد بیوی بچے ضروری گھریلو سامان کے ساتھ آ گئے اور یوں زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔

تعلیم و تدریس کے فرائض کے ساتھ ساتھ میں ہیڈ ماسٹر کے تصنیف و تالیف کے کام بھی باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر کے لکھوائے جانے والے جملوں میں تبدیلیاں تجویز کیں تو پہلے انھوں نے مجوزہ تبدیلیوں پر غور کیا اور پھر انھیں قبول کر لیا۔ روشن طبع کے بلا ہونے کی مثل اس وقت مجھ پر صادق آئی جب ہیڈ ماسٹر نے انگریزی زبان میں ان کی تصانیف و تالیف کے مسودات پڑھ کر ان کے مشورے سے مناسب تصحیح کر دوں۔ ایک روز وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور انھوں نے چرمی جلدوں میں محفوظ اردو اور انگریزی میں لکھے گئے بہت سے مسودات دکھائے جو بڑی محنت سے تیار کیے گئے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ مسودات کسی پبلشر کو دکھائیں اور چھپوائیں۔ ساتھ ہی میں نے ان کو مسٹر ایم ڈی ظفر ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز کی مثال دی کہ ان کی تصنیفات تو اساتذہ کے تربیتی اداروں کے نصاب میں شامل ہیں اور وہ کافی رائلٹی حاصل کر رہے ہیں، تو انھوں نے بتایا کہ وہ ملتان کے ایک پبلشر سے بات چیت کر رہے ہیں۔ ان کی محنت کا کیا انجام ہوا اس کا مجھے بوجہ تبادلہ علم نہیں ہو سکا۔

☆☆

تحریر و تصنیف کے تعلق کی بنا پر وہ چھوٹی چھوٹی مہربانیاں تو مجھ پر کرتے ہی رہتے تھے لیکن اب انھوں نے مجھ پر ایک بڑی مہربانی کی کہ اسٹیٹ لائبریری بہاولپور میں لائبریری سائنس کے ڈپلومہ کورس کی کلاس کو لیکچر دینے کے لیے اپنی جگہ مجھے نامزد کر دیا۔ موضوع اردو اور فارسی ادب کی تواریخ کا مختصر جائزہ تھا۔ میں نے لیکچرز کی تیاری کے لیے اسٹیٹ لائبریری ہی سے استفادہ کیا اور کامیاب لیکچرز دیے جن کا معاوضہ خاصا معقول تھا۔ حقیقتاً ہیڈ ماسٹر صاحب محرری کا جو کام مجھ سے کرا رہے تھے وہ اس کا معاوضہ ایسے ہی دیگر کاموں کے ذریعے مجھے نامعلوم طریقے سے دلوا رہے تھے۔ یہ ان کا خصوصی ظرف تھا کہ وہ یہ بات یاد رکھتے تھے کہ وہ مجھ سے وہ کام لے رہے ہیں جو میری ذمہ داریوں کے علاوہ ہے۔

◆◆◆◆◆

(۲۱)

گرد، گرما، گدا و گورستاں

ہیڈ ماسٹر صاحب ہی کی سفارش پر مجھے ایک ماہ کے لیے ملتان میں دورانِ ملازمت ایک تربیتی کورس کے لیے نامزد کیا گیا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان میں یہ کورس برٹش کونسل کے تعاون سے انگریزی تدریس کے سلسلے میں منعقد کرایا جا رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول مسٹر علی گردیزی اور مسٹر سمیع اللہ خان پروفیسر انگریزی صادق ایجرٹن کالج نے برٹش کونسل کے تعاون سے یہ کورس انگلستان میں کیا تھا۔ تیسرے انسٹرکٹر مسٹر ڈی وائی مورگن برٹش کونسل لاہور کے ایجوکیشن افسر تھے۔ ملتان اور بہاولپور ڈویژن کی چیدہ چیدہ معلمات اور معلمین اس کورس کے مندوبین تھے۔ اس کورس کے بعد انھوں نے اپنے اپنے ضلعی مراکز میں جملہ انگریزی مدرسین کو یہ کورس کرانا تھا۔

انگلستان کے کوئی ماہر تعلیم جن کا نام میکن *Mackin* تھا دوسری جنگ عظیم سے قبل ہندوستان آئے تھے اور انھوں نے چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کے طلبہ کے لیے عمر کے لحاظ سے موزوں انگریزی الفاظ کی درجہ بندی کر کے ایک ایسا سلیبس تیار کیا تھا جو براہ راست طریقہ تدریس (ڈائریکٹ میتھڈ) کا نقیب تھا جو سو الفاظ چھٹی جماعت کی انگریزی کی کتب میں شامل کیے گئے تھے ان کا اعادہ تو ساتویں جماعت کی کتاب میں شامل تھا لیکن ساتویں جماعت میں پڑھائے جانے والے مزید سو الفاظ میں سے کوئی بھی لفظ چھٹی جماعت کی کتاب میں شامل نہ تھا۔ اسے ''گریڈڈ ووکیبولری'' (درجہ وار ذخیرہ الفاظ) کا نام دیا گیا تھا۔ گویا میکنز سلیبس، کی فرمائش کا تجربہ ربع صدی بعد پاکستان میں کیا جا رہا تھا۔ جملہ اخراجات برطانوی حکومت برٹش کونسل کے ذریعے برداشت کر رہی تھی۔

نو سے ایک بجے تک اور پھر دو سے پانچ بجے روزانہ دو سیشن ہوتے۔ کورس دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ خاص طور پر جب مسٹر مورگن انگریزی الفاظ کے صوتی اثرات پر لیکچر دیتے تو ہم

مسکرائے بغیر نہ رہ سکتے۔ وہ جانوروں اور بچوں جیسی آوازیں نکالتے۔ بعض اوقات قہقہے بھی لگ جاتے مگر وہ سنجیدہ ہی رہتے۔

☆☆

سمیع اللہ خان سے میری سلام دعا کی حد تک شناسائی تھی۔ کیونکہ اسٹیٹ لائبریری میں وہ بھی انگریزی ادب کی تاریخ پر لیکچر دیتے رہے تھے۔ ملتان میں یہ واقفیت بھرپور دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ انھیں انگریزی ادب کے علاوہ فارسی اور اردو ادب سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ اساتذہ کے اشعار وہ قدم قدم پر حوالے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ سمیع اللہ خان چونکہ رہنما استاد اور پروفیسر تھے لہٰذا انھیں علیحدہ کمرہ دیا گیا تھا انھوں نے مجھے گپ شپ کے لیے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی جو میں نے خوشی سے قبول کر لی۔ ہم کورس سے فرصت ملنے کے بعد ہر لمحہ اکٹھے رہتے، خوب گھومتے پھرتے۔ ہم نے ملتان کے چار تحفوں ...... گرد، گرما، گدا اور گورستان کے حوالے سے شہر کا خوب مطالعہ کیا۔ ان کے چند لیکچرار دوستوں کے ہاں خوب دعوتیں اڑائیں۔ ان کے ایک مجسٹریٹ دوست جو پہلے لیکچرار ہی تھے کے ہاں تو دعوت کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ وہاں چند گنے چنے افراد مدعو تھے جن میں اس وقت کی مشہور ایک ملتانی مغنیہ بھی تھی جو ملکہ پکھراج کے انداز میں بڑے وقار سے کلام غالب اور کلام اقبال سناتی رہیں۔ سمیع اللہ خان خوب بے حال ہوتے رہے۔ جب اس نے "وچ روہی دے کھیڈ مچاون نازک نازو جٹیاں" پنجابی کا عارفانہ کلام سنایا تو سمیع کی سمجھ میں نہیں آیا۔ محفل کے بعد مجھے اس کے معنی سمجھانے پڑے تو وہ جھوم جھوم اٹھے۔

سمیع اللہ خان بریلی کے رہنے والے تھے۔ انھیں حضرت احمد رضا بریلوی سے بڑی عقیدت تھی، لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ بریلوی کا لاحقہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ خود کو بریلوی لکھیں تو وہ مذہبی فرقہ پرست شمار ہوں گے۔ بریلی شہر کا باشندہ شمار نہیں ہوں گے۔ ان معنوں میں وہ ترقی پسند بریلوی تھے۔ میں ان کی معیت میں حضرت شمس تبریزی اور شاہ رکن الدین عالم کے مزارات پر بھی حاضر ہوا۔ قوالیاں بھی سنیں اور فقرا کی دعائیں بھی لیں۔ قاسم باغ کی بارہ دری میں لوگوں نے اپنے ناموں کے ساتھ کئی اقوال اور اشعار لکھ رکھے تھے۔ ایک دوہا تحریر تھا جسے سمیع پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پڑھ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے ان کی مدد کی۔ دوہا یہ تھا:

چھپڑی وچ امب تر دا
طاہرہ دی جدائی نالوں، رب پیدا ای نہ کردا

سمیع اس دوہے کو معانی بتائے بغیر ہی سمجھ گئے اور سر دھننے لگے۔ انھوں نے کہا کہ نہ جانے لکھنے والا کون ہے' اور طاہرہ بی بی کون ہے لیکن عاشق اپنی آہیں ادھر بکھیر گیا ہے جس کی لہریں ان کے دماغ سے ٹکرا رہی ہیں۔

سمیع اور اس کے مجسٹریٹ دوست کے درمیان دعوت کے روز کچھ کھسر پسر ہوئی تھی۔ انھوں نے حرم گیٹ میں کلاسیکی رقص کی ماہر کسی رقاصہ کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس پروگرام کے انکشاف سے میرے اندر میرا خاندانی مولوی بیدار ہو گیا میں نے سمیع سے معذرت کی کہ میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تو انھوں نے میرے اندر کے مولوی کو سلانے کے لیے ایک ترغیبی درس دیا۔

"رقص اور موسیقی کی الگ الگ روایات ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ گلوکارہ کتنی باوقار اور پاکیزہ نظر آ رہی تھی۔ اسی طرح ہم جس کے ہاں جانے والے ہیں وہ امراؤ جان ادا کا دوسرا روپ ہے۔ سننے اور دیکھنے سے دامن تر نہیں ہوتا۔ ویدوں میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندروں میں جن میں سومنات بھی شامل تھا دیوتاؤں کے سامنے حسین و جمیل لڑکیاں بہترین ملبوسات میں رقص کرتی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہندو مذہب کے زیر سایہ شمالی ہند میں متھرا شہر کے علاوہ اجودھیا اور بنارس بھی موسیقی اور رقص و سرود کے مراکز تھے۔ قدر دانی میں بیجانگر کے راجے بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اس شہر میں پیشہ ور رام راجنیاں اس کثرت سے تھیں کہ ان کی آمدنی کے ٹیکس سے پولیس کے محکمے کو تنخواہیں دی جاتی تھیں......" اور' اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا "ہم تو بھائی...... حرم گیٹ جا رہے ہیں...... اور حرم کے معانی تو آپ کو معلوم ہی ہیں۔ پھر ہم فن اور معلومات کے نظریہ سے جو ہو گا دیکھیں گے۔"

حرم گیٹ کی شمسہ کے ہاں جو رقص ہم نے دیکھا مجھے تو وہ بی ٹی کے دوران میں ملتان ہی کے ظفر کے ساتھ لاہور کے ہوٹل میٹرو میں ڈیڑھ روپے کی چائے کی پیالی کے عوض دیکھا گیا اینگلو انڈین مِس اینجلا کا ٹی ڈانس لگا۔ پھر ڈانس کی یہ روایت عذرا کے نام سے ہوٹل سٹینڈرڈ اور وہاں سے سلطانہ پشاوری کے روپ میں سیمنز مری تک پہنچی۔ تاہم سمیع کا کہنا تھا کہ دیکھنے والے کی نیت کا بھی فنِ تماشا میں بڑا دخل ہے۔ کیا میں نے دیکھا نہیں کہ شمسہ ناچتے ہوئے جو گاتی تھی وہ تو اس بول کے معانی بھاؤ بتا کر ادا کرتی تھی۔ یہی نرت اور کتھک ناچوں کا طرہ امتیاز ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ سمیع کی نظروں میں جو لطافت ہے وہ میری نظروں میں کثافت تھی۔ مجھے اپنی اصلاح کرنا ہو گی کہ

میں کثافت کو لطافت کے طور پر دیکھ سکوں۔ مجھے تو عورت کے تھرکنے، پھڑکنے، مٹکنے، جھٹکنے کے خیال سے ویسے ہی کراہت ہوتی تھی۔ فن کے نام پر بناؤ سنگھار کے ساتھ ناچنا تو عورت کا مقام ہے ہی نہیں۔ بس بازاری پن ہے۔ یہ ہم تماش بین مرد ہیں جنھوں نے محفلوں میں عورت کو ثقافت کے پردے میں نچوایا۔ اعصابی اور حسی حظ اٹھایا اور اسے فن کا نام دے دیا۔ مجھے نرت اور کتھک کی کچھ سمجھ نہ تھی میں تو شمسہ کو ایک ایسی عورت کے روپ میں دیکھ رہا تھا جو ماں تھی نہ بیٹی، بہن تھی اور نہ بیوی۔

☆☆

انہی دنوں میں محمد خاں کلیم صادق ایجرٹن کالج میں فارسی کے لیکچرار تعینات ہو کر بہاولپور میں وارد ہوئے۔ جب وہ مجھے ملنے تشریف لائے اس وقت وہ داروغہ جیل چودھری احمد خان کی سرکاری رہائش گاہ کے مہمان خانے میں مستقل طور پر مقیم ہو چکے تھے۔ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ جیل کے مشقتی ادھر ادھر کام کر رہے تھے۔ انھیں بھی ایک مشقتی ملا ہوا تھا۔ مہمان خانے کے اردگرد خوب پھول کھلے ہوئے تھے۔ جیل کی بیرونی دیوار تک گھاس کا لان تھا۔ دریچوں سے باہر بہار نظر آتی لیکن ان کا کہنا تھا کہ جب جیل کی دیوار پر نظر پڑتی ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے۔ داروغہ جیل سیالکوٹ ضلع کی مشہور سیاسی شخصیت چودھری عبدالغنی گھمن کے چھوٹے بھائی تھے اور اپنے بھائی کے سیاسی داؤ پیچ کے شاکی تھے کہ سیاسی گٹھ جوڑوں کے تحت بھائی کے کارناموں کی زد ان پر بھی پڑ سکتی ہے۔ ان کا بیٹا جاوید گھمن ان دنوں بی اے میں تھا اور کلیم صاحب اس کی راہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

ملتان سے آنے کے بعد ایسی ہی راہنمائی کے عوض میں بھی طعام و قیام پر ملک عبدالرحمن کے ہاں مقیم تھا۔ میں نے ملک اسلم کو بتایا کہ اسے آٹھویں جماعت میں سرعام سگریٹ نوشی پر پھینٹی لگانے والے کلیم صاحب ادھر کالج میں لیکچرار مقرر ہو کر آئے ہیں اور داروغہ جیل کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ داروغہ جیل کون ہے تو اس کے والد جو شاید ہماری باتیں ساتھ والے کمرے میں سن رہے تھے، ہمارے پاس آ گئے اور بتایا کہ احمد خاں گھمن تو ان کا بی اے کا ہم جماعت ہے۔ میں نے ان کی احمد خان صاحب سے ملاقات کرائی۔ انھوں نے ماضی کی یادیں تازہ کیں۔ دونوں کے ہاں دعوتوں کا تبادلہ ہوا۔ میں اور محمد خاں کلیم طفیلیوں کی طرح دونوں جانب شریک ہوتے رہے۔ ہم بیچارے مرلی محکمے کے ملازم۔

محمد خاں کلیم صاحب بہاولپور تشریف لائے تھے تو اپنے ساتھ ایک طویل فہرست ایسے

احباب کی بھی لائے تھے جو بہاولپور میں تھے۔ ان میں سے انھوں نے کچھ کھوج نکالے تھے اور کچھ کھوجنے ابھی باقی تھے۔ یہ سارے پردیسی لوگ تھے۔ ان میں سے ایک احمد نواز چیمہ لیکچر ٹیچر ٹریننگ کالج، گوجرانوالہ کی مشہور فرم حق نواز لمیٹڈ کے مال حق نواز کے بڑے بھائی تھے۔ شعروسخن کا ذوق رکھتے تھے۔ سرکاری کالونی میں ایک ذاتی ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کے ہاں روزانہ مجلس جمتی تھی۔ جس کے شرکاء میں سے تصدق حسین عباسی ایک میری طرح کا مدرس تھا۔ ستار خوب بجاتا تھا وہ اس وقت الہٰ آباد میں تھا جب میں وہاں سے فرار ہوا تھا۔ اس نے بھی میرے نام کی وجہ سے مجھے یاد رکھا تھا اور مجھے مل کر بڑا خوش ہوا تھا اور مجھے داد دیتا تھا کہ میں واقعی فنکار ہوں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھنے کی خاطر میدان سے بھاگ گیا (میدان سے اس کی مراد میدانی علاقے سے تھی)۔ سعید صدیقی دمے کا مریض بھی عباسیہ سکول کا انگریزی مدرس تھا۔ خشک آب وہوا کی تلاش میں وہ راولپنڈی سے بہاولپور پہنچا تھا۔ اس کی بیوی تربیت یافتہ لیڈی ہیلتھ وزیٹر تھی۔ جب صدیقی کو دمے کا دورہ پڑتا تو وہ اسے شریان میں ٹیکہ لگاتے ڈرتی تھی۔ میں اپنی مہاجرین کیمپ باؤلی میں حاصل کی گئی ان 'آ کولیشن' کی تربیت کی بنا پر یہ فریضہ انجام دیتا۔ صدیقی کو سکون ملتا تو کہتا کہ اس کی بیوی ڈرتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کہیں اس کا محبوب شوہر ہلاک نہ ہو جائے۔ (ان سطور کے لکھنے سے ایک روز قبل مجھے پتہ چلا ہے کہ صدیقی کا انگلستان میں انتقال ہو گیا ہے حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا) سمیع بھی کبھی کبھی تشریف لاتے۔ وہ بھی دمے کے مریض تھے۔

☆☆

ہماری اس روزمرہ کی محفل میں ایک ریاستی باشندہ بھی شامل ہوتا لیکن وہ اس طرح شامل ہوتا کہ ہماری گفتگو میں شامل ہوتا نہ قریب بیٹھتا۔ اس کا نام پیر بخش ذوق تھا۔ اسے چودھری حمید تبدیل ہو کر بہاولپور سے جاتے جاتے میرے سپرد کر گئے تھے کہ اس کا ایک کام منصور علی خاں اے ڈی آئی سکولز بہاولپور سے تھا۔ منصور علی خاں حمید کے تو ڈسکہ ہائی سکول کے ساتھی تھے جبکہ میرے بھی آشنا تھے۔ پیر بخش ذوق کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہاولپور سے ایک میل کے فاصلے پر ایک پرائمری سکول میں تعینات تھے لیکن سکول میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ وہ بہاولپور کی مرکزی جامعہ مسجد کی ایک کوٹھڑی میں مقیم تھے۔ سکول میں حاضر ہونے کی صورت میں وہ مرکزی جامع مسجد میں پانچوں نمازیں باجماعت نہ پڑھ سکتا تھا۔ اس کو دین کے اس عالمگیر مسئلے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اگر وہ کسی اور چھوٹے بڑے مقام پر بھی باجماعت نماز پڑھ لے تو وہ نماز

بھی مرکزی جامع مسجد میں پڑھی جانے والی نماز کے برابر ہی ہوگی۔

وہ اپنے جاننے والوں میں وزیر زراعت خدا بخش بچہ انسپکٹر آف سکولز ملک غلام محمد، پرنسپل انصاری وغیرہ وغیرہ کا نام لیتا تھا شاید ان سے ملتا بھی ہو۔ میں ذوق کے موقف کی حمایت میں منصور علی خاں صاحب سے ملا کہ وہ اسے ایک میل کے فاصلے سے جامعہ مسجد کے نیچے ہی واقعہ سرکاری پرائمری سکول میں تبدیل کر دیں۔ تبادلہ منصور علی خاں کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ تو ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے ہاتھ میں تھا جو پیر بخش ذوق کے نام ہی سے چڑتے تھے۔ میرے علاوہ اب اس نے محمد خاں کلیم کو بھی اپنا سفارشی بنالیا تھا۔ وہ ہمارا ہر حکم بلکہ ہر اشارہ بجالانے کے لئے موجود رہتا تھا۔ کئی بار وہ ہمیں یہ پیش کش بھی کر چکا تھا کہ اگر ہمیں ادھار یا قرض حسنہ کی ضرورت ہو تو وہ ہماری خدمت کر سکتا ہے۔

☆☆

میرے اور محمد خاں کلیم کے مشترکہ عزیز اصغر قریشی جو محمود الحسن قریشی کے صاحبزادے تھے اسی سال بی ایڈ کے لئے بہاولپور میں تھے۔ ایک اور جاننے والے حمید شیخ مدرس پرائمری سکول ڈسکہ بھی تھے۔ کبھی کبھی یہ دونوں بھی ہماری اس رات بھیگنے تک جاری رہنے والی محفل میں شامل ہوتے۔ ایک روز چند اور پروفیسروں کے ساتھ ہم نے پروفیسر سمیع کی دعوت کی۔ کلیم صاحب داروغہ جیل کے گھر سے ساگ پکوا کر لائے۔ بٹیر بھی تھے۔ بکرے کا گوشت بھی تھا۔ سب کھا رہے تھے از راہ مروت کلیم صاحب نے پیر بخش ذوق کو بھی ساتھ شامل کر لیا تو اس نے ساگ کے سالم ڈونگے ہی کو اپنے سامنے رکھا اور اس کے عین درمیان میں سے چپاتی کے ساتھ کھانے لگا۔ دوسروں کو کراہت سی محسوس ہوئی اور کسی نے ساگ نہیں لیا جبکہ خصوصی ڈش ساگ ہی تھا۔ ایک بہت ہی نفیس طبیعت والے پروفیسر کی پلیٹ میں بچا ہوا ذرا سا سالن دیکھ کر پیر بخش ذوق نے انھیں کہا ”پروفیسر صاحب! پلیٹ صاف کریں۔ یہ سنت ہے۔“ پروفیسر صاحب مسکرا دیئے۔ جب ماسٹر ذوق نے ساگ کا ڈونگہ چھوڑ کر بٹیر کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے تو پروفیسر صاحب نے ان کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا ”جناب! ڈونگہ صاف کرنا فرض ہے۔ پہلے اسے ختم کیجئے۔“ طوعاً کرہاً انھوں نے ڈونگہ صاف کیا اور اٹھتے ہوئے کہا کہ پنجابیوں کو مہمان نوازی کے آداب بھی نہیں آتے۔ بعد میں یہ حضرت ذوق ہمیں (مجھے اور کلیم کو) لاہور میں بھی میزبانی کا شرف بخشتے رہے لیکن ہمیشہ ہماری مہمان نوازی کے شاکی ہی رہے۔ کاش انھوں نے کوئی نمونہ دیا ہوتا جس پر ہم عمل کرتے۔

☆☆

جب ریاست کو صوبہ پنجاب میں مدغم کیا گیا تو امیر بہاولپور نے حکومت پنجاب سے یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ ریاست کے ملازمین جس بھی اہلیت کے ہیں اور جہاں بھی تعینات ہیں انھیں ویسے ہی چلنے دیا جائے گا جب تک کہ ان میں سے کوئی ازخود تبدیلی کا خواستگار نہ ہو۔ میرے اپنے ایک عزیز جو صرف میٹرک تھے لیکن کوآپریٹو سوسائٹیز کے ڈویژنل رجسٹرار تھے خود کو ریاستی کہلواتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ میرے ساتھ ایک ملاقات میں انھوں نے اعتراف کیا کہ انھیں بھی ذاتی طور پر ریاست کا ادغام پسند نہیں ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت کا زمانہ ہوتا تو ان کے بچے وظائف پر غیر ممالک میں پڑھ رہے ہوتے۔

سیکنڈ ماسٹر جوہر نے تو یہاں تک کہا کہ جب حکومت پنجاب کی طرف سے ایسے چھوٹے چھوٹے اہلکار بھی ادھر آنے لگے جن کی تعلیم ایم اے، بی اے، ایم ایس سی اور بی ایس سی سے کم نہ تھی تو ہم تو بوکھلا اٹھے تھے۔ ادھر تو بس ایک ہی کالج تھا جس کے گریجوایٹس کو ریاست کہیں نہ کہیں ملازمت دیتی تھی مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی تھی۔ کوئی بااثر ریاستی باشندہ اگر کہیں باہر سے زیادہ پڑھ کر آ جاتا تو اعلیٰ حضرت اس کی قدر دانی کے لیے اس کو ریاست میں عہدے پیش کرتے خواہ وہ عہدے ضرورتاً تخلیق کرنا پڑتے۔

ایسی باتیں بھی سننے میں آئیں کہ اعلیٰ حضرت نے محض سرپرستی کی خاطر ایک ڈاکٹر کو ہسپتال کے بجائے منیجر پرنٹنگ پریس لگا دیا۔ کسی انجینئر کو ہیڈ ماسٹر تعینات کر دیا۔ وہاں کئی کلرک پرائمری پاس تھے۔ محکمہ تعلیم میں بھی دو سی ٹی افراد ایسے تھے جو اس وقت ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان میں سے ایک تو بعد میں سینیارٹی کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر بھی تعینات ہوئے۔

اعلیٰ حضرت کی فیاضیوں کے بھی بڑے لطیفے تھے۔ ایک پنجابی مدرس کسی دیوار کی آڑ میں پیشاب کر رہا تھا۔ نواب صاحب کی سیٹی بجاتی گاڑی گزری تو وہ گھبرا کر کھڑا ہوا اور ازار بند باندھنے لگا۔ کافی آگے جا کر گاڑی رکی اور پھر سیٹی بجاتی ہوئی اسی رفتار سے ریورس میں اس شخص تک پہنچی۔ اعلیٰ حضرت گاڑی سے اترے اور اس مدرس کو سرعام پیشاب کرنے کے جرم میں خاصی چھینٹی لگائی۔ اور چلے گئے۔ بعد میں متعلقہ اہلکاروں نے پتہ کیا کہ پٹنے والا شخص کون تھا؟ اعلیٰ حضرت نے اسے سو روپیہ کھانے پینے کے لیے بھیجا۔

اسی طرح ایک علیگ کسی دفتر کے افسر تھے۔ اعلیٰ حضرت دفتر کا اچانک معائنہ فرمانے جا پہنچے۔ اس علیگ نے شیروانی کے اوپر کے بٹن کھول رکھے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے اسے بٹن بند کرنے

کے لیے کہا۔ علیگ نوجوان تھا' اکڑ گیا کہ گلا تنگ ہے اور اس کا دم گھٹتا ہے۔ وہ بٹن بند نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ حضرت اسے مارنے کو لپکے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اعلیٰ حضرت کا ہاتھ علیگ پر پڑنے کے بجائے میز پر پڑا۔ اب انھوں نے وہاں سے شیشے کا قلمدان ہی اٹھا کر علیگ کے دے مارا جو علیگ کی پیشانی کو لہولہان کرتا ہوا فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اگلے دن وزیر حضوری نے نہ صرف علیگ کی مزاج پرسی کی بلکہ ایک بلوری قلمدان کے علاوہ پانچ سو روپیہ علاج معالجے کے لیے بھی علیگ کو پیش کیے۔

آنجہانی دیوان سنگھ مفتون نے اپنے ہفتہ وار رسالے ''ریاست'' میں والیان ریاست کی کرتوتوں اور کارگزاریوں کی ہمیشہ تشہیر کی تھی۔ اس کے قلم سے اگر کوئی والئے ریاست بچا ہوا تھا تو وہ بہاولپور ریاست کا حکمران عباسی خاندان تھا۔ بے شک ریاست کے کونے کونے میں ریاستی باشندے مطمئن تھے۔ عمدہ سڑکیں' نہریں اور درس گاہیں موجود تھیں تاہم اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ صرف ایک تھی۔ لوگ حکمران خاندان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

☆☆

ہمارے ہی سکول کے ایک او ٹی مولوی صاحب کسی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ان کی مدت سے کوئی حق تلفی ہو رہی تھی۔ انھوں نے حق تلفی کے ازالے کے لیے ایک درخواست صدر ایوب کے نام لکھی جس میں انھوں نے سابقہ حکومت کی شکایت کی لیکن ساتھ ساتھ انھوں نے مارشل لاء کو بھی خوب رگیدا کہ اب بھی وہی عالم ہے اور ان کی داد رسی نہیں ہو رہی۔ یہ بھی لکھا کہ وہ یہ درخواست اہتمام حجت کے طور پر دے رہے ہیں اگر اب بھی ان کی دادرسی نہ ہوئی تو وہ کسی نہ کسی مقام پر صدر ایوب کی گاڑی کے نیچے آ کر احتجاجاً جان دے دیں گے۔ شاید کچھ مزید بھی زور خطابت دکھایا ہوگا۔

ان کی درخواست کہیں سنسر ہو گئی۔ اچانک مولوی صاحب کو گرفتار کر کے مارشل لاء کورٹ میں پیش کیا گیا۔ جہاں سے انھیں تین ماہ قید اور دس کوڑوں کی سزا ہوئی۔ میں نے اس زیادتی کا ذکر محمد خاں کلیم سے کیا۔ انھوں نے نائب داروغہ جیل سے کہا تو مولوی صاحب کو جیل میں ہلکی سی مشقت دی گئی مگر مولوی صاحب کوڑوں کی سزا سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ جیل کے حکام کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ کوڑوں کی سزا معاف یا کم کر سکیں۔

ملک عبدالرحمٰن کے کہنے پر میں ان کے گھر کے قریب ہی دوسری جماعت کے ایک بچے کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اس بچے کا باپ فوج میں صوبیدار میجر تھا۔ انتہائی کم گو اور شریف النفس

آدمی تھا۔ ایک روز میں نے از راہ ہمدردی اس سے مولوی صاحب کی بات کی تو اس نے بڑی ملائمت سے کہا ''ان سے ایک غیر مشروط معافی نامہ لکھوا لائیں، انشاء اللہ کوڑوں کی سزا معاف ہو جائے گی۔'' میں نے دوسرے ہی روز جب مطلوبہ معافی نامہ صوبیدار صاحب کو پہنچایا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ملٹری کورٹ کے صدر کرنل کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں اور وہ ہی اس معافی نامے پر سفارش لکھیں گے۔ صوبیدار صاحب کی انسانیت اور ہمدردی کہ انھوں نے تیسرے چوتھے روز ہی مولوی صاحب کو باعزت بری کروا دیا۔ کوڑے بھی معاف، قید بھی معاف......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ملازمت بھی بحال رہی۔

مولوی صاحب نے خصوصی ملاقات میں میرے اور کلیم صاحب کے ہاتھ چومے...... اور کہا کہ ہم ریاستی تو خوامخواہ ہی تعصب کا شکار ہیں۔ پنجاب میں بھی اچھے انسان ہیں۔ مولوی صاحب صوبیدار صاحب کے ہاں بھی گئے۔ وہ بھی جہلم کے رہنے والے تھے۔ وہ کرنل صاحب سے بھی ملنا چاہتے تھے لیکن صوبیدار صاحب نے کہا کہ کیا ضرورت ہے؟ انھیں وقت کے مطابق قدم اٹھانا چاہیے۔ مولوی صاحب کو صوبیدار صاحب نے یہ بھی بتایا کہ حق تلفی کے بارے میں ان ان کی دادرسی بھی ہو رہی ہے۔

☆☆

پروفیسر سمیع کو نہ جانے مجھ میں کیا خوبی نظر آئی تھی کہ وہ میرے ساتھ اکیلے میں ملنا اور گپ شپ لگانا پسند کرتے تھے۔ شاید اس لیے کہ میں ایک اچھا سامع تھا، میں ان کی کسی بات کی تردید نہیں کرتا تھا۔ خاموش سنتا رہتا تھا۔ کبھی وہ بتاتے کہ بہاولپور علوم شرقیہ کا گہوارہ ہے۔ یہاں کئی لوگ آثار الصنادید ہیں۔ جوہر صاحب کو وہ ان ہی میں شمار کرتے تھے۔ انھیں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا شرف بھی حاصل تھا۔ ان کی معیت میں میں مخدوم جہانیاں کے عرس پر میلہ دیکھنے بھی گیا۔ وہاں انھوں نے سرگوشی میں بتایا کہ معروف ادیبہ جملہ ہاشمی بھی مخدوم خاندان میں شامل ہو کر اپنی آزادی سے محروم ہو گئی ہے۔ دو چھٹیاں آئیں تو ہم چولستان کے صحرا تک جا پہنچے۔ وہ جانتے تھے کہ میں ایم اے انگریزی کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں اس لیے وہ امتحانی نکتہ نظر سے میری راہنمائی بھی کرتے رہتے۔

وہاں اشفاق زیدی اور مسٹر زبیر بھی میرے لیے سرمایۂ افتخار تھے۔ انہی دنوں میں میرے گاؤں کے تین چار اشخاص جیل کے باہر اچانک مل گئے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ گاؤں

میں ۱۹۵۷ء کے رمضان المبارک کی ستائیسویں شب ہونے والے نو قتلوں کے ملزموں میں سے جو تین بری ہو گئے تھے ان کو جسٹس منیر احمد نے نگرانی کی درخواست پر دوبارہ گرفتار کرالیا ہے اور وہ ادھر بہاولپور جیل میں ہیں۔ ان میں سے دو محمد انور اور غلام رسول میرے ہم عمر تھے۔ محمد انور میرا انگریزی کی خوشنویسی کا استاد بھی تھا۔ ان کو قاتلوں نے رائفل تان کر مٹی کے تیل کا کنستر اور لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر مقتولین کے گھر کو آگ لگانے کے لیے ساتھ چلنے پر مجبور کیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ میری رائے بھی یہی تھی۔ عدالت نے بھی ان کو ایک بار تو بری کر ہی دیا تھا۔ میں نے ان سے خود بھی ملاقات کی اور گاؤں سے آنے والے ان کے عزیزوں کی ملاقات بھی کرائی۔ بعد میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن ۱۹۶۲ء میں آٹے کے ساتھ قانون نے گھن کو بھی پیس ڈالا۔

انہی دنوں میں ڈاکٹر خاں صاحب کے قاتل عطا محمد کو جیل میں پھانسی ہوئی۔ آخری ملاقات کے بعد اس کے لواحقین کو جیل کے دروازے پر روتے اور بین کرتے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ میں اس شب محمد خاں کلیم کے پاس رات گئے تک بیٹھا رہا۔ وہ کہتے تھے کہ انھیں بڑا خوف آ رہا ہے۔ واقعی خوف کی بات تھی۔ بڑا بھیانک سناٹا تھا' غیر معمولی پہرے کا انتظام تھا۔ جیل کے محافظ ''خبردار'' کی ایسی ہانک لگاتے کہ سننے والے کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی۔ سارے افسران بھی بڑے مستعد تھے۔ خود داروغہ جیل نماز عشا کے بعد دیر تک مصلے پر بیٹھا رہا۔ جیل کالونی میں ہو کا عالم تھا۔ محمد خاں کلیم بھی میرے ساتھ خاموشی سے اٹھ آئے۔ انھوں نے احمد نواز کی رہائش گاہ پر رات بسر کی۔ مشہور تھا کہ جس رات کی صبح کسی مجرم کو تختہ دار پر لٹکانا ہوتا ہے اس رات جیل کے دوسرے قیدی بھی نہیں سوتے۔ مجرم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور نوافل پڑھتے ہیں۔ ہر ایک کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ مجرم کو انسان سمجھا جانے لگتا ہے۔ اس کا جرم بھلا دیا جاتا ہے۔ میں تصور میں آج بھی اس رات کی سنسناہٹ محسوس کرتا ہوں۔ الامان والحفیظ۔

☆☆

دسویں جماعت کے امتحانات کا موقع آیا تو بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے مجھے ہارون آباد کے سنٹر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تعینات کیا۔ ہیڈ ماسٹر اب اُردو کے کسی مسودے پر کام کر رہے تھے، میں محرری سے تو فارغ تھا لیکن ان کی پہلی تالیفات پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اگر میں امتحان لینے نہ جاؤں تو اس سے ہونے والی آمدنی کی کمی وہ پوری کر دیں گے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ اندر سے میں کس قدر تبدیلی کا خواہاں تھا۔ بچوں سے دور تھا اور اتنے دوستوں کے باوجود میں اپنے

اندر حبس سا محسوس کرتا تھا۔ محمد خاں کلیم بھی اپنے بھائی طفیل ہوشیار پوری کے ذریعے تبادلے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ہزار دانے کی تسبیح محض تبادلے کے لیے پڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کی خوش نویسی اور عاجزانہ زبان کی ہم آہنگی میں انھی سے لیکن اپنی طرف سے کئی خطوط چچا فاروقی کو لکھوا چکا تھا کہ وہ لاہور ڈویژن میں کہیں بھی میرا تبادلہ کرا دیں لہٰذا میں نے ہیڈ ماسٹر سے کہا کہ وہ مجھے امتحان پر جانے دیں تاکہ میں کچھ اس ضمن میں بھی تجربہ حاصل کروں اور واقعی مجھے ایسے تجربات سے گزرنے کا موقعہ ملا جو زندگی بھر مشعل راہ بنانے کے قابل تھے۔

میں امتحانی مرکز پر چوبیس گھنٹے پہلے پہنچنے کی بجائے اڑتالیس گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ وہاں ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ میں خود کو وی آئی پی سمجھنے لگا۔ انھوں نے مجھے افسران معاینہ کے لیے مخصوص مہمان خانہ کھول دیا اور مجھے اپنے پی ٹی آئی کے سپرد کر دیا جوان سے بھی بڑھ کر خدمت گزار اور متواضع نکلا۔ میرے ذہن میں کھٹکا تو ہوا کہ میری یہ پذیرائی خالی از علت نہیں لیکن میں دانستہ خاموش رہا۔ پہلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ مجھ سے امتحان میں کس قسم کی مراعات اور چشم پوشی کی توقعات کر رہے ہیں۔ ان کو وہ سارے ڈھنگ معلوم تھے جن سے وہ ایک نائب نگرانِ اعلیٰ سے استفادہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایسا گھیر اڈالا اور شیشے میں اتارا کہ میں اپنا آپ اور اپنی اوقات بھول گیا۔ میں ان کی بے مثل خدمت کے عوض ان کی تھوڑی بہت رسمی مدد کرنے پر آمادہ بھی ہو گیا۔

اگلے روز میں دوپہر کا پر تکلف کھانا کھا کر جو سویا تو مجھے سہ پہر کے قریب سکول کے چوکیدار نے جگا کر بتایا کہ نگران اعلیٰ ایک بجے دوپہر کی ٹرین سے آ چکے ہیں اور اسکول کے ہال میں باقی عملے کے ساتھ میرے منتظر ہیں۔ بھاگم بھاگ میں ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب خاکی پتلون پر واجبی سی مٹیالے رنگ کی بوشرٹ پہنے ہال میں پہلے سے لگی نشستوں کے دوسرے سرے پر بنی اسٹیج پر مرکزی کرسی چھوڑ کر ایک چوبی صندوق پر بیٹھے ہیں۔ ان کے خدوخال کسی گورکھا فوجی جیسے تھے۔ ان کے نگران اعلیٰ ہونے کی شناخت میں نے صرف اس خیال سے کی کہ ان کے اردگرد امتحانی عملہ بیٹھا تھا اور وہ باری باری ان کا انٹرویو لے رہے تھے۔ میں بھی اسلام علیکم کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی باری پر اپنا تعارف کرایا۔

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر اگلے روز پہلے پرچے کے لیے امیدواروں کی نشستوں کا خاکہ تیار کرنے کو کہا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک بجے سے لے کر اب تک ان کے

پاس ہارون آباد کے تھانیدار، سلوتری، ایکسائز انسپکٹر اور ہیڈ ماسٹر سمیت کئی آڑھتی اور سکول کے اساتذہ آ چکے ہیں۔ چند رول نمبروں سے ترجیحی سلوک کرنے کے عوض انھوں نے کئی اقسام کے لالچ بھی دیے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ اپنے آپ کو پاکستانی نہیں سمجھتے بلکہ اپنے آپ کو ریاستی کہتے ہیں۔ انھیں ان لوگوں کی ذہنیت کا پورا پورا شعور ہے، لہٰذا دامن بچا کر چلنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے آپ سے بھی بہت سے لوگ ملے ہوں، سکول کے مہمان خانے میں قیام کرنا بھی درست نہیں ہے۔ پھر انھوں نے مجھے امیدواروں کی فہرست تھما دی۔

میں چونکا کہ یہ گورکھا خاصا گرگ باراں دیدہ نظر آ رہا تھا۔ پی ٹی آئی نے اعلیٰ قسم کی مہمان داری کے عوض مجھ سے یہ سادہ سی درخواست کی تھی کہ ان کے سکول کے طلبہ کے فلاں فلاں رول نمبر نشستوں کے خاکے میں کہاں آنا چاہئیں اور پھر امتحانی عملے میں سے کس نگران کی ڈیوٹی کس قطار میں لگنی چاہیے۔ انھوں نے میرا کام آسان کرنے کے لیے مجھے نشستوں کا ایک رف سا خاکہ بھی تیار کر دیا تھا۔ چند نگرانوں کے ساتھ مل کر میں نے خاکے سے پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے امیدواران کی نشستوں کا مطلوبہ خاکہ تیار کر کے نگران اعلیٰ کو دیا۔ انھوں نے خاکے کو سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے زبانی مجھ سے پوچھا کہ میں نے ہارون آباد سکول کے امیدواروں، مضافات کے سکولوں کے امیدواروں اور پرائیویٹ امیدواران کو کہاں کہاں اور کس قطار میں بٹھایا ہے۔ میں نے ان کو تفصیل سے سمجھایا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''اچھا بھئی ڈپٹی صاحب، مجھے اس مجوزہ خاکے میں تبدیلی کا حق حاصل ہے کہ نہیں۔''

''حق؟'' میں نے حیرانی سے کہا ''آپ پورے مرکز کے نگران اعلیٰ ہیں۔ جو بھی تبدیلی چاہیں کر سکتے ہیں۔''

''دیکھو، ناراض نہیں ہونا، یوں کرو کہ قطار نمبر ایک کے رول نمبروں کو تیسری قطار میں، تیسری کے دوسری قطار میں اور دوسری کے پانچویں قطار میں کر دو۔ چوتھی کو اپنی جگہ پر ہی رہنے دو۔''

یہ ایک جھٹکا تھا جو میں نے ہی نہیں، سارے نگران عملے نے محسوس کیا۔ بہرحال مجوزہ تبدیلی کے بعد نشستوں کے خاکے کو آخری صورت دے کر امتحانی ہال کے باہر چسپاں کر دیا گیا۔ پھر انھوں نے نگران عملے کی ڈیوٹیاں خاکے کی نقل کے مطابق اپنی صوابدید سے لگائیں اور انھیں اگلے روز ٹھیک آٹھ بجے ہال میں پہنچ جانے کا کہہ کر چھٹی دے دی لیکن مجھے روک لیا۔ نگرانوں کے جا چکنے کے بعد تنہائی میں مجھے سمجھایا کہ میں اپنی رہائش سکول کے مہمان خانے میں رکھوں اور نہ ہی سکول والوں کا

کھانا اور چائے قبول کروں۔ بورڈ سے آخر یومیہ الاؤنس ملے گا اس میں بخوبی گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ سکول والے مقامی لوگوں سے اپنی وابستگیاں نبھانے کے لیے آخر ہمیں کیوں استعمال کریں۔

پرچوں کی حفاظت کے لیے وہ اپنا نائب قاصد اور چوبی صندوق اپنے ساتھ لائے تھے۔ پانی پلانے کے لیے بھی ایک چوکیدار ان کے ہمراہ تھا۔ انھوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں ان کا ہانڈیوال بن جاؤں اور اگر چاہوں تو ان کا نائب قاصد میرا کھانا علیحدہ تیار کر دیا کرے گا۔ پھر ہال کو بند کر کے اور اپنے دونوں آدمی دروازوں پر متعین کر کے انھوں نے صندوق کھولا۔ اس میں سے سوالات پر مشتمل پرچہ جات کے مہر بند لفافے نکالے ان کو میرے ساتھ مل کر امتحانی ڈیٹ شیٹ کے مطابق ترتیب سے رکھا۔ پھر ان کو مقفل کرنے کے بعد صندوق کی چابی اور امتحانی بورڈ کی کوڈ نمبر والی مہر قواعد کے مطابق میرے سپرد کر دی اور اپنی اس ساری کارگزاری کے تصدیقی سرٹیفکیٹ پر میرے دستخط ثبت کرائے اور اپنا تعارف بھی کرایا۔

ان کا نام چودھری کرامت خاں تھا' میو برادری سے تھے۔ ضلع قصور کے کسی گاؤں کے رہائشی تھے۔ برسوں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز رہے تھے اور اب فیروزہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ بطور نگران اعلیٰ امتحان ثانوی تعلیمی بورڈ کام کرنے کا یہ ان کا دوسرا موقع تھا اور وہ پہلے امتحان کے تجربات سے بھرپور استفادہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگلے روز ضابطے کی پوری کارروائی کرنے کے بعد انھوں نے پرچہ جات تقسیم کرائے اور امیدواران سے کہا کہ کوئی بوٹی' کوئی کانا پھوسی اور کسی قسم کی نقل نہیں چلے گی۔ پانی اندر ہی ملے گا۔ پیشاب کی اجازت پرچے کا نصف وقت گزرنے کے بعد ملے گی اور ہال کے ملحقہ کمرے میں اندر ہی سے جانا ہو گا۔ پھر انھوں نے تمام نگرانوں کی ڈیوٹیاں بدل دیں۔ جن امیدواروں کے رول نمبر ان کو خاص خیال رکھنے کے لیے دیے گئے تھے وہ فرداً فرداً ان امیدواروں کے پاس گئے اور ان کو مقررہ جگہ سے اٹھا کر اپنی نشست کے قریب بٹھا لیا اور مجھے کہا "بھئی ڈپٹی صاحب! ان بچوں کا خاص خیال رکھنا ہے۔ ان کو پانی بھی ان کی نشستوں ہی پر ملنا چاہیے۔"

سکول کے درجہ چہارم کے ملازمین سے لے کر ہیڈ ماسٹر تک نے چودھری کرامت خاں کی خشک مزاجی کا مجھ سے شکوہ کیا۔ انھیں ہیڈ ماسٹر نے چائے کی پیالی کی دعوت دی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ انشاء اللہ جس دن امتحان ختم ہو گا، اس دن ان کی خدمت میں حاضری دیں گے اور چائے پئیں گے۔ سکول والوں نے انسپکٹر آف سکولز کی آمد کا بہانہ کر کے مجھے بھی

ہال کے قریب ایک کمرے میں چارپائی ڈال دی۔ انھوں نے ٹھیک ہی کیا۔ میں ان کے کسی بھی معمولی سے معمولی کام نہیں آسکا تھا۔

میں چودھری صاحب کے نائب قاصد کے ذریعے بازار سے ناشتہ' کھانا منگوالیتا۔ خود چودھری صاحب سترہ دن ہال کے اندر ہی رہے۔ گرمی کی پروا نہیں کی۔ اپنا کھانا مسور کی دال اور چپاتیاں خود پکاتے اور نہ جانے کس وقت کھاتے۔ ان کے ملازمین نے بتایا کہ دو تین مرتبہ سبزی بھی پکائی ہے۔ نہائے بھی تو اندر' وضو کیا تو بھی اندر..... کپڑے بھی دھوئے اور سکھائے وہ بھی اندر۔ استری کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ستو' شکر' گھی' دال' نمک' مرچ وہ ساتھ ہی لائے تھے۔ ایک دن ان کے نائب قاصد نے کہا کہ اب تو ہم چودھری صاحب کے عادی ہو گئے ہیں۔ کسی سے ایک پیسے کے بھی روادار نہیں۔ ان کی دیانتداری کی سمجھ آنے کے بعد اب ان کے مخالفین بھی ان کے موافق ہو چکے ہیں۔

اپنے چوکیدار سے روزانہ ہال کی صفائی کراتے اور قواعد کے مطابق روزانہ کی بنیاد پر اجرت ادا کرتے۔ میں جب ہر پرچے کے بعد امتحانی کاپیاں گن کر بنڈل بنالیتا اور وہ متعلقہ ڈاک تیار کر لیتے تو مجھے پڑتال کرنے کو کہتے' میں جلدی جلدی پڑتال کر لیتا تو کہتے' اتنی جلدی؟ پھر خود پڑتال کرتے اور ساتھ ساتھ بتاتے جاتے کہ فلاں جگہ انھوں نے فلاں پر اعتماد کیا تو اس نے کیا کام دکھایا اور فلاں نے کیا گل کھلایا۔ اور فلاں نے کیا کیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پرچے بک کروانے اپنے ملازم کو میرے ساتھ بھیجتے۔ مجھ سے اس موقع پر کوڈ مہر لے لیتے۔ واپسی پر وہ اس مقصد کے لیے مقررہ اجرت کے ساتھ مجھے مہر بھی واپس کر دیتے۔

چند دنوں میں' میں ان سے گھل مل گیا تھا' ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتا۔ ان کی دیانت' خدمت' امانت اور احساس کی تعریف بھی کرتا۔ وہ میرے مشورے بھی تسلیم کرنے لگے لیکن آخری دن تک بکنگ سلپ پر وقت درج کرواتے رہے۔ اسکول والوں نے ہمیں پوچھنا تک چھوڑ دیا تھا۔ اہم پرچہ جات ہو جانے کے بعد ہم پر دباؤ ویسے ہی کم ہو گیا تھا۔

جس روز ہماری ہارون آباد سے واپسی تھی' اس روز چودھری صاحب مجھے لے کر اسکول کے دفتر کی سمت چل دیے کہ آج وہ ہیڈ ماسٹر اور پی ٹی آئی سے چائے پئیں گے اور ان کا شکریہ ادا کریں گے کہ انھوں نے ہم پر کوئی حملہ نہیں کروایا۔ پچھلے سال وہ لیاقت پور میں تھے تو عدم تعاون کے الزام میں ان پر حملہ کراویا گیا تھا۔ سکول میں کوئی شخص بھی موجود نہ تھا۔

''دیکھا بھئی ڈپٹی صاحب!'' انھوں نے کہا ''غرض کے بندے ایسے ہوتے ہیں' میں بداخلاق گندا سہی' ان کو تو اپنے اعلیٰ اخلاق اور روحانی صحت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔''

سمہ سٹہ تک ریل کا سفر میں نے چودھری صاحب کے ساتھ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ''ریاستی'' مدرسین ان سے اس قدر بغض رکھتے تھے کہ ان کی نقل وحرکت کی ڈائری لکھتے تھے۔ ان کی حاضری لگاتے تھے کہ کس وقت سکول آیا' کس وقت گیا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی طرح ہیڈ ماسٹر بھی سکول کے رجسٹر حاضری مدرسین پر آمد اور رفت کا وقت درج کرے۔ کبھی ان کی آرڈر بک گم کر دیتے۔ انھیں ''غیر ملکی'' کہہ کر ان کے متعلق گفتگو کرتے۔ چاہتے تھے کہ ہیڈ ماسٹر بھڑک اٹھے' مگر ہیڈ ماسٹر تو کبھی جوانی میں نہیں بھڑکا تھا اب کیا بھڑکتا۔ بات اتنی تھی کہ انھوں نے اساتذہ کی مرضی سے سکول آنے' چھینک آنے پر چھٹی کرنے اور ذرا دیر کے لیے کام سے جانے کے بعد واپس نہ آنے کی رعایت ختم کر دی تھی۔

ہارون آباد کے قیام کے دوران میری غیر رسمی تعلیم میں جو اضافہ ہوا تھا۔ ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحان میں پہلی مرتبہ کام کرنے سے اس میں وہ چند اضافہ ہوا۔

محکمہ تعلیم کی تبادلہ پالیسی پر تعلیمی سال کے آغاز میں عمل شروع ہوا۔ احمد نواز تبدیل ہو کر لاہور چلے گئے تو ان کی قیام گاہ پر ہونے والی مجلس ختم ہو گئی۔ صدیقی نے بھی تبادلہ کرا لیا۔ محمد خاں کلیم کا تبادلہ بھی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ہو گیا۔ انھوں نے رخصت ہوتے وقت کہا کہ یہ ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ ان کا تبادلہ داتا گنج بخش ہجویریؒ کی بغل میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے میں خاصا اداس تھا۔ کبھی سمیع اللہ خان سے ملنے بھی چلا جاتا۔ ایم۔ اے کا امتحان قریب آ رہا تھا۔ اسی کے متعلق باتیں ہوتیں۔ بورڈ نے مجھے پھر ایف اے کے امتحان میں بہاولپور ہی میں عام نگران کے طور پر کام کرنے کی پیشکش کی۔ مقامی طور پر کام کرنے میں ٹی اے ڈی اے نہیں ملتا تھا۔ پھر میں بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کام کر چکا تھا۔ اب میں بطور عام نگران کام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں نے معذرت کر لی۔

◆◆◆◆◆

(۲۲)

سٹار سرکس

شہر میں سٹار سرکس کی بڑی دھوم مچی تھی۔ ہر کوئی سرکس کی باتیں کرتا نظر آتا۔ سمیع اللہ خان نے ایک ملاقات میں مجھے کہا کہ چلو بھئی! ہم بھی سرکس دیکھ آئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ جن لوگوں کے ہاں میں رہتا ہوں وہاں سے رات کے وقت نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ ان کو تکلیف ہوتی ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں رات ان کے ہاں ہی گزار لوں۔ گرمیوں کا موسم ہے چارپائی اور تکیہ مل ہی جائے گا۔ قصہ کوتاہ کہ ہم دونوں نے ایک شب سٹار سرکس کا آخری شو دیکھا۔

سرکس کو شہر میں آئے دو ہفتے گزر چکے تھے لیکن رش کا یہ عالم تھا کہ ٹکٹ خریدنا دشوار تھا۔ وہ تو سمیع اللہ خان کے ایک واقف سٹال والے نے انتظام کر دیا ورنہ دھکم پیل سے ٹکٹ خریدنا ہمارے بس سے باہر ہوتا۔ سرکس شروع ہوا سینڈوز نے اپنی طاقت کے کمالات دکھائے لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر اور چیخ چیخ کر داد دیتے رہے۔ رنگ ماسٹر نے درندوں کی تسخیر کے شعبدے دکھائے تو ان پر بے تحاشا واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے۔ جھولنے والی پینگوں پر تن سازوں اور بازی گروں کے کرتب دیکھ کر لوگ اش اش کر اٹھے...... آخر میں جب دلمار اس کے رقص کا اعلان ہوا تو جیسے پورے پنڈال کو سانپ سونگھ گیا۔ لوگ دم بخود رقاصہ کا انتظار کرنے لگے۔ وہ چھن کی آواز کے ساتھ پردے سے برآمد ہوئی۔ سمیع نے سرگوشی کی کہ یہ سارا رش اس چھریرے بدن کی رقاصہ کے رقص کے لیے ہے۔ اس نے مشرقی اقدار کی اس سرزمین کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ ان کی بات ٹھیک ہی تھی وہ رقص کم اور جسم کی نمائش زیادہ کر رہی تھی۔ مختصر لباس میں وہ تماشائیوں کے سامنے روشنی کے دائرے میں گھومتی اور ساتھ ہی اپنے جسم کو ایسا بل دیتی کہ اس کا مختصر لباس اس کے جسم سے پھسلنا شروع ہو جاتا اور ایسا لگتا کہ لباس اب گرا کہ گرا لیکن وہ ایک اور بل سے اسے سنبھال لیتی تو تماشائیوں کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔ "استغفر اللہ" سمیع اللہ خان نے کہا میں نے پروفیسر صاحب کو اس رقص پر تبصرہ

کرنے اوراس کی تاریخ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ تہذیبوں کی تاریخ میں دنیا کا قدیم ترین پیشہ جسم کی نمائش رہا ہے۔ اس رقص کے ڈانڈے جنگلی قبائل کے رقصوں سے ملتے ہیں۔ بہاولپور شہر میں چونکہ عورت دہلیز سے باہر نہیں نکلتی یہاں کے مرد اس رقاصہ کو دیکھ کر جنونی ہو گئے ہیں۔ پہلے شو میں بے شمار طلبہ بھی ہوتے ہیں اس لیے انھوں نے اس آخری شو کا انتخاب کیا تھا۔ رقص اس قدر دلفریب تھا کہ میرے اندر کا شیطان مجھے ترغیب دینے لگا کہ میں اس رقص کو ایک بار پھر دیکھوں کیونکہ ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی ہوس پیدا کرنا ہی رقاصہ کا کمال تھا۔

☆☆

میں امتحان دینے کے لیے لاہور آیا تو میں احتراماً اپنے چچا فاروقی سے بھی ملا اور ان سے پوچھا کہ انھوں نے میرے تبادلے کے لیے کیا کیا ہے؟ میرا اب بہاولپور میں رہنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ بیوی بچے رشتہ دار عزیز اور سب دوست بھی ادھر ہی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر کہنے لگے "یار! کوشش تو بہت کی ہے لیکن لاہور ڈویژن میں کوئی اسامی ہی خالی نہیں ہے۔" کارپوریشن کے دفتر (ٹاؤن ہال) سے محکمہ تعلیم کا دفتر قریب ہی تھا۔ وہ دفتر سے اٹھے اور مجھے ساتھ لے کر لاہور ریجن کے آفیسر ایڈمنسٹریشن خواجہ عبداللہ سے ملے۔ ان کی گفتگو سے میں سمجھ گیا کہ چچا فاروقی ان سے ملتے رہے ہیں۔ اب بھی خواجہ صاحب نے کہا کہ لاہور ڈویژن کے سکولوں میں تو کوئی اسامی اس وقت بھی خالی نہیں لیکن ابھی کل ہی سنٹرل ماڈل سکول کے سیکنڈ ماسٹر شفقت حسین کا انتقال ہو گیا ہے اوران کی اسامی خالی ہے لیکن سنٹرل ماڈل سکول میں تعیناتی اسی مدرس کی ہوتی ہے جو ہیڈ ماسٹر سکول اور پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج کے انتخاب پر پورا اترے۔ چچا فاروقی کو علم تھا کہ وہاں خواجہ غلام نبی بٹ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ انھوں نے کہا "بس پھر تو کام بن جانا چاہیے۔ خواجہ کو خواجہ ملے کر کر لمبے ہاتھ...... ذرا ہاتھ بڑھائیے انھیں فون کیجئے اور انھیں برخوردار جا کر مل آتا ہے۔" انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الغرض خواجہ عبداللہ نے خواجہ غلام نبی بٹ سے فون پر بات چیت کی۔ انھوں نے کہا کہ امیدوار کو بھیج دیں۔ میں ہیڈ ماسٹر سے ملا تو انھوں نے میرا اسار اماضی کھنگالا اور پھر مجھے قائم مقام پرنسپل خواجہ ہارون صاحب کے پاس لے گئے۔ خواجہ ہارون صاحب نے تاریخ کے بارے میں کچھ عام سے سوالات کیے جن میں سے ایک سوال مجھے آج بھی یاد ہے۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ لاہور میں کون کون سے دو بادشاہ کہاں کہاں دفن ہیں؟ میں نے ان کے جملہ

سوالات کے صحیح جوابات دیے تو انھوں نے مجھے اگلے روز ہیڈ ماسٹر سے مل لینے کو کہا۔

اگلے روز ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ ان کے سکول کا ایک مدرس منظور عالم شاہ جو ایم اے بی ایڈ ہے چھ ماہ کی عارضی تقرری پر ایویلیوایٹرز کالج (جس کو پیدائشی اے ڈی آئی بنانے والا کالج بھی کہا جاتا تھا) میں لیکچرار ہے۔ اس کا چھ ماہ کا عرصہ ختم ہو رہا ہے لہٰذا وہ واپس آ رہا ہے اور یہ کہ اس کا استحقاق فائق ہے۔ میں مایوسی کے عالم میں چچا فاروقی کے پاس پہنچا۔ انھیں ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ انھوں نے پھر خواجہ عبداللہ سے رابطہ کیا تو خواجہ عبداللہ نے کہا کہ ہیڈ ماسٹر ہمیں ٹال گیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ منظور عالم شاہ کو مزید چھ ماہ مل چکے ہیں اور وہ اپنی اسامی پر واپس نہیں آ رہا۔

چچا فاروقی نے تھوڑا سا سر کو کھجایا اور کہنے لگے کہ ان کا ایک دوست عارف راولپنڈی میں راولپنڈی امپروومنٹ ٹرسٹ کا سیکرٹری ہے۔ وہ جب کبھی پہلے لاہور آتا تھا تو ان کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ پچھلے دنوں وہ انھیں لاہور میں ملا تو اس نے بتایا اس دفعہ وہ اپنے عزیز خواجہ ہارون پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ان کا مطلب تھا کہ عارف صاحب پرنسپل ہارون صاحب سے میری سفارش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے عارف صاحب کے نام ایک رقعہ دیا اور میں رات کے آٹھ بجے راولپنڈی میں ان کے گھر ان سے جا ملا۔ انھوں نے کہا کہ فاروقی صاحب کے پاس فون تھا وہ مجھ سے بات کر لیتے۔ آپ کو تکلیف ہوتی' نہ آنے جانے کا خرچ برداشت کرنا پڑتا۔

''میرا آنا کام کی اہمیت کے اظہار کے لیے ضروری تھا۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے عزیز من! لیکن خواجہ ہارون صاحب سے میرے تعلقات نیازمندانہ ہیں۔ میں سفارش کرنے کی پوزیشن میں نہیں' انھیں عرض ہی کر سکتا ہوں اور وہ بھی انکسارانہ...... وہ مجھے ایک کام سونپ گئے ہیں میں نے تین دن بعد ان کو فون کرنا ہے ساتھ ہی تمہارے لیے درخواست بھی کروں گا۔''

واپس لاہور آ کر میں نے چچا فاروقی کو ساری صورت حال بتائی تو انھوں نے کہا ''اچھا پھر اللہ مالک ہے۔ تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔''

اس تگ و دو میں میں نے امتحان بھی نہیں دیا۔ میری خواہش تھی کہ اگر مجھے سنٹرل ماڈل سکول میں آنے کا موقع مل جائے تو یہ میری پیشہ ورانہ تربیت میں سنگ میل ثابت ہو گا۔ تین دن کے لیے میں گاؤں چلا گیا۔ تیسرے روز واپس آ کر میں سیدھا پرنسپل ہارون کے دفتر حاضر ہوا تو پتہ چلا کہ وہ گھر پر ہیں۔ میں ان کی کالج کے عقب میں واقع سرکاری کوٹھی پر پہنچا۔

اندر چٹ بھیجی ''قاضی ذوالفقار احمد جسے راولپنڈی سے عارف صاحب نے بھیجا ہے۔'' پرنسپل فوراً اندر سے باہر تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے سکول میں حاضری رپورٹ دے دی ہے؟ انھوں نے میرے بارے میں تین روز قبل ہی ہیڈ ماسٹر کو کہہ دیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جس وقت میں عارف صاحب سے مل کر نکلا، کہیں اسی وقت خواجہ ہارون نے عارف صاحب کو اپنے کام کے سلسلے میں فون کیا تو انھوں نے بھی میرے لیے تبادلے کی سفارش کر دی۔''

میری قسمت کہ تین دن بعد آنے والا فون اسی وقت عارف صاحب کو آ گیا ورنہ ہیڈ ماسٹر کا ارادہ نہیں تھا۔ احکامات تبادلہ اور وہ بھی اس وقت کی اعلیٰ منفرد درسگاہ میں' لے کر میں اللہ کی مہربانیوں کا شکر ادا کرتا ہوا واپس بہاولپور پہنچا۔ اب ہیڈ ماسٹر یوسف علی قائم مجھے فارغ کرنے سے انکاری ہو گئے۔ میں نے ملک عبدالرحمٰن کے گھر کے قریب انسپکٹر دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ملک منظور احمد کو اکثر دیکھا تھا۔ میں نے ملک عبدالرحمٰن سے کہا کہ وہ ملک منظور احمد سے کہہ کر مجھے سکول سے فارغ کرائیں۔ ملک منظور احمد نہ صرف قد کاٹھ میں ہی دبنگ آدمی تھے اپنے کام کے بھی ماہر اور قواعد و ضوابط کے پابند تھے۔ انھوں نے دفتر جاتے جاتے راستے میں رک کر یوسف علی قائم کو کہا کہ وہ ڈائریکٹر لاہور ریجن کے آرڈرز کی توہین کر رہے ہیں جو شخص سنٹرل ماڈل سکول میں تبدیل ہو کر جا رہا ہے یقیناً وہ بھی کوئی معمولی شے نہیں ہوگا لہٰذا اسے فوراً فارغ کر دیں تو مناسب بات ہوگی۔

چونکہ میں نے لاہور آنا تھا اس لیے میں کوئٹہ پسنجر پر بیٹھا۔ صرف سمیع مجھے الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک آئے۔ میں بڑا خوش تھا اور سمیع کی نوازشوں کا بار بار ذکر کر رہا تھا مگر وہ اداس تھے۔ میں انھیں لاہور آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اپنے سفر کے دوران میں بہاولپور میں گزارے ہوئے سال کے بارے میں سوچتا اور اپنا محاسبہ کرتا رہا۔ کیسے میرا تبادلہ علی پور سے بہاولپور میری خواہش کے مطابق قدرت نے کیا اور کیسے قدرت ہی نے مجھے محمد خاں کلیم کے تعاقب میں ان ہی کی طرح داتا گنج بخش ہجویری کی بغل میں بھیج دیا تھا۔ پہلے مرحلے میں مجھے مرحوم مدرس کی جماعت ملی تھی اور اب دوسرے مرحلے میں ایک مرحوم مدرس کی اسامی۔

☆☆

میں نے ۳رجون ۱۹۶۱ء کو گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول' لوئر مال لاہور میں حاضری دی اور میں اس سکول میں چھ دسمبر ۱۹۶۳ء تک رہا۔ سنٹرل ماڈل سکول کی حیثیت اس وقت پنجاب بھر کے سرکاری اسکولوں میں اول درجے کے سکول کی تھی۔ لاہور میں اردو میڈیم میں پڑھانے

والے آج جتنے بھی مشہور سکول وجود میں آ چکے ہیں ۶۱ء میں ان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ روساء، امرا، جاگیرداروں اور افسران کے بچے بھی اسی سکول میں پڑھتے تھے۔ مشہور پنجابی ادب کے محقق اور شاعر شریف صابر نے مجھے سنٹرل ماڈل سکول میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا ''بھا جی' گھبرانانئیں 'بس انج سمجھو جس طراں تہاڈی شادی کسے راجے مہاراجے دے گھر ہوگئی اے۔''

بہاولپور میں قیام کے دوران میں نے کالج میں لیکچررشپ کے لیے بھی ایک درخواست دی تھی۔ چند دن بعد ہی مجھے بہاولپور سے ہوتے ہوئے ایک لفافہ سنٹرل ماڈل سکول میں موصول ہوا جس میں مجھے ایڈہاک بنیادوں پر ایس ای کالج بہاولپور میں لیکچرر لگایا گیا تھا۔ اب حضرت ذوق کی دلی کی طرح مجھے لاہور چھوڑنا گوارا نہ تھا لہٰذا میں نے اس پیشکش سے باوجود دوستوں کی فہمائش کے فائدہ نہیں اٹھایا۔

ابتدا میں مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے لائبریری میں بٹھا دیا کہ میں وہاں اپنے انچارج اساتذہ کے ساتھ مطالعے کی گھنٹی میں آنے والے طلبہ کی نگرانی کروں۔ سکول کے چلن اور طور طریقے سمجھوں۔ بی۔ ٹی کے دوران ہی میں مَیں سکول میں طویل تدریس کی مشق کر چکا تھا ۔اس لیے میں کچھ کچھ سکول کو سمجھتا بھی تھا۔ لائبریری میں اچھے رسائل بھی آتے تھے۔ میں ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔ کبھی الماریوں میں سجی کتب کو دیکھتا۔ جو کتاب پسند آ جاتی اسے مطالعے کے لیے گھر بھی لے جاتا۔ پھر جولائی کے شروع ہی میں تعطیلات موسم گرما آ گئیں، جو میں نے اپنے گاؤں میں سب اہل خانہ کے ساتھ گزاریں۔ سیالکوٹ کا چکر لگایا اور دیرینہ احباب سے ملا۔ محبتیں تازہ کیں۔ کنوارے رہ جانے والے منجھلے بھائی کی شادی سے بھی فارغ ہوا۔

میرے دوست اصغر علی گردیزی اسسٹنٹ رجسٹرار محکمانہ امتحانات تعینات ہو چکے تھے اور نظامت تعلیم لاہور ریجن پنجاب میں ہی ان کا دفتر تھا۔ سکول سے نکل کر میں ان کے پاس جا بیٹھتا۔ اس طرح میری شناسائی محکمہ تعلیم کے علاقائی اور صوبائی دفتر میں بھی بڑھنے لگی۔ کچھ وقت میں نگینہ بیکری انارکلی میں گزارتا۔ وہاں اس وقت اہل علم اور دانشوروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ساتھ ہی مال روڈ پر چائنیز لنچ ہوم میں بھی اہل علم وسیاست کی نشست روزانہ ہوتی۔ حلقہ ارباب ذوق کا اجلاس وائی ایم سی اے کی عمارت میں ہوتا تھا۔ میں ادبی حلقوں میں آنے جانے لگا تھا۔ فہم وادراک کی سرحدیں پھیل رہی تھیں۔

سکول میں مجھے مستقلاً چھٹی اور ساتویں جماعت میں تدریسی پیریڈ دیے گئے۔

لائبریری کی ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ کسی جماعت کا انچارج نہیں بنایا گیا۔ ایسی ذمے داریاں سینئر اساتذہ کو دی جاتی تھیں میں سکول کے علاوہ ملازمت میں بھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کا تھا اور خصوصی طور پر یہ اللہ کا کرم تھا کہ میں اتنی بڑی عظیم درسگاہ میں تھا جہاں ہونا اعزاز کی بات تھی۔

یہاں بڑے بڑے نادر روزگار اساتذہ تھے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ابوالفتح تدریسی کتابوں کے مصنف اور بہترین استاد تھے' سادگی میں امتحان والے چودھری کرامت ناظم امتحان برائے میٹرک ہارون آباد سے بھی آ گے تھے۔ ان کے توسط سے میں نے ان ایام میں ''سیکنڈری سکول' اردو گرائمر اینڈ کمپوزیشن'' نامی پہلی درسی کتاب تدوین کی جسے تاج بک ڈپو نے شائع کیا۔ میں نے اس وقت تک شائع شدہ تمام ایسی کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی تالیف کو ان سب سے بہتر اور جامع بنایا۔ اسے بڑی پذیرائی ملی لیکن وہ اب دستیاب نہیں۔ آثم صاحب بھی ادیب اور معلم تھے' اردو زبان کی صرف نحو سے خوب خوب واقف تھے۔ طاہر شادانی کا نام بھی اردو فارسی میں بڑا محترم تھا۔ فاروق صدیقی سائنس کی کتابوں کے مصنف اور بہترین استاد تھے۔ شریف صابر پنجابی شاعر اور محقق تھے انھوں نے ہیر وارث شاہ پر تحقیق کر کے ثابت کیا کہ اصل ہیر میں تحریف کر کے اس میں کثافت بھری گئی ہے۔ انھوں نے ہیر کو پاکیزہ کیا۔ ایسے لوگوں کی ہم جلیسی میں میں بھی آ گے بڑھ رہا تھا۔ نظم و نسق مدرسہ اور تنظیم مدرسہ کے پہلوؤں میں بھی غیر شعوری تربیت ہو رہی تھی۔

شریف صابر نے مجھے زبردستی رائٹرز گلڈ کا ممبر بنوایا جس کے مثبت نتائج کئی سال بعد علامہ اقبال ٹاؤن میں گلڈ کے ذریعے ایک پلاٹ الاٹ ہونے کی ٹھوس صورت میں برآمد ہوئے۔ اسی پلاٹ پر اللہ رب العزت نے مجھے رہن بسیرا بنانے کی کٹھن منازل سے کامیابی سے گزارا۔

گردیزی صاحب نے مجھے وقت سے پہلے بتایا کہ ورنیکلر فائنل امتحان کا نام مڈل سٹینڈرڈ امتحان رکھا گیا ہے۔ نصاب اور طریقہ امتحان میں تبدیلی لائی گئی ہے۔ میں نے پوری نئی سکیم کی ایک نقل حاصل کر لی۔ اس اطلاع سے مجھے ایک بات سوجھی۔ کسی کو بتائے بغیر میں نے جملہ مضامین کا نمونے کا ایک ٹیسٹ پیپر برائے امتحان مڈل سٹینڈرڈ تیار کیا اور اسے خود چھپوایا۔ قیمت پانچ روپے رکھی۔ پورے پنجاب کے مڈل اور ہائی سکولوں میں ٹیسٹ پیپر کے بارے میں ایک طبع شدہ تعارفی خط بھیجا کہ ۱۹۶۲ء میں ہونے والا مڈل سٹینڈرڈ امتحان کیسے ہو گا؟ میرا اٹھنا بیٹھنا نگینہ بیکری کے دوستوں کے توسط سے گیلانی پریس میں بھی تھا۔ کسی وقت اس پریس میں ہندو اخبارات بھی چھپا کرتے تھے۔ اپنے وقت کا بہت بڑا پریس تھا۔ لیکن اب

سمٹ کر ایک کھلی سی نشست گاہ ہی رہ گیا تھا۔ وہاں ایک کاتب منشی غلام فرید بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے مشورے سے ٹیسٹ پیپر پر گیلانی پریس کا پتہ دیا۔ پنجاب بھر سے نمونے کے ٹیسٹ پیپر کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ ایک ہزار کا ایڈیشن بذریعہ ڈاک جلد ہی ختم ہو گیا دوسرا ایڈیشن چھاپا وہ بھی بک گیا۔ مطالبہ جاری رہا لیکن میں نے تیسرا ایڈیشن شائع نہیں کیا۔ منشی فرید کی کچھ خدمت کی، کچھ گیلانی پریس کے مالک عبدالحلیم شاہ گیلانی کی۔ پھر بھی مجھے پانچ ہزار سے زائد روپے بچے۔ مجھے پہلی مرتبہ معلومات کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔

طباعت و اشاعت کے سلسلے میں میری راہنمائی رانا رحمٰن ظفر نے کی جو پبلشرز یونائیٹڈ میں خط و کتابت کے ذریعے کتب کی فروخت کے شعبے کے منیجر تھے۔ ان کا یہ بھی احسان ہے کہ انھوں نے مجھے نادر کتب پڑھنے کی راہ پر ڈالا۔ ان کے تعلقات پنجاب یونیورسٹی اور پنجاب پبلک لائبریری کے لائبریرین صاحب سے ذاتی نوعیت کے تھے۔ لاہور میں ان سا مخلص دوست مجھے میسر نہیں آیا۔ ان کی مصاحبت میں پچھلے تمام دوست پیچھے رہ گئے۔ وہ ہر فن مولا شخص تھے۔ ہر قسم کی مجلس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ سیاست دانوں سے لے کر شعبدہ باز روحوں کے شکاری روحانی اور شیطانی عامل سب ان کو جانتے ہی نہیں مانتے بھی تھے۔ آخری دم تک وہ میرے بے مثل دوست رہے۔ میری غیر رسمی تعلیم میں ان کی دوستی نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔

☆☆

۱۹۶۲ء میں انڈیانا یونیورسٹی امریکہ کے تعاون سے پنجاب یونیورسٹی میں ادارہ تعلیم و تحقیق کی بنیاد رکھی گئی۔ صبح و شام کی ایم ایڈ کی کلاسیں لارنس روڈ پر کرائے کی عمارت میں شروع ہوئیں۔ ابتدائی اور ثانوی ایم ایڈ کی دو باقاعدہ جماعتوں میں پنجاب بھر سے اساتذہ داخل ہوئے جبکہ شام کی کلاسوں میں لاہور اور گردونواح کے اساتذہ نے داخلہ لیا۔ میں نے بھی شام کی ایم ایڈ (ثانوی) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ تمام اساتذہ امریکن یونیورسٹی انڈیانا سے آئے ہوئے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر مسٹر کرس ڈبلیو جنگ تھے۔ سال کے دوران ہی میں نیو کیمپس میں ادارہ تعلیم و تحقیق کی عمارت کا ایک بلاک تعمیر ہوا تو کلاسیں وہاں لگنے لگیں۔ ایک زرد رنگ کی بس ہمیں مختلف مقامات سے نیو کیمپس لے جاتی اور واپس لاتی۔ کوئی معاوضہ یا فیس نہ تھی۔ کتب تک لائبریری سے ملتیں۔ نوٹس وغیرہ نئی فوٹو سٹیٹ مشینوں سے چھپ کر ملتے۔ اس وقت ابھی فوٹو سٹیٹ کی مشین مارکیٹ میں نہیں آئی تھی۔

ہر جماعت میں تعلیم مخلوط تھی۔ خواتین اساتذہ بھی گہری دلچسپی سے ایم ایڈ کی کلاسوں میں شامل ہوئی تھیں۔ امریکن چھتری کے نیچے مخلوط تعلیم میں خاصی گہما گہمی اور دلچسپی تھی۔ کوئی فرد بھی تعلیمی لحاظ سے بی اے، بی ایڈ سے کم نہ تھا' لہٰذا خالص بالغ نظری کے ماحول میں ہم اپنے کردار اور عمل کو سنورتا محسوس کر رہے تھے۔ آخر تعلیم کا مقصد اور کیا ہے؟ یہ اگر ہمیں بالیدگی عطا نہ کرے تو پھر تعلیم کیسی؟ کوئی سکینڈل نہیں تھا۔ بہن بھائیوں جیسے رشتوں میں ہم اپنا تفویضی کام تیار کرتے اور ٹیوٹوریل گروپوں میں شریک ہوتے۔ امریکن اساتذہ بھی اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ ہمارے دوست' بہی خواہ اور مہربان معلم ہیں۔ ادارہ تعلیم و تحقیق کے حوالے سے ان کا کوئی بین الاقوامی سیاسی ہدف نہیں۔

☆☆

یہ وہ دور تھا جب مجموعی طور پر معاشرے میں ''ٹیڈی ازم'' وبا کی طرح پھیل رہا تھا۔ اونچے طبقے کے مرد' عورتیں اور بچے تن کے کپڑوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ بعض پرانے لوگ یہ کہتے تھے کہ بچوں نے ٹیڈی لباس کے لئے کھلے کپڑے پہنے پہلے تھے اور سلائی بعد میں کرائی تھی۔ ایسی ہی پتلون پہنے چھٹی جماعت کا ایک لڑکا سلطان عرف ٹیٹو کمرہ جماعت میں ''ٹوسٹ'' کر رہا تھا۔ وہ ایک بیوروکریٹ کا لڑکا تھا۔ مجھے کمرہ جماعت میں داخل ہوتے دیکھ کر شرما کر رہ گیا۔ میں نے اسے کہا ''کوئی بات نہیں' مجھے بھی اپنا فن دکھاؤ۔'' چھٹی جماعت کا طالب علم مزید جھینپا۔ میرے بعد اس جماعت میں مرزا عبدالعزیز صاحب کا پیریڈ تھا اور وہی اس کلاس کے انچارج تھے۔ میں نے جماعت سے جاتے جاتے مرزا صاحب سے کہا کہ آپ کی جماعت کا ٹیٹو بڑا اچھا رقاص ہے۔ آپ نے کبھی اس کے فن کا مظاہرہ دیکھا ہے؟

مرزا صاحب نے نہ جانے اس سے کیا کہا اور کیسے بات کی کہ چند روز بعد وہ ہم دونوں کے لیے اپنے گھر سے دعوت نامہ لے آیا کہ ہم اس کے ہاں آئیں، وہ ہمیں وہاں ٹوسٹ دکھائے گا۔ مرزا صاحب نے پوچھا کہ یہ دعوت نامے وہ از خود لایا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ اس دن کے کلاس میں اپنے ٹوسٹ کرنے کی بات اس نے اپنی ماما سے کی تھی اور یہ دعوت نامے اس کی ماما نے بھیجے ہیں تاکہ ہم اچھی طرح ''ٹوسٹ'' دیکھ سکیں جوان کے ہاں ایک پارٹی میں ہونے والا تھا۔

میں تو جھجک رہا تھا لیکن مرزا صاحب جانے پر اور مجھے ساتھ لے جانے پر مصر تھے۔ اس طالب علم کی ماں مرزا صاحب سے اپنے بیٹے کی تعلیم کے سلسلے میں کئی بار مل چکی تھیں۔ وہ مجھے کہہ رہا

تھا کہ لاہور آئے ہو تو لاہور کا گلبرگ رنگ بھی دیکھو۔ کارڈ میں لکھا تھا کہ سوئٹزر لینڈ سے آنے والے مسٹر اینڈ مسز...... کے اعزاز میں ملن پارٹی میں آپ کی شمولیت باعث رونق ہو گی۔''

میں اور مرزا بس کے ذریعے جب اس طالب علم کے گھر پہنچے تو ٹیٹو ہمارا منتظر تھا۔ اس نے بڑی خوشی سے ہماری آمد کے متعلق اپنی ماما اور پاپا کو بتایا۔ ابھی ان کے دوسرے مہمان آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز طلبہ سے پولیس کی مڈ بھیڑ میں دو طلبہ کے ہلاک ہونے کی غیر مصدقہ خبر روزنامہ ''کوہستان'' میں چھپی تھی۔ اس خبر پر شہر میں کافی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ سگار پیتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو جانے والے صاحبِ خانہ سے ہماری گفتگو کا آغاز اسی خبر سے ہوا۔ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کی بیگم بار بار ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھی بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ میں گاہے گاہے نظر چرا کر ان کو بھی دیکھ لیتا۔ ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش پر بھی نظر ڈالتا اور پھر صاحب خانہ سے کوئی سوال پوچھ لیتا۔ ان کے جوابات مختصر اور محتاط انداز لئے ہوئے تھے۔

آدھ گھنٹے کے بعد ان کے مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ ہر ایک کے ساتھ اس کی بیگم تھی۔ مجھے تو وہ سارے کسی اور ہی دنیا کے لوگ لگ رہے تھے۔ میں اور مرزا ان کے درمیان نظر بٹو کی حیثیت رکھتے تھے۔ بیگمات نے اپنی بساط کے مطابق بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ وہ جب آپس میں ملتیں تو ایک دوسرے سے اشاروں سے باتیں کرتیں ان کے انداز تخاطب سے شوخیاں جھلکتیں۔ اپنے مرد کے علاوہ وہ کسی دوسرے مرد سے باتیں کرتیں تو اداؤں کے طوفان کے ساتھ۔ نگاہوں سے حسن طلب جھانکتا، قہقہوں کے دوران ان کے دانت لبوں میں ایسے نظر آتے جیسے موتیے کی کلیاں اور گلاب اکھٹے رکھ دیے گئے ہوں۔ لباس اس قدر چست تھے کہ ان کو بیٹھتے وقت پہلوؤں کی لگی زپیں کھولنا پڑتیں۔ مرزا جب کوئی نیا جوڑا آتا تو مجھے کہنی مارتے کہ دیکھو کیسے کیسے ٹیڈی لباس ہیں۔

لگتا تھا کہ سب مدعوئین ان کے بارے میں پوچھ رہے تھے جن کے اعزاز میں یہ ملن پارٹی ہو رہی تھی۔ صاحبِ خانہ کی جواں سال شادی شدہ صاحبزادی پانوں کی طشتری اٹھا کر لائیں۔ وہ ہر ایک کے سامنے جاتیں اور جسے طلب ہوتی وہ پان لے لیتا۔ جب وہ میرے قریب آئیں تو انھوں نے خاص طور پر پوچھا ''آپ بھی پان لیں گے ماسٹر صاحب؟'' وہ نہ پوچھتیں تو میں ورق لگا میٹھا پان کھانے کا منتظر تھا لیکن جب انھوں نے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ نہیں...... انھوں نے کیوں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں بھی پان کھاؤں گا؟ کیا ایک ماسٹر

پان بھی نہیں کھا سکتا؟ کیا پان بھی کوئی عجیب یا ممنوعہ شے تھی؟ مرزا نے تو میری تقلید میں یہ تک کہہ دیا کہ اس نے تو کبھی پان کھایا ہی نہیں حالانکہ میرے ساتھ وہ کئی بار بھاٹی گیٹ کے باہر دارالماہی کے ساتھ والی دکان سے پان کھا چکے تھے۔

اسی شب آٹھ بجے ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ علامہ علاؤ الدین صدیقی کو پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کر دیا گیا ہے۔ توبہ استغفار اس معزز طبقے نے اس خبر پر وہ غلیظ تبصرہ کیا کہ مسلمان علماء سے ان کی دلی نفرت کھل کر سامنے آ گئی۔ انھوں نے حکومت کی کوتاہ اندیشی کا خوب ماتم کیا کہ لے آئے مُلّاں کو اوپر، دیکھنا کیا گل کھلاتا ہے؟ کوئی پوچھے اس کے سوا اور کوئی سکالر دستیاب نہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور جوڑا اندر آیا۔ مرد تو یونہی عام مردوں جیسا تھا لیکن اس کے ساتھ خاتون بڑی پروقار اور سادہ تھی۔ کوئی بناؤ سنگھار نہیں تھا۔ خواتین اس کے احترام میں کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے سب کو سلام کیا اور سفید ساڑھی سمیٹ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ صاحب خانہ کی بیگم کی فرمائش پر اور معزز مہمانوں کے انتظار کی کوفت کو ختم کرنے کے لیے ایک دبلی پتلی خاتون نے فیض احمد فیض کی غزل ''دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے'' سنائی۔ آواز کے تاثر اور ترنم کو سب نے پسند کیا۔ داد بھی دی' لیکن بعض نے ان اشعار کا مطلب پوچھنا شروع کر دیا۔ کسی نے اردو میں' کسی نے انگریزی میں وضاحت کی لیکن پوچھنے والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بحث سی چل نکلی تو سب سے آخر میں آنے والی متین سنجیدہ خاتون نے حرف آخر کے طور پر کہا کہ دراصل شعر خواہ کسی زبان کا ہو اس کا ترجمہ اس کی اصل روح کو پیش کرنے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ فیض کو اردو میں ہی سمجھنا ہو گا۔

''اگر اردو نہ آتی ہو تو پھر کیا کیا جائے۔'' پہلو بدل کر ایک کمسن بیگم نے پوچھا۔

''تو اردو سیکھی جائے'' خاتون نے جواب دیا۔

آخر وہ مہمان بھی تشریف لے آئے جن کے اعزاز میں محفل سجائی گئی تھی۔ ایک مرد کے ساتھ دو نوعمر لڑکیاں تھیں۔ سب کھڑے ہو گئے۔ لڑکیوں نے خواتین کے علاوہ مردوں سے بھی ہاتھ ملائے اور ہر ایک کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ محفل میں ہم دو استاد بھی ہیں ورنہ شاید وہ پوچھتیں۔ ''ہاتھ ملائیں گے ماسٹر صاحب؟''

جلد ہی کھانے کا اعلان ہوا۔ سب بھوک محسوس کر رہے تھے۔ کمرۂ طعام میں سب بے

تکلفی سے چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ میں اور مرزا دونوں ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک کابوس نے ہمیں اندر ہی اندر دبوچ رکھا تھا۔ اس موقع پر وہ سفید ساڑھی والی سنجیدہ خاتون ہمارے کام آئیں۔ انھوں نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم ایسی دعوتوں کے عادی نہیں ہیں اور ہمارے ساتھ بیگمات بھی نہیں جو پلیٹیں سجا کر ہمیں تھما جاتیں۔ ہم تو اُن بیویوں کے شوہر تھے جن کو جہاں چھوڑ آئے تھے وہاں ہی پڑی کڑھ رہی ہوں گی...... ہم مشرقی پروقار خاتون کے ممنون ہوئے کہ انھوں نے ہمیں دو پلیٹوں میں بہترین کھانا ڈال کر دیا۔

کھانے کے بعد مہمان لڑکیوں سے درخواست ہونے لگی کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ بڑی روشنیاں گل کر کے ڈھانپی ہوئی روشنیاں جلائی گئیں۔ ریڈیو گرام پر مغربی موسیقی کی دھن بجنے لگی۔ بعض افراد نے مخصوص مشروب انڈیلے بعض نے خود کو سوڈا واٹر تک محدود رکھا۔ تالیاں بجیں اور ان مہمان لڑکیوں نے ٹوسٹ شروع کیا۔ موسیقی کی ہم آہنگی میں انھوں نے اپنے وجودوں کو ایسے ایسے بل دیئے اور گھمایا کہ ان کے پس منظر میں سب کچھ ہی گھومتا نظر آنے لگا۔ گویا کہ انھوں نے حاضرین کے دماغوں کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ ریڈیو پروگرام پر ریکارڈ خود بخود بدل جاتے اور نئی دھن نئے طوفانوں کا باعث بنتی۔ ایک دور ختم ہوا تو وہ نڈھال ہو کر اپنے ساتھ آنے والے مرد کے پہلو میں گر گئیں۔ جس نے ان کو مخصوص مشروب کے ننھے ننھے بلوریں جام پیش کئے۔

صاحب خانہ نے بڑی روشنی جلائی تو سفید ساڑھی والی خاتون اور اس کے شوہر نے جانے کی اجازت چاہی۔ انھیں روکنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ نہیں رکیں۔ میں ذرا باتھ روم تک جانا چاہتا تھا میں بھی کھڑا ہوا تو صاحب خانہ نے مجھے کھڑا دیکھ کر کہا ''آپ بھی تشریف لے جا رہے ہیں؟'' وہی پان والی بات ہوگئی۔ اس وقت میں ہاں نہیں کہہ سکا تھا اب میں نہ نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ میری نگاہوں میں پیرس بسا ہوا تھا اور ہم تو آئے ہی ٹوسٹ دیکھنے تھے۔ میں نے رسماً اجازت چاہی۔ مرزا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں کسی نے رکنے کو نہیں کہا۔ صاحبِ خانہ ہمارے ساتھ باہر تک آئے اور سفید ساڑھی والی خاتون سے کہا کہ مزنگ چونگی تک ماسٹر صاحبان کو بھی لیتی جائیں۔ یہ سنٹرل ماڈل میں ٹیٹو کے استاد ہیں۔

◆◆◆◆◆

(۲۳)

تعلیمی انتظامیہ میں

جب یکم جولائی ۶۳ء کو میری ملازمت تین سال کی ہوگئی تو میرے اندر نائب ضلع انسپکٹر برائے مدارس بننے کی میری دیرینہ خواہش کروٹیں لینے لگی۔ تین سال سے کم ملازمت والے انگریزی مدرس کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی جاتی تھی۔ اس کے حصول کے لیے جوئے شیر بھی لانا پڑتی تھی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار گردیزی سے کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ متعلقہ ایسٹیبلشمنٹ اسسٹنٹ کو نعمت کدہ میں بلائیں گے۔ وہاں تم خود ہی ان سے بات کر لینا۔ پروگرام طے ہونے کے بعد متعلقہ اسسٹنٹ سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ بس یہ سمجھو کہ تمہارا نام میرے سینے پر لکھا جا چکا ہے، جونہی کوئی داؤ لگا میں تمہیں افسر بنا دوں گا۔

دسمبر آ گیا تو ایک دن متعلقہ اسسٹنٹ میرے پاس سکول میں آیا اور بتایا کہ اس نے اپنے وعدے کے مطابق میرا کام کر دیا ہے۔ اپنی کارگزاری کی داد حاصل کرنے کے لیے مزید بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب کولمبو منصوبے کے تحت ایک میٹنگ پر کولمبو جا رہے تھے کہ قصور کے میاں عبدالرحمٰن، اے ڈی آئی کے بارے میں رپورٹ آئی کہ وہ بے خوابی کے مریض ہو گئے ہیں، انھیں فوری آرام کرنے کا طبی مشورہ دیا گیا ہے۔ آج کل سالانہ معائنوں کے دن ہیں لہٰذا فوراً مناسب انتظام کیا جائے۔ اس نے ڈائریکٹر صاحب سے ضروری کاغذات پر ائیر پورٹ کے لاؤنج ہی میں دستخط کرواتے ہوئے میرے تبادلے کے احکام پر بھی دستخط کرا لیے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی ہو لیا اور خوشی میں ان کے بچوں کے لیے سو روپے کے میوہ جات خریدے جس کا بنڈل میں دانستہ ان کی میز پر چھوڑ آیا۔

مسٹر غلام نبی بٹ بڑے سنجیدہ، کم گو اور کائیاں ہیڈ ماسٹر تھے، انھوں نے ۱۹۶۱ء کی میری خفیہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ ''ایماندار ہے...... بس ایک تسلی بخش انگریزی مدرس ہے۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا جا رہا ہے"۔ ۱۹۶۲ء کی رپورٹ میں لکھا کہ "ایماندار ہے۔ ایک اچھا انگریزی اور اردو معلم ہے۔ گو سکول میں ٹھیک جا رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ انتظامیہ میں بطور اے ڈی آئی زیادہ مفید رہے گا۔ یہ مڈل سکولوں کا ہیڈ ماسٹر رہا ہے اور اس نے وہاں اچھا کام کیا ہے۔ یہ ایک وفادار ساتھی ہے"۔ ۱۹۶۳ء کی رپورٹ میں لکھا کہ "ایماندار ہے۔ اردو اور انگریزی کا اچھا معلم ہے۔ اس نے نویں اور دسویں جماعت کو برصغیر کی پاک و ہند تاریخ بھی کامیابی سے پڑھائی ہے۔ حال ہی میں اس کا تبادلہ انتظامیہ میں ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں کی طرح یہ وہاں بھی کامیاب ہو گا"۔

مجھے یہ سمجھ نہیں آ سکی کہ بٹ صاحب نے ۱۹۶۲ء کی رپورٹ ہی میں میرے لیے انتظامیہ میں مفید رہنے کے بارے میں کیوں لکھا؟ ان سے تو کبھی انتظامیہ میں جانے کی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۶۲ء کا میرا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ میں نے عبدالحمید باجوہ پولیس افسر کے صاحبزادے عظمت حمید باجوہ کو ثانوی تعلیم بورڈوں کے بین المدارس انگریزی کے تقریری مقابلے کے لیے تیار کیا تھا اور وہ پنجاب بھر میں اوّل آیا تھا، اس کا ذکر رپورٹ میں نہ تھا۔ لگتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کی میری رپورٹیں میرے تبادلے کے بعد اکٹھی ہی لکھیں یا پھر انھوں نے متعلقہ انچارج کو کہا ہو گا کہ رپورٹیں ٹائپ کر دو، وہ دستخط کر دیں گے۔ بااختیار افسران خفیہ رپورٹیں وقت پر نہ لکھنے کا کھیلا سخت قوانین کے باوجود کرتے رہتے ہیں۔ (میرے ہاتھ تو اپنی خفیہ رپورٹ کے یہ مندرجات ۱۹۹۴ء میں لگے)۔

میں اپنے احکام بطور تقرر و تبادلہ بحیثیت نائب ضلعی انسپکٹر مدارس ضلع لاہور وصول کرتے ہی سب سے پہلے نگینہ بیکری پہنچا جو ڈائریکٹوریٹ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی اور اپنے دوست رانا رحمٰن ظفر کو اپنے تبادلے کے متعلق بتایا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ وہاں کارپوریشن کے ایک استاد موسیٰ خاں بھی بیٹھا کرتے تھے جو ستاروں اور سیاروں کے علم کا دعویٰ رکھتے تھے اور جزوقتی نگینہ بیکری ہی میں زائچے تیار کرنے اور ہاتھ دیکھنے کا شغل فرماتے تھے۔ رانا صاحب نے ماسٹر موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لو جی! موسیٰ خاں ہمارے دوست آج سے سکولوں کے افسر ہو گئے ہیں۔"

ماسٹر موسیٰ خاں کو اے ڈی آئی کے منصب اور اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر تعظیم بجا لایا اور پوچھا "کیا میں کارپوریشن کے اسکولوں کا

اے ڈی آئی تعینات ہوا ہوں؟'' رانا صاحب ہی نے اسے جواب دیا'' ابھی تو احکامات ہی آئے ہیں۔ ابھی اسکول سے فارغ ہوں گے پھر ضلع لاہور حاضری دیں گے اور اس کے بعد یہ قصور جائیں گے۔ ان کا کارپوریشن سے کوئی تعلق نہیں۔''

ماسٹر موسیٰ خاں نے کارپوریشن کے اسکولوں کے اے ڈی آئی ملک غلام حیدر کا ذکر شروع کر دیا اور رانا صاحب کو بتایا کہ کارپوریشن کے سکولوں کا انتظام تو کارپوریشن کے ذمہ ہے لیکن معائنہ ضلعی انسپکٹر آف سکولز کی ذمے داری ہے۔ اے ڈی آئی کی رائے ہی پر انھیں سالانہ ترقی ملتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

☆☆

اچانک وہاں اورینٹل کالج کے پروفیسر مخدوم عبدالحکیم تشریف لے آئے جو نگینہ بیکری کے مستقل احباب میں سے تھے۔ انھوں نے مجھے ماسٹر صاحب کہہ کر میرا حال پوچھا تو موسیٰ خاں نے فوراً اصلاح کی۔ ''ماسٹر صاحب نہیں' افسر صاحب کہیے۔'' پھر انھیں بتایا گیا کہ مجھے اس نئے عہدے سے پکارنے کی وجہ کیا ہے۔ مخدوم صاحب بھی ماضی میں کبھی اے ڈی آئی رہے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے کئی واقعات سنائے اور مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ جس قوم سے میرا واسطہ پڑنے والا ہے ان کے درمیان مجھے بتیس دانتوں کے بیچ زبان کی طرح رہنا ہوگا۔

انھوں نے سمجھایا ''تم اساتذہ سے کبھی ان کی تعلیمی وتدریسی صلاحیت کے بارے میں سوال کرنا نہ ان سے پوچھنا کہ انھوں نے سال بھر کیا پڑھایا ہے، بچوں کو کیا سکھایا ہے؟ اس پالیسی پر گامزن ہو کر تم اپنا وقت بخیر وخوبی کھاتے پیتے گزار سکو گے۔ وجہ یہ ہے کہ اساتذہ کی قوم جانتی ہے کہ وہ تو ب، ٹ بٹ پڑھانے اسکول میں آئی ہے اور ب، ٹ بٹ پڑھاتے ہی ریٹائر ہو جائے گی۔ اسے منشی جی ہی رہنا اور منشی جی ہی کہلانا ہے اور یہ جو اے ڈی آئی ہے اس کو تو ترقی کرنی ہے' ہیڈ ماسٹر بننا ہے' ڈپٹی انسپکٹر یا ڈسٹرکٹ انسپکٹر بننا ہے۔ انسپکٹر یا ڈائریکٹر بھی بن سکتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں وہ ایک روپے کے آٹھ لفافے خریدتے ہیں اور اے ڈی آئی کے خلاف روایتی قسم کے الزامات لگا کر وزیر تعلیم سے لے کر ڈسٹرکٹ انسپکٹر تک آٹھ افسران کو شکایتی درخواستیں بھیج دیتے ہیں اور اے ڈی آئی صاحب بے چارے کبھی ایک الزامات بھری درخواست کا جواب دیتے ہیں' کبھی دوسری کا اور اگر کوئی ایک افسر بھی اے ڈی

آئی کے خلاف ہو تو بس پھر اس کے خلاف کارکردگی اور نظم وضبط قوانین کے تحت پوچھ گچھ شروع ہو جاتی ہے۔"

قوم یعنی مدرسین کس حد تک اپنے پیشے سے محبت رکھتے ہیں، اس کے بارے میں بھی خلیفہ صاحب نے اپنا ایک واقعہ سنایا:

"میں نے سرسری معائنہ جات کے دوران اسکولوں کے جو لاگ بکیں (روزنامچے) لکھیں ان میں ہر ایک میں آخری سطر یہ تحریر کی کہ مدرسین "لاگ بک" پڑھیں، جو تجاویز دی گئی ہیں ان پر عمل کریں اور لاگ بک کے صفحے کے مخصوص حصے پر تصدیقی دستخط کریں کہ وہ لاگ بک کے مندرجات پر عمل کر رہے ہیں لیکن سالانہ معائنے پر میں نے دیکھا کہ کسی ایک اول مدرس اور اسکول کے دیگر عملے نے 'افسر معائن کی رائے پر کیا عمل کیا' نامی حاشیے میں کچھ بھی نہیں لکھا تھا کیونکہ انھوں نے میری آراء کو پڑھنا ہی گوارا نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک خصوصی سرکلر بھی جاری کیا۔ اگلے سال کے سرسری معاینوں کے دوران میں نے دو اچھے اسکولوں کی لاگ بکیں لکھنے کے بعد ان لاگ بکوں کے اندر اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے کا ایک ایک نوٹ رکھ دیا۔ خیال یہ تھا کہ مدرسین میرے جانے کے بعد روزنامچے پڑھیں گے تو انھیں نوٹ دستیاب ہوں گے، پھر کسی موقع پر وہ مجھ سے پوچھیں گے کیا وہ نوٹ میرا تو نہیں تھا؟ لیکن صاحب! اگلے معائنے پر وہ نوٹ جوں کے توں لاگ بکوں کے اندر ہی پڑے ہوئے ملے۔ پڑھنا تو درکنار انھوں نے لاگ بک کھول کر بھی نہیں دیکھی تھی۔"

مجھے مخدوم صاحب کی رائے سے اختلاف تھا۔ لائلپور کے ضلعے میں شاید ایسا ہوتا ہوگا، میں سیالکوٹ کے جن اسکولوں میں رہا تھا اور میرے مرکز میں جس قدر پرائمری اسکول تھے وہاں اے ڈی آئی کی آرا کو غور سے پڑھا اور ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ رہی دستخطوں والی بات تو اس میں کوتاہی پائی جاتی تھی اور یہ کوتاہی ہیڈ ماسٹر یا اول مدرس کی تھی۔ میں نے جو اے ڈی آئی دیکھے تھے ان کی مدرسین خاصی عزت کرتے تھے، اپنا کام بھی کرتے تھے۔

بیکری میں ایک اور مستقل ممبر سید شفیع غضنفر انسپکٹر عمارات کارپوریشن بھی تشریف لے آئے۔ وہ کارپوریشن میں میری ملازمت کے دوران میرے ساتھی رہے تھے اور انور کمال پاشا کی فلموں کے مکالمے لکھا کرتے تھے۔ گاہے بگاہے ان کے افسانے بھی مختلف رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اس حوالے سے بھی میری ان سے بے تکلفانہ آشنائی تھی۔ ان کے والد سید

غضنفر علی سنٹرل ماڈل اسکول میں فارسی کے معلم تھے۔ پسر معلم ہونے کی وجہ سے انھوں نے میٹرک تک سنٹرل ماڈل اسکول ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ مجھ سے اکثر اپنے زمانۂ طالب علمی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میرا تبادلہ سنٹرل ماڈل اسکول سے بطور اے ڈی آئی ہو گیا ہے تو انھوں نے بلا تکلف کہا کہ سنٹرل ماڈل اسکول نالائق اور اوسط درجے کے معلمین برداشت نہیں کرتا۔ وہ تو پہلے ہی حیران تھے کہ کلرک رہنے والا قاضی اس اسکول میں کیسے سمگل ہو گیا ہے؟ مَیں ان کی نظر میں ایئرفورس کی طرح سنٹرل ماڈل سکول کے لئے بھی ''ان فٹ'' تھا۔

جب انھوں نے تسلیم کر لیا کہ تبادلہ میں نے خود کرایا ہے کیونکہ مجھے انتظامیہ میں جانے کا شوق تھا تو انھوں نے کہا کہ پھر تم نے سخت غلطی کی ہے۔ سنٹرل ماڈل سکول جیسی عزت اور آرام کی ملازمت کے بعد یہ دھکے کھانے والی نوکری ہے۔ انھوں نے اپنی مثال دی کہ جب سے ان کے پیچھے یہ 'ٹر' لگی ہے یعنی وہ انسپکٹر ہوئے ہیں تب سے وہ پریشان ہی ہیں۔ اگلے روز سنٹرل ماڈل اسکول کے بعض اساتذہ نے بھی میرے اسکول سے نکل کر اے ڈی آئی بننے کے عمل کو حماقت قرار دیا اور رازدارانہ لہجے میں پوچھا ''کیا میں نے ہیڈ ماسٹر سے کوئی اونگی بونگی تو نہیں ماری؟''

قصور کے رہائشی شیخ عبدالغفور مدرس جسمانی تعلیم سنٹرل ماڈل اسکول البتہ خوش تھے۔ میرے تقرر کی نسبت انھیں میاں عبدالرحمٰن کے تبادلے کی خوشی زیادہ تھی کہ میاں صاحب نے بطور اے ڈی آئی ان کے دو تین جائز کام بھی نہیں کیے تھے۔ انھوں نے مجھے بڑی فراخدلی سے دعوت دی کہ قصور پہنچ کر میں پہلے ان کے گھر اطلاع بھیجوں اور ان کے ہاں ہی ٹھہروں۔ نگینہ بیکری کی طرح سکول کے احباب نے بھی کئی لطائف سنائے جن کا تعلق میری نئی اسامی سے تھا۔ مثلاً ایک دوست نے کہا کہ ایک اے ڈی آئی گاؤں پہنچا تو کچرے کے ڈھیر پر چگتی مرغیاں پرپھڑ پھڑاتی اور کڑکڑاتی اطراف کو بھاگیں کہ آج ہم میں سے ایک چھری تلے آئے گی یا پھر ہم من حیث الجماعت بیوہ ہو جائیں گی۔

ایک اور صاحب بولے کہ کسی نے جے وی ٹیچر سے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے تو اس نے کہا کہ اس کی سال کی تنخواہ کو جمع کر کے اس میں سے ایک سیر گھی، ایک مرغی اور درجن بھر انڈوں کی قیمت نکال کر باقی رقم کو بارہ پر تقسیم کر لیا جائے۔

مرحوم دوست شہباز چیمہ نے مجھے خصوصی ملاقات میں مشورہ دیا کہ چونکہ بعض نالائق مدرسین اے ڈی آئی کو ہلکا (حلقہ) افسر (پنجابی میں ہلکا باؤلے کو کہتے ہیں) یا 'مرغی افسر' بھی کہتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کی مرغی نہ کھاؤ بلکہ جہاں جاؤ وہاں اپنی مرغی کھاؤ۔ خود ہی اس نے بتایا کہ کیسے؟ وہ ایسے کہ تم جس اسکول میں پہلے سرسری معاینے کے لیے جاؤ وہاں ایک چونی اول مدرس کے ہاتھ پر رکھو اور اسے کہو کہ وہ دو تین انڈے خرید کر کسی گھر میں انڈوں پر بٹھائی گئی کڑک مرغی کے نیچے رکھ دے پھر ایک چوزہ تو دوسرے سرسری معاینے پر کھاؤ اور دوسرا مرغ سالانہ معاینے پر کھاؤ۔

☆☆

ضلعی انسپکٹر آف اسکول قاضی نواب علی بڑے نستعلیق آدمی تھے۔ انھوں نے علیک سلیک کے بعد مجھے اے ڈی آئی صاحبان کے کمرے میں بیٹھنے کو کہا کہ وہ فارغ ہو کر میرے ساتھ خصوصی مکالمہ کرتے ہیں۔ اے ڈی آئی صاحبان میں سے ایک ملک عبدالمجید میرے بی ٹی کے ہم جماعت نکل آئے۔ میں نے ان سے بغلگیر ہوتے ہوئے پوچھا ''کیا وہ بھی ادھر اے ڈی آئی صاحب ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا کہ وہ اے ڈی آئی تو ہیں لیکن 'صاحب' نہیں، صاحب تو صرف قاضی نواب علی ہی ہیں۔ یہ بڑی بامعنی بات تھی، انھیں پتہ چل چکا تھا کہ میرے احکامات تبادلہ جاری ہو چکے ہیں اور میں ادھر حاضری دینے ہی والا ہوں۔

ملک عبدالمجید نے بھی کرید کر پوچھا کہ سنٹرل ماڈل کیوں چھوڑ کر آئے ہو؟ میں نے انھیں بتایا کہ کوئی خاص وجہ نہیں۔ میرا شوق تھا کہ میں بھی اے ڈی آئی بنوں۔ باقی اے ڈی آئی صاحبان کا خیال تھا کہ مجھے سنٹرل ماڈل اسکول سے 'ان فٹ' کر کے نکالا گیا ہے۔ بھلا وہ کون احمق ہو سکتا ہے جو از خود پنجاب کی درجہ اول کی درس گاہ چھوڑ کر دیہات کی خاک چھاننے نکل پڑے! ممکن ہے ملک مجید کی بھی دلی رائے یہی ہو۔ مجھے ان کی سوجھ بوجھ اور مبلغ عقل پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے سامنے بیٹھے 'احمق' کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

قاضی نواب صاحب نے ملاقات کے دوران میرے ماضی کے متعلق جان کر کہا ''اچھا ہے کہ تمھیں مڈل اور پرائمری اسکولوں سے آشنائی ہے اور تم جانتے ہو کہ اے ڈی آئی کی اسامی کی کیا اہمیت ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع کی نسبت لاہور میں 'عوامی رابطے' کے محکمے

میں کام کرنا مختلف ہوتا ہے۔ بادی النظر میں تو تم ضلعے کی تعلیمی معاینہ ٹیم میں شامل ہوئے ہو لیکن لاہور ڈویژن اور دارالحکومت کے عملے کی بھی ایک کڑی بن چکے ہو۔ سرکاری کام تو تمھیں کرنا ہی ہے لیکن یہاں انسپکٹوریٹ سے لے کر سیکرٹریٹ تک کے افسران کے ذاتی کام بھی کرنا پڑیں گے۔ تم اب کسی جماعت کے انچارج نہیں رہے بلکہ ایک اہم فیلڈ افسر ہو۔"

"بہتر فیلڈ افسر وہ ہوتا ہے،" ضلعی انسپکٹر نے فرمایا "جو کوئی مسائل پیدا نہ کرے۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو بھی جائے تو اپنی سطح ہی پر اسے نپٹا دے۔ اساتذہ سے مل جل کر جمہوری انداز میں رہے۔ دوسرے مقامی دفاتر کے عملے سے رابطہ پیدا کرے۔ عوام میں بھی اپنا ایک باوقار مقام بنائے۔ ضلعی حکام سے گاہے گاہے ملتا رہے۔ سینئر انگریزی استاد کی تنخواہ پر کوئی اور ایسی اسامی نہیں ہے جو ذمے داریوں اور اہمیت کے لحاظ سے اے ڈی آئی کے ہم پلہ ہو۔ دوسرے محکموں کے افسران تو اس اسامی کو گزیٹیڈ سمجھتے ہیں۔ محکمے کے افسران بھی اس عہدے کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔ مدرسین اے ڈی آئی کے آگے پیچھے ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ان سے فاصلہ رکھنا ہی بہتر ہے۔ وہاں قصور میں سینئر اے ڈی آئی میر قمر الدین ہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا تمھارے لیے مفید رہے گا۔"

☆☆

متعلقہ کاغذات کی تکمیل کے بعد میں ہدایات سے لدا پھندا قصور جا پہنچا۔ پہلی رات میں نے شیخ عبدالغفور کے ہاں ہی قیام کیا۔ شیخ صاحب نے میری آؤ بھگت کی لیکن میں نے دیکھ لیا کہ ان کے چوبارہ نما مکان میں قیام بڑا مشکل ہے۔ اگلی صبح انھوں نے ایک مڈل پاس غیر تربیت یافتہ معلم غلام محمد کو بلایا۔ دن بھر کے لیے مجھے اس کے سپرد کیا اور اسے تاکید کی کہ رات کو وہ مجھے ان کے ہاں ہی واپس لائے لیکن میں نے کہہ دیا کہ آج تو میں لاہور جاؤں گا۔ میں غلام محمد کی ہمراہی میں میاں عبدالرحمٰن سے ان کے گھر پر ملا۔ وہ تپاک اور محبت سے ملے۔ زبردستی تواضع کی اور اپنی بے خوابی کے بارے میں بتاتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ چارج وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے، سب کاغذات دفتر میں ماسٹر قادر بخش کے پاس ہیں جو دفتر میں بطور کلرک کام کرتا ہے۔

ان کے گھر سے نکلے تو غلام محمد نے مجھ سے پوچھا "کیا میں کسی سکول کا معائنہ کروں گا؟" اف! ظالم نے کیا کہہ دیا، یہی تو میری دلی تمنا تھی۔ میں نے ماضی کے اے ڈی آئی

حضرات کو یاد کیا اور بابو دین محمد سے چلتا ہوا اقبال قریشی تک پہنچا۔ ظہور الحق فاروقی کا معاینہ بھی یاد آیا اور میں بھول گیا کہ مجھے دفتر جانا اور وہاں سینئر اے ڈی آئی میر قمرالدین سے ملاقات کرنا ہے۔ میں غلام محمد کی ہمراہی میں کوئی پانچ میل کے فاصلے پر واقع موضع فتح پور کے پرائمری سکول میں جا پہنچا۔

اسکول میں ایک ہوچی منہ قسم کی مولوی نما شخصیت میز کرسی لگائے بیٹھی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک اور نوجوان مدرس کچھ بچوں کو کھڑا کیے اور کچھ کو بٹھائے مصروف تدریس تھا۔ مولوی صاحب نے غلام محمد کو پہلے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے ''خوش آمدید' خوش آمدید'' کہا۔ میں ان کی نشست پر بیٹھ گیا۔ پتہ چلا کہ مولوی صاحب نقشہ الف مرتب کر رہے تھے۔

نقشہ الف ہر ماہ کی آخری تاریخ کو تیار کیا جاتا ہے جس میں طلبہ کی حاضریوں' داخل خارج' جماعت اول کی ترقی کی رفتار' مدرسین کے مکمل کوائف اور فنڈز وغیرہ کا حساب درج ہوتا ہے۔

میں نے مولوی صاحب سے پوچھا ''ماہ نومبر کا نقشہ آپ اب کیوں تیار کر رہے ہیں۔ اب تو دسمبر کا بھی ایک ہفتہ گزر چکا ہے؟''

مولوی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''میں نے نقشہ الف تو سنٹر ہیڈ ماسٹر کو ۳۰ نومبر ہی کو دے دیا تھا لیکن انھوں نے کچھ غلطیاں نکال کر واپس کر دیا ہے اور وہ انہی اغلاط کو درست کر رہا ہے۔''

میں نے داخل خارج رجسٹر طلب کیا اور حاضری رجسٹر سے حاضر طلبہ کی تعداد کا موازنہ کیا۔ معائنے کی دھاک بٹھانے کا یہ گر کھالہ گناں کے زمانے سے میرے لاشعور میں موجود تھا جو آج اُجاگر ہو گیا تھا۔ داخل خارج رجسٹر میں پانچ طلبہ زائد تھے۔ مولوی صاحب ''او جی' یہ جی' وہ جی'' کرنے لگے۔ میں نے سرسری سا معاینہ کیا اور مولوی صاحب سے کہا ''میری ابتدا ہی اچھی نہیں ہوئی بہر صورت میں انشاء اللہ سالانہ معاینے پر پورا پورا جائزہ لوں گا۔'' میں نے لاگ بک کی چند سطور میں مولوی صاحب کے نومبر کے نقشہ جات الف کو دسمبر میں مرتب کرنے کا ذکر بھی کیا تو مولوی صاحب کچھ افسردہ ہو گئے۔

☆☆

ایک کمرے، برآمدے اور صحن پر مشتمل اسکول کی عمارت ایک زمیندار کے ڈیرے کے پہلو میں واقع تھی۔ ڈیرے پر ایک خاصے ڈیل ڈول اور اونچے قد کے بزرگ بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب نے بتایا ''اسکول کی زمین انہی بزرگ کی مرحمت کردہ ہے جو ماضی میں ایک فعال شخصیت ہوا کرتے تھے۔ وہ خود بابا کریم کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے ایک بیٹے وکیل ہیں اور ایک ممبر ضلع کونسل ہے۔'' (۱۹۶۲ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ کو ضلع کونسل کا نام دیا گیا تھا اور اسی سال حکومت پنجاب نے تمام ڈسٹرکٹ بورڈ مدارس کو اپنی تحویل میں لے کر پنجاب اساتذہ کی یونین کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ گویا میں اس وقت ڈسٹرکٹ بورڈ یا ضلع کونسل کے اسکول کا نہیں بلکہ سرکاری اسکول کا معائنہ کر رہا تھا)۔ مولوی صاحب نے مزید بتایا ''ان کے بھتیجے کھائی ہٹھاڑ کی سیاسی شخصیت ہیں۔'' بابا جی کے یہ بھتیجے محمد علی آف کھائی ہٹھاڑ ڈپٹی چیئرمین سینٹ بھی رہے۔

مولوی صاحب نے بابا جی کو میرے متعلق جا کر بتایا تو انھوں نے مجھے اپنے ڈیرے پر طلب کر لیا۔ میں نے نیاز مندانہ انداز میں ان سے ملاقات کی۔ وہ خاصے باخبر شخص ثابت ہوئے اور بڑی معلوماتی گفتگو کی۔ ان سے میں نے پہلی بار سنا کہ عمر رسیدگی کی وجہ سے ان کی خون کی نالیاں سکڑ چکی ہیں۔ ایسے میں دو ہی علاج ہوتے ہیں، یا تو نالیوں کو کھلا کرنے کی دوا لی جائے یا خون کو پتلا کرنے کی...... وہ خون کو پتلا کرنے کی دوا اسپرین لے رہے تھے۔ میرے بھاری وجود کو دیکھ کر انھوں نے مجھے ورزش، سادہ خوراک اور گھی وغیرہ سے پرہیز کی باتیں بھی کیں بلکہ یہ بھی کہا کہ معائنہ کرنے والے افسران کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے، لہٰذا میرے لیے ضروری ہے کہ یہ نکتہ میں ہر وقت ذہن میں رکھو کہ دستر خوان تو مدرسین کا ہے مگر پیٹ تو اپنا ہے، اسے ہرگز توند نہیں بننے دینا ہے۔

''اب آپ بتائیں کیا پئیں گے...... چائے یا لسّی؟'' بابا جی نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''لسی''، میں نے کہا کیونکہ میں صبح سے دو مرتبہ چائے پی چکا تھا۔

''میٹھی یا نمکین، پتلی یا گاڑھی، گرم یا ٹھنڈی؟'' لسی کے بارے میں یہ فرق و امتیاز بھی میرے علم میں اضافہ تھا۔

''نمکین، پتلی اور ٹھنڈی''، میں نے کہا تو بابا جی نے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ ان کے

گھر جائے اور لسی لے کر آئے۔

مولوی صاحب لسّی لے کر آئے تو اس میں مکھن کا ایک پیڑا ابھی تیر رہا تھا۔ ساتھ گھریلو ساخت کی مٹھائی بھی تھی۔ بابا جی کے اصرار پر میں نے دو گلاس لسی کے ساتھ چھٹانک بھر مکھن بھی کھایا۔ بابا جی نے کہا "وہ میری عمر میں پاؤ بھر مکھن لازماً کھاتے تھے۔ چھٹانک بھر تو وہ اب بھی کھا لیتے ہیں لیکن گھنٹہ دو گھنٹے کسّی بھی چلاتے ہیں۔"

واپسی پر میں سیدھا لاہور چلا گیا کیونکہ اس روز میری ایم ایڈ کی کلاس تھی۔ کریم بابا کی پُروقار شخصیت اور گفتگو، اول مدرس کی ہوچی منہ ہیئت اور ماسٹر غلام محمد کی مسکین طبیعت اور دھیمی مسکراہٹ میرا دن بھر کا حاصل تھیں میں نے ملتے رہنے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی رہائش کے لیے موزوں مکان تلاش کرنے کی بھی فہمائش کی۔

☆☆

میر صاحب، سینئر اے ڈی آئی صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ میر کم اور 'صاحب' زیادہ ثابت ہوئے۔ دفتر ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ پہلی ملاقات پر چائے کی پیالی کا پوچھتے، چھوٹتے ہی کہنے لگے "کہ کیا مجھے علم نہیں کہ دورے پر جانے سے پہلے اس کا منصوبہ مرتب کیا جاتا ہے پھر اس کی منظوری ڈی آئی صاحب سے لی جاتی ہے، تب دورہ کیا جاتا ہے؟ ادھر دفتر میں کافی ڈاک رکی پڑی ہے۔ میاں عبدالرحمٰن نے تو ایک دن بھی ڈھنگ سے کام نہیں کیا۔"

انھوں نے پگڑی اور اونی چادر اوڑھے بیٹھے ڈاڑھی والے مدرس سے کہا "ماسٹر قادر بخش! اپنے صاحب کو ڈاک دکھاؤ۔"

میر صاحب کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا گو ان کی بات ٹھیک تھی۔ دورے کا منصوبہ تیار کرنا اور صدر دفتر کی ڈاک دیکھنا ضروری تھا۔ اگر ڈی آئی صاحب کو معلوم ہی نہ ہو کہ ان کا اے ڈی آئی فلاں روز کہاں ہوگا، کہاں رات گزارے گا تو وہ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں اور نہ اس سے رابطہ۔ رابطے کی ضرورت اکثر پڑتی رہتی ہے اور کچھ نہیں تو کوئی ہنگامی میٹنگ ہی آ جاتی ہے یا کوئی ایسا خط آ جاتا ہے جس کا جواب فوری درکار ہوتا ہے۔ ڈاک میں کئی اقسام کے اعداد و شمار اور معلومات مہیا کرنے کے ضمن میں چٹھیاں موجود تھیں۔ مدرس کلرک نے چٹھیوں کے جوابات' اعداد و شمار اور مطلوبہ معلومات تیار بھی کر رکھی تھیں۔ میر صاحب چاہتے تو وہ ان پر دستخط کر کے

صدر دفتر کو بھیج سکتے تھے مگر بعد میں مدرس کلرک نے بتایا ''میر صاحب کو جب بھی دستخط کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے کہا کہ ان کی سب ڈویژن قصور شمالی ہے، قصور شمالی کا کوئی کاغذ ہے تو بتاؤ۔ قصور جنوبی کا وہ کوئی کام کر کے کسی غلط یا ادھورے جواب کے ذمہ دار نہیں بنیں گے۔'' ان کی یہ بات بھی ٹھیک تھی۔

میں نے میر صاحب سے کہا ''میں پہلی دفعہ اے ڈی آئی بنا ہوں۔ مجھے اس اسامی کا کوئی تجربہ نہیں ہے آپ میری راہنمائی فرمادیں۔'' جواب میں انھوں نے فرمایا کہ قصور جنوبی کے سنٹر ہیڈ ماسٹر بڑے تیز ہیں اور پھر یہ ماسٹر قادر بخش بھی بڑا 'استاد' ہے۔ یہ مجھے سب کچھ سکھا دے گا۔ پھر انھوں نے ماسٹر قادر بخش سے کہا کہ وہ قاضی صاحب کے دورے کا منصوبہ بناتے وقت ان کا منظور شدہ منصوبہ بھی مدنظر رکھے تاکہ ہم باری باری دفتر میں رہیں۔

☆☆

قصور جنوبی میں بھیلہ ہٹھاڑ' کھڈیاں' عثمان والا' کچہ پکہ' جوڑہ اور ڈھولن ہٹھاڑ کے مراکز شامل تھے، ان میں سے آخری تین اسکول مڈل تھے لیکن بی اے بی ایڈ ہیڈ ماسٹر صرف مڈل اسکول کچہ پکہ میں تھے۔ ہر مرکز میں آٹھ سے دس تک پرائری سکول ہوتے تھے۔

بھیلہ ہٹھاڑ قصور سے پاکپتن جانے والی ریلوے لائن پر پہلا اسٹیشن ہے۔ یہاں اول مدرس طالب حسین شاہ تھے جو افیون کے عادی تھے۔ ان کے نائبین میں سے 'محمد علی آف بھیلہ ہٹھاڑ' ان کا بڑا چاق چوبند، باخبر اور نیم سیاسی نائب مدرس تھا۔ وہ بھیلہ یونین کونسل کے چیئرمین عمر خاں کا دوست اور مشیر تھا۔ اسے چیئرمین عمر خاں پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ حقیقتاً یونین کونسل کا وہی چیئرمین تھا لیکن وہ اس حیثیت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاتا تھا۔ عمر خان صاحب کے ایک بھائی ریٹائرڈ میجر تھے جن کا خاصا دبدبہ تھا۔ جاوید محمود سابق ڈپٹی کمشنر لاہور انہی میجر صاحب کے فرزند ہیں۔

ماسٹر غلام محمد اور قادر بخش کے بعد میری گہری واقفیت محمد علی ہی سے ہوئی۔ جس روز پہلے دن میں دفتر میں موجود تھا تو وہ اپنے اول مدرس کی جگہ مجھے قصور میں 'خوش آمدید' کہنے آیا۔ اس نے بہت سی باتیں کیں، اتنی کہ مجھے کچھ پوچھنے اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بھیلے سے شروع کر کے اس نے ساری سب ڈویژن قصور جنوبی کا تعارف ایسے کرایا جیسے وہ ہی قصور جنوبی کا اے ڈی آئی رہا ہو۔ ماسٹر قادر بخش بھی اس کی گفتگو میں تائید کرنے کے لیے شامل تھا۔

وہ میر قمر الدین کے خشک رویے کا شاکی تھا۔ میاں عبدالرحمٰن کے پیش رواے ڈی آئی چودھری بشیر احمد تھے، ان کا ذکر وہ بڑی عقیدت' احترام اور محبت سے کرتا رہا اور بار بار کرتا رہا۔ اس نے اپنی سحر بیانی اور سحر طراز شخصیت سے مجھے مجبور کر دیا کہ میں دفتر سے اٹھوں، ایک آڑھت کی دکان سے ملحقہ ایک آرام گاہ میں چلوں اور وہاں اس کا حقیر سا 'استقبالیہ' قبول کروں۔ میں نے قادر بخش کی طرف دیکھا تو اس نے کہا "محمد علی کو ٹالنا مشکل کام ہے۔ آدھ گھنٹے کے لیے دفتر سے اٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" میں نے قادر بخش کو بھی ساتھ لے لیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر آڑھت تھی اور اس کے ساتھ ایک ڈیرہ سا تھا۔ وہاں چار پائیاں اور سرکنڈے کے بڑے بڑے مونڈھے رکھے ہوئے تھے۔

کمہار کی دکان سے مٹھائی منگوا کر وہ پہلے ہی وہاں رکھ گیا تھا۔ دکان کے ایک ملازم کے ذریعے اس نے ایک سیر دودھ پتی منگوائی۔ اس نے مٹھائی کے ڈبے کھولے اور مٹھائی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا: "باباجی! ناراض نہ ہونا۔ ہم جٹ بوٹ آدمی ہیں..... جب تک کسی مہمان پر دس بیس روپے خرچ نہ ہوں ہم سمجھتے ہیں کہ مہمان نوازی نہیں ہوئی..... یہ لیجیے اندرسہ' یہ قصور کی سوغات ہے۔ یہ کھوئے والا ہے اور وہ سادہ....."

میں نے خاموشی سے انھیں چکھا اور خوش ہوا کہ میری ایک الجھن ختم ہوئی۔ میں قصور آنے کے بعد ماسٹر غلام محمد کی معیت میں کئی بار ایک گلی سے گزرا تھا جس میں ایک بورڈ لگا ہوا تھا 'دیسی گھی کے اندرسے'۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ اندرسے' جمع ہے اندرسہ کی..... جبکہ میں نے بورڈ پڑھ کر ہر مرتبہ سوچا تھا کہ اندر سے دیسی گھی کے بنے ہوئے کیا ملتے ہیں؟ میں نے غلام محمد سے بھی نہیں پوچھا تھا "بھئی' یہ دیسی گھی کے اندرسے کا کیا مطلب ہے؟" میری بے ذوقی ملاحظہ کیجیے' کہ مجھے مٹھائی کی اس صنف کا علم ہی نہیں تھا۔

محمد علی کہے جا رہا تھا "جناب! ہم تو خادم ہیں، جہاں ہماری ضرورت پڑے آواز دیں، ہم حاضر ہوں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہیں..... قصور جنوبی میں شیخ ہیڈ ماسٹر بہت زیادہ ہیں، اچھے لوگ ہیں لیکن ایک تو شیخ جی ہیں اور اوپر سے تھوڑے سے سیاسی ہیں..... تعلیم میں سیاست کا کیا مقام؟ لیکن پھر بھی انتظامیہ میں چلتی ہے۔ چودھری بشیر احمد کو بھی ان شیخوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ تو عمر خاں سے ملاقات کے بعد ان کو علم ہوا کہ وہ غلطی پر تھے....."

☆☆

قصہ کوتاہ محمد علی سے فراغت پانے کے بعد میں اور قادر بخش دفتر میں واپس آئے تو وہاں وہ شیخ صاحبان بھی موجود تھے جن کا ذکر ابھی ابھی ہوا تھا۔ تعارف ہوا کہ شیخ نذیر ایس وی مڈل سکول ڈھولن ہٹھاڑ کے ہیڈ ماسٹر ہیں، شیخ لطیف پرائمری سکول عثمان والا کے اول مدرس ہیں اور شیخ صدیق پرائمری سکول کھڈیاں کے اول مدرس ہیں اور سب آپس میں رشتہ دار بھی ہیں۔ انھوں نے مجھے اور قادر بخش کو کہیں محمد علی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے اپنے خادم تابعدار اور بے ضرر انسان ہونے کے اظہار کے بعد یہ بھی کہا ''ہم صبح صبح بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے تھے لیکن ہماری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے آپ کی ملاقات قصور جنوبی کے تھم (ستون) اور عمر خاں کے بالکے سے ہو جائے۔''

''کیوں بھائی قادر بخش، ہمارا تعارف اس نے صاحب سے ضرور کرایا ہوگا؟'' اچانک شیخ نذیر نے قادر بخش سے پوچھا۔

قادر بخش ایسی ہنسی ہنسا جس سے شیخ نذیر کے استفسار کی تائید خود بخود ہو گئی۔ پھر وہ اپنی باتیں جن کا تعلق ان کے اپنے مدرسے، سینٹر کے مدارس اور اساتذہ وغیرہ سے تھا، کرتے رہے۔ سالانہ معائنوں کے بارے میں بھی انھوں نے پوچھا۔ انھی کی گفتگو سے عیاں ہوا کہ امتحان مڈل اسٹینڈرڈ فروری کی ابتدا ہی سے شروع ہو رہا ہے۔ میرے آٹھ دن وہاں ہی لگ جائیں گے کیونکہ ان دنوں محکمانہ امتحانات میں اے ڈی آئی ہی سپرنٹنڈنٹ تعینات ہوتے تھے۔ مارچ میں عام امتحانات سے قبل ضلع بھر کی جماعت پنجم کا وظیفے کا امتحان بھی ہونا تھا۔ جماعت پنجم کے امتحانات بھی مرکزی مدارس میں اے ڈی آئی ہی کو لینا تھے۔ ضلعی انسپکٹر کے دفتر میں ماہوار میٹنگ کے علاوہ کوئی نہ کوئی ہنگامی نوعیت کی میٹنگ بھی آ جاتی ہے۔ ٹورنامنٹوں کا موسم بھی یہی تھا۔

سرکاری نوعیت کی ان گونا گوں مصروفیات کے علاوہ میری اپنی مصروفیت ایم ایڈ کی شبینہ کلاسوں میں حاضری تھی اور علاوہ ازیں...... ہاں جی، علاوہ ازیں لاہور کی ادبی محافل اور بالخصوص مشاعروں کا زمانہ بھی یہی فروری، مارچ کا تھا۔ مجھے ایک لت بین الکلیاتی مباحثوں کے سننے کی بھی تھی۔ میں کسی باقاعدہ کالج کا طالب علم نہیں رہا تھا مگر میرے لاشعور میں کالج کا طالب علم ہونے کی تمنا جاگزیں ہو گئی تھی۔ اندازہ کیجئے کہ ایک جان کس قدر الجھ گئی تھی لیکن اس الجھن میں کس قدر کیف تھا اور مجھے اس نئی صورت حال میں کس قدر عرفان نظر آ رہا تھا، اس کا

اندازہ آپ ذیل کے واقعے سے کر سکتے ہیں۔

☆☆

سنٹرل ماڈل اسکول کی ملازمت کے دوران نگینہ بیکری کے چند دوستوں کے ساتھ مل کر میں نے ایمپلائمنٹ ایکسچینج لاہور کی معرفت ایک درخواست برطانوی پروانہ ملازمت (British Employment Voucher) حاصل کرنے کے لیے بھیجی۔ میری تعلیمی اسناد یا شاید سنٹر ماڈل اسکول کے عملے کا رکن ہونے کی وجہ سے مجھے برطانوی محکمہ داخلہ نے پروانہ ملازمت جاری کر دیا جبکہ کسی دوسرے ساتھی کو کوئی جواب بھی نہیں آیا۔ دوستوں نے مجھے مبارکباد دی۔ اس پروانے کی اہمیت یہ تھی کہ اس کی وجہ سے برطانیہ کا ویزا فوراً لگ جاتا، پاسپورٹ گھنٹوں میں بن جاتا اور جب پروانے کا حامل ملازمت کی تلاش کے لیے برطانیہ پہنچتا تو اس کا گزارہ الاؤنس مقرر ہو جاتا اور اس وقت تک ملتا رہتا جب تک کہ وہ من پسند ملازمت حاصل نہ کر لیتا۔

میں نے اپنی مصروفیت سے وقت چرا کر پاسپورٹ بنوایا' ویزا لگوایا اور مسٹر مورگن سے برٹش کونسل کے دفتر جا کر ملاقات کی۔ کئی اور بھی حوالہ جات حاصل کیے۔ جب ساری تیاری ہو چکی تو دل نے لاہور' قصور اور اچھی بھلی 'افسری' چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مختلف فلمیں اور اپنا مبلغ علم مجھے پکار پکار کر کہتا کہ لندن جاؤ، لندن کی گلیاں سونے کی ہیں، نسلیں سدھر جائیں گی...... چلے جاؤ...... عقل اور دل میں جاری اس جنگ کو سردست بند کرنے کے لیے میں نے برطانوی محکمہ داخلہ کو لکھا کہ میں ایم ایڈ کر رہا ہوں۔ میرا آخری امتحان ستمبر ۶۵ء میں ہوگا' لٰہذا تب تک کے لیے میرے واؤچر میں توسیع کی جائے تا کہ میں ایک بہتر استاد کی حیثیت سے برطانیہ پہنچوں۔ مجھے توسیع مل گئی لیکن تب تک میں اپنے وطن کی تعلیمی انتظامیہ میں گلے گلے تک دھنس چکا تھا۔ میں نے فرنگی پریوں کے دیس میں جانے کا موقع ضائع کر دیا۔ بعض قریبی دوستوں نے بڑی لعن طعن کی لیکن میں تو شروع ہی سے اپنی مفاداتی فکر کے اعتبار سے احمق چلا آ رہا تھا...... میں نے پہلی حماقت کی ابتداء بوچھال کلاں چھوڑ کر کی تھی۔ دوسری اللہ آباد سے بھاگ کر کی تھی۔ تیسری حماقت لیکچرر بننے کے احکامات پر سنٹرل ماڈل اسکول کی مدرسی کو ترجیح دے کر کی۔ جبکہ چوتھی حماقت سنٹرل ماڈل اسکول چھوڑ کر اے ڈی آئی بننے کی اور پانچویں حماقت کا مرتکب برطانوی پروانہ ملازمت ضائع کر کے ہوا۔

ایک سادہ لوح بھولی بھالی دیہاتن حسینہ سے ایک اوباش بابو قسم کے نوجوان نے پوچھا

کہ اس کا نام کیا؟ تو حسینہ نے اسے اپنا نام بھولی بتا دیا۔ اس پر اوباش بابو نے کہا کہ اسے بھولے بھالے لوگوں سے بڑی محبت ہے لہٰذا آؤ میں تمہیں شہر کی سیر کرا لاتا ہوں۔

''مجھے اس قدر بھی بھولی نہ سمجھو کہ میں تم جیسے لوفر کے ساتھ شہر کو چل دوں۔'' بھولی نے جواب دیا۔

اسی مضمون کا لطیفہ لکھنوی دبستان شاعری کے ایک استاد کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔

میں احمق یا باؤلا نہیں تھا، میں تو بس عقل سے زیادہ دل کا مرید تھا...... اور دل گزرگاہِ رَبِ جلیل ہے جبکہ عقل ابن الکتاب ہے۔

☆☆

الغرض دفتر سب ڈویژن شمالی و جنوبی قصور میں حاضری کے پہلے ہی دن سوائے کچہ پکہ کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر شیخ محمد اشرف بی اے۔ بی ایڈ کے جملہ سنٹر ہیڈ ماسٹر صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ سب سے آخر میں علامہ صدیق ارشد تشریف لائے جو مڈل اسکول جوڑہ کے او ٹی ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ اس قدر خوبصورت اردو بول رہے تھے کہ میں محمد علی آف بھیلہ کی تیز رفتار پنجابی کی روانی بھول کر علامہ کے محاوروں اور ضرب الامثال کی زد میں آ کر مع قادر بخش پانچ بجے شام ہی عشائیہ کھانے پر مجبور ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد قادر بخش نے بتایا کہ علامہ کو اساتذہ پنجابی کا 'الامہ' (گلہ شکوہ) کہتے ہیں، لیکن علامہ نے مجھ سے کسی کا گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔ بس اس نے بھی دوسرے بزرگوں کی طرح اپنے خادم اور مخلص ہونے کا یقین دلایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میں کہنے کے بجائے 'آپاں' کہتا تھا۔

''آپاں دوسرے ہٹھاڑوؤں کی طرح من من نہیں کرتے، جو کرتے یا کہتے ہیں بہانگ دہل کرتے اور کہتے ہیں......'' یہ علامہ کا خاص تکراری فقرہ تھا۔

میری ذات نہیں، میرا عہدہ دیہاتی اساتذہ کے نزدیک کس قدر اہم تھا اس کا اندازہ آپ اس بات سے کیجئے کہ جس روز میں نے فتح پور کا سرسری معاینہ کیا اسی روز شام تک میرے قصور میں وارد ہو جانے کی خبر پوری سب ڈویژن جنوبی کے علاوہ سب ڈویژن شمالی میں بھی پہنچ گئی تھی۔ اساتذہ کرام کی اپنی سی آئی ڈی نے انھیں یہ خبر بھی پہنچا دی تھی کہ میں آج دفتر میں 'جلوہ افروز' ہوں اور وہ اپنی باہمی منطق کے تحت ایسے ایسے اوقات میں تشریف لائے تھے کہ ان کی باہم مڈ بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔

جب علامہ، قادر بخش اور میں بسوں کے اڈے کی طرف جا رہے تھے تو سامنے سے غلام محمد آ گیا۔ اس نے کوٹ رکن دین میں میرے لیے ایک دومنزلہ مکان تلاش کر لیا تھا، چابی اس کے پاس تھی۔ میں نے اسے فوری دیکھ لینا چاہا' لہٰذا ہم چاروں اس مکان میں آئے۔ اندھیرا ہو رہا تھا لیکن ڈیوڑھی میں لگا مین سوئچ دباتے ہی سارا مکان روشن ہو گیا۔ مکان پسند آ گیا' بالخصوص اس لیے بھی کہ اس کے نچلے حصے میں دفتر قائم کرنے کی گنجائش بھی موجود تھی۔ مہمانوں کو بٹھایا اور سلایا بھی جا سکتا تھا اوپر باپردہ رہائش ہو سکتی تھی۔

میں نے ۲۵ روپے ماہوار کرائے پر وہ مکان لے لیا۔ قادر بخش اور غلام محمد کو یہ ذمے داری سونپی کہ اگلے روز جب میں دورے پر ہوں گا تو وہ اس مکان کی صفائی وغیرہ کرا دیں تاکہ اتوار کے روز میں اپنے بال بچے وہاں لا سکوں۔

☆☆

ہفتے کو ماسٹر قادر بخش نے بتایا کہ مکان صاف اور نلکا درست کرا دیا گیا ہے۔ دو گھڑے اور گھڑونچی خرید کر نیچے صحن میں بھر کر رکھ دیے ہیں۔ دو چٹائیاں بچھا دی گئی ہیں۔ ایک میز اور چند کرسیاں بھی گڈول اسکول اور تنویر الاسلام اسکول سے منگوا کر رکھ دی گئی ہیں۔ آپ دیکھ لیں اور اتوار کو بچوں کو لے آئیں۔ القصہ میں دفتر سے اٹھ کر مکان میں آیا تو حیران رہ گیا۔ وہاں ان اشیاء کے علاوہ جن کا ذکر مجھ سے قادر بخش نے کیا تھا، گھر گرہستی کا تمام سامان موجود تھا۔ چولہا چونکی سے لے کر تو اپرات تک...... مرچ مسالے سے بھرا نمکدان' جلانے کی لکڑی' چاول' آٹا، گھی' دیسی چینی کے برتن اور دو چار پائیاں...... کمی صرف بستروں کی تھی۔

میں نے قادر بخش کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا ''یہ سب انتظام شیخ برادران نے کیا ہے۔ یہ قصور کے اساتذہ کی روایت ہے کہ وہ ہر پردیسی افسر کو ایسی ضروریات مہیا کرتے ہیں اور پھر یہ سارا انتظام مالیت میں تین سو روپے سے زائد کا نہیں۔'' اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے تو شیخ صاحبان سے کہا تھا کہ صاحب سے پوچھ کر چیزیں خریدنا تو انھوں نے کہا کہ کیا وہ انجان دودھ پیتے بچے ہیں، انھیں علم ہے کہ ایک کنبے کی کیا کیا ضروریات ہوتی ہیں؟

میں ان اشیاء کو اٹھا کر باہر نہیں پھینک سکتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں شیخ برادران نے جو کیا اس پر چیں بہ چیں ہونا بھی بے محل تھا کہ وہ تو موقع پر موجود ہی نہ تھے۔ سوچا کہ چلو میں انھیں سرزنش کر کے تمام اشیاء کی قیمت دے دوں گا۔ ملاقات پر شیخ برادران کے لیڈر شیخ

نذیر نے کہا "یہ اشیاء واپس کرنے یا ان کی قیمت دینے سے بہتر ہے کہ آپ ہمیں زمین پر بٹھا کر جوتے ماریں۔"

انھوں نے چودھری بشیر احمد کا حوالہ دیا کہ ان کا تو ہر قسم کا خرچہ انھوں ہی نے اٹھا رکھا تھا اور انھوں نے کبھی انھیں غیر نہیں سمجھا تھا۔ افسر مائی باپ ہوتا ہے، چودھری بشیر تو ان کے مفادات کی خاطر صدر دفتر سے بھی بھڑ جاتے تھے۔

بچے آ گئے تو علامہ صدیق ارشد نے انڈے، گھی اور ذبح شدہ مرغی کا گوشت بھیجا۔ کئی دیگر زمیندار مدرسین نے مکئی، گنا، باجرہ، آلو، سوکھی میتھی اور علاقے کی انواع واقسام کی مخصوص اشیاء تحفے کے انداز میں بھیجنا شروع کر دیں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سالانہ معائنوں میں نرمی برتنے کی ایک غیر تحریری درخواست ہے۔ چودھری بشیر احمد کا حوالہ دیتے ہوئے محمد علی آف بھیلہ نے کہا "وہ کہا کرتے تھے کہ وہ ایک مڈل جے وی، میٹرک ایس وی یا اوٹی مدرس کو سوائے اچھی رائے کے اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟ وہ تو محکمے کے کلرکوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور گھر کی کھیتی کی چیزوں کا لین دین رشوت نہیں، باہم خیر سگالی کا اظہار ہے۔"

حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ رشوت کوئی ناجائز کام کرنے کی صورت میں نقدی کی شکل میں لی جاتی ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں انڈہ، مرغی یا غذائی اجناس وغیرہ کا نذرانہ ایک روایت تھی۔ قصور کے متعلق ایک کہاوت تمام سرکاری ملازمین کو ازبر تھی کہ سرکاری ملازم قصور میں تعینات ہو کر روتا ہوا آتا ہے اور جب جاتا ہے تب بھی روتا ہوا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنا وقت تحصیل قصور میں خوش خوش گزار رہا ہوتا ہے۔ میں اپنی پذیرائی اور اپنے میل جول کی روشنی میں اس روایت کو سچ ہی تسلیم کرتا ہوں۔

مدرسین سے میری سانجھ چل رہی تھی۔ میں نے خود مڈل غیر تربیت یافتہ مدرس کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا تھا اور انتہائی نچلے درجے کے مدرسین سے لے کر بی ایڈ مدرسین تک کی ذہنیت کو سمجھتا تھا۔ قصور تحصیل کے مدرسین ویسے بھی بڑے مذہبی تھے اور وہ معمولی اشیا کے لین دین کو یقینی طور پر سانجھ رکھنے کے مترادف ہی سمجھتے تھے۔ گھی، انڈہ اور مرغی غیر کاشتکار کی بھی گھریلو فصل تھی۔ اس میں سے سال میں دو چار مرتبہ زکوۃ نکال دینا ان کی اقتصادیات پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

◆◆◆◆◆

(۲۴)

علاقے کے لوگوں سے میل ملاپ

سرکاری اسکولوں میں سے مڈل اسکول کچہ پکہ کے ہیڈ ماسٹر شیخ اشرف، شیخ برادران کے رشتہ دار تھے اور شیخ محمد اسلم ضلع کے سینئر ترین اے ڈی آئی کے بھائی تھے۔ ان سے ملاقات تنخواہ کے موقع پر ہوئی۔ وہ قدرے بہرے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دوسرے ہی ان کا تعارف نئے افسر علاقہ سے کرادیں تو بہتر ہے۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا تعارف دوسروں نے کچھ اچھے الفاظ میں نہیں کرایا تھا۔

قصور جنوبی میں میونسپل کمیٹی قصور کے بھی چھ سات اسکول تھے۔ قصور جیل کا اسکول بھی اسی سب ڈویژن میں شامل تھا۔ ایک روز جیل اسکول کے انچارج بھی مجھ سے معاینے کی تاریخ لینے آئے۔ قادر بخش نے جیل اسکول کو نظر انداز ہی کر رکھا تھا۔ کچھ پروگرام اوپر نیچے کر کے ان کو تاریخ دی گئی۔ میونسپل اسکولوں کا مرکز ایم سی پرائمری سکول سبزی منڈی تھا۔ اس اسکول کے اول مدرس مشہور نعت خوان اور مجلس حسانؓ کے بانی محمد علی ظہوری قصوری تھے۔ وہ ملنے نہیں آئے تھے البتہ ان کا پیغام آیا تھا کہ وہ بسلسلہ نعت خوانی بڑے مصروف ہیں، فرصت پاتے ہی حاضر ہوں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک ڈبہ مٹھائی اور سیر بھر کٹی ہوئی کھگا مچھلی بھیجی تھی۔ میں نے رسمائیت وتعل کی تو ان کے پیغامبر نے کہا "میں تو حکم کا بندہ ہوں جی، ظہوری صاحب حکم دے گئے ہیں اور اس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔"

بیوی صاحبہ بڑی خوش تھیں۔ ایک تو میری 'ترقی' پر (وہ اے ڈی آئی بننے کو میری ترقی سمجھتی تھی) اور دوسرے بیٹھے بٹھائے گھر گرہستی کی ہر شے مہیا ہونے پر۔ اس نے اب کچھ فہمائشیں بھی شروع کر دی تھیں۔ دفتر کا نائب قاصد میر صاحب کی تحویل میں تھا، لیکن وہ میرے گھر آنے جانے لگا تھا۔ ویسے بھی دفتر کے دن وہ میری ہی تحویل میں ہوتا تھا۔ وہ سبزی

وغیرہ نہ صرف لے آتا بلکہ پکانے کے لیے تیار بھی کر دیتا۔ اسی کی مدد سے بیوی نے چھت کے اوپر ایک کونے میں روٹیاں پکانے کے لئے ایک تنوری بھی لگالی۔

☆☆

ایک اور مدرس عباس خاں بھی میرے پاس آنے جانے لگا۔ شمالی سب ڈویژن میں ہونے کی وجہ سے میرا اس سے کوئی تعلق نہ تھا مگر وہ جب آتا تو میرے چھوٹے دو بچوں کے لیے کھانے یا کھیلنے کی کوئی نہ کوئی چیز لے آتا۔ اس کی مسلسل آمدورفت کے بعد جب میں اس کے احوال و کوائف سے آگاہ ہوا اور قدرے بے تکلفی پیدا ہوئی تو علم ہوا کہ مدرس ہونے کے علاوہ قصور کے ٹرکوں کے اڈے میں بیٹری سروس کی دکان بھی کرتا ہے جس پر زیادہ تر اس کا ایک بااعتماد ملازم بیٹھتا تھا اور بقول اس کے ''اگر ملازم خود بھی کچھ کھا جاتا تھا تو اسے اس کا ملال نہ تھا۔ ملال تو تب ہو جب ملازم اسے کچھ نہ دے۔ جب اس کا جی چاہتا ہے وہ خود بھی دکان پر بیٹھ جاتا تھا، لیکن وہاں کے ماحول، ڈرائیوروں، کلینروں، پانڈیوں، مستریوں، ہیلپروں، کاریگروں اور دلالوں کی دنیا ایسی تھی کہ ان کے درمیان رہ کر اور ان کی گفتگو سن کر اس کا جی چاہتا ہے کہ ایسے شخص کے پاس بیٹھا جائے جس کی گفتگو عام بول چال سے کچھ بلند ہو۔'' اس نے بتایا کہ شاکر علی شاکر، مولوی یحییٰ، خلیل آتش وغیرہ وغیرہ کے پاس بیٹھ بیٹھ کر اب اس کا من اوب گیا ہے اور اب وہ کسی افسر کے پاس بیٹھنا اٹھنا چاہتا ہے۔ مزید بتایا کہ وہ اپنی اس جدوجہد کے ذریعے اپنے بچوں کے لیے مستقبل تلاش کر رہا ہے۔ جو شخص اسے پسند آئے گا وہ اس کے نقش قدم پر اپنے بچوں کو ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ مختصر عرصے میں غلام محمد اور قادر بخش کی طرح عباس خان بھی میرے خاص مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ میں اپنے گردو پیش میں اس قدر کھو گیا تھا جیسے میں برس ہا برس سے ادھر ہی تھا۔

باہم میل جول اور خوش گپیوں میں کھانا پینا بھی چلتا رہتا تھا لیکن حلفاً کہا جا سکتا ہے کہ پیسے کا لین دین کوئی نہ تھا۔

☆☆

امتحان مڈل سٹینڈرڈ میں مجھے چونیاں میں سپرنٹنڈنٹ لگایا گیا۔ وہاں چودھری حمید اللہ اے ڈی آئی تھے اور وہ لاہور کے کسی مرکز میں سپرنٹنڈنٹ لگائے گئے تھے۔ وہ اپنے کلرک کو ہدایت کر گئے تھے کہ وہ خیال رکھے کہ قصور سے آنے والے اے ڈی آئی بھائی کو کسی

قسم کی تکلیف نہ ہو۔ مجھے انھوں نے کہلا بھیجا کہ انھوں نے میری رہائش اور کھانے پینے کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ جب میں چونیاں اسکول پہنچوں گا تو ان کا کلرک رابطہ کرے گا۔ کلرک نے واقعی دفتر والے مکان میں میری رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے کیسے میرے کھانے پینے کا بندوبست کیا، مجھے علم نہیں۔ میں نے اس کا حساب کتاب چکانا چاہا تو اس نے کہا کہ میں حساب کتاب چودھری صاحب سے کروں۔ ان کی اس رعایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ہارون آباد میں امتحانی مرکز کی جو تربیت چودھری کرامت میو نے دی تھی، میں اس پر کاربند نہ رہ سکا۔ اس کی کچھ وجوہات اور بھی تھیں۔

امتحان مڈل سٹینڈرڈ میں محکمہ تعلیم نے دوغلی حکمت عملی اپنا رکھی تھی۔ دیہاتوں میں واقع طلبہ و طالبات کے جملہ مڈل اسکولوں کے لیے لازمی تھا کہ ان میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات امتحان مڈل سٹینڈرڈ پاس کر کے ہی نویں جماعت میں داخلہ لے سکتے تھے جبکہ ہائی اسکولوں کے کچھ ذہین و فطین طلبہ و طالبات امتحان مڈل سٹینڈرڈ میں وظیفے کے حصول کے لیے شمولیت کرتے تھے۔ نویں جماعت میں جانے کے لیے ان کا امتحان اسکول ہی لیتا تھا۔ اس دوغلی حکمت عملی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا کہ بعض مڈل اسکولوں کے بیشتر طلبا آٹھویں جماعت میں آتے ہی امتحان مڈل سٹینڈرڈ کے خوف سے ہائی اسکولوں میں داخلہ لے لیتے اور مڈل اسکول خالی ہو جاتے، لہٰذا محکمانہ امتحان مڈل سٹینڈرڈ میں 'ہولا ہتھ' رکھنے کی روایت چلتی تھی۔

چونیاں کا امتحانی مرکز مخلوط تھا۔ محکمے نے سپرنٹنڈنٹ تو مجھے ہی رکھا تھا لیکن نگران عملے میں چند خواتین تعینات کی تھیں۔ امتحان دینے والی لڑکیاں بھی خاصی عمر کی تھیں۔ کچھ طالبات علاقے کے مدرسین کی بہنیں یا بیٹیاں تھیں۔ پرائیویٹ خواتین امیدواروں میں کئی مدرسین کی بیگمات بھی شامل تھیں۔ پہلے ہی روز جب میں مرکز کا چکر لگاتے وقت خواتین کے حصے میں جانے لگا تو زور سے کھنکھارا۔ نگران معلمات اور امیدواروں نے پردہ کرنے کی کوشش میں کئی کتابیں، گائیڈیں اور بوٹیاں نیچے گرا دیں، پورا زنانہ حصہ ہی نقل کر رہا تھا۔ میں نے نگران معلمات سے کہا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' تو وہ کوئی جواب نہ دے سکیں لیکن پرچہ ختم ہونے کے بعد انھوں نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ جب انھیں محکمے نے نگرانی کے لیے تعینات کر رکھا ہے تو سپرنٹنڈنٹ ان کے حصے میں آیا ہی کیوں ہے اور پردے کی حرمت کیوں ملحوظ نہیں رکھی گئی؟ شرارتی عناصر نے طالبات اور معلمات کے لواحقین کو مشورہ دیا کہ اگر اگلے دن بھی

سپرنٹنڈنٹ طالبات کے حصے میں پہنچے تو طالبات امتحانی کمرنے سے واک آؤٹ کر جائیں۔ اگلا پرچہ انگریزی کا تھا اور دیہاتی لڑکیوں کو انگریزی کی معلمات ہی نصیب نہیں ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ دور دراز کے مردانہ مڈل اسکولوں میں انگریزی اساتذہ کی کمی تھی، زیادہ تر غیر تربیتی ایف اے معلم ہی انگریزی مدرس تھے۔ میں نے مصلحت کے پیش نظر لڑکیوں کے شعبے میں جانے کی جرأت ہی نہیں کی۔

اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کس قسم کا وقت اپنے پہلے ہی محکمانہ امتحان میں گزارا؟ مجھے نہ صرف مڈل اسکول کالا کا پرانا دور یاد آتا رہا بلکہ انگریزی کے ہاتھوں عاجز طلبہ کی شکلیں بھی حافظے میں گھومتی رہیں۔ مجھے سنگھوئی کا سفر بھی یاد آیا۔ فرائض منصبی ادا کرنے والی کوئی بات نہ تھی بلکہ ایک مولوی قسم کے دیندار مدرس نے مجھے یہ معلومات بھی بہم پہنچائیں کہ سرداروں کی ایک لڑکی کا تو پرچہ ہی باہر سے حل ہو کر آتا رہا ہے اور مجھے پتہ تک نہیں چل سکا۔ میری یہی کامیابی تھی کہ امتحان کسی گڑبڑ کے بغیر اختتام کو پہنچا اور آخری روز سارے امتحانی عملے کی دعوت ایک ایسے ایس وی مدرس نے کی جس کی بیوی نے سو فیصد نقل کی تھی۔ گھر میں اس کی بیوی اور دوسری نگران معلمات میرے سامنے ہی بے پردہ بیٹھی گپیں لگاتی اور گھومتی رہیں۔ انھوں نے فرشی دستر خوان پر کھانا بھی مردوں کے ساتھ مل کر کھایا۔ سچ ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ کمرہ امتحان میں اگر وہ پردے کا شور نہ مچاتیں تو میری آمد پر انھیں کم از کم بوٹیاں چھپانے کا تکلف تو کرنا ہی پڑتا۔

میرے خیال میں جملہ امتحانی مراکز میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا اس کے باوجود اگر طلبہ کی کثیر تعداد انگریزی میں فیل ہوتی تھی تو اس سے 'نقل را عقل باید' والی ضرب المثل کی صداقت عیاں ہوتی ہے۔

☆☆

ضلع لاہور کی جماعت پنجم کے وظیفے کا امتحان سٹی مسلم لیگ ہائی اسکول سید مٹھا بازار' شاہی محلہ لاہور میں ہوا۔ یہ اسکول ایک متروکہ حویلی دھیان سنگھ میں واقع ہے۔ اس وقت یہ عمارت اپنی بوسیدگی کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ دربار ہال میں ضلعی انسپکٹر سکولز کی نشست اونچی کر کے اس جگہ رکھی گئی جہاں روایت کے مطابق راجہ رنجیت سنگھ دربار کیا کرتا تھا۔ وہ دریچے بھی نظر آرہے تھے جہاں رانی جنداں اور دیگر درباری امراء کی دھرم پتنیاں بیٹھ کر دربار کی کارروائی

دیکھا کرتی تھیں۔ ضلع بھر کے اے ڈی آئی اس امتحان کے نگران بھی تھے اور پرچے بھی ہم ہی کو جانچنے تھے۔

طریق کار کے مطابق پہلے جملہ امیدوارانِ امتحان سے اردو املا کا پرچہ لیا گیا۔ املا کا معیار بلاشبہ ایسا تھا کہ وہی بچے اس میں کامیاب ہو سکتے تھے جنہوں نے امتحان وظیفہ کی خصوصی تیاری کی ہوتی تھی۔ وہ اساتذہ اور اسکول جو بچوں کو اس امتحان کی خصوصی تیاری کراتے تھے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ املا کے بعد چند اے ڈی آئی املا کے پرچوں کی جانچ کرتے اور ریاضی کا پرچہ لیتے۔ میں بھی املا جانچنے والی جماعت کا رکن تھا۔ ہم نے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ریاضی کا پرچہ ختم ہونے تک املا کے پرچے دیکھ کر انھیں فہرست نتیجہ پر چڑھا دیا اور پڑتال بھی کر لی تھی۔ ریاضی کا پرچہ ختم ہوتے ہی جانچ کا کام شروع ہو گیا۔ وظائف کی تعداد سے دگنی تعداد کو نمبروں کے حساب سے منتخب کرنے کے بعد بقیہ طلبہ کو 'ناک آوٹ' کر دیا گیا۔

دوپہر کا کھانا سکول والوں نے دیا۔ ملک غلام حیدر، شیخ محمد اسلم، میر قمر الدین اور خان عبد المجید سینئر ترین اے ڈی آئی تھے۔ ان کی درخواست ہی پر قاضی نواب علی صاحب نے اسکول والوں کا کھانا قبول کیا تھا ورنہ ان کا فارمولا تھا کہ آدھ پاؤ گوشت فی کس کے حساب سے علم الدین نائب قاصد قصور سالن تیار کرے اور تنوری روٹیوں کے ساتھ کھا کر خدا کا شکر بجا لایا جائے جہاں کوئی خصوصی میزبان نہ ہوتا قاضی صاحب اس فارمولے پر عمل کرتے۔

قاضی صاحب کی طبیعت مبالغے کی حد تک نفیس تھی۔ وہ حتی الوسع دوسرے کے گلاس میں پانی بھی نہ پیتے تھے۔ برتنوں کو لائف بوائے صابن سے اپنے سامنے دھلواتے تھے۔ علم الدین کو بھی ہاتھ دھلوانے کے بعد کسی چیز کو ہاتھ لگانے دیتے تھے۔ اس قدر جراثیم سے خوفزدہ ہونے کے باوجود ان میں دوسروں پر اعتماد کر لینے کی خوبی بھی تھی۔ جب انھیں یقین دلا دیا جاتا کہ ان کی مرضی کے عین مطابق سارا سلسلہ کیا گیا ہے اور حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے تو یقین بھی کر لیتے۔ علم الدین اور بابا محمد دین کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اسکول والوں کے کھانے کے انتظامات کی کڑی نگرانی کریں۔ کھانے سے پہلے دونوں کی تصدیق کے بعد انھوں نے لقمے کے لیے ہاتھ بڑھایا، پھر ہم باقی حضرات ان کی پیروی میں کھانے پر 'ٹوٹ' ہی پڑے۔

شام چار بجے تک باقی پرچہ جات لیے گئے، ان کو باقاعدہ مہر بند کیا گیا اور اسکول کے

ایک کمرے میں رکھ کر اسے دو تالے لگائے گئے۔ ایک تالے کی چابی میر قمر الدین کو اور دوسری چابی خان عبدالمجید کو دی گئی کہ دونوں کی دیانتداری قاضی صاحب کی نظر میں ہر شبے سے بالاتر تھی۔ میر قمر الدین کو واپس قصور پہنچنا تھا۔ انھیں قاضی صاحب نے تاکید کی کہ اگلے روز صبح ہم تو نو بجے پہنچیں لیکن چابی بردار حضرات پونے نو بجے تک ضرور پہنچ جائیں اور ان کی آمد کے بعد 'سٹرانگ روم' کھولا جائے۔

اگلے روز پرچے جانچے گئے۔ سینئر اے ڈی آئی صاحبان نے سو فیصد پڑتال کی۔ تعداد کے مطابق کارپوریشن، میونسپل کمیٹی قصور چونیاں اور ضلع کونسل کے وظائف پچاس فیصد سے زائد نمبر لینے والے طلبہ کو عطا کیے گئے۔ ہر فہرست میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ اگر کوئی طالب علم کسی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تو اس کی بجائے اس سے کمتر نمبر حاصل کرنے والے اگلے طالب علم کو وظیفہ مل سکے۔ اگلے ہی دن کامیاب طلبہ کی فہرست دفتر میں آویزاں کر دی گئی اور نقول متعلقہ اداروں کو مہیا کر دی گئیں۔ نہ رو رعایت، نہ سفارش...... نہ انتظار کا جھنجھٹ...... وقت نے دیگر روایتوں کی طرح یہ روایت بھی ختم کر دی ہے۔ اب ۲۰۰۰ء میں ہونے والے امتحانِ وظیفہ کا اعلان اگر ۲۰۰۱ء کی ابتدا میں ہو جائے تب بھی غنیمت جانیے!

کچھ ایسا ہی طریق کار ہم نے جے وی اور ایس وی اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں دیکھا۔ میرٹ کے حساب سے کامیاب امیدواران امتحانات جے وی، ایس وی، او ٹی وغیرہ کی فہرستیں اسکول قصور اور گکھڑ سے موصول ہوتیں جنہیں پچھلے سال کی فہرست کے نیچے دفتر ضلعی انسپکٹر کے باہر آویزاں کر دیا جاتا۔ جو اسامی خالی ہوتی اس کو پر کرنے کے بعد متعلقہ کلرک متعین ہونے والے استاد کے نام پر فہرست کے اوپر سرخ لکیر کھینچ دیتا۔ ہر امیدوار جب چاہتا آکر فہرست دیکھ لیتا۔ اگر اسامیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو ان کی فہرست بھی باہر لگائی جاتی کہ امیدوار اپنے میرٹ کی بنیاد پر گھر کے نزدیک ترین اسکول کا انتخاب کر سکے۔

کبھی کبھار اور چار و ناچار اگر کوئی سادہ لوح امیدوار یا اس کا وارث یہ پتہ کرنے دفتر آجاتا کہ اس کی باری آئی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو کب آرہی ہے تو متعلقہ کلرک اس کو نوٹس بورڈ پر لے جاتا اور اسے سمجھاتا کہ ان فہرستوں کی روشنی میں وہ خود ہی دیکھ لے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔

☆☆

ضلعی انتظامیہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۴ء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تعلیمی سال کے اس آخری دن

تک جملہ تعلیمی، تدریسی، ترقیاتی اور مالیاتی اہداف پورے کرنا لازمی تھے۔ ہر شخص مصروف تھا۔ ہر اے ڈی آئی اپنی سطح پر تفویض کردہ کاموں کے علاوہ ضلعی اور ڈویژن کی سطح کے کاموں کو نبھا رہا تھا۔ جب ہمیں افسران بالا کی زیرنگرانی کوئی کام کرنا ہوتا تو ہماری حیثیت نیازمندوں جیسی ہوتی لیکن جب ہم 'فیلڈ' میں ہوتے تو وہاں مرکزِ نگاہ ہم ہی ہوتے۔ سالانہ معاینہ جات ایک دن میں دو دو یا تین تین اسکولوں کے بھی کرنا پڑ رہے تھے۔ اب مجھ پر چودھری بشیر احمد کی صلاحتیں روشن ہو رہی تھیں اور اس کی مقبولیت کی وجوہ کا احساس ہو رہا تھا۔ میر قمرالدین کے پہلے روز کے بیان کے مطابق مجھے قصور جنوبی کے ہیڈ ماسٹروں نے سب کچھ سکھا دیا تھا۔

چودھری بشیر احمد نے ہر اسکول میں خواہ وہ کسی بڑ کے درخت کے نیچے یا کسی زمیندار کی حویلی کے دامن میں لگتا تھا، افسر معاینہ کے لیے چند چیزیں اردگرد کے اسکولوں سے یا پھر ریڈکراس فنڈ سے مہیا کر رکھی تھیں۔ ایک چارپائی' موسم کے مطابق بستر' صابن' تولیہ' آئینہ' تیل کنگھی' سلیپروں کا جوڑا' لوٹا' مصلیٰ' بالٹی ڈونگا' شیشے کے گلاس' چائے کے لیے کپ پیالیاں اور چار پانچ عدد نئے ٹاٹ...... اگر افسر معاینہ اتفاقیہ آ جاتا اور قیام کا عندیہ دیتا تو عمارت رکھنے والے اسکول کے اندر یا بلا عمارت اسکول کی صورت میں کسی مانگی تانگی جگہ پر اسکول کے تربیت یافتہ طلبہ جگہ صاف کر کے پہلے اس کے فرش پر ٹاٹ بچھاتے پھر چارپائی ڈال کر بستر بچھاتے۔ پانی بھرتے، قبلہ رخ مصلیٰ بچھاتے اور اسکول یا مانگے کی میز پر باقی ضرورت کی سب اشیاء سجا دیتے۔ یوں معاینہ ایک پکنک کی صورت اختیار کر جاتا اور پکنک میں مرضی کے مطابق کھانے پینے کا انتظام تو کیا ہی جاتا ہے۔

میں نے بیوی بچوں کی تنہائی کے پیش نظر والدہ کو بھی قصور ہی میں بلا لیا تھا۔ دراصل میری تمنا تھی کہ بچاری بوڑھی، بیوگی کی ماری ماں بھی میری جعلی افسری کی بہار کا نظارہ کر لے۔ بینک بیلنس نہیں تھا تو کیا ہوا' کھانے پینے اور اچھا اوڑھنے پہننے کو تو تھا۔ میں خود دورے کے دن رات 'لیمپ' میں بسر کرتا اور اگلے دن کسی اسکول کا معائنہ کر کے ہی دفتر آتا۔ دفتر اگر نہ بھی آتا تو کیا تھا، سو بہانے سمجھ میں آ چکے تھے۔ بڑبڑانے والے میر صاحب خود بھی بڑے مصروف تھے۔ ویسے بھی انھوں نے دفتر میں اپنے حلقے کے چند مدرسین سے کہا تھا کہ جنوبی کا اے ڈی آئی اپنے کام کا ذمہ دار ہے وہ اپنے کام کے ذمہ دار ہیں، بے شک وہ اپنا دفتر اپنے گھر لے جائے۔ مجھے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ خشکی کے باوجود میر صاحب بے ضرر انسان تھے۔ انھوں

نے میری کوئی شکایت ضلعی انسپکٹر سے نہیں کی تھی حالانکہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ ہر ماہ ارزاں نرخوں پر قصور کے خالص مرچ مسالے اور خالص دیسی گھی وغیرہ ضلعی انسپکٹر کو مہیا کرتے تھے جن کے ساتھ میر صاحب کا 'واحد معاملہ' ہے۔

میر صاحب کی یاد آتی ہے تو ان کے متعلق مزید باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ بچارے اپنی دیانتداری اور کھرے مزاج کی وجہ سے اساتذہ میں مقبول نہیں تھے۔ مقبولیت کے عدم توازن کا احساس انھیں چودھری بشیر احمد نے دلایا تھا جس کے گُن قصور جنوبی کا ہر مدرس گاتا تھا اور لازمی طور پر شمالی کے اساتذہ رشک کرتے تھے کہ کاش ان کا اے ڈی آئی بھی ان میں گھل مل کر بیٹھتا اور ان کی واہی تباہی سنتا، ان کے تحفے تحائف قبول کرتا اور وہ کہہ سکتے کہ ان کی اپنے افسر علاقہ سے بڑی دوستی ہے۔ اچانک ہی میر صاحب کی ترقی ہو گئی اور انھیں پنجاب کی آخری سرحد چک ۳۰۳/ایچ آر نز دفورٹ عباس ہیڈ ماسٹر لگا دیا گیا...... ان دنوں نئے تقرر اور ترقی بہاولپور ڈویژن ہی میں ہوتی تھی، گنجائش ہی وہاں تھی۔ منہ اندھیرے گاڑی پر ان کو سوار کرانے انھی جیسے خشک مزاج کا ایک مدرس اور ان کا دس گیارہ سالہ بیٹا موجود تھا۔ میں شاید میر قمر الدین صاحب کی یہی بے بسی دیکھنے ان کو الوداع کہنے اسٹیشن پر پہنچا تھا۔ جب وہ اپنے بیٹے سے بغلگیر ہوئے تو ان کا دل پگھل گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ انھوں نے میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا لیکن گھر کا خیال رکھنے کے بارے میں بھی انھوں نے ماسٹر خشکی ہی کو ہدایت دی۔

القصہ معائنہ جات تمام ہوئے۔ سنٹر ہیڈ ماسٹروں کی سفارش پر مدرسین کو سالانہ ریمارکس دیئے گئے۔ بیشتر 'گڈ' ہی تھے اور اب صرف ایک مرحلہ پانچویں جماعت کے مرکزی امتحان کا باقی رہ گیا۔ اس کے لیے دو مراکز مقرر ہوئے جن کے لیے ۲۸ اور ۲۹ مارچ دو دن مختص کیے گئے۔ ۲۸/مارچ کو میونسپلٹی کے اسکولوں کے سنٹر کا امتحان لیا گیا جبکہ ۲۹/مارچ کو دیہاتی سکولوں کی پانچویں جماعت کے سنٹر کا امتحان مرکزی مقام کھڈیاں پر لیا گیا۔

☆☆

میں نے وہیں دیکھا کہ بیشتر معلمین اور بالخصوص سنٹر اسکولوں کے اول مدرسین اور ہیڈ ماسٹر سید طالب حسین شاہ اول مدرس بھیلہ ہٹھاڑ سے افسوس کر رہے ہیں۔

وہ انھیں جواب میں کہہ رہے ہیں ''مجھے مار دیا گیا ہے، میری افیون کی گولی چھین لی گئی

ہے۔اس میں اے ڈی آئی صاحب کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھرا عمر خاں کے چمچے محمد علی کا ہے۔غریب کو کوئی روٹی کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔'' پھر سب مل کر قہقہہ لگاتے اور سید طالب حسین سے ہمدردی کرتے اور کہتے ''ایک در بند سو در کھلے'' اور وہ جواب دیتے۔''ہاں وہ تو ہے ہی۔''

امتحان کے بعد نتیجہ میں نے اپنی تحویل میں لے لیا کیونکہ جملہ نتائج کی منظوری اسکول کے امتحان کے نتائج کے رجسٹروں پر اندراج کے بعد مجھے ہی دینا تھی اور دستور کے مطابق یہ منظوری ۳۰ مارچ سے پہلے نہیں دی جاتی تھی۔اس مقصد کے لیے اگلے روز سب سنٹر مدارس کے اول مدرسین اور ہیڈ ماسٹر صاحبان کو قصور میرے دفتر میں حاضر ہونا تھا۔

سنٹر کے امتحان کے موقع پر بھی مڈل اسکول کچہ پکہ کے ہیڈ ماسٹر کی بجائے ان کا ایس وی ٹیچر حیدر علی آیا اور اس نے مجھے شیخ صاحب کی خراب طبیعت کے متعلق بتانے کے بعد یہ بھی بتایا کہ اس نے تین بھینسیں پال رکھی ہیں اور بہت سے افسران کو صحیح داموں میں خالص دیسی گھی بغیر خرچہ آمد و رفت کے مہیا کرتا ہے اگر مجھے ضرورت ہو تو وہ خدمت کے لیے حاضر ہے۔میں نے دل میں سوچا کہ جیتے رہیں جے وی مدرسین جو گھی کا کوزہ خالی ہی نہیں ہونے دیتے اور قیمت کا ذکر بھی نہیں کرتے۔میں اس دخل در معقولات کے باوجود شیخ نذیر صاحب سے یہ پوچھنا نہیں بھولا کہ سید طالب حسین شاہ سے ان سب کی نوک جھونک کس موضوع پر تھی اور اس میں اے ڈی آئی کا ذکر کیوں آ رہا تھا؟

شیخ صاحب نے مجھے جو تفصیل بتائی اُسے سن کر میں اپنے لاشعور کی کارگزاری پر حیرت زدہ رہ گیا۔حیدر علی ایس وی ٹیچر کچہ پکہ کی بات سن کر میرا خیال اپنے دوست حیدر علی (لالو ڈاکو) کی طرف چلا گیا اور پھر کئی جگہوں اور شخصیتوں سے ملاقاتیں کرتا ماسٹر دلدار علی تک پہنچا۔مجھے دلدار علی کی میتر انوالی میں ملاقات یاد آئی اور ساتھ ہی اس کے تحفے کا خیال بھی آیا جو دلدار علی کی زندگی کے واقعات و مشاہدات پر مبنی ایک کاپی کی صورت میں پڑا تھا۔میں نے اس دوران میں کئی کہانیاں بھی عدیم الفرصت ہونے کے باوجود لکھی تھیں لیکن دلدار علی کی فہمائش کے مطابق ان کی بیاض سے استفادہ کم کیا تھا۔مجھے تو معلوم نہیں تھا لیکن لاشعور جان چکا تھا کہ دلدار علی کی کوئی کہانی ابھی منظر عام پر آنے والی ہے۔

شیخ نذیر نے سید طالب حسین کی 'دربندی' کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتے ہوئے بتایا ''میں نے جماعت پنجم کا امتحان ہفتہ پہلے نہ لے کر طالب حسین شاہ سے کیا ظلم کیا ہے؟'' ظلم کی یہ

کہانی حکیم یعسوب الحسن کی کہانی سے حرف بحرف ملتی ہے۔ اس میں فرق اول مدرسین کے ناموں یا پھر نہر کی پٹڑی کی جگہ متبادل آرام گاہ ریلوے سٹیشن کی درجہ اول کی انتظار گاہ میں ہے۔ میں آپ کو حکیم یعسوب الحسن کی واردات کا حال دلدار علی کی پوتھی سے سناتا ہوں کہ ان سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا ہو جائے اور آپ جان سکیں کہ طالب حسین شاہ پر کیا ظلم ہوا تھا۔

☆☆

حکیم یعسوب الحسن تھے تو جے وی معلم لیکن اپنی تیز وطرار طبیعت کی وجہ سے اپنے خاندانی پیشے طب میں بھی خاصی درک رکھتے تھے۔ ان کا مطب قصباتی ہونے کی وجہ سے بہت چلتا تھا۔ قصبہ بھی ایسا تھا کہ وہاں دن رات ہن برستا تھا۔ جوان عمر سے لے کر ادھیڑ عمر تک کے تمام باشندے غیر ممالک میں تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں ہی ادھر تھیں۔ قصبے کے ہائی اسکول میں حکیم صاحب کے ہم زلف عابد حسین ہیڈ ماسٹر تھے۔ محکمے سے بنا کر رکھنے کی وجہ سے حکیم صاحب نے اپنے اسکول میں ضرورت سے زیادہ اساتذہ جمع کر رکھے تھے جن میں سے چند غریب الطبع اساتذہ کو وہ مطب کی ادویہ تیار کرنے کے لیے اور اپنی بھوری بھینس کی نگہداشت کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ افسران معاینہ بھی پوچھ کر کہ حکیم صاحب موجود ہیں تب اسکول آتے تھے۔ حکیم صاحب اپنے عزیز، ہیڈ ماسٹر ہائی سکول عابد حسین سے کہتے:

''عابد حسین! تُو تو بس دیوانہ ہے، پاگل ہے...... چیخ چیخ کر پڑھاتا ہے پھر پڑھایا ہوا سنتا ہے۔ طالب علموں کے والدین سے ان کے بچوں کی بہتری کے نام پر ملاقاتیں کرتا ہے۔ اتنی محنت، اتنی جان ماری...... اور وہ بھی ڈھائی تین سو کے لیے...... کھانے کا فکر ہے نہ بال بچے کا...... ماسٹر کیا بنا ہے کہ خود ہی درسگاہ بن کر رہ گیا ہے۔''

حکیم صاحب کے پند و نصائح سن کر عابد حسین پوچھتے ''اچھا تو بھائیا جی! میں کیا کروں؟''

''بیٹھکیاں لگاؤ، ٹیوشن پڑھاؤ...... یہاں قصبے میں بڑا مال آ رہا ہے، اسے اکٹھا کرو، کام آئے گا۔'' پھر حکیم صاحب اپنی مثال دیتے کہ وہ کس شان سے نوکری کر رہے ہیں اور کس آن بان سے مطب چلا رہے ہیں۔ سوائے پیسے کمانے کے اور کوئی غم نہیں ہے۔

عابد حسین مزہ لینے کے لیے پوچھتے ''بھائیا جی! وہ جو آپ کا امتحانات سے پیسہ کمانے کا جو طریقہ ہے، مجھے ذرا وہ سمجھائیں...... وہ میرے بھی کام آ سکتا ہے کہ نہیں؟''

''اس میں سمجھانے والی کونسی بات ہے، کئی دفعہ تو تمھیں سمجھا چکا ہوں پر عمل کرو تو تب ہے نا......'' اور پھر حکیم صاحب بتاتے کہ وہ کس طرح وسط مارچ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سے جماعت پنجم کے طلبا کا سینٹر کا امتحان کراتے ہیں۔ وہ فرداً فرداً ہر طالب علم کو خواہ اس کا تعلق کسی بھی پرائمری سکول سے ہو بتا دیتے کہ وہ فیل ہو گیا ہے' خواہ وہ اول ہی آ رہا ہو۔ ان کی مائیں' چچا' ماموں وغیرہ بچے کو پاس کرانے کے لیے حکیم صاحب کے مطب میں آتے ہیں کیونکہ ان کے باپ تو بیرون ملک یا اندرونِ ملک روپیہ پیسہ کمانے گئے ہوتے ہیں۔ وہ خرچہ وغیرہ دیتے اور کچھ افسر کے لیے بھی نذر کرتے ہیں۔ پھر ایک روز حکیم صاحب گھر سے آلوؤں کے پراٹھے پکواتے ہیں اور دری لے کر افسر کو ملنے چلے جاتے ہیں تا کہ بچے کو کامیاب کرایا جا سکے۔ دن بھر وہ نہر اپر باری دوآب کے کنارے موزوں جگہ پر دری بچھا کر سورہتے ہیں' مکمل آرام کرتے ہیں ...... نہ استاد...... نہ شاگرد اور نہ ہی مریض، کوئی مخل نہیں ہوتا۔ شام کو واپس آ کر گھر میں آرام کرتے ہیں اور اگلی صبح مطب ہی میں فیل ہونے والے بچوں کے لواحقین کو مطمئن کرنے کے لیے کہتے کہ فکر نہ کریں، کام ہو جائے گا...... فعل مستقبل میں گول مول بات کرتے ہیں۔

تفصیل سے بات کرتے ہوئے بتاتے کہ افسر نہیں ملا یا کہتے کہ نذرانہ کم تھا وہ نہیں مانا...... پچھلا کھایا پیا ہضم ...... نئے سرے سے بات ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ پھر افسر سے ملنے کے لیے خرچہ پانی لیتے اور واقعی شہر چلے جاتے۔ مطب کے لیے ادویات خرید لاتے یا بال بچوں کی ضرورت کی اشیاء۔ دوپہر کو من پسند ہوٹل میں کھانا کھاتے ......اور پھر لڑکے کے پاس ہو جاتے۔ حکیم صاحب کی مٹھائی کھری ہو جاتی۔

طالب حسین شاہ حکیم یعسوب الحسن کے بھائی بند ہی تھے مگر انھیں یہ سب کچھ چنیا بیگم کے لیے کرنا پڑتا تھا۔ میں نے شیخ نذیر کو حکیم صاحب کی کہانی سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یعسوب الحسن جو اپنے ہم زلف کو چیخ چیخ کر پڑھانے کے خطرناک نتائج سے ڈرایا کرتے تھے اور خود ہمہ تن ہمہ وقت پیسے کی فکر میں رہتے تھے، ایک دن اسکول کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی کرسی سے گر پڑے اور عزیز و اقارب نے انھیں نیلے پل والے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے لٹا دیا۔ عابد حسین نے ان کے بعد بھی دیر تک اپنا مشن جاری رکھا، انھوں نے کئی بھگوڑوں' نالائقوں' پھسڈیوں کو دلدل سے نکال کر تعلیم کی صحیح راہ پر ڈال دیا۔ اب وہ دنیا میں نہیں لیکن انھوں نے

ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا ایک اسکول جاری کیا جو اب بھی ان کی بیٹی کی زیرنگرانی چل رہا ہے اور صرف اس لئے چل رہا ہے کہ اسے نیک نیت اور نیک اطوار عابد حسین نے قائم کیا تھا۔ ان کو دعائیں دینے کے لیے ہزاروں ہاتھ اٹھتے رہتے ہیں۔

☆☆

۳۰ مارچ کو علی الصباح ہی اساتذہ کرام نتیجے کی منظوری لینے کے لیے آنا شروع ہوئے۔ جو بھی آتا مٹھائی کا ایک ڈبہ اٹھائے ہوتا۔ شام تک درجن بھر ڈبے میرے پاس جمع ہو گئے تو میں نے بابا علم دین سے پوچھا "میرا سارا کنبہ تو ایک ڈبہ مٹھائی بھی نہیں کھا سکتا' ان باقی ڈبوں کا کیا کیا جائے؟"

"رشتے داروں کو تحفے میں بھیج دیں یا پھر بابا بلھے شاہ کے مزار پر جا کر بانٹ دیں۔"

مجھے بابے کی تجویز پسند نہیں آئی' میں نے ایک ایک ڈبہ علم الدین کے علاوہ اپنے تینوں مصاحبین کے گھر بھجوایا۔ ایک ڈبہ شیخ عبدالغفور کے گھر بھیجا اور ایک میاں عبدالرحمٰن کے گھر۔ دو ڈبے اگلے روز ایم ایڈ کی جماعت میں لے جانے کے لیے رکھ لیے...... لیکن اگلی صبح میری سوچ بدل گئی اور بقیہ مٹھائی میں نے علم الدین کے ہاتھوں بابا بلھے شاہ کے زائرین میں تقسیم کرا دی۔

میں اپنے جملہ صدر معلمین سوائے شیخ محمد اشرف جو حاضر نہیں تھے' کی زیرکی' دور بینی اور حکمت عملی کا پورا قائل نتائج کی منظوری کے وقت ہوا۔ جملہ مدرسین نے رجسٹر امتحانات پر دستخط کروانے کے ساتھ ساتھ دس دس روپے کے خرچ کی منظوری کی بے شمار قراردادیں بھی منظور کرائیں۔ یہ قراردادیں سکول کی انجمن ہلالِ احمر فنڈ سے خرچ کرنے کی اجازت کے مترادف ہوتی ہیں۔ ان قراردادوں کے ذریعے انھوں نے دوران سال جو سرمایہ کاری اے ڈی آئی اور اپنی ذات پر کی وہ وصول کی جاتی تھی۔ میرا یہ تاثر غلط نہ تھا لیکن کیا کیا جاتا...... افسر ماتحتوں کے مائی باپ بھی تو ہوتے ہیں۔

اس موقع پر مجھے اپنا ایک پیٹی بند بھائی شیخ نیاز الدین یاد آیا جس کا ذکر بھی ولدار علی کی پوتھی میں تھا۔ اس کے بھائی کا بیٹا جو شیخ کا متوقع داماد بھی تھا ایم بی ایس کر رہا تھا۔ وہ جس سکول میں جاتا وہاں دس روپے کی ایک قرارداد منظور کرنے کی فہمائش کرتے ہوئے کہتا "ایک غریب بچہ بڑا لائق نکلا ہے۔ اس کی امداد ہمارا فرض ہے۔" اول مدرس اگر کہتا کہ وہ یہ کام کر دے گا تو نیاز الدین بالکل اعتماد نہ کرتا وہ وہاں سکول ہی میں بیٹھ جاتا' کسی نائب مدرس سے منی

آرڈر فارم بھرواتا' قریبی بینک یا ڈاک خانہ سے منی آرڈر کروانے کے بعد رسید مع قرارداد ہلال احمر کی متعلقہ فائل میں لگواتا اور رجسٹر میں اندراج کرواتے ہوئے لکھواتا "غریب طالب علم کی مدد کی گئی۔"

مٹھائی لانے کی قبیح رسم کو نقدی کی صورت میں تبدیل کرنے کا سہرا بھی ہمارے ہی ایک ساتھی کے سر ہے۔ اس تبدیلی کو اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی کہ اس نے امتحان کے علاوہ دیگر مواقع پر بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور اس سے سب فیض یاب ہوئے۔

میری ماں مرحومہ نے وہ مٹھائی چکھی تک نہیں تھی۔ اُن کے خیال میں میرا رزق ناپاک ہو گیا تھا اور میں 'وڈیاں' لے رہا تھا (پنجابی میں رشوت کو وڈی کہا جاتا ہے)۔ ان کے اصرار پر میں نے انھیں چھوٹے بھائی کے ہاں شالیمار کے قریب واقع بستی نصیر آباد پہنچا دیا۔ میری بیوی نے ان کو کپڑوں کا ایک اچھا سا جوڑا ابنا کر دیا تھا جو ماں دانستہ ادھر ہی چھوڑ گئیں اور میری بیوی کو کہہ گئیں "یہ جوڑا کسی کو اللہ واسطے دے دیا جائے۔"

ماں کو میری 'خوش حالی' جو انتہائی معمولی سطح پر تھی' کھٹک رہی تھی۔ مجھے اس کا بڑا احساس ہوا لیکن وہ دن ایسے احساسات کو سلا دینے والے تھے۔

☆☆

غلام محمد شام کے قریب آتا اور میرے بچوں کو نارمل اسکول اور گورنمنٹ ہائی اسکول کے مشترکہ کھیل کے میدان میں لے جاتا' وہ کھیل کود لیتے۔ قادر بخش نے دفتری کام میں کبھی غفلت نہیں دکھائی' کبھی کسی چٹھی کے بارے میں 'یاد دہانی' کا پروانہ نہیں آیا۔ عباس خاں مسلسل آتا رہا اور ننھے ننھے تحفے لاتا رہا۔ وہ کبھی کسی مدرس کے تبادلے کا خواہاں نہ ہوا' کبھی کوئی اور سفارش بھی نہیں کی' عجیب قسم کا آدمی تھا۔ بے غرض انسان تھا۔

موسم بہار کی تعطیلات میں جے وی کلاس کا داخلہ برائے سال ۱۹۶۴۔۶۵ء ہوا۔ رجسٹرار محکمانہ امتحانات' سید تقی شاہ صاحب داخلہ کرنے تشریف لائے۔ دونوں اے ڈی آئی بھی داخلے کے عمل کے وقت نارمل سکول میں حاضر رہنے کے پابند کیے گئے۔ داخلے کی مختلف درجہ بندیاں تھیں بالکل نئے طالب علم اور غیر تربیت یافتہ مدرسین...... ایک امیدوار ایسا تھا جو اپنے آپ کو گڈول پرائمری اسکول کا مدرس ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے چند روز قبل ہی گڈول اسکول کا معائنہ کیا تھا وہاں وہ مدرس نہیں تھا۔ میرے پاس قصور جنوبی کے گوشوارے تھے ان

میں بھی اس کا نام نہیں تھا لیکن اس کا اصرار تھا کہ وہ وہاں مدرس ہے۔ اس کے پاس انجمن کا جاری کردہ تصدیق نامہ بھی موجود تھا۔ رجسٹرار صاحب نے اسے کہا کہ وہ تصدیق نامے کی علاقے کے افسر سے توثیق کرائے۔ میں نے امیدوار کے مدرس ہونے کی توثیق نہیں کی۔ تاہم امیدوار کو اس شرط کے تحت داخلہ دے دیا گیا کہ وہ دس دن کے اندر اندر مدرس ہونے کا توثیق شدہ تصدیق نامہ پیش کرے گا تو داخل رہے گا ورنہ اس کا داخلہ منسوخ تصور ہوگا۔

وہ امیدوار شیخ عبدالغفور، پی ٹی آئی سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور اور قصور میں میرے پہلے میزبان کا پروردہ تھا اور وہ اس کے زبردست سفارشی تھے۔ شیخ صاحب کو میں نے منت سماجت کر کے ٹالا۔ پھر کئی معززین ایک ایک کر کے تشریف لائے۔ بعض نے تسلیم بھی کیا کہ وہ واقعی وہاں مدرس نہیں ہے لیکن داخلہ مل جانے کی صورت میں اس کا مستقبل سنور جائے گا۔ شیخ صاحب بھی مسلسل آ رہے تھے۔ ادھر سے دس دن ختم ہونے والے تھے۔ مجھے اتنا مجبور کر دیا گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی شیخ صاحب کو مجھے ہی راستہ بتانا پڑا کہ اگر انجمن اپنا ریکارڈ درست کرے اور سابقہ تاریخ ڈال کر نیا گوشوارہ مجھے مہیا کرے تو پھر میں دیکھوں گا۔ مگر پھر کیا دیکھنا تھا...... مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ امیدوار گڈول اسکول کے عملے میں پچھلے سال کی ابتدا سے شامل چلا آ رہا ہے۔

◆◆◆◆◆

(۲۵)

ہنگامی اجلاس

اچانک ایک روز ضلعی انسپکٹر صاحب کا پیغام پہنچا کہ ہنگامی نوعیت کے ایک اجلاس سے انسپکٹر سکولز آج ہی خطاب کریں گے' فوراً لاہور حاضر ہو جاؤ۔ میں بھاگم بھاگ ۸۔ ہال روڈ پر واقع ڈویژنل انسپکٹر سکول کے دفتر پہنچا۔

انسپکٹر سکولز' ایم آئی ربانی اونچے لمبے قد اور بھاری بھرکم جسم کے بارعب شخص تھے۔ بڑے فعال' حاضر دماغ اور حاضر جواب...... تمام معاملات میں اپنا خصوصی زاویۂ نظر رکھتے تھے۔ اپنی شخصیت کا رعب ڈالنے میں وہ کسی بیوروکریٹ سے کم نہ تھے' لیکن اس اجلاس میں وہ بجھے بجھے اور تھکے تھکے نظر آئے۔ انھوں نے بتایا ''آپ لوگوں کو علم ہے کہ سال میں ایک بار ہم سب افسران معائنہ کو محکمہ تعلیم کی عفریتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم کامیاب صرف اس وجہ سے ہو جاتے ہیں کہ ہم پنجاب کی سطح پر اتحاد کرتے ہیں۔ وہ موقع موسم گرما کی تعطیلات میں آ رہا ہے اور کل انھیں ڈی پی آئی پنجاب' ڈاکٹر جہانگیر خاں نے اس دنگل کا جس کا نام 'سالانہ انسپکٹرز کانفرنس' ہے کا ایجنڈا دیا ہے۔

میرے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ انھوں نے بتایا ہمیں کس طرح ایجنڈے کی ایک ایک شق کا جواب دینا ہے اور اس کے لیے کس قسم کی تیاری کرنا ضروری ہے تاکہ ہمارا جواب کسی طرح بھی غلط ثابت نہ ہو' اسے سچ بنانے کے لیے خواہ سابقہ ریکارڈ بھی از سر نو تیار کرنا پڑے تو تیار کیا جائے۔ انھوں نے مزید بتایا ''وزیر تعلیم' سیکرٹری تعلیم اور ڈی پی آئی وغیرہ کا تعلق تو محکمے کی انتظامیہ سے ہے' وہ تو ہماری معروضات تسلیم کر لیتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ ہم نچلی سطح پر ان ہی کی ہدایات کے مطابق کام کرتے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ کانفرنس میں مبصرین اور اخباری نمائندے بھی ہوتے ہیں۔

''اس مرتبہ تو ''پروفیسر ہچو گنجا ٹھانت'' (پروفیسر اشفاق علی خاں) کی سرکردگی میں ایک جائزہ ٹیم بھی بنادی گئی اور یہ پروفیسر ہچو گنجا ٹھانت بڑے بڑے غیر ملکی مبصرین کو بھی تگنی کا ناچ نچادیتا ہے لہٰذا ہمیں بھرپور تیاری کرنا ہوگی۔ میٹنگ کے حاضرین ایجنڈے کی ایک ایک نقل لے جائیں اور ہر متعلقہ شق کا تفصیلی جواب تیار کریں۔ کانفرنس کے انعقاد تک ہر پندرھویں دن اجلاس ہوا کرے گا اور تیار کردہ مواد پر شق وار بحث میرے ساتھ کھلے اجلاس میں ہوا کرے گی۔''

ہمیں سالانہ انسپکٹرز کانفرس کا ایجنڈا دیا گیا جو بڑا معلوماتی اور چشم کشا تھا۔ اس ایجنڈے کے تفصیلی مطالعے سے مجھ پر واضح ہوا کہ تعلیم کے میدان میں انتظامی، مالیاتی اور ترقیاتی منصوبے کس زبوں حالی کا شکار ہیں۔

نئے تعلیمی سال کے ابتدائی دن تھے۔ طبیعت میں فراغت کا احساس تھا۔ گو انسپکٹرز کانفرنس ابھی کافی دور تھی پھر بھی قادر بخش اور میں ایجنڈے کے گہرے مطالعے میں مصروف ہو گئے اور وہ جستہ جستہ نکات تلاش کرنے لگے جن کا تعلق لاہور ڈویژن، ضلع لاہور اور پھر مختلف تعلیمی سب ڈویژنوں سے تھا۔ ایسے میں اطلاع ملی کہ ننھیال میں ایک سو پانچ سالہ بوڑھی نانی جو میری حقیقی نانی کی جیٹھانی تھی کا انتقال ہو گیا۔ اتوار ساتھ ملا کر میں نے چار دن کی رخصت اتفاقیہ کی درخواست گزاری اور بال بچوں سمیت ننھیال روانہ ہو گیا۔

☆☆

رواجی تعزیت کی رسوم کے سلسلے میں دیہات میں کئی کئی دن سوگ منایا جاتا ہے۔ میری یہ نانی ویسے بھی عمر کی نسبت سے خاص و عام میں برگزیدہ ہستی خیال کی جاتی تھیں لہٰذا تعزیت کے لیے آنے والے عزیز و اقارب کے علاوہ دیگر تعلق داروں کی آمدورفت کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔

☆☆

یہاں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس کی کڑیاں اپنی سرگزشت سے ملانے کے لیے مجھے پلٹ کر ماضی کی طرف جانا ہوگا۔ وہ یوں کہ موسم بہار کی تعطیلات کے اختتام کے ساتھ ہی بعض مہربانوں اور رفقاء کے اصرار پر مجھے بادل نخواستہ تنویر الاسلام ماڈل پرائمری سکول مرکزی بازار، قصور کے جلسہ تقسیم انعامات میں شامل ہونا پڑا۔ اس سکول کے مالک، منیجر اور پرنسپل کا نام محمد شفیع

لکھ پتی تھا۔ لکھ پتی اس لحاظ سے کہ وہ کوٹ لکھپت' لاہور کا رہائشی تھا۔

میں مذکورہ سکول میں کسی حیثیت سے بھی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس سکول کی حیثیت غیر قانونی تھی یعنی اس کی عارضی سالانہ منظوری ۳۱/ مارچ ۶۴ء کو ختم ہو چکی تھی۔ مزید عارضی منظوری کے وقت عائد کردہ شرائط پوری کرنے کے بعد ۳۱/ مارچ سے پہلے درخواست دائر کرنا تھی۔ محمد شفیع نے ایسا نہیں کیا تھا۔ مجھے اس صورت حال کا علم تھا کیونکہ نئی درخواست پر سکول کا ریکارڈ ملاحظہ کرنے کے بعد صورت حال کی رپورٹ بطور علاقہ افسر مجھے ہی کرنی تھی۔ لکھ پتی متعلقہ ریکارڈ کو ملاحظہ کرائے بغیر ہی نئی منظوری کی درخواست پر مجھ سے ہر معاملے پر صاد کرانا چاہتا تھا۔

لکھ پتی میرے تعاقب میں نانی اماں کے سوم کے اگلے روز میرے ننھیال آ دھمکا اور فاتحہ خوانی کے بعد اس نے اپنے اسکول کی ایک سال کی مزید منظوری کے کاغذات میرے توثیقی دستخطوں کے لیے پیش کیے۔ درخواست فارم کے نیچے اور دیگر دستاویزی ثبوتوں کے درمیان لکھ پتی نے پچاس پچاس روپے کے چھ نوٹ اس طرح نتھی کر رکھے تھے جیسے وہ بھی دستاویزات کا حصہ ہوں۔

صف ماتم پر عین میرے ننھیالی عزیز و اقارب کے سامنے مجھے لکھ پتی کی یہ دیدہ دلیری بڑی ناگوار گزری۔ سب حاضرین لکھ پتی اور کاغذات کی طرف متوجہ تھے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں اس کے ساتھ بڑی تلخی سے پیش آیا۔ دو چار حضرات نے دخل در معقولات کی۔ کچھ نے مجھے سمجھایا اور کچھ نے لکھ پتی کو ڈانٹا۔ میں اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ میں نے لکھ پتی کی منت سماجت کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اسے یہ کہہ کر بے نیل و مرام واپس بھیج دیا کہ میں واپسی پر اس کے اسکول کا جملہ ریکارڈ دیکھ کر ہی منظوری کے لیے کاغذات پر دستخط کروں گا۔

اب جب مجھے دوستوں کے اصرار پر اس کے اسکول جانا ہی پڑ رہا تھا تو میں نے اسے کہلا بھیجا کہ وہ مزید منظوری کے حوالے سے جملہ ریکارڈ بھی دستیاب رکھے' جلسہ تقسیم انعامات کے بعد میں ریکارڈ کی پڑتال اور ضروری دستخط ثبت کروں گا۔

جلسہ کی صدارت کے لیے ایک معزز شہری تشریف لائے ہوئے تھے۔ لکھ پتی نے ان کا تعارف رئیس اعظم قصور کی حیثیت سے کرایا تھا۔ وہ خاصے خوبصورت' وجیہہ اور صحت مند شخصیت کے مالک تھے۔

ابھی تلاوت کلام پاک اختتام پذیر ہوئی تھی کہ جلسہ گاہ میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اس نے اپنے آٹھ نو سال کے دو بچوں کے بستے اٹھا رکھے تھے۔ اس نے بلند آواز سے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ماجھے کی ٹھیٹھ پنجابی میں پوچھا ''کون اے وے پرن سی پل؟'' (پرنسپل کون ہے؟)

قریب کھڑی ایک معلّمہ نے کہا ''بی بی آہستہ بولو' افسر آئے ہوئے ہیں' جلسہ ہو رہا ہے اور لکھ پتی صاحب اسکول کے پرنسپل ہیں......''

''نی لکھ پتی نوں لکھ لعنتاں۔ مینوں افسر ای دس' میں رنڈی تتی بچے آں نوں پاس کرن دا چندہ کتھوں دیندی......'' (لکھ پتی کو لاکھ لعنتیں۔ افسر ہی مجھ بیوہ کو بتائیں کہ میں بچوں کو کامیاب کرانے کا چندہ کہاں سے دیتی؟) عورت کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ لکھ پتی لپک کر اس کے پاس پہنچا' اس سے بچوں کے بستے تھامے اور خاموش رہنے کا اشارہ کر کے اسے اسکول کے دفتر میں لے گیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ عورت بستے اٹھائے واپس آئی اور بچوں کو جلسہ گاہ میں چھوڑ کر چلی گئی۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ خوبصورت قرأت کے ساتھ تلاوت کرنے والا اور بیشتر دوسرے انعامات حاصل کرنے والا ہونہار بچہ رئیس اعظم قصور خاں عطا اللہ خاں کا بیٹا تھا۔ میں صاحب صدر کی شخصیت سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا اور اب ان کے بیٹے کی صلاحیتوں نے مجھے مبہوت کر دیا۔ میں نے دل ہی دل میں تمنا کی کہ کاش میرے بچوں کی اٹھان بھی ایسی ہی ہو مگر یہ تنویر الاسلام اسکول کی کرامت نہ تھی بلکہ سکول سے باہر کے ایک محنتی اور مخلص دینی مدرس کی محنت کا فیض تھا۔

اسکول میں میرا استقبال گلے میں سنہرے ہار ڈال کر' پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے' بینڈ بجا کر' اسٹیج پر بیٹھے معززین' صاحب صدر' دیگر حاضرین اور بچوں نے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ اس خوش آمدید کا تاثر ابھی قائم ہی تھا کہ جلسے کے اختتام کے بعد مہمان نوازی کا وقت آن پہنچا۔ صاحب صدر کی نیازمندی' پرتکلف چائے اور میز کے ارد گرد خدمت گزار استانیوں نے مجھے اپنی اوقات بھلا دی۔ جب عطا اللہ خاں صاحب نے لکھ پتی کو منظوری کے کاغذات پیش کرنے کو کہا تو میں مسکرا کر رہ گیا۔ تنویر الاسلام ماڈل اسکول کی عارضی منظوری کے جملہ کاغذات پر میں نے بے چون و چرا دستخط کر دیے۔ اب ان کاغذات میں پہلے کی طرح پچاس پچاس کے

چھ نوٹ نہیں تھے۔

کافی عرصے بعد پتہ چلا کہ میں نے اسکول میں منعقدہ تقریب اور مہمان نوازی کے 'پاکھنڈ' کے نتیجے میں جو دستخط کیے تھے' لکھ پتی اسے اپنے چھ نوٹوں کا کرشمہ ہی سمجھ رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جب اپنے ننھیال میں صف ماتم پر میں نے لکھ پتی کو جھاڑ پلائی تھی اور اسے اصل کاغذات کی پڑتال کے بعد توثیقی دستخط ثبت کرنے کا کہا تھا تو وہاں صفِ مرگ پر ننھیال کا حجام موجود تھا۔ اسی نے کھانا وغیرہ تیار کرایا تھا۔ وہ لکھ پتی کے پیچھے پیچھے تانگوں کے اڈے تک چلا گیا اور اس نے لکھ پتی سے یہ کہہ کر نوٹ لے لیے تھے کہ اسے میں نے ہی لکھ پتی کے پیچھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آیندہ جب بھی کوئی کام کرانا مقصود ہو تو نوٹ علیحدہ کاغذ میں لپیٹ کر پردے سے دیے جائیں' درخواستوں میں لگا کر نہیں۔

میں نے نوسرباز حجام کے بارے میں ننھیال والوں سے شکایت کی تو حجام نے ان سے کہا "آپ کو پتہ نہیں کہ ججمان جی (مراد میں تھا) یتیم رہ گئے تھے۔ اکثر ننھیال ہی میں رہتے تھے۔ میرا باپ اور میں ان کی مفت حجامتیں بناتے رہے ہیں۔ کیا ہوا جو تین سو روپیہ لے لیا۔ چند دنوں بعد مجھے اپنے چودھریوں کے تحصیلدار بیٹے کے پاس قصور جانا ہے وہاں ججمان جی سے بھی مل لوں گا۔"

☆☆

میر قمرالدین کی خالی اسامی پر بہاولپور کے میرے وہ دوست تشریف لائے جو وہاں ہماری شبینہ محفلوں کے ساتھی اور دمے کے مریض تھے اور جن کی اہلیہ تربیت یافتہ ہیلتھ وزیٹر ہونے کے باوجود انھیں ٹیکہ لگانے سے ڈرتی تھی اور میں یہ فرض ادا کیا کرتا تھا...... میری مراد سعید صدیقی سے ہے۔ وہ ملازمت میں مجھ سے سینئر تھے لیکن اے ڈی آئی کی حیثیت سے میں ان سے سینئر تھا۔ 'بزرگ اٹھ گئے تو ہم بزرگ ہو گئے' والی بات تھی۔

ابتدا میں تو وہ مجھ سے یوں پوچھ پوچھ کر چلتا رہا کہ مجھے اس پر استاد نہ ہونے کا شبہ ہونے لگا لیکن جلد ہی سعید صدیقی نے اس طرح پر پرزے نکالے جیسے وہ پیدائشی اے ڈی آئی ہو۔ اے ڈی آئی صاحبان کی ضلعی ٹیم کے بہت سے کھلاڑی دم بخود ہو کر پیچھے رہ گئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر قاضی نواب علی کے پاس سواری کے لیے ویسپا سکوٹر تھا۔ سعید صدیقی کے پاس بھی یہی 'بلا' تھی۔ وہ اس کی مشینری کو کچھ سمجھتا بھی ہوگا۔

اس نے قاضی صاحب کوسکوٹر چلاتے دیکھا۔ سکوٹر کو دوسری کک لگانے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے سکوٹر کو ''سٹارٹنگ'' کے حوالے سے اسے بیمار قرار دے کر اس کا 'علاج' کرایا۔ پھر اس نے ان کے سکوٹر کی چابیوں کو ایک چھوٹے سے پرس نما چابیوں کے چھلے میں محفوظ کر دیا۔ اس قدر ننھی ننھی خدمات سے قاضی صاحب صدیقی کی تعریف میں کئی بار رطب اللسان ہوئے۔ وہ قصور تشریف لائے تو صدیقی کا کھانا بھی قبول کر لیا اور اسے نہ صرف مدرسین کے قبل از منظوری تبادلے کرنے کا اختیار بھی دیا بلکہ غیر تربیت یافتہ انگریزی مدرسین کا بہ امید منظوری تقرر کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

یہ صدیقی کا ظرف تھا کہ میرے ساتھ اس کے تعلقات نیازمندانہ ہی رہے۔ بعض انتظامی نوعیت کی تدابیر میں ہم باہم مشورہ کر کے چلتے اور ایک دوسرے کی ڈاک بھی نکال دیتے۔ جس بات کا مجھے بہاولپور میں علم نہ ہوا تھا وہ اب قصور میں عیاں ہوئی کہ صدیقی رکھ رکھاؤ کا بڑا قائل تھا۔ گھر اور دفتر میں اس نے رسمی تکلفات کا ایسا سلسلہ قائم کر دیا جس کی بدولت وہ اپنی 'اوقات' سے کافی بڑا نظر آتا تھا۔

چائے پیتا' تو اہتمام کے ساتھ' کھانا کھاتا تو تکلفات کے ساتھ...... اٹھنا' بیٹھنا' اوڑھنا' بچھونا سب میں تکلف ہی تکلف...... مکان بھی چن کر لیا اور مالک مکان سے اس میں مرضی کے مطابق تبدیلی بھی کرائی۔ سینئر ہونے کی وجہ سے جملہ اخراجات بھی اسی کے ذریعے اٹھتے تھے اس لیے اس نے دفتر کی بھی آرائش اپنی صوابدید کے مطابق کی۔ قاضی نواب علی صاحب کو بھی یہ سب کچھ پسند تھا اس لیے اس کے وارے نیارے تھے۔

جب نگینہ بیکری' لاہور کے میرے دوست رانا رحمٰن ظفر' مکتبہ عالیہ کے مالکان جمیل النبی خان اور الطاف حسین کو لے کر میرے پاس آئے' تو ان کی پذیرائی مجھ سے زیادہ صدیقی نے کی۔ چھٹی کا دن تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی صدیقی نے اپنے ہاں تیار کرایا اور بڑے پر تکلف انداز سے مہمانوں کو اور مجھے بھی کھلایا پھر ان کی آمد کا سبب دریافت کیا جو مدارس میں امدادی کتب لگوا کر باہمی فائدہ اٹھانے کا تھا۔ صدیقی نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

امدادی کتب لگوانا ان دنوں بڑا جرم تصور کیا جاتا تھا اور اس کے بارے میں کئی گشتی مراسلے موجود تھے۔ مگر رانا صاحب کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ ہم نے ایک راہ نکالی کہ درسی کتب کے اسباق کی مشقوں میں 'عملی کام' کرنے کے بارے میں سوالات تھے جن کو مدرسین نے طلبہ سے

حل کرانا تھا۔ ہم نے انھیں 'عملی کام' کی کاپیاں تیار کرنے کو کہا۔ یعنی سادہ کاپی نہ لگوائی، چھپی ہوئی لگوالی۔ جیسے نہم دہم میں کیمیا طبیعیات اور حیاتیات کے عملی کام کی کاپیاں ہوتی ہیں۔

بات نئی بھی تھی اور کاپیوں کے لگوانے یا نہ لگوانے کے سلسلے میں کوئی محکمانہ مراسلہ بھی نہیں تھا۔ خود میں نے دوسری جماعت سے پانچویں جماعت کی عملی کام کی کاپیاں تیار کیں۔ مکتبہ عالیہ والوں نے انھیں خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ ہم دونوں نے ان کاپیوں کو قصور شمالی اور قصور جنوبی میں لگوا دیا۔ مکتبہ والوں نے مجموعی کمیشن پچاس فیصد رکھی جس میں سے انصاف کے ساتھ مدرسین اور طلبہ کو بھی حصہ دیا گیا۔ ہمارے حصے میں مکتبہ عالیہ والوں کی دائمی دوستی اور دس انچ قطر کا چھوٹا سا برقی پنکھا پنکھا آیا۔

اس سلسلے میں ہمارے دوسرے اے ڈی آئی بھائیوں میں سے چودھری حمید اللہ نے ہمارا ساتھ دیا۔ کسی نہ کسی طرح قاضی نواب علی صاحب کو بھی خبر ہوگئی کہ قصور کے اے ڈی آئی صاحبان نے قصور میں لوٹ مچا رکھی ہے اور امدادی کتب کے ذریعے 'مال' پیدا کیا جا رہا ہے۔ قاضی نواب علی نے ہم دونوں کو دفتر طلب کیا۔

ہم ''جل تو جلال تو'' کہتے دفتر پہنچے اور اعتراف کیا کہ جس جرم کی اطلاع ان کو پہنچی ہے وہ ہم سے سرزد ہوا ہے لیکن اس میں طلبہ کا مفاد تھا اور یہ امدادی کتب نہیں عملی کام کی کاپیاں تھیں۔ سادہ کاپی نہ خریدی، چھپی ہوئی خرید لی۔ قصور تو معاف ہو گیا لیکن صدیقی سے قاضی صاحب سخت ناراض ہوئے کہ اس نے ان کا اعتماد مجروح کیا ہے، چنانچہ انھوں نے وہ تمام مراعات یکدم کالعدم کر دیں جن سے انھوں نے صدیقی کو نواز رکھا تھا۔

حمید اللہ کی بھی طلبی ہوئی۔ موصوف کنگن پور کے رہائشی تھے اور اپنی ہی تحصیل چونیاں میں تعینات تھے۔ وہ اسی تحصیل میں مختلف سطحوں پر مدرس بھی رہے تھے۔ ان کے کئی 'سجن دوست اور دشمن' بھی تھے۔ ان کے بارے میں قاضی صاحب نے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر کے قریب تعینات ہے جو خلاف ضابطہ ہے۔ اس کے متعلق پہلے بھی شکائتیں ہیں، اب وہ اسے اپنی ناک کے نیچے رکھیں گے چنانچہ اس کا تبادلہ چونیاں سے لاہور کر دیا گیا۔

☆☆

انسپکٹروں کی کانفرنس میں شمولیت کی تیاری کے لیے پہلا پندرہ روزہ اجلاس ڈویژنل انسپکٹر برائے اسکول کے دفتر میں ہوا۔ لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے اضلاع کے

ضلعی انسپکٹر، نائب معاون انسپکٹر، نائب انسپکٹر، معاون انسپکٹر اور ان ہائی اسکولوں کے صدر معلمین بھی موجود تھے جن کے بارے میں معائنہ جاتی نوٹ ایجنڈے میں شامل تھے۔ انسپکٹر اسکول ایک ایک نکتے پر متعلقہ افراد سے استفسار کررہے تھے۔

جس جواب کو وہ اپنے خیال کے مطابق مثبت اور موزوں سمجھتے اس پر متعلقہ اہلکار کو شاباش دیتے اور اسی جواب پر ڈٹے رہنے کا مشورہ بھی۔ خواہ وہ جواب غلط ہی کیوں نہ ہوتا۔ ایجنڈے کی ہر شق کا جواب خود متعلقہ شخص ہی دیتا جس کو کوئی جواب نہیں سوجھا اس کو ڈانتے اور فرماتے ''تم کیسے افسر معاینہ ہو کہ جواب بھی نہیں گھڑ سکتے؟'' پھر وہ جواب گھڑنے کے طریقے بھی بتاتے اور اگلے اجلاس تک جواب 'گھڑ' کر بحث کے لیے پیش کرنے کو کہتے۔

انسپکٹر برائے اسکول کے بارے میں میرا ذاتی طور پر ماضی کا تجربہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسا افسر ہوتا ہے جس تک رسائی کے لیے سفارشات تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ (جیسے میں کالا کے منشی عنایت علی کو اپنی سفارش کے لیے لایا تھا)۔ پھر بھی وہ بات سن لے تو بڑی بات ہے۔ اب اتنے سارے ضلعی افسروں، نائب انسپکٹروں اور انسپکٹر اسکول سے میں بالمشافہ بات بھی کر سکتا تھا۔ پرانا تصور کرچی کرچی ہو کر رہ گیا تھا۔

جو منفی چالیں تجویز کی جارہی تھیں اور انھیں مزید جاری رکھنے کے جو مشورے ہو رہے تھے وہ مجھے برے لگ رہے تھے لیکن میرا منصب اتنا چھوٹا تھا کہ میں مخالفت میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، اندر ہی اندر تلملا سکتا تھا یا پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑبڑا سکتا تھا۔ بہرحال نقار خانے میں طوطی کی آواز بلند ہو کر رہی۔ طوطی میں نہ تھا کوئی اور تھا۔

ان دنوں شہر لاہور میں دوسرا سنٹرل ماڈل اسکول سمن آباد میں تیار ہو چکا تھا۔ کچھ حصہ محکمہ تعمیرات (عمارات و شاہرات) نے محکمہ تعلیم کو منتقل کر دیا تھا کچھ حصہ زیر تعمیر تھا۔ بجلی، ٹیلیفون اور پینے کے پانی کے مسائل ابھی حل طلب تھے جبکہ مدرسے میں عملے کا تقرر کر کے جماعتوں کا اجرا کر دیا گیا تھا۔ مرزا مسعود بیگ صدر معلم مقرر ہوئے تھے۔

انسپکٹر برائے اسکول نے پے در پے مدرسے کے دورے کر کے اپنے تاثرات مدرسے کی لاگ بک میں تحریر کیے جو مسائل حل طلب تھے ان کی ذمہ داری کچھ تو صدر معلم پر تھی لیکن زیادہ تر ذمہ داری انسپکٹر برائے اسکول ہی کی تھی کیونکہ سنٹرل ماڈل اسکول کے منصوبے کے وہی پروجیکٹ ڈائریکٹر تھے۔ صدر معلم، مرزا مسعود بیگ نے انسپکٹروں کی کانفرنس کے

ایجنڈے پر جو رپورٹ مرتب کی وہ واضح حقائق پر مبنی تھی مگر اس خانہ ساز اجلاس میں واضح حقائق ہی تو سب سے زیادہ ناپسندیدہ شے تھے۔

انسپکٹر برائے اسکول کو مرزا مسعود بیگ کی حقائق پر مبنی رپورٹ پسند نہیں آئی کیونکہ انھوں نے اپنی رپورٹ بے لاگ طور پر تیار کی تھی اور اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں کیا تھا۔ انسپکٹر اسکول نے مرزا مسعود بیگ کی رپورٹ پڑھنے اور سننے کے بعد کہا ''کیا وہ اس رپورٹ کے ذریعے ایم آئی ربانی انسپکٹر اسکول کو نالائق تو ثابت نہیں کر رہے؟ وہ مختلف نکات کے بارے میں فرضی وضاحت بھی لکھ سکتے تھے۔'' جب وہ تنقید سے تھک گئے تو جواب کے لیے مرزا مسعود بیگ کی طرف دیکھا۔

مرزا مسعود بیگ نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر کہا ''جناب! مملکت خداداد کی عمر سترہ سال ہو چکی ہے۔ ہم نے اس عرصے میں غیر ملکی امداد کے باوجود اپنی شرح خواندگی میں اعشاریہ صفر ایک بھی اضافہ نہیں کیا۔ پہلے خواندگی کی تعریف قومی زبان پڑھ اور لکھ لینا تھی پھر خواندگی کی شرح بڑھانے کے لیے اسے صرف 'پڑھ' لینے تک محدود کیا۔ جب پھر بھی صورت حال نہ سنبھلی تو صرف دستخط کر لینے ہی کو 'خواندگی' شمار کیا گیا...... کیا ہم خواندگی کی تعریف کو 'انگوٹھا چھاپ' کی سمت تو نہیں لے جا رہے؟''

''مرزا صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آئی؟'' انسپکٹر صاحب نے تلخی سے پوچھا۔

مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا:

''یہ کہ ہم غلط رپورٹیں تیار نہ کریں، سب اچھا ہے نہ کہیں..... حقیقت حال بیان کریں تاکہ حکومت سچائی کے آئینے میں حالات و ترقیات کو جانچے اور صحیح اقدامات کرے۔''

انسپکٹر صاحب بولے ''آپ کی نصیحت پر حکومت عمل کرتی تو جو ترقیاتی امداد ملک کو مل رہی ہے وہ کہاں سے آتی؟ رپورٹوں میں جتنے اعداد و شمار زیادہ ہوتے ہیں، اتنی ہی غیر ملکی امدادی رقوم زیادہ ملتی ہیں۔''

مرزا صاحب جھٹ بولے ''امداد دینے والے رقوم کا صحیح مصرف بھی تو پوچھتے ہیں؟ ان کے کافی یا ناکافی ہونے کا اندازہ بھی کرتے ہیں..... تب ہی مزید سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر ہم پہلے ہی کافی لکھ دیں تو ناکافی کیسے کافی ہوگا؟''

مرزا صاحب ابھی بات مکمل بھی نہیں کر پائے تھے کہ انسپکٹر صاحب برہم ہو گئے اور بولے ''انھیں ایسے دیانتدار اور قوم سے وفادار صدر معلموں کی ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ مرزا صاحب لاہور ڈویژن سے کہیں اور تبادلہ کرا لیں۔''

مرزا صاحب نے اپنی رپورٹ اور ڈائری اٹھائی اور میٹنگ سے باہر نکل گئے۔ یکا یک انسپکٹر صاحب کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ انھوں نے مرزا صاحب کو واپس لانے کے لیے اپنے نائبین کو ان کے پیچھے دوڑایا۔ بعدازاں انسپکٹر صاحب دفتر سے ملحقہ اپنی رہائش گاہ میں چلے گئے۔ چائے بھی ہمارے ساتھ نہیں پی۔

چائے پر ہر شخص مرزا صاحب کی جرأت رندانہ کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ میں تو چائے نظرانداز کر کے مرزا صاحب تک پہنچا۔ پہلے ہاتھ ملایا پھر اپنا تعارف کرایا اور ان کی حق گوئی کی داد دی۔ ان کی آواز میرے نہاں خانۂ دل کی آواز تھی۔

☆☆

وہ رئیس اعظم عطاءاللہ خاں جس نے تنویرالاسلام ماڈل پرائمری سکول میں جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت کی تھی، مجھے کئی بار بازار میں ملا۔ مصافحے اور معانقے کے دوران ہی وہ کئی باتیں کر جاتا۔ ساتھ ہی مجھے کچھ کھلانے پلانے کی بات کرتا۔ میں انکساری سے کام لیتا۔ ایک دن وہ لکھ پتی کے ساتھ مجھے اسٹیشن پر ملا۔ لکھ پتی نے قادر بخش سے معلوم کر لیا تھا کہ مجھے فلاں دن بذریعہ ریل عثمان والا جانا ہے۔

خاں صاحب نے مجھے بتایا ''لکھ پتی کا لاہور میں لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا۔ اس سکول کے قریب ہی دو اور اسکول کھل جانے اور اُن کے اسکول کی ایک استانی کے سکینڈل کی وجہ سے ان کا اسکول بند ہو گیا۔ اسکول دوبارہ آباد کرنے کی کوششوں میں لکھ پتی صاحب کے ذاتی اثاثے بھی ڈوب گئے۔ یہ قسمت آزمانے ادھر قصور آ گئے اور اب انتہائی کوششوں کے باوجود ان کا اسکول روبہ تنزل ہے۔ میں اس پردیسی شخص کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے میونسپل کمیٹی قصور سے مالی امداد دلانے کی کوشش کریں۔''

''مگر مالی امداد تو مستقل طور پر منظور شدہ مدرسوں ہی کو ملتی ہے۔'' میں نے انھیں جواب دیا۔

''یہی تو عرض کرنا ہے کہ اس کے سکول کو مستقل طور پر منظور کرا دیں۔ یہ عارضی منظوری

کے کاغذات دفتر میں جمع کرانے گیا تھا' اس کا وہاں متعلقہ اہلکار سے سودا ہو گیا ہے کہ وہ اسے مستقل منظوری دلا دے گا بشرطیکہ یہ......"

خاں صاحب نے بات روک دی تو لکھ پتی نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا "بشرطیکہ...... آپ لکھ دیں کہ تنویر الاسلام اسکول کی انتظامیہ نے عارضی منظوری دیتے وقت عائد کی جانے والی جملہ شرائط نوے فیصد پوری کر دی ہیں۔"

شرائط میں سکول کی کشادہ عمارت مع چھوٹا سا میدان' لائبریری میں کتابوں کی فراہمی' تربیت یافتہ عملے کی تعیناتی اور انتظامیہ کے محفوظ سرمائے برائے اسکول کا بینک سے تصدیق نامہ شامل تھا۔

نجی اسکولوں کے مالکان ادھر ادھر کی کتب سے لائبریری بھی بنا لیتے تھے۔ انتظامیہ میں اپنے بھائی بندوں کے نام لکھ دیتے تھے۔ تربیت یافتہ عملے کی شرط کو ادھر ادھر سے جعلی اسناد یا دوسروں کی اسناد کی مصدقہ نقول حاصل کر کے مسل کا پیٹ بھر دیتے تھے۔ درسگاہ کے لیے محفوظ سرمائے کے بارے میں کسی نہ کسی بنک سے گول مول الفاظ میں تصدیق نامہ بھی حاصل کر لیتے تھے' لیکن کشادہ عمارت اور کھیل کا میدان بڑا مسئلہ ہوتا تھا۔

حکومت کی مقررہ شرائط کے مطابق اس وقت ایسے پرائمری اسکول کے لیے جس کے طلبہ کی تعداد ایک سو تک ہو' ایک کنال کا میدان ہونا ضروری تھا۔ مصدقہ نقشہ ساتھ شامل کرنا پڑتا تھا۔ خاں صاحب نے لکھ پتی کو وہ بھی مہیا کر دیا تھا۔ انھوں نے مجھے صاف صاف بتایا کہ انھوں نے صرف کاغذات کا پیٹ ہی بھرا ہے حقیقت اس کے سو فیصد برعکس ہے۔ میں ان کو بس اپنی فیس بتاؤں۔

یہی وہ موقع تھا جب مجھے علم ہوا کہ میرے ننھیال کے نوسرباز حجام نے لکھ پتی سے تین سو روپے میرے نام پر ہتھیا لیے تھے۔ مجھے خاں صاحب پر غصہ آیا اور میں نے کہا "خاں صاحب یا تو آپ کو ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا اور اب جب آپ آ ہی گئے ہیں تو آپ کو فیس کی گھٹیا بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔" یہ فیس صاف معنوں میں رشوت ہے۔

اسی اثناء میں گاڑی آ گئی۔ میں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا تو خاں صاحب بھی اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ لکھ پتی اسٹیشن ہی پر رہ گیا۔ میرے برہم مزاج کو دیکھ کر خاں صاحب نے بتایا کہ وہ یہ سفر لکھ پتی کی خاطر میرے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مربعوں پر

موضع جحل جانے کے لئے کر رہے ہیں۔ اس کی تصدیق مجھے عثمان والا ریلوے اسٹیشن پر ہو جائے گی جہاں ان کا مزارعہ ان کے لئے گھوڑی لیے کھڑا ہوگا۔ انھوں نے اپنی ہجرت، زمین کی الاٹمنٹ، اپنی شادی اور اپنی کتاب زندگی کے کئی دیگر اوراق پلٹ کر رکھ دیے۔ وہ مولوی یحییٰ کریمی فیروز پوری کی جامع مسجد کے بھی جملہ اخراجات برداشت کر رہے تھے۔ اپنی صحت، جوانی اور خوبصورتی کے حوالے سے بھی انھوں نے ایک دو قصے سنائے جن سے ''دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے'' کا تاثر ملتا تھا۔ ان کے چاہنے والوں میں ایک مشہور بھارتی اداکارہ کا نام بھی آیا۔ اب ان کی عمر بیالیس برس کے قریب تھی۔ محبت میں مایوس ہونے پر بھارتی اداکارہ نے ایک تھانیدار کو اپنا آپ اس شرط پر پیش کرنے کی حامی بھری کہ وہ خاں صاحب کو قتل کے مقدمے میں پھنسا کر ان کی جوانی کو برباد کر دے۔ بدبخت کو پتہ نہیں تھا کہ اسی تھانیدار کی بہن سے خاں صاحب کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے جرم پر اکسانے اور ترغیب گناہ دینے پر الٹا اس اداکارہ کا چالان کر دیا۔ عدالت میں خاں صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو وہ اقبالی ہو گئی۔ خاں صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

میں خاں صاحب کے کردار اور ان کی گفتار کے سحر میں آ چکا تھا۔ اب انھوں نے اپنی موضوع جحل تحصیل چونیاں کی آٹھ مربع اراضی کی باتیں شروع کر دیں۔ ان مربعہ جات سے ان کو گزر بسر کے مطابق بھی بازیافت نہیں ہو رہی تھی۔ ان کی نرم مزاجی کی وجہ سے مزارعین ان کے پلے کچھ نہیں ڈال رہے تھے۔ وہ اراضی کو ٹھیکے پر دینے کے لئے کسی سے بات کرنے ہی جا رہے تھے۔ ان کے نزدیک فی مربعہ ایک ہزار روپیہ ٹھیکہ کافی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ مربعوں کے لیے نہری پانی بھی منظور ہے اور زمین کے عین درمیان ایک ڈیزل ٹیوب ویل بھی ہے۔

عثمان والا ریلوے اسٹیشن پر خاں صاحب کا مزارعہ گھوڑی لیے موجود تھا جبکہ مجھے لینے کے لیے شیخ لطیف سنٹر ہیڈ ماسٹر مع سائیکل موجود تھے۔ مجھے اس سائیکل پر آگے کسی پرائمری اسکول میں جانا تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں خاں صاحب سے آشنائی اور ان کی منکسرانہ گفتگو میں لکھ پتی کے لیے ہمدردی اور محبت ...... اس صورت حال میں مجھ پر ان کا اخلاقی دباؤ اس قدر بڑھا کہ ''منکہ ایک مدرس'' کچی دیوار کے مانند ڈھے کر رہ گیا۔

میں نے لکھ پتی کے اسکول کے بارے میں عمارت کی استثنائی صورت پر بحث کر کے مقررہ شرائط کو نرم کرنے کی سفارش کرتے ہوئے مستقل منظوری کے لیے لکھ دیا۔ خاں صاحب

نے شکریہ کے طور پر مجھے اپنی زمینوں کے تل، شکر اور چاولوں کا تحفہ بھیجا۔ افسوس لکھ پتی کو پھر بھی عارضی منظوری ہی دی گئی لیکن ایک سال کے بجائے اب وہ تین سال کی تھی۔ میونسپل مالی امداد اسے پھر بھی نہیں مل سکتی تھی۔

☆☆

میرے بچے اب قصور سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ اتفاق سے نارمل سکول قصور کا لیبارٹری سکول کوٹ رکن الدین کے مشرقی دروازے کے قریب ہی ایک مسجد کی اوٹ میں تھا۔ بڑا بیٹا وہاں تیسری اور چھوٹا پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ سہ پہر کو بھی وہ کھیلنے کے لیے اسکول کی گراؤنڈ میں چلے جاتے یا کبھی کبھی محلے کے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ گلیوں میں لکن میٹی کھیلتے نظر آتے۔

ہمارے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک سہ منزلہ مکان تھا۔ دوسری منزل پر وہاں کا رہائشی کنبہ رات کے کسی سمے چارپائیاں بچھا کر سوتا۔ میں اور میری بیوی اکثر کہتے کہ وہ گھر صبح ہی آباد نظر آتا ہے۔ پھر ہم اکثر اس عورت کو دیکھتے جو علی الصباح اپنے بستر سے اٹھتی، بچوں پر چادریں اور اپنے موٹے سے شوہر پر بھی کوئی کپڑا ڈالتی اور نیچے اتر جاتی۔ میں بیوی سے کہتا کہ دیکھو کس قدر وفا شعار عورت ہے۔ بچوں کے اور شوہر کے آرام کا کس قدر خیال رکھتی ہے۔ میری بیوی اس بات پر برا مانتی جیسے میں اس کی وفا شعاری پر رشک کر رہا ہوں۔

ایک صبح میری بیوی نے بتایا کہ وہ عورت بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ میں حیران ہوا اور پوچھا کہ اسے کیسے علم ہوا۔ اس نے بتایا کہ سامنے والی پڑوسن کہتی ہے کہ نہا دھو کر اسپتال جانے کے بہانے گھر سے نکلی اور پھر نہیں لوٹی۔

دوسرے دن قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ کی ملی خدمات کے بارے میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہونے والے تقریری مقابلے میں شمولیت کے بعد گھر پہنچا تو میرے گھر کے سامنے گلی میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک ناقابل برداشت تعفن پھیلا ہوا تھا۔ گلی آگے سے بند تھی اور صرف چار مکانات ہمارے گھر سے آگے تھے۔ آخری عمارت خستہ اور شکستہ تھی۔ اوپر کی منزل پر منڈی میں کام کرنے والے چند مزدور رہتے تھے۔ نیچے کا حصہ ویران پڑا تھا۔ بچے حسب معمول لکن میٹی کھیلتے کھیلتے اس مکان میں گھسے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں کچلو کی ماں کی برقعے میں لپٹی لاش پڑی ہے اور سخت بدبو آ رہی ہے۔ میرے بچوں کی طبیعت خراب ہو رہی

تھی۔ ہم نے صدیقی کے گھر کے ایک برآمدے میں رات بسر کی۔ ایک گھریلو عورت کی پراسرار موت نے ہمیں گلی ہی سے خوفزدہ کر دیا تھا۔ ہم گھر نہیں لوٹے بلکہ علم دین نائب قاصد کی مدد سے اگلی صبح کوٹ شہباز خاں میں ایک کشادہ مکان حاصل کیا۔ اس مکان میں رہائش کے لحاظ سے صرف ایک قباحت تھی کہ اس میں پانی کے لئے نل کے بجائے کنواں تھا۔ ڈول اور چرخی سے پانی نکالنا پڑتا۔ ہمارا گھٹنے گھٹنے چلنے والا بچہ جاتا بھی اس طرف تھا۔ اس کے لیے ڈول اور چرخی میں بڑی کشش تھی۔ اس کی ماں اس کی کمر میں رسی ڈال کر اور دوسرا سرا چارپائی سے باندھ کر اسے صحن میں چھوڑتی تھی۔

مکان کی دوسری منزل پر بے شمار ابابیلوں نے گھروندے بنا رکھے تھے، لیکن ہم نے اس حصے کو استعمال ہی نہیں کیا۔ نچلے حصے کے طویل برآمدے میں شام کو بے شمار چمگادڑیں ادھر سے ادھر چکر لگاتیں۔ میری بیوی چمگادڑوں سے بڑا خوف کھاتی تھی اس کے خیال میں یہ چمٹ کر خون پی جاتی تھیں۔ ویمپائر کا تصور نہ جانے اس کے ذہن میں کیسے بیٹھ گیا تھا۔ میں سرِشام تختی لے کر برآمدے کے ایک سرے پر میز پر چڑھ کر کھڑا ہو جاتا اور بہت ساری چمگادڑوں کو مار گراتا۔ چند ہی دنوں میں چمگادڑیں تقریباً ختم ہو گئیں۔

میں اس مکان میں جنگ ستمبر ۶۵ء تک رہا۔

☆☆

انسپکٹرز کانفرنس کے سلسلے میں دوسرا اجلاس تھا۔ اس بار مرزا صاحب صدر معلم سنٹرل ماڈل سکول کی بجائے ان کا 'جی حضوریا' قسم کا نائب معلم آیا تھا۔ ربانی صاحب خوش تھے۔ مرزا صاحب پر طنز کرتے ہوئے وہ سب کو بتا رہے تھے ہم نے بڑی بڑی توپوں (big guns) کا سامنا کرنا ہے۔ ان سے لیٹ کر، چھپ کر اور خندقوں میں کود کر جان بچانا ہے۔ مرزا صاحب ہمیں اکڑنے کا سبق دے رہے تھے۔ سچ بولنے کو کہہ رہے تھے۔ کیا اکڑنے کے لیے کمرہ جماعت کافی نہیں؟ وہاں جتنا مرضی ہے وعظ بھی کر لو۔ دروغ مصلحت آمیز بھی آخر کوئی شے تو ہے۔

''کیوں بھئی مولوی وٹوانی...... میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟'' انھوں نے ایک لمبی ڈاڑھی والے شیخوپورہ کے اے ڈی آئی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے فوراً جواب دیا ''بجا ارشاد فرمایا آپ نے!''

ع......فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

انھوں نے اپنے اندازِ فکر کے مطابق تمام اے ڈی آئی صاحبان کے مختلف صفاتی نام رکھے ہوئے تھے...... مجھے وہ 'کارپوریشن کا سالا' کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میرے چچا فاروقی بلدیہ کے چیف آفیسر تھے۔ انسپکٹر صاحب کے دفتر میں ایک نل ضرورت سے زائد تھا۔ انھوں نے یہ نل بند کرانا چاہا۔ میں نے اپنے چچا جان سے کہہ کر یہ کام چند منٹ میں کرا دیا۔ انھوں نے اسی دن سے مجھے کارپوریشن کا سالا قرار دے دیا۔

ابھی وہ ایجنڈے کی دوسری ہی شق پر پہنچے تھے کہ ہال کے باہر کوئی شخص دفتر کے چپڑاسی سے الجھ پڑا۔ ربانی صاحب نے چپڑاسی کو بلا کر پوچھا' تو اس نے بتایا کہ کوئی شخص وزیر تعلیم کا رقعہ لے کر آیا ہے اور ابھی ملنا چاہتا ہے۔ ربانی صاحب نے حکم دیا کہ اسے آنے دو اور ہم سے کہا "وزیر صاحب کے آدمی کو ہم سب پر فوقیت حاصل ہے اس لیے اس کی بات پہلے سننا ضروری ہے۔ آپ لوگ بھی سنیں۔"

☆☆

ایک چودھری نما شخص خاصا اکڑا ہوا لباس پہنے اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ انسپکٹر صاحب نے دونوں کا کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ مصافحے کے بعد اپنے قریب بٹھایا اور آنے والے کے دیے ہوئے لمبے سے لفافے میں سے رقعہ نکال کر پڑھا۔ رقعہ وزیر صاحب کی طرف سے ان کے پی اے نے لکھا تھا۔ اس پر 'بحکم' (بی او) لکھا تھا۔

ہمیں مخاطب کرتے ہوئے اور رقعہ دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو! اس پر 'بحکم' لکھا ہوا ہے۔ اس ان پڑھ چپڑاسی کو نہیں علم کہ بی او کے کیا معنی ہیں...... آپ لوگ بھی یاد رکھیں کہ 'بحکم' والی چھٹی لانے والے سے ترجیحی سلوک کرنا لازمی ہوتا ہے۔"

"جی چودھری صاحب! فرمایئے...... کیا حکم ہے؟"

"جناب! چٹھی میں لکھا ہوا ہے۔"

"ہاں وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے...... امیدوار کہاں ہے؟"

"یہ ہے......" چودھری صاحب نے ساتھ بیٹھے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا تو تم امیدوار ہو! نوکری لینے آئے ہو...... اور ادھر چودھری صاحب کے برابر ہی کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گئے ہو...... کھڑے ہو جاؤ...... کچھ ادب آداب بھی سیکھو۔" وہ نوجوان

مسکین سی صورت بنا کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

ربانی صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نوجوان سے کہا ''یہ سب افسران بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوری ڈویژن سے سرکاری کام کے لیے آئے ہیں۔ وزیر صاحب کے حکم کی وجہ سے سب کام چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم درخواست وغیرہ لکھ کر لائے ہو؟''

''نہیں جناب!'' نوجوان نے مریل سی آواز میں کہا۔

''تمہاری تعلیم کتنی ہے؟''

''ایف اے۔''

اب انسپکٹر صاحب نے میٹرک اور ایف اے کی اسناد کے متعلق پوچھا' سکونت نامے (ڈومی سائل) کے متعلق پوچھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم سب حیران تھے کہ اب انسپکٹر صاحب کیا کہتے ہیں؟

انھوں نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ تمہارے ساتھ چودھری صاحب تو ہیں ہی اور پھر بی او بھی ہے۔'' بلند آواز سے انھوں نے ہیڈ کلرک غلام قادر کو بلایا اور اسے بی او دیتے ہوئے کہا ''چودھری صاحب وینکے تارڑ سے آئے ہیں۔ یہ ان کے مزارعہ کا بیٹا ساتھ ہے۔ اس کے پاس کوئی درخواست یا سند وغیرہ نہیں لیکن ہم نے اس کو ابھی ملازمت دے کر بھیجنا ہے..... قریب کی خالی آسامی بتاؤ۔''

ہیڈ کلرک نے کچھ بولنا چاہا تو انسپکٹر صاحب نے کہا ''ٹالنا نہیں' کام کرنا ہے۔ تم وینکے تارڑ کے صدر معلم کے نام ہی حکم بنا کر لاؤ..... کہ احمد دین ولد شاہ دین کو ابتدائی انگریزی معلم کی اسامی پر بطور غیر تربیت یافتہ انگریزی مدرس بحوالہ بی او مورخہ گیارہ مئی ۱۹۶۴ء تعینات کیا جاتا ہے' صدر معلم مدرس سے مکمل درخواست مع اسناد حاصل کرے اور بذریعہ خصوصی ایلچی افسر مجاز سے منظوری حاصل کرے..... جاؤ جی چودھری صاحب..... ادھر سے احکامات لے لو۔''

چودھری صاحب نے بتانا چاہا کہ امیدوار کا نام احمد دین ولد شاہ دین نہیں ہے اور وینکے تارڑ میں کوئی آسامی نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ تو انسپکٹر صاحب نے کہا ''یہ سب کچھ آپ ہیڈ کلرک کو بتا دیں' آپ جو کہیں گے وہی لکھے گا۔''

امیدوار اور چودھری صاحب ہیڈ کلرک کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے تو انسپکٹر صاحب نے ہمیں مخاطب کیا اور کہا ''آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے غلط کیا ہے؟

بے شک غلط کیا ہے لیکن وزیر صاحب کو راضی کیا ہے۔ یہ چودھری واپس جا کر ان کو بتائے گا کہ انسپکٹر نے کس طرح اجلاس روک کر ان کے احکام کی تعمیل کی۔ جو غلطی اسامی ہونے یا نہ ہونے کی ہے وہ بعد میں درست ہوتی رہے گی۔ درخواست وغیرہ سب دفتری باتیں ہیں ان کو دفتر خود حاصل کر لے گا۔ یاد رکھو! حاضر لمحے سے نمٹنا اور اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بڑا ضروری ہے..... کل کیا ہوتا ہے کون جانے؟"

☆☆

ٹریکٹر فروش

میرے گاؤں کے ایک سابق فوجی صفدر حیات خاں صاحبزادہ حسن محمود کی زرعی انجینئرنگ کی فرم واقع ہال روڈ میں اسسٹنٹ منیجر تھے۔ جب بھی میں انسپکٹر صاحب کے دفتر ہال روڈ پر جاتا تو صفدر حیات خان لودھی کو بھی سلام کرتا۔ اچھے تیز طرار، گفتگو کے ماہر اور چلتے پرزے انسان تھے۔ میٹنگ کے بعد میں ان سے گپ شپ لگانے ان کے دفتر چلا گیا۔ وہاں ایک ریٹائرنگ روم بھی تھا جس میں آرام کرنے کی خاطر لیٹا بھی جا سکتا تھا۔ ان کے ایک دوست میاں میاں عبدالحق جو میڈیکل ہاسٹل میں کینٹین کے ٹھیکیدار تھے بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ٹھیکوں کی بات ہو رہی تھی..... عمارت کے ٹھیکے، زرعی آلات کی ترسیل کے ٹھیکے وغیرہ۔ میں جانتا تھا کہ گاؤں میں صفدر حیات خان کی زمین بھی ہے۔ لہٰذا میں نے دخل در معقولات کی بنیاد پر زرعی زمین کے ٹھیکے کی بات بھی کر دی۔ آٹھ مربعہ زمین اور آٹھ ہزار میں! صفدر حیات خاں یہ بات تسلیم کرنے ہی کو تیار نہ تھے بلکہ انھوں نے کہا:

"ذوالفقار! تم اگر مجھے وہ زمین دلا دو تو میں بلا کسی سرمایہ کاری کے تمہیں ایک چوتھائی پیداوار کا حصہ دار بناتا ہوں..... میاں عبدالحق اور ہیڈ کلرک سکندر خاں اس بات کے گواہ رہے۔

میں نے مذاق ہی مذاق میں کہا کہ لکھ دیجئے۔ انھوں نے اپنی فرم کے کاغذ پر لکھ بھی دیا اور میں نے ان سے کہا کہ اتوار کو قصور آ جائیں۔ میں ان کی مالک سے ملاقات کا انتظام کر رکھوں گا۔ اتوار ابھی چار روز بعد تھا۔ وہ دوسرے ہی دن میاں عبدالحق کے ساتھ قصور آ گئے۔ اتفاق سے میں دفتر ہی میں تھا۔ عطاء اللہ خاں سے بھی بوساطت لکھ پتی سے ملاقات کا انتظام ہو گیا۔ شام تک صفدر حیات خاں اور میاں عبدالحق زمین بھی دیکھ آئے اور عطاء اللہ خاں سے ان

کی بات بھی پکی ہو گئی۔ حسب وعدہ صفدر حیات نے مجھے چوتھے کے بجائے پانچویں حصے کا حصہ دار بنایا کیونکہ ان دونوں نے دو دو حصے رکھے تھے۔ قصہ کوتاہ قصور میں اپنی آمد کے ساتویں اٹھویں مہینے میں، میں ایک ''لینڈ لارڈ'' بھی بن گیا۔ ٹھیکہ لینے میں مرکزی کردار میں نے ادا کیا تھا اور صفدر حیات خاں آئندہ بھی میری قصور میں موجودگی' اساتذہ سے تعلقات اور دفاتر میں میرے میل جول سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی مجھے گزیٹیڈ افسر ہی سمجھتا تھا۔

اب ایک ایسے شخص کی تلاش شروع ہوئی جو زمیندارے سے واقف ہو' ایماندار ہو' تجربہ کار ہو' دفاتر میں کام پڑ جائے تو وہاں بھی جا سکتا ہو۔ معاوضہ بھی نقد طلب نہ کرے بلکہ زرعی پیداوار میں حصے کی صورت میں قبول کرے۔ یہ تلاش بھی صفدر حیات خاں نے میرے سپرد کی اور میں نے بھی قصور جنوبی کے اب تک کے کائیاں ثابت ہونے والے ہیڈ ماسٹر شیخ نذیر احمد کی خدمات اس سلسلے میں حاصل کیں۔ انھوں نے بتایا کہ کھڈیاں کے ہائی اسکول میں ایک درویش صفت اوٹی معلم مولانا نصر اللہ نصر ہیں جو مسجد کی بغل میں رہتے ہیں۔ محمد علی آف کھائی ہٹھاڑ کے منشی رہے ہیں۔ زمینداری ہی کراتے رہے ہیں۔ خطیب اجل اور پیش امام بھی ہیں اور خان عطاء اللہ خان جس مسجد کے طفیل ہیں اس کے خطیب اور امام مولوی یحیٰی کے بڑے بھائی ہیں۔ مولوی یحیٰی کی خطابت کا قصور میں بڑا چرچا تھا۔ میں نے ٹھیکیداروں کو شیخ نذیر احمد کی سفارشات کی اطلاع دی اور اگلے اتوار مربعوں پر جانے کا پروگرام طے ہوا۔

☆☆

پانچ کھو کھلے لیکن ہنگامہ خیز اجلاسوں میں یہ آخری اجلاس تھا۔ اگلی دفعہ ہمیں انسپکٹرز کانفرنس میں ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن میں واقع ایڈوائزری بورڈ کے لائبریری ہال میں اکٹھے ہونا تھا۔ اس دوران میں چند واقعات ہوئے۔

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ انسپکٹر آف سکولز کے ایک برادر نسبتی جو آسٹریلیا میں پاکستانی سفارت خانے میں اول یا دوم سیکرٹری تھے' وہاں ہی کسی سبب انتقال فرما گئے۔ لواحقین کو تو غم تھا ہی لیکن ہم جو انسپکٹر آف سکولز کے دست و بازو تھے ہمیں بھی چہروں پر ملال اوڑھنا پڑا۔ جتنا بڑا سانحہ تھا اتنے بڑے جملہ انتظامات تھے۔ ربانی صاحب اپنی ڈائری سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔ جس کے ذمے کوئی کام لگاتے اس کا نام لکھتے جاتے اور ساتھ ہی کام بھی تحریر فرماتے۔

’کارپوریشن کا سالا‘ ہونے کی وجہ سے میانی صاحب میں پانی کے ٹینکر کھڑے کرانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

ان دنوں انسپیکٹوریٹ کی تعلیمی فلمیں دکھانے والی گاڑی کا آپریٹر جو فوٹو گرافر بھی تھا‘ بیماری کی رخصت پر تھا۔ ویسے تو فوٹو گرافر کافی تھے لیکن ۸۔ایم ایم کے مووی کیمرے کا استعمال وہی جانتا تھا۔ جب تحقیق پر یہ خبر ربانی صاحب تک پہنچی کہ واقعی آپریٹر کو ۱۰۴ درجے بخار ہے تو ربانی صاحب رو پڑے وہ اب اپنے برادر نسبتی کے جنازے کی فلم کیسے بنائیں گے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آیا اور میں نے مووی فلم بنانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مجھے بی ٹی کے دوران میں اس فن کا کچھ تجربہ ہوا تھا۔

ربانی صاحب نے علیحدگی میں مجھے سمجھایا کہ میت کے ہوائی اڈے سے لے کر دفنانے تک‘ سارے مراحل فلم بند ہونے چاہئیں اور ہر منظر میں ربانی صاحب خود یا ان کے بچے وغیرہ ضرور ہوں جبکہ مرحوم کی قریبی فاصلے سے لی گئی تصویریں بھی ہوں۔

تکفین تو آسٹریلیا ہی سے ہو کر آئی تھی۔ خوبصورت تابوت میں پھولوں کے اندر مرحوم کا چہرہ بڑا تر و تازہ لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے مرحوم سو رہے ہیں۔ اجالے کے دوران جس قدر فلم بن سکتی تھی بن گئی‘ تدفین پر اندھیرا چھا گیا۔

چودھری غلام حیدر مرحوم عرف رتہ (وہ سر پر مہندی لگاتے تھے) کے ذمہ قبرستان کا سارا انتظام تھا۔ جنازے میں شمولیت کے لیے راولپنڈی کے کچھ رشتہ داروں کا انتظار تھا۔ سب لوگ ادھر ادھر ٹولیوں میں بیٹھے منتظر تھے کہ کب جنازہ پڑھا جائے اور وہ گھروں کو جائیں۔ مجھے خود قصور جانا تھا۔ میں نے فلم ہمیت کیمرہ شیخ منورالدین ڈپٹی انسپکٹر کو دیا اور ان سے کہا کہ میں تو قصور جا رہا ہوں۔

”ایسا مت کرو۔“ شیخ صاحب نے مجھے سمجھایا۔ ”ہم میت کا جنازہ پڑھنے نہیں نوکری کی سلامتی اور ’لاجواب سروس‘ کے حوالے سے جنازہ پڑھنے آئے ہیں۔ آنکھوں کی آخری سوئیوں پر فرار جیسی بات نہ کرو۔ جہاں سارا دن گزارا ہے وہاں چند گھنٹے اور بھی گزر سکتے ہیں۔“

اگلے روز قرآن خوانی ہوئی تو خلق خدا کو بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ کسی نے کہا ”آج بھی بڑا اجتماع ہے کل بھی بڑا جنازہ تھا۔“

دوسرے نے جواب دیا "ایسا ہی ہوتا ہے کل جب اختیارات والی کرسی نہیں رہے گی تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

☆☆

انسپکٹر صاحب بڑے چاک و چوبند اور حاضر دماغ تھے۔

وہ جب بھی کسی سکول کا معائنہ فرماتے تو ڈپٹی صاحبان، اسسٹنٹ انسپکٹر اور دو تین شہری اے ڈی آئی صاحبان کو ساتھ لے کر سکول میں پہنچ جاتے۔ ہیڈ ماسٹر سے کہتے کہ وہ تو آج کا دن چھٹی کرے.......... ہاں البتہ پوچھ گچھ اور راہ نمائی کے لئے اپنا ایک "چمچہ" ہمارے حوالے کر دے۔ ہیڈ ماسٹر بیچارا کہتا..... نہیں جناب، میں آپ کی خدمت کے لئے خود بھی ادھر ہی رہوں گا۔ آپ جو حکم دیں گے بجالاؤں گا۔ انسپکٹر صاحب کہتے کہ آپ کی موجودگی میں ہم سکول کو صحیح طور پر "کھنگال" نہیں سکیں گے آخر مجھے اور ان میرے ساتھیوں کو آپ کا احترام تو ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود مجبوراً اور احتراماً ہیڈ ماسٹر کو انسپکٹر کی بات ماننا پڑتی اور وہ سکول سے گھر یا کہیں اور چلا جاتا اور اپنے کسی خاص الخاص، ماتحت کو انسپکٹر صاحب کے سپرد کر دیتا۔

اب انسپکٹر صاحب اس "چمچہ ماسٹر" کو بلاتے اور کہتے۔

"دیکھو! میری خوراک دو چپاتیاں اور دال ہے۔ مگر یہ جو میرے ساتھ آتے ہیں وہ ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے" "یہ سور کھانے کے عادی ہیں اور اسی لیے میرے ساتھ آتے ہیں.......... کیا تم سور کو سمجھتے ہو؟؟

"جی ہاں"

"تم اس سور کی بات تو نہیں کر رہے جسے انگریزی میں پگ اور عربی میں خنزیر کہتے ہیں۔"

"نہیں جی.......... نہیں۔" چمچہ ماسٹر کہتا۔

"شاباش۔ تم صحیح چمچے ہو.......... وہ چمچے نہیں جو عام معنوں میں استعمال ہوتے ہیں.......... اب سن لو کہ یہ لوگ گوشت، تکے، چانپ، مرغ بٹیر، فرنی کھیر.......... سب شوق سے کھا جاتے ہیں.......... اب تم اس سب کچھ کا انتظام کرو.......... میرے لیے مونگی کی دال اور دو روٹیاں کافی ہیں.......... جاؤ بندوبست کرو اور کسی چھوٹے چمچے کو ہمارے حوالے کر دو۔

معائنہ بھی ہوتا۔ لاگ بک بھی لکھی جاتی اور دال کے بجائے صاحب سب کچھ چکھتے

چکھتے پیٹ بھر لیتے اور جاتے جاتے بچا کھچا لیکن صاف ستھرا کھانا ہمارے اشارے پر کار کی ڈگی میں رکھ دیا جاتا کہ انسپکٹر صاحب نے کچھ کھایا نہیں .... چلیں اب رات کے وقت اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ مل کر کھالیں گے۔

☆☆

ڈویژنل انسپکٹر کے دفاتر میں ایک اسامی اسسٹنٹ انسپکٹر کے عنوان سے تھی۔ اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے لیکن لاہور ڈویژن میں یہ اسامی ایک پڑھے لکھے تعلیم یافتہ ہرکارے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ اتنی غیر مقبول اور غیر دلچسپ اسامی پر کوئی بھی تعینات ہونا پسند نہ کرتا تھا، مجبوری کی بات اور تھی۔ اس کے مقابلے میں اے ڈی آئی کی اسامی ہزار درجہ باعزت تھی مگر یہ راز صرف انتظامیہ ہی کو معلوم تھا یا خود اس اسامی پر تعینات شخص کو..... انگریزی معلمین اور صدر معلمین اس اسامی کو انسپکٹر کی اسامی ہی کی طرح اہم خیال کرتے تھے۔

ربانی صاحب کے اسسٹنٹ انسپکٹر نے اپنے سیاسی اثر ورسوخ سے اپنا تبادلہ اپنے گھر کے قریب کسی سکول میں کرا لیا۔ ربانی صاحب کو معقول اسسٹنٹ انسپکٹر کی تلاش ہوئی تو انھوں نے ایک ایک کر کے سب مقامی اے ڈی آئی صاحبان سے پوچھا۔ کسی نے بھی ہامی نہ بھری۔ انھوں نے چودھری غلام حیدر (رتہ) کا تبادلہ اس اسامی پر کرنے کی ٹھانی۔ اسے دفتر بلایا۔ چائے پلائی اور پھر اسے اس اسامی کے بارے میں خاصے سبز باغ دکھائے۔

چودھری غلام حیدر نے تنگ آ کر بڑی لجاجت سے پوچھا کہ کیا یہ نزلہ اسے عضوِ ضعیف سمجھ کر اس پر نازل کیا جا رہا ہے؟ ربانی صاحب ذرا سٹ پٹائے۔ کچھ مزید سمجھانے کی کوشش کی تو چودھری غلام حیدر پھٹ پڑا۔ اس نے برملا کہا:

''آپ کے مُردوں کا کفن دفن کرنے کو تو چودھری غلام حیدر اے ڈی آئی تھا۔ اب اس کے کام سے خوش ہو کر اس کو یہ انعام دے رہے ہیں کہ وہ قبرستان میں اٹھنے والا خرچہ بھی پورا نہ کر سکے۔ اسے کہتے ہیں غریب مار۔''

ربانی صاحب دانا و بینا آدمی تھے، سمجھ گئے کہ غلام حیدر کے لہجے میں کس قدر تلخی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم اپنے مصارف کا بل پیش کرو۔ اس نے کہا کہ اگر بل دینا تھا تو اسے اب سے بہت پہلے ادا ہو جانا چاہیے تھا اور اگر میں نے بل پیش کرنا ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔ اب تو چالیس دن گزر چکے ہیں۔

پھر انھوں نے نہ جانے کہاں سے پرویز قریشی کھوج نکالا جو بڑا عرصہ اس اسامی پر متمکن رہا تا آنکہ اس کی ترقی ہوگئی۔

☆☆

انسپکٹرز کانفرنس کا ایجنڈا تو اتنا زوردار تھا جیسے اسمبلی میں پوچھے گئے سوالات ہوتے ہیں لیکن توقع کے برعکس اس کی دہشت پہلے ہی روز ختم ہوگئی۔ زیادہ تر سالانہ ترقیاتی پروگرام زیر بحث رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ کانفرنس میں جتنی بڑی توپیں شامل تھیں ان کا تعلق کالج کیڈر سے تھا' صرف چند اعلیٰ افسران ہی اسکول کیڈر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ربانی صاحب ہی کی طرح یہ پیش بندی کر کے آئے تھے کہ 'سب اچھا ہے' ہی کی رپورٹیں دینی ہیں۔

کچھ اصحاب نے بے چراغ دیہات' دریا برد ہو جانے والے اسکولوں اور ان کے متبادل انتظامات کے لیے سوالات اٹھائے۔ بلا عمارت اسکولوں' ناکافی عمارتوں والے اسکولوں' کم عملے والے اور زائد عملے والے اسکولوں کا ذکر آیا۔ قومی سطح پر شرح خواندگی بڑھانے کے اقدامات اور اس کے کم ہونے کے اسباب پر غور ہوا۔ سفارشات بھی مرتب کی گئیں۔ کانفرنس کی ابتدا ہی سے ڈی پی آئی' ڈاکٹر جہانگیر خاں اور پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج' پروفیسر اشفاق علی خاں کے درمیان خاصی نوک جھونک رہی جس سے کانفرنس میں پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔

پروفیسر اشفاق علی خاں کا رویہ مرزا مسعود بیگ جیسا تھا۔ مرزا مسعود بیگ تو راہِ فرار اختیار کر گئے تھے لیکن پروفیسر اشفاق علی خاں ڈٹے رہے۔ حاکم مجاز چونکہ ڈی پی آئی تھے اس لیے 'ہر مسالے پیلا مول' کے مصداق پروفیسر صاحب ہر تان ڈاکٹر صاحب ہی پر توڑتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب برامان جاتے بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے کہہ ہی دیا کہ پروفیسر صاحب خود ڈی پی آئی بن کر دیکھیں' پتہ چل جائے گا کہ وہ کیا تیر مارتے ہیں۔"

تیسرے روز پروفیسر اشفاق علی خاں خاموش خاموش تھے۔ ڈاکٹر جہانگیر خاں نے خود پوچھا کہ "بھئی آج کیا معاملہ ہے؟ چپ کیوں لگ گئی ہے؟"

"رات خواب آیا کہ آپ نے میری اے سی آر میں لکھ دیا ہے کہ شرح خواندگی گرانے میں پروفیسر اشفاق علی کا ہاتھ ہے۔"

اس جواب پر زبردست قہقہہ پڑا۔ فضا خوشگوار ہو گئی اور الوداعی تقریب انجام کو پہنچی۔ محکمہ تعلیم پنجاب کی تاریخ میں یہ انسپکٹرز کانفرنس آخری ثابت ہوئی۔ بعد کو نہ جانے کیا ہوا کہ ساری ملازمت کے دوران پھر ایسا موقع نہیں آیا۔

☆☆

۱۹۶۴ء میں بنیادی جمہوریت کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ مجھے تین روز کے لیے مد کے دھاریوال، چک ۵۳ اور چک ۵۴ میں پریذائیڈنگ افسر تعینات کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقع کے لیے میں نے خصوصی طور پر ٹیرالین کی قمیص خریدی اور ایک گرم سوٹ بھی سلوایا۔ ۱۹۵۳ء میں سیالکوٹ سے خریدی ہوئی دفتری صندوقچی کو نئے سرے سے روغن کرایا، اس کا تالا ٹھیک کرایا۔ اس پر نام اور عہدہ درج کرایا اور اس میں انتخابات سے متعلقہ تمام ضروری سامان رکھ کر اسے مقفل کیا۔

ان انتخابات میں ووٹ کی پرچی یکساں تھی تاہم ہر امیدوار کے لیے پرچی ڈالنے کی صندوقچی الگ الگ مختص کی گئی تھی۔ ہر صندوقچی پر امیدواروں کے مخصوص انتخابی نشان چسپاں تھے۔ ووٹ کی پرچی ڈالنے کے لیے امیدواروں کی صندوقچیاں پردے کے پیچھے ایک قطار میں رکھ دی گئی تھیں۔ ووٹ کی ہر پرچی پر پریذائڈنگ افسر کے دستخط شرطِ لازم تھے، دستخط کے بغیر ووٹ کی کوئی پرچی درست تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی۔

قادر بخش میرے ساتھ تھا۔ ہمارا پہلا پڑاؤ مد کے دھاریوال میں تھا۔ سیدھے راستے پر سیلابی پانی کی وجہ سے ہم لاہور سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچے۔ مدرسے میں رہائش کا انتظام تھا اور وہ ہی پولنگ اسٹیشن بھی تھا۔ دو افراد پر مشتمل دوسرا عملہ بھی پہنچ چکا تھا۔

وہاں خوشخبری یہ تھی کہ ایک امیدوار نے انتخابات لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور دوسرا بلا مقابلہ ہی منتخب ہو رہا تھا۔ ہمیں چونکہ اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہ تھی لہٰذا اگلی صبح ہم انتخابی دفتر ٹھیک کر کے اپنے کام کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ صرف جیتنے والے امیدوار نے اپنا ووٹ ڈالا۔ دوسرا امیدوار آیا نہ کوئی رائے دہندہ۔ وقت مقررہ پر انتخابی مرکز بند کیا۔ ضروری کاغذات کی تکمیل کی اور اگلی منزل چک ۵۳ پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے۔

اب ہمیں پتہ چل چکا تھا کہ جس سیلابی پانی کا سن کر ہم براستہ لاہور آئے تھے، اس سیلابی پانی پر حکومت نے آمدورفت کے لیے معمولی کرائے پر موٹر کشتی چلا رکھی تھی۔ جیتنے والے

سردار صاحب نے موٹر کشتی والوں کو ہمیں چک ۵۳ لے جانے کے لیے پابند کر دیا تھا۔

☆☆

ٹھیک چار بجے قادر بخش اور میں باقی دونوں انتخابی معاونین کے ہمراہ موٹر کشتی میں بیٹھے۔ اللہ کی قدرت کے صدقے جائیں، میلوں تک پھیلے نشیبی علاقے میں کھڑا پانی اس قدر شفاف تھا کہ اس میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کی ایک ایک شے نظر آ رہی تھی۔ کئی کھیت فصلوں سمیت یوں نظر آ رہے تھے جیسے وہ ہوں ہی آبی پودے۔ درخت، مکانات، چند رہٹ، دستی نلکے بالکل اس طرح کھڑے تھے جیسے فلموں میں والٹ ڈزنی کی تفریحی آبدوزوں سے سمندر کے اندرونی اسرار کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ انوکھا نظارہ تھا۔ اس کی دید سے میرے اندر کا فنکار قدرت کی نیرنگیوں کی ثنا خوانی میں محو ہو گیا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد زبان پر جاری تھا۔

بے شک تین چار مربع میل کی فصلیں تباہ ہوئی تھیں۔ اگلی فصل کی کاشت بھی پانی خشک ہونے تک ناممکن تھی لیکن سیلابی پانی کے نیچے دور دور تک جو کھیت، کھلیان، درخت، پودے، کیاریاں اور دیہی زندگی کے جو دیگر مظاہر نظر آ رہے تھے وہ اس قدر دلکش اور مسحور کن تھے کہ میں دنگ ہو کر انھیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگر ارباب اختیار میں کوئی روحانی بالیدگی والا صاحب دل ہوتا تو وہ اس دلفریب نظارے سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور شہری باشندوں کو بھی اس جنت ارضی کے نظارے کی دعوت دیتا۔ موٹر کشتیوں پر مناسب شرح کے ٹکٹ کے عوض شہریوں کی بڑی تعداد اس دلکش نظارے کی سیر کے لیے آ سکتی تھی۔ اس طرح سیلاب زدگان کے لیے بھی اچھی خاصی رقم آسانی سے جمع ہو جاتی۔

بعض جگہوں پر پانی کی گہرائی پچاس فٹ سے بھی زیادہ تھی کیونکہ بڑ اور پیپل جیسے درخت بھی پانی کے نیچے تھے۔ سطح پرسکون، ہموار اور صاف تھی۔ اگر میرے ساتھ وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا تو میں اسی راستے سے واپس جا کر دوبارہ پھر اس غرق شدہ جنت کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔

☆☆

اسٹیٹ آفس سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کے ماموں چک ۵۳ میں امیدوار تھے۔ چودھری حمید اللہ نے مجھے ان کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے ووٹروں کو جتنی جلدی لے آئیں گے میں ان کو اتنی ہی تیزی سے بھگتا دوں گا۔ مگر وہ یہ چاہتے

تھے کہ میں ووٹ کی پرچیوں کی ایک کاپی پر دستخط کر کے ان کو دے دوں۔ اپنا ووٹ ڈالتے وقت وہ اس کاپی کی پرچیاں بھی صندوقچی میں ڈال دیں گے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ میں نے انھیں اپنے ہاتھ کاٹ کر دینے سے انکار کر دیا۔ اب انھوں نے مجھے دھمکیاں دیں کہ وہ مجھے انتخاب ہی نہیں کرانے دیں گے۔ ان کے مخالف فریق نے ہمیں کہا کہ وہ رات بھر پہرہ دیں گے، ہم کوئی فکر نہ کریں۔ قادر بخش تو ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔

سفارشی فریق کی حالت واضح طور پر کمزور جا رہی تھی۔ مخالف فریق کی صندوقچی ووٹوں سے بھر گئی تو میں نے دونوں پولنگ ایجنٹوں کے سامنے صندوقچی کے سوراخ میں بانسی جھاڑو کا تنکا ڈال کر پرچیاں نیچے کیں تو ہارنے والی ٹولی نے شور مچا دیا ''بے ایمانی ہو گئی، دھاندلی ہو گئی۔ بائیکاٹ بائیکاٹ۔'' اتفاق سے پولیس والوں نے بھی مجھے تنکا پھیرتے دیکھا تھا۔ انھوں نے میری پوری پوری حمایت کی اور ہارنے والے فریق کو سمجھایا کہ وہ سرکاری اہلکاروں سے زیادتی نہ کریں۔ نتیجے میں ہارنے والی پارٹی کو سینکڑوں ووٹوں سے شکست ہوئی۔ جیتنے والی پارٹی نے ہماری رات بھر حفاظت کی کیونکہ اگلی صبح چک ۵۳ کے جڑواں گاؤں چک ۵۴ کا پولنگ بھی اسی جگہ ہونا تھا۔

اگلی صبح جب میں چک ۵۴ کے انتخاب کے انتظامات کر کے اپنی کرسی پر بیٹھا تو مجھے سامنے سے شفیع احمد میو جو ہائی اسکول بھائی پھیرو کے صدر معلم تھے اور جن کی رہائش کوٹ رادھا کشن میں تھی، آتے دکھائی دیے۔ میں سمجھا کہ شاید ریٹرننگ افسر نے ان کو انتخابی مقامات کا معاینہ کرنے کا فرض سونپا ہے لیکن انھوں نے آتے ہی مجھے کہا کہ ان کو میری جگہ پریذائڈنگ افسر تعینات کیا گیا ہے لہٰذا میں انتخابات کا پورا سامان ووٹ کی پرچیوں سمیت ان کو دے دوں۔ میں نے دو منٹ بھی نہیں لگائے اور یہ ذمے داری ان کو سونپ دی اور قادر بخش کے ساتھ ریل کے ذریعے پہلے رائے ونڈ اور پھر قصور پہنچ گیا۔

☆☆

ہم ٹھیکیدارانِ اراضی آٹھ مربع بجوار موضع ججل جانے کے لیے ایک اتوار کو بذریعہ بس ڈھنگ شاہ کے اڈے پر جا کر اترے۔ وہاں شیخ نذیر صاحب معہ ہمارے مطلوبہ شخص کے موجود تھے۔ غائبانہ تعارف تو مجھے شخص مذکور کا پہلے ہی تھا اب روبروئی سے ان کے متعلق بہت کچھ اندازہ ہوا۔ شیخ نذیر صاحب نے دوسرے دونوں اصحاب سے بھی نصراللہ نصر کا تعارف

کرایا۔ جونئی بات انھوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ وہ اردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ یہ انکشاف میرے لیے تو خوش کن تھا لیکن ہر دو اصحاب نے مجھے دبی زبان سے کہا کہ شاعر لوگ ٹھوس کام نہیں کر سکتے۔ میرا چناؤ غلط ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پگڑی اور ڈاڑھی سے بھی یہ کوئی بے عمل مُلّاں ہی دکھائی دیتا ہے۔

تانگے پر بیٹھے تو شیخ نذیر نے نصراللہ کے بارے میں مزید بتایا کہ لاہور کے کسی اخبار نے اپنے اتوار کے ادبی ایڈیشن میں لکھا تھا کہ یہ پرانے کپڑوں میں ملبوس جدید سوچ کا درویش ہے جو غالب جیسی زبان، اقبال جیسا فکر اور فیض جیسے نادر مضامین کا امین ہے۔ میں اس لیے حیران ہو رہا تھا کہ شیخ نذیر بھی عجیب چغد ہے کہ اس نابغہ عصر کو کاشتکاری کے لیے اٹھا لایا ہے اور یہ نابغہ خود بھی کیوں آیا ہے؟

تھوڑی دیر کے لیے ہم زمین کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ صفدر حیات خان کو اپنے گاؤں کے چار مرلوں کا بڑا مان تھا۔ اس نے کچھ گفتگو زمین، پانی، بیج، پیداوار، تلائی اور کاشت کے متعلق کی تو مولانا نے بھی دخل اندازی کی اور اپنی معلومات اور تجربے سے سب کو چونکا کر رکھ دیا۔ میرے لیے یہ سب باتیں دوسری دنیا کی تھیں۔ ذرا خاموشی ہوئی تو شیخ صاحب نے نصراللہ سے کچھ سنانے کو کہا۔ انھوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''قاضی صاحب ..... عرض کیا ہے ؎

وہ سنتے ہیں ہر شب کہانی ہماری
مزا دے گئی، خوش بیانی ہماری

سبحان اللہ، میں پھڑک کے بغیر نہ رہ سکا۔ ترنم بھی کمال کا تھا۔ ایک ہی شعر میں اندازہ ہو گیا کہ شیخ نذیر احمد نے جو کہا سچ تھا۔ غزل کے باقی اشعار یہ تھے:

فسانہ ہوئی ہے، کہانی بنی ہے
جوانی تمھاری، جوانی ہماری
سحر اپنے بس میں، نہ شام اپنے بس کی
یہ ہم ہیں، اور یہ ہے زندگانی ہماری
بہت عشق سے نصر کو، ہم نے روکا
مگر اس نے ایک نہ مانی ہماری

خوب، خوب............اب کے صفدر حیات خاں اور میاں عبدالحق نے بھی کہا۔ مزید کچھ ارشاد کرنے کا تقاضا کیا تو فرمایا ۔

آئے وہ آخری دم، اشک الم گرانے
بیمار محبت، تیری محنت لگی ٹھکانے
بہبودی بشر کی، تدبیر ہو تو کیا ہو
تقدیر ڈھونڈتی ہے، اچھے برے بہانے
اے قبلۂ محبت، فرمایئے، کہاں تک
دیوانہ محبت، صحرا کی خاک چھانے
پی پی کے خون گل کا، کانٹے کی نوک نکلی
پیدا کیا جفا کو، اے نصر خود وفا نے

ذرا غور کروں تو ان کے بہت سے اشعار یاد آ سکتے ہیں لیکن طوالت کا مسئلہ آن گھیرے گا۔ ویسے بھی میں اپنی مدرسی کی روداد لکھ رہا ہوں۔ نصر اللہ نصر کی سوانح نہیں، لیکن وہ ان قبلہ گاہ لوگوں میں سے تھے جو سوچ کا راستہ روک لیتے ہیں۔ لیجئے ان کا ایک اور شعر یاد آ گیا ۔

للہ مجھے چھوڑ دے، اے شومئ قسمت
کیا میرے سوا، تیرا گزارا نہیں ہوتا

ہائے، ایک شعر اور ۔

گوئے ستارہ سحر، مٹتے ہوئے کہہ گئی
جیت تیری اسی میں ہے، کسی سے ہار کے چل

تسلی نہیں ہوئی............ایک اور ۔

آنسو بہے تو آپ کا نقصان کیا ہوا
موتی چلے گئے، تو ہمارے چلے گئے

سوچ کا دھارا، ٹھیکیداری کی کہانی کی طرف موڑتا ہوں تو پھر بھی نصر راہ تھام لیتے ہیں ۔

نہ قیصر نہ کسریٰ، نہ خاقان ہوتے
بڑی بات تھی، جو ہم انسان ہوتے

نصر اللہ نصر ہفتے کو دوپہر کے بعد وہاں جاتے اور پیر کی صبح کو وہاں سے آ جاتے۔ جو وہ

وہاں مزارعین کو کرنے کو کہتے اس پر عمل نہ ہوتا۔ میرے ساتھ دفتر آ کر ملاقات کی اور بتایا کہ جو مزارعے عطااللہ خان کے قابو سے باہر تھے انھیں مولوی نصر کیسے قابو کر سکتا ہے۔ اٹھ ہزار روپے کا فاتحہ پڑھ دیجیے۔ وہاں حالات بڑے دگرگوں ہیں یا پھر پولیس وغیرہ کے ذریعے وہاں کارروائی کروائیے۔ زمین پر ایک ہی خاندان مزارعہ چلا آ رہا ہے۔ وہ اچھی اچھی زمین کاشت کر لیتے ہیں بقیہ پر توجہ نہیں دیتے۔ باری کا پانی وہ ملحقہ زمینوں کے مالکوں کو نقد بیچ دیتے ہیں۔ ٹیوب ویل کے لیے تیل کا ڈرم لینے جاتے ہیں تو نصف لاتے ہیں۔ سخت منہ زور ہیں۔ عورتیں تک انھیں کہتی کہ بابا ادھر تم بھوکوں مرنے کیوں آتے ہو؟

ہم سب فکر مند ہوئے۔ صفدر حیات خاں نے خود زمین پر ڈیرہ جمانا چاہا تو بھی بات نہ بنی گندم اور دھان کی کٹائی کے وقت صفدر حیات نے پولیس سے امداد حاصل کی اور بمشکل آٹھ ہزار میں سے دو تین ہزار کی فصل حاصل کر سکے۔ مجھے تو حصہ داری میں تلوں کا ایک ٹوپہ ہی ملا۔ زمیندارے کے ذریعے امیر بننے کا خواب پریشان ہو گیا اور کسی مہربان نے میری ''امارت زمیندارے'' اور ملازمت کے حوالے سے میرے خلاف انٹی کرپشن میں درخواست دی۔ تحقیقات ہوئی۔ میں نے مفت کا حصہ دار ہونے کا اقرار کر لیا اور انٹی کرپشن کے ایس پی صاحب کو مؤدبانہ لکھ کر جواب دیا کہ درخواست کے مطابق ہر بڑے شہر میں میرے جو بنگلے ہیں ان کو حکومت ضبط کر لے اور مجھے ایک چھوٹا سا مکان لاہور میں رہائش کے لیے دے دے۔ جن بینکوں میں میرے کھاتے ہیں ان کو بھی بحق سرکار ضبط کر لیا جائے اور جو بینک میرا کھاتہ کم سے کم رقم ظاہر کر رہا ہو مجھے اس کی چیک بک جاری کرا دی جائے۔

کافی عرصے بعد پتہ چلا کہ درخواست صفدر حیات خان ہی نے دلوائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مزارعہ کے عدم تعاون کی کارروائی میں میرا دخل تھا اور نصر اللہ نصر کے ذریعے میں نے زمین سے بڑا استفادہ کیا تھا۔ میں نے سی آئی اے کے ذریعے مزارعین کو جوتے لگوانے کی صفدر حیات خاں کی تدبیر سے انھی وجوہات کی بنا پر انحراف کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں قصور میں اپنے عہدے کے حوالے سے اور دیگر تعلقات کی وجہ سے سی آئی اے کی مدد حاصل کر سکتا تھا۔ میرے ذوق شوق کے حوالے سے نصر اللہ نصر کی دریافت مربع جات کے ٹھیکوں سے بڑھ کر تھی۔

☆☆

میرے گھر میں پرانے سوت کی بنی ہوئی ایک فرشی دری بچھی ہوئی تھی جو میں نے بارہ

روپے میں خریدی تھی۔ جہیز کا ایک پرانا پلنگ' دیوار کے ساتھ بچھا ہوا تھا اور اس کی بغلی دیوار کے ساتھ قبلہ رخ ایک تخت پوش رکھا ہوا تھا۔ دو تین دفتری کرسیاں بھی تھیں۔ ایک دن قصور شمالی کا ایک ایس وی مدرس المعروف بابا کسی کام کے سلسلے میں آیا۔ اسے میرے کمرے کی خستہ حالی پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا کہ وہ جدی پشتی ترکھان ہے۔ وہ ایک سو روپے کے عوض مجھے ایک عمدہ صوفہ تیار کر کے دے سکتا ہے۔

میں نے اسے اگلے روز آنے کو کہا۔ گھر میں بیوی سے بات کی تو وہ اس قدر سستا صوفہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوگئی۔ اس نے گھر کے خرچے سے کچھ رقم بچا رکھی تھی' ان ہی میں سے سو روپے مجھے دیے۔ ان پیسوں سے بابا لاہور جا کر کپڑا' ناریل کی چھال' سپرنگ' ٹاٹ اور سوت کی ڈوری وغیرہ خرید لایا۔ لکڑی خریدنے کے باوجود چند روپے اس کے پاس بچ گئے تو اس نے صوفے کے پایوں کے لیے پیتل کی شامیں بھی خرید لیں۔ صوفہ تیار ہو کر آ گیا تو اس کی پشت اتنی آگے بڑھی ہوئی تھی کہ بیٹھنے والا اکڑوں ہی بیٹھ سکتا تھا۔

بابا پھر صوفے کو لے گیا اور پشت درست کر دی لیکن پھر بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو دوسروں کے صوفوں پر بیٹھ کر میں نے محسوس کی تھی۔ بہر کیف اس صوفے سے میرا کمرہ کچھ رعب دار ہو گیا تھا۔ بجلی کا چھت والا پنکھا ایک ہی ہونے کی وجہ سے ہم دوپہر اسی کمرے میں بسر کرتے۔ دونوں بھائی صوفے پر لیٹنے کے لیے الجھنے لگے' تو ان کی ماں نے بڑے کو تین نشستوں والا حصہ دے دیا اور دو نشستوں کو الگ الگ اکٹھا رکھ دیا۔ صوفے کے بازو نہیں تھے۔ پلنگ کمرے سے نکال دیا گیا۔

☆☆

ایک بار ماسٹر حاکم علی جو سردار احمد علی' سردار آصف وغیرہ کے خانوادے کا خاص آدمی تھا' آیا تو اس نے صوفے کو بڑا پسند کیا اور مجھے کہا کہ اس کے پاس شیشم کا ایک سالم سوکھا درخت پڑا ہے' وہ لکڑی کھڈیاں بھجوا دیتا ہے۔ میں کھڈیاں کے اول مدرس شیخ صدیق سے کہوں کہ وہ لکڑی کے دو پلنگ' میز اور کرسیاں بنوا دے۔ کھڈیاں قصبے میں بڑے کاریگر ہیں۔

''کتنا خرچہ آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو خرچے سے کیا' قصباتی اسکول ہے۔ ہزاروں روپیہ تو شیخ نے داخلے ہی پر اکٹھا کر لیا ہوگا۔''

''یار، ایسی بات نہ کرو، شیخ صاحب بڑے نفیس آدمی ہیں۔''

''نفاست سے ہمیں کب انکار ہے لیکن وہ میرے بھی مرکز کے صدر معلم ہیں اور میرا تعلق سرداروں کی وجہ سے ہر ہمہ شما سے ہے۔''

وہ چلا گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ تعطیلات موسم گرما آ گئیں۔ میں دفتر میں کم ہی بیٹھتا تھا۔ ایم ایڈ میں خصوصی کورسز شروع تھے۔ میں ادھر زیادہ مصروف تھا۔ مجھے یہ یاد بھی نہیں تھا کہ حاکم علی سے میری کوئی بات ہوئی تھی اور مجھے شیخ صدیق سے کچھ کہنا تھا' ایک دن میں جو رات گئے گھر آیا تو دو خوبصورت چمکتے نواڑی پلنگ ایک کمرے میں بچھے تھے۔ شیخ صاحب پلنگوں کو صبح ہی صبح چھوڑ گئے تھے۔

میری بیوی نے علم دین نائب قاصد کے ذریعے نواڑ منگوا کر علم دین ہی سے بنوا بھی لیے تھے۔ یہ پلنگ اتنی پائیدار لکڑی کے بنے ہوئے تھے کہ آج تک زیر استعمال ہیں گو نواڑ کی جگہ اب تختے لگوا لیے گئے ہیں۔ میں بے اختیار حاکم علی کے خلوص کی داد دیتا رہا کہ اس نے کمال کیا۔ حاکم علی کا خیال تھا کہ اس نے جتنی لکڑی بھجوائی تھی وہ پوری کام میں نہیں آئی۔ اس لکڑی میں سے شیخ صاحب نے اپنے لیے بھی کوچیز ضرور بنوائی ہے۔

بیوی صاحبہ کو گھر بنانے کا بڑا شوق تھا۔ جب مجھے سفری مصارف کے بل اکٹھے ملتے تو وہ اس رقم سے کچھ نہ کچھ ضرورت کی اشیاء خرید لیتی۔ اب وہ کبھی کبھار روئیاں لگوا کر لانے والی عورت کے ساتھ بازار کا بھی چکر لگا آتی تھی۔

اللہ کی کرم نوازی سے زندگی متوازن تھی۔ خواہشوں کی فراوانی کے باوجود وقت اچھا گزر رہا تھا۔ میں نے دو سو روپے میں ایک ریڈیو اور بیس روپے ماہوار اقساط پر سنگر سلائی مشین بھی خرید لی۔ کمرے میں بجلی کی ٹیوب بھی لگوائی کہ بچے اس کی روشنی میں پڑھ سکیں۔ اس پر صرف سترہ روپے خرچ آئے تھے۔ کبھی کبھی ہم رات کے وقت دہی پکوڑیاں بھی منگوانے لگے تھے۔ جو اشیاء لاہور میں ناشتے پر ملتی ہیں قصور میں وہ رات کا کھانا تھیں جیسے مرغ چنے اور سری پائے...... کبھی کبھار ان کا ذائقہ بھی چکھ لیتے تھے۔ قصور کا فالودہ بھی نوادرات میں سے تھا۔ ہم گاہے گاہے کھاتے اور لطف اندوز ہوتے۔

◆◆◆◆◆

(۲۶)

امریکن ماہرینِ تعلیم کی مہمانداری

پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تعلیم و تحقیق میں تحقیقی اور درسی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ اگلے سال ستمبر ۶۵ء میں ایم۔ایڈ کے مطلوبہ سہ ماہی کورسوں پر مبنی جامع امتحان ہونے والا تھا۔ تب تک ہر طالب علم کو سولہ کورس مکمل کرنے تھے۔ میرے دو کورس، یعنی شماریات اور سائنس کم پڑ گئے تھے۔ مجھے ان میں ای گریڈ ملا تھا جو مجموعی نتیجے پر منفی اثرات مرتب کر سکتا تھا۔ میں نے ان کی بجائے نئے کورس منتخب کیے۔ انھیں دگنا وقت دے کر ہی پورا کیا جا سکتا تھا۔ میں باوجود مصروفیت کے یہ وقت دے رہا تھا۔

ایم۔ایڈ کی ڈگری کا ایک اور تقاضا تعلیمی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنا بھی تھا۔ اس ضمن میں انڈیانا یونیورسٹی کے ڈاکٹر بائڈ میرے مشیر مقرر کیے گئے۔ ان سے پہلی ملاقات میں طے پایا کہ میں ٹی۔وی کی تعلیمی افادیت پر مقالہ اور دیہی پس منظر پر ایک ٹی وی ڈرامہ لکھوں گا۔ ان دنوں پاکستان میں ٹی وی کی آمد آمد تھی۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے ایک ایسی نمائشی ریل چلائی جو جابجا ریلوے اسٹیشنوں پر کلوز سرکٹ ٹی وی پر فلمیں اور اشتہارات دکھا رہی تھی۔ میں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر یہ نمائشی ریل دیکھی تھی اور ٹی وی کے علاوہ اس پر پروگراموں کی نشریات کا میکانکی عمل بھی دیکھا تھا لہٰذا مجھے اس جدید موضوع سے دلچسپی تھی۔

ادارے کی عظیم لائبریری میں ٹی وی کے موضوع پر گنتی کی چند کتب دستیاب تھیں۔ مجھے ان ہی سے استفادہ کرنا تھا لہٰذا کام آسان تھا۔ ڈرامے وغیرہ سے مجھے ویسا ہی لگاؤ تھا جیسا اپنی ملازمت سے۔ ڈاکٹر بائڈ نے مقالے اور ڈرامے کے سلسلے میں ڈاکٹر وتیڈیٹا سے بھی میری ملاقات کرائی جو اپنے ملک میں کچھ ٹی وی پر گرام کر چکے تھے۔ میرے گروپ ٹیوٹر ڈاکٹر گارود تھے۔ انھوں نے ہفتہ وار بات چیت کے دوران مجھ سے بھی مقالے کا پوچھا پھر نہ جانے کیوں

ان کا رخ میری ملازمت کی نوعیت کی طرف مڑ گیا۔ ڈاکٹر گارود نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے علم میں اضافے کے لیے میرے انتظامی حلقے کے چند اسکول اور دیہات دیکھنا چاہیں گے، میں نے ان کی خواہش پورا کرنے کی ہامی بھر لی۔

ڈاکٹر گارود نے ڈاکٹر بائڈ اور ڈاکٹر وینڈیٹا کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ ان کی بیگمات بھی ساتھ ہوں گی۔ ان سے وقت اور دن طے ہو گیا۔ ان غیر ملکی اساتذہ کے قریب ہو کر مجھے اپنی ڈگری کے حصول میں آسانی ہو سکتی تھی۔ ہم جماعتوں میں کچھ ایسے ساتھی بھی تھے جنھوں نے بعض امریکن پروفیسروں کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے امریکہ جا کر تعلیم کے شعبے میں ڈاکٹریٹ کے وظائف حاصل کر لیے تھے۔ ایک کھیپ تو واپس بھی آ چکی تھی، میرا خوشامد کا ارادہ نہ تھا بلکہ میں ان پروفیسروں کے ذہنوں پر پاکستانی روایات کے دوررس نقوش ثبت کرنا چاہتا تھا۔

مَیں نے اپنی انتظامی تعلیمی سب ڈویژن میں امریکی پروفیسروں کی آمد اور ان کی مصرفیات کے سلسلے میں کچھ انتظامات کرنے کے لئے اپنے جملہ مرکزی صدر معلمین کا اجلاس بلایا۔ ہر صدر معلم کو امریکیوں کی میزبانی کے لیے تیار پا کر مجھے قرعہ اندازی سے کام لینا پڑا۔ قرعہ اندازی سے پہلے متفقہ طور پر طے کر لیا گیا تھا کہ قرعہ جس صدر معلم کے نام نکلے گا وہ اپنے مرکز کی حدود میں جملہ مردانہ اور زنانہ سکولوں سے رابطہ کرے گا اور ان سکولوں کی ظاہری و باطنی حالت کو مقدور بھر بہتر طور پر پیش کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ گردونواح کو بھی صاف ستھرا بنائے گا اور مہمانوں کی آمد کی اہمیت اپنے مرکز میں واضح کرے گا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ شکایت کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔ اگر کوئی صدر معلم ایسا نہیں کر سکتا تو وہ ابھی بتا دے تا کہ اس کا نام ہی قرعے میں شامل نہ کیا جائے۔ شیخ محمد اشرف بی۔ اے بی۔ ایڈ صدر معلم نے اپنی سماعت کی کمزوری کی وجہ سے قرعے میں اپنا نام شامل نہیں کرایا۔ ویسے بھی وہ بھاری بھر کم وجود کی وجہ سے اس سرگرمی میں فعال کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔

میری توقع کے برخلاف قرعہ صدر معلم گورنمنٹ مڈل سکول جوڑہ علامہ صدیق ارشد کے نام نکلا تھا۔ علامہ صاحب باتونی آدمی تھے اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کام کم کریں گے اور باتیں زیادہ۔ لیکن اب قرعے نے میرا گلا دبا لیا تھا، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مَیں نے بڑی رسانیت سے علامہ صاحب سے کہا "دیکھنا علامہ صاحب! یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مجھے

کوئی 'الامہ' نہ دلانا۔"

"جناب!" علامہ نے کہا "اگر چہ آپ کو قرعہ بدلنے کا بھی اختیار حاصل ہے لیکن آپ اطمینان رکھیں۔ بس دیکھتے جائیں 'آپاں' امریکیوں کی عقل گم کر دیں گے۔ آپاں کوئی 'ہوڑ مار' نہیں سب کام سلیقے اور طریقے سے کر سکتے ہیں۔ سب کچھ آپ کی تسلی اور اطمینان کے مطابق ہوگا۔"

تقریباً دو ہفتے کا وقفہ موجود تھا۔ اس دوران میں نے علامہ سے کئی ملاقاتیں کیں اور اسے اپنی دانست کے مطابق مشورے دیئے جو اس نے ذمہ داری سے قبول کیے۔

سب سے پہلے اس نے اپنے سکول کے حصہ مڈل کے طلبہ اور اساتذہ کو امریکی ماہرین تعلیم کی اپنے علاقے اور سکول میں آمد کے متعلق بتایا۔ ابتدائی اخراجات کے لیے ان سے کچھ چندہ بھی جمع کیا۔ اس چندے سے اس نے امریکی ماہرین تعلیم کی آمد کے سلسلے میں بڑے بڑے اشتہارات چھپوائے' کچھ خیر مقدمی جملے دیواروں پر لکھوائے گئے۔ اپنی جملہ کوششوں کے منصوبے کی تفصیلات بتا کر اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے اپنے مرکز کے جملہ اساتذہ کے ساتھ مل کر یونین کونسلوں کے ممبران اور چیئرمین صاحبان کی تائید' حمایت اور اعانت بھی حاصل کی۔

ان کو باور کرایا کہ امریکی ماہرین تعلیم کی جماعت اس علاقے کو خصوصی تعلیمی ترقی دینے کے امکانات کا جائزہ لینے آرہی ہے۔ یہ فیصلہ علاقہ افسر قصور (یعنی میری) کی خصوصی مہربانی سے کیا گیا ہے۔ ماہرین کی جماعت فلاں فلاں گاؤں جائے گی۔ وہاں وہ گاؤں کی حالت' یونین کونسل کے دفتر' سماجی بہبود کے مراکز' سکول' عبادت گاہیں اور دیہات کے خوبصورت اور صاف ستھرے گھر بھی دیکھے گی۔ بچوں کے ذریعے ڈھول پٹوا کر اور مرکز کے اساتذہ کے ساتھ مل کر اس نے ڈاکٹر گارود کی آمد کو اس قدر مشتہر کیا کہ انتخابات کے مواقع کی مروجہ گہما گہمی بھی ماند پڑ گئی۔ اپنے سکول کی تزئین و آرائش اور معزز مہمانوں کی مہمان نوازی کے لیے اس نے کھاتے پیتے لوگوں سے نہ جانے کتنا چندہ اکٹھا کیا تاہم چندہ اکٹھا کرنے کے بارے میں کوئی شکایت نہیں آئی۔

اس نے یہ بھی انتظام کیا کہ معزز مہمانوں کی آمد سے ایک روز پیشتر تمام نوشتہ ہائے دیوار اور اشتہارات کا نشان تک مٹوا دیا۔ دلیل یہ دی کہ معزز مہمان یہ نہ سمجھیں کہ دیہاتوں اور

گھروں کی آرائش سب کچھ وقتی طور پر کی گئی ہے۔ کئی بوڑھے اور بوڑھیاں علامہ سے ملنے بھی آئیں کہ جب ڈاکٹر آئے تو علامہ ان کی نبض ضرور دکھائے۔ وہ ڈاکٹر گارود کو ہسپتال کا ڈاکٹر سمجھ رہی تھیں۔ ایک روز پیشتر علامہ نے مجھے اطلاع دی کہ جملہ انتظامات مکمل ہو چکے ہیں' چل کر جائزہ لے لیں۔ میں جائزے کے لیے تو نہیں گیا لیکن پوری تفصیل معلوم کی۔ علامہ نے ظہرانے کا انتظام بھی کیا تھا۔ میں نے طعام نامہ میں تبدیلی کی اور وہ کھانے باقی رکھے جو ڈاکٹر گارود اپنے طلبہ کو عشائیے پر پیش کیا کرتے تھے۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں اور بیگمات کے ہمراہ یونیورسٹی کی گاڑی میں پہنچے۔ میں نے ان کی تواضع قصور کی مٹھائی اور باداموں والی سبز چائے سے کی تو وہ نہال ہو کر بے حال ہو گئے۔ خواتین تو ''شاندار! شاندار!!'' کہتے نہ تھکتی تھیں۔ میں نے انھیں قصور کے خوش ذائقہ ماکولات کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچائیں۔ موسم قدرے سرد تھا پھر بھی میں نے ان کو واپسی پر فالودہ کھلانے کی پیشکش کی۔

ہم گنڈا سنگھ والا سے نہر کی پٹڑی پر سے ہوتے ہوئے جوڑے کی سمت ہو لیے۔ نہر کی پٹڑی کے ساتھ واقع پرائمری سکول چوہڑیوالہ' اور پرائمری سکول حسین خانوالہ کے بچوں نے ملیشیا یونیفارم میں پاکستانی پرچم کی جھنڈیاں لہرا کر اور خوش آمدید کے انگریزی میں لکھے کتبے دکھا کر معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ یہ سکول قصور شمالی کے تھے۔ میں سارے ماحول اور سکولوں کے نظم و نسق کی انتظامی تقسیم کے بارے میں تینوں پرفیسروں کو بتاتا رہا۔ ان کی بیگمات نے ان دو سکولوں کے بچوں کی بہت سی تصاویر بنائیں۔

جوڑے میں عید کا سماں تھا اور اردگرد کے دیہات کے لوگ عمدہ لباس پہنے موجود تھے۔ نہر کے پُل سے لے کر سکول کے صدر دروازے تک کیلے کے پتوں' سرسبز جھاڑیوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے راستے کو آراستہ کیا گیا تھا۔ میزوں کی ایک قطار پر علاقائی لباس پہنے ننھے ننھے بچے اور بچیاں کھڑی کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر گارود بار بار مجھے خراج تحسین پیش کر رہے تھے کہ میں نے انھیں 'ٹو مچ پروٹوکول' دیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ تحسین اور داد کا مستحق سکول کا صدر معلم' اس کے ساتھی اور علاقے کے معززین ہیں۔

نو بجے سے لے کر ایک بجے دوپہر تک مہمان بھی کرسی پر نہیں بیٹھے۔ علامہ انھیں جہاں لے گیا وہ گئے۔ جو کچھ اس نے دکھایا انھوں نے دیکھا' جن لوگوں سے انھیں ملایا وہ اُن

سے ملے اور کھل کر باتیں کیں، میں مترجم کے فرائض ادا کرتا رہا۔

دیہاتی حضرات اور خواتین مجھے گوروں اور گوریوں سے انگریزی میں باتیں کرتے دیکھ کر اس طرح حیران ہو رہے تھے جس طرح میرا دوست ملک عبدالغنی مجھے انگریزی اخبار پڑھتا دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا تھا۔

ظہرانے کے بعد علامہ نے اردگرد کے اچھے اچھے سکولوں سے اکٹھے کیے ہوئے بچوں کے جسمانی مظاہرے دکھائے۔ ان میں فینسی ڈریس شو، چھلانگیں، الٹ بازیاں، کشتی، کبڈی، خاموش ڈرل، بھنگڑا اور لوک ناچوں کے ساتھ لوک گیت بھی شامل تھے۔ علامہ نے کمال کر دیا تھا۔ میں خود حیران تھا کہ ایک او۔ٹی ماسٹر اس قدر قائدانہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔

امریکی خواتین رنگین تصاویر اور متحرک فلمیں تیار کرتے ہوئے مبہوت ہوتی رہیں۔ علامہ نے ان کو جوڑے کے دیہاتی گھروں کے اندرونی جھلکیاں بھی دکھائیں۔ وہ اب تھکی تھکی نظر آ رہی تھیں۔ ایک گھر میں ان کو خانہ ساز شکر پارے اور چائے بھی پلائی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ رکھ کر معذرت کرتیں کہ بہت بھر گیا ہے۔ مگر پنجابی مہمان نوازی کچھ ایسی ہے ''چکھیں تو سہی'' اور چکھتے چکھتے بندے کا حشر ہو جاتا ہے۔

واپسی پر جب ہم گاڑی پر سکول کے صدر دروازے سے باہر نکلے تو اب نہر تک پل کے دورویہ، علامہ نے ایک دیہاتی بازار لگوا دیا تھا جس میں سب دوکاندار طلبہ تھے۔ موچی، حجام، ترکھان، لوہار، سبزی فروش، قصاب، حلوائی، شیر فروش، خوانچے والا، پھل فروش، دال پھلیاں بیچنے والا، پکوڑے تلنے والا اور نہ جانے کیا کیا۔ ماہرین تعلیم ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جب اعتماد کے ساتھ ایک عام ذہانت کے مدرس کو ایک ذمہ داری سونپی گئی تو اس نے بیسویں صدی کے امریکی ماہرین تعلیم کو حیران کر دیا۔ علامہ نے سچ ہی کہا تھا ''آپاں امریکنوں کی عقل گم کر دیں گے''۔ اس نے تو میری بھی مت مار دی تھی، اس لئے کہ اس نے مہمانوں کو وہ قصوری فالودہ بھی جوڑے ہی میں کھلا دیا جو انھیں واپسی پر پیش کرنے والا تھا۔

میں نے علامہ سے پوچھا کہ اس نے ڈاکٹر گارود کی آمد کو میلے ٹھیلے کی شکل دے کر خواہ مخواہ اتنا ہجوم کیوں اکٹھا کر لیا؟ اس نے جو جواب دیا وہ اس کی حکمت عملی کا آئینہ دار تھا۔ اس نے بتایا وہ اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں بہت کچھ محسوس کرتا تھا۔ خاص طور پر گندگی، عوام کی بے حسی اور اداروں کی حالت زار... لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ

(امریکی) اپنا مطالعہ کر گئے' اس نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے۔ پورے مرکز کے گاؤں سکول اوران کی گلیاں' مسجدیں اور گھروں کو چمکا کر رکھ دیا اور ایک تاثر ہر سمجھ دار شخص کے اندر پیدا کیا' ان کو اُمید دلائی ہے کہ امریکی ان کے علاقے کو نمونے کا علاقہ بنا دیں گے۔ انھوں نے تو جو بنانا ہے وہ بناتے رہیں گے' لیکن اس وقت علاقہ صاف ستھرا' متحرک اور اُمید سے سرشار ہو گیا ہے۔ امریکیوں کی بنائی ہوئی تصاویر اور فلموں میں کم از کم پسِ منظر میں جیتی جاگتی زندگی اور صفائی ستھرائی تو نظر آئے گی۔

ڈاکٹر گارود نے تحریری طور پر مجھے' علامہ اور جملہ اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اپنے دورے کی تصاویر سے آراستہ رپورٹ لکھی جو انڈیانا یونیورسٹی کے جرنل میں شائع ہوئی۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس بیداری کا ذکر کیا جو اُس نے ۶۴ء کے موسم خزاں میں قصور کے گیارہ دیہات میں دیکھی۔ اس نے لکھا کہ پاکستانی مدرس اپنے دائرہ کار میں قائد کا کردار ادا کر رہا ہے اور آہستہ آہستہ ایک معاشرتی انقلاب برپا کرنے میں کوشاں ہے۔ ان کے بعض اقدامات سے امریکی اساتذہ بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس رپورٹ میں اس نے ماسٹر شہاب الدین کی تصویر کے ساتھ لکھا کہ یہ مدرس چودہ برس سے روزانہ ۲۸ میل سفر کر کے تجر د نامی گاؤں سے مڈل سکول جوڑا میں آتا اور واپس جاتا ہے۔ اگر یہ ایک ہی سمت میں سفر کرتا رہتا تو کُرۂ ارض کے گرد کب کا چکر لگا کر ''گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں جگہ پا چکا ہوتا۔

☆☆

قصور میں بطور اے ڈی آئی سکولز کے معمولی نوعیت کے بے شمار انتظامی واقعات کے علاوہ کچھ واقعات ایسے بھی پیش آئے جن کا ذکر قطعی بے محل نہ ہوگا۔ شیخ نذیر احمد صدر مدرس مڈل سکول ڈھولن میرے ہی نہیں محکمے کے اعلیٰ افسروں کے پیاروں میں سے تھے۔ بڑے ہوشیار اور خبردار شخص تھے' تاہم ان کے اندر ایک عیب یہ تھا کہ وہ اپنی دھاک بٹھانے کے لئے افسروں سے اپنے تعلقات کا ذکر موقع بموقع کرتے رہتے تھے۔ ماضی میں وہ مجھے بھی دبکانے کے لئے ایس ڈی ایم اور ڈائریکٹر تعلیمات سے براہ راست میل ملاپ رکھنے کے قصے سنا چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان سے قدرے خائف بھی رہتا اور ان کی غیر نصابی خدمات قبول کرنے سے ڈرتا تھا۔ اکثر ان کے متعلق گمنام درخواستیں اس نوعیت کی آتی تھیں کہ وہ خود کو فلاں فلاں افسر کے چمچے ظاہر کرتے ہیں' سادہ لوح افراد کے کام' سرکارے دربارے کرانے

کے پیسے بٹورتے ہیں۔ مختلف بہانوں سے بچوں سے بھی چندہ لیتے رہتے ہیں۔ ان کے سپاہی بیٹے نے اپنی اور باپ کی کمائی سے ایک بس بنا رکھی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

شیخ صاحب نے ۱۹۶۴ء کے دسمبر میں اپنے ہی گاؤں اور اپنی ہی برادری کے ایک ماتحت ایس۔وی مدرس کو ناراض کرلیا۔ مدرس کا اصل نام تو شاید رب نواز تھا لیکن اسے ساڑھے سات کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے بائیں ہاتھ کی اڑھائی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک درخواست ضلعی افسر تعلیم کے نام گزاری تھی کہ اس کا صدر مدرس حرص و ہوس کا بندہ ہے۔ زر طلبی میں دیہاتوں اور سکول کے بچوں کا استحصال تو کرتا ہی تھا اب اس نے جعلسازی کو بھی اپنا شعار بنالیا ہے۔ مدرس کی اس درخواست کے مندرجات کو بھی دیگر درخواستوں کی طرح عدم ثبوت کے بہانے داخل دفتر کیا جاسکتا تھا لیکن ساڑھے سات نے دیگر الزامات کی فہرست میں جعلسازی کے ایک الزام کے ساتھ ایک ایسا زبردست بدیہی ثبوت دیا تھا کہ اسے آسانی سے نظرانداز کرنا دشوار تھا۔

ماضی کے کسی سال میں شیخ صاحب نے سکول لائبریری کی جملہ کتب کو 'سیلاب کی نذر ہوگئیں' لکھ کر اسٹاک رجسٹر سے خارج کر دیا تھا۔ پھر انھوں نے انہی سیلاب کی نذر ہونے والی کتب کو نئی رسیدات کے ذریعے وقتاً فوقتاً 'خریدی گئیں' ظاہر کر کے نئے نمبروں کے ساتھ نئے اسٹاک رجسٹر میں درج کر کے انھیں لائبریری کی الماری میں سجا دیا تھا۔ کتب پر درج اسٹاک رجسٹر کے سابقہ نمبروں کو اُڑانے کے لیے جو کیمیکل استعمال کیا تھا' اس نے صحیح کارکردگی نہیں دکھائی تھی' اندراجات مٹے نہیں تھے۔ سابقہ اندراجات میں تاریخ تک نظر آتی تھی۔ اندرونی صفحات پر سابقہ نمبر بھی حذف ہی نہیں کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ نئے اندراج موجود تھے۔ ساڑھے سات (۷-۱/۲) کے پاس پرانے رجسٹر اور رسیدات بھی موجود تھیں۔

معمول کی کاروائی ہوتے ہوتے درخواست میرے پاس برائے تحقیقات اور رپورٹ آ گئی۔ شیخ صاحب سے میرے تعلقات بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ میں نے شیخ صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ جہاندیدہ شیخ صاحب کی سادگی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے 'ساڑھے سات' کی اندرونی چوٹ کا علاج نہیں کیا اور نہ صلح صفائی کی بات کی بلکہ میرا نام لے کر ساڑھے سات کو ڈرایا دھمکایا۔ ۷-۱/۲ نے مجھے بھی پارٹی بناتے ہوئے ایک اور درخواست گزاری کہ افسر علاقہ تو خود شیخ صاحب سے مل جُل کر کھاتا ہے۔ اب مجھے دونوں شیخوں پر غصہ تھا۔

۷-۱/۲ نے جہاں اپنے صدر مدرس کی پوری پوری نگرانی کی تھی وہاں اس نے میرا بھی روزنامچہ مرتب کر رکھا تھا۔ کس روز میں کہاں تھا، کس سے ملا، کیا کھایا، جو کھایا کس نے پکایا۔ تانگے کا کرایہ کس نے دیا اور کھوکھے پر چائے کی قیمت کس نے ادا کی۔ سکول میں کیا دیکھا اور لاگ بُک میں اُلٹ پھیر کر کیا لکھا۔

میرے خلاف اپنی درخواست میں ساڑھے سات نے اپنے والد سے متعلق ایک کہانی نما واقعہ بھی لکھا تھا جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ خاندانی اعتبار ہی سے ایک محبِّ قوم اور محبِّ وطن شخصیت ہے۔ تعلیمی خدمات اس کا خاندانی شعار رہا ہے اور شیخ صاحب کے خلاف اس کی درخواست کسی ذاتی رنجش کی بناء پر محکمے کو ارسال نہیں کی گئی۔ تاہم اس نے اپنی اس خدمت گزاری سے معمور ذہن کی عکاسی سیاسی انداز میں کی تھی۔ چونکہ کہانی دلچسپ اور سبق آموز ہے لہٰذا ملاحظہ فرمائیں:-

☆☆

''میرے ابا جان شیخ سعید احمد ایک کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جالندھر میں ہمارا مرکز تھا اور کاروبار دیگر اضلاع تک پھیلا ہوا تھا۔ جانے انھیں کیا دھن سمائی کہ میٹرک پاس کرتے ہی انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ کاروبار نہیں کریں گے بلکہ مدرس بن کر قوم کی خدمت کریں گے اور اپنے گاؤں ہی میں رہیں گے۔ دستور کے مطابق میرے دادا نے ڈسٹرکٹ بورڈ کو ایک قطعہ زمین اور ڈھیر سارا تعلیمی چندہ دیا۔ قطعہ زمین پر بھی سکول کے لئے دو کمرے مع برآمدہ خود ہی بنوائے۔ سکول کھل گیا تو دادا کی خدمات کے صلے میں میرے ابا کو ڈسٹرکٹ بورڈ نے گاؤں ہی میں مدرس تعینات کر دیا۔

''سکول گاؤں کی ضرورت تھی۔ مضافات میں پڑھنے جانے والے طلبہ بھی گاؤں کے سکول میں آ گئے تو کچھ اور مدرسین بھی تعینات ہوئے۔ ابا گو تربیت یافتہ مدرس نہیں تھے لیکن دوسرے مڈل جے۔وی مدرسین سے بہتر تھے۔ کچھ عمارت، جگہ اور چندے کا رعب بھی تھا اس لیے ابا ہی اول مدرس تھے۔ جب تعلیمی سال گزر گیا تو سردار سنتو کھ سنگھ اے ڈی آئی سکول کا معائنہ کرنے آئے۔

میرے باپ نے اُن کی بڑی خدمت کی کیونکہ سکول ہی ہمارا تھا۔ یہاں تک کہ ان کو سکھوں کے گھر سے جھٹکے والا کھانا بھی پکوا کر کھلایا۔ جس سکھ نے مرغا جھٹکہ کیا تھا، اس کو تصدیق

کے لئے اے ڈی آئی کے سامنے پیش بھی کیا کہ وہ ان کو حلال گوشت نہیں کھلا رہے۔

''سردار جی نے بڑی سختی سے سکول کا معائنہ کیا۔ حرام ہے جو کسی بچے نے کوئی سوال حل کیا ہو یا کسی بچے نے کوئی سبق سُنایا ہو۔ خدا جانے میرے ابّا اور مدرسین سارا سال کیا کرتے رہے تھے۔ میرا باپ تو پریشان ہو گیا کہ بس اب اسے غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے بورڈ کی ملازمت سے نکال دیا جائے گا اور باقی مدرسین کے تبادلے کر دیئے جائیں گے۔ سکول بھی بند ہو سکتا ہے۔ سردار جی معائنے کے دوران ہی لاگ بک بھی لکھتے جا رہے تھے۔ روانگی کے وقت سردار جی بڑے خوش تھے۔ میرے باپ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے جس سے میرے ابّا پریشان بھی ہوئے کہ طلبہ کو صفر پانے کے باوجود سردار جی کسی سے ناراض نہیں ہوئے۔

''میرے دادا بھی معائنے کے موقع پر شہر سے آئے ہوئے تھے۔ مگر وہ معائنے کے دوران اپنے گھر ہی پر رہے۔ سردار جی کو الوداع کہنے کے لئے انھیں بھی گھر سے بلایا گیا۔ وہ سردار جی کے ساتھ نہر کے پُل تک گئے۔ گھوڑی پر سوار ہونے سے پیشتر سردار جی نے میرے دادا کی تعلیمی خدمات کا ذکر کر کے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا 'شیخ صاحب! میں آپ کی دور اندیشی کی داد دِیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے قوم کا بیج مارنے کا جو طریقہ سوچا ہے اس کا جواب نہیں۔ اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ سرکار کے ہاں بھی آپ کی عزت ہو گی۔ مقامی لوگ بھی نظر نہیں اُٹھائیں گے۔ کاروبار میں بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہو گی۔ پڑھ لکھ کر چیونٹی قسم کے لوگوں کے بھی پَر نکل آتے ہیں۔ واہگرو تہاڈا راکھا ہووئے۔'

سردار جی تو اتنا کہہ کر چھلانگ لگا کر گھوڑی پر جا بیٹھے، ایڑ لگائی اور چل دیے۔ ابا بڑے خوش تھے مگر دادا بے حد پریشان تھے۔ ابّا نے ان سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو دادا جی نے ابا جی کو بتایا کہ سردار جی تمہاری اور دوسرے مدرسین کی نالائقی کا ذکر بڑے مکارانہ انداز میں کر کے گئے ہیں۔ تم لوگوں نے جس طرح بچوں کو سال بھر جاہل ہی رکھا ہے اسے وہ میری سیاسی چال سمجھے ہیں کہ میں وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرح گاؤں کے لوگوں کو جاہل ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں کو انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ اس لئے نہیں کی کہ وہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم مسلمان لوگ پڑھ لکھ کر ایک مہذب قوم بنیں۔

''ابا جی بھی بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ اگلے سال انھوں نے ایس۔ وی کلاس میں

داخلہ لے لیا کہ تربیت حاصل کریں۔ واپسی پر انھوں نے سکول میں اس شان سے کام کیا کہ پرائمری جماعت میں سات بچوں نے وظائف حاصل کیئے۔ سکول کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوا تو دادا جی نے مزید اخراجات برداشت کر کے سکول کو مڈل بنوا دیا۔ سکھ ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے ڈنڈی ماری اور سکول کو انگریزی مڈل نہیں بنایا۔ تاہم آئندہ سالوں میں سردار سنتو کھ سنگھ جب تک اے ڈی آئی رہے انھیں سکول کی بہترین تعلیمی حالت سے مایوسی ہوتی رہی۔ اب قوم کا بیج مارا نہیں جا رہا تھا بلکہ اس سے کونپلیں اور ٹہنیاں پھوٹ کر لہلہا رہی تھیں۔''

☆☆

ساڑھے سات نے اس مثالی کہانی کے بعد پھر اپنے متعلق لکھا کہ وہ ایسے محسن قوم باپ دادا کی اولاد ہے۔ اجداد کی روایت کو نبھانے ہی کی نیت سے وہ بھی محکمہ تعلیم میں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے ۲/۱-۷ کی اس درخواست پر انتہائی تجربہ کار اے۔ڈی۔آئی خان عبدالمجید کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا۔ میری حیثیت اب قدرے ملزموں جیسی ہو گئی تھی۔ میں نے اس بات کو اپنی توہین سمجھا کہ اپنے ہی ایک تجربہ کار ساتھی کے سامنے میں ملزم کی حیثیت سے پیشی بھگتوں۔ شیخ صاحب صورت حال کی روشنی میں اپنی ساری طراریاں بھول چکے تھے اور مجھ سے نہ صرف معافیاں مانگنے بلکہ ۲/۱-۷ سے جان چھڑانے کی باتیں کرنے میرے پاس آ بیٹھتے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، پرائمری اور مڈل اسکولوں کے مدرسین مقامی سطح کی اور بالخصوص محکمہ تعلیم کی خبریں پھیلانے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور تیز رفتار خبر رساں ایجنسی ثابت ہوتے ہیں۔ ساری جنوبی سب ڈویژن میں دھوم مچ گئی تھی کہ شیخ ۲/۱-۷ نے صدر معلم اور اے۔ڈی۔ آئی علاقہ کی دوڑیں لگوا دی ہیں اور فلاں تاریخ کو خان مجید تحقیقات کے لیے آ رہے ہیں۔ اب کیا ہو گا، اس کے متعلق بڑی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ شیخ صاحب تو براہ راست نامزد ملزم تھے ہی مجھے بھی تردد تھا کہ ''یک نہ شد دو شد'' والا یہ معاملہ ایک ناگہانی افتاد کی صورت میں میرے گلے کیوں آ پڑا ہے۔

تحقیقاتی افسر کے آنے میں ابھی تین روز باقی تھے کہ میرے پاس محمد علی آف بھیلہ ہٹھاڑ آیا اور اس نے رازداری سے پوچھا کہ یہ سب ڈویژن میں ۲/۱-۷ کی درخواست کا کیا شور

مچا ہوا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ شور کی نوعیت کیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ ذاتی اور برادری کی سطح پر شیخ نذیر احمد ۱/۲-۷ کو بٹھانے کی ہر کوشش کر چکے ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ تو ان لوگوں کی نسل سے ہے جنھوں نے تعلیم کی خاطر اپنا تن، من اور دھن وقف کر رکھا تھا۔ وہ باطل کے سامنے کیسے جھکے؟ میں نے محمد علی کو یہ بھی بتانے سے گریز نہیں کیا کہ وہ تو مجھے بھی شیخ صاحب کے ساتھ ملوث کر رہا ہے اور اب ہم دونوں اس کے رحم و کرم پر ہیں۔

''بابا جی...... کتا کتے کا بیری ہوتا ہے'' محمد علی نے اپنے تکیہ کلام کے مطابق کہا ''وہ تو شیخ اور شیخ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ شیخ نذیر بھی سب کچھ اپنی توندہی میں ڈالتے جاتے ہیں۔ بچا کچھا شیخ رب نواز کو بھی دے دیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کو لڑنے دیں۔ رہا آپ کے ملوث ہونے کا معاملہ تو ہمیں بتائیں ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

''آپ لوگ کچھ کر سکتے ہیں تو بس یہ کریں کہ سارا 'مدعا' ہی غائب کرنے کے لیے شیخ رب نواز عرف ۱/۲-۷ کو بٹھا دیں۔ ضلعی افسر بھی یہی چاہتے ہیں کیوں کہ شیخ نذیر سے تعلقات تو ان کے بھی ہیں اور ۱/۲-۷ مزید اوپر کود کر ان تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ ان کا نام بھی ملوث کر سکتا ہے۔ نیز میں کسی قسم کی موافق یا غیر موافق شہادت میں بھی نہیں الجھنا چاہتا۔''

''بس اتنی سی بات ہے؟'' محمد علی نے معاملے کو بڑے سرسری انداز میں لیتے ہوئے کہا اور پھر پوچھا کہ تحقیقات کے لیے خان مجید کس تاریخ کو آ رہے ہیں؟ میں نے بتایا تو اس نے کہا۔ ''بس آپ مطمئن ہو جائیں، ۱/۲-۷ اپنے چیئرمین عمر خاں کی مٹھی میں ہے۔ وہ تحقیقات کے روز حاضر ہی نہیں ہوگا۔ یا پھر ایک روز قبل دفتر جا کر اپنی درخواستوں سے دستبرداری کا اعلان کر آئے گا۔ اچھا، خدا حافظ.. گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔''

وہ مجھے حیران چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو شخص برادری کے کہنے پر اپنی حرکت سے باز نہیں آ رہا تھا وہ بھلا غیر متعلقہ شخص عمر خان کی بات کیسے مانے گا۔ لیکن محمد علی کا کہا سچ ہی ثابت ہوا۔ مقررہ تاریخ کو خان مجید کے بجائے رب نواز صدر دفتر کے ایک کلرک بابو صدیق کے ہمراہ میرے پاس دفتر آیا، اُس نے معذرت کی اور بتایا کہ اس نے اپنی تمام درخواستیں واپس لے لی ہیں اور بابو صدیق کو ضلعی افسر تعلیم ہی نے اس کے ساتھ بھیجا ہے۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ معاملہ جس قدر مشکل تھا اس سے کہیں زیادہ آسانی سے ختم ہو گیا تھا۔

چند دن بعد طالب حسین شاہ اول مدرس بھیلہ نے پینک کی حالت میں مجھے بتایا کہ عمر

خان نے شیخ رب نواز کو بلا کر کہا تھا کہ اگر اس نے تحقیقات کی تاریخ سے پہلے اپنی درخواستیں تحریری طور پر واپس نہ لیں تو اس کا نام ساڑھے سات کی بجائے 'ڈیڑھ ٹانگ والا لنگڑا' پڑ جائے گا۔ کیا اسے خبر نہیں کہ شیخ نذیر نے اس کام کے لئے ستو کی کے مرادو قصائی کو ایک ہزار روپے دیئے ہیں۔ مرادو قصائی کئی بار عمر خان سے 'کام' کر ڈالنے کی اجازت لینے آ چکا ہے۔ وہ ہی اسے 'کام' سے روکے ہوئے ہے۔

ستو کی کا مرادو قصائی کسی ایسے دوہرے قتل میں ملوث رہ چکا تھا جس میں مقتولوں کی بوٹیاں کر کے گِدھوں، چیلوں اور کوؤں کو کھلا دی گئی تھیں اور مشہور تھا کہ مقتولین کی بوٹیاں مرادو قصائی نے بنائی تھیں۔ فوجی عدالت نے اسے دوہری سزائے موت سنائی تھی لیکن ہائی کورٹ نے اسے بری کر دیا تھا۔ مرادو تائب نہ ہوا بلکہ اس کی ایسی دھاک بیٹھی کہ وہ علاقے بھر میں دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ یہ معلومات بھی مجھے طالب حسین شاہ ہی نے دی تھیں۔

میرا اصل ہمدرد اور شیخ نذیر کا حقیقی محسن محمد علی تو مجھے عرصے تک ملا ہی نہیں تھا...... اور جب ملا بھی تو اس نے اپنا احسان نہیں جتایا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۲۷)

خلیفہ صاحب اور کمینہ ماسٹر

ایم۔ایڈ کی شام کی جماعت میں میرے ایک مدرس دوست نے نیا نیا داخلہ لیا۔ اس کا تبادلہ پھلروان سے حال ہی میں گورنمنٹ ہائی سکول' لاہور چھاؤنی ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے لاہور میں اپنا تبادلہ کیسے کرایا؟ لاہور میں تب بھی اور اب بھی تبادلے تگڑی سفارش یا سودابازی سے ہوتے ہیں۔ مقامی الاؤنسز کے علاوہ بچوں کے مستقبل کی خاطر ہر ملازم لاہور آنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جو ایک بار آجائے وہ پھر لاہور سے جانا بھی نہیں چاہتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا تبادلہ خلیفے نے کرایا ہے' وہی خلیفہ مہدی پور کے سجادہ نشین ہادی شاہ کا بیٹا جسے سکول میں ہم خلیفہ ٹل کہا کرتے تھے۔ اب وہ مغربی پاکستان اسمبلی کا ممبر ہے۔

خلیفہ کا اصل نام خلیل الدین شاہ تھا' گول مٹول اور کمرۂ جماعت میں اونگھتے رہنے والا سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ سجادہ نشین کی اولاد ہونے کی وجہ سے ہم اُسے پہنچی ہوئی ہستی سمجھتے تھے۔ سر درد' بخار اور نزلے میں اسی سے جھاڑ پھونک کرواتے تھے اور دم درود کے لیے میں نے اس اس سے کئی وظیفے سیکھے تھے۔ تعلیم کی نسبت اس کی توجہ بھی اپنے والد کی طرح ولی اللہ بننے کی طرف مائل تھی۔ اپنے سب ہم جماعتوں میں سے خلیفہ مجھے اکثر یاد آتا رہا تھا اور اب بھی یاد آتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔

ایک دن اُس نے مجھے کہا تھا کہ اسے ایک ایسا دَم (منتر) آتا ہے کہ اسے پڑھ کر پھونک مارنے سے شہد کی مکھیوں' بچھوؤں' بھڑوں اور ڈیموؤں کے ڈنک منجمد ہو جاتے ہیں اور آسانی سے ان کا شہد اور مٹھاس کی گولیاں حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس نے مجھ سے بھڑوں کے چھتوں سے گولیاں حاصل کرنے کا تجربہ کرا ڈالا۔ لیکن گولیوں کی بجائے بھڑوں نے نہ صرف مجھے بیری کے پیڑ سے نیچے گرایا بلکہ مجھے اس قدر ڈنک لگائے کہ میں بے ہوش ہو کر پانی کے

کھال میں گر پڑا۔ ایک کسان نے مجھے بدترین حالت میں میرے گھر پہنچایا اور دس بارہ دن کے ہلاکت خیز بخار اور درد کے بعد میں پھر سکول جانے کے قابل ہوا۔

خلیفہ کے متعلق باتیں کرتے اور سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک دبی ہوئی خواہش نے انگڑائی لی کہ میں بھی خلیفہ کے ذریعے کسی نہ کسی طرح لاہور ہی میں بطور اے ڈی آئی تبادلہ کروالوں۔ میرے مدرس دوست تنویر شاہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ خلیفہ کی شادی بھی میرے ننھیال کی فلاں لڑکی سے ہوئی ہے جو فلاں بیوروکریٹ کی بہن اور فلاں زمیندار کی بیٹی ہے۔ یہ مزید ایک اتفاق اور انکشاف تھا۔

وہ لڑکی ایک بڑے چودھری کی بیٹی تھی۔ تعطیلات موسم گرما ننھیال میں گزارنے کے لیے لڑکپن تک مَیں محلے کے دیگر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ انہی کی حویلی میں کھیلتا رہا تھا۔ وہ لڑکی مجھے ذاتی طور پر جانتی تھی۔ مجھے بھا زُلفی پُکارا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے منشی جی بھی کہتی کیونکہ ان کی حویلی کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں کھیلنے سے پہلے ہم لڑکے لڑکیاں مل کر سکول کا کام (چھٹیوں کا کام) کیا کرتے تھے۔ زمیندار اور سماجی مرتبے کی وجہ سے ہم سب چودھری کے صاحبزادوں کو چھوٹے چودھری صاحب اور لڑکیوں کو بڑی باجی اور چھوٹی آپا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ 'ف' چھوٹی آپا تھی اور یہی چودھریوں کے گھر سے نکل کر سجادہ نشینوں کی بہو بن چکی تھی۔

گلبرگ کی ایک وسیع کوٹھی میں 'مَیں خلیفہ سے ملا۔ بڑی باتیں ہوئیں۔ لگتا تھا کہ خلیفہ' اس کی بیگم اور میں بچپن سے اب تک ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہے ہیں۔ (ف) کو یاد تھا کہ وہ مجھے بھا زلفی اور منشی جی کہا کرتی تھی۔ خلیفہ کو یاد تھا کہ اس کی ریاضت کی کمی کی وجہ سے اس کا سکھایا ہوا 'دم' کارگر نہ ہوا تھا۔ اب اس کا 'دَم' شافی ہو چکا تھا' ایک پھونک سے میرا کام ہوسکتا تھا۔ اس نے کہا بھی یہی' بلکہ یہ بھی کہا ''اب تو ف کا 'دَم' بھی چلتا ہے مگر 'دَم' کرنے کی کچھ شرائط ہوتی ہیں...... تمھارے لیے بھی ایک شرط ہے؟''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔ شرط یہ طے ہوئی کہ میں ان کے دس گیارہ سالہ بیٹے کو جو کیتھڈرل کا طالب علم ہے' پڑھایا کروں گا۔ میں نے ہاں کر لی۔ (ف) کی موجودگی میں میرا بچے سے تعارف ہوا۔ خاصا ذہین تھا۔ بس اس میں کچھ خوشحال گھرانوں کے بچوں والی لاپرواہی پائی جاتی تھی۔ اس کی ماں مجھے اس کے متعلق بتاتی رہی اور بار بار یہ کہتی رہی کہ یہ تو خوش قسمتی کی بات ہے کہ مجھے دونوں میاں بیوی آج سے نہیں برسوں سے جانتے ہیں۔ اور اب

برسوں بعد مَیں اُن کے ہتھے چڑھا ہوں۔

میرا تبادلہ ہو گیا۔ اِرادہ یہ تھا کہ میں اپنے بچوں کو اس وقت تک لاہور نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ میں خلیفہ ہی کی وساطت سے کوئی سرکاری کوارٹر حاصل نہیں کر لیتا۔ اندھیرے سویرے میں لاہور اور قصور کے درمیان سفر کرنے کا عادی تھا۔ کچھ کاغذی کارروائی اور کچھ دیگر انتظامات کرتے مجھے چھ سات روز لگ گئے۔ ساتویں یا آٹھویں روز شام کے وقت ادارہ تعلیم و تحقیق سے فارغ ہو کر میں بچے کی تدریس کے لیے خلیفہ صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ لان میں بیٹھے ایک ملازم نے میرا استقبال کیا' بچے کے کمرے میں لے جاتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بیگم صاحبہ کو میرا بڑا انتظار رہا ہے۔

وہ بچے کو بلانے نکلا۔ ابھی وہ راہداری میں پہنچا ہو گا کہ دوسری جانب سے (ف) نے چلا کر ملازم سے پوچھا ''کیا وہ کمینہ ماسٹر آج بھی آیا ہے یا نہیں؟ اُسے بس لاہور میں تبادلہ کرانا تھا' کرا لیا۔ اب اس کی جوتی کو بھی خلیفہ صاحب کی پرواہ نہ ہوگی''۔ میں نے ملازم کی دھیمی سی آواز سنی' وہ سرگوشی میں میرے آنے کی اطلاع دے رہا تھا..... 'ف' کے لبوں سے یکدم ''ہائے اللہ'' کا سرسراتا ہوا جملہ نکلا اور فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر 'ف' کی کوئی آواز نہیں آئی۔ کافی دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

انسان فطرتاً خود پسند ہے اس لئے اسے خود اپنے عیوب کی گھات میں بیٹھنے کی مہلت مشکل ہی سے ملتی ہے۔ بعض ذاتی حوالوں سے میں کمینہ ٹھہروں تو کیا عجب! لیکن جن حوالوں سے (ف) مجھے جانتی تھی' ان کی روشنی میں وہی وہ تھی جو وہ مجھے پکار رہی تھی۔ میرے حقیقی نانا ان کے خاندان کے روحانی پیشوا اور میرے رشتے کے ماموں ان کے خاندانی طبیب تھے اور اس کے باپ کو حکیم صاحب کی دوا اور دُعا دونوں پر یقین و اعتماد تھا۔ میں اپنا انوکھا لقب یا خطاب سن کر بچے کے کمرے سے خاموشی سے نکل گیا۔ (ف) نے مجھے ذرا بھی عزت نہیں دی تھی اور مجھے 'کمینہ ماسٹر' کہا تھا۔ کمینے اور اشراف کی کیا جوڑی! میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خلیفہ خود بھی آ کر اگر مجھے کچھ کہے گا تو میں ان کے بچے کی تدریس سے معذرت کر لوں گا۔ بھول کر بھی اس کی سفارش کی تمنا نہیں کروں گا۔

☆☆

میں ضلع لاہور کی تعلیمی انتظامیہ کا رکن تھا۔ مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ میرا تبادلہ صرف ریجنل ڈائریکٹر یا ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز ہی کر سکتے تھے لیکن میرے قصور سے لاہور تبادلے میں ضلعی

افسر کو نظر انداز کرتے ہوئے انسپکٹر صاحب نے کارروائی کی تھی۔ میرے ضلعی افسر انسپکٹر آف سکولز سے پوچھا کہ میرا تبادلہ کرانے کا کون ذمہ دار ہے؟ انسپکٹر صاحب نے ان کو بتایا کہ تبادلہ کس نے کرایا ہے۔ ضلعی افسر مجھ سے ناراض ہو گئے کہ میں نے خلیفہ صاحب سے ان کو کیوں نہیں کہلوایا۔ انتظامی افسر، اسمبلی کے ارکان اور دیگر سیاسی لوگوں کے کام کر کے اپنے نمبر بناتے تھے۔ میں نے صاف گوئی سے ان کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ مجھے علم نہ تھا کہ میرا تبادلہ وہ بھی کر سکتے تھے۔ اور اُن سے کہا تھا کہ خلیفہ صاحب کو وہ اپنا خادم سمجھیں، میں ان کو بھی فون کروا دوں گا۔ اب میری اس بڑ کا مان ٹوٹ چکا تھا۔ اب میں نے شکستہ دلی سے (ف) کی بات ضلعی افسر کے گوش گزار کی۔ لاہور میں رہنے، علمی و ادبی حلقوں میں آنے جانے اور سرکاری رہائش حاصل کرنے کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔

ع ...... ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند''

والا معاملہ تھا۔ ضلعی افسر نے میری ڈھارس بندھائی اور فون پر انسپکٹر آف سکولز سے رابطہ کر کے ان کی میرے حق میں تائید حاصل کی۔ یوں میں 'عطائے تو بہ لقائے تو' کا نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا واپس قصور چلا گیا۔ خلیفہ صاحب نے مجھے کئی پیغامات بھیجے۔ ایک روز فون پر رابطہ بھی کیا۔ اپنے مدرس دوست تنویر شاہ کے ذریعے میں نے ان کو پیغام بھیجا کہ وہ برخوردار کو ذرا بڑا ہو لینے دیں پھر میں ان کی خدمت کرتے ہوئے اس کے کردار اور شخصیت کی تعمیر میں اس کی مدد کروں گا۔ نیز میرے بچے قصور سے بڑے مانوس ہیں، مکان بھی اچھا اور سستا ملا ہوا ہے، کم از کم دو سال مزید ادھر ہی رہنے دیں تو ان کی مہربانی ہو گی۔ یہ خلیفہ صاحب کی شرافت تھی کہ بقول تنویر شاہ انھوں نے (ف) کو ڈانٹا اور مجھ سے معذرت طلب کی تھی اور مجھے کبھی کبھار ملتے رہنے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔

اس ساری درازنفسی کے باوجود 'کمینہ ماسٹر' ہونے کا کانٹا آج تک میرے رگ و ریشے میں کہیں نہ کہیں چبھتا رہتا ہے۔

☆☆

میونسپل پرائمری سکول، سبزی منڈی، قصور کے اول مدرس میونسپل پرائمری سکولوں کے سینئر ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ نعت خوانی کے علاوہ انھیں غزل گوئی اور غزل سرائی میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ایک روایت قائم کر رکھی تھی کہ رواں سال کو الوداع اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی رات دس بجے سے دو بجے صبح تک ایک تقریب کا اہتمام کیا کرتے

تھے۔ سن تریسٹھ اور چونسٹھ کی رات انھوں نے مجھے اس تقریب میں شمولیت کی دعوت اس لیے نہیں دی تھی کہ میں نیا نیا ہی سب ڈویژن میں آیا تھا اور وہ میرے مزاج اور علم وادب سے میرے گہرے شغف سے آشنا نہ تھے۔ اب کے انھوں نے مجھے سن چونسٹھ اور پینسٹھ کی رات کو مہمان خصوصی بننے کی دعوت دی تھی۔

میں پورا سال قصور میں رہا تھا اور مجھے ہر سکول کی کارکردگی کا علم تھا۔ اساتذہ کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بعض طلباء کے ذاتی اور انفرادی جوہروں سے بھی مجھے کچھ نہ کچھ آگاہی تھی۔ تقریب کا پہلا حصہ یعنی دس سے بارہ بجے تک کا وقت بچوں کے مخفی جوہروں کے جائزے اور انعام واکرام پر مشتمل تھا۔ جبکہ دوسرا حصہ شعروشاعری اور نعت خوانی پر مبنی تھا۔ بچوں نے جو تقاریر کیں، جو ترانے گائے، جو نغمے الاپے اور جن دوسری اکتسابی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ان کو میں سال بھر کے دوران دن کی روشنی میں بھی دیکھ چکا تھا لیکن بھیگتی رات کے اس سمے جب چیدہ چیدہ طلباء، اساتذہ، معززین شہر، علماء فضلاء اور منتخب روزگار شاعر اور ادیب جمع تھے بچوں کی فنی کارگزاریوں نے طلسماتی سماں باندھ دیا۔ حافظہ ساتھ نہیں دے رہا کہ اپنے تاثرات قلمبند کروں لیکن مجموعی تاثر یہ ہے کہ وہ بچے ایسے ستاروں کی مانند تھے جن کے مقدر میں بدروآفتاب بننا لکھا تھا۔

قرأت کا مقابلہ........... سبحان اللہ

نعت خوانی........... مرحبا

تقاریر........... ماشاءاللہ

اور باقی سب کچھ بھی جزاک اللہ والی بات تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ان نونہالوں کو تعلیم کی دنیا کا فرد ہونے کی نسبت سے انعامات دیئے۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جب میں نے فرداً فرداً ان اساتذہ کا ذکر کیا جنھوں نے ان بچوں کی تربیت کی تھی اور ساتھ ہی اس معذوری کا اظہار بھی کیا کہ میں ان اساتذہ کو سند امتیاز تو جاری کر سکتا ہوں لیکن انھیں خلعت فاخرہ پہنانا یا کوئی نقرئی ہار زیب گلو کرنا یا انھیں اشرفیوں کی تھیلی پیش کرنا میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ کاش میری جگہ کسی مُقتدر رسول افسر، ممبر اسمبلی یا وزیر باتدبیر نے اس محفل میں مہمان خصوصی کے فرائض ادا کئے ہوتے تو وہ صلہ وستائش کے پیرائے میں ان جید اساتذہ کی ایسی حوصلہ افزائی کرتے جس سے انھیں تھوڑا بہت مالی فائدہ بھی میسر آ جاتا۔

ظہوری قصوری نے بطور منتظم تقریب میرے الفاظ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ قصور کے

معززین کو اساتذہ کی سرپرستی کرنے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کا ہمیشہ ہی شوق رہا ہے۔ میں قصور میونسپلٹی کی طرف سے ہر مدرسے کے اساتذہ کو فی مدرس سو روپے اور اول مدرس کو دو سو روپے اور سکولوں کے ان بچوں کے لئے جنہوں نے تقریب میں حصہ لیا ہے، فی طالب علم کے حساب سے پچاس روپے انعام کا اعلان کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں فلاں فلاں معزز شہری نے انفرادی طور پر فلاں فلاں انعام فلاں فلاں طالب علم، استاد اور اول مدرس کو مرحمت کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہم قصور میونسپلٹی کے سکولوں کے اساتذہ اور طلبہ ان شرفاء کے ممنون ہیں۔ دیر تک ان مخیّر اصحاب کا نام لے کر فرداً فرداً اعلانات ہوتے رہے۔ اسی ہنگامے میں نئے سال کی آمد کا گجر بجا تو مہمانوں میں سے ایک مولانا صاحب نے دعائے خیر کی اور اپنی اور حاضرین کی ماضی کی فروگزاشتوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ اس دعا کے بعد تمام بچے اور کچھ اور لوگ گھروں کو چلے گئے۔ اب بڑوں کی باری تھی۔

تقریب کے حوالے سے میری ہی دعوت پر لاہور سے طفیل ہوشیار پوری، محمد خان کلیم یزدانی جالندھری اور دیگر اصحاب تشریف لائے تھے۔ گھڑیاں سے مولانا نصر اللہ نصؔر کو بھی میری فرمائش پر بلایا گیا تھا۔ صدر مجلس طفیل ہوشیار پوری تھے۔ متعدد شاعروں نے اپنا نعتیہ کلام اور غزلیں ترنم سے سُنائیں لیکن طفیل ہوشیار پوری اور نصر اللہ نصؔر دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہے جبکہ منصفوں نے ظہوری قصوری ہی کو نعت خوانی اور غزل سرائی کا امام قرار دیا اور وہ اول انعام کے مستحق قرار پائے۔ اردو فارسی اور پنجابی میں اپنا کلام پیش کرنے والوں کے چند نام ہی ذہن میں رہ گئے ہیں جن میں نمایاں خلیل آتش تھے جو آگ اور شعلوں کی بات کرتے تھے۔ دوسرا نام شاکر علی شاکر کا ہے جو کھری کھری سنانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ریڈیو کشمیر کے نے نوازوں اور طبلچیوں کی سنگت میں جب اختتامی نغمہ 'اے میرے محبوب وطن' طفیل ہوشیار پوری نے سنایا تو پوری محفل سناٹے میں آ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی متنفس موجود نہیں، سب دم بخود ہو کر نغمے کے سحر میں ڈوبے مجسمہ ہائے حیرت بنے ہوئے تھے۔

اخبارات کے نامہ نگاروں نے قصور میں نعت خوانی و غزل سرائی کی اس محفل کا انعقاد بھی محکمہ تعلیم کے کھاتے میں ڈال دیا جس سے میری ہی نہیں صدیقی اور محکمے کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوا حالانکہ اس رات سعید صدیقی قصور ہی میں نہ تھا۔

قصور سے میرا تبادلہ، میری استدعا پر ۳۱ مارچ ۶۵ء تک روک دیا گیا تھا لیکن ۳۱ مارچ ۶۵ء گزر جانے کے باوجود کسی نے احکام کی روشنی میں مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی اور

اِدھر مجھے بھی معاملہ اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ جملہ امور معمولات کے طور پر انجام پا رہے تھے اور میں مطمئن جا رہا تھا۔

☆☆

اگست ۶۵ء کی ابتدا ہی سے کشمیر سے بھارتی سامراج کی چیرہ دستیوں کی خبریں آنے لگیں۔ پھر کشمیری حریت پسندوں اور بھارتی درندوں میں تصادم ہو گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ گزشتہ ۱۸ برس سے بھارتی افواج مقبوضہ علاقے میں اپنے مورچے مضبوط کر رہی تھیں۔ جواباً انقلابی کونسل کی کارروائیاں بڑھنے لگیں۔ مجاہدین نے بھارتی فوج کے حواس خطا کر دیئے۔ جواباً بھارتی فوج نے اعوان شریف آزاد کشمیر پر گولہ باری کی' یہ حکومت پاکستان کو للکارنے کے مترادف فعل تھا لیکن حکومت نے صبر کا دامن تھامے رکھا' پورے پاکستان کے ساتھ قصور میں بھی ہر کوئی کشمیر کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ ہم طلبہ اور اساتذہ سے آزادیٔ کشمیر اور امن و آشتی کی دعائیں کر وا رہے تھے' بگڑتے حالات اور بھارتی پروپیگنڈے سے ہر کوئی اندازہ کر رہا تھا کہ کشمیر میں آزادی کی جنگ کا فیصلہ کشمیریوں ہی کے حق میں ہو گا۔ مگر ہونی ہو کر رہی۔

وہ دن آ گیا جب بھارتی فوج نے کشمیر میں خطِ متارکہ جنگ کو عبور کر کے آزاد کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ افواجِ پاکستان نے آزاد کشمیر کی افواج کی اخلاقی مدد کی اور لمحوں میں چھمب' جوڑیاں اور دیوا کی چوکیاں بھارتی فوج سے چھین لیں۔ بھارت نے اپنی روایتی مکاری سے کام لیا اور آپریشن نیپال کے تحت پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کو بغیر پیشگی انتباہ کے عبور کر لیا۔ پو پھٹنے سے پہلے بھارتی فوج' بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کے سہارے کئی سرحدی دیہاتوں کا محاصرہ کرتی آگے بڑھتی رہی۔ سرحدوں پر غیر معمولی گھن گرج تو سنائی دے رہی تھی لیکن ملک کے اندر کوئی سراسیمگی نہیں تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سرحدی جھڑپیں کچھ زیادہ ہو گئی ہیں۔

میں بھی بے فکری سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ میرا ایم۔ایڈ کا جامع امتحان ہو چکا تھا۔ مقالے کا کچھ کام باقی تھا جسے داخل کرنے کی آخری تاریخ ۸ ستمبر تھی۔ ادارے ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ ہم تو حالت جنگ میں ہیں' میں نے فوراً واپس جانے کی ٹھانی۔ فیروز پور روڈ سے جلد ہی بس مل گئی۔ قصور میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اسٹیشن پر گولہ باری ہو چکی تھی۔ بھارتی طیارے بھی چکر لگا چکے تھے۔ میرے دونوں بڑے بچے سکول کے دوسرے بچوں کے ساتھ سٹیشن کی حالت دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ میں سخت پریشان ہوا۔ لوگ ٹرکوں اور بسوں کے

ذریعے اپنے بچے ضلع لاہور کے محفوظ علاقوں میں بھیج رہے تھے۔

تمام زنانہ مردانہ درس گاہیں بند کر دی گئی تھیں۔ میں اپنی اہلیہ سے ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے بابا علم دین کو بچوں کو تلاش کرنے کیوں نہیں بھیجا کہ عین اس لمحے ماسٹر عباس خان بچوں کو لے کر آ گیا۔ اس کا اپنا بچہ بھی میرے بچوں کے ساتھ تھا۔ ماسٹر عباس خان نے مجھے پیش کش کی کہ میں بھی بچوں کو اس کے بچوں کے ساتھ پتوکی کے قریب ایک گاؤں میں بھیج دوں۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ مجھے کیا اقدام کرنا ہے؟ بچے بڑی تفصیل سے مجھے گولہ باری کی تباہی کے بارے میں بتا رہے تھے مگر میں ان کو ان کی غلطی پر ڈانٹ رہا تھا۔

ایس ڈی ایم کے ہرکارے تمام تحصیل افسران کو خصوصی اجلاس میں شمولیت کی اطلاع دے رہے تھے۔ بابا علم دین دفتر سے میرے لیے بھی اطلاع لے کر آیا تھا۔ میں نے اہلیہ کو جلد تیار ہونے کے لئے کہا تا کہ اُسے اور بچوں کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑ آؤں۔ خود کچہری میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے اجلاس میں چلا گیا جہاں بتایا گیا کہ ہمیں داخلی محاذ پر کس طرح فوج کے دوش بدوش بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اپنی تقریر میں صدر ایوب نے بھی سرکاری ملازمین سے خصوصی طور پر توقع کی تھی کہ وہ معمول کی زندگی میں فرق نہیں آنے دیں گے۔ ایس ڈی ایم نے شہری دفاع کے سلسلے میں بھی مناسب اقدامات کرنے کو کہا اور سرکاری عمارت میں کئی قسم کے امدادی مراکز کھولنے کی ہدایات دیں۔

واپسی پر میں نے دیکھا کہ میری اہلیہ جوں کی توں بیٹھی ہے۔ وہ لاہور میں کسی رشتہ دار کے ہاں جانے کو تیار نہ تھی۔ میرا بھائی تو رہتا ہی دراوغہ والا تھا' وہاں جانا محاذ پر جانے کے مترادف تھا۔ اہلیہ کے مقابلے میں مَیں کچھ زیادہ ہی پریشان تھا کہ معصوم بچے جب دھماکوں کی آوازیں سنیں گے تو گھبرا جائیں گے۔ اور بھی بہت سے تفکرات تھے۔ یہ خیال بھی تھا کہ حکام کے احکام کی تعمیل کرنا میرا فرض منصبی ہے۔ اساتذہ کو مراکز کے مدارس میں حاضر رہنے کی ہدایت بھی ملی تھی۔ اگلے دن ہی مدرسین کو اطلاع دینے کا یہ کام سرانجام دینا تھا گو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مدرسین سے رابطے کی صورت کیا ہو گی۔

☆☆

میرے اصرار پر جب میری اہلیہ لاہور جانے کے لئے تیار ہوئی تو اُس وقت تک شہر سے تمام بسیں اور ٹرک غائب ہو چکے تھے۔ مجبوراً میں اہلیہ اور بچوں کو لے کر ریلوے اسٹیشن

پہنچا، شام ہو رہی تھی، اوپر سے بلیک آؤٹ ہو چکا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں اتفاقاً ایک گاڑی پاکپتن کی طرف سے آئی۔ ٹکٹ وغیرہ کا کوئی چکر نہ تھا۔ اسٹیشن پر موجود سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیوی کو اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑنے کا دکھ ہو رہا تھا۔

چاند کی روشنی میں گاڑی لاہور اسٹیشن پر تقریباً دس بجے پہنچی۔ مجھے اور میری اہلیہ کو صرف اس قدر معلوم تھا کہ بچوں کا طالب علم ماموں شالیمار واپڈا کالونی میں ایک رشتہ دار کی کوٹھی کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ پہلے ہم باغبانپورہ میں اپنی ایک پھوپھو کے گھر گئے۔ ان سے کہا کہ ہمیں بچوں کے ماموں رفیق کے ہاں پہنچا دیا جائے۔

پھوپھو نے ہمیں کھانا کھلایا اور پھر پھوپھی زاد بھائی ریاض اپنی گاڑی پر ہمیں شالیمار کالونی واپڈا میں چھوڑ آئے۔ ہم نے پوری کالونی کو خالی پایا۔ چند چوکیدار ایک برآمدے میں بیٹھے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ برادر نسبتی بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اتفاق کی بات تھی ہمیں اس کا کمرہ کھلا ہی مل گیا۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے بچوں کو بستر اور فرش پر لٹایا۔ وہ سو رہے تھے۔

وہاں اپنی رانی توپ کی گھن گرج اس شدت سے آ رہی تھی کہ الامان۔ سرحد پر چمکتی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ ہم رات بھر جاگتے رہے۔ دھماکوں کا شور نہ ہوتا تو شاید ہماری بھی آنکھ لگ جاتی۔ کبھی کبھی خطرے کے سائرن بھی بجتے۔ جیٹ طیاروں کی گونج بھی در و دیوار کو کپکپا دیتی۔ اہلیہ توبہ استغفار کرتی کبھی اندر جاتی کبھی باہر آتی۔ مقام شکر تھا کہ بجلی کی رو بحال تھی۔ بچے پنکھے کے نیچے آرام سے سو رہے تھے۔ بہرکیف، جنگ کے فوری اور مابعد اثرات اور محاذ پر لڑنے والے جوانوں کی باتیں کرتے رات بسر ہو ہی گئی۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ رات بڑی اہم ہے۔ اس رات کے اندر اندر پاکستانی قوم اس طرح بیدار ہوئی کہ اس نے اتحاد، اعتماد اور امداد کے سارے جذبوں کے تحت اپنے داخلی اختلافات اور تضادات بھلا دیئے۔ سرحد سے ایک لاکھ جیالوں کی طرف سے اپنی خدمات برائے جہاد پیش کی گئیں۔ اہل قلم نے برسوں کا جمود توڑا اور قومی اور ملی نغمے اور گیت تخلیق کیے۔ فنکاروں نے اپنی آوازیں ملک و ملت کے لئے وقف کر دیں۔ اُسی رات کے فیضان سے ہلالی پرچم ایک کہکشاں کی مانند جگمگا اُٹھا...... یہ رات نیند کی ماتی قوم کے ارادوں اور خیالوں میں پختگی بھرنے والی رات تھی۔ یہ وہ رات تھی جس نے ہمیں اپنے بال و پر آزمانے کا موقع مہیا کیا۔

☆ اس رات پاکستانی قوم نے بھارتی جارحیت سے ہزار سال تک لڑنے کا عزم کیا۔

☆ اس رات کشمیری عوام کو یہ یقین دلایا گیا کہ پاکستان کے عوام ان کو حق خود ارادیت دلا کر ہی دم لیں گے۔

☆ اسی رات کے دوران ہی بھارتی سامراج کا لاہور پر قبضے کا خواب ہمیشہ کے لیے پریشان ہو کر رہ گیا۔ جنرل اروڑہ جم خانہ کلب میں کاک ٹیل پارٹی کی آرزو کا خون چاٹتا رہا۔

☆ اسی رات کے بعد دنیا انگشت بدانداں رہ گئی کہ اپنے سے پانچ گنا بڑی مکار طاقت سے ٹکرانے والی پاکستانی قوم کیسی قوم ہے جو مادرِ وطن کے تحفظ کے لئے بنیان مرصوص بن کر دادِ شجاعت دے رہی ہے۔

☆ اسی رات دنیا بھر کے عوام نے ریڈیو سُن کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ پاکستان کہاں واقع ہے اور کیسا ملک ہے۔

☆ بھارتی جارحیت کو پسپا کرنے پر پاکستان کو بین الاقوامی طور پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔

☆ اسی رات ہماری تینوں افواج کو اپنی تربیت اور صلاحیتیں آزمانے کا موقع ملا۔

☆ اسی رات ہمیں پتہ چلا کہ بین الاقوامی برادری میں ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون؟

۶ ستمبر ۶۵ء کی اس رات کے بطن سے پیدا ہونے والی قومی جرأت و یک جہتی کی کہانیاں جنگ عظیم کی کہانیوں کی طرح مدتوں لکھی اور دہرائی جائیں گی۔ اب بھی یہ رات ہماری قوم کے لئے ایک حوالے کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہے کہ ہم رنجشیں، کدورتیں اور اختلافات بھلا کر یکجا ہو گئے تھے۔

☆☆

اگلی صبح میں نے بچوں کو چوبرجی کوارٹر میں ایک عزیز کے ہاں چھوڑا اور خود حاضری ڈالنے کے لئے ضلعی دفتر میں حاضر ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا مجھے ضلعی افسر کا پیغام مل گیا تھا کہ میں تو دفتر صدر میں حاضر ہو گیا ہوں جبکہ باقی سب ڈویژنوں کے انچارج حاضر نہیں ہوئے۔ میں نے بتایا کہ میں تو محض حاضری ڈالنے خود ہی آیا ہوں اور مجھے بتایا گیا کہ انتظامیہ نے جملہ ضلعی انتظامی اہلکاروں کو لاہور میں طلب کر لیا ہے تاکہ داخلی محاذ پر مکمل ذمہ داری اور قومی سرشاری کے جذبے سے کام کیا جائے۔

مجھے سرحدی پناہ گزینوں کے لیے بستر اور لباس کے عطیات اکٹھے کرنے اور تقسیم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، یہ مرکز چشتیہ ہائی سکول میں قائم کیا گیا تھا۔ لوگ از خود کپڑوں

کے گٹھڑے اٹھائے چلے آتے تھے، ہمیں فہرستیں تیار کرنا بھی مشکل ہو جاتی تھیں۔ چشتیہ ہائی سکول ساتھ ہی فوجی جوانوں کے لئے صابن بسکٹ، چنے، حجامت کے سامان اور سگرٹوں کے پیکٹ بنانے کا مرکز تھا۔ وہاں دوسرے ساتھی متعین تھے۔ کوئی فرد معمولی سا گھپلا بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ مراکز جنگ بند ہو جانے کے بعد بھی متاثرین جنگ کی واپسی تک کام کرتے رہے۔ جنگ کے بند ہوتے ہی مجھے تحصیل ہیڈ کوارٹر پر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی۔

قصور میں میری عدم موجودگی میں کوٹ مراد اور ہمارے ملحقہ محلے کوٹ شیر باز خان پر بم گرے تھے۔ بموں کے دھماکوں سے قریبی گھروں کے دروازوں کے کواڑ خود بخود اکھڑ گئے تھے۔

میرا پورا گھر ایک سلائی مشین اور ڈرائنگ روم کی اشیاء کے سوا اپنے ہی شہر نا عاقبت اندیش اور کم ظرف بدمعاشوں نے لوٹ لیا تھا۔ بچوں کے کپڑے تک باقی نہ چھوڑے تھے۔ ضلعی افسر کو جب صدیقی نے میرا گھر لٹ جانے کی خبر سنائی تو انھوں نے مجھے اپنی جیب سے ایک گرم سوٹ سلا کر دینے کی پیش کش کی۔ یہ بھی کہا کہ میں بھی جنگ کے متاثرین میں شامل ہو چکا ہوں لہٰذا میں محکمے کے اس مرکز سے جس میں مَیں کام کرتا تھا ہر وہ چیز حاصل کر سکتا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہے لیکن جس قومی جذبے کی کیفیت نے ہر سمجھدار پاکستانی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا میں اس کیفیت کو علم و ادب کا شغف رکھنے کی وجہ سے زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ضلعی افسر کا شکریہ ادا کیا اور کسی قسم کی مدد قبول نہ کی۔ میرے اپنے بھائیوں اور میری اہلیہ کے بھائیوں نے سردیوں کی آمد سے پہلے پہننے والے گرم کپڑوں اور گرم بستروں سے ہمارا گھر بھر دیا۔

رواں تعلیمی سال کے اختتام سے پہلے ضلعی معائنہ ٹیم کے دو ارکان کی بطور صدر معلم ثانوی سکول ترقی ہو گئی۔ ان کی جگہ تعینات ہونے والے ایک اے ڈی آئی کو کسی نے بتا دیا کہ میرا تبادلہ ۳۱ مارچ ۶۵ء تک روکا گیا تھا۔ وہ دوست قصور آنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس کوئی سفارش بھی تھی۔ لہٰذا 'کمینے ماسٹر' (مجھے) کو قصور سے پتوکی تبدیل کر دیا گیا۔ میرے احکام تبادلہ انسپکٹر آف سکولز نے جاری کئے۔ کہاں تو میں لاہور سے تیس میل کے فاصلے پر تھا' اب پچاس میل دور چلا گیا۔ جنگ کے اختتام پر میں نے اپنے رشتہ دار عزیزوں کی وجہ سے باغبانپورہ میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ بچوں کو بھی ادھر ہی سکول میں داخل کرا دیا تھا لہٰذا میں اکیلا ہی پتوکی میں رہنے لگا۔ ہفتے کے اختتام پر گھر آ جاتا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۲۸)

پتوکی اور میری پت

پتوکی میں ایک مکان سرکاری طور پر کرائے پر لیا گیا تھا جس میں پتوکی شرقی اور پتوکی غربی، تعلیمی سب ڈویژنوں کے دو دفاتر تھے۔ مکان کا پچھلا حصہ صحن اور دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ان کمروں میں بال بچوں کے بغیر چھڑے اے ڈی آئی قیام کرتے تھے۔ جب مجھے لاہور جانا ہوتا تو اس روز سب ڈویژن کے ان سکولوں کا دورہ کرتا جو لاہور سے قریب تر ہوتے۔ کچھ سکول تو لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع تھے۔ واپسی بھی اسی انداز سے ہوتی۔ اس طرح آمدورفت کا نصف خرچہ حکومت کے کھاتے میں چلا جاتا۔ مہینے میں ایک آدھ تعطیل اور ایک دو سرکاری اجلاس بھی منعقد ہوتے یوں آنے جانے میں مالی طور پر کفایت ہو جاتی تھی۔

پتوکی میں فرائض انجام دیتے ہوئے دو ایسے خاص واقعات پیش آئے جنہوں نے میری زندگی پر گہرے اثرات ثبت کر دیئے، ایک واقعہ تو میرا ذاتی ہے دوسرے کا تعلق میرے پہلے ضلعی افسر کی زندگی سے ہے۔

☆☆

دفتر کے قریب ہی ایک ایس۔ وی صدر مدرس مڈل سکول عبدالرحیم رہائش پذیر تھے۔ پرانی وضع کے متواضع اور خوش مزاج انسان تھے۔ ان کی بچیاں معلمات تھیں جبکہ ان کے بیٹے بڑے کاروباری تھے۔ وہ پتوکی کی پوری تاریخ جانتے تھے۔ سبکدوشی کے قریب ہونے کے باوجود اے ڈی آئی صاحبان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ اساتذہ، افسران معائنہ اور دیگر افسران انتظامیہ کی انھیں بے شمار داستانیں مڈل سکول کالا کے ماسٹر دلدار علی کی طرح یاد تھیں۔ بس ایک قدرتی عیب تھا کہ وہ اونچا سنتے تھے جس طرح ریڈیو اپنی کہتا رہتا ہے، دوسرے کی نہیں سُنتا اسی طرح ہمیں زیادہ تر انہی کی سننا پڑتی تھی۔ انھوں نے مجھے میری سب ڈویژن کے بہت

سے مدرسین کی تاریخ اوران کا جغرافیہ خوب حفظ کرایا۔ان مدرسین میں ایک مدرس عباس علی تھا میں نے اُسے دیکھا بھی تھا اوراس کے متعلق سنا بھی تھا کہ درویشی میں درک رکھتا ہے۔ ماسٹر عبدالرحیم کے نزدیک وہ حقیقی درویش تھا۔اس درویشی کی وجہ سے اس کی اپنے مرکز کے صدر مدرس سراج الدین سے چپقلش رہتی تھی۔صدر مدرس اسے فریبی، کام چوراور ذہنی مریض قرار دیتا تھا۔عبدالرحیم نے مجھے نصیحت کی کہ جب بھی میں عباس علی کے سکول کا دورہ کروں تواس کی دعوت کورد نہ کروں۔

معمول کے مطابق تعلیمی و انتظامی کام اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا کہ عباس علی کے سکول کے معائنے کا دن آ گیا۔عباس علی نے میری رہنمائی کے لئے اپنے ایک نائب مدرس کوعلی الصباح ہی پتوکی بھیج دیا کہ وہ مجھے راہ نمائی میں سکول لے چلے۔ایسے تکلفات معمول کی بات تھے۔ساتھ ہی عباس علی کا یہ پیغام بھی ملا کہ طعام وقیام اسی کے ہاں ہوگا۔اور میں اپنی روایت کے مطابق مرکز کے سکول میں قیام نہیں کروں گا۔تجسس کے پیش نظر میں نے عباس علی کے متعلق اس کے نائب سے کئی سوالات کئے جن سے علم ہوا کہ عباس علی کوہ ہندوکش کے پہاڑوں میں بسنے والے کسی بزرگ کا مرید ہے۔اسی لئے سیاہ پوش ہے۔ دائیں کلائی میں فولادی کڑا پہنتا اور ہاتھ میں دوفٹ کی چھڑی رکھتا ہے۔موج میں آکر چھڑی سے کڑے کو بجاتا ہوا عارفانہ کلام گاتا ہے۔گاتے گاتے وجد میں آجاتا ہے اور بے ہوش ہوکر گر پڑتا ہے۔کچھ دیر بعد ہوش میں آتا ہے۔اپنے آپ کو سمیٹتا ہے۔کپڑے جھاڑتا ہے اور کہیں جا کر لیٹ رہتا ہے۔ شام کے قریب گھر واپس آجاتا ہے۔

''سکول کا کام کیسے کررہا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''بہت اچھا... سکول کے اوقات میں اسے کبھی کچھ نہیں ہوا۔بہترین مدرس ہے۔ موجودہ مرکزی صدر مدرس سراج الدین کے سوااس کے سب سے خوشگوار تعلقات ہیں۔اس نے مجھے نصیحت کے انداز میں کہا کہ آپ معائنے پر سراج الدین کو نہ بلائیے گا۔میرا طریق کار پہلے ہی ایسا تھا کہ کسی مرکز کے صدر مدرس کواس کے مرکز کے کسی مدرسے میں معائنے کی غرض سے نہیں بلاتا تھا'یوں بھی معائنہ کرنا یا معائنے میں مدد دینا ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن معائنے کوایک تقریب سمجھ کر خود اول مدرسین مرکز کے صدر معلم کو بلالیا کرتے تھے۔

عباس علی نے سکول کو غیر معمولی طور پر آراستہ کررکھا تھا۔طلبہ کے سال بھر کے کام کو

اس نے ہر جماعت کے قریب ہی تختے بنا کر ان پر ترتیب سے رکھ دیا تھا کہ ایک ہی نظر میں سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکے۔ اسکول کے جو دو کمرے تھے وہ بھی چارٹوں، نقشہ جات اور دیواروں پر لکھے اقوال سے آراستہ تھے۔ بنگاہ بلوچاں کے اول مدرس ملک محمد اشرف کو جو پنجاب ٹیچرز یونین کے عہدیدار تھے عباس علی نے بلا رکھا تھا حالانکہ ملک صاحب کا تعلق کسی اور مرکز سے تھا میں نے اول مدرس بنگاہ بلوچاں سے پوچھا کہ وہ کدھر؟ اور کیسے؟؟

میرا یہ پوچھنا آگ اور پانی کے اجتماع ضدین پر حیرت کی وجہ سے تھا۔ ملک اشرف جس عقیدے کے کٹر پیروکار تھے عباس علی اس کے برعکس عقیدے کا آدمی تھا۔ ان کا میل جول اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ دونوں ہی اپنے مسلک میں کٹر نہیں بلکہ معتدل انسان ہیں۔ ملک اشرف کی بجائے عباس علی نے جواب دیا:

''جناب! آپ کے ساتھ طعام و کلام میں شرکت کے لئے کسی معزز شخص کا ہونا ضروری تھا اور صدر پنجاب ٹیچرز یونین سے زیادہ معزز میرے نزدیک ارد گرد کے سکولوں میں کوئی بھی نہیں ہے۔''

عباس علی کا یہ جواب مجھے پسند آیا۔

معائنہ ہوا۔ لاگ بک لکھنے میں، میں نے اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا۔ پھر طلبہ کو چھٹی دینے کے بعد کھانا ہوا۔ کھانے کے دوران میرے نہ چاہتے ہوئے بھی مرکزی صدر مدرس سراج الدین کا ذکر آ ہی گیا۔ پتہ چلا کہ وہ فضائیہ میں ائیر مین تھا۔ وہاں سے فراغت کے بعد اس نے بی۔ ایڈ کیا اور فوجی کوٹے میں معلم بن کر دو تین سال ہوئے صدر مدرس مڈل سکول تعینات ہوا ہے۔ اس کا باپ پتوکی مارکیٹ کمیٹی میں پلے دار ہے۔ ملک فقیر علی چیئرمین یونین کونسل 'فقیر والی' ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بھی ہے اور مارکیٹ کمیٹی کا چیئرمین بھی!...... اسی کے بَل پر سراج الدین کو ملازمت ملی اور اس کے اندر غیر معمولی اکڑ بھی ملک فقیر علی کی وجہ ہی سے پائی جاتی ہے۔ جو بات زور دے کر بتائی گئی وہ یہ تھی کہ وہ جے۔ وی اور ایس۔ وی مدرسین کو ایک جاہل بے وقعت اور واہیات مخلوق خیال کرتا ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سراج الدین اپنی نئی سائیکل پر آتا دکھائی دیا۔ ایک مدرس نے مجھے اطلاع دی تو میں نے کہا کہ بسم اللہ...... آ رہا ہے تو آئے ملنے میں کیا قباحت ہے۔ السلام علیکم کہنے، ہاتھ ملانے اور بیٹھنے کے بعد اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ وہ

محض اس لئے حاضر ہوا ہے کہ افسر علاقہ اس کے مرکز میں آیا ہوا ہے اور اسے علم ہی نہیں حالانکہ میزبانی اس کا حق بنتا تھا۔

''سرکاری مہمانداری کسی کا حق نہیں.... یہ تو رواج بنا دیا گیا ہے۔ جب آپ کے سکول کا معائنہ ہوگا تو وہاں آپ میزبانی کا شوق پورا کر لیجئے گا۔'' میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب! بات یہ نہیں' آپ نے جان بوجھ کر مجھے نظرانداز کیا ہے۔ ایسے مواقع پر مرکز کے صدر مدرس کو بلانا اس کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ آخر یہ ملک صاحب بھی تو آئے ہوئے ہیں۔'' سراج الدین نے کہا۔

''بھئی! ان کو میں نے نہیں، اس سکول کے اول مدرس نے بلایا ہے''

''تو آپ اس کی بھی اور ملک صاحب کی بھی جواب طلبی کریں اس نے کیوں بلایا اور یہ کیوں مدرسہ چھوڑ کر آ گئے؟''

ہر چند اس کی بات درست تھی لیکن حفظِ مراتب کے خلاف تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ بے لگام گفتگو نہ کرے، چاہے تو میری شکایت کر دے۔ جواب میں اس نے کہا کہ شکایات سے کیا ہوتا ہے؟ اس نے کئی عرضیاں عباس علی کے خلاف بھیجی ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر جاتی ہیں۔ اس پر عباس علی بول پڑا، قریب تھا کہ وہ دونوں الجھ پڑتے کہ میں نے مختلف پینتروں سے دونوں کو ٹھنڈا کیا، سراج الدین چائے میں بھی شامل ہوا۔ قیام کے بارے میں' مَیں نے عباس علی سے معذرت چاہی کہ میں اول مدرس بنگاہ بلوچاں کے تانگے پر بھائی پھیرو جاؤں گا اور وہاں سے، بجائے پتوکی، لاہور اپنے گھر چلا جاؤں گا اور پیر کو واپس آؤں گا۔

ابھی سراج الدین وہیں تھا کہ میں اور ملک صاحب سب سے ہاتھ ملا کر نکل آئے۔

ماہ مئی کی تنخواہ ملنے کے دن بھی کسی بات پر عباس علی اور سراج الدین باہم الجھتے الجھتے رہ گئے۔ دفتر سے تو چلے گئے لیکن کسی اور جگہ دونوں کا زبانی کلامی تصادم ہوا تھا میں نے سُنا کہ عباس علی نے اسے کہا تھا کہ وہ درویشوں سے نہ اُلجھا کرے۔ اس پر سراج الدین نے درویشی اور درویشوں دونوں کو بے نُقط سنائیں۔ عباس علی کو بڑا طیش آیا۔ اس نے اپنی چھڑی سے کڑا بجایا اور قلندرانہ نعرہ لگاتے ہوئے سراج الدین پر پل پڑا۔ اس کا پلڑا بھاری رہا۔ سراج پِٹ کر بھاگ گیا جبکہ راوی کے مطابق عباس علی تین بجے تک تپتی گرد پر سڑک کے کنارے پڑا رہا۔ راوی نے یہ بھی بتایا کہ سراج الدین یہ کہتا پھر رہا ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ عباس علی نے کیا ہے

وہ سب کچھ اے ڈی آئی کی (یعنی میری) شہہ پر ہوا ہے۔

۲۲ جون ۶۶ء کو میرا دفتر میں کام کرنے کا دن تھا۔ میں کچھ چٹھیوں کے جوابات لکھ رہا تھا، دفتر کا کلرک اور نائب قاصد کہیں گئے ہوئے تھے سراج الدین دفتر آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا بات ہے ہیڈ ماسٹر صاحب؟'' جواب میں اس کا لہجہ اور تیور دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اس کے بعد وہاں ماسٹر غلام حسین ہیڈ ماسٹر مڈل سکول راولا بھی آ گیا اور خاموشی سے سراج الدین کی باتیں سُنتا رہا۔ میں نے اس سے کہا ''آپ نے سراج الدین صاحب کا لہجہ ملاحظہ فرمایا؟...... '' ابھی میں بات بھی پوری نہیں کر پایا تھا کہ سراج الدین نے ایک مُکّا میری ناک پر دے مارا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسی دوران سراج الدین کے دو ساتھی اچانک نمودار ہوئے' انھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ وہ مجھ پر پل پڑے۔ غلیظ گالیاں دیں اور مار مار کر مجھے ادھ موا کر دیا۔ ادھر سراج الدین نے سکول پہنچ کر ۳۰۔۷ کا وقت درج کر کے حاضری بھی لگا دی۔ غلام حسین، وہیں کھڑا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو کم از کم مجھے ان لوگوں سے چھڑوا سکتا تھا۔

جب کوئی آدمی پٹتا ہے یا اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے تو وہ پولیس کے پاس جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا ردِ عمل بھی یہی ہونا چاہیے تھا' لیکن میں کچھ ایسی بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ مدد کے لئے میں نے اپنے ہی محکمے کو پکارنا چاہا۔ میں جب صدر دفتر لاہور جانے کے لئے تیار ہوا تو غلام حسین نے مجھ سے کہا کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر بھی مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا میں نے تھانے میں واقعہ کی رپٹ درج کرائی؟ اس نے مشورہ دیا کہ مجھے پہلے رپٹ ضرور درج کرانی چاہیے۔ غلام حسین کے خلاف دل میں رنجش رکھنے کے باوجود میں نے اس کی بات غور سے سن لی۔ اس نے تھانے تک میری رہنمائی بھی کی۔ تھانیدار موجود نہیں تھا۔ حوالدار نے کہا کہ مجھے آنے والی چوٹیں انتہائی معمولی اور بے نشان ہیں، لہٰذا معاملہ دست اندازی پولیس نہیں بنتا۔ پھر بھی اگر مجھے رپورٹ درج کرانے پر اصرار ہے تو میں پہلے سول اسپتال جاؤں اور ڈاکٹری معائنے کا سرٹیفکیٹ لاؤں۔ غلام حسین ہمدردی کی باتیں کرتے ہوئے مجھے اسپتال لے گیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب چھٹی پر تھے۔ پھر حوالدار کے کہنے پر غلام حسین مجھے تحصیل اسپتال چونیاں لے گیا۔ وہاں بھی صورت حال بالکل ویسی ہی تھی' ڈاکٹر ندارد......

اِس صورت حال نے جو میرے اندر مایوسی اور بیزاری پیدا کی' مجھے اس پر رونا آ گیا'

لیکن غلام حسین کی موجودگی میں' مَیں اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرر ہا تھا۔ میں غلام حسین سے اس کے ایثار اور قربانی کی باتیں کرنے لگا کہ وہ کس طرح صبح سے شام ہوتک بھوکا پیاسا میرے ساتھ خوار ہور ہا ہے۔ میری تو خیر بھوک پیاس ویسے ہی مرگئی تھی۔ ہم چونیاں سے واپس پتو کی پہنچے تا کہ تھانے والوں کو وہ پروانہ واپس کیا جا سکے جو انھوں نے طبی معائنے کے لئے دیا تھا اور پوچھا جائے کہ اب بھی رپٹ درج ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اب وہاں تھانیدار موجود تھا۔ اس نے کہا'' آپ ہمارے پیٹی بند ملازم بھائی ہیں'' کوئی غنڈہ، ذلیل ہمارے ساتھ بھی ایسی حرکت کرسکتا ہے آپ سے جو زیادتی ہوئی اس کی سزا ملزم کو دلانا پولیس کا فرض ہے..... اس نے میری پوری رام کہانی سُنی۔ میری باتوں کی تصدیق، تائید اور وضاحت کے لئے وہ غلام حسین سے بھی کچھ نہ کچھ پوچھتا جاتا اور غلام حسین بھر پور تائید کرتا۔ تاہم اس وقت بھی مجھ پر خود ترسی کا عالم طاری رہا۔ غلام حسین کا میں ممنون تھا کہ اس نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا اس نے وقوعہ کے بعد زبانی ہمدردی کے علاوہ مجھے دودھ پتی کے ساتھ چار سو ملی گرام کی بروفین کی دو گولیاں بھی کھلائی تھیں۔

''منشی......'' تھانیدار نے اونچی آواز سے کہا'' کاغذات وغیرہ تیار کرو، ایک پرچہ دینا ہے۔'' کہاں تو حوالدار رپورٹ لکھنے کے لئے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لانے کو کہہ رہا تھا اور کہاں اب اس کا تھانیدار رپورٹ کے بجائے پرچہ درج کرنے پر تیار تھا' پرچہ درج ہونے کے بعد اگلا مرحلہ ملزم کی گرفتاری ہوتا ہے، اس صورت حال سے میری افسردگی ذرا کم ہوئی۔

ہم دونوں کو تھانیدار نے نسبتاً اچھی کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ منشی کو اس نے کاغذات لانے کے ساتھ ساتھ کھانا لانے کا حکم بھی دیا کیونکہ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اسی لمحے دو افراد تھانے کی حدود میں داخل ہوئے تو تھانیدار نے ہمیں سُناتے ہوئے کہا'' لو جی! آگئے ہیں سرا جو حرام زادے کے سفارشی.........'' اور پھر اُس نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا اور انھیں تھانے کی پچھلی جانب لے گیا۔ اس اثناء میں ایک چھوٹا تھانیدار ہم دونوں کے قریب آ بیٹھا۔ منشی بھی کھانا رکھ کر کاغذات لے کر تھانیدار کی میز کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ تقریباً نو بجے رات تھانیدار پھر اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوا.... معذرت کرنے کے بعد تھانیدار نے مجھے جملہ واقعات دہرانے کے لئے کہا۔ میں نے بیان شروع کیا تو چھوٹے تھانیدار نے وضاحت طلب کرتے ہوئے لقمہ دیا کہ جھگڑا دفتر کے اندر ہوا تھا یا باہر؟''

"جھگڑا نہیں ہوا، بلکہ مجھ پر حملہ کیا گیا ہے اور مجھے زدوکوب کیا گیا ہے...."

"دفتر کے اوقات کار کب سے کب تک ہیں؟" چھوٹا تھانیدار پھر بولا۔

"دفتر کے اوقات ساڑھے سات سے پونے دو بجے تک ہیں" میں نے بتایا۔

اب چھوٹے تھانیدار نے بڑے تھانیدار سے اپنے مخصوص پر اسرار لہجے میں کہا۔ "سوچ لیں جی"

نجانے "اس سوچ لیں جی" میں کیا بات تھی کہ تھانیدار نے منشی حوالدار سے کہا، تم پہلے وہ رپٹ لکھو، جس کے متعلق چورمین (چیئرمین) کہہ گیا ہے۔ پھر وہ چھوٹے تھانیدار کی طرف متوجہ ہوا، کہنے لگا۔ "دو ملازم ساتھ لے جاؤ موقعٔ واردات کا معائنہ کرو اور جائے وقوعہ کا نقشہ بنالاؤ۔" پھر اُس نے میری طرف اُنگشت نمائی کی اور کہا "قاضی صاحب ہمارے لئے بہت قابلِ احترام ہیں یہ ہمارے بچوں کے اُستادوں کے افسر ہیں۔ ان کے ساتھ جو زیادتی کی گئی ہے وہ دراصل ہمارے ساتھ زیادتی ہے۔"

پندرہ منٹ تک تو دو ملازم ہی نہیں ملے۔ جب ملے تو غلام حسین کو بھی ساتھ لے جانے لگے۔ میں نے انھیں کہا کہ انھیں میرے پاس ہی رہنے دیں۔ تھانیدار اُٹھا اور ہمیں تسلی اور آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے کر کھانا کھانے چلا گیا۔ "آپ فکر نہ کریں....... رپورٹ پر وقت سات بجے ہی کا درج کرلیا جائے گا۔ ابھی جو رپورٹ منشی نے لکھی ہے وہ پانچ بجے کا وقت ڈال کر لکھی گئی ہے" اس نے بڑی اپنائیت سے میرے غم وغُصے کو زائل کرنے کے لئے کہا۔

جھکڑ چلنے لگے۔ خنکی بڑھنے لگی۔ دافع درد دوا کا اثر بھی ختم ہو چکا تھا۔ میری چوٹوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ درد اِتنی شدت سے اُبھرا کہ میں خود اپنے آپ پر رحم کھانے لگا۔ عجیب سانحہ تھا میری زندگی کے سابقہ تجربات سے یکسر جُدا!

ع... جانے کس جُرم کی پائی تھی سزا، یاد نہیں!

بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے غلام حسین سے سرگوشی کی پھر ہم نے تھانے کے باہر قریبی تنور پر جا کر جو ملا کھایا۔ بل غلام حسین ہی نے اصرار کر کے ادا کیا۔

تھانیدار گیارہ بجے کے قریب واپس آیا۔ دریں اثناء چھوٹا تھانیدار بھی واپس آ چکا تھا۔ اس کے ہمراہ دفتر کا کلرک یوسف، ماسٹر عبدالرحیم اور منشی کرم داد کے علاوہ دفتر کا نائب قاصد بھی میری ہمدردی میں تھانے آئے تھے۔ تھانیدار نے اب تیسری مرتبہ مجھے واردات کی تفصیل

بتانے کے لئے کہا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کہا ''جناب! آپ یہ سب کچھ رہنے دیں۔ پہلے آپ کے منشی نے صبح سے شام تک مجھے میڈیکل سرٹیفکیٹ کے چکر میں ڈالے رکھا اور اب تین گھنٹے سے آپ اُٹھنے بیٹھنے کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔''

''اوہو! آپ تو ناراض ہو گئے...... جس کو کانٹا چبھے وہ ہی یقیناً چبھن محسوس کرتا ہے۔ آپ سے زیادتی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ کا تلخ لہجہ قابل فہم ہے۔ لکھ منشی لکھ، میں تمہیں لکھاتا ہوں۔''

تھانیدار نے کچھ نتائج از خود اخذ کیے۔ انھیں قلم بند کرایا اور ہم سب حاضرین کے دستخط کروانے کے بعد اس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ والے پروانے پر نئے سرے سے سول ڈسپنسری بھائی پھیرو کو میرے طبی معائنے کے لئے لکھا حالانکہ میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا میں نے وہ پروانہ لے لیا اور دفتر میں آ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ غلام حسین بھی دفتر کے صحن میں پڑے بنچ جوڑ کر میرے قریب ہی لیٹ گیا۔

میں واقعات کی کڑیاں جوڑتا رہا' نیند نہیں آئی۔ جو کچھ بیت چکا تھا اس کے متعلق سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے سارے ماضی اور سارے تعلقات کے علاوہ اپنے سارے اقدامات کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ اپنی تمام غلطیاں کوتاہیاں اور سرگردانیاں یاد کرتا رہا۔ سوچتا رہا کہ میرا ضلعی افسر مجھ سے کہے گا کہ کیا اس نے مجھے پہلے دن ہی انتظامی امور کی الف بے نہیں سمجھائی تھی۔ میر قمر الدین بھی یاد آئے جو کسی مدرس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ میں نے اپنی مظلومیت، اپنے اضطراب اور اپنے پیچ و تاب کے ایک ایک پہلو پر غور کیا۔ مگر مجھے ردعمل کے طور پر اتنی شدید جسمانی ضربیں اور ذہنی گھاؤ لگانے والی کسی خطا کا کوئی خارجی یا داخلی جواز نہیں ملا' پریشانی میں اضافہ ضرور ہوا۔

میری رپورٹ پر محکمے نے سراج الدین کو فوری طور پر معطل کر دیا اور ساتھ ہی مجھے پتوکی سے لاہور میں بطور اے۔ڈی۔ آئی (ترقیات) تبدیل کر دیا۔ دریں اثناء مجھے پتہ چلا کہ سراج الدین کا اقدام ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا اور ملک فقیر علی کی ترغیب اور تائید ہی سے رونما ہوا تھا۔ جبکہ غلام حسین میرا ہمدرد نہیں سراج الدین کا جاسوس تھا اور اس نے اپنا دوہرا کردار خوب نبھایا تھا۔

☆☆

چالاک اور ہوشیار لوگ بیچ چوراہے میں ڈنکے کی چوٹ اپنے مخالف کی بے عزتی کر دیتے ہیں اور پھر کسی بند کمرے میں جا کر اس سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ معززین سے مظلوم پر اتنا دباؤ ڈلواتے اور اسے عفو درگزر کے ایسے فضائل سمجھاتے ہیں کہ وہ بالآخر چار و ناچار صلح صفائی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ غریب آمادہ نہ بھی ہو تو کیا کرے؟ مقامی افراد تو پردیسی اہلکار پر بھاری ہی ہوتے ہیں۔ سراج الدین نے میرے پاس کئی وفود بھیجے کیونکہ محکمہ میری ہی طرف سے معافی ملنے پر اسے بحال کر سکتا تھا۔

دفتر میں میرے فرائض کی نوعیت ان فرائض سے قطعی مختلف تھی جو اب تک میں بطور اے۔ڈی۔ آئی مدارس انجام دیتا رہا تھا۔ اے۔ڈی۔ آئی (ترقیات) ضلعی سطح پر نئے پرائمری، مڈل اور ہائی مدارس کے قیام، پہلے سے موجود انہی مدارس کی ضروریات کے سامان کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں حکومت کی منصوبہ سازی کے عمل میں شریک ہوتا تھا۔ ہر قسم کے ضروری اعداد و شمار مہیا کرنا اور جاری منصوبوں کی ترقی کی رفتار پر نظر رکھنا اور رپورٹیں اوپر بھیجنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس وقت چلنے والی اسکیمیں مندرجہ ذیل تھیں

۱) نئے پرائمری سکولوں کا قیام
۲) نئے سکولوں کی عمارات کی تعمیر۔
۳) موجودہ عمارات مدرسہ میں توسیع۔
۴) موجودہ سکولوں کو ضروری سامان کی فراہمی۔
۵) لیبارٹریوں اور ٹیکنیکل ورکشاپوں کے سامان کی فراہمی۔
۶) پرائمری اور مڈل مدارس کے درجات بڑھانا اور ہائی سکولوں کو سامان مدرسہ، عملہ اور مزید کمرہ ہائے عمارات کی سہولتیں مہیا کرنا۔

یہ کوئی ایسا کام بھی نہ تھا کہ سمجھا نہ جا سکتا۔ لیکن پھر بھی کوئی اے ڈی آئی اسے قبول کرنے پر رضا نہ تھا۔ میں تو مجبوری کی حالت میں تھا۔ میں پرانی فائلوں کے مطالعے سے کچھ سیکھ رہا تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ اگر میں نے تھوڑے سے تحمل اور بردباری سے کام لیا ہوتا تو آج خلیفہ ایم پی اے میری مٹھی میں ہوتا اور میں کم از کم اس حرام خور تھانے دار کی ٹھکائی تو کرا سکتا تھا۔ سراج الدین اور غلام حسین کو بھی ان کی نانیاں یاد دلوا سکتا۔ میری دادرسی کے لئے میرے پاس کچھ مدرسین بھی آئے جن میں ایک تو خود مرد قلندر عباس علی تھا اور دوسرا پتوکی سب ڈویژن کا ایک میو

مدرس دُراب خان تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ان سے کہوں تو وہ سراج الدین کی ٹانگ توڑ سکتے ہیں۔ اس کی ٹانگ توڑنے کا میرا اپنا پروگرام بھی تھا۔ مگر میں کسی دوسرے کو گواہ نہیں بنانا چاہتا، لیکن اگر اس کی ٹانگ توڑ ہی دی جاتی تو الزام مجھ ہی پر آتا پھر سراج الدین اور میرے فعل میں کیا فرق رہ جاتا؟ یوں حریف کے مقابلے میں مجھے کوئی اخلاقی برتری حاصل نہ ہوتی۔

اے-ڈی- آئی (ترقیات) کے پاس کوئی سب ڈویژن نہ تھی جس کے سکولوں کا وہ معائنہ کرسکتا یا جن کے مدرسین کو وہ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری کام کرنے کے لیے کہہ سکتا۔ بس لے دے کر ایک کلرک (ترقیات) تھا۔ جس کو اے-ڈی- آئی (ترقیات) ہر چھوٹا بڑا سرکاری کام کہہ سکتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کا زیادہ تر تعلق ضلعی افسر ہی سے ہوتا تھا اور وہ سال بھر مختلف گرانٹوں کی رقوم کے خرچ کرنے ہی کا دفتری کام کرتا تھا۔ حکومت غیر ملکی امداد فراخدلی سے شعبہ تعلیم پر خرچ کرر ہی تھی۔ نئے سکولوں کے قیام، موجود سکولوں کی عمارات میں توسیع اور سکولوں کے ساز و سامان کی خریداری کے لئے وافر پیسہ آرہا تھا۔ اس امداد کو ضلعی سطح پر خرچ کرنے کے لیے ایک کمیٹی وضع کی جاتی تھی جس کا سربراہ عام طور پر ڈپٹی کمشنر (ضلع) ہوتا لیکن وہ اپنے فرائض بھی نچلی سطح کے کسی مجسٹریٹ کو سونپ دیتا تھا۔ فنی اعانت کے لئے محکمہ صنعت کا ایک نمائندہ ہوتا۔ کمیٹی کا سیکرٹری ضلعی افسر ہی ہوتا۔ اسی وجہ سے کلرک (ترقیات) ضلعی افسر ہی کے تصرف میں رہتا تھا۔

اے ڈی آئی (ترقیات) پر دوسرے اے ڈی آئی اس لئے ترس کھا کر اسے چائے کی پیالی پیش کرتے یا سلام دُعا لیتے کہ وہ ان کے مدارس کے لئے گرانٹوں کی سفارشات کرے۔ یا کوئی نیا مدرسہ کھول دے یا کم از کم ضلعی افسر سے یہ شکایت نہ کرے کہ اے ڈی آئی حضرات ترقیات کے سلسلے میں مطلوبہ اعداد و شمار اور دیگر متعلقہ معلومات مہیا نہیں کر رہے۔ پھر میں جن حالات میں صدر دفتر آیا تھا ان کی وجہ سے بھی وہ میرے ساتھ دلی نہ سہی ظاہری ہمدردی تو رکھتے ہی تھے آخر وہ تھے بھی تو میرے پیٹی بند بھائی۔

فراغت کے اوقات میں میرے خیالات بے اختیار اپنے ساتھ بیتنے والے سانحے کی جانب بڑھنے لگتے اور میں سوچتا تھا کہ

ع...... عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یعنی میرے ساتھ کبڑے کو لات کاری آنے والی بات ہوئی ہے۔ خلیفہ کا ''دم'' تو چلا

نہیں تھا۔اب عباس علی کی درویشی میرے کام آئی تھی یا سراج الدین کا گھونسہ..... بہر کیف مجھے اس لحاظ سے بڑی طمانیت محسوس ہو رہی تھی کہ میں 'ف' اور خلیفہ کا احسان اٹھائے بغیر لاہور کے ضلعی دفتر میں آ گیا ہوں۔

☆☆

ضلعی افسر تعلیم قاضی نواب علی کی ترقی ہو گئی۔انھیں سنٹرل ماڈل سکول سمن آباد کا صدر معلم مقرر کر دیا گیا۔ابھی وہ نئی اسامی پر فائز نہیں ہوئے تھے کہ میں نے ان سے ان کے گھر واقع وحدت کالونی میں ملاقات کی۔انھیں بتایا کہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ مجھے لاہور میں محض اس لئے تبدیل کیا گیا ہے کہ جملہ اے ڈی آئی صاحبان ترقیات جیسے غیر منافع بخش کام کو ہوّا سمجھتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ضلع بھر کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔اوپر جھوٹی یا عارضی رپورٹیں اس لیے بھیجی جاتی ہیں کہ نچلی سطح سے صحیح اور درست کوائف اور اعداد و شمار حاصل نہیں ہوتے۔ترقیات کے کلرک کو خریداری کمیٹی کے کام ہی سے فرصت نہیں ملتی۔آپ کی مہربانیوں کی وجہ سے میں چُپ چاپ کام نبھا رہا ہوں۔لیکن آپ جا رہے ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی کسی سکول میں لے چلیں...'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''تم نے کام اچھی طرح سنبھال رکھا ہے، مایوسی کی کیا بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔میں نے انھیں دل کی بات بتائی کہ مجھے ایک سب ڈویژن تخلیق کر کے دی جائے تاکہ میں براہ راست اپنے ماتحت مدرسین سے اعداد و شمار اکٹھے کرانے کا کام لے سکوں اور اپنے رفقاء میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاؤں۔وہ مسکرائے اور دفتر سے سنٹرل ماڈل ہائی سکول سمن آباد حاضر ہونے کے لیے اپنی فراغت سے پہلے میرے لئے ستاسٹھ (۶۷) سکولوں پر مبنی ایک سب ڈویژن ''وسطی'' کے نام سے تخلیق کر دی۔

اس مہربانی سے ایک تو میں غیر معمولی طور پر مصروف ہوا، میں دو اُسامیوں پر کام کرنے لگا۔میری سوچ بھی بدلی اور کچھ کچھ شہر لاہور کے فیوض و برکات سے بھی آشنائی ہونے لگی۔دروازے کی کنڈی بجنے لگی، انڈہ، مرغی اور گھی قیمتاً سہی لیکن سستا خالص اور تحفتاً بھی ملنے لگا اور وقت کی رفتار سراج الدین کی لگائی ہوئی ذہنی اور جسمانی چوٹوں پر مرہم رکھتی چلی گئی۔

☆☆

قاضی صاحب کی جگہ پر ریٹائرڈ فلائٹ لیفٹیننٹ آغا عبدالسعید ضلعی افسر تعلیم مقرر

ہوئے۔ فضائیہ کا بندہ ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں سراج الدین کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیا گیا تھا۔ جبکہ میرے اپنے دل میں آغا صاحب کے لئے نرم گوشہ اس لئے تھا کہ وہ علم و ادب کے حوالے سے میرے اول و آخر استاد محترم مولانا عبدالمجید سالک کے داماد تھے۔ وہ اپنے پیش رو کی نسبت ترقیات کے کام کو خاصی اہمیت دیتے تھے اور اس نوعیت کے اجلاس اور نشستوں میں مجھے ساتھ رکھتے تھے۔ میں اپنے زخموں کو ستارے بنانے کے لئے اب پھر سے علمی و ادبی محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ نگینہ بیکری کا چکر صبح و شام لگتا اور وہاں چائے کی چسکیاں بھی چلتیں اور یاران کہن سے تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا۔ پھر رات کو بچوں کے پاس جاتا تو ساری کوفت اور تلخیاں ماند پڑ جاتیں۔ میں اپنے آپ کو ایک نیا انسان محسوس کرتا۔

خلیل جبران کا قول ہے کہ ایسی یادیں جن سے روح کو خوف محسوس ہوتا ہو بھلا دینا ہی بہتر ہے۔ میں نے خود بھی ایم۔ایڈ کی کلاس میں پڑھا تھا کہ یاداشت اگر قدرت کا ایک تحفہ ہے' تو فراموشی اس کا نعم البدل ہے۔ آغا صاحب کے کہنے پر میں نے بڑے تذبذب اور ہچکچاہٹ سے سراج الدین کی درخواست بحالی پر لکھ دیا۔ ''مجھے معطل صدر مدرس سراج الدین کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اِسے ملازمت پر بحال فرمایا جائے۔''

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں نے اسے فی الواقع معاف کر دیا تھا؟ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی سرگزشت میں اس واقعے کا ذکر ہی نہ کرتا اور جب آغا صاحب کا اسی سال ہی کے عین نصف النہار یعنی ماہ جون ۶۷ء میں فوری تبادلہ کر دیا گیا تو اندر خانے میرا دل خوشی سے بلیوں نہ اچھلتا۔ وہ سراج الدین سے نیکی تو کر گئے لیکن لاکھوں کی گرانٹ سے کوششوں کے باوجود ایک پیسہ بھی خرچ نہ کر سکے۔

☆☆

پتوکی میں قیام کے دوران کا یہ دوسرا واقعہ اگرچہ بعد کے کئی سالوں پر محیط ہے لیکن واقعے کی پشین گوئی کے حرف بحرف صحیح نکلنے پر اس کا تعلق اسی دور سے جا ملتا ہے۔ یہ پشین گوئی بلوکی ریسٹ ہاؤس میں ہوئی اور یہ پشین گوئی کو کرنے والے ضلعی افسر معائنہ لاہور تھے۔

مجھے ان کا پیغام موصول ہوا کہ وہ فلاں فلاں سکول کے معائنہ جات کی خاطر فلاں تاریخ کو فلاں جگہ تشریف لائیں گے۔ چونکہ ان کے ساتھ ان کی بیگم اور بچے بھی ہوں گے لہٰذا انھیں بلوکی ہیڈ ورکس کے محکمہ انہار کے ریسٹ ہاؤس میں چھوڑا جائے گا میں ان کے قیام کے

انتظامات بھی کروں اور محکمہ انہار کے افسران سے ریسٹ ہاؤس میں ۲۴ گھنٹے کے لئے ان کے لیے رہائش حاصل کروں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دو راتوں کے لیے آ رہے ہیں، پہلی رات وہ چودھری بشرالدین اے ڈی آئی چونیاں کے انتظامات کے تحت چھانگا مانگا ریسٹ ہاؤس میں گزاریں گے کیونکہ وہ بچوں کو پکنک قسم کی تفریح کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ ذاتی کار پر تشریف لائیں گے۔ بلوکی میں قیام کی رات دوسری رات ہوگی۔ میں نے بشیر الدین صاحب سے پوچھ لیا کہ مجھے ضلعی افسر کے لئے کیا کیا انتظامات کرنا ہوں گے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نفاست طبع کی وجہ سے زیادہ ہی وہمی طبیعت کے ہو گئے تھے۔ آندھی کے جھکڑ شدت سے چلنے کی وجہ سے موسم میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ میں نے ہیڈ ماسٹر مڈل سکول بلوکی اعتماد میں لیا اور اسے ضرورت کی اشیاء معہ بل مہیا کرنے کو کہا۔ جھکڑ چلنے کی وجہ سے خود صاحب بھی مغرب کی نماز کے بعد بلوکی ہیڈ ورکس پر پہنچے۔ ان کی نفاست طبع کے مطابق ان کو چائے پلائی۔ وہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے دو رہائشی کمروں میں فروکش ہو گئے تو میں نے اس مرغی کے متعلق پوچھا جسے انھوں نے کٹوا کر رکھ دینے کو کہا تھا کہ وہ خود اپنے سامنے اس کو دھلوا کر پکوائیں گے۔ کوئلوں کی انگیٹھی کے متعلق پوچھا جس پر بابا محمد دین نے چپاتیاں پکانا تھیں۔ سب کچھ ٹھیک ہی تھا لیکن میں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہ رات ہو رہی ہے۔ افسر کے بچے بھوکے ہوں گے ذبح شدہ مرغی پکوا دی تھی۔ جب ان کو مرغی کے پکوا دینے کی خبر سنائی گئی تو وہ برہم ہو گئے۔

''تم خود ہی کھاؤ......'' انھوں نے مجھے فرمایا۔ ہیڈ ماسٹر کو نئی مرغی لانے کے لیے کہا۔ رات تھی۔ جھکڑ ابھی تک چل رہا تھا۔ وہ سائیکل پر گاؤں گیا۔ مرغی خریدی اور ذبح کر کے کٹوائی۔ واپسی پر اس کی سائیکل خراب ہو گئی۔ ادھر بچوں کی اور ان کی اہلیہ کی بھوک نا قابل برداشت ہو گئی۔ مجبوراً انھیں پکی ہوئی مرغی ہی کھانا پڑی۔ ہیڈ ماسٹر کی لائی ہوئی مرغی اگلے روز کے لئے محفوظ کر لی گئی۔ ہم بھی کھا پی کر لیٹ گئے۔ کوئی آدھی رات ہوئی تو اونچی اونچی آواز میں ڈی آئی صاحب کے بولنے اور گرجنے کی آواز آئی۔ ہم کمروں کی کھڑکیوں تک پہنچے اور سنا کہ وہ اپنے بچوں سے کہہ رہے تھے کہ تمہاری ماں کتیا ہے۔ دیکھ لینا یہ حرامزادی میرے مرنے کے بعد دوسرا نکاح کرے گی۔ یہ گھر اور باہر میں تمیز نہیں کر سکتی ہر وقت اپنی ہانکتی رہتی ہے۔ جو جھگڑا پرسوں چلا تھا وہ کل رات بھی چلتا رہا ہے اور آج بھی اسے ہی چلائے جا رہی ہے۔ اس نے مجھے سونے ابھی

تک نہیں دیا......اسی جھگڑے کو لیے بیٹھی ہے"۔

ہم خاموش کمروں میں چلے گئے۔ بڑی دیر تک ان کی بیگم کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنتے رہے، مشہور تھا کہ بیگم صاحبہ کے نام کافی اراضی تھی اور اپنے شوہر کی نسبت بہت زیادہ امیر تھیں۔

رات گئی بات گئی.......... پھر زمانہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ بیگم وشوہر نے تین بچوں کی شادیاں کر دیں اور ریٹائر ہو جانے کے بعد افسر معہ اپنی بیگم کے زمینوں پر بنی ایک کوٹھی میں رہنے لگے۔ بابا محمد دین ان سے ملنے گیا تو اس نے واپس آ کر بڑی عجیب وغریب باتیں سنائیں لیکن سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ افسر جو کسی کے گلاس میں پانی نہیں پیتا تھا اور چپڑاسی کے ہاتھ صابن سے دھلوا کر اسے روٹی کوئلوں پر سینکنے دیتا تھا۔ وہ افسر اب جب میز پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہوتا ہے تو گھر میں موجود سات کتیا کے بچے اس کے پاوں پر لوٹتے رہتے ہیں اور وہ ان کو بھی لقمے ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

پھر افسر مذکور کا انتقال ہو گیا۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں تھیں۔ ایک لڑکا فوج میں تھا اور دوسرا تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر قریہ قریہ گاؤں گاؤں گھومتا رہتا تھا۔ بیگم صاحبہ اکیلی ہو کر رہ گئی تھیں۔ زمینداری کے سلسلے میں ان کی ملاقات ایک پٹواری سے ہوا کرتی تھی۔ جانے کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ بیگم صاحبہ نے پٹواری سے عقد ثانی کر لیا.......... ان کے شوہر کی سالوں پیشتر کی محکمہ انہار کے ریسٹ ہاؤس بلوکی میں کی گئی پیشین گوئی پوری ہو گئی.......... ہو سکتا ہے ان کے بچوں کو باپ کی یہ پیشین گوئی یاد بھی نہ ہو۔ اور پھر کئی ماہ بعد سنا کہ پٹواری مر گیا اور وہ ایک بار پھر بیوہ ہو گئی ہیں۔ پھر ان کے بارے میں خبر چھپی کہ نامعلوم افراد نے ان کو قتل کر دیا۔ بعض کا خیال ہے کہ انھیں زمین کے جھگڑوں میں قتل کرایا گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ قارئین کو بتانے کی بات صرف اتنی ہے کہ کسی وقت کی زبان سے نکلی ہوئی بات مدتوں بعد بھی پوری ہو سکتی ہے لہٰذا منہ سے ہر کلمہ سوچ سمجھ کر ادا کرنا ضروری ہے۔

☆☆

آغا صاحب کی جگہ مسٹر محمد گلزار بھٹی نئے ضلعی افسر تعلیم مقرر ہو کر آئے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی شہرت میں نے سنٹرل ماڈل سکول میں تعیناتی کے دوران سنی تھی۔ جہاں سے وہ میری آمد سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی پبلک سروس کمیشن کے ذریعے براہ راست سررشتۂ تعلیم مغربی پاکستان کی انتظامیہ میں درجہ دوم کے افسر بن کر آ گئے تھے۔ عام مدرس ملازمت کے لحاظ

سے اس اسامی پر ۲۱ یا ۲۲ سال کے بعد ترقی پاتا تھا۔ ان کے اثر ورسوخ کی بڑی داستانیں مشہور تھیں۔ تعلیم و تدریس کے حوالے سے ان کی کوئی روایت سُننے میں نہ آئی تھی لیکن تعلقاتِ عامہ میں ان کے کمالات مشہور تھے' یہاں تک بتایا گیا کہ جو غیر ملکی معززین، طائفے، صدور اور بادشاہ پاکستان آتے اُن کے اعزاز میں جو استقبالئے، عشائیے دیئے جاتے اور جو ثقافتی مظاہرے منعقد یا محفلیں برپا کی جاتیں بھٹی صاحب ان تمام تقریبات کے دعوت نامے حاصل کر لیتے اور اپنے محکمے کے افسران میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ انھیں جملہ افسر محکمہ تعلیم کا پروٹوکول افسر کہہ کر پکارتے تھے۔ اب تو کئی سال سے وہ فی لواقع افسر تھے۔

خریداری کمیٹی کے معتمد کی حیثیت سے جو کام آغا صاحب گھسیٹ گھسیٹ کر کر رہے تھے وہ انھوں نے رات رات بھر دفتر ہی میں جاگ کر دنوں میں مکمل کر لیا۔ ان کی جان پہچان تقریباً ہر محکمے میں تھی۔ وہ دفتر کے اہلکاروں، اے ڈی آئی صاحبان یا کسی بھی عرضی گزار کو کہتے کہ وہ فلاں دفتر میں فلاں شخص کے پاس جائے۔ ان کا سلام کہے اور اپنا مدعا بیان کرے۔ ۹۹ فیصد کام ان کے حوالے ہی سے ہو جاتے۔ یار لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے یہ تعلقات سنٹرل ماڈل سکول میں قیام کی وجہ سے تھے کیونکہ وہ اپنے ہر طالب علم کے مکمل کوائف جمع کر لیتے تھے۔ کچھ بھی تھا وہ بہر حال ایک کامیاب افسر تھے۔

ہر وہ کام جو اُن کے اپنے قلم سے انجام پانے والا ہوتا اس میں وہ تامّل برت لیتے لیکن اگر اُن کو یہ کہا جاتا کہ وہ فلاں شخص کو فلاں کام کی سفارش کر دیں تو ذرا تامّل نہ کرتے بلکہ خود سائل کے ساتھ جانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

دفتری کام میں ان کی کامیابی ایک پُرانی سیاہ اور موٹی سی ڈائری کی مرہونِ منت خیال کی جاتی تھی جس میں وہ ہر کام درج کرتے یہاں تک کہ ان سرکاری چٹھیوں کو بھی اسی ڈائری میں درج کرتے جو اوپر سے آتیں اور جن کا جواب حکام بالا کو دینا ہوتا تھا۔ علی الصباح دفتر آتے ہی وہ ہر اہلکار سے فرداً فرداً پوچھتے کہ فلاں فلاں چٹھی کا جواب تیار ہوا ہے یا نہیں۔ اگر جواب تیار ہوتا تو پڑھ کر دستخط کرتے۔ چٹھی کی روانگی کا نمبر ڈائری میں درج کرتے اور اندراج پر اس طرح لکیر پھیرتے کہ اندراج باقی بھی رہے تاکہ بوقت ضرورت پڑھا جا سکے۔ ترقیات کے کام کے بارے میں بھی ان کا یہی طریق کار رہا۔ ایک گھنٹہ دفتر میں بیٹھ کر وہ دفتر کو مصروف کرتے، حاضری کی پڑتال کرتے اور پھر دفتر سے نکل جاتے۔ مشہور تھا کہ سیکرٹریٹ میں

چوکیداروں سے لے کر سیکرٹری حضرات تک کومل کر آتے ہیں۔کئی حضرات تو یہ بھی کہتے کہ نوکری کی حفاظت اور ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔

سکولوں کے معائنے کا ان کا اپنا مخصوص طریقہ تھا۔وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی سکول کا انتخاب کرتے اور اے ڈی آئی کو کہتے کہ فلاں سکول میں پہنچے اور صدر معلم کو بتائے کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سرسری معائنہ، ملاحظہ ریکارڈ، پڑتال ترقیاتی کام یا فلاں فلاں سلسلے میں آ رہے ہیں۔ابتدائی کام اے ڈی آئی کو کر لینے کی تاکید کرتے۔ظاہر ہے ان کی آمد تک تمام مطلوبہ کوائف تیار ہو جاتے۔اُنہیں ملاحظہ کرتے۔اگر کوئی شکایت ہوتی تو پوری تحقیق کے بعد ہی رپورٹ مرتب کرتے۔

قصہ کوتاہ کوئی ان کو جُل نہیں دے سکتا تھا۔نہ ہی ان سے کچھ چھپایا جا سکتا تھا۔ہر شخص اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گیا تھا۔بڑے بڑے چلتے پرزے بھی دھیمے پڑ گئے تھے۔دفاتر میں ماتحت عملہ افسروں کے مزاج کے مطابق چلتا ہے۔حق بات بھی نہیں کہتا۔"جی ہاں، جی حضور، بجا فرمایا، سچ کہا" کی گردان کرتا ہے۔محکمہ تعلیم پڑھے لکھے لوگوں کا محکمہ ہے لیکن اس میں بھی اُتنا ہی حبس ہے جس قدر کسی بھی بدنام محکمے میں ہو سکتا ہے۔ہر افسر اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتا ہے۔اور کسی کے مشورے پر عمل نہیں کرتا، ہاں مِسل پر اگر کچھ لکھا آ جائے جو نظر انداز نہ کیا جا سکے تو بات اور ہے۔میں اپنی سب ڈویژن اور ترقیات کے تمام کاموں میں لکھ کر تجویز پیش کرتا پورے دلائل دیتا اور تقریباً سب کاموں میں بھٹی صاحب متفق ہو جاتے۔اگر متفق نہ ہوتے تو 'بات کریں' لکھ دیتے۔

ع.....خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اچھے اور برے' ناقص اور کامل' بددیانت اور ایماندار اہلکار ہر محکمے میں نظر آتے ہیں۔ ملال یہ ہے کہ تعلیم جیسا مقدس محکمہ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔افسوس! کہ تعلیم و تدریس کے مقدس پیشے کی منصوبہ بندی اور تعمیر و ترقی میں گھپلے کرنے والے ذمہ دار لوگ بھی کثرت سے دیکھنے میں آئے ہیں۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو ترقیاتی گھپلوں یا رویوں کی مثالیں پیش کروں میں آپ کو ترقی دیہات اکادمی پشاور لے چلتا ہوں جہاں اے ڈی آئی (ترقیات) کی حیثیت سے مجھے چھ ہفتے کا ایک کورس کرنے کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۲۹)

ترقی دیہات کی اکادمی میں

ترقی دیہات اکادمی، پشاور کے بارے میں تفصیلات چوہدری رفیق احمد ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز سے حاصل کیں جو چھ ماہ قبل ہی اکادمی سے ریفریشر کورس کر کے آئے تھے۔ انھوں نے کورس کی افادیت اور اکادمی کے دلچسپ طریق کار کی اس قدر دلکش وضاحت کی کہ میں بے تابی سے پشاور روانگی کا انتظار کرنے لگا۔ عارضی طور پر ترقیات کے کام کی ذمہ داری چوہدری غلام حیدر المعروف ''رتہ'' کو سونپی گئی۔ دفتر سے سفری اخراجات کا بل پیشگی وصول کیا اور مقررہ تاریخ پر بذریعہ خیبر میل پشاور روانہ ہوا۔ میری زندگی کا یہ پہلا سفر تھا جس پر میں کسی سے قرض لے کر نہیں نکلا تھا۔

راولپنڈی اسٹیشن سے ایک لمبا تڑنگا شخص سوار ہوا اور میرے مقابل کی نشست پر بیٹھ گیا۔ گاڑی یا بذریعہ بس سفر کے دوران میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں دائیں جانب کھڑکی کے ساتھ اس رخ کی طرف منہ کر کے بیٹھوں، جدھر گاڑی یا بس جا رہی ہو۔ خیبر میل میں بھی مجھے ایسی ہی نشست مل گئی تھی۔ روالپنڈی کے اسٹیشن پر میں نے ڈائنگ کار کے بیرے کو چائے لانے کا کہہ دیا تھا۔ بیرا چلتی ریل میں چائے لے کر آیا۔ جب وہ چائے کا ٹرے میری طرف بڑھانے لگا تو نہ جانے کیا ہوا کہ چھلک جانے کی وجہ سے چائے میرے کپڑوں پر گر گئی اور ٹرے فرش پر جا گرا۔ بیرے نے معذرت کی اور میرے کپڑے اپنے رومال سے صاف کرنے لگا۔ میں نے کہا ''کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔'' بیرا چلا گیا تو اس لمبے تڑنگے آدمی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اگر بیرا مجھ پر چائے گراتا تو میں اُسے اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیتا۔''

میں نے نرمی سے کہا ''تو کیا اس طرح آپ کے کپڑے صاف ہو جاتے؟ صاف تو کیا

ہوتے اُلٹا آپ کے دامن پر خون کے دھبّے لگ جاتے۔‘‘

وہ خاموش ہوگیا۔ بیرا دوبارہ چائے لے کر آیا‘ تو میں نے اس شخص کو بھی چائے کی دعوت دی۔ اس نے بیرے کو گھور کر دیکھا اور محتاط ہونے کی ہدایت کی اور میری دعوت قبول کرلی۔ باتیں شروع ہوئیں تو پتہ چلا کہ وہ راولپنڈی میں اے ڈی آئی (ترقیات) ہے اس کا نام نثار اختر زیدی ہے اور وہ بھی ترقی دیہات اکادمی میں اسی کورس میں شرکت کے لئے جارہا ہے۔ جس میں شرکت کے لئے میں جارہا تھا پشاور پہنچنے تک ہم ایک دوسرے سے اچھے خاصے واقف ہو چکے تھے۔ پشاور کے ریلوے اسٹیشن پر ترقی دیہات اکادمی کی گاڑی کھڑی تھی وہ ہمیں اکادمی لے گئی۔

☆☆

اکادمی برائے ترقی دیہات پشاور میں ۷-اگست سے ۱۶ ستمبر ۶۷ء تک ہونے والے کورس میں شرکت کی غرض سے قومی تعمیر کے تمام محکموں سے سب ڈیژن، تحصیل، ضلع اور ڈویژن کی سطح کے افسر آئے تھے۔ مثال کے طور پر اختر زیدی اور میں سب ڈویژن سطح کے نان گزیٹڈ افسر تھے۔ قاضی نواب علی کراچی میں ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تھے‘ وہ بھی تشریف لائے تھے۔ گوجرانوالا سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر ضلعی سطح کے افسر بھی شامل تھے۔ اسی طرح باقی تمام محکموں کے چھوٹے بڑے افسر پاکستان بھر سے شامل تھے۔ مشرقی پاکستان سے تو چند محکموں کے سیکرٹری صاحبان بھی شریک ہوئے تھے۔ خواتین بھی تھیں۔ اکادمی کے وسیع کیمپس میں مندوبین کی رہائش کا عمدہ انتظام تھا۔ اکادمی اسلامیہ یونیورسٹی پشاور کے بالمقابل اس سڑک پر واقع ہے جو پشاور سے جمرود ہوتی ہوئی طورخم تک جاتی ہے۔

ابتدائی تعارفی کلاس میں ہمیں سرحد کی ثقافت اور روایات سے آگاہ کیا گیا کہ دوران تربیت ہمیں کیا امور پیش نظر رکھنا ہوں گے‘ کب ہم اکادمی سے باہر جاسکیں گے اور کب تک ہمارا واپس آنا ضروری ہے۔ تربیتی کورس میں کیا کچھ شامل ہوگا۔ ہمیں یہ مژدہ بھی سُنایا گیا کہ کورس کے اختتام پر جملہ مندوبین کو افغانستان کی سیر بھی کرائی جائے گی تاکہ ہم پاکستانیوں کو افغانستان کی حالت دیکھنے کے بعد وطن عزیز پاکستان کی اہمیت کا احساس ہو۔ واقعی یہ بڑا سبق آموز پروگرام تھا۔ اس کے خالق اسلامیہ یونیورسٹی پشاور کے وائس چانسلر چودھری محمد علی تھے۔

اکادمی میں کچھ انسٹرکٹر تو خصوصی طور پر اکادمی کے تدریسی اور عملی کام کے لئے پبلک

سروس کمیشن کے توسط سے مہیا کئے گئے تھے۔ جبکہ کچھ اہم آسامیاں سول سروس آف پاکستان کے افراد کے لئے مخصوص تھیں۔ اس وقت اکادمی کے ڈائریکٹر فرید اللہ شاہ تھے جو کمشنر لاہور ڈویژن رہ چکے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ملازمت کے امیدواروں اور ملزموں سے نماز اور دعائے قنوت سُنا کرتے تھے جو سُنا دیتا اس سے اپنے فیصلوں میں نرمی برتتے تھے۔ ان سے قبل اکادمی کے ڈائریکٹر مسعود کھدر پوش تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ واحد آئی سی ایس افسر تھے جنہوں نے جنوبی ہند میں بھیل قوم کو مہاجنوں کے چنگل سے نجات دلائی اور اپنی اس کارکردگی کی وجہ سے وہ ''مسعود بھگوان'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ہمیں تربیت کا پورا منصوبہ ایک معلوماتی کتابچے کی شکل میں دیا گیا۔ ہم کو اسی کے مطابق اپنا روزانہ کا کام کاج کرنا ہوتا تھا۔ دیہی معاشرے میں پائی جانے والی سرگرمیوں میں مختلف قومی تعمیر کے محکموں کا جو کردار ہوتا ہے ان میں باہمی رابطہ، تعاون، تنظیم اور نظم و ضبط جیسے امور پر تدریس کی جماعتوں میں شمولیت کے علاوہ جملہ مندوبین اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔ میں نے وہاں کمشنروں، سیکرٹریوں اور ڈویژن کی سطح کے دیگر افسروں کو بیلچوں، کسیوں، کھرپوں اور تنگلیوں سے کام کرتے دیکھا۔ سب خوشی خوشی بھاگ دوڑ کر زرعی اوزار اٹھاتے اور اکادمی کے وسیع کھیتوں میں گھس جاتے۔ مرغیوں کے ڈربے اور بیل بکریوں کے باڑے بھی صاف کرنے پڑتے اور کوئی گلہ شکوہ نہ کرتا بلکہ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور قہقہے لگاتے۔ مل جل کر کام کرنا بھی کتنا بابرکت اور مسرت بخش عمل ہوتا ہے۔ اس کا ٹھیک اندازہ اکادمی ہی میں ہوا۔ اکادمی نے حقیقی معنوں میں صوبہ سرحد کی دیہی زندگی میں انقلابی نظریاتی اور عملی کام کیا تھا۔

تعلیمی اور اکتسابی حوالوں سے چند مشاہدات کا ذکر درج ذیل ہے۔

☆☆

اکادمی کے تعاون اور رہنمائی میں واڑہ لسونا (ننھے منے ہاتھ) کی تحریک زیادہ تر ابتدائی سکولوں میں رائج تھی۔ تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ بچے سکولوں سے ملحقہ قطعاتِ اراضی میں مختصر پیمانے پر سبزیاں، پھل، گنا، جوار، باجرہ اور مکئی کی فصلیں اگاتے۔ حاصل شدہ سرمائے کو تنظیم اِمدادِ باہمی کی مقامی شاخ میں رکھا جاتا اور پھر اُسے طلبہ ہی کی بہبود پر خرچ کیا جاتا۔ بعض سکولوں میں ماہی پروری کے تالاب اور مرغی خانے بھی موجود تھے۔ طلبہ مخصوص

کاپیوں پر اپنی ان غیر نصابی سرگرمیوں اور اپنی روزانہ کی عملی کارگزاری کا اندراج کرتے۔ بتایا گیا کہ واڑہ لسونا کی تحریک نے بہت سے سکولوں کو ہر قسم کی بیرونی امداد سے بے نیاز کر دیا ہے اور بچوں میں نہ صرف اعتماد پیدا کیا ہے بلکہ ضرورت مند بچوں کو خود کفیل بھی بنا دیا ہے۔

☆☆

کورس کے شرکاء کے مختلف گروپوں کو مختلف منصوبوں پر کام کرنے والی امداد باہمی کے مراکز کی معلوماتی سیر کرائی گئی۔ میں جس گروپ میں شامل تھا اسے ایک روز چارسدہ کی امداد باہمی کے مرکز لے جایا گیا تاکہ ہم وہاں ایک انوکھا مطالعہ اور مشاہدہ کر سکیں۔ علاقے کے کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کی بہبود کے لئے انجمن امدادِ باہمی نے کئی منصوبے شروع کر رکھے تھے لیکن اس روز ہمیں ایک ایسے منصوبے کی تفصیلات بتائی گئیں جو ناکامی سے تو دوچار ہوا تھا لیکن اس نے لوگوں کے حوصلوں کو پست نہیں کیا تھا۔ انجمن امداد باہمی کے مقامی صدر کو ہم سے خطاب کرنا تھا لیکن وہ قریب ہی کہیں مصروف تھے۔ ان کا پیغام آیا تھا کہ اُن کی آمد تک ہم انجمن کی طرف سے دیئے گئے کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ ابھی ہم ان کے پیغام کی تکمیل نہیں کر پائے تھے کہ وہ بھی تشریف لے آئے۔ خود بھی بھاری بھر کم تھے اور سر پر پگڑی بھی بھاری ہی باندھے ہوئے تھے۔ چہرے مہرے سے ایک ذہین دیہی رہنما لگتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہماری آمد کے وقت انجمن امدادِ باہمی کے لئے حصّص کی صورت میں لئے ہوئے قرض کو چکانے میں مصروف تھے۔

''خان صاحب!'' ہمارے انسٹرکٹر نے کہا، ''آخر آپ ہار ہی گئے۔''

''نہیں پروفیسر صاحب! اسے ہار نہ کہئے۔ بلکہ یہ ہماری ایک اور کوشش کی ابتدا ہے''

خاں صاحب کا جواب بڑا مدبرانہ اور فلسفیانہ تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔ ہمارے انسٹرکٹر نے خان صاحب سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اپنی کوشش اور ناکامی کے معاملے سے آگاہ فرمائیں کیونکہ یہ معلومات اکادمی میں زیرِ تربیت شرکاء کے لئے مفید ثابت ہوں گی کہ یہ مندوبین بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں قومی تعمیر کا کام کر رہے ہیں۔

خاں صاحب نے بتایا کہ ان کی تحصیل کا زمیندار اور کاشتکار طبقہ ہمیشہ ہی سے نوکر شاہی کے شاطرانہ حیلے بہانوں اور سیاسی چالوں کا شکار رہتا ہے۔ اس پسے ہوئے طبقے نے ماضی میں اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لئے برسرِ اقتدار طبقے سے کئی چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑی

ہیں۔کبھی کامیاب ہوئے، کبھی پسپا بھی ہوئے۔اب کے گمبھیر مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔وہ اسی سلسلے میں مصروف تھے۔ تفصیل اس اجمال کی خاں صاحب نے یوں بیان فرمائی:۔

''نوکرشاہی ہمیں مشورہ دیتی ہے کہ ہم گنے کی بجائے دوسری فصلیں کاشت کریں تاکہ گنے کی کھپت کا مسئلہ جو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے پیدا ہی نہ ہو۔اب نوکرشاہی کو کون بتائے کہ ہمارے خطے کی زمین میں پیدا ہی گنا اور تمباکو ہوتا ہے۔دونوں اشیاء کی مصنوعات یعنی چینی اور سگرٹ بنانے کی فیکٹریاں مردان میں ہیں۔ہوتا یہ ہے کہ جب گنے کی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو چینی کے کارخانے کو مرمت کی خاطر بند کر دیا جاتا ہے۔گنے کی خریداری سے معذرت کر لی جاتی ہے۔ہم مجبوراً گنا بیلتے ہیں۔گڑ اور شکر کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔دور دراز کی ملوں میں گنا بھیجنے پر جتنا خرچہ آتا ہے اتنی آمدن نہیں ہوتی۔کارخانے کی بندش کی وجہ سے چینی کی مصنوعی قلت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں کارخانے میں پڑی گندی اور ناکارہ چینی پورے داموں بک جاتی ہے اور تاجر مقررہ نرخوں سے زائد قیمت پر خرید و فروخت کرنے لگتے ہیں۔

وقت گزرتا رہتا ہے حتیٰ کہ موسم برسات آ جاتا ہے۔ہمارے گڑ اور شکر کے ذخیرے فضا کی نمی سے شیرہ بن کر بہنے لگتے ہیں۔کارخانے کے مالکان کو ہماری حالت پر رحم آ جاتا ہے اور وہ کسان بھائیوں کی ''خدمت'' کے جذبے سے گڑ اور شکر کے ڈپو قائم کر دیتے ہیں۔مجبوراً ہم ان کے مقرر کردہ بھاؤ پر اپنے ذخیرے بیچ دیتے ہیں وہ گڑ اور شکر کو چینی کی تیاری کے آخری مرحلے سے گزار کر عجلت سے چینی تیار کر لیتے ہیں۔قلت کی وجہ سے حکومت سے قیمت بھی بڑھوا لیتے ہیں۔اس وقت چینی میں اجارہ داری بھی 'ہوتی برادران' کی ہے وہ اپنے ہی بھائی بند ہیں مگر تمباکو اور چینی کے کارخانوں کے مالک' تاجر اور ہمارے سیاسی رہنما بھی ہیں۔

ہم نے روزمرہ کے اس مسئلے کا حل سوچا اور امداد باہمی کی بنیاد پر چارسدہ میں چینی کا کارخانہ لگانے کے کام کا آغاز کیا۔خود سرمایہ اکٹھا کیا، کچھ حبیب بنک سے قرضے کی بات کی۔ایک وفد بیرون ملک گیا اور شوگر مل کا مکمل سودا کر آیا۔حکومت نے بھی اجازت دے دی لیکن چینی کے تاجروں نے صدر ایوب کو سیاسی بنیادوں پر اس قدر دبایا کہ اب چارسدہ میں لگنے والا کارخانہ حیدرآباد میں لگ رہا ہے اب ہم حصہ داروں کو ان کے حصص کی رقوم واپس کر رہے ہیں۔یہ ہماری پہلی کوشش کی ناکامی ہے اور دوسری کوشش کی ابتدا ہے کیونکہ اقتدار کسی ایک کے گھر کی لونڈی بن کر نہیں رہتا۔ہم کوشاں رہیں گے اور چارسدہ میں کارخانہ لگا کر رہیں گے۔

موجودہ حکمرانوں کے بارے میں کسان برادری کو اب تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اب ہم اپنا ووٹ سوچ سمجھ کر استعمال کریں گے۔ (عرصہ ہوا چارسدہ میں چینی کا کارخانہ لگ چکا ہے۔)

خاں صاحب سے سوالات ہمیں کرنے تھے لیکن خان صاحب ہی نے ہم سے ایک سوال کر کے ہمیں لاجواب کر دیا کہ کیا کبھی چینی کے صارفین اور گنا پیدا کرنے والے کسانوں پر یہ راز کھل سکتا ہے کہ کارخانوں کے مالک اور اربابِ سیاست کس طرح ان کو احمق بناتے اور مال کماتے ہیں؟

☆☆

پشاور کے مضافات میں ہمیں اس دور کے جدید زرعی منصوبوں کے مرکز ''ترناب فارمز'' پر بھی لے جایا گیا۔ وہاں ہمیں ڈائریکٹر اور دیگر زرعی سائنس دانوں نے زرعی تجربات سے نہ صرف زبانی آگاہ کیا بلکہ اپنے تجربات کی عملی صورتیں بھی دکھائیں۔ ترناب فارم کے تمام اہلکار محنت اور امید کے جذبے سے سرشار تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ وقت دور نہیں جب وہ علاقے میں پیدا ہونے والے پھلوں کی ایسی قسمیں تیار کر لیں گے جو بین الاقوامی منڈیوں میں اپنا مقام پیدا کریں گی اور آج سے دس گنا زیادہ مقدار میں پیداوار دیں گی۔ ان کی شکل وصورت، قدوقامت، صحت وصفائی اور پختگی کے مدارج عالمی منڈیوں کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے۔ ان کی برآمدات سے ملک کو کثیر زرمبادلہ میسر آئے گا۔

ایک نوجوان زرعی انجینئر اور سائنسدان نے خوبانی پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈگری غیر ملکی تھی لیکن ہماری سیر کے روز ہی اس ڈاکٹر کے اعزاز میں ترناب فارم نے اسے ''خوش آمدید'' کہنے کی تقریب منعقد کر رکھی تھی۔ ہمیں بھی اس تقریب میں شریک کیا گیا۔ شرکاء نے اس ہونہار جوان سے کئی سوالات پوچھے۔ دوسروں کی طرح میں بھی ان سوالات وجوابات سے مستفید ہوا۔ ایم۔ ایڈ کے جس کورس سائنس I میں مجھے اے گریڈ ملا تھا اس کی تدریس کے دوران میں نے مٹی کے تجزیئے اور نباتات کے خلیوں کے نیوکلیئس کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں میری ان معلومات پر تجربات کا رنگ ترناب فارم میں چڑھا۔ وہاں بیکروں میں پودوں، بیجوں اور ان کی نشوونما کے مراحل کو میں نے بے شمار حالتوں میں دیکھا۔ بیکروں میں پودوں، بیجوں اور پھلوں پر کیمیکلز کے استعمال کے منفی اور مثبت نمو نے بھی محفوظ کئے گئے تھے جو انتہائی معلوماتی نوعیت کے تھے۔

ترناب فارم کی ان تجربہ گاہوں اور نمائش گاہوں کے علاوہ پھلوں اور پھولوں کے باغات خوبصورتی اور رکھ رکھاؤ کے حوالے سے جنت نظیر تھے۔ جن سے دیکھنے والوں کے ذوق جمال کی بھی تسکین ہوتی تھی۔

☆☆

یہ وحدت پاکستان کا فیضان تھا کہ پنجاب کا ایک درجہ اول کا افسر کراچی میں تھا اور دوسرا اس کا ہم منصب پشاور میں۔ دونوں ہی ڈویژنل انسپکٹر تھے۔ ایک قاضی نواب علی تھے جو سال بھر پہلے میرے ضلعی افسر تھے اور دوسرے ظہور الحق فاروقی تھے جو ضلع سیالکوٹ میں میرے ضلعی افسر رہ چکے تھے۔ کراچی والے تو کورس کرنے آئے تھے۔ جبکہ پشاور والے وہیں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے قاضی صاحب اپنی کار ساتھ لائے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر اس کار کو اکادمی میں کھڑا کیا تو بیگار میں استعمال ہوگی۔ لہٰذا اُنھوں نے مجھ سے اور زیدی سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ہم ظہور الحق فاروقی سے ملاقات کر کے کسی قریبی سکول میں کار کھڑی کرنے کے لیے محفوظ جگہ حاصل کریں اور اسے وقت کی پابندی کے بغیر حاصل بھی کیا جا سکے۔

ظہور الحق فاروقی صاحب نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے پشاور کے چھتر کبابوں کے علاوہ وہ تکے بھی کھلائے جنہیں اُمراء اپنے عزیزوں کو غیر ممالک میں تحفے کے طور پر ہوائی سروس سے بھیجتے ہیں۔ باتیں کرنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں تھا۔ ہماری طرح وہ بھی سرحدی لوگوں کی سوجھ بُوجھ اور تعلیمی ترقی پر حیران تھے۔ انھوں نے وہاں کے دیہی سکولوں اور کالجوں کو پنجاب کے دیہی سکولوں اور کالجوں سے کئی لحاظ سے بہتر پایا تھا۔ ہماری شاندار تواضع اور اپنی خدمات پیش کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول پشاور کے صدر معلم سے ملنے کو کہا سے جنہیں پہلے ہی فون کر دیا گیا تھا۔

میں نے اور زیدی نے فاروقی صاحب سے ڈویژنل انسپکٹر کی طرف سے کھلا خط لیا کہ اگر ہم پشاور ڈویژن کے کسی سکول کو دیکھنا چاہیں تو کہیں بھی جا کر عملہ سکول سے مل سکیں۔ اس کھلے خط سے ہم نے خوب استفادہ کیا۔

☆☆

گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کے طویل قامت لیکن دبلے پتلے اور تیز طرار صدر معلم نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہماری آمد کا مقصد ان کو پہلے ہی فاروقی صاحب نے بتا دیا

تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم فاروقی صاحب کی بجائے خود ہی ان سے ملنے آتے تو ہماری خدمت کر کے ان کو زیادہ خوشی ہوتی۔ زبردستی خالص پشاوری چائے پلائی، ہمیں سکول کی عمارت اور کام کرتی جماعتیں دکھائیں۔ سکول کی تاریخ بتائی۔ حیران کن بات یہ بتائی کہ وہ جس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے یہ وہ کرسی تھی جس پر علامہ عنایت اللہ مشرقی بانی خاکسار تحریک بیٹھا کرتے تھے۔ علامہ صاحب جرمنی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے اسی سکول کے صدر معلم مقرر ہوئے تھے۔ یہ کرسی انھوں نے خود بنوائی تھی۔ صدر معلم اسے سکول کا تاریخی ورثہ قرار دیتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ صاحب اس کرسی کے علاوہ پشاور کی فضا میں ملک وملت کی خدمت کا جوش وجذبہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ ابتدا میں وہ ان کے رفیق کار رہے تھے اور اِسی لحاظ سے اب وہ ان کے ورثے کے محافظ بھی تھے۔

☆☆

چودھری محمد علی وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی پشاور نے یونیورسٹی کے لائبریری ہال میں حاضر ہونے کی دعوت اس لئے دی تھی کہ مشرقی ومغربی پاکستان کے قومی تعمیر کے محکموں کے نمائندے اسلامیہ یونیورسٹی کا تفصیلی مطالعہ اور معائنہ بھی کریں۔ ورنہ سڑک کے پار اکادمی کے ہال میں جانا ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ چودھری محمد علی پاکستان سے محبت کرنے والی شخصیت تھے۔ خاص وعام میں ان کے احترام کا ایک خاص مقام تھا۔ ابتدا میں انھوں نے شرکاء میں سے چند منتخب افراد کا تعارف ان کی سرکاری ذمہ داریوں کی تفصیل کے حوالے سے حاصل کیا۔ ازاں بعد انھوں نے اپنی فی البدیہہ تقریر میں تازہ معلومات کے حوالوں سے خوب رنگ بھرا۔ ہمیں بتایا کہ ہم اپنے اپنے مقام پر تحریک پاکستان جیسے جوش وجذبے سے کام کریں۔ انھوں نے اپنی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اکادمی کے مشیر ہونے کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان سے یہ اجازت حاصل کر چکے ہیں کہ اکادمی کے شرکاء کو افغانستان کی سیر کرائی جائے تاکہ پاکستان کے سرکاری حکام حقائق کی روشنی میں ازخود یہ فیصلہ کر سکیں کہ وہ افغانوں کے مقابلے میں جنت ارضی میں رہ رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا اس سیر سے کورس میں شامل ہونے والوں کے دل ودماغ میں لاشعوری طور پر پاکستان کی محبت اور زیادہ بڑھ کر پختہ ہو جائے گی۔ ماضی میں کئی گروپ افغانستان جا چکے تھے اور ان کے تاثرات پر مبنی کئی کتابچے اکادمی میں موجود تھے۔ جو چودھری محمد علی کے خیال کی تائید کرتے تھے

☆☆

میری موجودہ چچی کی والدہ لنڈی کوتل کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میں پشاور آنے سے پہلے اس بوڑھی خاتون سے مل کر آیا تھا اور انھوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر میں ان کے بھانجے یوسف خاں جس کی صدر بازار میں سائیکلوں کی دُکان ہے، سے مل لوں گا تو مجھے پشاور میں اجنبیت کا احساس نہیں رہے گا۔ ابتدا میں تو یوسف خاں سے ملاقات کے لئے وقت ہی دستیاب نہ ہوسکا لیکن ایک روز میں اور زیدی اس سے جا ہی ملے۔ منحنی سا وہ نوجوان اندر سے آریائی نسل کا عظیم انسان تھا۔ وہ تو بچھ بچھ گیا جیسے ہم لاہور سے نہیں مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ سے آئے ہوں۔ اس کے اصرار پر مجھے اس کے گاؤں بھی جانا پڑا جہاں اس کے عزیزوں اور کنبہ والوں سے ملاقات ہوئی۔ اس کے اہل خانہ اردو یا پنجابی نہیں سمجھتے تھے لیکن اُن کی آنکھوں کی چمک ان کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ یوسف خان ان کی ترجمانی کرتا رہا۔ انھوں نے میرا اتہ پتہ اور تعارف بالکل پنجابی عورتوں کی طرح حاصل کیا۔ ان کی بات اختتام تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اس بے لوث ملاقات اور محبت کی کیفیات آج بھی یاد آتی ہیں تو دل ودماغ میں چراغاں ہوجاتا ہے۔

یوسف خاں کے پاس ایک پرانی بھاری فوجی موٹر سائیکل تھی۔ زیدی نے کہا کہ وہ اس موٹر سائیکل کو چلانے پر قدرت رکھتا ہے اگر یہ مل جائے تو ہم پشاور کے مضافات کو کھنگال ڈالیں گے۔ فاروقی صاحب کا کھلا خط ہمیں بہت کام دے گا۔ یوسف نے ہماری کھسر پھسر سُن لی اور موٹر سائیکل میں پٹرول بھروا کر ہمارے حوالے کر دی۔ زیدی نے موٹر سائیکل مہارت سے چلا کر میرا اعتماد حاصل کیا۔ اب ہم اس پر روزانہ کسی نئی سمت نکل جاتے اور سورج ڈوبنے پر واپس آتے۔ ایک دن موٹر سائیکل کے پلگ میں کچرا آ جانے اور اسے صاف کرنے کے باعث ہمیں دیر ہوگئی تو کار میں سوار ایک آدمی نے ہمیں روک کر کہا۔ ''احمقو! تم بڑے نخرے سے موٹر سائیکل پر باتیں کرتے جا رہے ہو جلدی اس علاقے سے نکل جاؤ ورنہ قبائلی تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے۔''

مجھے اچانک یاد آیا کہ اکادمی میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ مقررہ وقت کے بعد قبائل کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم جلد ہی پاکستانی چوکی پر پہنچ گئے۔ لیکن ہمیں یہ حسرت نہ رہی کہ ہم نے پشاور اور اس کے گردونواح کی سیر نہیں کی۔ اکثر ایسے اوقات میسّر آجاتے جب ہم کسی نہ کسی سکول جا پہنچتے۔ فاروقی صاحب کی چٹھی دکھا کر ہم سکولوں کا معائنہ بھی کر

ڈالتے۔ کتابِ ملاقات کا پوچھتے وہ ہمیں کسی سکول میں نہیں ملی۔ لاگ بک ہم لکھ نہیں سکتے تھے تاہم کئی مدرسین نے خود اپنے سکولوں کے متعلق ہمارے تاثرات ہم سے قلمبند کرائے۔ مجھے واڑہ لسونا کی تحریک ہی یاد تھی۔ میں بچوں کی قابل رشک صلاحیتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ ایک بچہ ایسا ملا جس نے ایک رائفل خود بنائی تھی۔ اس کے پاس اس سلسلے میں پولٹیکل ایجنٹ کی طرف سے عطا کردہ ایک سند بھی تھی۔

موٹر سائیکل پر سیر سپاٹوں کے دوران سکولوں کے اساتذہ نے کبھی ہمیں کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں اٹھنے دیا۔ ایک گاؤں سے ہمیں گڑ اور شکر سے تیار کردہ تمباکو ملا جو میں نے اپنی چچی کی والدہ کے لئے سنبھال لیا۔ وہ حقہ نوشی کرتی تھیں اور اس تحفے کو اپنے وطن کی سوغات جان کر بڑی خوش ہوئی تھیں۔ اس تمباکو میں سے کچھ حصہ انھوں نے میرے چچا (اپنے داماد) کو بھی دیا اور کہا ''محمد صادق! ساری عمر حقہ پیتا رہا ہے' ذرا اس سرحدی سوغات کا مزہ بھی چکھ...... اور سچ سچ بتانا کہ اس کا لطف اور سرور کیسا ہے۔''

☆☆

اکادمی نے بھی ہمیں خوب مطالعاتی دورے کرائے۔ میں نے وطن عزیز کے قبائلی اور شمالی علاقہ جات انہی ایام میں دیکھے۔ ان کا تقابل اپنے میدانی علاقوں سے کیا۔ معلومات کا خزانہ حاصل کرنے سے ذہنی افق بھی وا ہوئے۔ میرے ساتھ چند مناظر آپ بھی دیکھئے جو میری ان دنوں کی لکھی ڈائری میں سے انتخاب ہیں۔

یہ جمرود ہے...... چرس کے تھیلے' کاربین' پستول اور بے شمار سمگل شدہ اشیاء کھلے بندوں بک رہی ہیں۔ آزاد قبائلی لوگوں کی دکانیں دیکھ کر میں جمرود کے قلعے کے قریب باب خیبر کی جنوبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر مغرب کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے سامنے خشک اور پتھریلے پہاڑوں کا وہ سلسلہ تھا جسے پامیر کہتے ہیں اسی سلسلے میں چھبیس میل آگے تک درہ خیبر پھیلا ہوا ہے۔ صدیوں کی تاریخ سمیٹے یہ درہ قدیم وجدید کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ سڑک کے کنارے ابھی تک ہزاروں لوگ غاروں میں رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر پتھروں کا زمانہ یا تاریخ سے پہلے کا دور یاد آتا ہے...... لنڈی کوتل پہنچیں تو وہاں زندگی کی سہولتوں پر مبنی بے شمار سمگل شدہ اشیاء منڈی میں دکانوں پر سجی ملتی ہیں۔ ولائتی گرم کپڑا' پریشر ککرز' سائیکل اور مروجہ الیکٹرونک آلات کے ڈھیر لگے ہیں۔ یہ مال ہر سال کسی نہ کسی طریقے سے پابندیوں کے

باوجود پاکستان بھر میں پہنچ جاتا ہے۔ قبائلی پٹھان خود ہی پہنچا دیتے ہیں۔ یہ کاروبار سرحد کا خوشحال طبقہ کرتا ہے۔ ایک واضح معاشرتی عدم توازن ہر مقام پر روشن نظر آتا ہے۔

معاشرتی عدم توازن کے باوجود کئی تہذیبوں کے رنگ لئے ہوئے قبائلی نوجوان اپنے پھٹے پرانے لباس میں بھی یونانی دیوتاؤں کے روپ معلوم ہوتے ہیں۔ اس درے کی راہ آریہ یونانی اور مسلمان فتح ونصرت کے شادیانے بجاتے برصغیر آتے رہے...... لیکن قبائلیوں کو کوئی زک نہ پہنچا سکے۔ برطانوی فوجیں جدید اسلحہ کے باوجود اُن سے دب کر رہیں۔ آج بھی نوجوان قبائلی اپالو دیوتا اور ان کے سردار زیوس سے کم نہیں...... وہ فطرت سے پیار کرتے ہیں اور اسلامی روح سے سرشار ہیں۔ ان کی اپنی اقدار ہیں۔ وہ مظلوم کو پناہ دیتے ہیں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کے اصول قصاص پر عمل کرتے ہیں اور مہمان نوازی ان کا طرہ امتیاز ہے۔

☆☆

میں ورسک سے جمرود جانے والی سڑک پر زیدی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں لیکن میں سڑک کے اردگرد پھیلے ہوئے کھیتوں کی شادابی، برساتی نالوں میں پانی کی ننھی منی لکیروں اور خوبانی کے پیڑوں کے لامتناہی سلسلے میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی دریائے کابل کی کہانی بھی ذہن میں کروٹ لے اٹھتی ہے اور کبھی میں ان زمین دوز نہروں کے متعلق سوچتا ہوں تو پورے ڈیم کے منصوبے کو تجسس و آفرین کہنے کے لئے کچھ الفاظ ذہن میں گھوم جاتے ہیں۔ ڈیم بنے کئی برس گزر چکے ہیں وہاں وہ دیوقامت عفریتوں کا منظر پیش کرتی مشینری بیکار پڑی ہے جو تعمیراتی کمپنی وہاں چھوڑ گئی ہے۔ کمپنی اس مشینری کو اس کی قیمت سے زیادہ نقل وحرکت پر اٹھنے والے اخراجات کے پیشِ نظر ''خدا حافظ'' کہہ گئی ہے۔

خدا حافظ اس لئے کہ حکومت پاکستان کے کسی محکمے نے اس مشینری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور وہ وہاں پڑی زنگ خوردہ ہو رہی ہے۔

ہم ٹیکسلا کے کھنڈرات میں گھوم پھر رہے ہیں۔

ٹیکسلا وارد ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ایک بڑی بے باک سیاح لڑکی بڑے لاابالی انداز میں ٹیکسلا کے عجائب گھر کی کھڑکی پر ٹکٹ خرید رہی ہے۔ اس کے تنگ اور چست لباس پر ہر شخص کی نظر پڑ رہی ہے۔ اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں۔ بعض ساتھیوں نے اسے گندھارا

آرٹ کا عجوبہ قرار دیا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ایک سٹوپہ کے قریب مجھے اکیلی مل گئی اور مجھ سے کچھ پوچھا جو میں نے بتانا اپنی ''عزت افزائی سمجھا۔'' جلد ہی...... دو چار باتوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ گندھارا آرٹ اور بدھا کی تعلیمات کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہے۔ وہ اس بات پر بڑی حیران تھی کہ پشاور' لاہور اور ٹیکسلا کے عجائب گھروں میں ''لارڈ بدھا'' کے اتنے مجسمے رکھے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہی وسط ہند' چین اور جاپان میں بھی ہے (گویا وہ ان ممالک کی بھی سیاحت کر چکی تھی) اس کا خیال تھا کہ بدھ تہذیب اور بھی کئی مقامات پر مدفون ہو گی اور یہ شخص جسے ''لارڈ بدھا'' کہا جاتا ہے یقیناً ایک عظیم ترین انسان ہے کہ اس کے لکڑی' دھات اور پتھر سے بنے مجسموں کی تعداد معلوم نہیں جا سکتی۔

وہ ٹیکسلا سے افغانستان میں بامیان میں گوتم بدھ کے اسی فٹ اونچے بت کو دیکھنے بھی جانے والی تھی۔ وہاں سے ہی اسے ایران اور ترکی کے راستے یورپ لوٹ جانا تھا۔ وہ ہماری تہذیب کے حوالے سے ''نامعقول لڑکی'' ڈاکٹریٹ کے لئے ''لارڈ بدھا'' کی تہذیب پر مقالہ لکھ رہی تھی۔ لہٰذا اس کی ہمت اور اس کے اسفار پر نظر ڈالئے۔ باتیں کرتے وقت اس کی سنجیدگی اور ملاحت سے یوں لگتا تھا کہ بدھا کی روح اس کے اندر گھس چکی ہے...... اس نے کہا بھی کہ وہ آئندہ زندگی میں ''بدھ بھکشو'' بننے کی آرزومند ہے۔

☆☆

ٹیکسلا سے ہم منگلا ڈیم پہنچے۔

منگلا ڈیم کی تعمیر اختتام پذیری کی منزل میں تھی۔ ہماری بس غیر ملکی انجینئروں اور دیگر کارکنوں کے لئے بنی بٹرل کالونی کے قریب رکی۔ ہم نے دیکھا کہ کالونی کے باہر سڑک کی سمت بنائے گئے پیراکی کے تالاب میں بہت سی گوریاں اور گورے نہا رہے ہیں۔ فلموں میں تو ایسے مناظر بہت دیکھے تھے لیکن یہ زندہ منظر تو بہت سوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوا۔ ساتھیوں نے اس منظر کو بھی اپنے مطالعاتی دورے کا جزو قرار دیا اور منگلا ڈیم کی سیر کو آنے والے سیاحوں کے ستانے کے لیے بنی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تالاب کے نظارے لینے لگے۔ کچھ گوریاں اپنے سفید رنگ کو سیاہی مائل کرنے کے لیے بے تکلفانہ ستمبر کے سورج کے سامنے اپنے جسموں کو پھیلائے لیٹی تھیں۔

نسبتاً اونچے مقام پر بنی اس رہائشی کالونی سے نیچے بھی جھانکا جا سکتا تھا۔ جہاں بہت سی دیوقامت مشینیں، بے شمار ٹرک، جیپیں اور پک اپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مختلف النوع سامان سے سارا میدان بھرا پڑا تھا۔ یہاں بھی کتنا تعمیراتی ساز و سامان بیکار پڑا ہے۔'' میں نے سوچا لیکن مجھے ایسی سوچ کا جواب ورسک ڈیم پر تو کسی نہ نہیں دیا تھا لیکن یہاں منگلا ڈیم کے چیف انجینئر نے ترقی دیہات کی اکادمی کے جملہ مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ منگلا بند کے ٹھیکیداروں کو اتنا ساز و سامان بیکار رکھنے' استعمال کرنے' اتنی بڑی کالونیاں تعمیر کرنے' اور انجینئروں کو بیش از بیش تنخواہیں دینے کے باوجود چھتیس کروڑ روپیہ بچت ہوئی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے وعدے کے مطابق مقررہ مدت سے ایک سال قبل ڈیم کی تعمیر کا کام ختم کر دینے کی وجہ ٹھیکیدار فرم کو تین کروڑ روپیہ بونس بھی دیا ہے۔

منگلا بند کی جھیل میں پانی کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ منگلا نامی پورا گاؤں پانی میں ڈوب چکا ہے اور اس گاؤں کے متروکہ مندر کا کلس پانی سے باہر جھانک رہا ہے۔ ویو پوائنٹ پر کھڑے ہو کر کھلی آنکھوں اور دوربینوں کے ذریعے ستمبر ۱۹۶۷ء میں ہم سب نے زیادہ اسی مندر کے ڈوبنے کا نظارہ کیا۔ رومتہ الکبریٰ کے کھنڈروں جیسے مناظر پیش کرنے والے پہاڑوں کی دیواروں پر کم ہی توجہ دی گئی۔

منگلا ڈیم کے چیف انجینئر نے ایک بات اور بھی بتائی کہ پچاس برس کے اندر اندر یہ منگلا بند کی جھیل کیچڑ سے بھر جائے گی...... یہ سارا بند ناکارہ ہو جائے گا۔ ہمارے پانی کے منبعوں پر دشمن کی نظر ہے کئی متبادل انتظامات کرنے ہوں گے۔ چھوٹے بڑے کئی ڈیم بنانا ہوں گے...... یہ ڈیم ہماری قومی معیشت اور ترقی کا ایک اہم ستون ہے۔ ہمیں آج ہی سے ممستقبل کے اندیشوں کو رفع کرنے کی تدبیر کرنا ہوگی۔

کسی نے پوچھا کہ اگر ہمارے پانی کے منبعے ہی دشمن کی نظر میں ہیں تو اس نے اگر ہمارے پانیوں کو روک لیا تو......؟

چیف انجینئر نے دو برس پہلے کی لڑی جنگ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر آپ کو' پاکستانیوں کو ایک اور جنگ لڑنا ہوگی......اس کا انگریزی جملہ یہ تھا'' دین یو ویل ہیو ٹو فائٹ این ادر وار ود انڈیا'' مجھے چیف انجینئر کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے۔

☆☆

میں ایک مدرس ہوں...... بے شک اس میں کیا کلام ہے لیکن میں ایک فنکار بھی ہوں...... اپنی اس فطرت کا احساس مجھے اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو کسی شعر کی گہرائیوں میں اترا ہوا پاتا ہوں۔ جب کسی لفظ یا جملے کے سحر میں گم ہو جاتا ہوں جب میں کسی تصویر کو دیکھ کر اس میں سما جاتا ہوں...... فطرت کے کسی منظر کا حصہ بن جاتا ہوں...... میں حسنِ فطرت سے حاصل ہونے والی اپنی سرشاری میں کسی دوسرے کو شریک کرنا چاہتا ہوں...... ایسی مجرد اشیائیں، ایسے محسوس کئے جانے والے وجودوں اور دل کی گہرائیوں میں جنم لینے والے تصورات و خیالات میں کسی دوسرے کو شریک کرنا بہت ہی مشکل ترین مرحلہ ہے لیکن اس کا احساس رکھنا ہی فنکاری ہے۔

سوات میں حسن فطرت کو کو دیکھ کر میں نے شدت سے خواہش کی کہ کاش کوئی دوست...... دل کا جانی، بڑا بیٹا، یا میری اہلیہ ہی میرے ساتھ ہوتی تو میں اس کو بتاتا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں...... وہ کیا محسوس کر رہی ہے؟ جب میں دو تین دوستوں کے ساتھ مرغزار میں ''بادشاہ سلامت'' سے ملا تو میں نے چاہا کہ میری اہلیہ ساتھ ہوتی اور میں اسے بتاتا کہ تاج و تخت کے حوالے سے نظر آنے والے غیر معمولی انسان دراصل عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو یہ بادشاہ سلامت بھی نماز اور قرآن پڑھ کر اصل شہنشاہ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر بخشش کی التجا کر رہا ہے۔ اسے بتاتا کہ دیکھو مدین کی یہ پن چکی کس طرح پانی سے چل کر گیہوں پیس رہی ہے اور یہ دیکھو پہاڑوں کے پانی نے مکئی کا پودا ۱۲ فٹ لمبا کیسے کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہاتھ بھر لمبے کتنے بھٹے لگے ہوئے ہیں...... اور یہ دیکھو کالام پر دریائے سوات کتنا گہرا اور تنگ ہو گیا ہے کہ اس پر والیٔ سوات نے پل بنا کر اپنی چھوٹی سی آرام گاہ تعمیر کر رکھی ہے...... میں یہ سب کچھ سوچ ہی سکا۔ اپنی تنہائی کے احساس کو محسوس کرتا رہا...... ہاں میں نے بیوی بچوں کے لئے منگورہ سے بہت سے تحائف خریدے...... اپنی جیب کی بساط کے مطابق۔

☆☆

ترقی دیہات کی اکادمی کی دعوت پر بہت سی منفرد ہستیاں خطاب کرنے آئیں۔ سب تو یاد نہیں رہیں لیکن ان میں اکادمی کے سابق ڈائریکٹر مسعود کھدر پوش بھی تھے۔ ان کے متعلق میں کچھ پہلے بھی جانتا تھا لیکن یہاں ان کا خطاب سن کر ان سے میری عقیدت اور بڑھ گئی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے فرمایا کہ یہ جو درہ خیبر ہے اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔

اس درے کی راہ بہت سے فاتحین ہندوستان میں آئے۔ ان فاتحین میں سے زیادہ تر مسلمان تھے۔ یہ مسلمان ہندوستان پر مختلف ادوار میں حکمران بھی ہوئے فاتح ہونے کی وجہ سے وہ مقامی مال و دولت کو مال غنیمت اور مقامی افراد کو جنگی قیدیوں کی صورت میں ساتھ لے گئے۔ غزنوی سومنات کے سترہ حملوں کی تو تاریخ بھی امین ہے۔ ہندوستان کے برہمن اور کھشتری کبھی ایسی مستحکم حکومت برصغیر میں قائم نہیں کر سکے جو مسلمانوں سے ان کی صدیوں کی محرومیوں کا انتقام لیتی۔ اب اتفاق سے انگریز کی مہربانی سے انھیں حکومت ملی ہے اور انھوں نے (خاکم بدہن) پاکستان کی عمر پچیس سال مقرر کر دی...... بھارت ہمارا بدترین دشمن ہے۔ اس کی ساری سیاست انتقامی ہے۔ ہمیں اس سے ہر لمحے اور ہر لحظہ چوکنا رہنا ہوگا۔ اس کے نظریات، عقائد، کارگزاریوں اور اقدامات پر نظر رکھنا ہوگی...... اسی میں ہماری بقا ہے۔

اپنے خطاب میں انھوں نے جو تاریخی دلائل دیئے اور سول سروس میں ہونے کی وجہ سے اپنی حکومتوں کی کارگزاریوں اور کوتاہیوں پر جو سیر حاصل تبصرہ کیا وہ ان کے حساس ضمیر کا آئینہ دار تھا۔ میں ان کے خطاب کا تاثر ابھی تک محسوس کرتا ہوں شاید اس لئے کہ مسعود کھدر پوش وطن عزیز کے مخلص ترین افسر تھے۔

☆☆

مس میاں ایک ایسی خاتون تھیں جو اکادمی میں 'معاشرہ' کے بارے میں مضمون پڑھاتی تھی جس دن مسعود کھدر پوش نے خطاب کیا تو وہ خطاب میں موجود نہیں تھیں۔ اس سے اگلے دن انھوں نے مسعود کھدر پوش پر ایسی تنقید کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسعود صاحب کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ میں مس میاں کی اہلیت کا بھی بڑا قائل تھا وہ بھی اپنے مضمون کی ماہر تھیں۔ میں اور زیدی کسی بہانے سرِ شام مس میاں کے بنگلے پر جا پہنچے اور ان سے کچھ وضاحتوں کے سلسلے میں عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ کافی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک میں نے پوچھا کہ وہ مسعود کھدر پش سے ناراض سی کیوں ہیں اور انھوں نے کل اپنے لیکچر کے دوران کچھ ایسے الفاظ کیوں کہے تھے جس میں ان کے دل کی بات کو اور مسعود کھدر پوش سے نفرت کو سب نے محسوس کیا۔

پتہ چلا کہ مس میاں کسی اعلیٰ ریٹائرڈ پولیس افسر کی صاحبزادی ہیں۔ وہ پولیس افسر اسی ضلع میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے جس ضلع کے مسعود کھدر پوش ڈپٹی کمشنر تھے۔ مسعود کھدر پوش

اپنے آپ کو غیر معمولی اور منتخب روزگار فرد سمجھتے تھے۔ اپنے زعم میں وہ پاکستانی انتظامیہ کی چوتھی چول تھے۔ وہ ان کے والد کو جائز وناجائز تنگ کرتے رہتے تھے بالآخران کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے اور مسعود کھدر پوش نے ان کے والد کی خفیہ رپورٹ خراب کرڈالی یا کرواڈالی۔ خفیہ رپورٹ تو درست ہوگئی لیکن مسعود کھدر پوش کا ذہن کبھی ٹھیک نہ ہوسکا۔ پھر کئی سال بعد اتفاق یہ ہوا کہ مسعود کھدر پوش اس اکادمی میں آوارد ہوئے جس میں وہ بھی گزشتہ کئی سال سے موجود ہیں۔

سٹاف میٹنگ کے دوران میں انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں فلاں ریٹائرڈ پولیس افسر میاں کی بیٹی تو نہیں ہوں۔'' مس میاں نے مسعود کھدر پوش سے اپنی نفرت کا سبب بیان کرنے کی ابتدا کرتے ہوئے کہا ''میں نے اثبات میں جواب دیا۔'' دوسرے روز انھوں نے مجھے اپنے دفتر طلب کیا اور مجھے کچھ لکھنے کا کام تفویض کیا۔ میں نے کہا یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ لائبریری موجود ہے اس سے استفادہ کریں۔ میں نے جیسا انھوں نے کہا ویسے کیا اور جو وہ چاہتے تھے کہ میں لکھوں وہ لکھ دیا وہ میری تحریر سے خوش ہوئے اور مجھے ایسے ہی کئی کام تفویض کرنے لگے جو میرے مضمون اور میری سکت سے باہر تھے۔

مجھے اپنے دفتر میں بھی تقریباً روزانہ ہی بلا لیتے اور کچھ کام سونپ کر میرا وقت ضائع کرتے رہتے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا تدریسی کام اضافی کام سے متاثر ہو رہا ہے تو انھوں نے کہا کہ میں جو مضمون ادھر اکادمی میں پڑھاتی ہوں نہ صرف غیر ضروری بلکہ فضول ہے۔ مجھے انھوں نے کبھی اپنا کام نہیں کرنے دیا۔ ادھر ادھر کے کاموں میں لگائے رکھتے۔ اب فریداللہ شاہ آئے ہیں۔ یہ بھی میرے والد کے اچھے واقف کار ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ مسعود کھدر پوش نے مجھے ملازمت سے نکلوانے کے لئے اکادمی کے نصاب سے میرا مضمون ہی خارج کرادیا ہے۔ میں چونکہ کسی سروس کیڈر میں نہیں ہوں بلکہ دیگر کئی انسٹرکٹرز کی طرح صرف اکادمی ہی کی انسٹرکٹر ہوں۔ مسعود کھدر پوش کی سفارش پر مجھے حکومت نے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء سے فارغ کرنے کا سرکلر جاری کر دیا ہے...... آپ لوگ ہی فیصلہ کریں کہ یہ مسعود دیوتا' کیسا دیوتا ہے...... بدی کا یا نیکی کا۔''

◆◆◆◆◆

(۳۰)

کابل کابل' افغانستان افغانستان

ستمبر کے تیسرے ہفتے کی ایک شام ہم وادیٔ تنگنائے میں بہتے دریائے کابل کے ساتھ ساتھ بنی سڑک پر بسوں کے ذریعے سفر کرتے کابل پہنچے۔ اکادمی کے جو افسران ہمارے ساتھ تھے وہ ہمارے پاسپورٹوں' ویزوں اور ان پر دخول وخروج کی مہریں لگوانے کی ذمہ داریاں نباہ رہے تھے۔ کابل اور افغانستان کے بارے میں انھوں نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ اسے جس آنکھ سے بھی دیکھنا ہے ہم نے خود ہی دیکھنا ہے۔ لہٰذا بسوں سے اترتے ہی ہم ٹولیوں میں بٹ گئے اور مختلف ہوٹلوں میں رہائش کا بندوبست کیا۔ میں تو سفر کی تھکن کے باعث ایسا سویا کہ اگلی صبح ہی آنکھ کھلی۔

میں جب پہلے پہل اپنے گاؤں سے نکلا تھا تو میرے لئے لاہور' راولپنڈی اور بہاولپور جیسے مقامات' اجنبی دیس تھے۔ اب جب میں پاکستان سے نکل کر ابھی ایک ہمسایہ ملک میں پہنچا تھا تو مجھے کابل شہر اس طرح اجنبی لگ رہا تھا جیسے لاہور سے نکل کر مجھے پشاور لگتا تھا۔ غریب الوطنی میں پستیوں کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ افغانستان میں مجھے چاٹگام سے لے کر طورخم تک کا چپہ چپہ یاد آتا رہا۔ مجھے وادی تنگنائے کے سنگلاخ پہاڑوں کے حسن وسطوت کے باوجود وادی اور چٹانوں کے کناروں کی کشش زیادہ محسوس ہوتی رہی۔ وطن بڑی چیز ہوتی ہے اس کے بغیر تو انسان اپنی شناخت ہی کھو دیتا ہے۔

دوستوں کی معیت میں افغانستان میں اپنے پہلے دن وادیٔ پغمان میں کرغا جھیل دیکھی گئیں۔ وادی پغمان کابل شہر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے دور اونچے پہاڑوں پر ابلتے چشموں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اس وادی کے حسین رنگوں کا ذمہ دار ہے۔ شجرکاری انسانی ہاتھوں کا کرشمہ ہے لیکن اس رومان پرور وادی میں افغانی نوجوان اپنی تعطیلات اسی رنگ میں

مناتے ہیں۔ جیسے لندن یا پیرس کے نوجوان ...... کرغا جھیل میں پغمان کی وادی سے پانی لایا گیا ہے۔اس مصنوعی جھیل کے اندر تیرنے اور نہانے کا خاصا انتظام ہے۔اس کے کنارے پر ایک خوبصورت ہوٹل واقع ہے۔ جہاں شراب وغیرہ کھلے بندوں بیٹھ کر پی جا سکتی ہے۔ہم جیسے پرہیزگاروں کے لئے ''پوپی ٹی'' عام مشروب بھی دستیاب ہے۔ ویسے بھی کابل ایک بین الاقوامی ہوائی راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے کاروبار کے لئے ایک کھلی مارکیٹ ہے وہاں زرمبادلہ کا جھگڑا نہیں...... بدیسی مال پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔تقریباً ہر قسم کے مال کے ڈھیر پر ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور کیا مقامی کیا غیر ملکی لوگ ...... مارکیٹوں میں گھوم اور پسند کی چیزیں خرید رہے ہیں۔غیر ملکی سکے افغانی سکے کے مقابلے میں بھاری ہیں۔

خشک میوہ جات اور کپڑے کی تجارت ان سکھوں کے ہاتھ میں ہے جو صدیوں پہلے افغانستان میں آئے یا لائے گئے۔وہ اپنے آپ کو افغان کہلاتے ہیں۔سکھ خواتین تلک لگاتی' شلوار قمیص پہنتی اور خوبصورت ٹھیٹھ پنجابی بولتی ہیں۔ جب ہم کسی سکھ کی دکان پر جاتے تو ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ کہتے ''جی آیا نوں'' آؤ مہاراج ...... امرتسروں آئے او۔''

ہم نفی میں جواب دیتے۔تو پھر اپنی روانی میں پوچھتے چلے جاتے...... ''تے فیر تسی پختونستان توں آئے او...... ''ہم پختونستان کے وجود سے بھی انکار کرتے تو حیران ہوتے۔

سیاحوں کی راہنمائی کے لئے ہر اچھی دکان سے ''فرینکلن بک پروگرام'' کے تحت شائع کردہ ایک نقشہ مفت دیا جاتا تھا۔ پروپیگنڈے اور اس دور کی مصلحتوں کے پیش نظر اس نقشے میں پورے قبائلی علاقے کو پختونستان ظاہر کیا گیا تھا۔قبائلی لوگوں کے لئے حکومتِ افغانستان کا ''کسیہ خوشحال خاں خٹک'' بھی اسی پروپیگنڈے کا حصہ تھا۔ اس مفروضہ پختونستان کے باشندے بلا روک ٹوک اور بلا کسی پاسپورٹ یا ویزے کی پابندی کے افغانستان میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

افغانی خواتین نے بالخصوص اعلیٰ سوسائٹی خواتین نے پردہ ترک کر دیا ہے۔سکرٹ پہنتی اور بال کٹواتی ہیں...... جب وہ شراب کا جام سامنے رکھ کر سگریٹ کا کش لگاتی ہیں تو افغانی معلوم نہیں ہوتیں' اٹلی اور فرانس کی رہنے والی عورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ میں اور میرا دوست ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے' جو جھیل کے کنارے کے عین اوپر لگی تھی...... بغیر دودھ کے پوپی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے...... اُن چھوٹے چھوٹے کیبنوں کے استعمال کے متعلق

باتیں کرتے رہے، جو جھیل کے کنارے غسل کرنے والوں کے کپڑے وغیرہ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے۔

کئی جوڑے آئے...... بلکہ غول کے غول آئے اور چلے گئے۔ ہم برابر بیٹھے رہے...... مزید بیٹھنے کی خاطر ہم نے کھانا بھی کھایا جو عام ہوٹلوں کے نرخ سے دس گنا مہنگا تھا ہم کسی لڑکی سے کھل کر بات کرنے سے ڈرتے تھے ہمارے اپنے اندر حجاب محض اس لئے تھا کہ ہم افغانیوں کو جمال الدین افغانی کی قوم سمجھتے تھے...... غزنوی کی نسل سمجھتے تھے اور ہمیں امان اللہ خان کا انجام بھی یاد تھا...... اے کاش! کوئی آج اقبال کے اس افغان کو دیکھتا...... خوب صورت افغانی نسل مشرقی روایات کو چھوڑ کر مغربی اقدار تیزی سے اپنا رہی ہے...... ان کی ہر ادا یورپ کے سانچے میں ڈھل گئی ہے...... ان کا ہر طریق اور ہر چلن بدل چکا ہے۔

میرا اور زیدی کا تعلق چونکہ محکمہ تعلیم سے تھا اس لئے باقی چند قبیل کے دوستوں کے ساتھ ہم کابل یونیورسٹی دیکھنے گئے۔ ہمیں وہاں چارسدہ کا ایک نوجوان ملا جو وہاں میڈیکل کے سال چہارم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں یونیورسٹی کے جملہ شعبہ جات دکھائے، ان کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ یونیورسٹی میں دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ یونیورسٹی کی طرح جملہ مضامین پڑھائے جاتے تھے مگر ہر شعبے کا الحاق کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے تھا۔ اکثر پروفیسر صاحبان کا تعلق اپنی غیر ملکی یونیورسٹی سے تھا۔ درس تدریس میں مترجم رابطے کا کام دیتے تھے۔ تعلیم مخلوط تھی اور یوں جان پڑتا تھا کہ پوری فضا پنجاب یونیورسٹی کے نئے یا پرانے کیمپس کی مانند ہے۔ لیکن طالبات کا لباس بیروت یونیورسٹی جیسا تھا۔

چند باتیں قابلِ تقلید اور قابل توجہ بھی تھیں۔ وہ یہ کہ کابل یونیورسٹی میں طلبہ وطالبات سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی یہاں تک کہ کتابیں اور جیب خرچ بھی یونیورسٹی مہیا کرتی تھی ہوسٹل میں بیک وقت پانچ ہزار طلبا رہ سکتے تھے اور ''الف سے یائے'' تک ہوسٹل ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ کھانا مشینوں پر پکتا اور خود کار طریق پر تقسیم ہوتا تھا...... غسل خانوں میں ایک دوسرے سے پردہ کا کوئی انتظام نہیں تھا جو خالصتاً غیر ملکی اثر کا نتیجہ تھا...... طلباء نے از خود پلاسٹک کی شیٹ اور چادریں پردہ کی خاطر لٹکا رکھی تھیں۔

نوجوان زیر تعلیم ڈاکٹر نے ہمیں یونیورسٹی کے طلبہ کے امور کے ڈائریکٹر کے سپرد کر کے ہم سے اجازت چاہی کہ اس کا غیر معمولی نوعیت کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ ڈائریکٹر نے

افغانستان کا محل وقوع اور تاریخ یوں بیان کی۔

☆☆

''افغانستان ایشیا کے وسط میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ دو لاکھ پچاس ہزار مربع میل ہے اور آبادی چودہ ملین ہے۔ اس کا کوئی سمندر نہیں۔ چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا ہے۔ شمال میں جمہوریہ روس کے صوبہ ہائے تاجکستان، ترکمانیہ اور کرغزیہ ہیں۔ شمال مشرقی کونہ میں چین کا صوبہ سنکیانگ ہے۔ مشرق اور جنوب میں پشتون قبائل یعنی چترال، مہمند، آفریدی، وزیری وغیرہ اور بلوچستان کا علاقہ ہے۔ جنوب میں ایران واقع ہے۔''

میں نے پروفیسر صاحب کو بتایا کہ اگر آپ اتنا کہہ دیتے کہ مشرق اور جنوب میں پاکستان واقع ہے تو آپ کی گفتگو مختصر بھی ہوتی اور حقیقت پر مبنی بھی۔ آپ کے بیان کردہ یہ سارے قبائل پاکستان کے باشندے ہیں۔

ڈائریکٹر مسکرایا اور اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ کچھ بات ضرور تھی۔ کابل سے امرتسر کے لئے روزانہ دو فلائٹیں تھیں جبکہ پاکستان سے روزانہ ایک ہی فلائٹ ہوتی تھی۔ بہر حال ڈائریکٹر مزید بتاتا رہا۔

''افغانستان قدیم آریانا کا جدید جغرافیائی نام ہے۔ ۱۵۰۰ ق م لکھے جانے والے ویدوں اور ۶۰۰ ق م لکھی جانے والی زرتشت کی کتاب ''اوِستا'' میں آریاؤں کی سرزمین کا ذکر ملتا ہے۔ جو کوہ ہندوکش کے سلسلہ میں دریائے اوکسس اور دریائے سندھ کے درمیان واقع تھی......''

میں نے پھر پروفیسر کو ٹوکنا چاہا۔ لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے منع کر دیا۔ میں نے بھی سوالات اس کی گفتگو کے اختتام تک اٹھا رکھے...... اب اس کی گفتگو حقیقت پسندانہ تھی۔ اس نے بتایا:۔

''افغانستان کئی تہذیبوں کا مسکن رہا ہے۔ شمالی افغانستان میں زرتشت پیغمبر بلخ میں پیدا ہوئے اور اپنے دین کی تبلیغ کی۔ سکندر اعظم نے ۳۳۲ ق م میں افغانستان کو فتح کیا اور اپنے رواج کے مطابق اس نے ملک کے مختلف حصوں میں اسکندریہ نامی بستیاں آباد کیں۔ پھر اس کے ایک جرنیل نے شمالی علاقہ میں یونانی باختری سلطنت کی بنیاد رکھی جو دو صدیاں قائم رہی۔ ۲۵۰ ق م میں بودھ مذہب کی تعلیم کے اثرات ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہے۔ جس

کے اثرات آج بھی بامیان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں دینا کا عظیم ترین بدھا کا مجسمہ ایک چٹان پر کندہ کیا گیا ہے۔ آج تک یہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک یونانی اور بُدھ مت کی ملی جلی تہذیب نے جنم لیا۔ پھر سفید ہُن اپنی تہذیب لائے اور آخر میں مسلمان نصرت کا پرچم تھامے اس سرزمین پر قابض ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنے اثرات اس سرزمین پر چھوڑے ہیں...... اب یہاں ہندو، سکھ اور یہودی بھی آباد ہیں۔ ان اقلیتوں کو پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔ وغیرہ وغیرہ''

میں نے اور میرے دوستوں نے پروفیسر صاحب کو تاریخ کے کچھ اور بھی پہلو بتائے۔ جن کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا...... ہم نے انھیں تیمور، بابر اور جمال الدین افغانی کے مقابر کی حالت زار بتائی...... ان روایات کا ذکر کیا جو امان اللہ خان کے دورِ حکومت سے متعلق تھیں۔ انھیں بتایا کہ یونیورسٹی کے سامنے زیرِ تعمیر جمال الدین افغانی کے مزار کے گرد گندگی کے ڈھیر لگے ہیں اور تاریخی ہستیوں سے اس قدر بے انصافی ہو رہی ہے جو مسلمان قوم کی روایات کے منافی ہے......

پروفیسر نے صرف اتنا کہا:۔

''ہم سب کچھ کر رہے ہیں...... ہر طرف ترقیاتی پروگرام تکمیل پا رہے ہیں...... حکومت کے وسائل کم ہیں وغیرہ وغیرہ''

یہ ٹھیک ہے...... کابل کا رنگ وروپ بدل رہا ہے...... یہ ایک چھوٹا سا پیرس ہے...... شیشوں کا شہر...... حسیناؤں کا شہر...... مختلف رنگوں کی روشنیوں کا شہر...... شہر سے باہر بھی غیر ملکی اداروں کی امداد سے زرعی انقلاب لایا جا رہا ہے۔ بجلی کی طاقت کے لئے بند باندھے جا رہے ہیں لیکن ایسے ملک کے لئے جہاں ہزاروں کی تعداد میں سیاح آتے ہیں نامور شخصیتوں کے مزاروں کو کسمپرسی کی حالت میں رکھنا قرین مصلحت نہیں دنیا کا کونسا ملک ہے، جہاں بابر کا نام روزانہ تاریخ کے اسباق میں نہ لیا جاتا ہو اور غزنوی کے کارناموں کو دہرایا نہ جاتا ہو......

ایک رات میں نے غزنی میں بسر کی، وہ رات حقائق کی تاریخ میں کھو جانے کی رات تھی...... غزنی کے قرب وجوار میں بیشمار زیارتیں ہیں...... میں ہر جگہ گیا...... خواجہ بلغار ولی کے مزار پر، حضرت بہلول دانا کے مزار پر، جامع اولیاء اور شمس العارفین کے مزار پر...... موئے مبارک کی زیارت گاہ پر، ختم اولیا کے مزار پر...... ان بزرگوں کے مزاروں کی حالت بھی کچھ اچھی

نہیں لیکن جو دکھ حکیم سنائی کے مزار پر جا کر ہوا۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا...... سلطان محمود غزنوی کے مزار کی حالت دیکھ کر تو تاریخ کا سینہ جل سکتا ہے۔ وہ اولوالعزم فاتح جانے کس طرح غزنی سے چل کر وسط ہند تک سترہ بار آیا ہوگا...... آج بھی غزنی میں کسی موٹر پر جانا بھی بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن آج سے صدیوں قبل دشوار گزار پہاڑوں کو غزنی سے کابل تک اور کابل سے پشاور تک عبور کرنا...... وہ بھی سترہ جمع سترہ چونتیس مرتبہ...... پھر لاؤ لشکر لے کر...... عقل تسلیم نہیں کرتی...... ایسا صرف جذبۂ عشق ہی سے ہو سکتا ہے...... غزنوی کے انتظام سلطنت اور لیڈر شپ کی داد دینا پڑتی ہے۔

میں رات بھر یہی سوچتا رہا...... اس کے مزار کی حالت اتنی خستہ کیوں ہے...... افغانی اس کی عظمت کو کیوں بھولے ہوئے ہیں...... غزنوی کے مزار کے قریب ہی ایک دیہاتی مدرسہ ہے۔ ان طالب علموں میں سے ایک نے ہمیں دیکھ کر جانے کیوں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا...... میں افسوس کرتا رہا کہ میں نے اس طالب علم کو بلا کر کیوں نہیں پوچھا "تمہارا یا تمہارے کسی بزرگ کا پاکستان سے کیا تعلق ہے؟...... تم نے ہمیں امرتسر سے آئے ہوئے کیوں خیال نہیں کیا؟......" لیکن وہ طالب دوسرے لڑکوں میں گم ہو گیا...... اس نے یہ نعرہ شرارتاً لگایا تھا...... لیکن رات کے اس وقت بھی اس نعرہ کی یاد سے آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ واقعی پاکستان زندہ باد ہے...... ہم تو اپنے بدترین دشمنوں کی تاریخی اہمیتوں کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

غزنی کے ایک سستے سے ہوٹل میں بستر پہ لیٹے لیٹے میں نے حکیم سنائی کی لوحِ مزار سے نقل کئے ہوئے اشعار یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے سوائے اس شعر کے کوئی شعر یاد نہیں آ رہا ؎

شہرِ علم و عمل و آفتاب!
فروغ معرفت، آئینہ دارِ بزمِ وصال

لیکن زیارت گاہِ موئے مبارک کا یہ شعر بار بار میرے ذہن میں آتا رہا

بیا بیا کہ تار زلفِ مصطفیٰ اینجا است
اگر دوا طلبی رشتۂ شفا اینجا است

☆☆

کابل کے ہوٹل آرین میں آخری رات نصف سے زائد گزر چکی ہے...... میں لکھنا چھوڑ کر ان چیزوں کے متعلق سوچنے لگتا ہوں۔ جو میں نے تحائف کے طور پر خریدی ہیں۔ سامنے ہی بستر کے نیچے پڑی ہیں...... میری ساری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے کسی کے لئے تحائف خریدے ہیں...... ان تحائف میں بیروت کا بنا ہوا وہ خوبصورت زنانہ کوٹ بھی ہے، جسے میں نے اپنی اہلیہ کے لئے خریدا ہے۔ اس کوٹ کے خیال سے مجھے اپنی اہلیہ، بچے، اپنا گھر اور لاہور یاد آ جاتا ہے۔

☆☆

نئے تجربات، نئی معلومات اور نئے جذبوں سے لیس میں اکادمی سے واپس اپنی اے ڈی آئی (ترقیات) کی کرسی پر آ بیٹھا۔ ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ لکھی جس میں زیادہ تر ان تحریکات کا ذکر تھا جن کے ذریعے تعلیمی ترقی میں انقلاب برپا کر کے معاشرے میں مفید تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ اقدامات کی اجازت بھی چاہی۔ رپورٹ میں دفتری نظم وضبط اور کارکردگی میں بہتری لانے کی سفارشات تھیں۔ انتظامیہ کے رویوں میں جمہوری آداب شامل کرنے کا بھی ذکر تھا۔ میری یہ رپورٹ پڑھ کر ضلعی افسر تعلیم نے اس پر ''بہت خوب'' لکھا۔ کچھ سفارشات پر سرخ نشانات انھیں نمایاں کرنے کی غرض سے لگائے اور اس کی چار نقول ٹائپ کرانے کو کہا۔ ایک کاپی انھوں نے مجھے ریکارڈ میں رکھنے کے لیے دی۔ ایک اے ڈی آئی حضرات کو پڑھنے اور دستخط ثبت کرنے کے لیے دی۔ ایک انسپکٹر سکولز اور ایک ڈائریکٹر تعلیمات لاہور ڈویژن کو برائے اطلاع ومناسب کارروائی کے لیے ارسال کی۔

یہ کورس کی آخری جھلکی تھی۔ سب کچھ طاق نسیاں ثابت ہوا۔ میں وقت کی رفتار کے ساتھ خود بھی جزئیات بھول گیا لیکن ایک مجموعی تاثر اور تبدیلی جو کورس کا حاصل تھی میرے ساتھ ساتھ رہی اس میں کابل (افغانستان) کا وہ سفر بھی تھا جو کابل کی بدلتی ہوئی قسمت کے ساتھ مجھے ہمیشہ یاد آتا رہا۔

☆☆

محکمہ تعلیم پنجاب جس ڈگر پر چل رہا تھا اس میں اصلاحات اسی حد تک ہوتی تھیں جس حد تک کوئی امداد دینے والی ایجنسی چاہتی تھی۔ اس میں بھی حضرات کاغذی کارروائیوں سے زیادہ کام لیتے تھے پھر بھی ملک میں کچھ ہوتا نظر آ رہا تھا یعنی سکول کھل رہے تھے۔ ان میں سے منتخب

اداروں کا درجہ بڑھایا جا رہا تھا۔ نئی عمارتیں بن رہی تھیں' پرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی تھی جبکہ تعلیم و تدریس کی روح اُلجھتی جا رہی تھی۔ میں جس سطح پر تھا وہاں کسی انقلاب کا گزر نہ تھا' اکادمی میں ترقی دیہات کی باتیں ہوتی تھیں' تعلیم کا بھی ذکر عام تھا' لیکن محکمے کے اندر طریقہ ہائے تعلیم' نصاب تعلیم' نظام تعلیم اور مدرسین کیلئے تقاضوں کے مطابق تربیت کا کوئی احساس نہ تھا بلکہ ۶۴ء کے بعد تو سالانہ انسپکٹر کانفرنس بھی منعقد نہیں کی گئی تھی۔ جھوٹی اَنا کا جال پورے محکمے پر پھیلا ہوا تھا' روایات کو توڑنے کا کوئی اقدام تو کجا ارادہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ انگریزوں کا مرتب کردہ 'ایجوکیشن کوڈ' چل رہا تھا۔ ماتحت اپنے افسر کی رضا کو سونگھ کر چلتے تھے۔ اوپر سے وطن اور ملت کی باتیں کرتے لیکن دل میں ذاتی مقاصد اور ارمان مچلتے رہتے تھے۔

میں کچھ پڑھنے لکھنے کا شغل رکھنے کی وجہ سے' کچھ غیر معمولی ادیبوں' شاعروں اور صحافیوں سے جان پہچان اور علیک سلیک رکھنے کے باعث اپنے تجربات اور مشاہدات سے استفادے کی راہ پر تھا اور سمجھتا تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور میرا مقام کیا ہے؟

مثال کے طور پر جب مجھ پر مہربانی کرتے ہوئے ضلعی افسر نے میرے لئے سب ڈویژن وسطی تخلیق کرنا چاہی تو اس سلسلے میں دوسرے ساتھی اے ڈی آئی حضرات صرف ایسے سکولوں سے دستبردار ہوئے جو ان کے لئے مسائل کا گڑھ تھے' جن کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور اول مدرسین اکھڑ مزاج اور سرکشی پر مائل رہتے تھے' وہ پارٹی باز تھے یا بزعم خویش لیڈر تھے۔ میں خود دفتری حالات اور سیاست سے واقف تھا نہ ہی میری حیثیت کوئی حرف اُٹھانے کی تھی۔ جب وسطی مدارس کے سربراہوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں تو میری مسکراہٹ اور خاموشی کے جواب میں انھوں نے جی بھر کر اپنے سابقہ اے ڈی آئی صاحبان کی خامیوں' کوتاہیوں اور بے انصافیوں کے دفتر کھول دیے۔ ایسے ایسے واقعات بتائے جو کسی پڑھے لکھے' تربیت یافتہ گریجویٹ کے شایانِ شان نہ تھے۔ میں نے جواب میں ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی آپ کو بھی اور مجھے بھی ہدایت دے۔

میرا کام درست چل رہا تھا کہ موجودہ ضلعی افسر تعلیم نے میری سب ڈویژن میں کچھ سکولوں کی تقسیم میں مزید ردوبدل کیا اور کچھ اساتذہ کو اِدھر اُدھر کیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ وہ دو ایک ساتھیوں کو خوش کرنا چاہتے تھے' ان کی وضاحتیں ان کے اندر کی سوچ کی چغلی کھاتی تھیں۔

میں کورس پر جانے سے پہلے بھی پورے اعتماد سے کام کر رہا تھا لیکن اب میں نے مزید اعتماد اور زیادہ تر اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینا شروع کر دیا۔ میں قصور جنوبی، پتوکی مشرقی اور وسطی لاہور کا دورہ کرتے رہنے کی وجہ سے ان علاقوں کے بارے میں بہت کچھ ذاتی طور پر جانتا تھا۔ مجھ پر واضح تھا کہ ان علاقوں میں کہاں کس درجے کے سکول کی ضرورت ہے، کہاں زنانہ سکول کی کمی ہے، کون سا پرائمری سکول، مڈل بننے کے قابل ہے اور ایسا کرنا علاقے کی ضرورت بھی ہے۔ کس مڈل سکول کو ہائی بنا کر علاقے کے معززین، ممبران اور چیئرمین کو خوش کرنے کے بجائے عامتہ الناس کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

سیاسی افراد کے بجائے میں نے طلبہ کے مفاد کو پیش نظر رکھا اور ہر اسکیم کے روایتی انداز بدلنے لگا۔ جب کسی سمت سے اعتراض اُٹھتا تو میں معترض کو اعتراض لکھ کر دینے کو کہتا۔ وہ لکھ کر دیتا تو میں ذاتی واقفیت کی بنیاد پر اس پر نوٹ لکھتا، اپنے افسر کو دکھاتا، اس کی تائید حاصل کرنے کے بعد میں اسے تحصیل یا ضلع کونسل میں پیش کرتا۔ میں اپنے منصب کے حوالے سے تحصیل کونسل لاہور، چونیاں اور قصور کا ''ایکس اوفیشیو'' ممبر تھا اور ترقیات کے کام کی وجہ سے ضلع کونسل کے اجلاس میں، مجھے ضلعی افسر کے ساتھ ہی جانا ہوتا تھا۔ ضلعی افسر ترقیات کو ترقیاتی گرانٹ کی موجودگی میں ترقیاتی اسکیموں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ حقیقت کی روشنی میں پیش کی گئی صورت حال کو کوئی بھی رد نہیں کر سکتا تھا اور ذاتی مقاصد رکھنے والے عوامی نمائندے مجھے ذاتی طور پر مجبور کرتے، میں ان کی سفارش اگلے سال کے لئے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا تا کہ حاضر لمحہ ٹل جائے۔ بعض عوامی نمائندوں نے میری شکایات بھی میرے افسرِ اعلیٰ سے کیں لیکن شکر ہے کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

☆☆

جب میں قصور جنوبی میں تھا تو میں نے پرائمری سکول کھودے کو ایسی جگہ پر پایا جہاں سے قریب ترین مڈل سکول چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ کھودے کا ایک لڑکا تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں چھ میل کا فاصلہ طے کر کے سکول جاتا اور واپس آتا، یہ لڑکا ایک روز مجھے کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر ملا اور میرا اس سے خاصا مکالمہ ہوا۔ میں سائیکل پر تھا، اس کا اور میرا سفر مخالف سمتوں میں تھا۔ میں اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ کھڈیاں کے لیے عازم سفر ایک سائیکل سوار ہمارے قریب سے گزرا۔ میں نے اسے آواز دی اور پوچھا وہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کے جواب

پر میں نے اسے کہا کہ اس لڑکے کو بھی جرنیلی سڑک تک لے جاؤ' اس چھوٹے سے بچے کو مڈل سکول کچہ پکا جانا ہے۔

اس آدمی نے بتایا کہ اسے یہ لڑکا تقریباً روزانہ ملتا ہے اور وہ خود کئی بار اسے 'لفٹ' کی پیشکش کر چکا ہے لیکن بچہ بڑا خوددار ہے۔ میں نے بچے اور اس سائیکل سوار کے درمیان 'مستقل معاہدہ' کروا دیا کہ لڑکا اس کے ساتھ جایا کرے گا۔ لڑکا مجھے جانتا تھا کہ میرا تعلق اسکولوں سے کیا ہے' وہ اس وقت چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اس لڑکے کو مڈل سکول کھودے سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع تو نہیں ملا ہوگا لیکن وہ مجھے اس قدر یاد رہا کہ جب میں نے پرائمری سکولوں کا درجہ بڑھانے کی خاطر سکولوں کا انتخاب کیا تو سب سے پہلے پرائمری سکول کھودے کا نام تجویز کیا۔ اسی طرح میں نے ایک سال میں دس ایسے مڈل سکولوں کو ہائی کا درجہ دینے کی سفارش کی جن کی علاقائی یونین کونسلوں کو کبھی اُمید بھی نہ تھی کہ وہ سکول 'اپ گریڈ' کر دیئے جائیں گے۔ میں انتہائی دیانتداری سے موزونیت کے معیار پر اپنی سفارشات محکمہ کی طرف سے مرتب کرتا جو کہ اعلیٰ سطحی میٹنگوں میں جملہ اسکیموں کے ساتھ منظور کر لی جاتیں۔ اس دور میں اتنے نئے سکول کھلے اور پرانے اپ گریڈ اور سازوسامان سے آراستہ ہوئے کہ ترقیات کا کام کرنیوالے چھوٹے سے لے کر بڑے افسر تک جھنجھلا اُٹھے۔ ڈویژنل انسپکٹر صاحب ترقیاتی کاموں سے تعلق کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے کسی اہم اجلاس میں بلا لیتے تھے۔

☆☆

'ڈان باسکو' ہائی سکول' ایمپرس روڈ' لاہور میں سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب تھی' محمد علی ہوتی وزیر تعلیم مغربی پاکستان مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈویژنل انسپکٹر ربانی صاحب کی وجہ سے میں بھی اس تقریب میں شامل تھا۔ مخصوص تعداد میں کچھ مہمان افسران ایک کمرے میں بیٹھے وزیر تعلیم سے تعلیم کے موضوع پر بات چیت کر رہے تھے۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہمارے انسپکٹر صاحب نے وزیر تعلیم محمد علی ہوتی کی خدمت میں عرض کیا کہ نئے پرائمری سکول قائم کرنے کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اب پورے لاہور ڈویژن میں ہر قریہ' ہر آبادی اور ہر ڈیرے پر پرائمری سکول کھل چکا ہے۔ اوپر سے ہر مسجد میں مکتب سکول بھی کھول دیے گئے ہیں۔ کم از کم کچھ سالوں کے لئے پرائمری سکول کھولنے کی سکیم ختم کر دی جائے کیونکہ اب نئے

سکول کھولنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی۔

وزیر تعلیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑا مثبت اور چشم کشا جواب دیا' انھوں نے کہا ''انسپکٹر صاحب! آپ دیکھیں کہ ایک پرائمری سکول کھولنے پر آپ دو بیکار میٹرک پاس افراد کو روزگار فراہم کرتے ہیں۔ سکول کے قیام کے ساتھ ملنے والی گرانٹ سے سکول کے لئے ضروری سامان' فرنیچر' ٹاٹ اور لائبریری کی کتابیں وغیرہ خریدی جاتی ہیں۔ اگر عمارت کے لئے بھی گرانٹ ملے تو عمارت تعمیر ہوتی ہے' اس ساری سرگرمی سے معیشت استوار ہوتی ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ لوگوں کا جو بھی تھوڑا بہت بھلا ہو رہا ہے وہ ہوتا رہے؟ حکومتیں ایسے ہی کاموں سے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بناتی ہیں۔ جگہ نہیں ملتی تو کسی درخت کے نیچے' کسی دیوار کے سائے میں سکول کھول دیجئے۔ اس کے باوجود جگہ نہیں مل رہی تو ہر بڑے گاؤں میں پرائمری سکول نمبر۲ قائم کر دیجئے۔''

انسپکٹر صاحب کے پاس اس فاضلانہ وضاحت کے بعد اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

☆☆

ضلع لاہور میں ایک گاؤں نبی بخش والا ہے' وہاں میں نے نیا پرائمری سکول کھولا۔ تجویز بھی میری تھی اور مقام چونکہ میری سب ڈویژن وسطی میں تھا اس لئے اُس کا اِجرا بھی میں نے ہی کیا۔ یہ گاؤں میاں افتخار الدین مرحوم کی ملکیت اراضی میں تھا۔ میں میاں افتخار الدین کے پسماندگان' ان کے بیٹے میاں عارف اور اُن کے مینجر سے کئی بار ملا کہ وہ گاؤں میں محکمہ تعلیم کو سکول کے لئے دس مرلے کا ایک ٹکڑا ہی دے دیں لیکن ۱۹۷۰ء تک اس قدر عالی مرتبت خاندان نے جو غریبوں کے حقوق کا بلند آہنگ علمبردار تھا' نامعلوم وجوہ کی بنا پر جگہ نہیں دی حالانکہ ملاقاتوں میں وہ جگہ مہیا کر دینے کی حامی بھرتے رہے۔ میری بطور اے ڈی آئی موجودگی تک اس سکول کے لئے جگہ دستیاب نہیں ہوئی تھی' یوں سکول کچھ تو گاؤں کی مسجد میں اور کچھ ملحقہ پیپل کی چھاؤں میں چلتا رہا۔

☆☆

بنیادی جمہوریتوں کے نتیجے میں حکومت نے یونین کونسلوں کی سطح تک عوام کے منتخب نمائندوں کو نوازنے کے لئے تعمیری کاموں میں عملی طور پر شریک کرنا چاہا لہٰذا حکومت پنجاب نے صوبے بھر کی تمام یونین کونسلوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں تعمیر و ترقی کے کام کرنے کے لئے

'میچنگ فنڈ' کی ایک سکیم نافذ کی۔ اس سکیم کے تحت چھوٹے چھوٹے منصوبوں کی تکمیل کے لئے حکومت نے اتنی رقم یونین کونسل کو دینے کی پیشکش کی جتنی رقم یونین کونسل خود دیا تو نقد دے یا پھر تعمیراتی سامان اور مزدوروں کی اُجرت کی صورت میں مہیا کرے۔ سرکاری امدادی رقم فی پرائمری سکول تین ہزار اور فی مڈل سکول دس ہزار روپے تھی۔ تحصیل کونسل کے ذریعے یونین کونسل کے چیئرمینوں سے ضروری اعداد و شمار حاصل کرنے کے بعد اس امدادی منصوبے پر فوری عملدرآمد کا پروگرام وضع کیا گیا۔ ضلع لاہور کی تینوں تحصیلوں کے لئے چیک ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے ذریعے تقسیم ہوئے۔ فلسفہ یہ تھا کہ چیئرمین صاحبان مقامی ہیڈ ماسٹر / اول مدرس کے تعاون سے مقامی سطح پر وضع کردہ کمیٹی سے تعمیراتی کام کرائیں۔ اور اس امر کو یقینی بنائیں کہ مقامی آبادی / کونسل سرکاری رقم کے برابر رقم ضرور خرچ کرے۔

اس سکیم پر عمل کے دوران کچھ چیئرمینوں نے سکولوں کی بجائے اپنے گھروں کے تھڑے، نالیاں اور پلیاں مرمت کرالیں یا نئی بنالیں، کئی رقم لے کر بیٹھ گئے اور کوئی کام نہیں کیا۔ بے شمار چٹھیاں لکھی گئیں، مدرسین ان سے جا جا کر ملے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ایک ذاتِ شریف ایسی تھی کہ مڈل سکول کے لئے دیا گیا دس ہزار روپیہ اس نے ذاتی طور پر استعمال کر لینے کا اعلان تحصیل کونسل کے اجلاس میں کیا اور بتایا کہ اس امدادی رقم کے ملنے سے پہلے اس نے یونین کونسل کے لئے کئی ہزار اپنی جیب سے خرچ کرر کھے تھے، اس لیے اس نے وہ رقم وضع کر لی ہے۔ قصور میں مڈل سکول راؤ خاں والہ کی یونین کونسل نے دس ہزار روپے اور اپنے تعاون سے سکول کی چار دیواری کے علاوہ تین کمرے بھی تعمیر کیے، یہ ایک مثالی کام تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ترجمان 'پاک جمہوریت' نامی جریدے نے اس سکول کی تصاویر شائع کیں اور یونین کونسل کے اراکان کے علاوہ اساتذہ کرام کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا۔

☆☆

سکولوں کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت ملنے والی امدادی رقوم کو ضابطے کے مطابق ضلع کی خریداری کمیٹی خرچ کرتی تھی جس کا سیکرٹری ضلعی افسر تعلیم ہوتا تھا۔ خریداری کا سارا عمل وہ ہی انجام دیتا تھا۔ ان رقوم سے فرنیچر، گھڑیاں، ٹاٹ، گھڑیال، پانی کے لئے نل، رجسٹر اور لائبریری کے لئے کتب یعنی مدرسہ کی جملہ ضروری اشیاء خریدی جاتیں۔ یہ رقوم سارا سال پڑی رہتیں۔ مئی اور جون میں متعلقہ کلرک اور ضلعی افسر کے آگے پیچھے مندرجہ بالا اشیاء سپلائی کرنیوالے ٹھیکیداروں کی

بھیڑ لگ جاتی۔ اہلکار یہ عمل دانستہ کرتے تھے تاکہ جب مالی سال کا اختتام ہو تو وہ عجلت میں گھپلے کر سکیں۔ ٹھیکیداروں کا مفاد بھی اسی میں تھا۔ ضابطے کی کارروائی عجلت میں کی جاتی، جانے کہاں کہاں اجلاس اور ملاقاتیں ہوتیں، ظاہری طور پر ٹینڈر بھی ہوتے، مال سپلائی کرنے کے احکام بھی جاری ہوتے ۳۰ رجون سے پہلے پہلے مال مہیا کر دینے کی تاکید بھی ہوتی۔

خریداری کی کمیٹی کا صدر تو ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا لیکن کاغذات پر دستخط ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کرتا۔ ایک فنی ماہر ممبر ہوتا تھا، یہ دونوں افسران محکمہ تعلیم کی ضلعی سطح پر خریداری کو معمولی خیال کرتے اور کم کم دلچسپی لیتے کیونکہ دیگر محکمہ جات کی امدادی رقوم کی نسبت تعلیم کی رقوم بہت کم ہوتیں۔ لہٰذا پورا پورا تصرف ضلعی افسر تعلیم ہی کو حاصل تھا۔

ساری کارروائی چونکہ عجلت میں ۳۰ جون سے پہلے پہلے ہی کرنا مقصود ہوتی تھی اس لئے دن رات ایک کر دیا جاتا۔ سرکاری خزانے سے رقوم نکلوانے کی کاغذی تیاری فرضی رسیدوں اور سرٹیفکیٹوں سے کی جاتی۔ مثلاً مال اشیائے سرکار کی آمد اور متعلقہ رجسٹروں میں ان کا اندراج، سرٹیفکیٹ، یہ سب کچھ فرضی ہوتی۔ مال تو ۳۰ رجون کے بعد بھی آتا رہتا۔

رقوم میں ضلعی افسر تعلیم کا حصہ ہوتا تھا جسے کمیشن کہا جاتا تھا۔ اگر کوئی کمیشن طے نہ بھی ہوتا تب بھی ٹھیکیدار پر واضح تھا کہ اسے ضلعی افسر کو، متعلقہ کلرک کو دفتر کے خزانچی اور بل منظور کرنے والے اے۔ جی کے دفتر کے متعلقہ اہلکاروں کو بہر حال کمیشن دینا ہی ہے۔ جبکہ اے ڈی آئی (ترقیات) کو بھی ان سودوں کی ہوا بھی نہ لگنے دی جاتی کیونکہ پرچیز کمیٹی کے نوٹیفکیشن میں اس کا نام نہیں تھا۔ اس بندر بانٹ کا حقدار بھی وہی تھا جس کا عہدہ نوٹیفکیشن میں درج تھا یا پھر وہ جس کے دستخطوں سے بلوں کی منظوری کے مرحلے طے ہوتے تھے۔ اے جی آفس کی شرح کمیشن ۵۰ پیسے فی صد سب سے کم تھی جو ایک لاکھ پر -/۵۰۰ روپے بنتی ہے۔

لکھنے لکھانے اور کچھ تالیفات کی وجہ سے شہر لاہور کے کئی کتب فروش میرے واقف تھے، وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ میں ان کی کتب کے سلسلے میں اپنے ضلعی افسر سے بات کروں تاکہ وہ ان کی کتب کی خریداری کریں، ان کو معقول کمیشن دی جائے گی۔ میں ان سے کہتا کہ جب کبھی میں ضلعی افسر تعلیم بنوں گا تو ان کی خدمت کروں گا۔ اگر میں اب ان کی سفارش کروں گا تو میرا افسر مجھ سے پوچھے گا کہ اس سفارش میں میرا کیا مفاد ہے؟

◆◆◆◆◆

(۳۱)

عقل بڑی عیار ہے

سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو فراہم کی جانے والی کتب حکومت پنجاب نے دو اقسام میں منظور کی تھیں۔ ۲۵ فیصد لازمی خرید والی کتب تھیں، ۲۵ فیصد صوابدیدی فہرست سے منتخب کرنا ہوتی تھیں۔ باقی ۵۰ فیصد سربراہ اپنی مرضی سے خرید سکتا تھا لیکن اس بارے میں بھی ہدایات تھیں کہ کسی کتاب کا مواد اختلافی نہ ہو۔

میری دو کتب 'جمیلہ الجزائری' اور 'الفتح' لازمی خرید کی فہرست میں تھیں۔ اسی طرح ایک کتاب 'اقبال کے دس اشعار' بھی لازمی خریداری کی فہرست میں تھی۔ ایک ناشر نے مجھ سے اقبال کے 'دس اشعار' کی شرح وتفسیر لکھوائی جو میں نے دو چار چرغے کھا کر بلا معاوضہ دوستی ہی میں لکھ دی۔ اس ناشر نے اس کتاب کو ہزاروں کی تعداد میں جداگانہ مصنف کی کتاب کے طور پر مہیا کیا۔ اگر وہ اصل مصنف کی کتاب ہی فراہم کرتا تو اسے مصنف کو یا مصنف کے لواحقین کو بھاری رائلٹی دینا پڑتی۔ اسی طرح ناشر حضرات نے کئی اور کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جیسے مولانا الطاف حسین حالی کے 'دیوان حالی' میں مقدمہ شعروشاعری ایک طویل دیباچہ کی صورت میں کتاب کا حصہ ہے۔ ناشرین نے کتاب کو دو کتابوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک 'دیوان حالی' اور دوسری 'مقدمہ شعروشاعری' کہلاتی ہے، انھیں الگ الگ بیچا جاتا ہے جبکہ لازمی خرید کی کتب کی فہرست میں یہ ایک ہی کتاب موسوم بہ ''دیوان حالی مع مقدمہ شعرو شاعری'' ہے۔ ایسی ساری تکنیکی چالاکیوں کا محکمے کے کارندوں کو علم ہوتا لیکن وہ خاموش رہتے۔

☆☆

ایک دوست ناشر نے کتابوں کی خریداری پر حاصل ہونے والے کمیشن کا ایک دلچسپ

قصّہ سُنایا۔ایک معروف ضلعی ناظم تعلیم نے اس ناشر سے سالانہ گرانٹوں میں سے پرائمری ٔمڈل اور ہائی سکولوں کی لائبریری کے لئے کتب خریدیں۔ دونوں کے درمیان لین دین کا 'نفع بخش' معاملہ چل رہا تھا لیکن اس سال ضلعی ناظم تعلیم کے ساتھ ایک خوشگوار معاملہ ہوا کہ وہ حجِ بیت اللہ کر آیا۔ پہلے تو اس کی نظر میں کمیشن خواہ کسی بھی مد کی خریداری سے ملے' قبول کر لینا کوئی معیوب بات نہ تھی لیکن اب وہ کمیشن کو رشوت کے زمرے میں شمار کر رہا تھا لیکن پندرہ بیس ہزار کی یکمشت ملتی نقد رقم چھوڑنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دن تو اس نے ناشر کی رقم دبائے رکھی لیکن سرکاری کھاتہ بھی بند کرنا ضروری تھا۔لہٰذا ضلعی افسر نے ناشر کو فون پر کہا کہ وہ اس کی رقم کی ادائیگی کیلئے رقم لے کر اس کی دُکان پر ہی آرہا ہے۔وہ رسیدات تیار رکھے۔

ضلعی افسر نے رقم کا لفافہ ناشر کو تھمایا اور کہا کہ وہ اپنے بل کے مطابق رقم گن لے اور وصولی کی رسیدات دے دے۔ ناشر نے رقم گنی' پکی رسید بھی جاری کر دی پھر معمول کے مطابق کمیشن کی رقم کے نوٹ نکالے اور ایک الگ لفافے میں رکھ کر ضلعی افسر کو پیش کیے۔افسر متذبذب تھا کہ کیا کرے اور کیا کہے' ابھی تو حج کی کھجوریں اور آبِ زمزم بھی اس کے ہاں سے ختم نہیں ہوا تھا' بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ وہ ذہنی کشمکش کو اِدھر اُدھر کی باتوں سے دبانے کی کوشش کرتا رہا' مگر کمیشن کے لفافے سے توجہ نہ ہٹا سکا۔اس نے ناشر سے کہا کہ وہ کمیشن کے یہ نوٹ اسے دوسرے ٹھیکیداروں کی طرح بطور کمیشن نہیں بلکہ ''بخشیش'' کے طور پر دے اور اپنے منہ سے کہے کہ جناب اس رقم کو ادارہ ہذا کی طرف سے بطور ''بخشیش'' قبول کیجئے۔ناشر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' جو کچھ ضلعی افسر تعلیم نے کہا اس نے ویسے ہی کہہ دیا

خوئے بدرا بہانا بسیار! اس حیلے سے کمیشن یا رشوت کی رقم بصورت ''بخشیش'' افسر موصوف پر حلال ہوگئی۔

☆☆

ضلعی ناظم تعلیم کے دفتر میں میرے ساتھی' ہیڈ کلرک' کلرک اور اے ڈی آئی حضرات کے علاوہ درجہ چہارم کے ملازمین بھی تھے۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ وہ سب کے سب مجھ سے زیادہ ہوشیار' دانا اور فکر فردا کرنے والے لوگ تھے۔

ہیڈ کلرک چوہدری محمد اشرف بڑے معاملہ فہم اور اپنی ذمہ داریوں کو بطرزِ احسن نبھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جو بھی ضلعی ناظمِ تعلیم آتا ان کے بغیر نہ چل سکتا تھا۔وہ اپنی گفتگو'

اپنے تعلقات اور اپنی اہلیت کی دھاک اس طرح بٹھاتے کہ کوئی بھی اہم کام کرنے کے لئے افسر کو ان کی تائید حاصل کرنا پڑتی۔ وہ مِسل ہی پر لکھ دیتے کہ یہ معاملہ غلط اور سراسر خلاف قانون ہے، وہ اس کی سفارش نہیں کر سکتے۔ ہاں ناظم ضلع مختار ہیں جو بھی فیصلہ کریں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ ایسی صورت حال میں افسر بچارا کیا کر سکتا تھا!

وہ اکثر اے ڈی آئی صاحبان اور کلرکوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ ضلعی افسران تعلیم کی اتنی بے ضابطگیوں کے بھیدی ہیں کہ اگر وہ کمینگی کرنا چاہیں تو گھر بیٹھے کئی افسروں کو ہتھکڑیاں لگوا دیں۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو اے ڈی آئی اور باقی عملہ کیا سمجھتا ہوگا۔

ان کے ماتحت بابو لوگوں کے متعلق مشہور تھا کہ اگر کسی کو پانی کی لہریں گننے پر بھی تعینات کر دیں تو بھی وہ 'دیہاڑی' بنا کر ہی گھر جائے گا۔ اساتذہ کرام کے کام ہو بھی جاتے تو انھیں اس وقت تک یقین نہ آتا جب تک کہ متعلقہ کلرک ان کا نذرانہ قبول نہیں کر لیتا تھا۔ درجہ چہارم کے لوگ بھی اگر اور کچھ نہ کر سکتے تو مِسلیں ادھر ادھر کر دیتے، چِٹھیاں متعلقہ لوگوں تک نہ پہنچاتے، جھوٹ بولنے کو غلطی یا گناہ شمار ہی نہ کیا جاتا تھا، ایسے افراد کی تعداد انگلیوں پر گِنی جا سکتی تھی جو قابل اعتماد یا خدا کا خوف رکھتے تھے۔

میرے پیٹی بند بھائی یعنی اے ڈی آئی صاحبان بڑے منجھے ہوئے 'فنکار' تھے۔ انھیں گرگ باراں دیدہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی صحبت اور معیت میں خود بخود عجیب و غریب نا مسعود منزلوں کی طرف میری رہنمائی ہو رہی تھی اور خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کے رنگ پکڑنے والی مثل عملی طور پر سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں تو ہر خربوزہ کسی نہ کسی وصف کے باعث دوسرے پر بھاری تھا۔ اگر ان کا رنگ مجھ پر نہ چڑھتا، اور میں اگر ان کی صحبت کے اثرات قبول نہ کرتا تو میں شاید اقبال کا شاہین اور برنارڈ شا کا 'سُپر مین' ہوتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انسان بننے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے!

میرے سب سے سینئر ساتھی ملک غلام حیدر مرحوم تھے...... بڑے لطیفہ گو، طرح طرح کی مثالیں پیش کرنے والے، تجربات کی رنگا رنگ داستانوں کے امین اور دبنگ انسان۔ خوب قصے کہانیاں اور ضرب الامثال سُنایا کرتے تھے لیکن شخصی کمزوریوں سے خالی نہیں تھے۔

وہ ضلع میانوالی کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۶۸ء-۱۹۶۹ء کے دور میں وہ کارپوریشن کے سکولوں کے افسرِ معائنہ یعنی اے ڈی آئی تھے۔ گورنر ہاؤس کے ایک سیکشن افسر کے ذریعے وہ

ملک امیر محمد خان، نواب آف کالا باغ، گورنر مغربی پاکستان کے پوتوں کی تعلیم کے نگران اور اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ روزانہ گورنر ہاؤس کی گاڑی ان کو دفتر سے لینے آتی اور واپس دفتر چھوڑ جاتی۔ اس تعلق کی وجہ سے محکمہ تعلیم کے افسران ان سے دبتے تھے، ہماری تو اوقات ہی کیا تھی۔ جہاندیدہ تھے اس لئے انھوں نے اپنی اتالیقی کا کوئی معاوضہ گورنر صاحب سے قبول کیا اور نہ وصول کیا۔ گورنر صاحب نے معاوضہ قبول نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو ملک صاحب نے انکساری میں کہا'' آپ ہمارے مائی باپ ہیں، پہلے بھی آپ کا کھا رہے ہیں۔ میری خدمات کا صلہ جمع رہنے دیں، جب ضرورت پڑے گی عرضی گزار کر لے لوں گا۔''

انھوں نے اپنی دانائی سے وقت آنے پر یہ معاوضہ اپنے بڑے لڑکے کو گورنر پنجاب کے خصوصی کوٹے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل کروا کر وصول کیا۔

میرے ساتھیوں میں دو اور ملک صاحبان بھی تھے۔ ایک ملک گلزار احمد تھے جن کے بیشتر فارغ اوقات شطرنج کھیلنے میں گزرتے تھے۔ وہ میرے خاصے دوست بن چکے تھے کیوں کہ میں اکثر ان کی بے باک طبیعت اور کھلی گفتگو کی داد دیا کرتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ تعلیم اور معلّمی کے ابتدائی سالوں میں بڑے باریش، نمازی، پرہیز گار اور صوفی قسم کے نوجوان ہوا کرتے تھے۔ ان کی خاندانی روایات بھی کچھ مذہبی پس منظر رکھتی تھیں۔ اچانک اپنے خاندانی پیشوا سے ان کا کوئی اختلاف ہوا اور انھوں نے داڑھی مونچھ صاف کرا ڈالی، پٹوں کی بجائے انگریزی بال رکھ لئے۔ عبادات کو خیر باد کہہ دیا۔ اپنے بیٹے کی اس تبدیلی پر، ان کے دیندار معمر اور نورانی چہرہ رکھنے والے والد نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا'' پہلے یہ بہروپیا تھا، اب اصل حالت میں آیا ہے۔ بہروپ میں انسان ہمہ وقت تکلیف میں رہتا ہے۔ اب یہ خوش ہے۔''

وہ جو کچھ بھی تھا لیکن یاروں کا یار تھا... بلکہ جس کا کوئی یار نہ تھا وہ اس کا بھی یار تھا۔ میری خاطر اس نے اساتذہ کی پوری میو برادری سے ٹکر لے لی جبکہ بعد میں ملزم میو مدرس نے اپنا قصور بھی تسلیم کر لیا، غلطی کا ازالہ بھی کر دیا اور فریقین کے مابین صلح ہو گئی۔ وہ معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی خصوصی صلاحیت رکھتا تھا، لہٰذا ہم نے اس کا لقب 'سرگودھا کا عقل مند' رکھا ہوا تھا۔ سب اپنے نجی اور ملازمت کے اُلجھے ہوئے معاملات میں اس سے مشاورت کرتے تھے۔ وہ رواں گفتگو میں کوئی ایسا خلاء چھوڑ دیتا جسے مخاطب خود بخود پورا کرتا اور اپنا راز اگل دیتا۔

دوسرے ملک صاحب، ملک عبدالمجید ککے زئی تھے۔ بی-ٹی کے میرے ہم جماعت

تھے' ان کا تعارف میں پہلے بھی کرا چکا ہوں لیکن اب بطور مستقل ساتھی ان کا تعارف مَلک مجید کی بجائے مِلک (Milk) مجید کے طور پر ہوا کیونکہ ہر ماہ یونیسکو کی 'کیئر' نامی تنظیم کی طرف سے سکولوں میں تقسیم کرنے کے لئے خشک دودھ ملتا تھا جس کی تقسیم کا انتظام ملک مجید صاحب کو سونپا گیا تھا۔ ساتھی جان بوجھ کر ''م'' پر زبر کے بجائے زیر استعمال کرتے اور وہ نیم سا مسکرا دیتے۔ کسی سے شکوہ نہ کرتے۔

رانا محمد اکبر کم از کم تین ایم۔اے پاس تھے لیکن شکل وصورت اور بول چال میں رنگڑ ہی تھے' انھیں ٹرپل کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

منصور علی خان بھی اپنے ساتھی تھے' وہ بی ٹی ہونے کے علاوہ ایل ایل بی بھی تھے۔ انھیں تحقیقات کرنے اور قانونی حوالے لکھنے اور بتانے سے خصوصی دلچسپی تھی۔ دیانت دار تھے اور افسروں کے فرمانبردار بھی' وہ کہا کرتے تھے کہ اگر افسر یہ حکم دے کہ فلاں درخت کی تحقیق (انکوائری) کرنی ہے تو وہ درخت سے بھی حقیقت حال اگلوا لیں گے اور اگر درخت خاموش رہنے پر تُل جائے تو پھر وہ اس کے خلاف ایسی شہادتیں قلمبند کریں گے کہ درخت قید ہو کر ہی رہے۔ افسران کے اعتماد پر پورے اترنے والے شخص تھے۔

جسمانی تعلیم کے اے ڈی آئی سید نذیر احمد شاہ جو بڑے عمر رسیدہ' جہاندیدہ اور باتونی تھے۔ سارا ہفتہ اِدھر اُدھر سے مختلف اشیاء کی پوٹلیاں جمع کرتے رہتے اور ہفتے کے روز ضلع فیصل آباد میں اپنے گاؤں لے جاتے۔ واپسی پر پیر اور منگل کو دورہ کرتے ہوئے بدھ کو دفتر پہنچتے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے دفتر کی ڈاک کی پڑتال ان کے ذمے لگا رکھی تھی۔ ان کا حکم تھا کہ اوپر سے آنے والی محکمانہ چِٹھی کو ڈائری کلرک سرخ سیاہی سے ڈاک کی آمد کے رجسٹر پر درج کرے' جب اس چِٹھی کا جواب بروقت نہ جاتا تو وہ اس کی رپورٹ ضلعی افسر کو کرتے۔ اس پڑتال کا یہ فائدہ تھا کہ جس چِٹھی کا جواب تیار نہ ہو سکتا یا کوئی معلومات درکار ہوتیں تو اس چِٹھی کا عارضی جواب ضرور دے دیا جاتا۔ نیچے سے آنے والی چِٹھیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا' ان کے جوابات کی بھی پڑتال کی جاتی۔

چوہدری حمید اللہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ضلعی ناظم تعلیم کے دفتر کے فنکار ستاروں میں بڑا اہم تھا۔ اپنے اس امتیاز کو اس نے تعلیم کے ہر شعبے میں اپنی ملازمت کے آخری دن تک برقرار رکھا۔ وہ محکمہ تعلیم کے ہر افسر کے کسی نہ کسی طرح کام آتا رہا۔ ضلع' ڈویژن اور نظامت

تعلیم کے جملہ دفاتر کے لئے وہ بہترین رابطہ افسر ثابت ہوا تھا۔ ہر افسر کو اس کی ضرورت تھی۔
اس کے ملاقاتی آتے رہتے تھے۔وہ ملاقاتی کی آمد پر بلند آواز سے چپڑاسی سے کہتا ''تم دیکھ نہیں رہے کہ میاں (چوہدری' ملک وغیرہ) صاحب تشریف لائے ہیں۔ان کے لئے چائے کا پیالہ لاؤ اور کوئی بسکٹ وغیرہ بھی۔''

''پیالہ کیوں پیالی کیوں نہیں؟'' میں پوچھتا تو وہ بتاتا کہ مہمان کو نمونہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جب ہم ان کے پاس جائیں تو ہمیں چائے کی کنجی پیالی پر ہی نہ ٹرخا دے۔''

آنے والا معذرت خواہانہ انداز میں کہتا ''آپ آئیں تو سہی چوہدری صاحب! کوئی حکم دیں' تابع پائیں گے۔''

''ہاں! ایک چھوٹا سا کام ہے آپ کے بڑے بھائی صاحب کے لئے جو محکمہ انہار میں ہیں' ڈائریکٹر صاحب کی زمین پر پانی پہنچانے والا موگا ذرا کھلا کرانا ہے۔''

اس طرح حمید اللہ بڑے طریقے سلیقے سے دوسروں کو کام بتاتا' ان سے کام لیتا اور دوست احباب اور افسران کو خوش رکھتا۔اس کی کامیابی کا اصول یہ تھا کہ اکتاؤ نہیں تھکو نہیں' گھبراؤ نہیں اور جھجکو نہیں۔'' وہ کہتا کہ صاحب اگر عرض گزار کی مراد پوری نہیں کرے گا تو پکڑ کر بٹھا تو نہیں لے گا۔

کسی محکمے کے افسر سے کام نکلوا لینے کا اس کا معروف طریقہ یہ تھا کہ افسر سے پہلے وہ متعلقہ اہلکار سے رابطہ پیدا کرتا اور اسے کہتا کہ یہ ایک کام ہے' اگر وہ اسے کر سکتا ہے تو بہتر کہ 'معاملہ واحد' رہے گا۔اگر افسر ہی کو کام کرنا ہے تو متعلقہ اہلکار ہونے کی وجہ سے وہ کام میں رخنہ نہیں ڈالے گا نہ کوئی مزاحمتی نکتہ اٹھائے گا۔متعلقہ اہلکار وعدہ کر لیتا تو وہ پھر افسر سے کام نکالنے کی کوئی تدبیر سوچتا۔اکثر اُس کی تدابیر کارگر ہی رہتیں۔

''ایک در بند سو در کھلے' پر اس کا پختہ یقین تھا۔ وہ دورانِ ملازمت لاہور ہی میں رہا۔ترقی کے موقع پر اسے باہر جانا تو پڑا لیکن چند ماہ بعد وہ پھر لاہور ہی میں آ جاتا۔میں اس کی صلاحیتوں کی خصوصی نوعیت کی وجہ سے اسے محکمہ تعلیم کا 'سپر سٹار' کہتا ہوں' وہ ہاتھی کی طرح سوا لاکھ کا ہے' خوش رہے اپنا یار رہے۔

ایک پڑھے لکھے شاعر ساتھی شفیق الرحمٰن بھی تھے۔انتہائی دیندار اور راست باز نوجوان تھے۔وہ اس وقت قصور میں تعینات تھے جب ضیاالحق کے دور میں جنرل عتیق الرحمٰن

نے گورنر کی حیثیت سے قصور میں دربار عام کیا۔ انھوں نے ایک نظم اے ڈی آئی کی حالت کے بارے میں لکھی کہ اے ڈی آئی بیچارے کو اپنے اصل کام کے بجائے کیا کیا کام کرنا پڑتے ہیں اور اگر کوئی کام خراب ہو جائے تو موردِ الزام بھی وہی ٹھہرتا ہے' اس نظم کا مجھے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

گر کوئی مہ جبیں' روٹھ جائے
تو الزام اے ڈی آئی پر آئے

جنرل صاحب کے دربار عام میں شمولیت کے لئے ضلعی اور ڈویژنل حکام کو پابند کیا گیا تھا۔ ہمارے ڈویژنل انسپکٹر نے ضلعی افسر سے کہا کہ بھئی دوپہر کا کھانا قصور میں بنگلے کی بجائے فلاں سکول میں کھایا جائے گا اور ہم کم از کم بارہ افراد ہوں گے۔ اے ڈی آئی قصور کو کہہ دیا جائے کہ وہ کھانے کا انتظام شاندار طریقے سے کرے۔ اے ڈی آئی (ترقیات) کی وجہ سے ضلعی ناظم تعلیم نے مجھے یہ پیغام اے ڈی آئی علاقہ شفیق الرحمٰن کو پہنچانے کو کہا۔ ہماری طرح کا کوئی اے ڈی آئی ہوتا تو بارہ کے بجائے چوبیس کا انتظام کر کے خوش ہوتا مگر شفیق الرحمٰن نے کہہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین افراد کی مہمانداری کر سکتا ہے۔ میں نے جب یہ بات ضلعی افسر تعلیم سے کہی تو انھوں نے کہا کہ اسے کہو کہ پھر کسی سکول میں تبادلہ کرا لے' اے ڈی آئی کی اسامی سے کیوں چمٹا ہوا ہے؟ مجھ سے بھی نادانی ہوئی کہ میں نے شفیق الرحمٰن کو انہی الفاظ میں ضلعی ناظم تعلیم کا پیغام پہنچا دیا۔

تبادلہ تو درکنار شفیق الرحمٰن نے محکمہ تعلیم کی ملازمت ہی سے استعفٰی دے دیا۔ وہ ایک معروف دینی جماعت میں تصنیف و تالیف اور تحقیق کا کام کر رہا ہے اور اللہ کی اس پر ہر طرح سے کرم فرمائی ہے۔

☆☆

میں ابتداء میں بھی عرض کر چکا ہوں کہ محکمہ تعلیم میں اے ڈی آئی کی آسامی محکمے کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر اے ڈی آئی اپنے حلقے کا پٹواری ہوتا تھا۔ کالج سے لے کر مکتب (جماعت دوئم تک کا مسجد سکول) کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری اور غیر ملکی مشنری اداروں کی جملہ معلومات اس کی ڈائری میں موجود ہوتی تھیں۔ ایسی ڈائری تیار کرتے وقت اسے دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی لیکن جب ڈائری تیار ہو جاتی تو پھر

اسے اپنی پیشہ وارانہ معلومات کے سلسلے میں کسی کی احتیاج نہ رہتی تھی۔ حلقوں میں تبدیلی کے وقت اسے ایسی ڈائری بھی چارج میں دی اور لی جاتی تھی۔ وسطی سب ڈویژن کی ڈائری مرتب کرنے میں مجھے اپنے تمام ساتھیوں کی ڈائریوں سے استفادہ کرنا پڑا۔ ترقیات کے کام کے سلسلے میں مجھے ایک الگ ڈائری اپنے لیے اور ایک ضلعی افسر کے لیے بھی تیار کرنا پڑتی تھی۔ مدرسین کا تعاون حاصل تھا اس لئے مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ افسروں کو بھی کام کے بارے میں کوئی شکایت نہیں تھی پھر بھی مجھے کوئی ایسا پرائیویٹ (نجی یا انجمن کا) سکول نہیں دیا گیا تھا جسے سالانہ امداد ملتی ہو۔

ضلع میں بہت سے منظور شدہ سکول تھے۔ عارضی طور پر سال، دو سال کے لیے منظور کئے گئے سکولوں کو سرکاری امداد نہیں دی جاتی تھی۔ جبکہ متعدد ایسے سکول بھی تھے جو مستقل بنیادوں پر منظور شدہ تھے وہ بھی سرکاری امداد سے محروم چلے آ رہے تھے۔ ضلعی ناظم تعلیم اپنی صوابدید پر منظور شدہ نجی یا قومی سکولوں کے لئے سالانہ امداد متعین کرتا تھا مگر یہ امداد بلدیاتی اداروں کے ذریعے تقسیم کی جاتی تھی۔ تعلیمی بجٹ میں یہ رقم سال بہ سال مختص ہوتی اور ضلع کونسلوں، ٹاؤن کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کے ذریعے تقسیم ہوتی تھی۔ ضلعی ناظم تعلیم ہر سال ماہ اپریل میں تحریری طور پر اپنی حدود میں واقع بلدیاتی اداروں سے پوچھتا کہ امسال قومی بجٹ میں کتنی تعلیمی امدادی رقم منظور شدہ سکولوں کے لئے مختص کی گئی ہے؟ جواب موصول ہونے پر امدادی رقم ہر سکول کے عملے اور تعداد طلباء پر مبنی ایک فارمولے کے تحت تقسیم کر دی جاتی۔ سکولوں کے مینجروں کے نام، چٹھیاں جاری ہو جاتیں کہ وہ امدادی رقم اپنے بلدیاتی ادارے سے وصول کر لیں۔ تقسیم رقوم کی تفصیلی چٹھی بلدیاتی اداروں کو بھی بھیجی جاتی تھی۔

اسکول اس سلسلے میں دوہرا ریکارڈ رکھتے تھے: ایک اصل ہوتا، ایک فرضی۔ فرضی ریکارڈ میں مدرسین اور طلبہ کی تعداد زیادہ لکھی جاتی۔ اس فرضی ریکارڈ کی تصدیق اے ڈی آئی علاقہ کرتا یوں وہ سکول کو ملنے والی سالانہ گرانٹ کی کسی نہ کسی مقدار کا حصہ دار بن جاتا۔ ایسے امدادی سکولوں کا عام سکولوں کی نسبت افسران معائنہ زیادہ خیال رکھتے۔ سرسری اور سالانہ معائنہ جات پر بھی خصوصی توجہ فرماتے۔ جس اے ڈی آئی کے پاس ایسے سکول نہ ہوتے یا کم ہوتے تو دفتر میں ان کی حیثیت کا تعین اسی پیمانے سے کیا جاتا اور اس پیمائش میں میرا نمبر صفر تھا۔

☆☆

میرے چوتھے ضلعی افسر ملک غلام حیدر مرحوم مقرر ہوئے۔ان کا اور میرا ساتھ دفتر تعلیم، ضلع لاہور میں نشست کے اعتبار سے زیادہ رہا تھا کیونکہ تمام اے ڈی آئی صاحبان کے لئے ایک ہی کمرہ مخصوص تھا۔ وہ کسی ایک آدھ سکول کا چکر لگا آتے، کبھی کوئی مدرس لاگ بک لکھوانے آجاتا اور کبھی کوئی اور کام کرتے نظر آتے۔ میں بھی زیادہ تر دفتر ہی میں رہتا تھا۔ دورے پر بھی جاتا تب بھی واپس دفتر آنا پڑتا کہ کوئی فوری نوعیت کی چٹھی بسلسلہ ترقیات نہ آئی ہو۔افسران کا حکم بھی یہی تھا۔ باہمی نشست کی وجہ سے ملک صاحب میری محرومیوں سے خوب واقف تھے اور میں ان کی فتوحات سے۔لیکن کبھی ان موضوعات پر گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کی وجہ سے ملک صاحب کا ضلعی ناظم تعلیم کا دور بڑا ہنگامی تھا۔لوگ انھیں نواب آف کالا باغ کا آدمی خیال کرتے تھے۔ پارٹی کے کارکن، عہدیدار اور منتخب ارکان اپنی حیثیت منوانے کے لئے پرانے دفتری طریق کار کو فوراً بدل دینا چاہتے تھے۔ ویسے بھی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے حکومت پہلے ہی محکمے کی تنظیم نو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔اس سوچ کی زد براہ راست ضلعی ناظم تعلیم پر اس طرح پڑتی تھی کہ وہ درجہ دوئم (یا گریڈ سترہ) کا حامل افسر تھا۔اس آسامی کو درجہ اول کے افسر کے لئے مخصوص کیا جا رہا تھا۔اس تنظیم نو کے خلاف ڈسٹرکٹ اِنسپکٹروں نے پنجاب کی سطح پر بڑا واویلا مچا ر رکھا تھا کہ اچھے بھلے چلتے کام میں رکاوٹیں ڈالنے کے لئے کوئی تخریبی ہاتھ سرگرم عمل ہے۔ چونکہ ڈسٹرکٹ انسپکٹروں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے وہ کوئی مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے تاہم وہ مختلف تنظیموں سے تنظیم نو کے خلاف آوازیں بلند کروانے کے لئے اخباری بیانات دلوا اور پمفلٹ شائع کر رہے تھے۔

تنظیم نو کے تحت نئے ضلعی افسران ضلع میں وہی اختیارات استعمال کرتے جو ڈویژنل انسپکٹرز آف سکولز ڈویژن میں کر رہے تھے۔ ڈویژن میں انسپکٹر کی جگہ نئے ڈائریکٹر تعلیمات متعین ہونے تھے۔ان ڈائریکٹروں کے لئے انیسویں گریڈ میں ہونا ضروری تھا جو کالج کیڈر ہی سے دستیاب ہوتے۔ سکول کیڈر کی تنظیموں کو اس تنظیم نو سے اختلاف تھا، وہ ڈی پی آئی کی سطح تک سکول کیڈر کے اساتذہ کے متعین کئے جانے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔حکومت نے اصولی طور پر ان کا موقف تسلیم بھی کر لیا تھا۔

☆☆

گلزار بھٹی صاحب موقع شناسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، وہ تنظیم نو کی ہلچل کا انجام

دور سے دیکھتے رہے اور خود اس میں ملوث نہ ہونے کی خاطر دوڑ دھوپ کر کے سنٹرل ماڈل ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تعینات ہو گئے۔ گو بعد میں حکومت نے وقتی طور پر تنظیم نو کے عمل کو معطل کر دیا۔ گلزار بھٹی صاحب کی جگہ ملک غلام حیدر جو ترقی کر کے ہیڈ ماسٹ گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی تعینات ہو چکے تھے، بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تشریف لائے۔ مجھے ان کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ تنظیم نو کی معطلی کی وجہ سے ملک صاحب مزید کچھ عرصہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر متعین رہے۔ انھوں نے کئی منظور شدہ سکولوں کو امدادی رقوم کی تقسیم کی فہرست میں شامل کیا جن میں چند سکول میرے حلقے کے بھی تھے۔ ایسے سکولوں کے مینجروں کی بیٹھے بٹھائے لاٹری نکل آئی، وہ بہت خوش تھے۔ امدادی رقوم کوئی غیر معمولی رقوم نہ تھیں لیکن پھر بھی نہ ہونے سے تو بہتر تھیں اور ہزاروں میں تھیں۔ مینجروں نے بڑی دیانت داری سے مٹھائی یا پھلوں کی ڈالیوں کے ساتھ رقوم کے حصے بھی گھروں تک پہنچائے۔

☆☆

ملک صاحب کی فطرت میں بیک وقت کئی تضادات تھے، وہ دوستوں کو نوازتے، ان کے کام کرتے، ان کی خاطر دوسروں سے الجھ بھی جاتے لیکن بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھ بھی جاتے اور کہتے کہ تمھیں شرم نہ آئی، میں نے تمہارا یہ کام کیا، وہ کام کیا، فلاں وقت یاد کرو لیکن جلد ہی من بھی جاتے۔ ان کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ کسی کو قلم کی مار نہیں دیتے تھے، ڈانٹ ڈپٹ دیتے اور پھر معذرت قبول کر لیتے۔ نذیر احمد شاہ اے ڈی آئی برائے تربیت جسمانی ملک غلام حیدر کی ترقی کے ساتھ ہی ریٹائر ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک نومسلم شیخ محمد اسلم صاحب تشریف لائے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے از خود ہی ملک صاحب کے 'ایڈی کانگ' بن گئے۔ وہ ان کی ڈائری اٹھائے ساتھ ساتھ رہتے ہر بات میں لقمہ دیتے اور ہر معاملے میں مشورہ دیتے۔ ہمیں ان کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن کھانے میں ان کے ٹانگ (بلکہ ٹانگیں) اُڑانے پر شدید اعتراض تھا۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے ہم ان کو 'خیبر پاس' کہتے تھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے دوروں کے دوران سب مقامی اے ڈی آئی ضلعی افسر تعلیم کے ساتھ جاتے تاکہ سکول کا جامع معائنہ ہو سکے۔ کھانے کے وقت شیخ صاحب ضلعی افسر کے دائیں ہاتھ بیٹھ جاتے۔ دیسی مرغ کے سالن کا جوڑ ونگہ ضلعی افسر کے سامنے رکھا جاتا وہ لازماً 'اعلیٰ ذات' کا ہوتا۔ ملک صاحب ایک آدھ بوٹی اور شوربہ

ڈال کر اسے شیخ صاحب کی طرف بڑھاتے اور شیخ صاحب پورا ڈونگہ ہی اپنی پلیٹ میں اتار لیتے۔ چند پنجر اور شوربہ چھوڑ دیتے۔ اس عمل میں وہ کوئی جھجک نہ رکھتے تھے۔ ہمیں ان سے یہی گلہ تھا۔ حقیقی خیبر پاس سے تو فوجیں تک بغیر نقصان کے گزر چکی تھیں۔ مگر یہ خیبر پاس کاٹھ دشمن تھا۔ میزبان کو اپنے لئے رکھا ہوا ڈونگہ مجبوراً لانا پڑتا۔

☆☆

ملک صاحب کا معائنہ قواعد وضوابط، درس تدریس، تحریری کام کی پڑتال، رجسٹروں کی پڑتال اور غیر نصابی سرگرمیوں کے جائزے وغیرہ کی وجہ سے اس قدر سخت ہوتا کہ عموماً بعض ہیڈ ماسٹر اے ڈی آئی صاحبان سے گزارش کرتے کہ وہ ملک صاحب کو ان کے سکول کے معائنے سے ٹالے ہی رکھیں۔ بے شک ہماری طرف سے ان کی کسی اچھے ریسٹورنٹ میں شاندار دعوت بھی کر دیں، ہم آپ کی بھی خاطر خواہ خدمت کر دیں گے۔ اے ڈی آئی حضرات بھی جانتے تھے کہ وہ کون سی چال چلیں کہ ملک صاحب فلاں فلاں سکول کا معائنہ نہ کر سکیں۔ ادھر ملک صاحب کی بھی ساری عمر اسی دشت کی سیّاحی میں گزری تھی، فوراً کہتے کہ تم جو میرا منہ گھر بیٹھے ہی میٹھا کرا رہے ہو یہ بتاؤ کہ تم نے اپنا منہ کتنا نمکین کیا ہے؟ بہرحال وہ ہماری التجا مان لیتے۔ جو صدر معلم اکڑ باز اور طرّم خان ہوتے اور ہماری مرضی کے خلاف چلنے کے علاوہ لب ولہجہ بھی درست نہ رکھتے، ان کے بارے میں ہم ملک صاحب کو عرض کر دیتے کہ جس سکول میں ہم جا رہے ہیں وہاں فلاں فلاں شخص کو ذرا کھینچنا ہے تو وہ بلا تامل اس پر عمل کر کے ہمارا وقار بلند کرتے۔

☆☆

ایک شخص بہت نمازی، پرہیزگار لیکن قانونی اور اکڑفوں مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اسے اس کے اے ڈی آئی نے غالباً کچھ کتابوں اور کاپیوں کی فراہمی کے لئے کہا، اس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس کے اے ڈی آئی نے اس کے خلاف ایک جھوٹ موٹ کی درخواست اپنے کسی منہ چڑھے مدرس سے لکھوا کر داغ دی۔ ملک صاحب نے اس کی تحقیقات منصور علی خان کے ذمے لگائی۔ منصور علی خان نے اس کی چھان بین کی تو اسکول کے عملے نے اپنے ہیڈ ماسٹر کے خلاف شہادتیں دیں، اس کا قصور محض یہ تھا کہ وہ مدرسین کو سکول میں بروقت آنے اور کام کرنے کو کہتا تھا۔ اس نے مدرسین کو امدادی کتب اور گائیڈیں بھی نہیں لگانے دی تھیں۔

تحقیقات سے ہیڈ ماسٹر بہت گھبرایا اور پنجاب ٹیچرز یونین کے ایک مولوی قسم کے عہدیدار کے پاس فریادی ہوا کہ وہ بے گناہ ہے' اسے بچایا جائے۔ مولوی صاحب نے اس سے پوچھا ''کیا کبھی وہ افسروں سے مُلاقاتی ہوا ہے؟ کبھی کسی کے بچوں کو پوچھا ہے؟ اور تو اور تم نے تو اے ڈی آئی سے بھی بنا کر نہیں رکھی۔ تمہارے اساتذہ کی کارکردگی ہی تمہاری کارکردگی ہے' تم مدرسے کے سربراہ ہو اور تمہارے مدرسین کی نااہلی کی سابقہ لاگ بک گواہ ہے۔ جو شخص زاہد خشک ہو اسے کسی ادارے کا سربراہ نہیں' ماتحت ہونا چاہیے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب کو یہی سزا ہو سکتی تھی کہ اسے کسی ہائی سکول میں ماتحت مدرس تعینات کر دیا جاتا۔ اِسے اپنی آزادی اور سربراہی جاتی نظر آنے لگی تو مولوی کی معیت میں ملک صاحب سے جا کر مل آیا' معافی طلب کی اور آئندہ 'بندہ' بن کر رہنے کی یقین دہانی کرائی۔ 'سجدہ سہو' غلطی کے ازالے کا بہترین طریقہ ہے۔

اگلی صبح ہیڈ ماسٹر مذکور کے خلاف انتظامی حکم کے تحت تحقیقات منصور علی خان سے لے کر راقم الحروف کو دے دی گئی اور راقم الحروف کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ شہادتوں اور لاگ بک کے مندرجات کو اوپر نیچے کر کے تحقیقات فائل کرنے کی رپورٹ کروں۔ میرے لئے ایسا کرنا ضروری تھا' مجھے ملک صاحب کا بڑا احترام تھا۔ انھوں نے میری عملداری کے پانچ سکولوں کو امدادی رقوم عطا کی تھیں۔

ملک صاحب ہمیشہ باوضو رہتے' سینما دیکھتے ہوئے بھی اُٹھ کر نماز پڑھ آتے تھے۔ اکیلے بیٹھے تسبیح پڑھتے رہتے اور کسی معلّمہ کو کبھی اپنے سامنے کھڑا نہ رہنے دیتے۔ کرسی خالی ہوتی تو اس پر بیٹھ کر بات کرنے کو کہتے اور اگر خالی نہ ہوتی تو کسی کو اُٹھا دیتے کہ بی بی بیٹھ جائے۔ لاگ بک ایسی لکھتے جیسے موتی پرو رہے ہوں۔ ان کا خط بھی بڑا خوبصورت تھا۔ تحریر بڑی باغ و بہار ہوتی۔ ان کا حسنِ کرشمہ ساز پھول کو کانٹا اور کانٹے کو پھول بنا دیتا تھا۔ ہم کہتے ''یہ ہیڈ ماسٹر بہت اچھا ہے۔ اس نے تدریسی اور غیر تدریسی کاموں میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ سال بھر کا کام معیاری ہے۔ تحریری کام پر قرار واقعی توجہ دی ہے۔''

وہ غور سے ہمیں دیکھتے اور کہتے ''میری نظر میں ہیڈ ماسٹر کو کام کی الف بے کا بھی شعور نہیں۔ رجسٹر گندے' چارٹوں پر مکھیوں کی غلاظت جمی ہے' اس کے دفتر کے کونوں سے ایسی بو آ رہی ہے جیسے چوہے مرے پڑے ہوں' سکول کی کھیتیاں ویران پڑی اس کی جان کو رو رہی

ہیں، باغیچہ اجڑا ہوا ہے، درختوں کو کاٹ کر ٹنڈ منڈ کر دیا ہے، چار دیواری میں شگاف پڑے ہیں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں کبھی کوئی اعزاز حاصل نہیں کیا۔ اس سے تو وہ علم دین ٹوپی والا ایس وی ہیڈ ماسٹر اچھا تھا۔"

ہیڈ ماسٹر بچارا شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ ہم بھی گنگ ہو جاتے۔ ہم غور کرتے تو ملک صاحب کا مشاہدہ ہی درست ہوتا۔ ہیڈ ماسٹر کو اپنا قصور یاد آ جاتا کہ وہ معائنے سے ایک دو روز پہلے معائنے کے معاملات طے کرنے کی خاطر ان سے مل کر کیوں نہیں آیا۔ اس نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے معائنے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اس تکرار کے دوران ہم باہر نکل آتے کہ کہ ہیڈ ماسٹر ضلعی افسر تعلیم سے معافی مانگ لے۔ جب ہیڈ ماسٹر معافی تلافی کی منزل سے گزر جاتا تو پھر ملک صاحب مسکراتے ہوئے ہم سے مخاطب ہو کر کہتے:

"ہیڈ ماسٹر صاحب معذرت خواہ ہیں اور آئندہ بہترین کام دکھانے کا عہد کرتے ہیں۔ آخر کو ہمارے ماتحت ہیں، ہم ہی ان کی پردہ داری اور دلجوئی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا! آپ لوگ اپنی اپنی معائنہ رپورٹ حوصلہ افزا اور مشفقانہ رہنمائی کے انداز میں لکھیں۔"

وہ سب رپورٹوں کو پاس رکھتے لیکن لاگ بک اپنے خوبصورت خط میں خوب تر لکھتے۔ ہیڈ ماسٹر کے متعلق بھی ایسے جملے لکھ دیتے کہ وہ اِتراتا نظر آتا۔

☆☆

سکولوں کے لئے ضروری سامان خریدنے کے لیے بابو مجید اور ملک صاحب دن رات کام کر رہے تھے۔ جون کا مہینہ سر پر آ پہنچا تھا اور سُست رفتار کلرک نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ملک صاحب صبح آتے ہی اسے کبھی کڑوی اور کبھی میٹھی جھاڑ پلاتے۔ دن بھر میں بہت سے ٹھیکیدار بھی چکر لگا جاتے۔ بالآخر وہ دن آ پہنچا جب ٹھیکیداروں کو مال فراہم کرنے کے حکم نامے جاری کر دیے گئے۔ سامان پہنچانے سے پہلے انھیں تفصیلی بل مہیا کرنے کو کہا گیا۔ سب مراحل طے ہو گئے۔ جستہ جستہ سامان بھی پہنچنا شروع ہو گیا۔ بابو مجید نے خریداری کی پوری کارروائی کے کاغذات تیار کر لیے۔ دفتر ڈائریکٹر میں ان کاغذات کی آخری پڑتال بجٹ آفیسر کو کرنا تھی، ملک صاحب ان کاغذات پر دستخط کر رہے تھے کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ضلعی افسر کے فون کی گھنٹی بجی، اور انھیں ان کی والدہ ماجدہ کے انتقال کی اطلاع دی گئی، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ رومال سے آنسو پونچھتے جاتے اور پڑتال کی

خاطر بھیجنے کے لئے کاغذات پر دستخط کرتے جاتے۔ ساتھ ساتھ بابو مجید کے بارے میں کہتے جاتے کہ حرام خور نے دیر کر دی، اسے پتہ تھا کہ میری ماں کئی دن سے ہسپتال میں تھی۔ اسے بتایا بھی تھا کہ اِس کی زندگی خطرے میں ہے۔

دستخط کرنے کے بعد انھوں نے ڈائریکٹوریٹ میں ٹیلیفون کیا، بجٹ افسر کو پہلے تو والدہ کی رحلت کی اطلاع دی اور پھر اسے کہا کہ وہ ضلع لاہور کی خریداری کے تمام کاغذات ان کی خدمت میں ارسال کر رہے ہیں، وہ ان کی پڑتال آج ہی کر دیں تاکہ اِن کو بلوں کے ساتھ اے جی آفس میں بھیجنے کا مرحلہ جلدی طے ہو جائے۔ بجٹ افسر کو مزید کہا کہ حرام خور اے جی آفس والوں نے تو ہڑتال کر دی ہے اور اب گرانٹوں کے لئے خصوصی سیل قائم کئے گئے ہیں، وہاں نہ جانے کل کو کیا حال ہو۔ ماں کی بے وقت موت نے ان کو بے حال کر دیا ہے اور انھیں اس وقت سب کے تعاون کی ضرورت ہے۔

ڈائریکٹوریٹ کے بجٹ افسر سے بات چیت کرنے اور اس کی ''ہاں'' سُننے کے بعد انھوں نے لکڑی کے ایک ٹھیکیدار کو فون کیا جو جلد ہی کار لے کر پہنچ گیا۔ ایک اور ٹھیکیدار کو ایمبولینس کے لئے کہا کہ انھیں میت کو تدفین کے لئے بھکر کے قریب واقع اپنے آبائی گاؤں لے جانا تھا۔ ہم میں سے کچھ اے ڈی آئی پہلے ہی ان کے گھر پہنچ گئے تھے۔

اگلے روز دفتر کھلنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے کہ ملک صاحب اہل خانہ سے بھری ویگن اور میت لے جانے والی ایمبولینس سمیت گاؤں کو روانہ ہوئے تو تھوڑا سا راستہ بدل کر دفتر آ گئے۔ گاڑیوں کو باہر روک کر وہ بلوں پر دستخط کرنے بیٹھ گئے۔ روتے جاتے اور بابو مجید کو معمول کے مطابق کوستے جاتے۔ ''تمھیں کہا تھا جلدی کام ختم کر لو۔ تم انتہائی سست ہو۔ اِدھر امّاں کو اگلے گھر جانے کی جلدی پڑ گئی۔ کوئی دس دن رُک جاتی تو کیا تھا، بیمار تو وہ دو سال سے چلی آ رہی تھی! میں تو جا رہا ہوں ماں کو قبر میں اُتارنے، تم ان حرام خور ٹھیکیداروں کو ساتھ لے جا کر بل اے جی آفس میں جمع کرا دو۔ اس فرنیچر والے کو ساتھ ہی رکھو وہ پیپلز پارٹی کا چمچہ ہے، حرام خور سے ایک پیسے کی توقع نہ کرنا وہ مروا دے گا، اسی کی وجہ سے میں یہ جنازے کا جلوس لے کر آیا ہوں۔

اور وہ خبیث پرپیچوئل کیلنڈر والا، پارٹی کا سالا جو لائبریری کی ساری گرانٹ ہی لے گیا ہے، آئے تو اس سے کیلنڈر وصول کر لینا۔ اگر تمھاری کوئی خدمت کرے تو کچھ نہ لینا، پھنسا

دے گا۔ (کراچی کے ایک شخص نے 'ایک قول قائداعظمؒ اور ایک قول 'قائدعوام' کا لکھ کر تاریخ بدلنے والا کیلنڈر تیار کیا تھا اور وزارت تعلیم پاکستان سے ان کی لازمی خریداری کی چھٹی بھی لئے پھرتا تھا۔ ملک صاحب پیپلز پارٹی کے ٹھیکیداروں سے بڑے خائف تھے۔

''اب تو کوئی خامی باقی نہیں۔ آج وہاں سے منظور ہوں تو کل بینک میں جمع کرا دینا۔ 'حمیداللہ کو بھی ساتھ لے جانا''۔ ملک صاحب نے بابو عبدالمجید سے کہا۔

دستخطوں سے فارغ ہو کر ملک صاحب ایمبولینس میں بیٹھ کر گاؤں روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح ٹھیک ساڑھے سات بجے ملک صاحب دفتر میں موجود تھے' وہ والدہ کی تدفین کے بعد ایمبولینس ہی پر لوٹ آئے تھے۔ آخر گرانٹوں کا معاملہ تھا اگر بروقت خرچ نہ کی جاتیں تو نالائق ٹھہرائے جاتے۔ حساب کتاب کی بھی بات تھی۔ انھوں نے بتایا کہ گو وہ 'قُل'' ساتواں' 'دسواں اور چالیسواں کے قائل ہیں کہ ان تقریبات سے افسردگی دور کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن احساس فرض بھی کوئی چیز ہے۔ واقعی وہ جب سے ضلع کے افسر بنے تھے تب سے ضلع بھر کے مدرسین کو تنخواہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو مل رہی تھیں۔

ایک اکاؤنٹس آفیسر ملک صاحب کے کام آیا' جملہ گرانٹوں کے چیک وصول ہو گئے۔ ٹھیکیدار بڑے خوش تھے کہ گزشتہ کئی سالوں سے رد کئے جانے والا سارا سامان اِمسال نکل گیا ہے' ''اب جاٹ جانے اور بجوّ جانے'' انھوں نے تو پیسے کھرے کر لئے ہیں۔ جاٹ ملک صاحب تھے اور بجوّ وہ ہیڈ ماسٹر صاحبان جن کے سکولوں میں ان کا مہیا کردہ مال جانا تھا۔ ان کی کامیابی میں بھی ضلعی صدر پی پی کا ہاتھ تھا

لائبریری کی کچھ کتب پر اعتراضات کرنے اور کچھ ناشروں کو برابر کا حصہ خریداری میں نہ دینے پر اور لائبریری کی نصف گرانٹ کیلنڈر والے کے لے جانے کے باعث ملک صاحب کو کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک معروف ناشر سے ملک صاحب کی اسی سبب سے تلخ کلامی ہو گئی۔ اس نے ملک صاحب کی شکایت وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق سے کی اور وزیر صاحب نے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کو فون کیا کہ ضلعی تعلیمی افسر لاہور پارٹی کے عہدیداروں کو غنڈے کہتا ہے۔ اسے فوری طور پر دور دراز مچھ نامی قصبے میں تبدیل کر دیا جائے۔ ڈی پی آئی صاحب ملک صاحب کو ملک امیر محمد خان کے زمانے سے جانتے تھے' انھوں نے ملک صاحب کو وزیر تعلیم کے زبانی احکامات سُنائے تو ملک صاحب پریشان ہو گئے۔

میرا اُٹھنا بیٹھنا گیلانی پریس ۲- ہسپتال روڈ پر ہوا کرتا تھا۔ وہاں میاں افتخار احمد تاری بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے پاس پیپلز پارٹی کے زُعما آیا کرتے اور پھر اُن کو ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ان سے شناسائی دوستی کی حد تک تھی۔ میں اور منصور علی خان رات کو میاں افتخار تاری جو محکمہ پبلک ورکس کے وزیر تھے، کے پاس ان کی سرکاری رہائش پر گئے۔ وہ کارکنوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں مخصوص مہمانوں کے کمرے میں بٹھایا۔ ان سے ہماری ملاقات کار گر رہی۔ میاں افتخار تاری نے وزیر تعلیم کو فون کیا اور اگلے دن انھوں نے نہ صرف ملک صاحب کو معاف کر دیا بلکہ ان سے معذرت کی اور شکایت کنندہ کو کوڈانٹا کہ ملک تو خود پارٹی ہی کا آدمی ہے اور تم اُس سے اُلجھتے ہو۔

کچھ جیالوں کی تسلی نہیں ہوئی، انھوں نے ملک صاحب کے خلاف سامان مدرسہ میں گڑ بڑ کرنے کی ایک فہرست الزامات مرتب کی اور سیکرٹری محکمہ تعلیم سے ملک صاحب کی جواب طلبی کرادی۔ ملک صاحب نے تمام الزامات کے جواب میں لکھا کہ ضلع میں جس قدر خریداری ہوئی ہے اس میں ان کا کردار پرچیز کمیٹی کے سیکرٹری کا ہے۔ خریدے ہوئے مال پر جو تنقید کی گئی ہے اس کا جواب محکمہ صنعت کا فنی مشیر اور چیئر مین پرچیز کمیٹی دے سکتا ہے۔ میں نے تو پرچیز کمیٹی کی کلرکی کا کام دیانتداری سے کیا ہے۔

☆☆

فنی مشیر اور چیئر مین سے کسی نے نہیں پوچھا، بات آئی گئی ہوگئی۔ ملک صاحب پھر سے گورنر ہاؤس آنے جانے لگے کیونکہ بیگم شہزاد کھر نے کھر صاحب کے پہلے صاحبزادگان کے لئے اتالیق اور نگران کی ضرورت محسوس کی تو انھیں کسی تجربے کار اور گورنر ہاؤس کے آداب سے آشنا فرد کی تلاش ہوئی۔ ملک صاحب کے بارے میں سیکرٹری گورنر ہاؤس نے بتایا کہ اس سلسلے میں وہ ادھر آیا کرتے تھے چنانچہ وہی معیار پر اُترے۔ ایک بار پھر ملک صاحب کا طوطی بولنے لگا۔ یہاں تک کہ ملک صاحب کے ڈاکٹر بیٹے کی شادی پر وحدت کالونی کے گورنمنٹ کوارٹر میں گورنر پنجاب مسٹر کھر اور بیگم شہزاد کھر دونوں بطور مہمان خصوصی تشریف لائے۔

حکومت نے پارٹی منشور پر عمل کرتے ہوئے ہر ڈویژنل مرکز پر تعلیمی ریکروٹمنٹ کمیٹی قائم کی۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اس کمیٹی کا سیکرٹری نامزد کیا گیا اور اسی کے دفتر میں کمیٹی کا دفتر قائم ہوا۔ لاہور ڈویژن کی کمیٹی کے سربراہ ملک غلام نبی تھے جو جانے

پہچانے سیاسی کارکن اور پارلیمانی آدمی تھے۔ محکمہ تعلیم میں ہونے والا ہر تقرر اسی ریکروٹمنٹ کمیٹی کے ذریعے عمل میں آتا۔ کمیٹی کا سیکرٹری ہونے کی وجہ سے ضلعی افسر تعلیم کی اہمیت خاصی بڑھ گئی۔ ویسے بھی جو کام ہوتا چیئرمین ملک غلام نبی ان سے مشورے کے بغیر نہ کرتے۔ جو کام چیئرمین خصوصی طور پر یا اپنے ایماء پر کرنا یا کرانا چاہیے اس کے بارے میں وہ سیکرٹری کو کہہ دیتے کہ یہ کام فلاں ممبر کمیٹی کا ہے، فلاں مشیر کی سفارش ہے یا یہ میرا ذاتی نوعیت کا کام ہے۔ کاغذات کی پڑتال وغیرہ مَیں اور منصور علی خان کرتے۔ کوئی خامی ہوتی تو دور کرتے۔ کام تو بہرحال کرنا ہی ہوتا تھا۔

اس دور میں پوری لاہور ڈویژن میں بہت زیادہ تقرریاں ہوئیں، کلرکوں کی، اسسٹنٹوں کی، کیئر ٹیکرز کی، درجہ چہارم کے ملازمین کی اور اساتذہ کی بھی بھرتی ہوئی۔ ہر تقرر سفارش کی بنیاد پر ہوا۔ پیپلز پارٹی نے پیمانہ ہی اپنے کارکنوں کی سفارش رکھا۔ ایک ہی وقت میں لاہور ضلع میں غیر تربیت یافتہ پانچ سو پرائمری اساتذہ کا تقرر ۱۹۷۱ء کا ریکارڈ تقرر ہے۔ ریکروٹمنٹ کمیٹی نے ہر ضلع کے ہر ایم پی اے کو اپنے حلقوں سے دس دس اساتذہ کی سفارش کرنے کا اختیار دیا۔ تربیت یافتہ اساتذہ دستیاب نہ تھے لہٰذا غیر تربیت یافتہ میٹرک ایف اے ہی پی ٹی سی ٹیچر کی آسامی کے لئے موزوں تھے۔ بیشتر ممبران نے اپنے حلقے کے امیدواروں میں سے دس دس کی جو فہرستیں مقررہ تاریخ تک ریکروٹمنٹ کمیٹی کو مہیا کیں ان کو انھوں نے بوجوہ کئی کئی بار تبدیل کیا۔ ایک ممبر کے متعلق مشہور ہوا کہ اس نے باقاعدہ بولی لگا کر دس کی دس آسامیاں نیلام کی ہیں۔ اس کے تمام سفارشی تھرڈ ڈویژن میٹرک تھے۔ سیکرٹری صاحب نے کمیٹی کے چیئرمین کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو انھوں نے کہا "چلانے دو ان کو چمڑے کے سکے، جلد ہی ان کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔" پتوکی کے ملک اللہ دتہ ایم پی اے واحد شخص تھے جنہوں نے اپنی سفارشات بغیر کسی لالچ کے میرٹ کی بنیاد پر کیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ابتدائی ایام میں ہر کس و ناکس کی رسائی اراکین اور مشیران حکومت اور وزراء تک آسانی سے ہو سکتی تھی۔ ملاقاتوں کی اس عام اجازت کی وجہ سے افسران خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں ان کے بارے میں شکایات اوپر کے حکومتی حلقوں تک نہ پہنچ جائیں۔ محکمہ تعلیم کے افسران نے بھی ملاقاتوں کے لئے اپنے دفاتر کے دروازے کھول دیئے تھے۔ شکایات، سفارشات، اور مطالبات کے ڈھیر لگ گئے۔ عوام کے دُکھ ہی اتنے

تھے کہ ہر محکمے کو خصوصی شکایات کے سیل قائم کرنا پڑے۔ حکومت عوامی دکھوں کا علاج منضبط طریقوں اور حکمت عملی سے ذریعے کرنا چاہتی تھی لیکن پارٹی نے اپنی انتخابی مہم میں ''روٹی' کپڑا اور مکان مانگ رہا ہے ہر انسان'' کا جو نعرہ لگایا تھا اس کی روشنی میں غریب عوام یہ چاہ رہے تھے کہ حکومت اُمراء زمینداروں اور تاجروں سے سب کچھ چھین کر ان میں بانٹ دے۔ لہٰذا پارٹی کی اوپر کی سطح پر فیصلہ کیا گیا کہ پارٹی کے کارکنوں کو سمجھایا جائے کہ اصلاحات بتدریج ہوں گی۔ وہ ہر وقت حکام کو ''یہ کرو اور وہ نہ کرو'' قسم کے مطالبات سے پریشان نہ کریں' ان کو اپنے فرائض منصبی بھی ادا کرنے دیں۔ برسر اقتدار سیاستدان بھی اپنی سیاسی چالیں چلنے لگے۔ ''پیپلز پارٹی'' اپنی سطح پر انوکھے انوکھے کام کرنے لگی۔ یکا یک ملنے والے اقتدار اور ملک کے دولخت ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل نے نئی قیادت کو بوکھلا دیا تھا۔ بہر صورت وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ملک غلام نبی صاحب کو پنجاب کی نئی کابینہ میں وزیر تعلیم کا عہدہ ملا تو انھوں نے سب سے پہلے ڈویژنل ریکروٹمنٹ کمیٹی کے اہل کاروں اور دیگر عہدیداروں سے کہا کہ وہ اب ان سے ملاقات کرتے وقت ادب آداب کو ملحوظ خاطر رکھیں' جب جی چاہا منہ اُٹھائے سیکریٹریٹ میں نہ گھس آیا کریں۔

جو عوامی نمائندے اسمبلی کے اندر پہنچ گئے تھے اور نوکر شاہی جن کو اپنے مرتبے کی شناخت کروا رہی تھی' اب آہستہ آہستہ عوام سے پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ بھولے عوام تو یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ضرور ان کو روٹی کپڑا اور مکان مل کر رہے گا۔ وہ قدرے منہ زور بھی ہو رہے تھے اور بے ہنگم بھی' انھیں اصل اوقات سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ کئی باتوں پر قدغن لگائی گئی۔ کئی نئے طریق کار وضع کیئے گئے۔ نئی نئی جھنجلاہٹیں دیکھ کر لوگ ہکلائے' سٹپٹائے اور خاموش ہو گئے' وقت اپنے فطری تقاضے پورے کرتے ہوئے سب کو پھلانگتا آگے بڑھ رہا تھا۔ عوام کہنے لگے کہ ان کے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ہو گیا ہے' سیاسی باتوں اور نعروں میں کوئی قیام وقرار اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔

☆☆

اداروں کو قومیانے کے عمل کی بنیاد رکھنے کے لئے حکومت نے بڑے بڑے صنعتی اداروں' کاروباری کمپنیوں اور بینکوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اِن کی سربراہی اور عہدے تقسیم کر کے بے شمار مخالفین اور طالع آزما لوگوں کے منہ بند کیئے گئے۔ قومیانے کے اس عمل سے

اداروں کے کارکنوں اور دیگر ملازمین کو روزگار کا تحفظ ملا، تنخواہیں معقول ہوئیں، ادائیگی بروقت ہونے لگی اور مالکان کی ریشہ دوانیوں سے نجات ملنے اور دیگر سرکاری اہلکاروں جیسی سہولتوں کی وجہ سے عام کارکن بہت خوش تھے۔

مُلک بھر کے نجی اور قومی تعلیمی اداروں کو بھی قومیا لیا گیا۔ جتنے بھی نجی اور قومی تعلیمی ادارے محکمہ تعلیم کے کاغذات میں منظور شدہ یا رجسٹرڈ تھے اس عمل سے مستفید ہوئے۔ وہ مالکان اور انجمنیں جنھوں نے تعلیم کے نام پر بڑی بڑی عمارتیں اور زمینیں حاصل کر رکھی تھیں اور ان کی ذاتی صوابدید پر استعمال ہوتی تھیں حکومت کے اس فیصلے سے بڑے بے چین ہوئے۔ بے شمار نجی اداروں کے مالکان نے راتوں رات اپنے ادارے بند کر کے ان کو رہائش گاہوں کی شکل دے دی۔ بعض تالے لگا کر فرار ہو گئے۔ چونکہ اس اہم اقدام کے لئے پیشگی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اس لیے کئی مسائل نے سر اُٹھایا۔

☆☆

۱) عمارتوں کے مالکان اور اداروں کے عملے کے درمیان لامتناہی کشمکش شروع ہو گئی۔

۲) بعض تنظیمیں اور مالکان نے کچھ اثاثے چھپا لیے اور انھیں ادارے کی ملکیت ظاہر نہیں کیا بلکہ ذاتی اور نجی ملکیت ظاہر کیا، عملے نے اس ضمن میں شکایات کے انبار لگا دیئے

۳) ایسے بھی مالکان اور مینجر تھے جنھوں نے کبھی اپنے نام عملے میں شامل نہیں کیئے تھے، ان کو ادارے کی آمدنی سے محروم ہونا پڑا۔

۴) بعض نے بھاگ دوڑ کر کے اور محکمہ تعلیم کے افراد کی ملی بھگت سے عملے کی فہرستوں میں اپنے رشتے دار مردوں اور عورتوں کے نام مختلف عہدوں پر درج کرا کے قومیانے کے عمل کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔

۵) وہ لوگ جو ایسے اداروں کو باقاعدہ صنعت کے طور پر چلا رہے تھے، حکومت کے اس فیصلے سے سخت پریشانی میں مبتلا ہوئے۔

۶) نام نہاد مالکان جو عملے کو ناکافی تنخواہیں دیتے تھے اور اپنی تنخواہ بھی کم ظاہر کرتے اور خُدا ترس شمار ہوتے تھے اب پہلے سے مہیا کی گئی اعداد و شمار کی فہرستوں کے پیچھے بھاگ کر ان کو اپنی اپنی منشاء کے مطابق درست کرنے لگے۔

تعلیمی اداروں کے قومیائے جانے کے عمل میں بھی تدریسی اور غیر تدریسی عملے کا

زیادہ فائدہ ہوا' مالکان اور انجمنوں کے حصّے کچھ نہ آیا۔ جن انجمنوں اورافراد نے واقعی قومی خدمت کے حوالے سے درس گاہیں قائم کررکھی تھیں اوران کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں شدید دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی انھوں نے قومیائے جانے کے اس عمل کو نعمت غیر مترقبہ خیال کیا اور ہنسی خوشی سب کچھ حکومت کے سپرد کر دیا۔ ایسے اداروں میں انجمن حمایت اسلام لاہور اور بعض دیگر انجمن ہائے اسلامیہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر خوش ہوئے بلکہ ان کا تاثر یہ تھا کہ ان کی سر دردی اب حکومت نے سنبھال لی ہے۔ کئی مشنری اداروں نے بھی بلاچوں چراں اپنے ادارے حکومت کی تحویل میں دے دیئے۔

ایسے مشنری اور دیگر ادارے جو یورپی طرز کے ادارے کہلاتے تھے اور جن کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا' انھیں خود ہی حکومت نے قومیانے کے عمل سے الگ کر دیا تھا۔ جن اداروں میں مالکان اور ملازمین کے مابین تصادم کی صورت پیدا ہوتی وہاں کا عملہ روتا ہوا تعلیمی دفاتر کا رخ کرتا جبکہ مالکان عدالتوں سے رجوع کر رہے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اے ڈی آئی ترقیات کی طرح ایک اے ڈی آئی (مقدمات) کی آسامی بھی تخلیق کرنی پڑی۔

تمام پرائمری' وسطانی اور ثانوی مدارس کے علاوہ کالجوں میں بیشتر عملہ غیر تربیت یافتہ تو تھا ہی' ان میں بیشمار لوگ اسامی کے تقاضے کے مطابق مطلوبہ بنیادی تعلیم کے حامل نہیں تھے۔ حکومت نے فراخ دلی سے اعلان کیا کہ کسی بھی مدرس یا دیگر عملے کے رکن کو سرکاری ملازمت سے فارغ نہیں کیا جائے گا' وہ جس اسامی پر تعینات ہے اور وہ اس کی بنیادی اہلیت پوری نہیں کرتا تو اسے بنیادی اہلیت کے حصول کا موقع دیا جائے گا۔

یوں تعلیم قومی مقاصد سے بے گانہ ہوگئی۔ نصابی تعلیم رسمی اور برائے نام رہ گئی۔ الجھنیں بڑھ گئیں' بے قراریاں پھیل گئیں۔ ہر شخص ہر معاملے کو ذاتی مفاد اور مراعات کے ترازو میں تولنے لگا اور عوامی دور کے رہبروں نے تعلیم و تعلم کے سارے اثاثے اور معلم و متعلم کی ساری قدریں روند کر ہر طرف انتشار پھیلا دیا۔

◆◆◆◆◆

(۳۲)

ایک سکول کا معائنہ

پنجاب بوائز سکاؤٹس ایسوسی ایشن کی سالانہ تقریب میں بطور مہمان خصوصی، ڈاکٹر جہانگیر خان ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کو گھوڑا گلی اسکاؤٹ کیمپ میں بلایا گیا تھا۔ وہ تقریب سے دو تین روز پہلے ہی مری کے سرکاری مہمان خانے جا پہنچے۔ مقصد یہ تھا کہ اسی بہانے تھوڑی بہت سیر بھی ہو جائے۔ سرکاری مہمان خانے میں چند اور افسر بھی قیام پذیر تھے۔ علی الصباح وہ سیر کے لیے دور تک نکل جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک سیر کے دوران انھوں نے دیکھا کہ کوہساری پتھروں کے بنے دو کمروں کے ایک مڈل سکول کو دلہن کی طرح سجایا گیا ہے، کمروں تک پہنچنے کے لئے جو ٹیڑھا میڑھا اور پست و بلند راستہ جاتا ہے اس پر رنگدار جھنڈیاں لہرا رہی ہیں اور گملوں میں پھول مہک رہے ہیں۔ کیری اور سفیدے سے پوری راہ گزر سجادی گئی ہے۔ عجیب سماں تھا۔ نہ جانے کون کون سے چھوٹے بڑے اور امیر و غریب گھرانوں کے مہذب بچے ادب اور احتیاط سے آ جا رہے تھے اور تین اساتذہ آٹھ اسکاؤٹس کے ایک دستے کی مدد سے کچھ خصوصی انتظامات میں مصروف تھے۔ دو افراد ایک ڈھول لئے بڑے سے پتھر پر سڑک کے رخ بیٹھے تھے۔ اس پتھر پر سفیدی سے 'خوش آمدید' لکھا ہوا تھا۔

ساتھیوں میں سے کسی نے ڈاکٹر جہانگیر خان سے پوچھا ''کیا آج آپ اس سکول کا معائنہ فرما رہے ہیں؟''

''نہیں...... میرا تو ایسا کوئی پروگرام نہیں لیکن آیئے دیکھتے ہیں ماجرا کیا ہے؟''

اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سکول کے راستے پر ہو لئے لیکن ابھی وہ آراستہ مقام تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ ایک مدرس اور اسکاؤٹس نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتے ہیں اور سکول کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ سکول کی سج دھج دیکھ کر اور طلبہ و اساتذہ کو سرگرم عمل پا کر

محض یہ جاننے کے لئے ادھر آئے ہیں کہ تقریب کیا ہے؟

''جناب والا! استاد نے کہا' ہمارے افسر سکول کے معائنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ ساری آرائش ان کے استقبال کے لیے کی گئی ہے۔ آپ لوگ سکول تک گئے تو ہمارا راستہ اوراس پر بچھی سرخ کیری آپ کے پاؤں سے پامال ہو جائے گی۔ آپ لوگ صرف پگڈنڈی سے پھاٹک تک جاسکتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب معذرت کر کے اپنے ساتھیوں سمیت واپس آ گئے لیکن انھیں تقریب دیکھنے کا اشتیاق باقی رہا۔ وہ سڑک پر لکڑی کی ایک جھونپڑی کے قریب رک گئے۔ ان کے ساتھی تو اکتا کر چلے گئے لیکن وہ وہیں ڈٹے رہے۔ کوئی گھنٹے بھر بعد ایک شخص دو ساتھیوں کے ساتھ بس سے اترا۔ ان کے استقبال کے لئے سکول کا عملہ آگے بڑھا۔ بس سے اترنے والے پہلے شخص سے انھوں نے جھک کر مصافحہ کیا۔ ایک مدرس نے اس کا دستی بیگ تھام لیا اور اسے آگے آگے چلنے کا اشارہ دیا۔ نقارہ بجا اور ڈھول پر تھاپ پڑنی شروع ہوگئی۔ یہ خیر مقدم کا رواجی علاقائی اسلوب تھا۔ اسکاؤٹس کے دستے نے سلامی دی اور پھر دورویہ کھڑے طلبہ نے تالیاں بجا بجا کر مرحبا' خوش آمدید' اللہ اکبر کے بلند آہنگ نعرے لگائے اور چھ آدمیوں کا جلوس راستے میں ایک گول دائرے پر رک گیا۔

ڈاکٹر جہانگیر خان خاموش تماشائی بنے دور ہی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اساتذہ کو مصروف پا کر وہ پھر استقبالیہ پتھر تک آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس دائرے میں ایک بکرا لایا گیا' افسر معائنہ یعنی اے ڈی آئی نے اس بکرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر چھری کو ہاتھ لگایا اور قصاب نے بسم اللہ' اللہ اکبر کہہ کر بکرا ذبح کر دیا۔

''کیا یہ بکرا مہمان کو کھلایا جائے گا؟......'' ڈاکٹر صاحب نے تجسس دور کرنے کے لیے ڈھولچی سے پوچھا۔ اس نے بتایا یہ صدقے کا بکرا ہے۔ اس کا گوشت غریبوں میں بانٹا جائے گا۔ سکول کے نادار اور یتیم بچوں کو دیا جائے گا۔ اور صاحب کے لئے میر عبدالرحمان کے گھر سے کھانا آئے گا۔''

ڈاکٹر صاحب بغیر کسی دخل در معقولات کے واپس آ گئے لیکن وہ یہ واقعہ اکثر اجتماعات میں سناتے رہے۔ انسپکٹرز کانفرنس میں مجھے بھی یہ واقعہ سننے کا موقع ملا۔ دراصل یہ محکمہ تعلیم پنجاب کے سب سے بڑے افسر کا اعتراف تھا کہ محکمہ تعلیم میں باعزت اور فعال اسامی صرف

اے ڈی آئی کی ہے۔ یہاں مجھے اس واقعہ کے اشارے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تا کہ میں اپنے عہدے کی اہمیت اجاگر کر سکوں۔

بھٹو مرحوم نے اپنی سیاست کو عوامی رنگ دینے کے لئے عوام' عوام کا نعرہ لگا کر لوگوں میں ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ بھٹو صاحب کامیابی کے بعد سرمایہ داروں سے مال و دولت چھین کر غریبوں کو دے دیں گے۔ یہ توقع تو پوری نہ ہوئی لیکن عوام کو ایک منہ زور زبان مل گئی جو دفاتر کے نظم وضبط میں بھی کترنی کی طرح چلنے لگی اور پی پی پی کے کارکن ہر طرف نت نئے طوفان اٹھانے لگے۔ انگریزی کے وہ مدرسین جو پارٹی سے یا تو خود ہمدردی رکھتے تھے یا ان کے عزیز و اقارب جو وقت کی فیض بخشی سے بلند مراتب تک پہنچے تھے ان کی نظریں اے ڈی آئی کی اسامی حاصل کرنے پر مرکوز ہو گئیں۔ انھوں نے ایوان حکومت میں یہ تاثر پھیلایا کہ اس وقت اے ڈی آئی حضرات اپنی اپنی اسامیوں پر مغل شہزادے بنے بیٹھے ہیں۔ عوامی دور میں شہزادوں کا کیا کام؟ انھیں ان کی آسامیوں سے ہٹا کر واپس سکولوں میں انگریزی پڑھانے کے لئے بھیج دیا جائے اور وہاں سے تازہ دم نوجوان اور پسندیدہ اساتذہ کو اے ڈی آئی کا منصب سونپا جائے۔ یہ روایت ختم کی جائے کہ اے ڈی آئی صرف ترقی پانے ہی پر تبدیل ہو سکتا ہے۔ ......اس فیصلے کے مضمرات سے کسی کو آگاہی نہیں تھی۔ عوامی دورِ حکومت کے داعی اسے انقلابی دورِ حکومت بھی کہتے تھے۔ وہ ہر تبدیلی پر ہونے والے احتجاج کو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ طرزِ کہن پر اڑنا اور نظام نو سے ڈرنا قوموں کی زندگی کا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ پاکستانی قوم تو اب قوم ہی نہیں رہی تھی۔ وہ تو 'عوام' بن چکی تھی۔ چنانچہ پنجاب کی عوامی وزارت تعلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسے اے ڈی آئی حضرات جو تین سال سے اس اسامی پر متمکن چلے آ رہے ہیں ان کو واپس ہائی یا مڈل سکولوں میں بطور انگریزی مدرس تعینات کر دیا جائے اور وہاں سے تین سال سے زائد عرصہ ملازمت والے انگریزی اساتذہ کو اے ڈی آئی تعینات کیا جائے۔

سفارشات کا دور تھا۔ کچھ نظم وضبط بھی جانے بوجھے ڈھیلا رکھا گیا تھا تا کہ عوام یہ سمجھیں کہ ان کی رسائی ایوان حکومت تک ہے۔ بہت سی اشیا کا حصول عوامی نمائندوں اور پی پی پی کے عہدیداروں کی مہر پر موقوف کر دیا گیا۔ محکمہ تعلیم پنجاب ڈاکٹر عبدالخالق کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں پیشہ ور ڈاکٹر ہوں۔ میں یہ تو جانتا ہوں کہ ڈاکٹر' ڈسپنسر اور طبی دنیا سے منسلک دیگر عملہ کیا کیا بدعنوانیاں کرتا ہے مگر تعلیم کے محکمے کے متعلق میں الف بے بھی

نہیں جانتا لہٰذا میرا اصول سفارش کی پاسداری ہے۔ جو سائل اپنے کام کے لئے دو ایم پی اے حضرات کی سفارش لے آئے گا میں اس کا کام جائز ناجائز دیکھے بغیر کر دوں گا اور میرے احکام سے متاثر ہونے والا فریادی اگر تین ایم پی اے حضرات کی سفارش لے آئے گا تو میں اپنے ہی احکام کو منسوخ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا......سفارش کا یہ معیار انھوں نے اے ڈی آئی صاحبان کے تبادلے اور نئے اے ڈی آئی صاحبان کے تقرر میں ملحوظ نہ رکھا۔ راتوں رات انھوں نے سفارشیوں سے اے ڈی آئی بننے کے امیدواروں کے لئے نام اکٹھے کیے اور متعلقہ دفتری اہلکاروں کو بلا کر یہ ہدایت کی کہ بطور مدرس تبدیل کیے جانے والے اے ڈی آئی صاحبان کو ان کے گھروں کے قریب ترین سکولوں میں تعینات کیا جائے تا کہ وہ شور نہ مچائیں اور صبح تک یہ احکام بذریعہ خصوصی ایلچی متعلقین تک دستی پہنچا دیے جائیں۔

عملے میں ہمارے بھی مہربان موجود تھے۔ احکام کی ایک نقل راتوں رات ہم تک پہنچ گئی۔ ہم نے صبح تک پنجاب کے تمام اضلاع میں اطلاع بھیج دی کہ تمام اے ڈی آئی صاحبان اگلے روز اپنے دفاتر حاضر نہ ہوں تا کہ نئے اے ڈی آئی صاحبان انھیں فارغ نہ کرنے پائیں۔ ان سے اپیل کی گئی کہ حکومت پنجاب کے اس اقربا پروری پر مبنی نادر شاہی حکم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے وہ پرسوں ڈسٹرکٹ کونسل ہال ضلع لاہور کے سامنے گراؤنڈ میں جمع ہوں۔ مقررہ دن کے لئے ہم نے سیکرٹری ڈسٹرکٹ کونسل سے ان کا ہال ایک بے ضرر اجلاس کے لئے مانگ لیا۔ گراؤنڈ میں جمع ہونے والے اے ڈی آئی حضرات کو ہم لاہور کے اے ڈی آئی ہال میں لے آئے ''ہمہ یاران دوزخ ہمہ یاران بہشت'' کی کیفیت' اجتماعی مصیبت میں کیسے کیسے مناظر دکھاتی ہے......

اللہ اللہ! کیسی گہما گہمی تھی ایک درد مشترک نے دور ونزدیک کے کیسے کیسے متاثرین کو یکجا کر دیا تھا۔ پنجاب کے مختلف حصوں' زبانوں اور قومیتوں کے......نمونہ ونمائندہ اے ڈی آئی صاحبان پنجابی' سرائیکی' پوٹھوہاری اور کوہستانی کی ہر تمیز اٹھا کر ایک دوسرے سے مصافحہ' معانقہ اور تبادلہ خیال کر رہے تھے' میں یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر سرشار ہو گیا۔ آج بھی وہ منظر حافظے پر ابھرتا ہے تو مختلف قومیتوں اور زبانوں کے اشتراک و وحدانیت سے پاکستانی قومیت کا تصور آپ ہی آپ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ پٹی بند بھائی ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ معانقے کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب ہونے کے لیے مختلف ڈانڈے ملا رہے تھے

۔بالخصوص ضلع لاہور کے اے ڈی آئی صاحبان کے لیے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ انھوں نے ان کو متوقع زلزلے یا زوال کی بروقت اطلاع دی تھی۔ علاقے اور لہجے کو نظر انداز کر کے مقصد کی بات کی خاطر اے ڈی آئی صاحبان کی حاضری ننانوے فی صد تھی۔ چند اضلاع کے اے ڈی آئی صاحبان اپنے غم وغصہ اور حکومت کے غلط اقدام پر تبصرہ کر چکے تو پھر حکومت کے طرز عمل کے خلاف بھرپور جدوجہد کے لیے ایک تنظیم کا قیام ضروری خیال کیا گیا۔ ساہیوال کے اے ڈی آئی شیخ الطاف حسین کو صدر، اوکاڑہ کے چودھری صدیق احمد کو سیکرٹری جنرل، لاہور کے منصور علی خان کو خزانچی منتخب کیا گیا۔ صدر کو اختیار دیا گیا کہ ہنگامی حالات کے پیش نظر اپنی مرضی کے مزید ارکان بھی نامزد کر سکتا ہے۔ چندہ کی بات چلی تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ آن کی آن میں پندرہ سولہ ہزار روپیہ اکٹھا ہو گیا۔ تمام حاضرین نے کہا کہ اگر قانونی جنگ کی ضرورت ہوئی تو وہ مزید منہ مانگا چندہ دینے کو تیار ہیں۔

حاضرین جوش و جذبے سے پھٹے جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ حکومت کی طرف سے چھیڑی جانے والی جنگ ہر قیمت پر جیت کر رہیں گے لیکن اندر سے سب ''ڈانواں ڈول'' تھے، بھلا انتظامیہ سے بھی کوئی جنگ جیت سکتا ہے۔ دور دراز اضلاع کے اے ڈی آئی حضرات نے ذمہ داری لی کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے ایم پی اے حضرات سے بات کریں گے اور ان سے مطالبہ کرائیں گے کہ حکومت اپنے احکام واپس لے۔ اس ابتدائی اجلاس کے بعد چند روز کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بیرونی ضلع کے ایم پی اے کے رشتہ دار اے ڈی آئی نے اطلاع بھیجی کہ اس کا رشتہ دار ایم پی ایک دوسرے ایم پی اے کے ساتھ مل کر گورنر سے یہ احکام منسوخ کروا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ سودا کرنا پڑے گا۔ ایک اور طرف سے تجویز آئی کہ اگر فلاں فلاں وکیل سے رابطہ کیا جائے تو وہ رٹ کر کے حکم امتناعی حاصل کر لے گا مگر اس کے لیے وکیل کی فیس کے علاوہ اس کی مزید خدمت بھی کرنا ہوگی۔ ہم نے لاہور شہر میں جو کوششیں کیں ان میں قابل قبول تجویز یہ تھی کہ تھوک کے حساب سے اندھا دھند کئے جانے والے تبادلوں کو عدالتیں شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اگر آئینی طور پر ہمارا مسئلہ عدالت کے ذریعے حل ہو سکتا ہے تو پھر دیر کس بات کی؟ چنانچہ پانچ ہزار روپے میں وکیل کھڑا کر کے ایک رٹ عدالت عالیہ میں دائر کر دی گئی جس کی ابتدائی سماعت مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ نے کی۔ کمرہ عدالت میں حاضرین کی تعداد غیر معمولی پا کر جسٹس صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ غیر معمولی ہے لہٰذا

انھوں نے رٹ کو باقاعدہ سماعت کے لیے منظور تو کر لیا لیکن حکومت کے احکام کے خلاف حکم امتناعی جاری نہیں کیا۔

اپنے منفرد مقام کی وجہ سے اے ڈی آئی حضرات کی اپنے اپنے علاقے کے مدرسین کے ذریعے معززین سے سانجھیں تھیں۔ روابط تھے انھیں ایک امتیازی اعزاز حاصل تھا۔ ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی تھی، تحفے ملتے تھے، تہواروں پر یاد کیا جاتا تھا، تقریبات میں بلایا جاتا تھا۔ جدھر جاتے تھے استقبال کی باہیں کھلیں نظر آتی تھیں۔ ہر جگہ محبت سے مہمان نوازی ہوتی تھی۔ اب ہمیں واپس سکولوں میں بھیجا جاتا تو ہمارا سارا بھرم کھل جانا یقینی تھا کہ ہم جو افسر بنے بیٹھے تھے دراصل انگریزی کے معمولی مدرس ہی تھے۔ کتنی سبکی ہوتی۔ میرے اپنے کئی افسر رشتہ دار مجھے درجہ دوم کا افسر سمجھتے تھے اور اکثر پوچھتے تھے کہ سول لسٹ پر میرا نام کس سال سے درج ہے۔ میں انھیں اِدھر اُدھر کا جواب دے کر ٹال دیتا تھا۔ تحصیل کی سطح کے تمام افسر بھی ہمیں اپنے برابر کا افسر سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ مدتوں سے چلا آ رہا تھا اور اب پی پی پی کے ہاتھوں اس کا تار و پود بکھرنے والا تھا۔

ملک معراج خالد ضلع اور تحصیل کونسل کے ممبر تھے۔ جب انھوں نے پی پی پی میں شمولیت اختیار کی تو انھوں نے ایک پمفلٹ ''ضمیر کا بحران'' تحریر کیا تھا۔ تقریباً تمام مقامی آے ڈی آئی صاحبان سے ان کی دعا سلام تھی۔ پی پی پی نے انھیں وزیر اعلیٰ پنجاب مقرر کیا تھا۔ ہم اپنے صدر اور سیکرٹری سمیت فریادی بن کران کی کوٹھی پر جا پہنچے اور عرض کی کہ ہم مارے جا رہے ہیں۔ اختیارات کی تقسیم اس وقت کچھ ایسی تھی کہ ملک صاحب محض تقریبات کی صدارت ہی کرتے تھے۔ حاکمیت کے اصل اختیارات گورنر غلام مصطفیٰ کھر کو حاصل تھے تاہم انھوں نے کہا کہ وہ گورنر سے بات کریں گے۔ اسی شام کوئی اجلاس تھا۔ ملک صاحب کی کھر صاحب سے ہمارے بارے میں بات چیت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے تبادلے نئے تعلیمی سال یعنی اپریل ۷۳ء تک مؤخر کر دیے گئے۔ ہمارے فوری صدمے کی شدت میں کمی آ گئی اور ہمیں اپنی بقاء کی جدوجہد کے لئے وقت مل گیا۔

☆☆

یہ تو طے تھا کہ حکومت اپریل میں ہمیں واپس سکولوں میں بھیج دے گی لہٰذا اب ہم اپنی اسامی پر اپنے قیام کو عارضی سمجھ رہے تھے۔ ضروری کاموں کے علاوہ بھی آہستہ روی کا شکار

تھے۔ محکمے کے افسروں نے حکومت کے مقابلے میں ہماری یہ مدد کی کہ انھوں نے ''رٹ'' کا بہانہ کر کے معاملے کو عدالت میں زیر سماعت ہونے کی بنیاد پر لٹکائے رکھا۔ مؤخر شدہ احکام مؤخر ہی رہے۔ ادھر وہ لوگ جن کے احکام تقرر ہماری جگہ پر ہوئے تھے خاموش نہیں بیٹھے تھے' انھوں نے حکومت کی طرف سے عدالت کو یاداشت بھجوائی کہ عدالت اے ڈی آئی حضرات کے مقدمے کا فیصلہ روزانہ سماعت کر کے جلد از جلد کرے تاکہ انتظامی خلا کو پر کیا جا سکے۔ چنانچہ عدالت عالیہ کے ایک ڈبل بنچ نے ہمارے مقدمے کی سماعت کی۔ ہم نے اس دور میں بیس ہزار روپے اکٹھے کر کے میاں محمود علی قصوری کو اپنا وکیل کیا۔ کئی دن کافی گہما گہمی رہی اور میاں محمود علی کی گرج کمرہ عدالت میں ہمیں یہ یقین دلاتی رہی کہ عدالت ہمارا موقف تسلیم کر لے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ محکمہ تعلیم میں ہمارا تقرر بطور سینئر انگلش ٹیچر ہوا تھا مگر اب ہمیں دفاتر کی ہوا لگ گئی تھی۔ ہمارے اندر طلبہ کا سامنا نہ کر سکنے کی خامی پیدا ہو چکی تھی۔ بطور اے ڈی آئی ہم گنڈیریاں چوستے ہوئے بھی ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ کسی سکول میں بیٹھ کر اساتذہ کی طرف سے دی گئی ضیافت اڑاتے ہوئے بھی ہم اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہوتے تھے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ انتظامی عہدیدار کو تدریسی کام پر واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ عدالت نے یہ موقف مسترد کر دیا۔ عدالتی کاروائی کا فیصلہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں سنایا گیا اور چند ہی دن بعد ہمیں تبادلے کے احکام موصول ہو گئے۔

میرا تبادلہ چوہدری نذیر احمد بھٹہ کی جگہ گورنمنٹ ہائی سکول' لاہور کینٹ میں ہوا جبکہ انھیں میری جگہ تعینات کیا گیا۔ آزردگی اور افسردگی کے اس عالم میں مَیں نے اپنے لیے ایک راہ نجات نکالی۔ وہ یہ تھی کہ انہی ایام میں میرے گاؤں بیگو والا کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر چودھری غلام نبی کی ترقی بحیثیت ہیڈ ماسٹر ہائی سکول ہو گئی اور مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹری کا عہدہ خالی ہو گیا' ان دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز مسٹر گلزار بھٹی تھے۔ وہ میرے ضلعی افسر رہے تھے۔ میں چند دوستوں کے ہمراہ ان سے ملا' انھوں نے میرے احکام تبادلہ میں تبدیلی کر کے مجھے مڈل سکول بیگو والا کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ گاؤں ہی کا ایک اور نوجوان جو انگریزی کا مدرس تھا' مدت سے اس تاک میں تھا کہ کب بیگو والہ کا صدر معلم تبدیل ہو اور وہ اس جگہ تعینات ہو۔ چودھری غلام نبی گاؤں کے چودھری تھے اور ۱۹۵۲ء میں بی ٹی کرنے کے بعد وہ ۱۹۷۳ تک

گاؤں کے سکول ہی میں ہیڈ ماسٹر رہے تھے۔کوئی مائی کا لعل ان کو وہاں سے ہلا نہیں سکا تھا۔ ہر چنداں کے بعد بے شمار مقامی بی ٹی اور بی ایڈ استاد پیدا ہوئے' اس حوالے سے میں ۱۹۵۳ء کی پیداوار تھا لیکن چودھریوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بھٹی صاحب کی وجہ سے میرا جو داؤ اپنے گاؤں پہنچ جانے کے لیے لگا تو متذکرہ امیدوار کے علاوہ اردگرد کے دیہاتوں کے بہت سے امیدواروں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ میں بذریعہ ضلعی افسر تعلیم سیالکوٹ اپنی اسامی پر حاضر ہوا لیکن ایک ہی روز قیام کے بعد میرا دل اپنے ہی گاؤں میں نہ لگا ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیان نئی نسل جوان ہو چکی تھی۔اور کئی قدردان بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ میں چند یوم کی رخصت لے کر واپس لاہور آیا اور اپنی اہلیہ کو یہ مژدہ سنایا کہ میں اب بیگو والہ میں نہیں رہ سکتا' گاؤں مجھے بہت اجنبی اجنبی لگا ہے۔وہ تو پہلے ہی میرے فیصلے کے خلاف تھی۔ بھٹی صاحب پھر میرے کام آئے اور میں نے تیرہ دن کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول لاہور کینٹ کے بجائے گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈنز میں بطور سینئر انگلش ٹیچر حاضری دینا شروع کر دی۔

مجھے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کی طرف سے دفتر بلایا گیا کہ میں مسٹر بھٹہ کو مکمل چارج دوں۔ میں دفتر پہنچا تو پتہ چلا کہ مسٹر بھٹہ بھی اسی روز حاضری دینے آئے ہیں۔ میں چارج نہ چھوڑتا تو پندرہ دن مزید سابقہ اسامی پر گزار سکتا تھا۔ بہرکیف میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنے دن بعد کیوں حاضر ہوئے ہیں؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ چند دن تو جھنڈی تیار کرانے میں لگ گئے اور اب جھنڈی تیار ہو گئی ہے تو اسے لہرانے کے لیے گاڑی نہیں مل رہی۔ لہٰذا انھوں نے مجھے اس لیے دفتر بلوایا ہے کہ میں انھیں اپنا لمبریٹا سکوٹر بھی چارج میں دوں۔ القصہ میں نے چودہ سو روپے میں خریدا ہوا لمبریٹا دو سو روپے گھاٹے میں انھیں دے دیا۔

☆☆

ہونی ہو چکی تھی' دل ٹوٹ چکا تھا' اور ایک معمولی سے تبادلے نے میرے کئی عقائد کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔ میرا عقیدہ پیروں' فقیروں اور تعویز گنڈا کرنے والوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان میں سے ۹۹٫۹ فیصد لوگ محض پیٹ بھرنے کا دھندہ کرتے ہیں۔ان کے اندر کوئی غیر معمولی صلاحیت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ وہ ہماری نفسیات کے کسی گوشے میں جھانک لیتے ہیں اور پھر ذومعنی باتوں سے ہماری کمزوریوں کو اگلوا لیتے ہیں۔ایک مہربان مدرس مجھے سائیں

سردار کے پاس لے گیا کہ اس کے قبضے میں کچھ روحیں ہیں اور ان کی مدد سے وہ ہونی کو انہونی اور ان ہونی کو ہونی میں بدل دیتا ہے۔ میں خاموشی سے اس مدرس کے ساتھ ہولیا۔

سائیں سردار کا آستانہ بابو صابو میں تھا۔ وہاں بے شمار دکھ درد کی ماری خواتین اور سراسیمہ مرد اداس چہروں، گرد آلود پیشانیوں اور نمناک آنکھوں کے ساتھ اپنی اپنی مراد برآنے والی امیدوں کے انتظار میں یوں گم صم بیٹھے تھے جیسے

ع...... کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پیئے بیٹھے ہیں!

سائیں نابینا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ پوچھتا اور پھر خود ہی کسی روح کے حقیقی یا فرضی ہیولے سے سوال و جواب کرتا۔ اس سے کہتا "سچ سچ بتا دے، ورنہ لا الہٰ الا اللہ کی ضرب لگاؤں گا.... پھر کبھی تو لا الہٰ الا اللہ کا نعرہ اتنے زور سے لگاتا کہ گرد و پیش گونج اٹھتا کبھی وہ آپ ہی آپ مسکراتا اور زیر لب کہتا "پہلے ہی سچ بتا دیا کرو"...... بعض اِدھر اُدھر بیٹھے حاشیہ نشین لوگ نو واردوں کو سمجھاتے کہ راوی پل کے قریب ایک بزرگ کی ڈھیری (قبر) ہے، جس سے سائیں کا رابطہ ہے۔ سارا فیضان اس ڈھیری والے ہی کا ہے، خود تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔

سائیں سردار اردو بھی نہیں بول سکتا تھا لیکن اس کا کاروبار اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ وہ اپنے ہاں آنے والے حاجت مندوں کو وظائف کے چھپے ہوئے پرچے دیتا تھا جو پنجابی میں لکھے ہوتے تھے۔ میری باری آئی تو سائیں نے میرا ماجرہ سن کر ڈھیری والے سے رابطہ کیا اور پنجابی میں کہا تو پھر دیر کیا ہے۔؟ چلا دونا الٹا چکر...... وقت لگے گا؟ وقت ذرا تھوڑا ہی لگانا...... ہاں کیا کہا کہ یہ جہاں بھیجا گیا ہے وہیں اس کا فائدہ ہے۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر اس کو کیسے یقین آئے گا؟ اور بھی باتیں ہوئیں۔ سائیں نے مجھے بعد نماز فجر پڑھنے کے لئے پنجابی میں چھپا ہوا پرچہ دیا، اس کی عبارت کا مفہوم یہ تھا "کشتی دریا میں رواں تھی، سردار (یہاں میرا نام درج ہونا تھا) خوش تھا اچانک طوفان نے آلیا ہے۔ کشتی گرداب میں ہے، تو ہی پار لگانے والا ہے مایوس نہ کر کیونکہ تو مایوس نہیں کرتا۔"

سائیں سردار چونکہ یہ جان چکا تھا کہ میں پڑھا لکھا ہوں اور انگریزی کا مدرس ہوں لہٰذا اس نے میرے اطمینان کی خاطر پرچہ دیتے ہوئے اور میرے مہربان مدرس کی مٹھی سے دس دس کے دو نوٹ تھامتے ہوئے کہا کہ "رب سوہنا ساریاں زباناں جان دا اے" باوجود نہ چاہنے کے میں سردار سائیں کا تصور سامنے رکھ کر وظیفہ پڑھتا رہا اور سکول کی دوسری شفٹ میں چھٹی،

ساتویں جماعتوں کو مختلف مضامین پڑھاتا رہا۔ پڑھانا کیا تھا۔ بس طلبہ کی پر ہجوم جماعتوں سے یہی التجا کرتا رہتا کہ وہ خاموش رہیں۔ بیک وقت سو سے زائد طلبہ کو پڑھانا' پڑھائی سے سنگین مذاق ہے۔ سکول کے صدر معلم نے مجھے یہ جماعتیں عارضی طور پر ستانے کے لئے دی تھیں۔

☆☆

سائیں سردار کے ہاں ہر جمعرات پابندی سے حاضری دیتا رہا۔ میں اپنی مخصوص ... کے مطابق وہاں آنے والوں کی داستانیں غور سے سنتا اور سائیں سردار کے ردعمل کا مشاہدہ بھی کرتا۔ سائیں لا الہٰ لا اللہ کی ضرب لگانے سے پہلے باداموں والے دودھ کا چھنا (پیتل کا پیالہ) پیتے تھے اور بعض اوقات سائلوں کو دھتکار بھی دیتے تھے۔ میں ٹوٹی ہوئی امیدوں کے مارے سائلوں کی پیشانیوں پر پسینہ پھوٹتا دیکھتا تو مجھے سائیں پر غصہ آ جاتا تھا۔

ایک بڑی خرانٹ قسم کی مائی بار بار سائیں سے کہہ رہی تھی کہ اب کے وہ اپنی روحانی قوت اس کے بیٹے کو سعودی عرب بجھوا دے تو وہ وہاں حج بھی کرے گا اور روضہ رسولؐ پر حاضری بھی دے گا۔

سائیں نے کہا کہ حج تیرے بیٹے کو خدا کے لئے نہیں اپنے لئے کرنا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر حاضری دے کر اسے اپنے ہی قلب کی تالیف کرنا تھا۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاضری کی ضرورت نہیں جو مردار چودہ برس تک جدہ میں رہے اور اسے حج اور زیارت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب نہ ہوئی ہو ایسے مکروہ شخص کا سرزمین حجاز سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ مائی تو اس کو ریس کھیلنے ہی سے روک لیتی۔ لاکھوں پھٹکاریں تم پر اور تمہارے بیٹے پر...... جا بھاگ جا...... اور توبہ استغفار کر......"

سائیں سردار سے میرا رابطہ چھٹی جمعرات کو ٹوٹ گیا۔ میں گیا تو پتہ چلا کہ سائیں **لا اِلٰہ' اِلّا اللہ** کی ضرب لگاتے لگاتے بے ہوش ہو چکے ہیں' اسی حالت میں سائیں کا انتقال ہو گیا۔

☆☆

گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی کے ہیڈ ماسٹر شہزادہ نواب تھے۔ خاصے پڑھے لکھے اور تجربہ کار مدرس تھے۔ پھر وہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے براہ راست ہیڈ ماسٹر منتخب ہو گئے انھوں نے پہلے ہی دن میرے دوساتھیوں چودھری حمید اللہ اور جمال الدین سلیم سے کہہ دیا کہ وہ اے ڈی آئی

صاحبان کے مرتبے اور مزاج سے باخبر ہیں لہٰذا وہ اس دورِ ابتلا میں ان سے تعاون کریں گے۔ دس بارہ دن کے بعد جب میں ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے مجھے بھی یہی کہا تھا تاہم میرے ساتھ ایک مسئلہ تھا کہ میں اس وقت سارے عملے میں سب سے سینئر تھا۔ وہ پہلے نائب صدر معلم کے کام سے بھی مطمئن تھے، مجھے بھی چھٹی ساتویں کلاس میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے سینئر سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بنا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کوئی کام کاج نہ تھا۔ میں لائبریری میں سے کوئی کتاب لیتا' اسے پڑھتا رہتا یا پھر اسکول کے کام کاج کا مشاہدہ اور معائنہ کرتا رہتا۔

انھی دنوں حکومت پنجاب نے پرائمری اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے جابجا ہائی سکولوں کے ساتھ پی ٹی سی اساتذہ کی تربیتی کلاسوں کا اجرا کیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی میں بھی اس کلاس کا آغاز ہوا۔ ہائی سکول میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد پہلے ہی مسئلہ تھی۔ اب سو بالغ طلبہ کی یہ جماعت مزید پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ شہزادہ صاحب نے بڑی فراست سے کام لیا اور ہائی سکول کے پرائمری حصے کے کیمپس میں پی ٹی سی کلاس کو بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کیمپس چوبرجی کوارٹرز میں گندہ نالہ سے ملحق کئی کوارٹرز پر مشتمل تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اساتذہ کی تربیت کے دوران مشقی اسباق کے لئے پرائمری سکول ہر وقت میسر رہے گا۔ میرے تقدم (Seniority) کی وجہ سے انھوں نے مجھے پی ٹی سی کلاس کا انچارج بنا دیا۔ انچارج کے بجائے انھوں نے میرے لئے ''پرنسپل پی ٹی سی یونٹ'' کا عہدہ بھی از خود ہی تخلیق کیا۔ کلاس کے لئے کمروں کی تخصیص کے ساتھ ساتھ میرے لئے بھی ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ اس خودمختاری سے میرے دل کی ہلچل میں ذرا کمی واقع ہوئی۔ ترقی کے زینے پر چڑھنے کے لئے مذموم طریقے اختیار نہ کیئے جائیں تو سروری کی تمنا بری چیز نہیں۔ سربراہی اور آزادی بڑی نعمت ہیں۔

اسی پی ٹی سی جماعت میں مدرس منشی خان کا بیٹا غیاث الدین بھی داخل تھا۔ وہ بڑا مودب، نظم و ضبط کا پابند اور دوستوں میں بہت مقبول برخوردار تھا۔ نہ جانے کن گناہوں کی پاداش میں تقدیر نے اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلا کہ وہ مدرس بننے کے بجائے ''عیا ثاڈاکو'' بن گیا۔ اسے پی ٹی سی کی جماعت سے خارج کر دیا گیا' بعد کو وہ بے شمار وارداتوں کا مرتکب ہو کر اورشہ سرخیوں کا عنوان بن کر جیل چلا گیا اور سزا پا کر ایک ساعت اِدھر نہ اُدھر چپ چاپ سولی چڑھ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

☆☆

چوبرجی کوارٹرز میں واقع گورنمنٹ پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر شیخ کریم الدین تھے۔ وہ ایس وی مدرس تھے اور ان دنوں پرائمری سکولوں کے اکثر ہیڈ ماسٹر ایس وی مدرس ہی ہوا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کے مزاج میں تلخی تھی اس لیے ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ انھیں اکھڑ، بدلحاظ اور مغرور خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ وہ دوسوہہ ضلع ہوشیار پور کی اس برادری سے تعلق رکھتے تھے جس سے عبوری وزیر اعلیٰ پنجاب شیخ منظور الٰہی کا تعلق تھا۔

میں کوشش کر کے بڑی مشکل سے شیخ صاحب کے قریب ہوا۔ تفریح کے گھنٹے میں وہ مجھے چائے میں شریک کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ کھلتے گئے۔ فی الواقع وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب کچھ تو اب یاد نہیں لیکن پھر بھی جو کچھ یاد ہے انہی کی زبانی بیان کرنے کی سعی کرتا ہوں

انھوں نے فرمایا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پڑھنے لکھنے میں اپنے بھائیوں جیسا نہیں تھا۔ مڈل کے بعد میں کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد بزرگوار کو مجبور کر دیا کہ وہ مجھے کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کریں اور میری تعلیم کے بارے میں سوچنا ترک کر دیں۔ وہ قدرے تلخ ہوئے مگر انھوں نے جدی پشتی جائداد کی کچھ قیمت متعین کر کے میرا حصہ مجھے دے دیا۔ میں نے گائے، بھینسوں کا ایک ریوڑ خرید لیا لیکن نہ جانے کیا روگ پڑا کہ ایک دن ہانک کے دوران ایک جوہڑ سے پانی پیتے ہی وہ سب ہلاک ہونا شروع ہو گئیں۔ میں قلاش ہو گیا۔ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اپنی داستان غم جا کر والد صاحب یا کسی اور کو سناؤں۔ میں ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور وہاں جو گاڑی آئی اس میں سوار ہو گیا ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں یونہی بے ارادہ پلیٹ فارم پر گھومنے لگا۔ اچانک ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک انگریز نے انگلی کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ "اویو بوائے ہماڑا بات سنو" میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جالندھر ڈویژن کا کمشنر تھا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دوسوہہ میں میرے ابا جان سے ملاقات کی تھی۔ وہ مونسپلٹی کے صدر ہونے کے علاوہ مسلم لیگ کے مقامی رہنما بھی تھے۔ اس نے پہلے تو اپنے شبہے کی تصدیق کی اور پھر مجھ سے دریافت کیا کہ میں کدھر جا رہا ہوں، وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھ نالائق سے ہمدردی سے بات کی تھی۔ میں نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اس دوران صبر کا دامن چھوٹ گیا اور میں

رو پڑا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ میں واپس اپنے گھر لوٹ جاؤں۔ ابا کو سب کچھ سچ سچ بتادوں۔ وہ اپنے اثر و رسوخ سے یہ بھی معلوم کرلیں گے کہ ریوڑ کیوں ہلاک ہوا۔ جوہڑ کے پانی کا تجزیہ ہو سکتا ہے لیکن میں نے انگریز سے صاف کہہ دیا کہ میں مر بھی جاؤں تو ابا کے پاس نہیں جاؤں گا۔

دوسری گاڑی کے آنے کا شور مچا تو انگریز نے مجھ سے میری تعلیم پوچھی۔ میں نے مڈل بتائی تو اس نے ہوشیار پور کے ڈپٹی کمشنر کے نام ایک چٹ دیتے ہوئے کہا کہ میں ہوشیار پور جاؤں وہاں مجھے کسی دیہی پرائمری سکول کا نائب مدرس تعینات کر دیا جائے گا۔ اس طرح میں دیہی سکول میں غیر تربیت یافتہ پرائمری مدرس بن گیا۔ اساتذہ کی دیکھا دیکھی میں نے جے وی اور پھر ایس وی کا امتحان پاس کرلیا۔ ایس وی کرنے کے بعد میں مڈل اور ہائی سکولوں کے ورنیکلر مضامین پڑھانے کا اہل سمجھا جانے لگا۔ دو سال بعد ایک اے ڈی آئی کی ترغیب پر میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت ترک کر دی اور ہوشیار پور شہر ہی میں سرکاری سکول میں ملازمت حاصل کرلی۔

☆☆

انگریز کمشنر نے میرے والد صاحب کو بھی کچھ سمجھایا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے ہوشیار پور آئے اور مجھے راضی کر کے گھر لے گئے، آخر والد تھے انھوں نے میرے سارے قصور معاف کر دیئے اور مجھ پر دوبارہ اپنی شفقت اور مرحمت کا دریچہ کھول دیا۔ اس خیال سے کہ میں مزید بہتر ہو جاؤں انھوں نے میری شادی کر دی۔

"پتہ نہیں میرے مزاج میں خشکی ہی خشکی کیوں تھی؟ میرے رویے سے بیوی بھی دبکی رہتی تھی۔ ملازمت میں بھی کبھی نہ کبھی میری ان بن صدر معلم سے ہو جاتی، کبھی میں کسی اپنے ہی معلم بھائی سے بھڑ جاتا تھا۔ طلبہ تو میرے ہاتھوں پٹتے ہی تھے کیونکہ میں اپنی نالائقی کی کمی "مولا بخش" کے ذریعے پوری کرتا تھا۔ اگر والد صاحب نے مجھ پر مولا بخش استعمال کیا ہوتا تو میں شاید پڑھ بھی لیتا اور بگڑنے بھی نہ پاتا۔ میں مولا بخش کو "ڈنڈا پیر" بھی کہتا ہوں۔ یہ بگڑے تگڑوں کا علاج ہے۔ حکیم الامت سچ فرما گئے ہیں......

ع...... عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

جب میں سکول میں مولا بخش استعمال کرتا تو لاڈلے بچوں کے باپ مجھ سے لڑتے آ جاتے۔ میں ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ نہ مانتے۔ نتیجہ میرے تبادلے کی صورت میں نکلتا۔ میں بیسیوں سکولوں میں اپنی خشک مزاجی کے باعث تبدیل ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا بھی تھا کہ آخر

میں جھگڑا کیوں کرتا ہوں۔ اگر میں ہی ذرا جھک جاؤں تو کیا فرق پڑے گا۔ مگر پھر کہیں نہ کہیں میری خشک مزاجی مجھے رسوا کر دیتی تھی۔ میری افتادِ طبیعت کی وجہ سے میرے ساتھ میری بیوی بھی نت نئے مقامات دیکھ چکی تھی۔ وہ اس قدر صابر و شاکر تھی کہ میں نے اس کا نام ہی صابرہ بیگم رکھ دیا تھا۔ وہ گھر میں اکیلی پڑی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔

میرے جھگڑالو رویے سے تنگ آ کر محکمہ تعلیم پنجاب نے مجھے گورنمنٹ ہائی سکول واہووا میں تبدیل کر دیا۔ واہووا متحدہ پنجاب کا وہ دور اُفتادہ سرحدی مقام تھا جسے محکمے کے افسرانِ بالا نے اکھڑ مزاج اور جھگڑالو مدرسین کا چال چلن ٹھیک کرنے کے لیے ''کالا پانی'' بنا رکھا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا ''صابرہ بیگم! اب منزل دور ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ پہلے میں واہووا جاؤں، وہاں کسی گھر کا انتظام کروں اور پھر تمہیں لینے آؤں، لہٰذا ابھی سامان باندھو۔ صبح گاڑی پر بیٹھیں گے۔ رات کو واہووا پہنچیں گے۔ وہاں اسٹیشن ہی پر بقیہ رات گزاریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ واہووا کی صبح ہمارا استقبال کس طرح کرتی ہے۔

☆☆

ان دنوں صابرہ کا پاؤں بھاری تھا۔ ریل کے سفر نے اسے نڈھال کر دیا لیکن وہ صابرہ تھی، لب پر کوئی شکایت نہیں لائی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے خود کلامی کی، اپنے آپ کو سمجھایا ''کریم الدین! کچھ سمجھو، خود ضبطی سے کام لو۔ واہووا سے آگے کہاں جاؤ گے۔ کہیں گھر ہی نہ بھیج دیے جاؤ! معصوم بیوی اور آنے والے مہمان کا خیال کرو۔ تنک مزاجی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اب بہت ہو چکی ہے۔ ابھی تک میری ملازمت کی کتاب صاف ہی جا رہی ہے، اس پر کوئی غلط رائے درج نہیں ہوئی تھی۔ میری یہی سوچ دعا میں ڈھل گئی...... اور پھر سحر دم مَیں نے مؤذن کی ملکوتی صدا سنی تو جاگ گیا۔ صابرہ بھی بیدار ہو گئی اور لوٹا اٹھا کر پلیٹ فارم کے نل کی طرف چل دی۔ میں بھی تعاقب میں روانہ ہوا، لوٹے کی بجائے برما (ہاتھ سے چلانے والا نل) چلا کر اسے وضو کرایا بعد میں اس نے برما چلایا تو میں نے وضو کیا۔ بیوی بہت حیران ہوئی۔ سوچتی ہو گی کہ:

ع...... جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

کالے پانی کے خوف سے کافر مسلمان ہوا چاہتا ہے، اس نے یہ بھانپ کر کہ میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں، اپنا مصلیٰ بچھا دیا اور خود چادر بچھا کر نماز ادا کی اور یوں واہووا کی اولین صبح خالق کائنات کی چوکھٹ پر جھکا کر مجھے نئے مستقبل کے حوالے کر گئی...... جو ٹھوکر آدمی کو محبوب کے

قدموں میں گرادے، اسے کیا کہا جائے گا؟ مجھے تو اپنی لغزشوں کا یہ انجام اچھا لگا۔

غالباً یہ اپریل کا آخری ہفتہ تھا۔ سورج کی کرن نمودار ہوتے ہی میں نے صابرہ بیگم کو اسٹیشن پر اکیلا چھوڑا۔ اسے تلقین کی کہ اگر مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تو وہ ہرگز نہ گھبرائے۔ میں گورنمنٹ ہائی سکول جا پہنچا۔ سکول ابھی بند تھا، چوکیدار ڈنڈ پیل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں بطور ایس وی معلم ادھر تبدیل ہو کر آیا ہوں۔ اہلیہ ساتھ ہیں، اسٹیشن پر بیٹھی ہیں۔ مجھے آناً فاناً کرائے کا مکان درکار ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ واہوا میں مکانوں کی بڑی قلت ہے۔ البتہ ایک مکان ہے جسے آسیب زدہ کہا جاتا ہے، وہاں کسی روح کا مسکن ہے وہ خالی پڑا ہے، اگر وہاں ایک مخصوص کونے میں جمعرات دیا جلا دیا جائے تو روح کچھ نہیں کہتی۔

مرتا کیا نہ کرتا میں نے وہ مکان لے لیا۔ صابرہ بیگم کو میں نے مکان کے بارے میں چوکیدار کی ساری باتیں بتا دیں۔ کہنے لگی کہ ایک کونہ تو کیا چاروں کونوں میں دیے جلا دیا کروں گی اور جب چاروں قل پڑھ کر چاروں طرف دم کروں گی تو روح تو کیا جن بھوت بھی کچھ نہیں کہیں گے۔

قیام پاکستان تک میرا قیام اسی مکان میں رہا۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار بیٹے اسی مکان میں عطا کئے۔ فارغ وقت میں میری بیوی نے از خود محنت کر کے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور پھر لڑکیوں کے مڈل سکول میں اس کا تقرر بھی ہو گیا۔ ہم اپنے عزیز و اقارب سے دور تھے لیکن ایک مثالی کنبے کی طرح اپنا وقت آسودگی سے گزار رہے تھے۔ گیارہ بارہ سال میں میری بیوی کوئی چار مرتبہ میکے والوں سے ملنے گئی۔ اسی طرح اس کے میکے کی طرف سے ہمارے ہاں گنتی کے چند مہمان ہی آئے۔ میرا اپنا کوئی آیا، نہ میں گیا۔

مجھے اپنے والد صاحب کے انتقال کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ کچھ غیر مصدقہ ذرائع سے بھائیوں کے متعلق پتہ چلتا رہا کہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد میں نے اپنا تبادلہ لاہور کے مضافات میں کرا لیا۔ بچوں کی تعلیم کا مرحلہ آیا تو میں لاہور آ گیا۔ واہوا تمام پاکستان ہی کا قصبہ ہے لیکن میں بھی اور میری بیوی بھی مشرقی پنجاب کے باشندے تھے اس حوالے سے ہم مہاجر تھے لہٰذا میں نے سنت نگر میں ایک چھوٹا سا متروکہ مکان الاٹ کرا لیا۔ تب سے وہیں مقیم ہوں۔''

ایک اور موقعہ پر مزید بتایا:

''ماشاءاللہ میرے نو بیٹے ہیں' کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی فوجی افسر' سب کے سب سرکاری افسر ہیں ایک ابھی پڑھ رہا ہے مسکراتے ہوئے انھوں نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ انھوں نے اولاد پر بلاوجہ مولا بخش استعمال نہیں کیا میں سونے کا نوالا کھلانے اور اولاد کو شیر کی نظر سے دیکھنے والا باپ ہوں۔ اولاد کے مسائل پیدا ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں واقعی ایک ناخلف بیٹا تھا لیکن میں نے اپنی اولاد کو سنوار کر وہ کمی پوری کر دی ہے جو میرے ابا جان نے ڈنڈا استعمال نہ کر کے مجھ میں پیدا کر دی تھی۔''

پھر انھوں نے ۱۹۷۳ء کا ایک واقعہ سنایا:

''میرے گھر میں ایک بھوسہ رکھنے کی کوٹھڑی ہے اور یہ اس لیے کہ میں ہمیشہ ایک گائے رکھتا ہوں جو دودھ مکھن دینے کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد دلاتی رہتی ہے کہ میں نے گائے کے کاروبار میں ہزاروں کا نقصان اٹھایا اور اسی نقصان کے طفیل مدرس بنا۔ اس کوٹھڑی میں ایک مولا بخش بھی پڑا رہتا ہے جو ہے تو گائے کے لئے کہ کبھی کبھی جانور کے لئے اس کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے لیکن میں اکثر اسے بچوں کی اصلاح کے لئے بھی استعمال کرتا ہوں۔ مولا بخش کی وجہ سے بھوسے کی کوٹھڑی ایک تادیبی مرکز بن گئی ہے۔ جب بھی ضرورت محسوس ہوئی میں اپنے بیٹے کو اکیلا اس کوٹھڑی میں لے گیا اور مولا بخش پھیرنا شروع کر دیا۔

اپنی بات کا تسلسل توڑ کر شیخ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بچوں کے تربیتی عمل میں تادیب برائے اصلاح پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں؟ میں نے جواب میں کہا اصلاح کے لئے مولا بخش اور بھوسے کی کوٹھڑی زیادہ ضروری چیز نہیں وہ مسکرائے اور اپنی دل پذیر داستان سنانے لگے' فرمایا:۔

☆☆

میرا چھوٹا بیٹا آج کل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ہے۔ اس نے نویں جماعت میں وہ ہتھکنڈے دکھانے شروع کر دیئے جو میں نے اپنی تعلیم کے دوران والد صاحب کو دکھائے تھے اور ان کی طرف سے کوئی تادیبی کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر سے بھاگنا پڑا تھا۔ بالکل میرے ہی انداز میں اس نے مجھ سے کاروبار کرنے کے لیے رقم طلب کی تا کہ پڑھنے لکھنے کی چخ چخ ختم ہو۔ میں نے پوچھا کیا کاروبار کرو گے؟ وہ خاموش رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے بھی اپنے باپ کو کاروبار کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ اس لئے مجھے سخت ناکامی ہوئی تھی۔ ماں باپ کا کہنا نہ ماننے اور ان

سے مشورہ نہ کرنے سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے۔ برکت بھی نہیں ہوتی اور پھر مشہور ہے کہ کوئی مشورہ دینے والا نہ ہو تو دیوار ہی سے مشورہ لے لیا جائے۔ میں تو ابھی تمہارے سر پر زندہ ہوں مجھے اپنے ارادوں سے مطلع کرو۔ میں تمہیں رقم دے دوں گا۔

وہ میرے نرم رویے کو دیکھ کر اپنا کاروباری منصوبہ بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک آراستہ پیراستہ خوبصورت ریڑھی خریدے گا۔ اس پر ''حنان نان چنے'' کا بورڈ آویزاں کر کے نان چھولے بیچے گا۔ کام چل نکلنے پر وہ حلیم اور بریانی کا اضافہ کرے گا۔ چوک میں اس نے ایک اڈہ بھی دیکھ لیا ہے جہاں وہ ریڑھی لے جایا کرے گا۔ میں باپ ہونے کے ناتے اعتراف کرتا ہوں کہ میرے باپ کو جو صدمہ میرا سرمایہ ضائع ہونے سے ہوا ہوگا اس سے کہیں زیادہ ملال مجھے بیٹے کی بات سن کر ہوا۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ اولاد ضبط بھی سکھا دیتی ہے حالانکہ میں تو کھول اٹھنے والا مزاج رکھتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں چند دنوں میں پراویڈنٹ فنڈ سے رقم حاصل کرتا ہوں پھر تمہیں رقم دے دوں گا۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ نماز کے لیے جاتے ہوئے میں نے اسے ایک فالودے کی ریڑھی والے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو میرا خون کھول اُٹھا۔ وہ جس قسم کے دوستوں میں گھر گیا تھا ان کی سوچ ایسی ہی ہو سکتی تھی۔ کاروبار چھوٹا ہو یا بڑا...... برا نہیں ہے۔ میں اس کے خلاف بھی نہیں لیکن تعلیم شرط اول ہے۔ مزید برآں اس عزت و حرمت کی پاسداری بھی شرطِ لازم ہے جو خاندان کے بزرگوں کو بڑی ریاضت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ اسی رات جب حنان کی ماں عشاء کی نماز پڑھنے لگی تو میں حنان کو بھوسے کی کوٹھڑی میں لے گیا اور بے دریغ مولا بخش سے مرمت کی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے کیوں اور کیسے غلط ہے؟ اللہ کا شکر ہے میرا عمل کارگر ثابت ہوا اور میرا بیٹا سیدھا ہو گیا۔''

☆☆

شیخ کریم الدین صاحب نے اگلی نشست میں بتایا کہ ہمارے نئے انسپکٹر آف سکولز مسٹر خان، ایم اے ایل ایل بی جالندھری لمبے تڑنگے خوبصورت ذہین اور تیز طرار شخص تھے۔ وہ محکمہ آبادکاری میں تھے اور اس کے خاتمے کے بعد سرکاری پالیسی کے تحت محکمہ تعلیم کے حصے میں آ گئے۔ انھیں ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تعینات کیا گیا تو وہ بڑے دھڑلے اور طنطنے سے اپنے فرائض ادا کرنے لگے۔ چونکہ پٹھان تھے اور ابتدا میں بھی افسر رہے تھے اس لئے وہ اساتذہ کو کبھی کبھی تلخ لہجے میں ''او ماسٹر'' کہہ کر بھی مخاطب کرتے تھے۔ انھیں کچھ جھوٹ بولنے کی

عادت بھی تھی۔ مثال کے طور پر میں ان سے دفتری اوقات کے بعد ملنے گیا' مجھے انھوں نے کسی ناراضی کی وجہ سے طلب کیا تھا۔ ان کا بچہ باہر کھیل رہا تھا میں نے کہا صاحبزادے جاؤ اپنے ابا جان سے کہو کہ کریم الدین شیخ آیا ہے۔

لڑکے نے واپس آ کر کہا'' ویسے تو ابا جان اس وقت چکوترہ کھا رہے ہیں لیکن انھوں نے کہلوایا ہے کہ وہ اس وقت تلاوت کر رہے ہیں' فارغ ہو کر آئیں گے۔''

میں یہ سوچتے ہوئے کہ کیسے شخص سے پالا پڑ گیا ہے ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ وہ اندر سے گرجتے برستے نازل ہوئے۔ مجھ سے فرمایا کہ نالائق اور گستاخ استادوں کی لاہور شہر میں کوئی ضرورت نہیں لہٰذا انھوں نے مجھے علی پور چٹھہ تبدیل کر دیا ہے اور اب وہ میری کوئی عرض اور کوئی عذر سننے کو تیار نہیں' میں خواہ مخواہ ان کی ''عبادت'' میں مخل ہوا ہوں۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ خاموشی سے واپس آ گیا اور تیسرے چوتھے روز میں علی پور چلا گیا۔ چند ہی روز بعد موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئیں۔

میرا بیٹا کرنل ڈاکٹر ہے۔ وہ رخصت پر تھا اور اپنے بچوں کے ساتھ مری میں مقیم تھا۔ چھٹیوں کی مناسبت سے میں اور میری اہلیہ بھی اس کے اصرار پر مری چلے گئے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ خان صاحب انسپکٹر آف اسکولز سکاؤٹ کیمپ کے معائنے کے لیے گھوڑا گلی پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے کسی عزیز کی معرفت میرے بیٹے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کا خود بھی دوسوہہ سے دور پرے کا کوئی تعلق تھا۔ مری میں ان کی میرے بیٹے سے ملاقات ہوئی تو میرے بیٹے نے انھیں بال بچوں سمیت اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ جب خاں صاحب میرے بیٹے کے گھر جا رہے تھے تو میں گھر سے کوئی دوسو گز کے فاصلے پر سیر سے تھک کر ایک پتھر پر بیٹھا سستا رہا تھا۔ میں نے خاں صاحب کو بال بچوں سمیت اپنی سمت آتے دیکھا تو میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تا کہ وہ مجھے دیکھ نہ سکیں لیکن انھوں نے مجھے دیکھ ہی لیا اور میرے قریب پہنچ کر بولے'' او ماسٹر! تم ادھر کہاں گھوم رہے ہو؟''

میں نے بھرپور نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور خاموشی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے ہی بیٹے کے ہاں جا رہے ہیں۔ مغرب کے بعد کھانا چن دیا گیا۔ میرے بیٹے کو میری تلاش ہوئی۔ اس نے اپنے اردلی سے کہا کہ جاؤ ابا جان کو بلا لاؤ۔ آج ہم کھانا ذرا قبل از وقت کھا رہے ہیں۔'' قصہ کوتاہ

جب میں کھانے کے کمرے میں داخل ہوا تو میں تو خان صاحب کو دیکھ کر ٹھٹکا ہی تھا لیکن خان صاحب مجھے دیکھ کر یوں چونکے جیسے انھیں بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اور میرے بیٹے کے ذریعے میرے نئے تعارف پر ان کا جو حال ہوا' اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ خان صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں!

ع...... گویا بشر نہیں' کوئی تصویرِ سنگ ہے!

ابھی میں مری ہی میں تھا کہ خان صاحب واپس لاہور پہنچے اور جب چند روز بعد لاہور سے اسکاؤٹس کا دوسرا گروپ کیمپنگ کے لئے گھوڑا گلی پہنچا تو علی پور چٹھہ سے میرے پرائمری سکول چوبرجی میں تبادلے کے نئے احکام بطور صدر معلم بھی ساتھ لائے۔ میں تعطیلات کے اختتام پر ایک شام خان صاحب کا شکریہ ادا کرنے ان کی سرکاری رہائش گاہ پہنچا۔ وہ کہیں جانے والے تھے' مجھ سے بغلگیر ہو گئے' اور گلہ کیا کہ میں نے اپنی اصل شناخت کیوں چھپائے رکھی۔ بہر کیف انھوں نے کہا کہ میں شام کا کھانا ان ہی کے ہاں کھا کر جاؤں۔ ہیڈ خانکی سے تحفے کے طور پر مہاشیر مچھلی آئی ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے کمرے میں بٹھا دیا اور بیٹے سے کہا کہ تایا ابا کو مچھلی کھلائے بغیر نہ جانے دینا۔ ان کا بیٹا میرے پاس بیٹھ گیا' پوچھتا رہا کہ میں کس طرح ان کا تایا ابو ہوں؟ پھر وہ اندر سے ایک بڑی سی سٹیل کی پلیٹ میں مچھلی اور نان لایا۔ مقدار میں مچھلی محض چھٹانک بھر کی بوٹی تھی اور معیار میں وہ مہاشیر کے بجائے ملی مچھلی کا کانٹوں بھرا چربی دار پلّا تھا جسے کھانے کی میں صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے وہ سب کچھ ان کے صاحبزادے ہی کو کھلا دیا بعد کو خان صاحب مجھ سے گلہ ہی فرماتے رہے کہ میں نے ان کے ہاں مچھلی نہ کھا کر کفرانِ نعمت کیا جبکہ وہ خود کئی مرتبہ میرے بیٹے کے ہاں اپنے رشتہ داروں سمیت متعدد دعوتیں کھا چکے ہیں اور میرے فلاں فلاں عزیز سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔

☆☆

خان صاحب فارغ افسروں کے صیغے سے محکمہ تعلیم میں آئے تھے' ان پر یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ وہ تین سال کے دوران بی ایڈ کی ڈگری ضرور حاصل کر لیں ورنہ محکمہ تعلیم کے افسروں میں ان کا تقدم ختم ہو جائے گا۔ خان صاحب نے بی ایڈ کے امتحان کا دوسرے سال ہی داخلہ بھیج دیا۔ وہ ذہین اور لائق تھے' مجھے پورا یقین ہے کہ انھوں نے مکمل تیاری کے بعد ہی امتحان دیا ہو گا۔ لیکن اپنے اکھڑ مزاج اور آبادکاری کے محکمے سے لائے ہوئے حاکمانہ رویے کی

وجہ سے انھوں نے بہت سے مخالفین پیدا کر لیے۔ انھوں نے جب بی ایڈ کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تو نہ جانے کیسے یہ بات چل پڑی کہ مذکورہ امتحان کا مرکز اور وہاں تعینات سارا امتحانی عملہ خان صاحب کی اپنی پسند کا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اخبارت یہ خبر لے اڑے، کسی نے کالم لکھے اور کسی نے شذروں میں اس فرضی ماحول کی خوب منظر کشی کی کہ کس طرح عملہ ان کو امتحانی پرچوں کے جوابی حل پیش کرتا رہا اور کس طرح خان صاحب نقل در نقل کرتے رہے۔

قطع نظر اس امتحان کے خان صاحب سے اور بھی کئی ''خوبیاں'' منسوب کی جاتی تھیں مثلاً کہا جاتا کہ ''محکمہ تعلیم کے غریب افسر تو بیچارے بڑے رقیق القلب ہیں، اپنے اے ڈی آئی قسم کے ماتحتوں سے بس ادنیٰ سے کام لیتے ہیں مثلاً یہ کہ ایک خوبصورت بٹن کسی ماتحت کو تھماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ قمیص لگوالاؤ۔'' یا ایک ٹوٹی پھوٹی آٹو سائیکل (کوئیکلی) دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کو بیچ کر سوزوکی موٹر سائیکل خرید دو۔ ماتحت پانچ سو میں کوئیکلی بیچتے ہیں اور دو ہزار مزید اکٹھا کر کے موٹر سائیکل خرید لاتے ہیں اور اپنے افسر اعلیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ بس جی صرف پانچ سو روپیہ دے دیں حساب برابر ہو جائیگا۔ لیکن خان صاحب ایسے ویسے افسر نہیں بلکہ وہ تو ماتحت افسروں کو چار پہیے دے کر ان کے ساتھ گاڑی لگوانے میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ایسے جملے توڑنے والوں سے کہا جاتا کہ کردار کشی ٹھیک نہیں تو وہ کہتے ''اچھا یہ بتاؤ کہ ۱۹۵۶ء ماڈل کی ڈاج جو ایک گیلن پٹرول سے صرف سات میل چلتی ہے، اس کا پٹرول کہاں سے آتا ہے؟''

باقاعدہ مہم خان صاحب کے خلاف چلی۔ اس مہم کو چلانے والے شاید وہ افسر تھے جن کے تقدم (Seniority) کے آگے خان صاحب نے بندش لگا دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو حکومت کے ہاتھوں ۱۳۰۰ ریٹائر ہونے والے افسروں میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ بعد کو وہ کسی طرح بحال بھی ہو گئے لیکن بحالی کے بعد بھی یا تو انھوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا یا پھر ان کے مخالفین نے اپنی مہم جاری رکھی، غرضیکہ وہ محکمہ تعلیم سے نیک نامی نہ کما سکے۔''

شیخ عبدالکریم کی باتوں میں تجربات کی روشنی تھی۔ میں ان کی معیت میں اپنی نئی ''پرنسپل'' کی اسامی سے بڑا مطمئن ہو چلا تھا۔ میں اکثر سوچتا سائیں سردار سے ملاقات کرنے والی روح نے میرے بارے میں یہی کہا تھا کہ یہ تبدیلی اس کے لیے مفید رہے گی۔ واقعی یہ تبدیلی اس لحاظ سے مفید ثابت ہو رہی تھی کہ میرے اندر کا سویا ہوا فنکار بیدار ہونے کی خاطر آنکھیں مل رہا تھا۔

◆◆◆◆◆

(۳۳)

محکمہ تعلیم کی تنظیم نو

محکمہ تعلیم کی تاریخ میں تعلیمی اداروں کے قومیائے جانے کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ یہ تھا کہ محکمۂ تعلیم کا تنظیمی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا گیا۔ یہ وہی فیصلہ تھا جس کا نفاذ ڈسٹرکٹ انسپکٹروں کی جدوجہد کے نتیجے میں موخر کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں اسکولوں کے تمام ڈسٹرکٹ انسپکٹروں کو ان کے اضلاع میں ڈپٹی ایجوکیشن افسر بنا دیا گیا' اے ڈی آئی صاحبان اسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر قرار پائے اور ضلعی سطح پر اٹھارہویں گریڈ میں کام کرنے والے افسران تعلیم ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر تعینات کئے گئے۔

تنظیم نو اور دیگر ضلعی تعلیمی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے انتظامی اور تعلیمی مدارج کے نظام سے واقفیت ضروری ہے۔ سرکاری سکولوں کے انگریزی پڑھانے والے اساتذہ جو کم از کم بی اے بی ٹی یا بی اے بی ایڈ تھے جنرل کیڈر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ محکمے کے عہدوں پر اسی کیڈر کے اساتذہ کو ترقی دی جاتی تھی۔ توسیع تعلیم کے پروگراموں کے تحت جب ہر ضلعی سطح پر ایک جامع سکول قائم ہوا تو پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ایم اے پاس افراد کو ماہر مضمون اور ایم اے کے ساتھ بی ٹی/بی ایڈ افراد کو جامع سکولوں کا پرنسپل منتخب کیا گیا۔ یہ لوگ اٹھارہویں گریڈ ہی سے شروع ہوئے' بعد ازاں حکومت نے اساتذہ کی تربیت کرنے والے نارمل سکولوں کو بھی ایلیمنٹری ٹیچرز ٹریننگ کالج بنا دیا تو وہاں بھی عملہ کے عہدوں کی ترتیب جامعہ سکولوں کی طرح ہوئی اور ان کا انتخاب بھی نئے اور حاضر سروس اساتذہ سے جو ایم اے اور بی ٹی/ایم ایڈ تھے' بذریعہ پبلک سروس کمیشن کیا گیا۔ ابتدا میں تو یہ کہا گیا کہ جامعہ سکولوں اور ایلیمنٹری کالجوں کی سنیارٹی الگ ہوگی اور جنرل کیڈر کی سنیارٹی الگ چلتی رہے گی۔ مگر بہت سی حکومتیں کہتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ ہیں۔ تنظیم نو سے قبل جنرل کیڈر میں جامع سکولوں اور ایلیمنٹری سکولوں کے عملے

کو مدغم کر دیا گیا۔ اس ادغام سے گریڈوں کی بنیاد پر جونیئر لوگ اوپر آ گئے' جنرل کیڈر کے اساتذہ کی ترقیاں رک گئیں۔ یوں بے چینی کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ تعلیم تو جہاں تھی وہاں ہی دھری رہ گئی لیکن اساتذہ کی آپس میں زبردست کشمکش شروع ہو گئی۔

قومیائے گئے سکولوں کا ایک الگ کیڈر نیشنلائزڈ کیڈر کے نام سے وجود میں آیا۔ بلدیاتی اداروں کے ہائی سکولوں کو اپنی تحویل میں لے کر حکومت نے ۴ ایک مزید صوبائی (پروانشلائزڈ) کیڈر کو جنم دیا۔ مزید برآں جنرل کیڈر پر ایک اور ظلم یہ ہوا کہ پی پی پی کی حکومت نے اپنی مصلحتوں کی خاطر ایسے افراد کو جو صوبہ پنجاب میں سرکاری ملازمت حاصل نہ کر سکے تھے یا پھر بہتر مواقع کی تلاش میں ملک کے دوسرے صوبوں کے پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کر رہے تھے اور قومیائے جانے کے عمل سے سب دفعتہً سرکاری ملازم بن گئے تھے' انھیں اپنے صوبے میں سنیارٹی سمیت آنے کی اجازت دے دی۔ یہ واپس اپنے آبائی صوبے میں لوٹ آنے والے (Repatriated) کہلائے اور پنجاب میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن ہو گئے۔ ایک کھچڑی پک گئی جس میں بھانت بھانت کی اجناس شامل تھیں۔ چالاک اہلکاروں نے یہ کھچڑی خوب پیٹ بھر کر کھائی۔ سکولوں کے معائنے ختم ہو گئے' آڈٹ موقوف ہو گیا اور نظم و ضبط کا جنازہ نکل گیا۔ اپنی اپنی نوکری کی بقا کی ایک دوڑ لگ گئی۔

اس دور میں اساتذہ کی تنظیمیں اس قدر بہتات سے وجود میں آئیں کہ پرانی مقتدر اور رجسٹرڈ تنظیموں کو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا پڑی۔ ایسی تنظیمیں جو مدرسین کے حقوق کی بحالی کے نام پر اساتذہ کی جیبیں خالی کر رہی تھیں ان کی تعداد ۳۲ تھی ان میں ایسی سبحان اللہ قسم کی خود کفیل تنظیمیں بھی تھیں جن میں ایک ہی مدرس تن تنہا اپنی ذات میں صدر' جنرل سیکرٹری' خزانچی' اور پروپیگنڈہ سیکرٹری سبھی کچھ تھا۔ وہ اپنا سارا دفتر اپنے ایک ہی تھیلے میں بند رکھتا اور جہاں چاہتا' بیان لکھ کر اپنی مہر لگا کر اخبارات کے دفاتر دے آتا۔ جس کی پگڑی چاہتا اچھال دیتا۔ کئی نامہ نگار اور رپورٹر بھی دفاتر میں چکر لگاتے اور افسروں کو بلیک میل کرتے رہتے۔ ایسے دور میں تنظیم نو نے ہلچل مچا دی۔ پرانی سب ڈویژنوں کو توڑ کر تھانے کی حدود کو مرکز تسلیم کیا گیا اور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر مرکز کا انچارج ٹھہرا۔ ڈپٹی ایجوکیشن افسر کے فرائض کی کوئی وضاحت ہی نہیں کی گئی۔ بس اس قدر لکھا گیا کہ وہ ضلعی نظم و نسق میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کا معاون ہو گا۔ اس غیر واضح صورتحال سے ہر مقام پر فرائض کی بجا آوری میں

ابہام اور خلل پیدا ہو گیا۔ رہا اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کا معاملہ تو وہ حسب سابق مزے میں رہا کیونکہ اس کا رابطہ براہ راست پرائمری اور مڈل مدارس کے اساتذہ سے تھا۔

ایک اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر نے کسی وجہ سے مجھے کھانا کھلانا چاہا۔ میں نے پوچھا کہاں اور کیا کھلاؤ گے؟ بولا یہ آپ کے انتخاب پر منحصر ہے۔ میں نے کہا کہ انتخاب کا تو وقت نہیں رہا اوپر سے ایک بج رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے افسروں نے ہماری بڑی تربیت کر رکھی ہے۔ میرا ایک آدمی گوالمنڈی میں منتظر کھڑا ہے اگر آپ تکے کباب کھانا چاہیں تو وہاں چلتے ہیں، مچھلی کھانا چاہیں تو مزنگ چونگی میں بھی ہمارا آدمی مستعد ہے۔ اگر سری پائے کھانا چاہیں تو پھجے کے ہوٹل پر بھی اپنا آدمی مسلط ہے، اگر عزیز کے چنے کھانا چاہیں تو وہاں بھی خادم کا خادم موجود پائیں گے۔

ع...... جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا!

وہ مجھے دم بخود دیکھ کر بولا جناب ہم سارا انتظام رکھتے ہیں۔ افسر نہ جانے کدھر کا رخ کر لے اور......' یہ اس ترقی کی رفتار کی ایک ہلکی سی جھلک تھی جو ہم اے ڈی آئی صاحبان کے اندھا دھند تبادلوں کے بعد رونما ہوئی تھی۔

☆☆

سائیں سردار کی پیشین گوئی، شیخ کریم الدین کی آپ بیتی اور خود پی ٹی سی کلاس نے مجھے اپنے اندر اس قدر جذب کر لیا تھا کہ اب اپنے اے ڈی آئی ہونے کے دور کی یاد بھی ماند پڑ گئی تھی اور مجھے اکثر اپنے اس وظیفے پر ندامت سی ہوتی جو میں اے ڈی آئی کے منصب پر واپسی کے لئے کرتا رہا۔ وزارتِ تعلیم کا قلمدان مشہور کرکٹر مسٹر کاردار کو سونپا گیا۔ مسٹر کاردار سردار ٹیکسٹائل ملز، سردار گرلز ہائی سکول اور سردار ہاؤس گڑھی شاہو والوں کے وظیفہ خوار تھے۔ انھیں وزیر تعلیم بنے چند دن ہی ہوئے تھے کہ سردار ہاؤس والوں کی سفارش پر انھوں نے ایک دھماکہ خیز حکم جاری کیا کہ چوہدری حمید اللہ اور مسٹر جے ڈی سلیم انگریزی مدرسین گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی کو بطور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر تبدیل کیا جاتا ہے۔ محکمہ ان کو ضلع لاہور میں متعین کرے۔ یہ ایسی نرالی خبر تھی کہ پورے پنجاب میں اس کا فوری ردعمل ہوا۔ وہ اے ڈی آئی صاحبان جو صبر و شکر کر کے بیٹھ چکے تھے، نئے سرے سے انگڑائی لے کر اٹھے اور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر بننے کے لئے اونچی سفارشوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ کیونکہ سفارش ضابطوں کو

بھی توڑ سکتی تھی کہاں انسپکٹر کہلانا اور کہاں اب افسر کہلانا...... اس اسامی کے ساتھ اب ایک نیا سرور تھا۔ میرے اپنے اندر کھلبلی مچ گئی۔ میں نے حمید اللہ اور سلیم سے شکوہ کیا کہ انھوں نے مجھے اپنی سفارش میں کیوں شامل نہیں کیا' وہ کہتے کہ انھیں امید نہیں تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اب جبکہ خوبی تقدیر سے کامیاب ہو گئے ہیں تو انھیں خود بھی شرمندگی ہو رہی ہے کہ انھوں نے اپنی تنظیم سے بے وفائی کیوں کی۔ انھیں کچھ اور مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔ میرے اصرار پر سفارش کی خاطر سلیم مجھے سردار گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس باجی روشن کے پاس لے گیا۔

باجی روشن سکول ہی کے ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ بڑی نیک طبع خاتون تھیں۔ ان کی بہن رشیدہ علامہ اقبال کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کی بیوی تھیں' یوں کہیے کہ رشیدہ علامہ اقبال کی بہو تھیں۔ باجی روشن مڈل پاس کرنے کے بعد بطور عربی ٹیچر سردار گرلز ہائی سکول میں آئی تھیں۔ پردہ دار خاتون تھیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے بی اے بی ایڈ کیا اور پردے ہی میں رہ کر مولانا محمد حسین نعیمی سے کلام پاک بھی حفظ کیا تھا۔ سردار گرلز سکول کی انتظامیہ نے ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے لئے سکول کے احاطے میں ایک چھوٹا سا مکان بنوا دیا تھا' سکول چونکہ قومیایا جا چکا تھا اس لئے اب نظم و نسق میں وہ آزاد تھیں لیکن سردار فیملی سے احترام کا رشتہ باقی تھا۔ ان کی وساطت ہی سے سلیم اور حمید اللہ کی رسائی سردار ہاؤس تک ہوئی اور وہ سال بھر ہی میں واپس انتظامیہ میں آ گئے تھے۔

باجی روشن شاعرہ بھی تھیں۔ میں بھی لکھنے لکھانے کا شوق رکھتا تھا۔ اس لئے انھیں مجھے چھوٹا بھائی بنانے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں ان کا کلام سنتا اور وجد میں آ جاتا۔ قیام پاکستان سے پہلے متحدہ ہند کے زمانے میں وہ ریڈیو پر نعت خوانی بھی کیا کرتی تھیں اور "بلبلِ ہند" تسلیم کی جاتی تھیں محبت اور شفقت کے باوجود وہ میرے لئے مؤثر سفارش ثابت نہ ہو سکیں اور میں پی ٹی سی کلاس ہی میں زیادہ مصروف رہنے لگا۔ مگر میں یہ خلش دل سے نہ مٹا سکا کہ دیکھو سلیم اور حمید اللہ سکول سے مکھن کے بال کی طرح نکل گئے ہیں اور اب پھر ان کے پوں بارہ ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے حمید اللہ کو سپر سٹار کا خطاب دیا کیونکہ اس نے کمال سیاست سے سلیم کی سفارش کو اپنے لئے بھی استعمال کرا لیا تھا۔

میری کوششیں اپنے انجام کو اس طرح پہنچیں کہ محکمہ میں نئے نظام کے تحت جو اکھاڑ

پچھاڑ ہوئی اس میں بھی کچھ اناڑی پن سے کام لیا گیا اور ہر جگہ بدلی بدلی نظر آنے لگی۔

ع...... ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

☆☆

لاہور کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر مفتی سعید احمد مقرر ہوئے۔ وہ جامعہ سکول ساہیوال کے پرنسپل تھے۔ انتہائی شرف النفس اور منکسر المزاج۔ انھیں اعتراف تھا کہ جس منصب پر ان کو فائز کیا گیا ہے وہ اس کی الف بے تک نہیں جانتے۔ ان کے کسی بہی خواہ نے ان کو یہ بھی سمجھایا کہ ملک غلام حیدر جوان کے نائب افسر ہیں بڑے منجھے ہوئے انسان ہیں۔ ان کا گورنر ہاؤس بھی آنا جانا ہے اور لاہور ہی میں مدت سے تعینات ہیں۔ مفتی صاحب کے مفاد میں یہی ہوگا کہ وہ ان سے ہر طرح بنا کر رکھیں۔ لہٰذا وہ بلاوجہ ملک غلام حیدر سے دبکے ہوئے تھے حالانکہ ملک غلام حیدر کھلی کتاب تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ ملک صاحب نے مفتی صاحب کو انتہائی دیانتداری اور خیر سگالی کے جذبے کے تحت لاہور کے محکمہ تعلیم کی اندرونی اور مقامی سیاست سے آگاہ کیا۔ انھیں حوصلہ دلایا کہ وہ ان کے دست و بازو کے طور پر پوری تابعداری اور دیانتداری سے کام کریں گے۔ ویسے بھی کام کی نوعیت تو اتنی نہیں بدلی تھی جتنی سمجھی جا رہی تھی۔ بس عہدوں کے نام ہی بدلے گئے تھے۔ اس یقین دہانی کے باوجود مفتی صاحب ملک صاحب سے مرعوب ہی رہے۔ ملک صاحب کا گورنر ہاؤس آنا جانا، وزیر تعلیم سے ذاتی نوعیت کے تعلقات ہونا اور ان کا انداز گفتگو، یہ سب ایسی باتیں تھیں جو ان کو اپنے افسر کے مقابلے میں ممتاز بنائے ہوئے تھیں۔

کوئی بھی کام جب عجلت میں کیا جائے تو اس میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ ضلعی سطح کی بھرتی کمیٹی کو اساتذہ تک محدود کر دیا گیا تھا اور اس کمیٹی کے ارکان میں سینئر اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کا نام تو تھا، ڈپٹی ایجوکیشن افسر کا نام نہیں تھا اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر (ترقیات) کی کوئی اسامی نہیں رکھی گئی تھی۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کے مالیاتی سال میں امدادی گرانٹوں کے انبار لگ گئے۔ مسلسل چلی آنے والی سالانہ ترقیاتی اسکیموں کے علاوہ بہت سی اضافی امدادی رقومات تنظیم نو کے حوالے سے دی گئیں۔ ضلع لاہور کی مجموعی رقم گیارہ لاکھ روپے کے لگ بھگ تھی۔ چونکہ پی پی پی کے عہدہ داروں اور دیگر مخالفین نے ملک صاحب کے خلاف گرانٹوں کے حوالے سے بڑا شور برپا کیا تھا، لہٰذا ملک صاحب نے قسم کھائی تھی کہ وہ گرانٹوں کے معاملے

میں مفتی صاحب کو کوئی مشورہ نہیں دیں گے۔ سرکاری مراسلے کے مطابق بھی نئ ضلعی خریداری کمیٹی برائے محکمہ تعلیم یوں تشکیل دی گئی تھی:

۱۔ ڈپٹی کمشنر ضلع .... چیئر مین

۲۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر .... سیکرٹری

۳۔ ٹیکنیکل افسر محکمہ صنعت .... فنی ممبر

پہلے ہی اجلاس میں ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہہ دیا کہ تمام کاغذی کارروائی پر ان کی طرف سے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) دستخط کریں گے۔ جو ضلعی افسر خواہ اس کا تعلق کسی بھی محکمے سے ہو' اگر امدادی رقوم ۳۰ جون ۷۵ء سے پہلے پہلے خرچ نہیں کرے گا تو اس کی نالائقی کا اندراج اس کی خفیہ رپورٹ میں کیا جائے گا۔ مفتی صاحب بچے نہیں تھے' وہ اس خریداری کو کوئلوں کی دلالی سمجھتے تھے اور اسی مرحلے سے خوفزدہ تھے۔ سوائے ڈویلپمنٹ کلرک کے کوئی اور ذمہ دار اہل کار مفتی صاحب کی مدد کے لئے موجود نہ تھا۔ ملک غلام حیدر نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک تحریر مرتب کر کے ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس لے جائیں اور انسپکٹر آفس کے پرویز قریشی کی ڈیوٹی اپنے ساتھ لگوالیں کیونکہ وہ پوری ڈویژن کے ترقیاتی کام کا انچارج رہا ہے۔ یہ مرحلہ تو بہ آسانی طے ہو گیا لیکن چار دن کام کرنے کے بعد پرویز قریشی خاموشی سے رخصتِ بیماری پر چلا گیا۔

☆☆

فنی ممبر نے مفتی صاحب سے کہا کہ وہ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ پرویز قریشی چلا گیا ہے تو کیا ہوا۔ وہ خود سارا کام کر سکتا ہے' وہ تیز طرار باتیں کرتا تھا۔ لہٰذا مفتی صاحب کو وہ بہت ہوشیار نظر آیا۔ اس نے کہا کہ گیارہ لاکھ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ وہ بروقت استعمال کر لے گا۔ مفتی صاحب نے اسے کہا کہ اس کا کام صرف مال کی فنی اقدار اور تصریحات مقرر کرنا ہے اور پھر جب مال تیار ہو کر اسٹور میں آ جائے تو اس کی پڑتال کرنا ہے کہ وہ مقررہ تصریحات کے مطابق ہے یا نہیں۔ باقی کاغذی کام اور ٹھیکیداروں سے رابطہ وغیرہ ان کا کام ہے۔ ابتداء میں تو وہ تلخ ہوا لیکن پھر وہ سمجھ گیا کہ اس کی طرح ضلعی افسر تعلیم بھی نیا نیا ہے۔ جوں جوں کمبل بھیگے گا اسی نسبت سے بھاری ہوتا جائے گا۔ اب کے ملک صاحب نے مفتی صاحب کو میرا نام تجویز کیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے میرے نام احکام جاری کر دیئے کہ میں تنخواہ تو اسکول ہی سے لوں گا لیکن

کام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے دفتر میں بطور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر (ترقیات) کروں گا۔

مفتی سعید صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کی سرکاری قیام گاہ ۹-ہال روڈ پر ہوئی۔انھوں نے علیک سلیک کے بعد تمہیدی گفتگو میں کہا کہ یہ مفتی، قاضی، قریشی، فاروقی صدیقی اور علوی وغیرہ قسم کے لوگ دراصل ان لوگوں کی اولاد ہیں جو سابقہ ادوار میں دینی تعلیم سے وابستہ رہے۔ یہ لوگ مولوی، مُلّاں، اور آئمہ مساجد تھے۔ان کی بات ٹھیک ہی تھی میں خاموش رہا۔انھوں نے پوچھا کہ کیا میں نماز پڑھتا ہوں؟ میں نے کہا کہ کبھی کبھار پڑھتا ہوں۔اس لیے کہ مسلسل پڑھنے کے باوجود مجھے نماز سے کچھ نہیں ملا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ٹکریں مارنے اور نماز پڑھنے میں بڑا فرق ہے، خشوع خضوع سے نماز پڑھ کر دیکھو تو تمہیں سب کچھ ملے گا۔''

ان باتوں کے بعد انھوں نے بتایا کہ انھیں دفتری کام کا تجربہ نہیں تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انھیں دفتری کام کرنا نہیں آتا، وہ سیکھ رہے ہیں۔امدادی رقوم کے خرچ کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔میں نے سنا ہے کہ میرے دفتر میں پہنچنے والی گرانٹوں کی چٹھیاں اور دیگر مراسلے ٹھیکیدار متعلقہ دفتر سے پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ضلع لاہور امدادی رقوم خرچ کرنے میں باقی اضلاع سے بہت پیچھے ہے۔ باقی اضلاع میں تو وہ مال بھی بھیج چکے ہیں۔

''میں نے کہا کہ یہ غلط ہے، مال تو وہ تیار ہی تب کرتے ہیں جب انھیں ''ورک آرڈر'' مل جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے مزید کہا کہ وہ مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں کہ میں خریداری کا تمام کام دیانتداری سے سرانجام دوں گا۔وہ میرے ہر اس قدم کی تائید کریں گے جو میں اس سلسلے میں اٹھاؤں گا۔انھوں نے صاف گوئی سے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا موڑ آجائے کہ میں کچھ گھپلا کرنا چاہوں تو ان کو سب کچھ بلا جھجک صاف صاف بتا دوں۔

ملاقات ختم ہوئی، مجھے سائیں سردار کا وہ جملہ ''یہ جہاں بھیجا گیا ہے وہیں اس کا فائدہ ہے'' یاد آیا۔تاہم میں نے ان سے ان کا دل رکھنے اور اعتماد حاصل کرنے کے لئے وعدہ کیا کہ اول تو گول مال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوا تو ان سے پوچھے بغیر کوئی گڑ بڑ گھٹالا نہیں ہوگا۔میں نے کام کا آغاز بابو مجید کے ساتھ دو مدرس لگا کر کیا۔ چند ہی دنوں میں ہم نے ٹھیکیداروں کو مال بمطابق تصریحات ۳۰؍جون تک مہیا کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔

☆☆

مال مہیا کرنے کی چٹھیاں وصول کرنے کے بعد ٹھیکیداروں نے اصل کھیل دکھانا شروع کیا۔ امدادی رقوم کے اچانک بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ہماری طلب کے مطابق مال مقررہ تاریخ تک مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے زبانی کلامی افسر مجاز سے درخواست کی تھی کہ وہ مال کی تفصیل کے مطابق اپنے بلوں کی رقوم وصول کرنے کی رسیدیں لکھ دیتے ہیں۔ ان کو دفتری بلوں کے ساتھ لگا کر مال کی پوری قیمت کے بل اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر سے پاس کرا لئے جائیں۔ رقوم تیس جون سے پہلے نکلوا کر کمیٹی کے کھاتے میں جمع رکھی جائیں تاکہ گرانٹیں ضائع نہ ہوں۔ پھر وہ جوں جوں مال مہیا کرتے چلے جائیں گے اس کی قیمت لیتے جائیں گے۔

ان کی یہ تجویز بظاہر بڑی بے ضرر تھی لیکن حکومت کی واضح ہدایات تھیں کہ جو مال اسٹور میں ہو اُسی پر ادائیگی کی جائے۔ کمیٹی اس سلسلے میں کسی قسم کی بے ضابطگی نہ کرے ورنہ سب اہلکار بحیثیت مجموعی ذمہ دار ہوں گے۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ کئی قسم کی نامعقول تجاویز آ رہی تھیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اسی نسبت سے سب کی تشویش بڑھ رہی تھی کہ امدادی رقوم کا کیا بنے گا۔ مفتی صاحب کے کلرک اور کمیٹی کے فنی رکن کے علاوہ ہم جو وقتی طور پر اس ذمہ داری میں ملوث کر دیئے گئے تھے ٹھیکیداروں کی ترغیبات کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ ان کے نذرانوں، دعوتوں، وعدوں، یقین دہانیوں، تحائف اور چھوٹی موٹی مالی مہربانیوں نے ہم سب کو ٹھیکیداروں کا ہم نوا بنا دیا تھا۔ میں اب مفتی صاحب سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ ان کو باتوں باتوں میں یہ تاثر دینے لگا تھا کہ ٹھیکیدار تو محکمے کی تخلیق کے اولین دن سے اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور چمٹے رہیں گے۔ ان کا سلسلہ بھی یوں ہی چلتا رہے گا۔ ہم سرکاری ملازمین آنی جانی مخلوق ہیں، بہتر ہوگا کہ وہ بھی کچھ فائدہ اٹھالیں۔ انھوں نے کہا کہ ذاتی مفادات ہی سچی اور سیدھی بات کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ میں کوئی بھی غلط اور غیر قانونی قدم اٹھا کر الجھنا نہیں چاہتا۔ جتنا مال ملے گا اتنی ہی ادائیگی کروں گا۔ جس قدر رقوم خرچ ہوں گی ان ہی کا آڈٹ میرے حوالے سے ہوگا۔

بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر میں گندے پانی کی ندی میں ہاتھ دھونا چاہوں تو وہ مجھے وعدے کی قید سے آزاد کرتے ہیں کیونکہ میں نے واقعی بڑی محنت کی ہے۔ موصوف کو کیا خبر تھی کہ میں پہلے ہی اپنے وعدے کی پاس داری سے پھسل چکا تھا۔ بعض اچھے

مڈل سکولوں اور ہائی سکولوں میں محکمہ تعلیم کے نصاب کی ''زیڈلسٹ'' کے مطابق دھات کاری، چوب کاری، بجلی اور اسی نوع کے دیگر فنی مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ان فنی مضامین کے لئے ضروریات کا سامان سپلائی کرنے والا ایک ٹھیکیدار سنٹرل ماڈل سکول میں میرا ساتھی رہا تھا۔ وہ ٹیکنیکل ورکشاپس کا انسٹرکٹر ہوا کرتا تھا۔ پہلے اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹھیکیداری کا کام شروع کیا اور پھر اس نے سرکاری ملازمت ترک کر کے مکمل طور پر ٹھیکیداری ہی شروع کر دی۔ اس نے برانڈرتھ روڈ پر ایک دوکان بھی حاصل کر لی تھی۔ وہی مجھے حمام میں ننگا کرنے کا اور مفتی صاحب سے میرے پیمان وفا میں دراڑیں ڈالنے کا سبب بنا۔ وہ ٹینڈر میں کامیاب ہونے کے بعد ہی سے میرے پاس آنے جانے لگا تھا اس نے کسی تہوار یا تقریب کے بہانے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں سو سو روپے کے اس قدر نوٹ تھے جو میری تنخواہ سے دوگنے تھے۔ساتھ ہی اس نے کہا کہ اس رقم کا ٹینڈر یا مہیا کئے جانے والے مال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ تو بس بھتیجے بھتیجیوں کے لئے ہے۔

ایسا مہربان چچا ٹھیکیداری کے روپ ہی میں کیوں مہربان ہوا تھا! اس لئے کہ اس کا سارا مال نمبر دو تھا البتہ اس پر مہر ''میڈان چائنہ'' کی لگی ہوئی تھی۔فنی رکن نے اس مال کے نمونے ''اے ون'' قرار دے دیے تھے۔ مفتی صاحب اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تو اس معاملے میں تھے ہی اناڑی۔خریداری کے اس عمل میں دفتر کے خزانچی کو کلی طور پر نظرانداز کیا گیا تھا حالانکہ جس کے ہاتھ میں کفگیر ہوتا ہے وہی سب کا پیر ہوتا ہے۔رقوم تو اسی کو وصول اور تقسیم کرنا تھیں۔ہم سے بالا بالا اس نے ٹھیکیداروں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا لیکن وہ ان کو بطور خاص دبکانا بھی چاہتا تھا' اس نے مفتی صاحب کو ایک ''یادداشت'' پیش کی کہ خریداری کے سارے عمل میں ایسا گھپلا ہو رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔لہٰذا وہ محتاط رہیں۔ جب ٹھیکیداروں کو خزانچی کی اس یادداشت کی سن گن ملی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور خزانچی کی خوشامد اور خاطر مدارت میں لگ گئے۔ مفتی صاحب نے مجھے، فنی رکن، بابو عبدالمجید اور خزانچی کو اپنی رہائش گاہ پر بلایا اور کہا کہ وہ نہیں چاہتے کہ امدادی رقوم بے ہنگم طور پر اندھا دھند خرچ کی جائیں اور ٹھیکیداروں کے مفادات کی توند بھری جائے۔تاہم ان کا یہ موقف کہ مال کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ۳۰ جون سے پہلے مال مہیا نہیں کر سکتے' کچھ نہ کچھ وزن رکھتا ہے۔اسی لئے کوئی درمیانی راستہ نکالنا ضروری ہو گیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں خریداری کی ضلعی کمیٹی کے

چیئرمین سے ایک فوری نوعیت کے اجلاس کے لیے وقت مانگوں۔ تاکہ باہمی مشاورت سے مسئلے کا حل ڈھونڈا جائے۔

اتفاق کی بات کہ یہ وقت اگلے ہی دن مل گیا اور کمیٹی کے اجلاس میں وہ مسئلہ جو ہم ''نمک حلال'' اہلکاروں' ٹھیکیداروں اور مستقبل میں امدادی رقوم سے خرید کئے مال سے استفادہ کرنے والوں کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا' صدر پر چیز کمیٹی کی جرأت و دانائی سے حل ہو گیا۔ طے پایا کہ روایت کو توڑ کر ضلعی پرچیز کمیٹی کے نام کا کھاتہ کسی سرکاری بینک میں کھولا جائے۔ تمام رقوم خزانہ سرکار سے نکلوا کر اس کھاتے میں جمع کرا دی جائیں چنانچہ ٹھیکیداروں سے رسیدیں اور بل لے لئے گئے اور انہیں ضروری کاغذات کے ساتھ اے۔جی کے دفتر میں جمع کرا دیا گیا۔ ٹھیکیداروں نے اپنے اثر ورسوخ سے بل پاس کرا لیے پھر بتدریج ادائیگیاں ہوتی رہیں۔ متعلقہ خزانچی انتہائی شریف آدمی ثابت ہوا۔ اس نے میری غیر معمولی محنت اور بھاگ دوڑ کو فراموش نہیں کیا۔ اس تمام سوداکاری پر ملنے والے کمیشن میں سے نصف فی صد مجھے بھی پیش کیا اور میں نے بمصداق ؎

پہلے جناب شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر
پھر سر جھکا کے داخل میخانہ ہو گئے

تھوڑی سی جھجک اور پس و پیش کے بعد میں یہ...... جامِ نافرجام غٹا غٹ پی گیا۔ اور زیرلب ''واہ سائیں سردار جیو'' کا نعرہ لگایا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پائے ثبات میں لغزش آ گئی اور میں اس ہاتھ کو جھٹک نہیں سکا جو خود آگے بڑھ کر مجھے ''حصہ رسدی'' پیش کر رہا تھا۔ گناہ کی زندگی کیا ہے؟ میرا تجربہ بتاتا ہے یہ ایک خوفناک نشیب ہے۔ آدمی اپنے قدموں کی کڑی نگرانی نہ کرے تو یہ لازماً لچک کھاتے ہیں اور پھر نشیب میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں...... جونہی میں نے اپنا حصہ رسدی کھایا یوں محسوس ہوا جیسے ہر روک اٹھ گئی ہے اور جھجک و تامل کے سارے بندھن کھل پڑے ہیں پھر یہ کافر لت ایسی لگی کہ ''لوت'' ہو گئی' پنجاب کی لوک کہانیوں کی ''لوت'' بحر و بر میں اپنے شکار کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آسیب کی طرح چمٹ جاتی ہے۔ میں ۱۹۸۹ء میں اپنی ملازمت سے پنشن پا کر سبکدوش ہوا لیکن اس نامراد ''لوت'' نے کہیں ۱۹۹۳ء میں آ کر میرا پیچھا چھوڑا۔

ع...... من نہ کردم شما حذر بکنید!

☆☆

ضلعی خریداری کمیٹی کا سیکرٹری ہر قسم کے مال جیسے کتب' فرنیچر' الماریاں اور سامان سپورٹس' سامان لیبارٹری وکیمیکلز وغیرہ کے لئے ماہرین پر مشتمل ذیلی کمیٹیاں بنانے کا پابند ہے تا کہ مال میں گھپلا نہ ہو سکے اور انتخاب بھی موزوں رہے۔ان کمیٹیوں کی نوعیت کاغذی ہوتی ہے۔ کتب کی خریداری کے لئے میں نے ذیلی کمیٹی میں اپنا نام بھی شامل کیا اور ساتھ ہی دفتر میں کسی کام سے آئے ہوئے اپنے دوست ملک عبدالمجید کا نام بھی لکھ لیا۔ان سے متعلقہ کاغذ پر دستخط بھی کروا لئے۔ ظفر برادرز نامی کتب خانے نے ۷۵ فیصد کمیشن پر لائبریری کے لئے مطلوبہ سپلائی کرنے کا ٹینڈر دیا۔ کمیشن اگرچہ مشکوک تھی لیکن ضوابط کے تحت کمیٹی کو منظور کرنا پڑا۔ مقررہ عرصے تک اس کتب خانے نے کتب فراہم نہ کیں تو اس کی ضمانت ضبط کر کے دوسرے کتب خانے کو جس نے ۵۲ فیصد کمیشن پیش کی تھی' کتب مہیا کرنے کی چٹھی جاری کر دی گئی۔ ایسا کتب فروشوں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے ہوا تھا۔ان کے مابین حصہ رسدی پر سمجھوتہ نہیں ہو سکا تھا' تاہم اس میں محکمہ کا مفاد تھا جو مطلوبہ منظور شدہ معیاری کتابیں انتہائی سستی خرید رہا تھا۔

ڈویژنل دفتر کے آڈٹ افسر غلام محمد بٹ مرحوم بڑے دیندار اور شریف النفس انسان تھے۔ وہ اس کمیٹی کے رکن تھے جسے تمام خریداری کے عمل کی مابعد پڑتال کرنا تھی۔ تمام دفاتر میں آڈٹ والوں کو ایک خاص احترام دیا جاتا ہے' بغرض پڑتال دفتر میں آمد پر ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ ڈالیاں نذر کی جاتی ہیں۔ گنجائش ہو تو نقدی بھی پیش کی جاتی ہے۔ ظہرانے اور عشائیے تو اِلّا ماشاء اللہ چلتے ہی رہتے ہیں۔ دفتر کے خزانچی سے آڈٹ پارٹی کی تواضع میں کوئی کوتاہی ہو گئی حالانکہ وہ بڑا سمجھدار اور جہاندیدہ اہلکار تھا۔ اس سے غلطی کی توقع نہ تھی۔ بٹ صاحب دفتری اہلکار کی کوتاہی کی وجہ سے' مفتی صاحب سے ناراض ہو گئے کہ کیسا روکھا پھیکا خشکی کا مارا افسر ہے۔ آڈٹ کرانے کے آداب بھی نہیں جانتا لہٰذا وہ خریداری کے سارے عمل میں کوئی نہ کوئی بے ضابطگی اور غلطی پکڑنے پر تل گئے۔ اللہ کا کرم رہا کہ کاغذات سے کوئی قابل ذکر غلطی یا کوتاہی برآمد نہ ہوئی۔

البتہ وہ لوت جو مجھے چمٹی ہوئی تھی اس نے اپنی نحوست کا پہلا وار کیا اور ایک ایسی غلطی پکڑی گئی جو فی نفسہٖ غلطی نہ تھی لیکن اسے غلطی بنا دیا گیا۔ لائبریری کی کتابوں کی خریداری میں

ہم نے ظفر برادرز کو کتابوں کی عدم فراہمی پر کتب خانے کی ضمانت بحق سرکار ضبط کرنے کی سزا دی تھی۔ آڈٹ پارٹی کا کہنا تھا کہ ضمانت کی ضبطی کے ساتھ کتب خانے کو ''بلیک لسٹ'' بھی کرنا چاہیے تھا۔ حالانکہ کسی کاروباری ادارے کو بیک وقت دو سزائیں نہیں دی جاسکتی تھیں۔ ہمارا یہی موقف بعد کو تسلیم بھی کرلیا گیا لیکن اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ آڈٹ کمیٹی نے کتب برائے لائبریری کی خرید کی ذیلی کمیٹی کے ارکان یعنی راقم الحروف، ملک عبدالمجید اور کلرک برائے ترقیات بابو عبدالمجید سے وضاحت طلب کئے بغیر ہمارے خلاف تادیبی کارروائی کے لئے نظامت تعلیم کو کچھ لکھ بھیجا اور جو کچھ لکھا اسے خفیہ رکھا۔ یہ دراصل اس ''لوت'' کی کارستانی تھی جو مجھے کمیشن کی صورت میں چمٹ گئی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' اس کی تفصیل آگے آئے گی فی الحال ''لوت'' کا ایک اور کارنامہ سنئے:

☆☆

میں پی ٹی سی کلاس کو پڑھا کر فارغ ہوا اور شیخ کریم الدین کے پاس جا بیٹھا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہزادہ نواب کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر شہزادہ صاحب کے اخلاق اور طریقہ کار کے متعلق بڑی خوشگوار باتیں ہوتی رہیں، شیخ صاحب نے بتایا کہ ان کی جگہ کسی خواجہ عبدالرؤف کا تقرر ہوا ہے۔ سنا ہے کہ مرکزی حکومت کے سیکرٹریٹ میں ان کی بیوی کا کوئی کزن بڑا افسر ہے اس نے یہ تبادلہ کرایا ہے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ایسے تبادلے ہوتے ہی رہتے ہیں میں اور شیخ صاحب نئے صدر معلم سے ملنے گئے۔ اپنا تعارف کرایا۔ نئے صدر معلم دھان پان سے آدمی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرا مقام اتنے بڑے سکول کی سیکنڈ ہیڈ ماسٹری ہے۔ وہاں پی ٹی سی کلاس میں مجھے صرف پیریڈ پڑھانے ہی جانا چاہیے اور مجھے سکول کے نظم وضبط میں ان کی اعانت کرنی چاہیے۔ پتہ نہیں ان کو کس نے یہ پٹی پڑھا کر بھیجا تھا کہ سکول میں جاتے ہی انھیں کیا کیا اقدامات کرنے ہیں۔ انھوں نے زبانی ہونے والی بات چیت ''کتاب الاحکام'' پر لکھی اور مجھ سے دستخط کرالیے۔ میں اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ شیخ کریم الدین سے بھی کہا کہ وہ تو ایس وی مدرس ہیں پرائمری سکول میں ان کا کیا کام؟ انھوں نے کہا کہ اس کا جواب وہ انسپکٹر سکولز سے معلوم کریں کہ اُنھی نے ان کو پرائمری سکول کا اول مدرس تعینات کیا ہے۔ خواجہ صاحب خاموش ہو گئے۔ باوجود ان کی شرافت کے مجھے ان کے اس فوری اقدام سے ذہنی کوفت ہوئی

اور میں ان کے خلاف ہو گیا۔

جعلی منصب سے تنزلی اور دل میں کدورت ایک بیماری کی صورت میں میرے ساتھ رہنے لگیں۔

نئے وزیر تعلیم ملک غلام نبی صاحب نے ملک غلام حیدر کی سفارش پر مفتی صاحب کا تبادلہ ان کی حسب منشاء پھر جامع اسکول ساہیوال کر دیا۔ ان کی جگہ چودھری اصغر علی تشریف لائے۔ وہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کی اسامی کو پسند کرتے تھے لیکن ان کو لاہور پسند نہیں تھا۔ یہاں سرکاری اور غیر سرکاری بہت سی ذمہ داریاں ان کے مزاج کے خلاف تھیں۔ پیپلز پارٹی بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی کر رہی تھی۔ وہ بھی تبادلہ کروا کر فیصل آباد چلے گئے۔ وزیر تعلیم کو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا کہ جناب آپ کو لاہور کے لیے ملک غلام حیدر جیسا آدمی ہی مناسب رہے گا۔ چھوٹے گریڈ کے افسر کا تقرر بڑے گریڈ کی اسامی پر ہو سکتا ہے۔ ملک صاحب کو یہ تجویز پسند آئی اور ان کے اشارے پر محکمہ تعلیم کے ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے ملک غلام حیدر کا نام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے طور پر تجویز کیا۔ جسے وزیر تعلیم نے منظور کر لیا۔ ملک غلام حیدر کے اس تقرر سے مجھے بڑی تقویت نصیب ہوئی۔ ان کی جگہ مسٹر رحمت اللہ سوری کو ڈپٹی ایجوکیشن افسر تعینات کیا گیا۔ رحمت اللہ سوری چند سال پہلے میرے حلقے سب ڈویژن وسطی میں مڈل سکول سرائچ کے ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ پبلک سروس کمیشن نے ان کا انتخاب گریڈ سترہ میں کیا تھا' ان کی آمد سے مجھے مزید حوصلہ ہوا۔ ملک صاحب میرے ارادوں اور تمناؤں سے بخوبی آگاہ تھے' میرے ذرا سے اشارے پر انھوں نے وزیر تعلیم سے براہ راست مجھے اپنے دفتر میں بطور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر (مقدمات وترقیات) لے لیا اور میں از سر نو ضلعی انتظامیہ کا رکن بن گیا۔

☆☆

تعلیمی اداروں کے لئے قومیانے کے عمل کی افادیت صرف اتنی تھی کہ سکول کے اساتذہ اور دوسرے عملے کی ملازمتیں محفوظ ہو گئی تھیں۔ مگر اس عمل سے اور بہت سے مسائل اور تنازعات نے جنم لیا۔ جن لوگوں نے اپنی نجی رہائشی عمارتوں میں سکول کھولے ہوئے تھے انھوں نے راتوں رات سکول بند کر دیئے اور ریکارڈ سمیت غائب ہو گئے۔ محکمہ ان سکولوں کو کھلوانے پر مُصر تھا کئی اُستانیوں اور اساتذہ کو سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ

ان کو سرکاری سکولوں کے برابر گریڈ دیئے جائیں۔ کئی ان پڑھ پراپرٹی ڈیلر قسم کے ''اساتذہ'' نے خود کو صدر معلم یا پرنسپل لکھ کر بارہ تیرہ سو روپیہ تنخواہ مقرر کر لی تھی۔ وہ اسی مرتبے پر فائز رکھے جانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ بعض افراد کے نام حاضری رجسٹر میں راتوں رات درج کیے گئے اور کئی حذف کیے گئے۔ وہ عمارات جن کو کرائے پر حاصل کر کے ان میں مدارس کھولے گئے تھے' ان کے مالکان چلا اٹھے کہ ان کی جائدادیں ضبط ہو گئی ہیں۔ بعض بڑی بڑی انجمنوں نے حکومت سے تعاون کیا لیکن ایسی انجمنیں جو ایک ہی کنبے کے افراد پر مشتمل تھیں اور جنہوں نے تعلیم کے فروغ کو صنعت کے طور پر اپنا رکھا تھا وہ بلبلا اٹھیں اور لامتناہی مقدمات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ترقیات کا کام بھی بڑے زوروں پر تھا۔ پارٹی عہدیدار اور ممبران اسمبلی کے کارندے کئی کئی منصوبوں کے پشتارے اٹھائے پھرتے تھے۔ میں سخت الجھن میں تھا' ملک صاحب میرے مہربان تھے' میں ان کے انتخاب پر پورا اترنا چاہتا تھا۔ ابھی مقدمات اور ترقیات کی مسلیں ہی سیدھی کر رہا تھا کہ افواہ اڑی کہ گریڈ سولہ میں کام کرنے والے اساتذہ کی فوری ترقی ہو رہی ہے۔ میرا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ ملک صاحب نے سنا تو بس اتنا کہا ''مروا دِتا ای او قاضیا...... تمہارا متبادل میں کہاں سے تلاش کروں گا؟'' میں نے ان کی منت سماجت کی کہ میری ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ کھڑی نہ کریں۔ انھیں راضی کرنے کے بعد میں انہی کو ساتھ لے کر وزیر تعلیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اپنے سیکرٹری سے پوچھا! بھٹی صاحب قاضی کو لاہور میں کہاں تعینات کیا جا سکتا ہے؟''

''جہاں آپ فرمائیں'' بھٹی صاحب نے جواب دیا۔

''تو بلاؤ ریاض لیاقت کو......''

مسٹر ریاض لیاقت خان ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب تھے۔ وہ آئے تو انھوں نے وزیر تعلیم کو بتایا کہ ہر خالی اسامی ان کے حکم کے مطابق فلاں فلاں کی سفارش پر فلاں فلاں کو دی جا چکی ہے۔ شہر لاہور میں تو نہیں لیکن لاہور ڈویژن میں نزدیک ترین آسامی سیالکوٹ کے ڈپٹی ایجوکیشن افسر کی ہے۔ جو خالی ہونے والی ہے کیونکہ خریداری کی اعلیٰ سطح کی معائنہ کمیٹی کی رپورٹ پر آپ ہی نے اس کے تبادلے کا حکم صادر کر رکھا ہے۔''

''تو پوچھ لیں قاضی سے...... اگر یہ راضی ہو تو ٹھیک ہے...... بھئی یہ پڑھا لکھا مصنف

اہلکار ہے'' وزیر تعلیم کو یاد تھا کہ میں نے کچھ کتب تالیف کر رکھی ہیں کیونکہ میں نے اپنی کتب کا ایک سیٹ ان کو کافی عرصہ پہلے پیش کیا تھا۔ اندر خانہ میں خود ہی لاہور کے بعد اپنے آبائی ضلع سیالکوٹ جانے کا متمنی تھا اور یہی آسامی حاصل کرنے کے لیے مسٹر ریاض لیاقت سے بات چیت کر چکا تھا۔ وہ بس وزیر تعلیم کی طرف سے اشارہ چاہتے تھے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں افسروں کے تقرر و تبادلے وزراء کی سطح پر اور ماتحت عملے کے ایم پی اے حضرات کی سطح پر ہوتے تھے۔ بقول ماسٹر رحیم الدین چاچا ...... ''بھئی سوئی خریدنے کے لئے بھی اب ایم پی اے کی اجازت لینا پڑتی ہے۔''

القصہ میری ترقی اپنی تنخواہ اور گریڈ پر بطور ڈپٹی ایجوکیشن افسر سیالکوٹ طے ہوگئی۔ بھٹی صاحب سیکرٹری برائے وزیر تعلیم نے مجھے بتایا کہ میرا تقرر سیالکوٹ میں خاص مقاصد کے لئے کیا گیا ہے' وہاں آپ کی حیثیت ہمارے خاص آدمی کی ہوگی۔ ظاہر ہے یہ بڑی نوازش اور کرم گستری کی بات تھی۔ میں نے پی اے صاحب اور سیکرٹری صاحب کے علاوہ موقع ملتے ہی وزیر تعلیم کا شکریہ بھی ادا کیا تو وزیر تعلیم ملک غلام نبی نے کہا کہ میں وہاں کچھ وقت رہوں پھر وہ مجھے لاہور لے آئیں گے۔ یہ بھی فرمایا کہ سیالکوٹ فوراً پہنچ جاؤ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایم پی اے دس بارہ آدمیوں کے نام لے کر آ جائے اور ...... پھر وہ

ع ...... یوں ہنس پڑے کہ جان سی کلیوں میں پڑ گئی !

◆◆◆◆◆

(۳۴)

آبائی ضلعے میں تبدیلی

میں اپنے آبائی ضلع میں تبدیلی اور ترقی سے اس قدر خوش ہوا تھا کہ اُڑ کر سیالکوٹ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ضلع کی دو تحصیلوں' ڈسکہ اور سیالکوٹ کا تو میں پٹواری تھا۔ ہر موڑ دیکھا بھالا' ہر گلی متعارف' ہر رہگزر جانی پہچانی اور ہر پگڈنڈی سے آشنائی تھی۔ کلیاں بھی چٹکتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے مجھ سے ہمکلام ہیں۔ ساتھ ہی نارووال' پسرور اور تحصیل شکر گڑھ کے متعدد قصبات اور دیہات سے بھی خوب واقفیت تھی۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔ میں پھولے نہ سماتا تھا اور اپنی نئی حیثیت کے احساس و ادراک کے ساتھ عزیز و اقارب سے ملاقات کے تانے بانے بن رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں رہائش تو سمبڑیال میں اپنے بھائی کے ساتھ سانجھے مکان میں رکھوں گا اور روزانہ ریل سے سیالکوٹ آیا جایا کروں گا۔ ماضی کی یادیں کتنی دل نشین ہوتی ہیں اور تصور کے پردے پر بیتے دنوں کے کیسے کیسے موہوم اور مدھم نقوش نمایاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ میرا ماضی چودہ برسوں پر محیط تھا۔ یادوں کے قافلے آتے تھے اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتے تھے۔ میں تصور ہی تصور میں نواز گھمن' مولوی منظور حسین' ماسٹر فتح دین' ضلعی بینڈ ماسٹر سید کرم حسین شاہ' پیر فضل حسین' ملک یعقوب اور کئی دیگر مہربانوں اور نامہربانوں سے اپنی متوقع ملاقات کے مناظر دیکھتا رہا۔ اور ان کی اس حسرت سے آپ ہی آپ لطف اندوز ہوتا رہا جو ان پر' مجھے نئے مسند پر متمکن دیکھ کر طاری ہونے والی تھی۔ یہ لوگ میری لاابالی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی ترقی نہیں کر سکوں گا اور اپنی ابتدائی تنخواہ ہی کی حد میں رہ کر ریٹائر ہو جاؤں گا۔

مجھے سب سے زیادہ حیدر علی اور ملک عبدالغنی یاد آئے۔ حیدر علی کا دفتر سیالکوٹ کے تاریخی قلعے کے اوپر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے دفتر کے قریب تھا۔ میں سوچتا رہا کہ وہ مجھ سے

مل کر کتنا خوش ہوگا اور پھر جب میں اسے بتاؤں گا کہ اب تو میں اس سے روزانہ ہی ملا کروں گا' اسی قلعے پر اپنے دفتر آیا کروں گا اور ضلع کے سررشتۂ تعلیم میں میرا نمبر درجہ دوم کا ہوگا تو وہ اپنی مسرت اور حیرت کا اظہار کس پیرائے میں کرے گا...... اور ادھر ملک غنی تو دانتوں تلے انگلی دبالے گا کہ اس کے بچپن کا مولوی دوست افسر بھی بن سکتا ہے۔ میں نے طے کیا کہ قلعے کی سیڑھیاں چڑھ کر سب سے پہلے حیدر علی کے پاس جاؤں گا اس سے ملاقات ہوئے مدت بیت چکی تھی۔ القصہ میں سیالکوٹ پہنچا اور دفتر میں اپنی حاضری کے دن یکسر بھول گیا کہ مجھے تو سب سے پہلے اپنے پرستار حیدر علی سے ملنا ہے۔ میں فوراً ضلعی دفترِ تعلیم پہنچا۔ ضلعی افسر تعلیم موجود نہیں تھے۔ میں نے ان کے نائب قاصد کو بتایا کہ میں کون ہوں۔ وہ بڑا مؤدب ہو گیا اور ''سر سر'' کرنے لگا۔ اس کے ذریعے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو طلب کیا۔ وہ باادب حاضر ہوا۔ کہنے لگا کہ اسے میرے بطور ڈپٹی ایجوکیشن افسر تعیناتی کے احکام موصول ہو چکے ہیں۔ پہلے ڈپٹی ایجوکیشن افسر چارج چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے دو نائب قاصدوں کو میرا کمرہ کھولنے اور صاف کرنے کا حکم دیا۔

سپرنٹنڈنٹ کا نام بابو رشید احمد تھا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ میرا سابقہ اس سے اُس وقت پڑا تھا جب میں اپنے گاؤں میں بطور ہیڈ ماسٹر سکول تعینات ہو کر آیا تھا۔ جلد ہی لاہور تبادلہ کرا لینے کے بعد مجھے اپنی تیرہ دن کی سروس کی تصدیق اپنی سروس بک پر کرانا تھی۔ ان تیرہ ایام میں تقریباً دس دن تو آنے جانے کے ایام تھے جن کو دفتری اصطلاح میں 'جائننگ ٹائم' کہا جاتا ہے۔ بابو رشید احمد کا کہنا تھا کہ میں اپنی سروس بک اس کے پاس چھوڑ جاؤں وہ اسے مکمل کر کے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈنز کے پاس' لاہور بھیج دے گا۔ میں مُصر تھا کہ جب میں اپنی سروس بک لاہور کے ضلعی دفترِ تعلیم سے دستی لا سکتا ہوں تو سیالکوٹ سے کیوں دستی نہیں لے جا سکتا۔ اس تکرار سے بابو رشید احمد کو مجھے جاننے اور مجھے اسے پہچاننے کا موقع ملا۔ وہ...... ایکا ایکی کہنے لگا 'یوں لگتا ہے جیسے پہلے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

ع...... میں نے احساس دلایا تو اسے یاد آیا!

وہ دفعتہً اچھا اچھا کہہ کر اٹھا اور بولا ''سروس بک تو آپ لے ہی گئے تھے'' میں نے سر ہلایا اور کہا ہاں! اس وقت کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے حکم دیا تھا کہ سروس بک دے دی جائے۔ اس وقت بابو رشید اسٹیبلشمنٹ کا اسسٹنٹ تھا۔ اب وہ سپرنٹنڈنٹ ہو چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی

آیا مجھے میری نشست پر بٹھایا۔ مبارکباد دی اور ساتھ ہی پرتکلف چائے پلائی۔ دفتر کے اہلکاروں سے میرا تعارف کرایا۔ ضلعی افسر تعلیم کی شرافت اور نرم دلی کی تعریف کی۔ کچھ منفی جھلکیاں بھی دکھائیں کہ سابق نائب افسر تعلیم، جو تنظیم نو سے پہلے ضلع کے ضلعی انسپکٹر تھے، نے کس طرح شریف طبع، ضلعی افسر تعلیم کو سالانہ ترقیاتی گرانٹوں کے چکر میں بلیک میل کیا اور ان کے قلم سے خود فائدہ اٹھایا۔ اسی چکر میں ضلعی افسر تعلیم لاہور گئے ہوئے ہیں کیونکہ اسمبلی کے اجلاس کے باعث ان کے ہم مسلک سفارشی چودھری محمد اعظم آج کل لاہور ہی میں ہیں چودھری محمد اعظم سمبڑیال سے ایم پی اے تھے۔

☆☆

وہ اور بہت کچھ بتا رہا تھا لیکن میرا خیال ناگہاں حیدر علی کی طرف پلٹ گیا ؎

عنوانِ گفتگو تو مری جاں کچھ اور تھا
دورانِ گفتگو میں تری یاد آ گئی

میں کھوکھلی تمناؤں اور خواہشات کے ریلے میں حیدر علی کے ساتھ حاضری دینے کا خیال ہی بھلا بیٹھا تھا۔ میں نے بابو رشید سے کہا کہ پولیس کے دفتر میں حیدر علی انسپکٹر پولیس سے ملنے جا رہا ہوں وہ میرا دوست ہے۔ بابو رشید بولا اگر وہ آپ کا دوست ہے تو پھر لگتا ہے کہ اس سے ملاقات کئے آپ کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ تو تقریباً دو سال ہوئے اپنی زمینیں اور جائداد بیچ کر مستقل طور پر انگلستان جا چکا ہے۔ میں اس اطلاع پر حیران ہو گیا۔ بابو رشید نے بتایا کہ حالات حیدر علی کے خلاف ہو گئے تھے حالانکہ وہ پولیس کا آدمی ہونے کے باوجود درویش خصلت انسان تھا۔

ہوا یوں کہ اس کی سوتیلی والدہ کا ایک رشتہ دار پی پی حکومت میں ایم این اے بن گیا تھا، اس کی جائداد کے کسی معاملے میں حیدر علی کے والد سے چپقلش چل رہی تھی۔ اقتدار میں آ کر اس نے حیدر علی پر قتل بذریعہ تشدد کا کیس بنوا دیا۔ تفتیشی ڈی آئی جی نے حیدر علی کو سمجھایا کہ وہ سیاسی دھاندلی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اوپر سے کئی اشارے اس کے خلاف مل رہے ہیں، اسے منظر سے ہٹانا مقصود ہے۔ اگر وہ خود ہی منظر سے ہٹ جائے تو وہ بہت سے چکروں سے بچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے مجبوری کے عالم میں پولیس کی نوکری چھوڑ دی اور اپنے پورے کنبے سمیت اپنے بھائی کے پاس انگلستان چلا گیا۔

مجھے یاد ہے حیدر علی سے جب آخری ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی انگلستان میں ڈاکٹر ہے۔ وہاں ایک فرنگن سے اس کا 'ٹانکا جڑ' گیا ہے۔ وہ بھی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اور اب وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ میں نے اسے زیادہ کریدا نہیں تھا...... اب تو میں حیدر علی سے کسی خط کے ذریعے ہی ہمدردی کا اظہار کر سکتا تھا۔ اس لئے مجھے اس کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ استادِ محترم مولوی محمد علی بھی پانچ سال ہوئے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے بہر کیف اس کے محلے میں کوئی نہ کوئی ایسا فرد ضرور مل سکتا تھا جس کے پاس اس کا پتہ موجود ہو۔ یہ کام میں نے آئندہ پر اُٹھا دیا۔

میں نے ایک سرد آہ بھری اور بابو رشید سے محکمانہ معلومات' مقامی سیاست' دفتری سیاست' اور اپنے واقف کاروں اور دوستوں کی خیر خیریت دریافت کی۔ اسی دوران نظر کھڑکی کے پار گئی۔ کئی اساتذہ کرام منتظر کھڑے تھے۔ انہی میں اچانک ضلعی ہیڈ ماسٹر سید کرم حسین شاہ دکھائی دیئے۔ وہ لپک کر آئے اور مجھ سے بغل گیر ہو گئے' کہنے لگے فیض الرحمان سے ملنے آیا تھا لیکن جب مجھے خزانچی تایا رحمت نے بتایا کہ شبیر خان کی جگہ آپ تعینات ہو کر آ گئے ہیں تو فیض الرحمان سے نہ ملنے کی ساری کلفت دور ہو گئی۔

پھر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ بہت سی باتیں ہوئیں پورے ضلعے کے ہیڈ ماسٹر اور ضلعی افسران کی سرپرستی کرتے تھے۔ وہ اپنی عمر اور صحت کے بارے میں متفکر نظر آئے لیکن خدا کا شکر بھی ادا کر رہے تھے کہ انھوں نے تمام ذمہ داریاں پوری کر لی ہیں اور اب گورستان کی سرد و سنسان فضا کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں پہلے ہی کئی مہربان ابدی نیند سو رہے ہیں۔ انھوں نے کئی لوگوں کے سفرِ آخرت کا ماجرا سنایا اور چیدہ چیدہ مرحومین کے نام گنوا دیے اور میں ''رہے نام اللہ کا'' کا پکار کر رہ گیا۔

رات دن زیر زمیں لوگ چلے جاتے ہیں
نہیں معلوم تہِ خاک تماشہ کیا ہے

انھوں نے ضلعی ایجوکیشن افسر تعلیم چودھری فیض الرحمان کی شرافت کی تعریف کی اور کہا کہ کاش ایسا اچھا شخص کالے کے نواز گھسن کے بھائی عبید اللہ کے مسلک کا نہ ہوتا۔ اس کے مسلک نے اس کی ساری خوبیوں پر سیاہی انڈیل دی ہے۔

شاہ صاحب کے اٹھ جانے کے بعد میں نے بابو رشید کو پھر سے بلایا۔ اور بتایا کہ مجھے

ٹیڈی ٹرین سے لاہور جانا ہے۔کل کے لئے میری رخصت ٹائپ کروا دے۔ نیز اگر اس کے مریدین (اساتذہ) میں سے کسی کے پاس موٹر سائیکل ہو تو وہ مجھے ذرا رنگ پورہ پولیس چوکی تک پہنچا دے تا کہ میں اپنے دوست عبدالغنی کو سلام محبت پیش کر سکوں۔ اس نے ایک نوجوان سے کہا وہ مجھے عبدالغنی کے گھر چھوڑ آئے۔ عبدالغنی کے گھر تالا پڑا تھا۔ ہمسائیوں نے بتایا کہ یہ مکان تو عبدالغنی کے بڑے بھائی ملک محمد شفیع نے خرید لیا ہے۔ اور ملک غنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ میں موٹر سائیکل کے مالک ملک ظفر ہیڈ ماسٹر مڈل سکول جتی شیخاں کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پہنچا جہاں ٹیڈی ٹرین بغیر انجن کھڑی تھی۔ میں نے ملک ظفر کو شکریے کے ساتھ رخصت کیا اور خود چائے خانے کی طرف چل دیا۔ چائے پی' اخبارات دیکھے اور اب پلیٹ فارم پر ٹہلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ظفر ملک اور بابو رشید چائے خانے میں آ گئے' بابو رشید نے میری رخصت کی ٹائپ شدہ درخواست اور میری حاضری رپورٹ کے فارموں پر میرے دستخط کروائے کہ کل وہ ڈی ای او صاحب کے آنے پر ان فارموں کو ڈائریکٹر صاحب اور دیگر متعلقین کو بھجوا دے گا۔ ملک ظفر نے نہ صرف چائے کی پیالی کا بل چکایا بلکہ مجھے لاہور تک درجہ دوم کا ٹکٹ تھماتے ہوئے کہا کہ ابھی گاڑی جانے میں پون گھنٹہ باقی ہے۔ یہ وقت میں درجہ دوم کے مسافروں کی انتظار گاہ میں گزار لوں تو اچھا ہو گا۔ میں نے ظفر ملک اور رشید کی طرف دیکھا اور کہا کہ آپ کو ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں تھی انھوں نے روایتی جملوں سے میرا منہ بند کر دیا۔ یہ آغاز تھا۔ پھر بعد میں تو ظفر ملک کے میرے ساتھ خصوصی تعلقات رہے۔

☆☆

میں اگلے دن ملازمت کے سلسلہ عالیہ کے پیر و مرشد حضرت ملک غلام حیدر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران کے کورس میں شمولیت کی خاطر مرکز توسیع تعلیم جا رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ لے لیا کہ وہ مجھے میرے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر چودھری فیض الرحمان کے سپرد کر دیں گے اور ان کو بتائیں گے کہ قاضی کون ہے اور کیا ہے؟ میں ملک صاحب کے ساتھ کورس کے مقاصد سے مستفید ہوا۔ چودھری فیض الرحمان کورس میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کی جگہ میں نے اپنی حاضری لگوا دی۔ ملک صاحب کے کہنے پر میں پورا ہفتہ ضلع سیالکوٹ کی نمائندگی کرتا رہا۔ چودھری صاحب یعنی میرے ڈی ای او کورس کی اختتامی تقریب پر تشریف لائے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے تفصیل سے بتایا کہ میں

ان کی اجازت کے بغیر کورس میں کیوں اور کیسے شامل ہوا۔

چودھری صاحب نے فرمایا "آپ نے بہت اچھا کیا" واپس سیالکوٹ پہنچ کر آپ اپنی رخصت واپس لے لیجئے گا۔ میں آپ کو کورس میں شمولیت کے لئے آئی ہوئی چٹھی پر سیالکوٹ حاضر ہونے کی تاریخ ہی سے اپنی جگہ نامزد کر دوں گا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کتنا حسین اتفاق ہے کہ میں ہفتہ بھر کورس کے عنوان سے اپنے بال بچوں میں رہا اب مجھے ٹی اے ڈی اے بھی ملے گا۔ "یہ تو آم کے آم، گٹھلیوں کے دام" والی بات ہوئی۔ ملک صاحب نے جب میری سفارش چودھری صاحب سے کی تو انھوں نے کہا "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ قاضی صاحب آپ ہی کے نہیں بڑے ملک صاحب (وزیر تعلیم) کے آدمی بھی ہیں۔ انھیں وزیر تعلیم کے سیکرٹری صاحب اوران کے پی اے صاحب نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ قاضی صاحب پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔"

دفتر میں ان کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تو پتہ چلا کہ مفتی سعید احمد کی شرافت میں فطری بھولپن شامل تھا جبکہ چودھری فیض الرحمان کا بھولپن اختیاری تھا۔ وہ ہرگز انجان نہیں تھے۔ اپنے مسلک کی وجہ سے مصلحتاً کسی سے الجھتے نہیں تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان کو گھاگ اور خرانٹ قرار دیتے تھے لیکن میں نے انھیں ہمیشہ شریف اور بردبار ہی پایا۔

دفتری کام کی تقسیم کے علاوہ انھوں نے مڈل سکولوں کے سرسری اور سالانہ معائنوں کا کام بھی مجھے تفویض کر دیا۔ ضابطے کے مطابق دوروں پر جانا ضروری تھا۔ انھوں نے ایک حکم نامے کے ذریعے طے کر دیا کہ ایک دن وہ دورے پر رہا کریں اور ایک دن میں! ضرورت پڑنے پر دونوں دورے پر جا سکتے ہیں۔ صدر دفتر سے رابطہ کسی وقت نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ میں مکمل سپردگی کے انداز میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تنظیم نو کے سرکلر کے تحت ڈپٹی ایجوکیشن افسر کے فرائض کے ضمن میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کی اعانت کرے گا۔ اس وقت ضلع سیالکوٹ پنجاب کا وسیع ترین ضلع تھا۔ اس کی پانچ تحصلیں تھیں۔ اگر وہاں پانچ ڈپٹی بھی ہوتے تب بھی کام احسن طریقے سے پورا ہونا مشکل تھا۔

☆☆

سیالکوٹ آئے ابھی مہینہ بھر ہوا ہو گا کہ ایک دن چودھری صاحب اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے کمرے میں آ بیٹھے۔ دریافت فرمایا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ کیا آپ

مطمئن ہیں؟ میرے جوابات سے مطمئن ہونے کے بعد انھوں نے پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں نے بتایا کہ روزمرہ کی وہ ڈاک نکال رہا ہوں جو آپ نے میرے سپرد کر رکھی ہے۔ فرمایا کیوں نہ ہم کسی مقامی سکول کا معائنہ کر آئیں؟ میں جھٹ تیار ہو گیا۔

ہم دونوں سکاچ مشن ہائی سکول، گندم منڈی جا پہنچے۔ مشن کا یہ سکول اب قومی تحویل میں لیا جا چکا تھا لہٰذا یہ اب گورنمنٹ سکاچ مشن ہائی سکول کہلاتا تھا۔ یہ وہی سکول تھا جہاں سے علامہ اقبالؒ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ سکول کا نام بدلنے کی تجویز بھی چل رہی تھی۔ سکول میرا دیکھا بھالا تھا لیکن جس حیثیت سے میں اب اس سکول میں داخل ہوا تھا اس کی وجہ سے میں جذباتی بھی ہو رہا تھا۔ نویں دسویں کے دور کے ازبر کیے ہوئے اقبالؒ کے اشعار ذہن کے پردے پر ابھر رہے تھے۔ میرے لئے تو اس اسکول کا ایک ایک ذرہ دیوتا تھا۔ میں نے اکثر اساتذہ سے علامہ اقبالؒ کے حوالے سے باتیں کیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ طلبہ نے ترنم سے حکیم الامت کا کلام سنایا۔

اس اسکول کے معلمین کو اپنی منزلت اور اسکول کی تاریخی عظمت کا پورا احساس تھا۔ وہ تزئین و آرائش اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس امر کو ملحوظ رکھتے تھے کہ مصور پاکستان کی نسبت سے یہ سکول کس قدر زبردست اہمیت کا حامل ہے، عمارت خستہ ہو رہی تھی۔ محکمہ ترقیاتی رقوم میں سے کچھ نہ کچھ صرف کر رہا تھا۔ متعلقہ سکاچ مشن کی طرف سے سکول کی سرکاری تحویل سے واپسی کی تحریک بھی چل رہی تھی۔

علامہ اقبالؒ کے کلام کے حوالے سے مجھے استاد محترم قاضی عطاللہ بہت یاد آئے، انہی نے مجھے کلام اقبال سے عشق کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ میں نے سمبڑیال میں ان سے ملاقات کی اور ان کی دعاؤں کا طالب ہوا۔ انھوں نے ایک یا دو مرتبہ اپنے دستخطوں سے چٹیں بھیجیں اور میں نے ان کی طرف سے آنے والے سائلین کے مطلوبہ کام کرا دیئے۔

ضلع کی بیشتر سڑکیں اب پختہ بن چکی تھیں۔ بسیں، ٹانگے، ویگنیں، سکوٹر اور موٹر سائیکل رواں دواں تھے۔ دور دور کے دیہاتوں تک سولنگ والے راستے موجود تھے۔ آبادی میں اضافے کی وجہ سے ۱۹۶۰ء تک جو ماحول میں نے دیکھا تھا وہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ اب ۱۹۷۶ء میں سیالکوٹ کی کایا ہی پلٹ چکی تھی جسے دیکھ کر میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ ہمارے لئے دور دور تک دورہ کر کے مرکز کی طرف لوٹ آنا بہت آسان ہو چکا تھا۔ ذرائع

مواصلات میں ترقی کی وجہ سے سکولوں میں مدرسین اور طلبہ کی حاضری بہتر رہتی تھی۔ کچی پکی سڑکوں، ریلوے لائن کے ساتھ بنی ہوئی پٹڑیوں، نہروں کی پٹڑیوں اور مشینی ذرائع آمدورفت سے فاصلے سمٹ کر رہ گئے تھے۔ فرائض کی انجام دہی میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن پھر بھی کچھ ایسے غیر معمولی واقعات اور حالات پیش آئے جن سے مجھے اپنے اناڑی ہونے کا احساس ہوا اور میری تربیت بھی ہوئی۔

☆☆

استاد محترم حضرت محمد اسماعیل زمانی ریٹائرڈ ایس وی مدرس لویری والہ، تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے مجھے ملنے آئے۔ انھوں نے بڑے آزردہ لہجے میں کہا کہ کیا وقت تھا کہ وہ علاقے بھر کے لوگوں کے ہر قسم کے کام خود ہر سرکاری دفتر سے کرایا کرتے تھے۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد یہ حال ہے کہ وہ اپنے پی۔ ٹی۔ سی پاس بیٹے کو دو سال سے کوئی ملازمت نہیں دلا سکے۔ وہ تو پریشان ہیں ہی، ان کا بیٹا زیادہ رنجیدہ رہتا ہے کہ وہ بوڑھے والدین کا سہارا بننے کے بجائے ان پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ ادھر حال یہ ہے کہ بورڈ کے ریٹائرڈ ملازمین کی پنشن کا معاملہ حکومت کے سرد خانے میں پڑا ہوا ہے۔ حکومت بورڈ مدرسین کی پنشن دینے کا اصولی فیصلہ کر چکی ہے لیکن اس فیصلے پر عملدر آمد شاید ان کی زندگی میں نہیں ہوگا۔

زمانی صاحب ضلع سیالکوٹ کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ دوران تعلیم وہ میری سرپرستی فرماتے رہے تھے۔ میں نے ان کو تسلی دی۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا میں ان کے صاحبزادے خالد بیگ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟ انھوں نے مزید کہا کہ وہ زمانے کے دستور کے مطابق اپنے بیٹے کو نوکر کرانے کیلئے کچھ رقم خرچ کرنے کو بھی تیار ہیں۔

سرکاری پالیسی کے تحت کوئی نئی آسامی تخلیق نہیں ہو رہی تھی۔ جو شخص کسی وجہ سے رخصت پر جاتا تھا وہ کسی نہ کسی عزیز رشتہ دار، واقف کار یا سودا کار کا عارضی تقرر اپنی جگہ کروا جاتا۔ بس یہی ایک طریقہ ملازمت حاصل کرنے کا رہ گیا تھا کہ امیدوار تین ماہ سے زائد رخصت کی درخواست لے آتا اور اس کی چھٹی کی منظوری کے احکام کے ساتھ ہی اپنا عارضی تقرر بھی کروا لیتا۔ میں نے متعلقہ کلرک سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا کہ ایک مدرس دو سال کی رخصت پر باہر جا رہا ہے لیکن وہ درخواست رخصت دینے کے لئے ۲۵۰۰ روپے طلب کرتا ہے۔ میرے لئے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ میں اپنے استاد محترم سے روپوں کی بات

کرتا لیکن رخصت کا عرصہ معقول تھا۔ میں نے یہ بات متعلقہ کلرک ہی کے ذریعے استاد محترم کے گوش گزار کرائی۔ انھوں نے جھٹ اڑھائی ہزار روپیہ اپنے شلوکے سے نکالا اور کلرک کو تھما دیا۔ کلرک نے ان سے ان کے برخوردار خالد کی درخواست برائے تقرر لے لی اور زمانی صاحب کو تیسرے روز آنے کو کہا۔ ادھر کلرک نے مجھے موصوف کی درخواست کے دو خاصے وزنی نقائص بتائے۔

۱۔ ڈومی سائل ضلع سیالکوٹ کے بجائے گوجرانوالہ کا تھا

۲۔ برخوردار تھرڈ ڈویژن تھا جو سب سے بڑا اعتراض تھا حالانکہ وہ پی ٹی سی بھی تھا۔ اور اسی وجہ سے اسے ابھی تک عارضی ملازمت بھی نہیں ملی تھی۔ میں نے کلرک سے کہا کہ دو باتیں اس کے حق میں بھی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہے دوسرا پسر مدرس ہے۔

اسی روز جب میں اپنے گھر جانے کے لئے اسٹیشن پہنچا تو متعلقہ کلرک بھی وہاں آ گیا۔ اس نے مجھے زمانی صاحب کے بیٹے کے احکام تقرر برائے دو سال تھماتے ہوئے کہا کہ اس نے میری خاطر بہت بڑا گھپلا کیا ہے۔ یعنی یہ کہ دو تین امیدواروں کے احکام جاری کرانا تھے۔ ان کے ساتھ ہی اس نے چودھری صاحب سے تقرر کے احکام والے سادہ فارموں پر بھی دستخط کروا لیے تھے تا کہ ان کو بعد میں پُر کر لیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے پچیس سو روپے کے نصف ساڑھے بارہ سو روپے بھی تھمائے اور کہا کہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جس مدرس کی درخواست پر اس نے تقرر کے احکام جاری کرائے ہیں وہ تو کئی روز ہوئے کویت بھی جا پہنچا ہے۔

میں حیران تو ہوا لیکن کلرک بہادر نے جو کام کر دکھایا تھا اس کی داد نہ دینا اپنا مستقبل تاریک کرنے کے مترادف تھا۔ طمع و حرص نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا' زمانی صاحب کا مقدس چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے ساڑھے بارہ سو روپے ان کی امانت سمجھ کر سنبھال لیے۔ جس دن وہ احکام لینے آئے تو میں نے ساڑھے بارہ سو (۱۲۵۰) روپے بھی ان کو پیش کر دیئے اور عرض کیا کہ احکام ضلع سیالکوٹ کے سرحدی سکول میں حاضری کے ہیں۔ برخوردار کو کچھ وقت ادھر گزارنے دیں پھر اس کا بین الاضلاعی تبادلہ کرا لیں گے حالانکہ میں جانتا تھا کہ رخصت کی اسامی پر عارضی تعینات کسی اہلکار کو مستقل اسامی پر تبدیل نہیں کیا جا

سکتا تھا مگر زمانی صاحب کو حوصلہ بھی تو دینا تھا۔

ڈائریکٹر لاہور ڈویژن میں تعینات زمانی صاحب کے ایک دوسرے شاگرد نے ان کا یہ مرحلہ بھی طے کر دیا۔ بین الاضلاعی تبادلے کے کاغذات تکمیل میں میرے دستخط برائے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر استعمال ہوئے اور برخوردار خالد کا بین الاضلاعی تبادلہ اس کے اپنے ہی گاؤں میں ہو گیا۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں زمانی صاحب کے کام آیا۔ دیگر ریٹائرڈ مدرسین بالخصوص اپنی جان پہچان والے ان حضرات کے کام آ کر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی جو ماضی میں کبھی میرے کام آتے رہے تھے۔

☆☆

محکمے کی فروگزاشت کے باعث میں اپنے عہدے کے حوالے سے ضلعی ریکروٹمنٹ کمیٹی کا ممبر نہیں تھا۔ ڈپٹی ایجوکیشن افسر زنانہ کے علاوہ سب سے زیادہ سینئر اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر دو ہی ارکان تھے جبکہ چیئرمین ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر تھے۔ تاہم مجھے بھی ریکروٹمنٹ کمیٹی کے اجلاس میں شامل کیا جاتا۔ چودھری صاحب نے کہا کہ یہ محکمانہ غلطی ہے۔ بھلا یہ کیا تک ہے کہ ڈپٹی ایجوکیشن افسر تو کمیٹی کا رکن نہ ہو اور ایک اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر رکن ہو۔ ریکروٹمنٹ کمیٹی کا اجلاس ڈپٹی ایجوکیشن افسر (زنانہ) کے دفتر میں ہوتا تھا جو محلّہ کمہاراں میں تھا۔

دفتر کے اسٹینوگرافر عابد حسین کا کہنا تھا کہ خواتین کے ہاں 'کھابہ' اچھا ہوتا ہے اسی لئے وہاں اجلاس کیا جاتا ہے۔ واقعی اس نے سچ کہا تھا' چائے کی پیالی کے نام پر وہاں دعوت کا سماں تھا۔ مگر چودھری صاحب زنانہ دفتر میں میٹنگ کرنے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ وہ خاتون ڈپٹی کو قلعے کی سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت سے بچانا چاہتے۔ خاتون ڈپٹی ایجوکیشن افسر بڑی مدبر اور دفتری کام کاج کی ماہر تھیں۔ میں نے کچھ معلمات کے تبادلے وزیر تعلیم کے عملے کے ذریعے کرائے تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئیں لیکن میں نے ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا بلکہ ان ہی سے کہا کروں گا۔ انھیں میری معذرت پسند آئی پھر جب کبھی میں نے ان سے کوئی سفارش کی تو انھوں نے انکار نہیں کیا۔ چند ہی مہینوں بعد تمام اضلاع میں ڈپٹی ایجوکیشن افسروں کو بھی ضلعی ریکروٹمنٹ کمیٹی کا ممبر اور سیکرٹری بنانے کا سرکاری مراسلہ جاری ہو گیا۔

☆☆

وزیر تعلیم کے سیکرٹری صاحب نے ایک روز مجھ سے پوچھا' کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں

نے تمھیں سیالکوٹ شہر میں کیوں تعینات کرایا تھا؟ میں جواب میں خاموش رہا، پھر کہا ''حکم فرمائیں، بندہ بجالائے گا۔''

''کام بڑا مشکل ہے۔ روپے پیسے سے نہیں ہوگا۔ محبت اور تعلق کی بنیاد ہی پر کوئی یہ کام کرے گا۔''

''آپ فرمائیں تو سہی میں پوری کوشش کروں گا۔''

انھوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں کبوتر پالنے کا شوق رکھتا ہوں، کبوتر بازی کا نہیں۔ سیالکوٹ میں کچھ لوگ ہیں جن کے پاس نایاب کبوتروں کی نسلیں ہیں۔ انھوں نے کسی نسل کا نام بتایا اور فرمائش کی کہ انھیں اس نسل کے کبوتروں کا ایک جوڑا درکار ہے۔ میں نے مطلوبہ جوڑا مہیا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ واپسی پر میں نے اپنے نائب قاصد سے پوچھا کہ شہر میں نامور کبوتر باز کون کون ہیں۔ اس نے کہا کہ سیالکوٹ کے نامور کبوتر بازوں میں اس کا ایک رشتے دار بھی ہے جو بیگ پائپ یعنی بغل میں دبا کر بجانے والی بینیں بناتا ہے۔ میری درخواست پر اس نے اپنے رشتے دار سے میری ملاقات کرائی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ میری نوکری کا معاملہ ہے، مجھے فلاں نسل کے کبوتر کا ایک جوڑا چاہیے۔ میں منہ مانگی قیمت دینے کو بھی تیار ہوں۔ اس نے مجھے نہایت خوش ذائقہ پیڑوں والی لسی پلائی اور معذرت کی کہ اس کے پاس اس نسل کے بچے موجود نہیں جس نسل کے بچے مجھے مطلوب ہیں۔ تاہم اس نے میرے نائب قاصد سے کہا کہ وہ 'صاحب' کو نادر خان کی حویلی لے جائے، وہاں فلاں آدمی سے ملے اور اس کی طرف سے مطلوبہ نسل کا جوڑا طلب کرے۔ امید ہے کہ مل جائے گا۔

اگلے دن نائب قاصد مطلوبہ جوڑا لے آیا۔ میں اسی روز جوڑا لے کر لاہور پہنچا اور سیدھا سیکرٹری صاحب کے گھر گیا۔ انھوں نے ان کبوتروں کا معائنہ نہایت خشوع خضوع سے کیا۔ کبھی آنکھوں سے کبھی پاؤں سے کبھی ان کے پروں کو پھیلا کر اور کبھی چونچ کھول کھول کر دیکھا اور پھر انھیں کھلا چھوڑ کر میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور جتنے توصیفی الفاظ ان کو یاد تھے وہ مجھ پر صرف کر دیئے کہ میں نے جوڑا مہیا کر کے ان پر احسان عظیم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ واقعی یہی جوڑا انھیں مطلوب تھا۔ مزید فرمایا کہ ان کا وصف یہ ہے کہ یہ چند دن ادھر رہ لیں تو پھر ان کو خواہ اسلام آباد چھوڑ دیا جائے یہ واپس گھر آجائیں گے۔ یہ قاصد کبوتر ہیں۔ اس کے بعد سیکرٹری صاحب سے میری واقفیت اور تعلق کچھ زیادہ ہی حساس ہوتا چلا گیا۔

☆☆

میں جب بھی شکر گڑھ جاتا تو وہاں اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کا کلرک میرا منتظر ہوتا۔ وہ کم گو لیکن تابعدار شخص تھا۔ دفتر کے ساتھ ایک مکان موجود تھا۔ میں اسی میں قیام کرتا۔ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میرا کیا پروگرام ہے؟ پھر وہ راتوں رات ہی کسی موٹر سائیکل والے مدرس کو یہ ذمہ داری سونپ دیتا کہ اس کو اگلے روز مجھے فلاں فلاں سکول لے جانا ہے۔ شکر گڑھ شہر اور مضافات نے لاتعداد بی ٹی سی مدرسین پیدا کیے تھے کہ ان کو تحصیل شکر گڑھ میں کھپانا مشکل ہو گیا تھا۔ بے شمار شکر گڑھی مدرسین ضلع کی دوسری تحصیلوں میں کام کر رہے تھے۔ وہاں جس سے بھی ملاقات ہوتی وہ یہی استدعا کرتا کہ فلاں تحصیل میں ان کا بھائی' بیٹا' بھتیجا یا بھانجا وغیرہ اتنے عرصے سے تعینات ہے اس کے تبادلے کی کوئی صورت بن جائے تو وہ ہر خدمت کے لئے تیار ہیں۔

خدمت کا رواج یا راج پورے ضلعے میں تھا لیکن تبادلہ تو اسامی کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ بالخصوص سیالکوٹ تحصیل میں شکر گڑھ کے مدرسین کے زیادہ تعداد میں تعینات ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس تحصیل سے بہت سے اساتذہ بیرون ملک جاتے رہتے تھے اور ان کی آسامیاں عارضی طور پر زیادہ تر شکر گڑھ کے مدرسین ہی حاصل کرتے تھے۔ دفتر میں دو تین شکر گڑھی بابو بھی تھے جو ان کے کام آتے تھے۔ میں جب بھی شکر گڑھ دورے پر گیا' کالا میں اپنے پرانے ساتھیوں' بابو بشیر احمد اور ماسٹر صدیق کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کو کہیں نہ پا سکا۔ سوچتا تھا کہ ان کو بھی تو میرے ڈپٹی بن جانے کا علم ہو گا' وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آئے۔ کسی نے ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ اللہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔

☆☆

مڈل سکول پنڈی عمرا کے ہیڈ ماسٹر چودھری محمد یوسف گوجر پنجاب ٹیچرز یونین کے صدر تھے اور ایوبی مارشل لاء کے نفاذ کے وقت وہ میرے ساتھ پنجاب ٹیچرز یونین کا خبر نامہ نکالنے میں معاون ہوا کرتے تھے۔ سب سے پہلے تجدید محبت کے لئے میں نے انہی کے سکول کا دورہ کیا۔ ان کے ہاں رات بھر قیام بھی کیا۔ اگلے دن ان کی معیت ہی میں جموں کشمیر کے سرحدی سکولوں کا چکر لگایا۔ حاضری کی پڑتال کی۔ دراصل میں موقع غنیمت جان کر شکر گڑھ کے دور دراز علاقے دیکھ لینا چاہتا تھا۔

میری جبال تک جانے کی خواہش ادھوری رہی کیونکہ چبال مڈل سکول سے ہائی ہو چکا تھا۔البتہ میں نے منیگٹری کا وہ ہائی سکول ضرور دیکھا جو شکر گڑھ کے راستے میں پڑتا تھا اور جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے یہ ایک نجی سکول تھا جسے حیات ملز والے چلاتے تھے۔ پوری انجمن انہی کی تھی ۔ پرائمری' مڈل اور میٹرک کے امتحانات میں پچھتر فیصد وظائف یہی سکول لے جاتا تھا۔قومیائے جانے کے بعد بھی اس سکول کے ہیڈ ماسٹر نے پرانی روایات قائم رکھی ہوئی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر نے زبردستی مجھے دوپہر کا کھانا کھلایا لیکن خود میرے ساتھ نہیں کھایا۔ مجھے یہ ناگوار گزرا' تو انھوں نے میرے چہرے کے تاثرات محسوس کرتے ہوئے کہا دراصل میرا کھانا سکول کے ہوسٹل سے آتا ہے۔ میں نمک نہیں کھاتا اور ویسے بھی سنتِ رسولؐ پر عمل کرتا ہوں اور دن میں دو وقت ہی کھاتا ہوں۔

سکول کا محل وقوع خالصتاً دیہی نوعیت کا تھا۔طلبہ بھی اردگرد کے دیہات ہی سے آتے تھے اور پانچویں' آٹھویں اور دسویں کے طلبا التزام کے ساتھ ہوسٹل میں رکھے جاتے تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ طلبہ کی تربیت جسمانی کے لئے سکول کے پی ٹی آئی صاحب سکول کے قریب ہی ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مشہور تھا کہ قومیائے جانے کے باوجود ہیڈ ماسٹر صاحب کسی نالائق اور کاہل استاد کو سکول میں نہیں ٹکنے دیتے۔ محنتی اور سادہ منش ہیڈ ماسٹر کے ساتھ وہی اساتذہ چل سکتے تھے جو محنتی ہونے کے علاوہ اپنے پیشے سے دلی لگاؤ رکھتے تھے۔

ڈی بی ہائی سکول سکھو چک کے ایک ہیڈ ماسٹر منیگٹری کے ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کی ضد تھے۔ان کی بھی علاقے بھر میں بڑی شہرت تھی اگرچہ وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔کمر جھک گئی تھی۔چھڑی تھام کر چلتے تھے۔افسوس ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ان کی ثناخوانی کرنے والے بتاتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے خلاف تحقیقات میں عبدالغنی گھمن جیسے سیاستدان اور بورڈوں کے چیئرمینوں کے چیئرمین کو بھی جل دے دیا اور صاف بچ گئے۔وہ اب بھی ان لوگوں کو قیمتاً مشاورت مہیا کرتے تھے جو محکمہ جات کی تادیبی کارروائیوں کا شکار تھے۔ان کے آستانے پر صبح سے شام تک رونق لگی رہتی تھی۔ انہوں نے سکول کی قدیم لائبریری کے کئی نادر نسخے محکمہ آثار قدیمہ کو فروخت کر دیئے تھے۔ان کے خلاف کتابوں سے محبت کرنے والے کسی مدرس نے شکایت کی۔بورڈ کے ممبران کا ایک وفد معائنے کے لئے آیا۔ جن کتابوں کا نام شکایت میں درج کیا گیا تھا' وہ لائبریری کی الماری میں سجی ملیں۔ممبران بورڈ

نے شکایت کو بے بنیاد قرار دیا جبکہ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہی جانتے تھے کہ نادر کتب کی جلدوں کے اندر انھوں نے پرانے اخبارات کے صفحات کتابی کاغذ کے برابر کٹوا کر بھر رکھے تھے وہ خود جلد ساز تھے۔ ان کے اس ہنر کا اظہار واعلان ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہوا۔ وہ اس کارنامے کا ذمہ دار اپنے بعد تعینات ہونے والے ہیڈ ماسٹر کو ٹھہراتے تھے۔ کوشش کے باوجود میری ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ عام ضرورت مندوں کے سوا کسی افسر سے نہیں ملتے تھے۔

☆☆

چودھری فیض الرحمان نے مجھے بتایا کہ پروفیسر سعید احمد اعلیٰ سطحی کمیٹی کے ساتھ پچھلے سال کی گرانٹوں سے خریدے گئے مال کی پڑتال کے لئے اگلی صبح نارووال پہنچ رہے ہیں۔ وہ وہاں سے شکرگڑھ جائیں گے، رات وہیں قیام ہوگا۔ اس دورے میں، میں ان کی نمائندگی کروں گا۔ خود پروفیسر صاحب کے دورے میں ان کے ہمراہ نہ جانے کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ اس روز ڈپٹی کمشنر ۷۷-۱۹۷۶ء کے لئے مختص گرانٹوں کے تحت ٹینڈرز کھولنے ہیں۔ اور ان کا خریداری کی ضلعی کمیٹی برائے تعلیم کے سیکرٹری ہونے کے ناتے ٹینڈر کھلنے کے وقت موجود ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپے دیئے کہ میں ایک ٹیکسی کار لے جاؤں اور ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ رہوں۔ ان کے ہمراہ محکمہ سماجی بہبود اور صنعت کے دو اور افسر بھی ہوں گے۔ دفتر کے سپرنٹنڈنٹ نے بھی پہلی ملاقات میں اس دھاندلی کا ذکر کیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ وہی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی ہے جس کا ذکر پہلی بار ۱۹۷۵ء کی خریداری میں، میں نے لاہور میں سنا تھا اور پھر یہ بھی سنا تھا کہ سیالکوٹ میں سابقہ ڈپٹی ایجوکیشن افسر نے چودھری صاحب سے ہر قسم کے کاغذات پر دستخط کروا لیے تھے اور ٹھیکیداروں سے مال خود بنایا تھا۔

میں سیالکوٹ سے کرائے کی کار پر نارووال پہنچا تو وہاں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ سامان کا اسٹور نارمل سکول میں ہے۔

وہاں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے دفتر کے سابقہ کلرک، خزانچی اور ہیڈ کلرک وغیرہ موجود تھے۔ ان اہلکاروں کو پچھلے سال کی خریداری کے بعد سزا کے طور پر تبدیل کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے معیاری مال نہیں خریدا ہے۔ اور ٹھیکیداروں کے ساتھ ملی بھگت کی ہے۔

معائنہ ٹیم محکمہ تعلیم کی فورڈ ویگن پر پہنچی۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو بتایا کہ ڈی۔ ای۔ او کن وجوہ کی بنا پر نہیں آسکے جبکہ ان کی نمائندگی کرنے کے لیے میں آیا ہوں۔ ان کے قیام و

طعام کا انتظام گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول نے کیا تھا۔ پروفیسر صاحب سخت مزاج آدمی تھے۔ وہ میری باتیں سن کر مسکرا دیئے۔ کچھ بولے نہیں۔ سابقہ ہیڈ کلرک اور کلرک سامان کا معائنہ کراتے رہے۔ چند ایک ٹھیکیدار بھی موجود تھے۔ زیادہ سامان سکولوں کا فرنیچر ہی تھا۔ سامان کی پڑتال ہوئی۔ اسے سکولوں میں تقسیم کرنے کے لئے پاس کر دیا گیا۔ کمیٹی نے آرام نہیں کیا' کھانا کھایا اور شکر گڑھ روانہ ہو گئی۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ ویگن میں آسانی سے بیٹھ جاؤں گا' لہٰذا میں نے ٹیکسی چھوڑ دی' ڈرائیور نے صرف ڈیڑھ سو روپے لئے۔

کمیٹی نارووال سے گورنمنٹ ہائی سکول شکر گڑھ پہنچی۔ وہاں ہیڈ ماسٹر کو پہلے ہی کمیٹی کی آمد کی اطلاع تھی۔ قیام و طعام کا انتظام موجود تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں گورنمنٹ ہائی سکول شکر گڑھ گولہ باری اور دھماکوں کی زد میں آیا تھا۔ ہوسٹل کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ دیواریں مسمار ہو گئیں۔ کنکریٹ کی چھت اس طرح گری کہ زمین سے ٹیک لگا کر مخروطی حالت میں کھڑی ہو گئی۔ جو اس چھت کو دیکھتا' دیکھتا ہی رہ جاتا اور معمار کی تعریف کرتا۔

خریدے ہوئے مال کا گودام اسی اسکول میں ہے؟ ڈائریکٹر صاحب نے ہیڈ ماسٹر سے پوچھا۔

''جی ہاں''، ''اسی سکول کے دوسرے بلاک میں ہے۔'' ہیڈ ماسٹر نے جواب دیا۔

''میں ذرا گودام دیکھنا چاہوں گا...... بس باہر ہی سے......''

کمیٹی کے دوسرے ارکان تھکن اتارنے کی خاطر سستا رہے تھے۔ تاریکی پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے ڈائریکٹر صاحب میرے اور ہیڈ ماسٹر کے ساتھ گودام تک تشریف لے گئے۔ وہاں گرد اُڑ رہی تھی' خاکروب گودام کی صفائی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتایا کہ دفتر کے بابو ان کو صفائی پر لگا گئے ہیں کیونکہ صبح افسروں کو معائنہ کرنا ہے۔ گودام میں سو (۱۰۰) واٹ کا بلب جل رہا تھا' اس کی روشنی سامان کے بجائے دھول ہی کو نمایاں کر رہی تھی۔ ڈائریکٹر صاحب گرد و غبار سے گھبرا گئے۔ بس اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور لوٹ آئے' ہم بھی ان کے ساتھ ہی واپس آ گئے۔

بلب کی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ گودام میں معمولی سا سامان پڑا ہے۔ مجھے کسی تبصرے کی ضرورت نہ تھی۔ صبح معائنے کے وقت بھی میں خاموش ہی رہا مگر اب گودام بھرا ہوا اور فرنیچر چمکتا ہو نظر آ رہا تھا۔ کمیٹی کو کسی قسم کا شک نہیں گزرا۔ چند اشیاء گنی گئیں اور ان کو فی الفور

سکولوں میں تقسیم کر دینے کا اجازت نامہ جاری کر دیا گیا' ساتھ ہی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے دفتر کے ایک کلرک نے مجھے راز داری سے بتایا کہ اہل کاروں اور ٹھیکیداروں نے جو سامان کمیٹی کو نارووال میں دکھایا تھا وہ چند روز پہلے پسرور سے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر سکول کو بتایا گیا تھا کہ ٹھیکیداروں کے اسٹور سے آیا ہے۔ شکر گڑھ میں جس سامان کا معائنہ ہوا ہے وہ دراصل وہی ہے جو نارروال میں دکھایا گیا تھا اور راتوں رات ٹرکوں میں لاد کر شکر گڑھ پہنچا دیا گیا ہے۔ ضلع سیالکوٹ میں بھی وہی مسئلہ زیر بحث رہا کہ ٹھیکیدار طلب کے مطابق مال بروقت نہیں پہنچا سکے تھے۔ متعلقہ اہلکاروں سے ان کا لین دین تھا۔ اس لئے وہ ٹھیکیداروں کی مدد کر رہے تھے۔ کلرک نے مزید بتایا کہ خریدا جانے والا مال طلب سے اب بھی کم ہے جبکہ ادائیگیاں ہو چکی ہیں۔ سب نے مال کھایا ہے اور اب الزام صرف ڈپٹی ایجوکیشن افسر پر دھرا جا رہا ہے' اس لئے کہ وہ موقع پر موجود نہیں۔ ''اگر سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہوتا تو یہ میرے پیٹی بند بھائی سیالکوٹ اور ڈسکے میں ایک ہی مال کیوں پیش کرتے اور ٹیکنیکل افسر کا منہ بند کرنے کے لئے دن رات اس کی منتیں کیوں کرتے۔''

اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کو جُل دینے کی تصدیق حصہ رسدی نہ پانے والے کئی اہلکاروں نے بھی کی۔ تاہم میرا ذاتی طور پر اس سارے جھگڑے سے کوئی تعلق نہ تھا اس میں کچھ سچ تھا اور کچھ جھوٹ۔ اپنی سطح پر میں نے دیانتداری برتی کہ مجھے چودھری فیض الرحمان نے جو پانچ سو روپے ٹیکسی کار کے لئے دیئے تھے اس میں سے بچے ہوئے ساڑھے تین سو روپے میں نے انھیں واپس کر دیئے۔ وہ کمیٹی کے مطمئن جانے پر مسرور تھے کیونکہ پورے ضلع کی تعلیم اور متعلقہ معاملات کے افسر اعلیٰ وہی تھے اور ان کی حیثیت ذمہ داری کے حوالے سے ملزم کی تھی۔ اسی لئے وہ حیلے بہانے کمیٹی سے دور ہی رہے۔ جنھوں نے گول مال کیا تھا انھوں نے تمام معاملات خود ہی نمٹا لئے تھے۔ ٹھیکیداروں کے ہاتھ اہلکاروں سے کہیں زیادہ لمبے تھے۔

◆◆◆◆◆

(۳۵)

ایک فتنہ انگیز ضیافت

اس افواہ نے میری دھاک' اساتذہ' عملۂ دفتر اور ہیڈ ماسٹر صاحبان میں بٹھادی تھی کہ ڈپٹی کا براہ راست وزیر تعلیم سے میل ملاپ ہے۔ حالانکہ یہ محض غلط فہمی تھی کیونکہ میری رسائی محض ان کے خصوصی عملے تک تھی۔ میرے ایسے واقف کاروں میں سے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب میرے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ پہلی ملاقات سرسری سی ہوئی وہ بھی سرراہ ہے'' ادھر آ گئے ہو' اچھا ہے'' گنتی کے یہ چند الفاظ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

اس ہیڈ ماسٹر کا سکول سرحدی علاقے بجوات میں تھا وہ قریبی مقام پر تبدیلی کی کوشش کر چکا تھا لیکن ناکام ہوا۔ میری رسائی کی شہرت سن کر اس نے مجھے شیشے میں اتارنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے ایک رقعہ میری عدم موجودگی میں دفتر میں چھوڑا کہ میں آپ کو ظہرانے کی دعوت دینے آیا تھا لیکن آپ نہیں مل سکے۔ میرا اسکول چونکہ بہت دور ہے اور میں روزانہ کالے کوس کاٹ کر وہاں جاتا ہوں۔ توی نالہ بھی عبور کرتا ہوں لہٰذا مجھے دوبارہ آنے کا وقت نہیں مل سکتا۔ اس رقعے کو چھپا ہوا دعوت نامہ تصور فرمایئے اور جمعے کو میرے ہاں ماحضر تناول فرمائیں''۔

میں جانتا تھا کہ اس کی اہلیہ دائم المریضہ ہیں اور وہ شہر میں سسرال کے ہاں رہتا ہے اس کے سسرال والے سنگاپور میں کاروبار کرتے تھے۔

میں نے ایک معذرت نامہ لکھ کر اپنے نائب قاصد کو دیا کہ وہ شام کو ہیڈ ماسٹر صابر علی کے ہاں دے آئے۔ وہ بولا میں ابھی دے آتا ہوں' میں نے کہا کہ اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ سکول گیا ہوا ہوگا۔ نائب قاصد بہت سے بھید جانتا تھا کہنے لگا کہ بجوات' بھرڑی' چرکھڑی محال اور بیلے کے علاقوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان جو شہر میں مقیم ہیں ہفتے میں صرف ایک

دو دن ہی سکول جاتے ہیں۔ صابر صاحب سو فیصد گھر پر ہوں گے۔

میں نے جانے کی اجازت دے دی اس کی بات سچی نکلی۔ کیونکہ جواب میں اس کے ساتھ صابر صاحب بھی دفتر تشریف لے آئے۔ پہلی ملاقات کے برعکس اس مرتبہ پُر جوش نعرہ لگا کر گلے ملے، فرمایا کہ اگر آج میں نے دفتر خزانہ جانے کے باعث سکول سے چھٹی نہ کی ہوتی تو آپ سے ملاقات کیسے ہوتی"

میں نے کہا، میں بھی زیادہ تر دوروں اور میٹنگوں میں رہتا ہوں۔ دفتر کم ہی بیٹھتا ہوں...... القصہ اس نے میری معذرت قبول نہیں کی اور مجھے بعد نماز جمعہ اپنے گھر محلّہ پل ایک آنے پر رضامند کر لیا۔

ضیافت بڑی پر تکلف تھی۔ گھر کی سج دھج سے غیر ملکی سامان کی مہک آ رہی تھی۔ کچھ اور مہمان بھی تھے جنہیں صابر نے میری عزت افزائی کے لئے بلا رکھا تھا۔ ان میں ایک میرا اہم جماعت حکیم ثنائی کا بیٹا بھی تھا تاہم اس کی میری بے تکلفی نہ تھی، ہاں صابر سے وہ بہت بے تکلف تھا۔ اپنے ہی گاؤں کا ہونے کی وجہ سے وہ میرے قریب بیٹھا تھا۔ جب میں نے عمدہ کھانوں اور جملہ انتظامات کی تعریف کی تو وہ چہکنے لگا" یہ سارے کھانے ریشماں نے تیار کئے ہیں!" حکیم ثنائی کے بیٹے نے کہا:

"ریشماں کون؟ میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارے میزبان کی مسٹریس۔ جواب بڑا ذومعنی تھا۔ "مسٹریس سے اس کی مراد وہی عام مفہوم تھا جو محتاج وضاحت نہیں ادھر میری ذہنی رسائی ہیڈ مسٹریس یا سکول مسٹریس تک ہی رہی۔ آگے نہیں گئی۔

"وہ کہاں تعینات ہیں؟" میں نے پھر پوچھا

"جناب! وہ یہیں صابر کے گھر میں تعینات ہیں۔ وہ سکول کے چوکیدار کی بیوی ریشماں ہیں۔ اپنے شوہر کی اجازت سے یہیں رہ رہی ہیں اور آج کل اس رنگڑ دیہاتی سے طلاق لے کر صابر سے عقد کرنے کی فکر میں ہیں۔ صابر بھی راضی ہے لیکن اس کی دولتمند مریض بیوی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ دونوں آہستہ آہستہ مل کر اس کے والدین سے ملنے والی دولت بھی سمیٹ رہے ہیں اور اس کو بھی اس کی خدمت کا تاثر دے کر ڈھب پر لانے میں کوشاں ہیں۔"

میں نے حکیم صاحب کے بیٹے کو پر معنی نظروں سے دیکھا تو وہ بولا کہ میں یہ سب کچھ

صابر کے سامنے بھی کہنے کو تیار ہوں کیونکہ صابر مجھے خود ہی اپنی رام کہانی سناتا رہتا ہے......اس نے مزید بتایا کہ:

ریشماں عمر کے فرق کے باوجود شہر کی آرام دہ زندگی سے زیادہ مانوس ہے اور صابر کو چاہتی ہے۔ بڑی نٹ کھٹ ہے پہلے اس نے میزبان کی بیوی اور اس کے بیٹے اور بیٹی کی خدمت کر کے ان کے دل میں گھر بنایا اور اب مستقل طور پر صابر علی کے دل میں مقیم ہے۔ ظالم نے بچوں کے دل بھی قابو کر رکھے ہیں' گاہے گاہے شوہر آتا ہے تو وہ اس سے بھی مسکرا مسکرا کر بناوٹی باتیں کرتی ہے اپنے دل کی بات نہیں بتاتی' تحفے تحائف اور نقد روپے دے کر بھگا دیتی ہے۔ کیا بتاؤں کیسی پٹاخہ عورت ہے۔ اس کے جتنے بال اتنے ہی جال

ع......خدا محفوظ رکھے اس بلا سے!

"اس کے بچے نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بچوں کی قائل نہیں۔ کچھ عرصہ خاندانی منصوبہ بندی کے مرکز میں بھی کام کرتی رہی ہے۔ آپ کہیں تو میں صابر سے کہہ کر اسے ادھر بلا لیتا ہوں۔ آپ عورتوں سے پردہ تو نہیں کرتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہم دونوں کی کھسر پھسر سے میرے سامنے بیٹھے ایک معمر شخص بڑے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے۔ وہ صبر نہ کر سکے بول ہی پڑے اور براہ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں صابر علی کا ماموں ہوں' ریٹائرڈ مدرس ہوں...... کچھ بتائیے تو سہی کہ بورڈ کے ریٹائرڈ اساتذہ کی پنشن کا بندوبست بھی ہو رہا ہے یا نہیں؟"

"ہو رہا ہے......" میں نے ترت جواب دیا۔ "میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ حکومت نے کئی لاکھ روپیہ مختلف بورڈوں کو ریٹائرڈ اساتذہ کی پنشن ادا کرنے کے لئے دیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور چہکنے لگے...... مدعو اصحاب تشریف لے گئے۔ حکیم صاحب کا صاحبزادہ اب خاموش تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے صابر علی کو بتا دیا کہ اس نے اس کا سارا کچہ چٹھہ مہمان خصوصی کو بتا دیا ہے۔ صابر علی معنی خیز ہنسی ہنس رہا تھا۔ میں اس کی ہنسی میں چھپے ہوئے فتنے کو بھانپ گیا۔ پھر اسے گھاس نہیں ڈالی۔

میں اب میزبان کے ماموں کی باتیں سن رہا تھا اور دوسری جانب ریشماں الائچی والی

مہک دار سبز چائے تیار کر رہی تھی۔صابر کے ماموں نے بڑی دلچسپ باتیں سنائیں۔اور گفتگو کا رخ نذر نیاز کی باتوں کی طرف مڑ گیا۔اس نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ سچا واقعہ سنایا۔آپ بھی سنئے۔

☆☆

قیام پاکستان تک پیرس روڈ کی ستونوں والی کوٹھی چند ضلعی افسروں کی رہائش گاہ تھی۔ایک حصہ بالکل علیحدہ تھا جو ضلعی افسر معائنہ کی رہائش کے لئے مخصوص تھا۔قیام پاکستان سے تھوڑی دیر پہلے ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ایسے بھی تشریف لائے جنھیں نذر و نیاز کا بہت شوق تھا۔ان کا نام میزبان کے ماموں نے بار بار لیا لیکن میں ان کو شیخ صاحب ہی کہہ کر ان سے منسوب نیاز کا واقعہ سنا رہا ہوں۔

کوٹھی مذکور میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے دفتر کے ہیڈ کلرک سے پوچھا کہ کوٹھی میں پہلے کون کون سے صاحبان رہ چکے ہیں۔انھیں کئی نام بتائے گئے۔جب انھوں نے پنڈت مرلی دھر اور باوا بلونت سنگھ جیسے نام سنے تو افسر موصوف کے کان جھنجھنا اٹھے۔انھوں نے کوٹھی پاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔مقامی قومی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان نے ان سے بھرپور تعاون کیا اور کوٹھی نئے رنگ و روغن سے آراستہ ہو گئی۔صفائی' ستھرائی اور دھلائی کے بعد شیخ صاحب اہل وعیال سمیت کوٹھی میں رہائش پذیر ہو گئے تو اب انھیں کوٹھی کو روحانی تقاضوں کے مطابق پاک کرنے کی فکر ستانے لگی۔یہ وہ مرحلہ ذکر اذکار اور قرآن خوانی کی مقدس محفلوں سے طے کیا گیا۔اس میں تعاون مقامی مدارس ہی نے کیا۔یہ خبر جب ضلع کے دیہی ہیڈ ماسٹروں تک پہنچی تو وہ بھاگے بھاگے آئے' شیخ صاحب سے ملاقات کی اور عرض گزاری ''قرآن خوانی کی تقریب میں ہم کو شامل نہ کر کے ہمارے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔آپ کی اصل ماتحت دنیا تو قصبات اور دیہات میں ہے جبکہ شہری سکولوں کے چند ہیڈ ماسٹر پورے ضلع کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔''...... شیخ صاحب موصوف نے ان کے خیالات قدر شناسی سے سنے اور فرمایا کہ اگلے ماہ کی پہلی اتوار کو میں اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں سالانہ نیاز دلاؤں گا اس موقع پر میں ایک کی بجائے دو دیگیں پکواؤں گا تمام علاقے کے ہیڈ ماسٹروں کو اس نیاز میں شمولیت کی صلائے عام ہے۔ساتھ ہی پنجاب ٹیچرز یونین کے عہدیداروں کو بھی شرکت کی دعوت ہے...... ہیڈ ماسٹر صاحبان خوشی خوشی گھروں کو لوٹ گئے۔

قریشی صاحب ایک مڈل ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اپنی ایک مخصوص ساکھ رکھتے تھے۔ ان کے سکول میں زراعت' بافندگی' باغبانی اور دیگر گھریلو صنعتوں کی تدریس بھی ہوتی تھی۔ ماڈل سکول کی خصوصی گرانٹیں اور کچھ فنڈز بھی سکول کے لئے مختص تھے۔ انھوں نے سوچا کہ شیخ صاحب کی نیاز میں شمولیت کے لئے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ مقررہ تاریخ کو ختم شریف اور درود شریف کی تقریب میں روایتی طور پر پھل وغیرہ تو لے ہی جائیں گے لیکن کچھ مال ومنال پہلے بھی بھیجنا چاہیے جو نیاز کے کھاتے میں شامل ہو۔ انھوں نے بھروسے کے ایک مدرس کے ہاتھ شیخ صاحب کے گھر نالہ ایک کے ڈیلٹائی علاقے کے نہایت خوشبودار باسمتی چاول ایک من کی مقدار میں بھیج دیئے۔ مدرس نے واپس آ کر بتایا کہ شیخ صاحب گھر ہی پر تھے انھوں نے چاولوں کی خوشبو سونگھی۔ بڑی تعریف کی اور دریافت فرمایا کہ کیا قریشی صاحب ابلے ہوئے چاول پسند کرتے ہیں۔ نیاز پر تو میٹھی اور نمکین دیگیں ہی پکیں گی۔ قریشی صاحب گھاگ آدمی تھے۔ اصل بات سمجھ گئے۔ اگلے روز ایک مہر بلب لفافہ تیار کیا۔ شاید اس میں سو روپے کا نوٹ تھا اسی مدرس کو حکم دیا کہ یہ لفافہ فوراً شیخ صاحب کی خدمت میں پہنچا دو۔ لفافے کے اوپر ''چینی اور نمک کے لئے'' کے جلی حروف جگمگا رہے تھے۔

مڈل سکول بوگرہ کے ہیڈ ماسٹر چودھری صاحب اور مڈل سکول جوڑیاں کے ہیڈ ماسٹر سید صاحب دونوں شیخ صاحب سے یہ اجازت لینے پہنچ گئے کہ وہ کھاتے پیتے زمیندار ہونے کے ناتے پوری نیاز کا انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ شیخ صاحب ''بات باہر نکل جانے'' کے خوف سے اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ بس آپ نماز ظہر کے بعد تشریف لے آئیں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ چودھری صاحب نے کہا کہ یہ تو ان کی روایات کے خلاف ہے' وہ نیاز میں اپنا حصہ ضرور ڈالیں گے۔ اس پر شیخ صاحب خاموش ہو گئے۔

شیخ صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے بہت سی روشیں بنی ہوئی تھیں اور ان روشوں کی دونوں جانب گارڈینیا کی قد آدم باڑیں تھیں جن کو کبھی تراشا نہیں گیا تھا۔ نیاز گزاروں کی پردہ پوشی میں ان باڑوں نے بڑا کام دیا۔

نیاز سے قبل آنے والی اتوار فقیر حسین ملہی نے چینی کا ایک توڑا سکول کے چپڑاسی کے سر پر رکھوایا اور پیرس روڈ پہنچ گیا۔ ایک باڑ کی اوٹ میں توڑا رکھوا کر چپڑاسی کو سڑک پر انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ برآمدے میں شیخ صاحب کے پاس دو آدمی

بیٹھے نظر آئے۔ وہ ایک باڑ کی اوٹ میں بیٹھ گیا کہ ملاقاتی اٹھ جائیں تو حاضری دے۔ اس باڑ کی دوسری طرف سے خرخر کی آواز آئی۔ وہ سمجھا کہ کوئی بکری ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی ہنسی آئی کہ ٹانڈے کا ماسٹر عبدالرشید بکرے کی رسی تھامے اسی کی طرح چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ رشید کے پاس گیا' آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوئیں پھر وہ سرگوشیاں کرنے لگے۔ عبدالرشید نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی مظفر چپڑاسی آیا تھا وہی سب کو مناسب جگہوں پر بٹھا رہا ہے۔ کیا وہ تم کو نہیں ملا؟ فقیر حسین نے نفی میں جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں' کہیں مصروف ہو گا۔'' رشید نے جواباً کہا۔

رشید نے مزید بتایا کہ مظفر اسے بتا کر گیا ہے کہ ایک بکرا تو منہ اندھیرے سید پور کا خادم علی پہلے ہی باندھ گیا تھا۔ اس وقت صاحب کے پاس ہیڈ ماسٹر نور محمد سیال اور اکبر علی قاضی بیٹھے ہیں اور چاول اور چینی کے توڑے لے کر آئے ہیں۔ ریاض علی بیلے سے ایندھن کی گڈ لے کر آیا ہے جو سڑک پر کھڑی ہے وہ منتظر ہے کہ ملاقاتی کب اٹھیں اور وہ سلام عرض کرے۔ مظفر نے رشید کو بتایا کہ اس کی باری ذرا دیر سے آئے گی کیونکہ کوٹھی کے عقبی لان کی باڑ کے اس پار تحصیل نارووال کے نیاز گزار اپنے نذرانے لئے چھپے بیٹھے ہیں۔ منشی صابر حسین عرف قلندر بھی اپنے باغ سے کیلوں کا پورا گھچا اور ثابت مسور کا توڑا لائے بیٹھے ہیں اور حکیم اللہ دوایا اور شریف پپو بادشاہ گھی کا کنستر لائے ہیں۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مظفر لسی کا جگ لے کر رشید کے پاس آیا۔ وہ فقیر حسین کو دیکھ حیران رہ گیا۔ دونوں کو لسی پلانے کے بعد اس نے فقیر حسین سے کہا اسے نیاز گزاروں کو الگ الگ بٹھانے کا حکم ہے۔ مظفر نے عبدالرشید سے کہا کہ بس پہلے مہمان اٹھنے والے ہیں صاحب مرچ مسالوں کے انتظام کی ذمہ داری انھیں سونپ رہے ہیں۔''

نذر و نیاز کا یہ فسانۂ عجائب سنا کر ماموں جان نے قہقہہ لگایا میں نے پوچھا کہ آپ نے بھی نیاز میں حصہ ڈالا یا نہیں؟۔ بولے...... ڈالا جی...... برابر ڈالا...... آپ بھی کسی ایسی نیاز کا بندوبست کریں' تو میں ریٹائر ہونے کے باوجود نذر لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔...... میں نے کہا میں ایسا کرتا تو آپ کو بھی بلواتا لیکن اب زمانہ آگے نکل گیا ہے۔ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان بڑے سیانے ہو گئے ہیں اور پھر میں ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر ہوں۔ میرا عہدہ زیادہ بڑا نہیں میں ڈرپوک آدمی ہوں۔ کوئی ایسا ویسا کام کرنے سے پہلے دور تک اور دیر تک سوچتا ہوں اور یہ اندازہ کر لیتا ہوں کہ میرے غلط اقدام کے عواقب کیا ہوں گے۔ میں حریص تو ہو چکا تھا

مگر مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ کوئی نقد آور کام کرنے یا کرانے کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں! اگر کوئی غرض مند کوئی چھوٹی موٹی خدمت کسی واقف کار کے ذریعے کرتا تو میں قبول کر لیتا تھا۔

☆☆

میرا ایک چچا سلیم شاہ تھا جو میرے ابا جان کا ماموں زاد بھائی تھا۔ وہ کہیں سندھ میں ٹھیکیداری کرتا تھا وہاں سے اپنے آبائی شہر ڈسکہ آ گیا۔ اور وہاں ایک مکان وغیرہ تعمیر کیا۔ اس نے مجھے کہا کہ اب وہ ادھر ہی ٹھیکیداری کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کا نام ٹھیکیداری کے لئے محکمہ تعمیرات میں رجسٹر کرانے میں اس کی مدد کروں۔ میرا بچپن کا دوست محمد شفیع راج ان دنوں سیالکوٹ کا جانا پہچانا معروف ٹھیکیدار تھا اور عمارات کی تعمیر کا کام کرتا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تو وہ مجھے اور سلیم شاہ کو ایگزیکٹو انجینئر صاحب کے پاس لے گیا۔ ہنس مکھ انجینئر صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح میں سکولوں کے ماسٹروں کا افسر ہوں اسی طرح محمد شفیع صاحب ٹھیکیداروں کے افسر اور ہمارے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ان کا حکم نہیں ٹالا جا سکتا۔

سلیم شاہ صاحب نہ صرف ٹھیکیدار رجسٹر ہوئے بلکہ ان کو ایک سکول کی عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ نہ جانے ان کو کیا سوجھی کہ انھوں نے لوگوں کو باہر بھجوانے کا جھانسہ دیا، بہت سارو پیہ گول مال کیا اور گم ہو گئے، ان کی اس مشق ستم کا ایک نشانہ میرا ایک ماموں زاد بھی بنا۔ اس بے چارے نے بہتر مستقبل کی امید پر اپنے سسرال والوں سے رقم ادھار لی تھی سلیم شاہ اسے بھی ڈس گیا بد قسمتی سے میرا یہ رشتہ دار سلیم شاہ مکتبہ عالیہ کے ملک الطاف حسین کا بہنوئی تھا۔ میں نے الطاف حسین پر زور دیا کہ سلیم شاہ، کا سراغ لگاؤ اور اس سے میرے ماموں زاد کی رقم واپس دلواؤ کہ وہ بے حد غریب ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سلیم شاہ تو اپنے بال بچے بھی بے سہارا چھوڑ گیا ہے اور آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔

میں نے ماموں زاد کی صحیح حالت زار واضح کی تو الطاف حسین نے کہا کہ میری منظور شدہ کتابیں مڈل اور ہائی اسکولوں کی لائبریریوں میں لگوا دیں تو میں آپ کے ماموں زاد کو دو سو روپے ماہانہ دے دیا کروں گا۔ میں نے اس سلسلے میں دوست اور تابعدار قسم کے ہیڈ ماسٹر صاحبان سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ بسم اللہ کیجئے۔ کتابیں بھجوایئے۔ قیمت کتابیں لانے والے کو ادا کر دی جائے گی۔ القصہ میں اس دھندے سے لگ گیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں بس میں بیٹھا سیالکوٹ جا رہا تھا۔ دفعتہً میں نندی پور کے پل پر اتر پڑا۔ تانگہ لیا اور مڈل سکول گوئند کے پہنچا۔ یہ دراصل میری طرف سے سرسری معائنے کی کارروائی تھی۔ میں اسکول کی حالت زار دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ اسکول میں صفائی کا نام و نشان نہیں تھا' دھول اڑ رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب غائب' معلمین غیر حاضر' صرف دو معلم بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ حاضری رجسٹر نامکمل تھا' آرڈر بک اور لاگ بک کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ تختہ سیاہ پر گھٹیا جملے لکھے ہوئے تھے۔ طلبہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کوئی گالی دے رہا تھا' کوئی دھول اڑا رہا تھا...... کسی اسکول کی ابتری کا اس سے زیادہ دلخراش منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں ہوک سی اٹھی اور میں اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

میں نے دونوں حاضر معلمین کو بلایا۔ ان میں ایک میٹرک ایس وی تھا دوسرا مڈل جے وی۔ میں نے ایس وی مدرس کو ڈانٹا اور اسکول کی حالت زار کی طرف متوجہ کیا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنی غیر حاضری میں کسی نائب کو کسی کو ہیڈ ماسٹر بنا دیں۔ پھر اس نے ایک معنی خیز جملہ کہا' کہنے لگا کہ ہیڈ ماسٹر شریف صاحب ویسے ہی تاناشاہی مزاج کے سر پھرے آدمی ہیں۔

میں نے ایک سادہ کاغذ پر لاگ بک کے اسلوب میں سکول کی ابتر حالت رجسٹروں کی عدم موجودگی اور دیگر چشم دید بے قاعدگیوں کا اندراج کیا۔

اپنی تحریر ایس وی مدرس کو دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر میں نے سب کچھ درست لکھا ہے تو اس پر توثیقی دستخط کر دو۔ اس نے متذبذب انداز میں دستخط کر دیئے۔ احتیاطاً میں نے جے وی مدرس سے بھی اس کاغذ پر دستخط کرا لئے اور پھر اپنے دفتر چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر محمد شریف سی ٹی کے لئے میں نے پیغام چھوڑا کہ وہ اپنی غیر حاضری کا جواز بتانے کے لئے لاگ بک سمیت صدر دفتر میں پیش ہو جائے۔

☆☆

اگلے روز جب میں دفتر پہنچا تو کچھ کتابوں کے بنڈل لیے الطاف حسین بھی موجود تھا۔ ڈویلپمنٹ کلرک اس کے پاس بیٹھا تھا۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد الطاف حسین کی موجودگی ہی میں محمد شریف بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ چند روز قبل اس کی ہمشیرہ جو چار بچوں کی ماں تھی' فوت ہو گئی ہے۔ تب سے وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی درخواست رخصت دفتر

اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر بھجوا رکھی ہے۔ مذہبی عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے حاضر مدرسین نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا کہ میں کل ختم شریف کی وجہ سے ہمشیرہ کے ہاں قریبی گاؤں میں تھا۔ اس گاؤں کے کئی لڑکے سکول میں پڑھتے ہیں وہ کسی کو بھیج کر مجھے بلوا بھی سکتے تھے۔

اگر اس کے وضاحتی بیان میں بہن کے فوت ہونے کا ذکر نہ ہوتا تو میں اس کی وضاحت پر اعتماد نہ کرتا۔ پھر اس نے درخواست بھی اسسٹنٹ ایجوکیشن افیسر کے دفتر بھیج رکھی تھی۔ وہ اس کا اندراج بھی چھ روز قبل کی تاریخ میں رجسٹر خط و کتابت پر دکھا رہا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا کہ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ ضرورت ہے تو مزید رخصت لے لو۔ الطاف حسین نے بھی تائید کی۔ اسی دوران میں کچھ لمحوں کے لئے میں باتھ روم گیا اسی اثناء میں شریف نے الطاف حسین سے واقفیت نکال لی کہ وہ خود گوئند کے کا رہنے والا ہے جبکہ الطاف حسین ہدو کے کا رہنے والا ہے۔ وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ الطاف حسین نے اسے دو سو روپے کی کتابوں کا بنڈل تھما دیا۔ اس نے مجھے لاگ بک لکھ دینے کو کہا تو میں نے کہا اب تو الطاف حسین آیا ہوا ہے کچھ لکھنا مشکل ہوگا۔ اس نے مجھے وہ کاغذ جو میں لاگ بک کے طور پر لکھ لایا تھا پھاڑ دینے کے لئے کہا۔ میں نے کہا کہ بے فکر رہو، سمجھ لو کہ وہ پھٹ گیا۔ اس نے معاً کہا کہ مجھے پرسوں سیالکوٹ آنا ہے وہ لاگ بک لے لے گا ساتھ ہی وہ مجھے کتابوں کی قیمت بھی ادا کر دے گا۔

وہ چلا گیا۔ میں الطاف حسین سے اس کی کتابوں کا حساب کتاب کرتا رہا۔ وہ مجھے قلعے سے نیچے ہوٹل میں لے گیا۔ کھانا کھلایا، پھر اس نے اپنے گاؤں جانے کا بتایا۔ وہ گاڑی پر تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے سمبڑیال اتار دیا...... اگلے روز میرے دورے کا دن تھا۔

اس سے اگلے روز جب میں دفتر پہنچا تو سیڑھیوں کے قریب بوٹ پالش کرنے والا لونڈا بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اپنے بوٹ دیئے اور ٹوٹے پھوٹے سلیپر پہن کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ میرے نائب قاصد نے بتایا کہ مجھے مہر حیات محمد کا آدمی دو بار بلانے آچکا ہے۔ مہر صاحب ڈسٹرکٹ کونسل کے چیف آفیسر تھے اور مجھے برخوردار کی حیثیت سے اس وقت سے جانتے تھے جب وہ لاہور میں چیف آفیسر تھے اور میں ڈویلپمنٹ کا اے ڈی آئی تھا۔ میں نے نائب قاصد سے کہا کہ مہر صاحب کو بتاؤ کہ میں ابھی جوتے پالش ہو جانے کے بعد حاضر ہو جاتا ہوں۔ مگر اس دوران مہر صاحب خود ہی میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ کہنے لگے کہ تم پر اینٹی کرپشن کا چھاپہ پڑنے والا ہے

تمہاری الماری میں کوئی لاگ بک پڑی ہے۔ اسے نکالو اور میرے کمرے میں چلو۔ میں نے لاگ بک نکالی۔ اسے مہر صاحب نے جھپٹ لیا اور نائب قاصد سے کہا کہ ان کے بوٹ میرے کمرے میں لے آؤ۔ چھاپے کا نام سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ مہر صاحب آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ ان کے کمرے میں پہنچا، میرا گلا خشک ہو رہا تھا، ان سے پانی طلب کیا۔ انھوں نے کہا "حوصلہ رکھو، اب تم اپنے کمرے میں نہیں ہو، کیا تم یہ لاگ بک لکھنے کے عوض دو سو روپے طے کر چکے ہو......"

میں نے اپنی جیب سے دو روز پیشتر کا لکھا ہوا وہ کاغذ انھیں دکھایا جس پر دو مدرسین کے دستخط تھے۔ ساتھ ہی ان کو ان دو سو روپوں کی حقیقت بتائی جو میں محمد شریف سے لینے والا تھا۔ انھوں نے اسے پڑھا اور کہا لاگ بک تم اس کے برعکس لکھتے تو گرفت میں آ جاتے اور جب تم کتابوں کی قیمت کے دو سو روپے محمد شریف سے لیتے تو "نوٹ برآمد کرا کے وہ تمھیں گرفتار کرا دیتا اور تمھیں خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں برسوں لگ جاتے...... ویسے بھی ابھی تمہاری ترقی اپنی تنخواہ اور گریڈ پر ہوئی ہے۔ خدا کا شکر کرو، چھاپے کا مجھے قبل از وقت پتہ چل گیا۔ اب تم دفتر سے غائب ہو جاؤ۔

یہ آج تک ایک سربستہ راز ہے کہ مہر صاحب کو مجھ پر چھاپہ پڑنے کا علم کیسے ہوا۔ بعد کو پتہ چلا کہ محمد شریف کی اعانت ایک کانسٹیبل سرفراز کر رہا تھا۔ یہ کانسٹیبل چھاپہ ناکام ہو جانے کے بعد مجھے ملا اور کہنے لگا کہ کسی کی مخبری کی وجہ سے اس روز چھاپہ ناکام رہا لیکن مقدمہ ختم نہیں ہوا۔ اینٹی کرپشن میرے خلاف پرچہ کاٹ چکی ہے۔ اس اثنا میں میں نے لاہور کے انسداد رشوت ستانی کے دفتر میں ایک صاحب سے بات کر کے فون پر سیالکوٹ سے کلیرنس لے لی تھی۔ میں نے چھاپے کے روز لاگ بک نہ ملنے کے بارے میں لکھ کر دو روز قبل کی تاریخ درج کرنے کے بعد اصل کاغذ لاگ بک پر چسپاں کر دیا تھا۔ جو حقیقت حال کا گواہ تھا۔ شکر اللہ کریم کا، کہ میں نے وہ کاغذ پھاڑا نہیں تھا، اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر نے بھی لکھ بھیجا تھا کہ محمد شریف کی کوئی درخواست اس کے دفتر میں نہیں پہنچی اور اس کا رجسٹر خط و کتابت میں اندراج بھی نہیں ہے۔ اس پریشانی میں دو سو (۲۰۰) روپے کی کتابیں اُڑن چھو ہو گئیں۔

مجھے جب بھی یہ نامراد چھاپہ یاد آتا ہے تو میں مہر حیات محمد کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں

ع...... رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت!

میری بھتیجیاں اور محلے کی دیگر چھوٹی بچیاں پڑھنے کے لئے سمبڑیال منڈی کے

پرائمری سکول جاتی تھیں۔ لڑکیوں کا ایک پرائمری سکول ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر قصبے کے مغرب میں تھا جبکہ ہماری رہائش عوامی ہائی سکول کے کیمپس کے مغرب میں تھی جو قصبہ کے شرقی اختتام سے بھی فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع نئی آبادی میں تھی۔ منڈی کا اسکول نئی آبادی سے زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ بچیوں کو پہلے چکر کاٹ کر ریلوے لائن عبور کرنا پڑتی۔ اکثر مال گاڑیاں وقت بے وقت کھڑی شنٹنگ کرتی رہتیں۔ ایسے میں عجلت کی خاطر بچیاں گاڑیوں کے ڈبوں کے نیچے سے گزر کر دوسری سمت جاتیں۔ پھر انھیں جرنیلی سڑک عبور کرنا پڑتی جس پر ہر قسم کی تیز رفتار ٹریفک ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ میں ہر دوسرے روز دفتر جانے کے لئے ریل گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے بچیوں کے سکول جانے کا یہ افسوس ناک منظر دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ ان کے لئے سکول نئی آبادی کے اندر ہونا چاہیے۔

دفتر میں ایک شکایت آئی کہ پرائمری سکول جیٹھول کی معلمات اکثر غیر حاضر رہتی ہیں۔ آتی بھی ہیں تو باری ٹھہرا کر۔ بچیوں کی تعلیم کا جنازہ نکل چکا ہے۔ درخواست ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر کے توسط سے آئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ جیٹھول کے مڈل سکول کے بارے میں بھی شکایت تھی کہ درخت کٹوا دیئے گئے ہیں اور کواڑ چوراچکے اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ...... ان دنوں نئے پرائمری سکول کا اجرا بھی ہورہا تھا۔ ایک شکایت اس علاقے کی اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر نے بھی بھیجی تھی کہ دفتر کے ڈویلپمنٹ کے شعبے نے جیٹھول میں پہلے سے بچیوں کے سکول کی موجودگی میں ایک اور سکول بھی کھول دیا ہے جس کی آبادی کے لحاظ سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ پہلے سکول ہی میں طالبات کی تعداد پندرہ سے بیس کے درمیان ہے۔ مجھے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر نے جیٹھول جانے کا حکم دیا کہ اصل صورت حال مردانہ اور زنانہ دونوں سکولوں کی معلوم کروں تاکہ ضروری رپورٹ ڈائریکٹر تعلیمات لاہور ڈویژن کو ارسال کی جا سکے۔

جیٹھول سے واپسی پر میں نے اصلاحِ احوال کے لئے چودھری فیض الرحمان سے تبادلہ خیال کیا اور بعد ازاں رپورٹ لکھ دی۔ جیٹھول میں کھلنے والے نئے پرائمری سکول کو نئی آبادی سمبڑیال میں کھول دیا گیا۔ سیکرٹریٹ میں ہونے والے ایک اجلاس میں یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ ترقیات کے حوالے سے پائی جانے والی غلطی یا بے ضابطگی کی رپورٹ

کرنے کے بجائے معاملات کو درست کر کے اعلیٰ دفاتر کو اطلاع کر دی جایا کرے۔ فوری طور پر بی بی نرگس کو جو سمبڑ یال کی رہنے والی تھیں اور موضع جیٹھیکے میں تعینات تھیں، تبدیل کر کے سکول کا اجرا کیا گیا۔ سکول وقتی طور پر میرے گھر کے ایک بیرونی کمرے میں کھولا گیا۔ چند دنوں میں طالبات کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ ایک اور معلّمہ کا انتظام کرنا پڑا اور وہ دونوں سکول کو قصبے کو پانی مہیا کرنے والی ٹینکی کے بڑے صحن میں لے گئیں۔ جگہ کی تکلیف تھی لیکن معلمات کھلے آسمان تلے ہی کام چلا رہی تھیں۔ ایک روز دفعتاً مجھے اس مسئلے کا حل سوجھا۔

میں گورنمنٹ عوامی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر رانا محمد حنیف سے ملا۔ ان کے سکول کا ہاکی گراؤنڈ میرے گھر کے سامنے والی گلی تک پھیلا ہوا تھا۔ جہاں گراؤنڈ کی ''ڈی'' تھی اس سے آگے بھی کافی رقبہ فالتو پڑا تھا میں نے عرض کیا کہ ہم دونوں سرکاری ملازم ہیں۔ ہم بقید حیات رہے تو ایک نہ ایک دن ریٹائر ہو کر اپنے اپنے گھر چل دیں گے۔ کیوں نہ ہم ایک دائمی نیکی کر جائیں...... انھوں نے پوچھا کہ آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کے گاؤں میں یہ سکول کھلوایا ہے۔ آپ گلی کے ساتھ گراؤنڈ کے حصے سے اگر ایک کنال زمین سکول کو دے دیں تو میں اوپر مل ملا کر ایک سکول کی عمارت کے لئے دو کمرے بنانے کی رقم سے یہاں دو کمرے تعمیر کروا سکتا ہوں۔ کیونکہ اس سکول کی عمارت کے لئے فی الحال جگہ دستیاب نہیں ہو رہی۔ اور رقم ۳۰ رجون کے بعد ضائع ہو جائے گی۔

رانا محمد حنیف نے میری بات مان لی اور اپریل سے جون تک دو کمرے تعمیر ہو گئے۔ سکول کی معلّمہ نے کچھ چندہ وغیرہ جمع کر کے چار دیواری بھی تعمیر کرا ڈالی۔ نئی مٹی ڈلوا کر گل بوٹے بھی بو دیئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ گوجرانوالہ کو نئی ڈویژن بنا دیا گیا۔ میں وہاں اسٹنٹ ڈائریکٹر (ترقیات) متعین ہوا۔ میں نے اس سکول کو مزید تعمیراتی فنڈز دلوائے۔ بعد کو یہ سکول مڈل بنا دیا گیا۔ گراؤنڈ سے مزید اراضی حاصل کر کے ایک کشادہ صحن کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ عمارت تیار ہو گئی جو آج ایک ہائی سکول معلوم ہوتی ہے۔ سکول کے اندر ہی اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر (زنانہ) کا دفتر بھی ہے۔ راقم الحروف، بی بی نرگس، رانا محمد حنیف اور دیگر کئی مہربان احباب ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن سکول نہ صرف قائم و دائم ہے بلکہ ترقی کر گیا ہے اور وہاں سے قوم کی بچیاں زیور تعلیم سے مسلسل آراستہ ہو رہی ہیں۔

کسی بھی اچھے اور نیک کام کا فیضان یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا انعام آپ ہوتا ہے۔ انسانی

زندگی فانی ہے۔ سب کچھ ہی فنا پذیر ہے مگر اچھے اعمال کو بقائے دوام حاصل ہے۔ کبھی کبھار ادھر سے گزرتا ہوں تو اس سکول کے در و بام پر نگاہ شوق ڈال لیتا ہوں۔ میری روح خوشی سے جھوم اٹھتی ہے۔ کیا عجب یہی عاجزانہ خدمت حشر کے ہجوم و ہیجان میں میری بخشش کا ذریعہ بن جائے! اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔

☆☆

پی پی پی کا پہلا پنج سالہ دور حکومت ختم ہو چکا تھا اور اگلے مرحلے کے انتخابات کا غلغلہ برپا تھا' مجھے کوٹلی امیر علی میں پریزائیڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔ کوٹلی امیر علی پیپلز پارٹی کا گڑھ تھا۔ پی پی پی کے امیدوار کے مقابلے میں صدر ضلع مسلم لیگ خواجہ صفدر تھے۔ میں دل سے خواجہ صاحب کا ہمدرد تھا' چاہتا تھا کہ وہ کامیاب ہوں لیکن پی پی پی کے کارندوں اور ووٹروں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ مقررہ وقت کے بعد بھی خواتین ووٹروں نے مجھے یرغمال بنائے رکھا۔ رات گئے ہجوم ختم ہوا' ووٹوں کی گنتی کرتے کرتے آدھی رات ہو گئی۔ بہر کیف پولیس گارد کے ساتھ میں نتیجہ جمع کرانے ضلع کچہری پہنچا' سارا دن میں نے خواتین کی جو باتیں سنیں اور ان کی جو حرکات دیکھیں ان سے اندازہ لگایا کہ خواتین پی پی پی کے سابقہ پنج سالہ دور میں بہت آگے نکل چکی ہیں۔ خصوصاً دیہاتی خواتین جو غیر مردوں سے بات کرتے شرم سے دوہری ہو ہو جاتی تھیں بالکل ہی بدل چکی تھیں' مجھے تو پولنگ کے دوران میں وہ ہر لحاظ سے اب مردوں پر حاوی نظر آئی تھیں۔

مجھے خواجہ صاحب کی شکست کا دکھ ہوا۔ ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ سیاسی مخالفین ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر رہے تھے۔ عدم برداشت کے رگڑے میں کئی ایسے سرکاری ملازمین بھی آ چکے تھے جن کی سرے سے کسی سیاسی پارٹی سے کوئی سیاسی وابستگی نہیں تھی۔ ڈرے ڈرے انداز میں چودھری فیض الرحمٰن نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ فرمانے لگے کہ ۷۷-۱۹۷۶ کے سال کے لئے ترقیاتی امدادی رقوم سے خریداری کا ٹینڈر کھولنے تک کا مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ اب ڈپٹی کمشنر صاحب نے اگلا مرحلہ طے کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ انھیں میرا مکمل تعاون حاصل رہے۔ میرا تعاون یہ تھا میں کہ لائبریری کتب کی خریداری مکمل طور پر اپنی صوابدید کے مطابق کروں اور بقیہ اشیاء از قسم سامان سائنس' فرنیچر' ٹاٹ اور دیگر متفرقات کی خریداری خود چودھری صاحب کریں گے۔ شاید انھیں اندیشہ تھا کہ اگر مجھے کسی گڑبڑ گھٹالے

کی بھنک پڑ گئی تو میں شاید اسے وزیر تعلیم کے عملے تک پہنچا دوں گا۔

میں نے انھیں بتایا کہ میں خریداری سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ ضابطے میں ڈپٹی ڈی ۔ای۔او کا کوئی تعلق خریداری سے ہے ہی نہیں۔ میرا یہ روکھا سا جواب سن کر چودھری صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کر رہے۔ میں الجھن میں تھا۔ بالآخر میں نے ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ ایک لحاظ سے میں خوش بھی ہوا کہ ٹینڈر ہو جانے کے باوجود کتابوں کے انتخاب میں' میں اپنے دوست پبلشروں کو نواز سکوں گا۔ بالخصوص الطاف حسین سے لین دین بھی طے ہو جائے گا۔

ملک غلام نبی صاحب نے پارٹی کی الیکشن مہم کے دوران سنت نگر میں ایک تقریر کی تھی کہ وہ یہ عوامی جلسے الیکشن کے لئے ووٹ مانگنے کی غرض سے نہیں بلکہ رابطہ عوام کی خاطر کر رہے ہیں۔ میں لاہور میں تھا۔ اس لئے میں بھی اس جلسے میں شریک ہوا' ملک صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ان کی پارٹی کا ووٹ بینک اتنا بڑا ہے کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس قدر ووٹ کہاں سے آ گئے؟ ...... واقعی الیکشن میں پارٹی کے کھاتے میں ووٹوں کا شمار نہیں تھا۔ لیکن اسی الیکشن کے بطن سے پیپلز پارٹی کے خلاف ایک سخت جان حریف قومی اتحاد نے بھی جنم لیا۔ اس اتحاد نے ایسی تحریک چلائی کہ پی پی پی کی حکومت ڈگمگا گئی اور اس نے تمام محکمہ جات کی ترقیاتی امدادی رقوم کے استعمال پر روک لگا دی۔ پھر قومی اتحاد کی تحریک کے نتیجے میں ضیاء الحق کا مارشل لاء آ گیا۔ جس کے نتیجے میں فوری طور پر ہر قسم کے مالیاتی معاملات پر پابندی عائد ہو گئی۔ صرف ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

☆☆

مارشل لائی ضابطوں میں ایک ضابطہ یہ بھی جاری ہوا کہ ایسے تمام گزیٹیڈ افسروں کو جو اپنے آبائی اضلاع میں تعینات ہیں' فی الفور دوسرے اضلاع میں تبدیل کر دیا جائے۔ نیز اس ضابطے پر عملدر آمد کی رپورٹ ضلعی مارشل لا حکام کو کریں۔ گو میں ابھی نان گزیٹیڈ تھا لیکن میری اسامی تو گزیٹیڈ تھی لہٰذا مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں ضلع سیالکوٹ میں چند دن کا مہمان ہوں۔

سیالکوٹ سے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر چودھری فیض الرحمٰن کو بوجوہ راولپنڈی بطور پرنسپل جامع سکول تبدیل کر دیا گیا حالانکہ سیالکوٹ ان کا پیدائشی ضلع نہ تھا۔ ان کی جگہ قصور سے چودھری شفیع احمد میو تشریف لائے۔ وہ عرصے تک ڈی۔ بی ہائی سکول اور پھر گورنمنٹ ہائی

سکول بھائی پھیرو کے ہیڈ ماسٹر رہے تھے اس لئے ہم ان کو ''بھائی پھیرو'' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ خاصے ہنس مکھ اور بے کلف تھے۔ اب جناب ''بھائی پھیرو'' براہ راست میرے افسر بن چکے تھے۔ میں نے ان کو ضلع کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات بہم پہنچائیں اور خود بھی اپنے تبادلے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ کہیں نومبر میں جا کر میرا تبادلہ بطور ڈپٹی ایجوکیشن افسر قصور کر دیا گیا۔

میں یکم دسمبر ۱۹۷۷ء کو قصور حاضر ہوا۔ مسٹر گلزار بھٹی جو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز لاہور، سنٹرل ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر اور ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز رہے تھے۔ ان دنوں ضلع قصور میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر تھے۔ میں پھر سے ان کا نمبر ۲ تھا۔

ذیابیطس کے مرض اور کام کے دباؤ کی وجہ سے ان دنوں ان کی طبیعت زیادہ ہی ناساز ہو گئی تو مجھے ان کی جگہ ضلعی انتظامیہ اور مارشل لاء حکام کی میٹنگوں میں جانا پڑتا۔ میں کئی دیگر امور کی وجہ سے اپنے محکمے کے دفاتر میں بھی جاتا تھا۔ زنانہ ڈپٹی ایجوکیشن افسر مسز محسن تھیں۔ اور مجھ سے سینئر بھی تھیں لیکن وہ بھی موٹاپے اور اپنے گھٹنوں کے درد کے ہاتھوں مجبور تھیں، لہٰذا ان کے بیرونی معاملات بھی مجھے ہی دیکھنے پڑتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے انتظامیہ میں میری خصوصی تربیت ہو رہی تھی۔ ایسا موقعہ سیالکوٹ میں نہیں ملا تھا۔

☆☆

قصور کے ہائی اسکولوں کے اسکاؤٹس کا ایک ٹروپ موسم بہار کے کیمپ گھوڑا گلی میں شامل ہوا۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر عہدے کی بنیاد پر بطور ضلعی چیف اسکاوٹ کیمپ کی تقریبات میں شامل ہوتا ہے۔ بھٹی صاحب نے یہ موقع بھی مجھے ہی مرحمت فرمایا۔ قبل ازیں میں چار مرتبہ گھوڑا گلی جا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ بی ٹی کی تربیت کے آخر میں اسکاوٹ ماسٹر کی تربیت حاصل کرنے کے لئے۔ دو مرتبہ جب میں مڈل اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر تعینات تھا، بحیثیت ہیڈ ماسٹر اپنے اسکولوں کے اسکاؤٹس کے ساتھ گیا تھا۔ آخری مرتبہ میں پی ٹی سی کی کلاس کے ساتھ بطور پرنسپل، گیا تھا۔ اب کے کیمپ میں مجھے رہائش کیلئے علیحدہ نیا تعمیر شدہ کیبن دیا گیا جہاں چارپائیوں کے علاوہ باتھ روم بھی تھا۔ یہ محض اس لئے تھا کہ میں وہاں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر قصور کی حیثیت سے گیا تھا۔

کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہو کیمپ میں اسے فعال بنا کر رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات

اسکاوٹ وردی پہننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ صبح اسمبلی میں شامل کیا جاتا ہے، کبھی جھنڈا لہرانے کی، کبھی انعامی جھنڈیاں تقسیم کرنے کی، کبھی زیر تربیت اسکاوٹس کے خیموں کے معائنے کی، کبھی کیمپ فائر کے پروگراموں میں جج کی ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ہفتے بھر کے پروگرام میں ایک روز کیلئے میں خانس پور بھی گیا۔ جونتھیا گلی سے آگے صوبہ سرحد میں ہے۔ وہیں وہ برقی جھولے بھی لگے ہوئے ہیں جو سیاحوں کو بلند ترین چوٹی پر لے جاتے ہیں۔ میں بھی برقی جھولے سے بلند پہاڑ کی چوٹی تک گیا۔ پہاڑوں کی بلندیاں طربناک اور پستیاں خوفناک ہوتی ہیں۔ پہاڑوں کو پہاڑی لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

◆◆◆◆◆

(۳۶)

ایک خونی واقعہ

ضلعی افسر تعلیم کی علالت کی وجہ سے تقرر اور تبادلوں کا کام رکا پڑا تھا۔ یہ دونوں کام کرنے کا اختیار مجھے نہ تھا۔ مگر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میں جذباتی ہوگیا اور مجھے فوری طور پر ایک تبادلہ کرنا پڑا۔ میں مارشل لاء کی طرف سے آئی ایک درخواست کے سلسلے میں معلومات کے لئے تحصیل چونیاں کے اندرونی علاقے میں جارہا تھا کہ راستے میں ایک مقام پر بڑا ہجوم دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت بین کرتی زاروقطار روتی جارہی تھی۔ وہ اپنے سر میں راستے کی دھول بھی ڈال رہی تھی۔ اور تماشائیوں کو اپنی بپتا سنا رہی تھی جو مختصر الفاظ میں یہ تھی کہ وہ بیوہ تھی' اس کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ایک اس نے بیاہ دی تھی جس کا شوہر محنت مزدوری کرتا تھا۔ وہ سیالکوٹ کے ایک سرحدی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کی دوسری بیٹی نے کسی نہ کسی طرح میٹرک پاس کر لیا۔ وہ تھرڈ ڈویژن تھی۔ اسے کہیں ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ اسے کسی نے بتایا کہ اسے قصور کے کسی سکول میں تھرڈ ڈویژن کے باوجود ملازمت مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ قصور ضلع کی کسی پسماندہ بستی کی رہائشی ہونے کا سرٹیفکیٹ بنوالے۔ کچھ پیسے دے کر اس نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اس کی بیٹی کو اس بستی ہی کے پسماندہ علاقے کے سکول میں جو دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا' تعینات کردیا گیا۔ اچانک اس پر قیامت گزر گئی۔

اس کی بیٹی کو دو ڈاکو لے بھاگے۔ وہ دو دن تک نہیں ملی۔ تیسرے دن وہ اسی سڑک پر بے ہوش پائی گئی اسے لوگوں نے سول ہسپتال چونیاں پہنچا دیا۔ مائی بھی بیٹی کے پاس ہسپتال جارہی تھی جب وہ اس جگہ پہنچی جہاں اس کی بیٹی خون میں لت پت بے ہوش پڑی ملی تھی تو وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی۔ چند افراد تو اس کے ساتھ اس کی بیٹی کے سکول والے گاؤں ہی سے آئے تھے جبکہ کچھ مقامی لوگ بھی اکٹھے ہوگئے تھے۔ ایک مدرس نے مجھے وہاں پہچان لیا تو اس

کی زبانی مجھے پورے سانحے کے سیاق وسباق کا علم ہوا۔ میں نے واپس دفتر پہنچ کر اس واقعے کے چشم دید حالات رپورٹ کی صورت میں ایس پی صاحب کو لکھ بھیجے۔ ایک نقل مارشل لاء حکام کو بھی بھیجی۔ چونیاں کی اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر سے بھی واقعے کی رپورٹ طلب کی۔ اس نے واقعے کی تصدیق کرنے کے بعد لکھا کہ مظلومہ کو فوراً ایسی جگہ تبدیل کر دیا جائے جہاں تحفظ کے ساتھ ساتھ اسے طبی امداد بھی ملتی رہے۔ اسے چونیاں بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ایک پر جوش نوٹ لکھ کر اسے قصور کی نواحی بستی کے ایک زنانہ سکول میں تبدیل کر دیا۔

ایک ہفتے بعد بھٹی صاحب تشریف لائے۔ ان کی حالت کافی بہتر تھی۔ ان کے ساتھ ایک مدرس مرزا محمد شفیع تھے جو بعد میں ''نون'' کے طور پر مشہور ہوئے' انھوں نے بتایا کہ اگرچہ بھٹی صاحب نے خود نہیں بتایا لیکن وہ جانتے ہیں کہ بھٹی صاحب کے دوبارہ سنٹرل ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تعینات ہونے کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔ آج وہ ادھر سے فارغ ہونے کے لئے ہی آئے ہیں۔ بھٹی صاحب دفتر میں بیٹھ گئے اور مروجہ طریق کار کے مطابق ان کو کئے گئے کاموں کی رپورٹ پیش کی گئی۔ ضروری ڈاک دکھائی گئی۔ سرکاری مراسلات اور مارشل لاء احکام کی مسلیں دکھائی گئیں۔ وہ توثیقی دستخط کرتے چلے گئے۔ جب اس معلّمہ کے تبادلے کے کاغذات پر نظر پڑی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تبادلہ تم نے کیوں کیا' میں نے کہا' میں نے ''عارضی تبادلہ'' کیا ہے آپ منسوخ فرما دیں۔ پھر پوچھا کہ تبادلہ آپ نے کیوں کیا' یہ مسز محسن کو کرنا چاہیے تھا؟ وہ زنانہ مدارس کی انچارج ہیں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ آپ کا کام' تو میں ہی کرتا ہوں اور پھر مسز محسن بھی کئی دنوں سے بیماری کی رخصت پر ہیں۔

وہ خاموش ہو گئے۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر بلایا' فرمایا کہ میں اس معلّمہ کے تبادلے کی منسوخی کے احکام جاری کر دوں۔ میں نے جواب دیا کہ اب آپ کی موجودگی میں' میں یہ حکم جاری نہیں کر سکتا آپ ہی کر دیں وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے مجھے اپنے تبادلے کے متعلق بتایا اور کہا کہ مجھے ان کے فارغ ہونے کے بعد یہ احکام عبوری عرصے میں منسوخ کرنا ہوں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے اپنا چارج چھوڑا بلکہ چارج چھوڑنے کی رپورٹ پر مجھے چارج سنبھالنے والے کی حیثیت سے دستخط بھی کرنے پڑے۔ ساتھ ہی مجھے پھر سمجھایا کہ بطور انچارج میں صرف روزمرہ کی ڈاک ہی پر دستخط کر سکتا ہوں۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی اسامی کو تفویض کردہ اختیارات استعمال نہیں کر سکتا۔

''مجھے اپنے فرائض کی حدود کا علم ہے جناب''

''تو پھر آپ نے اس معلّمہ کا تبادلہ کیوں کیا؟''

''اس معلّمہ کے ساتھ درندگی ہوئی تھی۔ اسے خون میں نہلا دیا گیا تھا اس کی ماں بلک رہی تھی، مجھ سے اس کی دلدوز حالت نہیں دیکھی گئی۔ آپ دیکھتے تو آپ بھی وہی کچھ کرتے جو میں نے کیا۔'' میں نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

''میں تو کرتا کیونکہ میں بااختیار تھا...... لیکن اگر نہ کر سکتا ہوتا تو کبھی نہ کرتا۔ مارشل لاء حکام کو لکھتا، وہ حکم دیتے تو کر دیتا۔ حکومت کے کاروبار جذبات سے نہیں قوانین سے چلتے ہیں۔'' میں بحث میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔ افسران کو بحث سے بڑی چڑ ہوتی ہے، خواہ ماتحت حق پر ہی کیوں نہ ہو۔

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن اگر میں اس معلّمہ کا تبادلہ منسوخ کرتا تو میری بڑی سبکی ہوتی اور جو دعائیں وہ ماں بیٹی مجھے دے رہی تھیں وہ آہوں اور بد دعاؤں میں بدل جاتیں۔ مارشل لاء کے خوف سے پولیس نے ایک ہفتے کے اندر اندر شیطان صفت مفرور ملزموں (مفرور اس لحاظ سے کہ وہ بدمعاش جیل سے بھاگے ہوئے سزا یافتہ ملزم تھے۔) کو گرفتار کر لیا۔ ان درندوں نے بوڑھی عورت کی بیٹی کا اثاثہ بھی لوٹا تھا اور عزت بھی۔

ع...... دنیا ہے تری منتظر اے روز مکافات!

میں ان سیاہ باطن سنگدلوں کی خون آشامی پر دیر تک دل گرفتہ رہا۔ بھٹی صاحب فارغ ہو کر سٹاف کی طرف سے دی گئی چائے کی تقریب میں شمولیت کے بعد تشریف لے گئے اور میں بطورِ قائم مقام ڈی ای او کسی نئے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆

میرے ساتھ اپنی ہی تنخواہ میں ترقی پانے والے لاہور ریجن کے اساتذہ کی تعداد ۴۷ تھی۔ انہی ایام میں حکومت نے ہماری ترقی کی توثیقی چٹھی جاری کی۔ مجھے علم تھا کہ ایسی چٹھی جاری ہونے والی ہے۔ میں چٹھی کا منتظر بھی تھا۔ اس کی وصولی کے ساتھ ہی مجھے گریڈ ۱۷ ملنا تھا۔ تنخواہ ہی کی بنیاد پر سفر خرچ اور یومیہ مصارف میں بھی اضافہ ہونا تھا۔ ایک دوپہر میں دفتر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ ہائی سکول کچہ پکہ کے ہیڈ ماسٹر دین محمد صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔ ان کے چہرے پر مایوسی کا چھینٹا پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ توثیقی چٹھی آ گئی ہے، ۴۵ اساتذہ

کی ترقی کی توثیق کر دی گئی لیکن میرے اور ملک مجید کے نام کی توثیق نہیں کی گئی۔ بلکہ نمبر شمار کے حساب سے ہم دونوں کے نام درج کر کے آگے یہ لکھا گیا ہے کہ ان کی ترقی کی توثیق ان کے خلاف ایک تحقیقات کی تکمیل تک مؤخر کر دی گئی ہے۔ یہ عجیب ظالم چٹھی تھی جو ہمارے دوسرے ساتھیوں کو ترقی کی بشارت دے رہی تھی مگر مجھے اور ملک عبدالمجید کو زیرِ تفتیش ملزم ٹھہرا رہی تھی۔ ہمارا جرم کیا تھا؟ یہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ اس صورتحال سے میں اس قدر مایوس اور بیزار ہوا کہ میرا خواب وخور حرام ہو گیا۔ زبان گنگ ہو گئی اور دماغ کے آگے تاریکی پھیل گئی۔ اللہ ان رذیلوں سے سب کو محفوظ رکھے جو کسی بدنصیب کو کسی ناگہانی اُفتاد میں گھرا دیکھتے ہیں تو بجائے ہمدردی کے بغلیں بجاتے ہیں...... یکے نقصانِ مایہ دگر شماتتِ ہمسایہ!......

یار لوگوں کو نیا موضوع ہاتھ آ گیا۔ جو بھی ملتا اس منحوس چٹھی کا حوالہ دیتا اور پوچھتا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ کی تفتیش کس الزام میں ہو رہی ہے؟ ہمیں کچھ علم ہوتا تو بتاتے، مگر ساتھی تھے کہ پوچھنے سے باز ہی نہیں آتے تھے۔ وہی بٹ صاحب جو اس وقت یعنی ۱۹۷۵ء میں آڈٹ پارٹی کے سربراہ تھے۔ اور ہمارے خزانچی کی طرف سے چائے پانی نہ ملنے پر ہم سے اللہ واسطے کا بیر باندھ گئے تھے۔ اب ۱۹۷۸ء میں اسٹیبلشمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ بن چکے تھے۔ ہم نے ان سے رابطہ کیا تو انھوں نے دھڑلے سے بتایا کہ یہ سب کچھ انہی ہی کا کیا دھرا ہے۔ ہم نے عرض کیا ہمارے خلاف کوئی الزام تھا تو اس کے بارے میں حسب ضابطہ ہم سے پوچھا کیوں نہیں گیا؟ چارج شیٹ کیوں نہیں دی گئی؟ موصوف نے فرمایا کہ میں نے تو جو لکھنا تھا لکھ دیا اب یہ دوسرے شعبے کا کام تھا کہ وہ ہمارے لکھے پر کارروائی کرتا۔ بہر حال اب میں اگلی میٹنگ میں آپ کی ترقی کرا دوں گا۔

سبحان اللہ! کیا خوب وحشیانہ جواب تھا! اس جواب کے آئینے میں ہمارے محکمہ تعلیم ہی کا نہیں پورے معاشرے کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ بھلے لوگوں کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ خلق خدا کے اٹکے ہوئے کام سدھارنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہمارے معاشرے میں ایسے سفاک اور سفلے لوگ بھی شامل ہیں جو بھلے چنگے ٹھیک ٹھاک کاموں میں بھی گندگی گھولنے اور روڑے اٹکانے سے باز نہیں آتے بلکہ لوگوں کو ستانے اور سر بازار پگڑیاں اچھالنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

مردہ بدست زندہ! ہم بٹ صاحب سے کیا کہتے۔ ان کے سنگدلانہ جواب پر خاموش

ہو گئے مگر بٹ صاحب کا جواب ان کا ایک کلرک بابو عارف بھی سن رہا تھا وہ ہم سے مخاطب ہوا' اس نے کہا:

''ارے پڑھے لکھے احمقو! میں تم ماسٹر لوگوں کو ہمیشہ خبردار کرتا آیا ہوں کہ اگر تم لوگ ترقی پانا اور بڑے افسر بننا چاہتے ہو تو کلرک بادشاہ سے بنا کر رکھنا اسے کبھی خفا نہ ہونے دینا۔ کتے میں ایک کاف (ک) آتا ہے کلرک میں دو کاف (ک) آتے ہیں۔ کتے کا کاٹا آدمی باؤلا ہو جاتا ہے اور پانی سے بھی ڈرتا ہے۔ اس سے قیاس کر لو کہ پھر کلرک کے کاٹے ہوئے آدمی کا کیا حشر ہوگا؟''

پہلے کبھی ہم کلرک بابو عارف کی یہ باتیں سن کر ہنسا کرتے تھے مگر اب دم بخود تھے! اور اپنے خزانچی بابو کی فروگزاشت اور بٹ صاحب کی کینہ پروری پر لعنت بھیج رہے تھے۔ مجھ پر جو بیتی سو بیتی ملک عبدالمجید کا حال مجھ سے بھی گیا گزرا تھا۔ وہ جہاں تہاں جاتے یہی کہتے نظر آتے تھے کہ مجھے تو قاضی نے مروا دیا ہے۔ قاضی کا تو کتابوں والوں سے کوئی تعلق بھی ہے' اس نے کتابوں والوں کے مرغے اڑائے ہوں تو معلوم نہیں مگر میں نے تو کبھی کسی سے ایک پکوڑا بھی نہیں کھایا۔ میں تو کسی کام سے مفتی صاحب کے پاس گیا تھا کہ قاضی نے مجھے خواہ مخواہ کتابوں کی خریداری والی کمیٹی کا ممبر بنا ڈالا۔ افسوس! آج اس ممبری نے مجھے کس انجام کو پہنچا دیا ہے کہ مفت میں مجرم ٹھہرایا جا رہا ہوں اور ترقی الگ کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔ اچھا بھئی قاضی! تیرا بھی بھلا ہو اور اے بٹ صاحب تیرا بھی...... بھلا ہی ہو۔

سچی بات یہ ہے کہ میں تو لوت کی گرفت میں تھا' ملک عبدالمجید خواہ مخواہ روند ہن میں آ گئے تھے۔ بٹ صاحب کی خاطر تواضع اور ناز برداری میں کوتاہی خزانچی نے کی تھی جو کانٹا بن کر بٹ صاحب کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ ہم بٹ صاحب کے کینے کی چکی میں خوامخواہ پس رہے تھے۔ بہر حال ہم بٹ صاحب کے دل سے پرانا کانٹا نکالنے لگے۔ ہم نے بٹ صاحب کو انارکلی لاہور میں دیسی گھی کے مرغن کھانے کھلائے اور ان کی روٹھی ہوئی انا کو نہ جانے کتنے پھلوں کا رس پلایا۔ تب کہیں ان کا مزاج ٹھکانے پر آیا۔ خدا خدا کر کے اگلا اجلاس ہوا تو انھوں نے ہماری ترقی کی توثیق کرا دی۔ ہم موصوف کے اس لطف و کرم سے نہال ہو گئے مگر وائے بر حالِ ما!

اگرچہ ہاتھ میں ساغر ہے لیکن کیا بھروسہ ہے
ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے میں!

جس دن ہماری ترقی کی توثیق ہوئی اس دن کمیٹی کے اجلاس میں پرانا سیکشن افسر سکولز' عبداللہ شاہ شریک نہیں ہوا بلکہ اس کی جگہ ایک نیا نیا سیکشن افسر بننے والا نوجوان افتخار شاہ شریک اجلاس ہوا۔ اس نو وارد اور نو آموز نوجوان کو دفتری قاعدوں' ضابطوں اور محکمانہ روایتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے ہماری ترقی کی توثیقی چٹھی جاری کرنے کی بجائے ہمارے نام مزید توثیق کے لئے آگے ایس این جی اے ڈی کو بھیج دیئے۔ بس سیکشن افسر کی یہ غلطی ہماری ترقی کے راستے میں نئے سرے سے ہمالیہ بن گئی۔

اب ہم پوچھتے کہ اتنے دن کمیٹی کے اجلاس کو ہو چکے' توثیقی چٹھی ابھی تک کیوں جاری نہیں ہوئی۔ ہم افتخار شاہ کے پاس گئے' بٹ صاحب کو بھی بھیجا' افسران سے بھی ٹیلیفون کرائے یہاں تک کہ عبداللہ شاہ کو ڈھونڈ لائے۔ انھوں نے افتخار شاہ کو ایسے کئی حوالے دیئے کہ کمیٹی کی توثیق کے بعد سیکشن افسر (سکولز) صرف ترقی کے احکام جاری کرتا ہے۔ معاملے کو اوپر برائے توثیق وتصدیق نہیں بھیجتا۔ اب افتخار شاہ بھی بٹ صاحب کی طرح یہی کہتا تھا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے لیکن وہ بھیجے ہوئے کاغذات کو خود جا کر لانے سے معذوری کا اظہار کرتا۔ اس نے ہمیں ایک چٹھی لکھ کر دی کہ ہم خود ایس این جی اے ڈی سے کاغذات لے آئیں تو وہ فوراً توثیقی چٹھی جاری کر دے گا۔

بڑی تگ و دو کے بعد ہم دونوں ایس این جی اے ڈی کے سیکشن افسر سے ملے۔ وہ ملک صاحب کہلاتے' تھے قانونی کیڑے نکالتے تھے۔ وہ سیکرٹریٹ کے عقبی دروازے کے قریب بڑے سے کمرے میں مسلوں اور بڑی بڑی کتابوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہماری بات سنی' ہمیں حق بجانب قرار دیا اور فرمایا" آپ لوگ سامنے الماری میں مسلوں کی تین قطاریں دیکھ رہے ہیں' ان میں ہی کہیں تم لوگوں کی مسل بھی پڑی ہو گی۔ ان مسلوں میں چھوٹے بڑے افسروں کی سروس کے معاملات ہی ہیں۔ میں باری باری بمشکل ایک دو مسلیں روزانہ کے حساب سے نکالتا ہوں۔ اگر آپ کی مسل آئی ہے تو اسے باری آنے پر ہی دیکھوں گا۔ تب ہی واپس کروں گا۔ میں انصاف کرتا ہوں' بہت مصروف آدمی ہوں۔"...... اُس کی یہ بات سن کر ہمیں بڑا اچھا لگا مگر ہم سوائے صبر کے اور کیا کر سکتے تھے۔

ہم نے پوری صورتحال افتخار شاہ کے گوش گزار کی۔ اس نے پھر تاسف کا اظہار کیا۔ ہم بھی جس افسر سے ملتے اسے اس نئی بپتا کی داستان سناتے مگر کوئی کیا کر سکتا تھا؟ اس چخ چخ کا

فائدہ ہمیں صرف اس قدر پہنچتا کہ ہمارے دل کا غبار نکل جاتا۔ یہ خیال ہمیں تسلی دیتا کہ چلو ہم سترہویں گریڈ پر نہیں لیکن سترہویں گریڈ کی آسامیوں پر تو ہیں ہی۔

ع......تم نہ سہی، تمہارا انتظار ہی سہی

☆☆

ہمارا معمول اپنی اپنی آسامیوں پر کام کرنے ساتھ ساتھ ہفتے میں ایک بار سیکرٹریٹ میں حاضری دینا بھی ہو گیا۔ بٹ صاحب اور افتخار شاہ نے ہمیں ڈس لیا تھا۔ خدا بھلا کرے شبیر احمد کا جو جونیئر کلرک سے ترقی کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ ہوا تو اپنی آسامی کے کام کا جائزہ لینے کے دوران اس نے ہماری مسلیں بھی پڑھیں اور اسے کہیں کہیں ہماری عرضداشتیں بھی پڑی نظر آئیں۔ اس نے بٹ صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، بٹ صاحب نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ شبیر احمد نے کہا ان دونوں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ بٹ صاحب نے کہا آگے دیکھو کہ افتخار شاہ نے کیا کیا ہے؟ قواعد وضوابط، محکمانہ قوانین اور سرکلرز کے مکمل علم اور ان کے استعمال کے حوالے سے شبیر احمد کی شہرت مسلمہ تھی۔ ہر پیچیدہ معاملہ اسی کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ وہ ہر گتھی کو سلجھاتا تھا اور ہر فیصلہ مثبت سوچ کے تحت کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے قلم نہیں اٹھایا۔ کوئی اپنی موت آپ مرتا ہوا پایا جاتا تو وہ اسے بھی دوا دینے کی کوشش کرتا تھا۔ محکمہ تعلیم کی کلرک برادری میں وہ واحد آدمی تھا جو حق کو حق کہتا۔

اس نے ہم مظلوموں پر مہربانی کی اور ہمارا معاملہ اگلی میٹنگ میں رکھا۔ افتخار شاہ کی غلطی واضح کی اس طرح ہمارے معاملے نے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۳ء تک طول کھینچا...... یہ میری لوت کا خمیازہ تھا۔ تاہم شبیر احمد کو سلام...... ایس این جی اے ڈی کے قانون دان سیکشن افسر کے ہاں تو ہمارے معاملے کی باری ہی نہیں آئی۔ اس فیصلے کی آمد تک یہ قانون بن چکا تھا کہ آئندہ افسروں کی ترقی ان کی اپنی تنخواہ اور گریڈ پر نہیں ہوا کرے گی۔ جملہ معاملات ترقی دینے سے پہلے طے ہوں اور جس روز ترقی کا نوٹیفکیشن ہوگا اسی دن سے ترقی شمار ہوگی۔ اس لحاظ سے ہم دونوں ۵ سال جونیئر ہو جاتے تھے۔ بارے یہ کٹھن گھاٹی نیک نہاد شبیر احمد نے اپنی فراست سے طے کرائی، پورے پنجاب میں ترقی پانے والوں کا نوٹیفکیشن جاری ہوا تو اس میں ملک عبدالمجید اور میرا نام بھی سرفہرست تھا۔

☆☆

نئے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر مسٹر اکرام الحق جڑانوالہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی اور میری پہلی ملاقات ڈائریکٹر صاحب کے دفتر میں ہوئی۔ ان کی نظر بے حد کمزور تھی۔ وہ بھلے آدمی تھے لیکن نظر کی کمزوری اور شریفانہ مزاج کی وجہ سے وہ مقامی اساتذہ کی سیاست میں الجھ گئے۔ دفتری کاموں میں مجھے نظر انداز کرنے لگے۔ وہ میرے دورے کا پروگرام جلدی جلدی منظور کر دیتے کہ میں دورے ہی پر رہوں تو بہتر ہے۔ وہ دفتری معاملات خود ہی نمٹا دیتے تھے۔

☆☆

میں جب ضلع قصور آیا تھا تو وہاں پنجاب ٹیچرز یونین کے انتخابات ہونے والے تھے۔ بنگاہ بلوچاں کے ملک محمد اشرف جے وی کے مقابلے میں مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر نور محمد میوٴ ایم اے بی ایڈ صدارت کے امیدوار تھے۔ جب میں لاہور وسطی کا اے۔ ڈی۔ آئی۔ تھا تو نور محمد وہاں نئے مڈل سکول شہزادہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کا تقرر بھی نیا نیا ہوا تھا۔ بطور ہیڈ ماسٹر مڈل سکول شہزادہ کے بھی ان سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ وہ پولٹیکل سائنس میں ایم اے تھے اس لئے ان میں سیاسی رجحانات پائے جاتے تھے۔ وہ بعض اساتذہ کے چھوٹے موٹے کام لے کر آتے تو میں وہ کام کر دیتا اگر کوئی کام ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے کرنے کا ہوتا تو وہ بھی کروا دیتا تھا۔ بعد کو وہ تبادلہ کروا کر پتوکی کے قریب اپنے گاؤں آ چکے تھے۔ اور وہیں تعینات تھے۔
انھوں نے جب میری قصور آمد کا چرچا سنا تو کسی مدرس سے پوچھا:
''کون سے قاضی صاحب ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر آ رہے ہیں؟'' مدرس نے میرا حوالہ دیا۔
''اچھا وہ قاضی صاحب' وہ تو اپنے ہی قاضی صاحب ہیں۔'' اس جملے میں جس قدر اپنائیت رچی ہوئی ہے وہ اتنی ہی اپنائیت سے مجھے ملتے رہے۔ پرسکون حالات تھے' وقت ہموار قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک نیا فتنہ جاگ اٹھا۔ پنجاب ٹیچرز یونین کے ضلعی صدر کے انتخاب کے چکر میں پنجابی اور میوٴ برادریوں کی دو پارٹیاں بن گئیں۔ انتخاب کسی بھی نوعیت اور کسی بھی سطح کا ہو' معیارِ انتخاب فرد کی اہلیت' لیاقت' صلاحیت' حق شناسی اور حسن کردار ہونا چاہیئے' رنگ ونسل' حسب ونسب' خاندان' نام' برادری اور قومیت کے بت وہ مہلکات ہیں جنہوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ کسی فرد یا جماعت کا ان مہلکات میں مبتلا ہونا نحوست اور نامرادی کی علامت ہے مگر جب اساتذہ کرام جیسا پڑھا لکھا طبقہ اس دام میں گرفتار ہو تو یہ

قیامت ہے۔ میں نے اساتذہ کی قابل تعظیم تنظیم کے انتخاب میں برادری کے بتوں کی پوجا ہوتے دیکھی تو دل کو بڑی ٹھیس لگی۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ ہمارے اساتذہ بھی ذات برادری کی جاہلانہ عصبیت کا شکار رہیں گے تو ہمارے نونہالوں' طلبہ و طالبات کا کیا بنے گا اور ان کی ذہنی پرورش و پرواخت کس نوعیت کی ہوگی۔ یہ تو کارِ طفلاں تمام خواہد شد والا المیہ ہوگا۔ زندگی میں نہ جانے ایسے کتنے مواقع اور مرحلے آتے ہیں جب آدمی ہلاکت کے گڑھے دیکھتا ہے تو بے اختیار انھیں پاٹنا چاہتا ہے مگر پاٹ نہیں پاتا اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا ہے۔ ٹھیک یہی حالت میرے دل کی تھی میں دائیں بائیں کے محترم اساتذہ کی عصبیتوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے روکنے پر قادر نہیں تھا۔

کچھ میوٴ حضرات ملک محمد اشرف کے حامی بھی تھے اور کچھ پنجابی مدرسین نور محمد کے ساتھی تھے۔ میری راہ و رسم دونوں امیدواروں کے علاوہ دونوں گروپوں کے بے شمار مدرسین سے تھی۔ میوٴ بڑی جوشیلی اور جنگجو قوم ہے۔ اسی مناسبت سے ان کو مہاجرت کے بعد سرحدی اضلاع میں آباد کیا گیا۔ قائد اللغات میں ہے کہ میوٴ بڑی سخت جان اور محنتی قوم ہے۔ ایک محاورہ بھی لکھا ہے کہ ''میوٴ موا مت جانئے واں کا تیجا ہو'' یعنی جب تک میوٴ کے قل نہ ہو جائیں' تب تک اسے مردہ نہ سمجھا جائے۔ گویا میوٴ قوم موت کو بھی چکر دے جاتی ہے۔ میرے پاس بہت سے میوٴ حضرات کا آنا جانا تھا۔ ان میں سے بعض کے ساتھ مختلف معاملات میں لین دین بھی تھا۔ وہ تہواروں پر بطور تحفہ میرے بچوں کے لئے دودھ' گنے کا رس اور اسی قسم کی دیگر اشیاء بھی لاتے تھے۔ ان میں ایک یٰسین خاں ایس وی مدرس تو میوٴ زبان کا شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنی دو تصنیفات ''میوٴ سبھا'' اور ''میوٴ شاعری'' بھی میری نذر کی تھیں۔

حالات اپنے رخ پر سبک روی سے بہہ رہے تھے کہ اچانک بھائی پھیرو پرائمری سکول کے میوٴ بزرگ ہیڈ ماسٹر کے بارے میں کچھ شکایات موصول ہوئیں۔ بھٹی صاحب نے مجھے تحقیقات کے لئے بھیج دیا۔ واپسی پر میں نے جو رپورٹ دی اسے پڑھ کر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر نے مجھے معاملات کے حل کی تجویز پیش کرنے کو کہا۔ میری تجویز پر ہیڈ ماسٹر کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ محمد یوسف نامی ایک پنجابی مدرس کو ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔ نور محمد صاحب تک رپورٹ پہنچی۔ وہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر سے ملا کہ یہ غلط اقدام کیوں کیا گیا ہے؟ یہ سراسر پارٹی بازی ہے۔ بھٹی صاحب نے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے ڈپٹی ایجوکیشن افسر کی رپورٹ

اور تجویز پر کیا ہے۔ نور محمد نے مجھ سے پوچھا تو میں اپنی رپورٹ اور تجویز سے انکار نہ کر سکا۔ نور محمد نے کہا کہ یہ سب کچھ ملک محمد اشرف کے اشارے پر ہوا ہے۔ محمد یوسف' ملک اشرف کا کارکن ہے اور میں نے ملک اشرف کی حمایت کر کے میو اساتذہ کے کاز کو نقصان پہنچایا ہے۔ پنجابی میو کا جاہلانہ قضیہ اس قدر زور شور سے اٹھا کہ اس کے آگے اسمبلی کے الیکشن بھی ماند پڑ گئے۔ نعرے لگے دیگیں پکیں' تانگے اور بیل گاڑیاں چلیں' کیمپ لگے' جلسے ہوئے' جلوس نکلے۔ یار لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ نور محمد ایم۔ اے بی۔ ایڈ تھا۔ اسے میو برادری کی بنیاد پر سب میو اساتذہ نے ووٹ دیئے۔ وہ کامیاب ہو گیا۔ کامیابی کے بعد اس نے جو کابینہ بنائی وہ بھی میرے خلاف ہو گئی۔ اس میں اس نے سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اپنے کیڈر کے بعض پنجابی اساتذہ کو بھی شامل کر لیا۔ وہ بھی اسی کی زبان بولتے تھے۔

میرے خلاف تحریک چلی کہ مجھے میرے عہدے سے ہٹا دیا جائے کہ میں پارٹی باز' رشوت خور اور تفرقہ ڈالنے والا افسر ہوں۔ پنجاب ٹیچرز یونین کے وفود ڈائریکٹر صاحب سے لے کر سیکرٹری تعلیم تک سبھی سے ملے۔ میرے خلاف درخواستیں سیکرٹری کے دفتر میں سیکشن افسر محمد اسلم کے پاس جمع ہو گئیں۔ انور بٹ نامی ایک اسسٹنٹ محکمہ تعلیم نے مجھے رازداری سے بتایا کہ میرے خلاف محمد اسلم سیکشن افسر کے پاس بہت کچھ لکھا ہوا آیا ہے۔ اور وہ مجھے بلاتا ہے۔ میں نے کہا اچھا آؤں گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یونین کے عہدیداروں نے میرے خلاف یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ میں سولہویں گریڈ میں کام کرتے ہوئے سترہویں گریڈ کی اسامی کا چارج سنبھالے ہوئے ہوں۔ یہ سراسر زیادتی ہے کہ سترہویں گریڈ کے ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں میں سے کسی کو اہم اسامی نہیں دی گئی اور ایک زیر تحقیق اہلکار کو ڈپٹی ایجوکیشن افسر لگا رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

☆☆

نور محمد میرے لئے معمہ بن گیا۔ میرے اس کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ لاہور میں بھی اور قصور میں بھی' میں جس مڈل سکول کا معائنہ کرتا اس سکول کا ہیڈ ماسٹر نور محمد کو صدر پنجاب ٹیچرز یونین کے حوالے سے بلاتا۔ ہم اکٹھے اٹھتے بیٹھتے' کھاتے پیتے اور تبادلۂ خیال کرتے۔ وہ پتوکی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا تو اس کے سکول کا معائنہ بھی میں نے کیا کیونکہ بھٹی صاحب اسے وقت دے کر نہیں پہنچ پائے تھے۔ میں کسی جگہ کیمپ کرتا تو وہ بھی وہیں ٹھہر جاتا۔ صدر کی

حیثیت سے لوگ اسے اپنے معاملات پیش کرتے' میں ان کے حل میں اس کی پوری پوری مدد کرتا تھا۔ مثلاً اس نے کہا کہ پتوکی سب ڈویژن کے مدرسین کی سروس بکیں غیر مکمل پڑی ہیں تو میں نے اسی دفتر میں دو دن قیام کر کے سروس بکیں مکمل کر ڈالیں جس دفتر سے سراج دین کے ہاتھوں زدوکوب ہونے کی بھیانک یاد وابستہ تھی۔

ایک میوٗ رحمت اللہ بی ایڈ بڑا محنتی استاد تھا۔ اس نے اپنی ذاتی جدوجہد سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس کا مدرسہ میں نے نور محمد کے کہنے پر بطور اے ڈی آئی ترقیات مدارس کے قومی تحویل میں لئے جانے سے چند روز پیشتر ہی بطور مڈل سکول رجسٹرڈ کرایا تھا۔ اس رجسٹریشن کی طفیل وہ مدرسے کا ہیڈ ماسٹر بن گیا تھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ نور محمد قاضی جیسے مہربان اور متوازن افسر کے خلاف کیوں ہو گیا ہے؟ میرے خیال میں میری مخالفت اس کی سیاسی حکمت عملی تھی۔ اور وہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کی طرح مجھے بھی دبا کر رکھنا چاہتا تھا۔ میری اس سے کوئی لڑائی نہیں تھی۔ میں انتظامیہ میں کافی وقت گزارنے کی وجہ سے قواعد وضوابط کے مطابق چلنا پسند کرتا تھا جبکہ غرض منداساتذہ حدود پھلانگ جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ مگر میں تجاوز پسند اساتذہ کے کام نہیں آسکتا تھا۔

رحمت اللہ سمیت میوٗ اساتذہ نور محمد کو ضدی انسان کہتے تھے۔ ایک معلم نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میوٗ برادری نور محمد کو پلٹو خان کہتی ہے۔ وہ آپ کی دوستی سے پلٹا کھا چکا ہے۔ اب دوسرا پلٹا کھانے میں وقت لگے گا۔ میں ذاتی طور پر نور محمد کو جانتا تھا۔ وہ واقعی ضدی تھا۔ میری بابت اسے کئی بڑے افسروں نے سمجھایا۔ مولانا غفاری جو پنجاب ٹیچرز یونین کے مرکزی صدر تھے' مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے اور دہلی مسلم ہوٹل انارکلی لاہور میں میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے بھی نور محمد سے کہا کہ قاضی صاحب مہذب اور مہربان آدمی ہیں' مدت سے ٹیچرز یونین سے وابستہ چلے آرہے ہیں لیکن نور محمد کی ضد کا ٹیلہ نہیں ٹوٹا۔

میں ایک مرتبہ سیکشن آفیسر سے بھی ملا اور اسے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا کہ مجھے تو سیکرٹری صاحب نے لکھ بھیجا ہے کہ ڈپٹی۔ ڈی او قصور کو تبدیل کر دو۔'' میں نے سیکشن افسر سے کہا کہ انھیں اپنے سیکرٹری صاحب کو مشورہ دینا چاہیے کہ وہ پہلے میرے خلاف تحقیقات کرائیں۔ اگر میری کوئی خطا ثابت ہو تو پھر کوئی فیصلہ کریں۔ اگلے دن میں دفتر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ انور بٹ آ گیا۔ کہنے لگا کہ تم نے سیکشن افسر کے اختیارات کو سمجھا ہی نہیں۔ میں

نے اسے بتایا کہ میں یہاں سولہویں گریڈ میں سیکشن افسر کا ڈسا ہوا بیٹھا ہوں لٰہذا اس کے اختیارات کو خوب سمجھتا ہوں لیکن آپ جانتے ہیں کہ مارشل لاء لگا ہوا ہے۔ ہر کام رکا ہوا ہے۔ دینے دلانے کے لئے کوئی 'پیدا' نہیں ہو رہی۔ تقرر اور تبادلوں پر پابندی ہے...... اسی دوران کمانڈنٹ مارشل لاء کے دفتر سے ٹیلی فون آیا کہ میں تیار رہوں کرنل یونس تشریف لا رہے ہیں۔ یہ اطلاع پا کر انور بٹ فوراً دفتر سے کھسک گیا۔

☆☆

میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی طرف سے سول ڈیفنس کورس میں نامزد کیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کو کرنل یونس صاحب نے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے فون کیا تھا کہ وہ سکولوں کے بارے میں ایک تفصیلی تحقیقات کرنے کے پابند کئے گئے ہیں لٰہذا کسی اچھے ضلعی افسر تعلیم کی ڈیوٹی ان کے ساتھ لگائی جائے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کو بتایا تھا کہ ضلع میں دو ہی مرد گزیٹیڈ آفیسر انتظامیہ ہیں۔ ایک ڈی۔ ای۔ او ہے اور دوسرا اس کا ڈپٹی...... لٰہذا میری ڈیوٹی کئی دن سے کرنل یونس کے ساتھ تھی۔ جب انھیں کہیں مفصلات میں جانا ہوتا تو وہ مجھے پابند کر دیتے۔ وہ مجھے جیپ میں دفتر سے لے لیتے اور میں ان کی رہنمائی ان سکولوں کی طرف کرتا جن کے نام ان کے پاس ایک فہرست کی صورت میں درج تھے۔ وہ بڑے شائستہ مزاج کرنل تھے۔ مطالعہ کا ذوق رکھتے تھے۔ میرے ساتھ کام کی باتوں کے علاوہ بھی خوب گپ شپ کرتے تھے۔ میں جتنی دیر ان کے ساتھ رہتا بہت خوش رہتا۔ ان کی سنتا اپنی سناتا۔ وہ کبھی کبھی اپنے صوبیدار سے بھی مذاق کر لیتے لیکن ڈرائیور کو ہمیشہ ڈانٹتے۔ اسے راستے پر کڑی نظر رکھنے کو کہتے اور گاڑی ہانکنے کے عمل میں نقص بھی نکال دیتے تھے۔

مجھے سول ڈیفنس کے ایک افسر کی طرف سے کورس سے غیر حاضری کی جواب طلبی کا پروانہ موصول ہوا۔ میں نے اس کا ذکر کرنل صاحب سے کیا۔ انھوں نے پروانہ مجھ سے لیتے ہوئے صوبیدار کو کہا۔ "دیکھو! یہ کیا کہتا ہے اسے اپنے لفظوں میں سمجھا دو۔ مجھے انھوں نے کسی بھی قسم کا جواب دینے سے منع کر دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب کورس ختم ہوا تو بغیر میری شمولیت کے اور بغیر کسی امتحان کے' مجھے اول درجے میں سول ڈیفنس کورس پاس کرنے کا سرٹیفکیٹ موصول ہوا۔ سول ڈیفنس والوں نے مجھ پر یہ ناجائز مہربانی کیوں کی؟ یقیناً یہ مارشل لاء کی کرامت اور کرنل صاحب سے میری وابستگی کا کرشمہ تھا۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے مگر اس

سے ہمارے محکموں کے افسران بالا کی ذہنی ساخت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کرنل صاحب کے ساتھ ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے مجھے تین ماہ بیت گئے۔ اس دوران مجھ پر ایسی کئی باتیں منکشف ہوئیں جو خواتین کی تعلیم کے عمل پر منفی اثرات مرتب کر رہی تھیں۔ مثلاً:

۱) زنانہ سکولوں میں استانیوں کی غیر حاضری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

۲) معلمات کی زچگی کی چھٹیوں کو مہینوں گزر جاتے تھے لیکن انھیں اس عرصے کی تنخواہ دی جاتی تھی اور نہ ہی ان کی رخصت منظور کی جاتی تھی۔

۳) کئی سکول استانیوں کی کمی کی وجہ سے بند پڑے تھے۔

۴) خواتین دورہ کرنے کی ڈیوٹی پسند نہیں کرتی تھیں لہٰذا خواتین کے سکولوں میں معائنہ جات کا کوئی نظام نہیں تھا۔

۵) سکولوں کی عمارات اور ملحقہ زمینیں مقتدر حضرات نے دبا رکھی تھیں۔ نوے فیصد عمارات ہمارے کھڑے کھڑے خالی کر دی گئیں۔

۶) کئی کھیل کے میدانوں میں سکولوں کے عملے نے کاشتکاری کر رکھی تھی۔ کرنل صاحب کی بھبھک ملزموں کو جی جی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

۷) صدر معلمات نے اپنی ذاتی 'ٹک شاپس' کھولی ہوئی تھیں۔ جواب طلبی پر وہ منمنا کر رہ جاتی تھیں۔

۸) صدر معلمات کو نصاب کا علم تک نہیں تھا۔ کسی سکول میں ٹائم ٹیبل، چارٹس، نقشہ جات اور رفتار ترقی کے رجسٹر بھی نہیں تھے۔ اگر تھے تو ان کے مندرجات ٹھیک نہیں تھے۔

۹) بعض معلمات کی جگہ ان کی بہنیں اور کزن وغیرہ ڈیوٹی دے رہی تھیں۔

۱۰) کئی سکول عرصے سے بند تھے لیکن معلمات دھڑلے سے تنخواہیں لے رہی تھیں۔ مرکزی مدارس کی معلمات لاعلمی کا اظہار کرتی تھیں کہ انھیں کیا خبر کہ کوئی سکول بند پڑا ہے۔ وہ صورتحال کی ذمہ داری دفتر پر ڈال دیتی تھیں۔

کرنل صاحب اکثر کہتے "ڈپٹی صاحب! بڑا گند ہے بھئی صاف کرو"۔ میں جواب دیتا کہ یہ گند ملٹری ہی صاف کر سکتی ہے۔ وہ ہنس کر کہتے: ملٹری کو گند صاف کرنے پر لگا دو اور سرحدوں پر استادوں اور استانیوں کو بھیج دو۔ میں نے انھیں اس خاتون کا قصہ بھی سنایا جس کی بیٹی کے ساتھ مفرور بدمعاشوں نے ہولناک زیادتی کی تھی۔ اس پر کرنل صاحب نے صوبیدار کو

کہا کہ حرام خور تھانیدار کو بلا کر پوچھو کہ اس نے کیا کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ بدمعاش مفرور قیدی تھے اور پکڑے جا چکے ہیں تو انھوں نے صوبیدار کو حکم دیا کہ انھیں ملٹری کورٹ میں پیش کراؤ اور کوڑوں کو سزا دلاؤ

تین ماہ بعد کرنل یونس کسی اور یونٹ میں تبدیل کر دیئے گئے۔ یوں ایک دلفریب داستان ختم ہو گئی۔ ان کی تحقیقات بھی مکمل ہو چکی تھی وہ زنانہ مدارس کی بے ضابطگیاں دیکھنے کے علاوہ اور کیا مشاہدہ کرتے تھے اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔

☆☆

میرے خلاف پنجاب ٹیچرز یونین کے صدر کی مہم قدرے سرد پڑ چکی تھی۔ یا شاید میرے محسوسات بدل گئے تھے۔ میں پچھلے تین ماہ دفتر میں کم ہی بیٹھا تھا۔ مجھے کسی نے ایک کارڈ بھیجا جس پر لکھا تھا ۔

قاضی! ذرا بچ کے چلنا اگر جان ہے پیاری
پستول ہے، بندوق ہے، تلوار ہے نور محمد

سچی بات ہے، یہ پڑھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں مڈل سکولوں کے معائنے اس طریقے سے کر رہا تھا کہ میں انہی سکولوں میں جاتا تھا جہاں کی فضا، ہیڈ ماسٹر اور عملہ میرے موافق ہوتا۔

میں نے ۲۶رفروری ۱۹۷۹ء کو مڈل سکول جوڑہ کا معائنہ رکھا۔ پروگرام یہ طے کیا کہ رات کو میں مڈل سکول چوہیڑ یوالہ میں قیام کروں گا۔ وہاں صبح صبح معائنہ کر کے میں دفتر پہنچ جاؤں گا۔

۲۶رفروری کو جب میں گھر سے دورے پر روانہ ہونے کے لئے ناشتہ کر رہا تھا تو میری والدہ نے کہا کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کے بچوں سے بہت اداس ہیں لہٰذا اب وہ سمبڑیال جانا چاہتی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے بھتیجے کے ہاں رحمان پورہ جائیں گی۔ میں نے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی''۔

میں جوڑہ میں دوپہر کا کھانا کھا کر چوہیڑ یوالہ پہنچ گیا۔

چوہیڑ یوالہ کا ہیڈ ماسٹر رحمت علی (کاکا) ایس وی میرا اور قادر بخش کا مشترکہ دوست تھا وہ مالی معاملات میں کئی بار میرے کام آیا تھا۔ کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ جب میں قصور میں اے۔ڈی۔آئی تھا تب سے ہی یہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ ان دنوں رحمت علی مڈل سکول

جوڑہ میں ایس۔ وی مدرس تھا۔ علامہ صدیق ارشد سے اس کی کھٹ پٹ رہتی تھی۔ جب میں لاہور میں ترقیات کا اے۔ ڈی۔ آئی تھا تو میں نے ذاتی دلچسپی لے کر خود پور گاؤں کے بے چراغ ہو جانے پر وہاں کے مڈل سکول کو چوہیڑ یوالہ منتقل کرا دیا تھا اور خصوصی طور پر ذاتی دلچسپی ہی سے رحمت علی کو وہاں کا ہیڈ ماسٹر بنوایا تھا۔ لہٰذا رحمت علی کی طرف ایک شاندار دعوت بقایا تھی۔ اسی دعوت کے سلسلے میں وہ میرے قیام کا بندوبست کر رہا تھا کہ اچانک میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے گھر لاہور چلا جاؤں اور اگلے روز گھر ہی سے سیدھا چوہیڑ یوالہ پہنچ جاؤں۔ رحمت علی اور اس کا عملہ میرے اس نئے پروگرام سے ناراض ہوئے۔ قادر بخش بھی صرف میری وجہ سے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی رک جانے کو کہا لیکن میرے دل سے گھر لوٹ جانے کی خواہش نہیں مٹی اور میں لاہور چل دیا۔ لوت میرے ہمزاد کی طرح میرے ساتھ ہی تھی لیکن پچھلے کئی ماہ سے مجھے اس کا شعور نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی وجہ سے پریشانیوں میں تو گھر جاتا تھا لیکن اللہ کی مہربانی سے میں محفوظ ہی رہتا تھا۔ اللہ کی ذات پر میرا پختہ ایمان میری حفاظت کرتا۔ چوہیڑ یوالہ سے نکلتے ہی میرا دل اپنا بوجھ ہلکا محسوس کرنے لگا۔

کوئی ساڑھے تین کے قریب بس مزنگ چونگی پہنچی۔ وہاں ایک بہت بڑے ہورڈنگ پر اس وقت کی مشہور اداکارہ ممتاز کا سراپا بڑے خوبصورت ماحول میں نظر آ رہا تھا۔ اس فلم کے متعلق مشہور تھا کہ وہ غیر ممالک میں فلمائی گئی ہے۔ غیر ممالک کی جھلکیاں دیکھنے کی خاطر میں مزنگ چونگی پر ہی اتر گیا اور سیدھا سینما ہال میں جا داخل ہوا۔

میری والدہ اور میری اہلیہ کی ایک پھوپھو عرصہ دراز سے فالج کی مریض چلی آ رہی تھیں۔ گھر پہنچا تو سیدھا باورچی خانے گیا۔ اہلیہ نے کھانا دیا اور ساتھ ہی کہا کہ فون آیا تھا پھوپھو نذیر فوت ہو گئی ہیں۔ میں نے دوسرا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری سمت سے میرا ماموں زاد بول رہا تھا کہ پھوپھو جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ پہلے بھی فون کیا تھا آپ گھر پر نہیں تھے۔ میری والدہ ہی میرے ماموں زاد کی پھوپھو تھیں۔ میں نے فوراً پوچھا کیا میری ماں چل بسی ہے؟"

ماموں زاد نے کہا "ہاں!" یہ سنتے ہی یوں لگا جیسے زمان و مکان کی گردش رک گئی ہے اور میرے اردگرد ہر چیز ساکن ہو گئی ہے۔ لقمہ حلق میں پھنس گیا۔ گریہ اٹھا، میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اہلیہ بھاگی بھاگی آئی۔ اسے اب پتہ چلا کہ کون چل بسا ہے۔ وہ بھی رونے لگی۔

سارا گھرانہ رونے لگا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خورونوش کے سارے تقاضے بھول گئے۔ میں رحمان پورہ بھاگا۔ راستہ ہی یاد نہ رہا۔ مدرسہ قاسمیہ کا نام بھی یاد نہ آیا۔ جس کے قریب ہی ماموں زاد کا گھر تھا خیریت گزری' میرا بیٹا سڑک پر مل گیا ورنہ ماموں زاد کا گھر ہی نہ ملتا۔ پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ دل گرفتہ' اُفتاں وخیزاں' ماموں زاد کے ہاں پہنچا۔ میں نے دنیا کی نیک ترین خواتین کے جو قصے پڑھے اور سنے تھے' میری مقدس ماں یقیناً ان میں سے ایک تھیں۔ جس مہربان ماں نے ہمارے آرام وآسائش کے لئے اپنے اوپر ہر راحت حرام رکھی' اس کا مقدس اور مطمئن چہرہ سامنے تھا۔ پہلے یہ مشفق چہرہ مجھے دیکھتا تھا' تو خوشی سے جگمگانے لگتا تھا آہ! آج اس مقدس چہرے پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور مجھے ہر گھڑی دعائیں دینے والے ہونٹوں پر خاموشی کی ابدی مہر لگ چکی تھی۔

ع.....عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

کیا بتاؤں مادر مہربان کو کفن میں لپٹا دیکھ کر کیا گزری۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کی مضبوط ترین طناب ٹوٹ گئی ہے اور میں زندگی کے آشوب اور آزمائش میں تنہا رہ گیا ہوں۔ والدین کتنے ہی ضعیف اور سالخوردہ ہو جائیں بہرحال اللہ کی رحمت کا نشان ہوتے ہیں اور ان کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے نکلنے والی دعائیں اولاد پر کوئی ہراس طاری نہیں ہونے دیتیں۔

مجھے بتایا گیا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ یکا یک لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ پتہ چلا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ ماموں زاد کے سسر طبیب تھے۔ انھوں نے فوراً خمیرہ کھلایا۔ تھوڑا سا افاقہ ہوا' مگر پھر سناؤنی آ گئی اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں اپنے آپ کو لعن طعن کر رہا تھا کہ میں کس قدر شیطان صفت انسان ہوں کہ میری ماں اللہ کو پیاری ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی اور میں یورپ کے مناظر میں ناچتی' گاتی اور عشق پیچے لڑاتی ایک ایکٹریس کو دیکھ رہا تھا۔ میں کئی دن تک اپنے آپ سے نفرت کے احساس میں مبتلا رہا۔

رب کریم انھیں کروٹ کروٹ اپنی رحمتوں سے شاداب رکھے۔

کیا بتاؤں مرحومہ کس تڑپ اور لگن سے مجھے نماز پڑھنے کی تلقین فرماتی تھیں۔ میں ایسا ڈھیٹ تھا کہ انھیں خوش کرنے کے لئے ان کے سامنے دکھاوے کی نماز پڑھ لیتا تھا آگے پیچھے غفلت برتتا تھا۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں ان کی دعائیں میرے لئے ہمیشہ فرحت بخش چھاؤں بنی رہیں۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد مجھ پر غم کی گھٹا چھا گئی۔

غم بھی گزشتنی ہے، خوشی بھی گزشتنی!
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

غم کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ انسان کو خدائے ذوالجلال کے قریب کر دیتا ہے۔ مجھ پر ماں کا احسان تھا کہ اس نے کفن اوڑھ کر مجھے اللہ کی ذات عالی کے قریب کر دیا۔ میں نے عہد کیا کہ اب ہمیشہ پابندی سے نماز پڑھوں گا، کلام الٰہی کی تلاوت کر کے ماں کو ایصال ثواب کروں گا۔ اپنے پرائے کی تمیز اٹھا کر سب کے کام آؤں گا۔ ذاتی فائدے کیلئے کوئی گڑ بڑ گھٹالا نہیں کروں گا۔ تنہا رب العزت ہی سب کا پالنہار ہے۔ بڑے سے بڑا مقتدر بادشاہ بھی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے جو کچھ درکار ہو گا صرف اپنے رب سے مانگوں گا۔ الحمدللہ! ماں کے احسان و فیضان نے مجھے کسی کے احسان کا محتاج نہیں رکھا۔ وہ میانی صاحب میں غازی علم دین شہید کے مزار کے قریب اپنے حسنات کی جنت میں آسودۂ خواب ہیں۔ فاتحہ کا نذرانہ پیش کرنے جاتا ہوں تو خدائے ذوالجلال کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ماں کی میت پر جن اچھی باتوں کا عہد کیا تھا الحمدللہ! آج بھی ان پر استقامت سے عمل پیرا ہوں ۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

◆◆◆◆◆

(۳۷)

قصور سے تبادلہ

پنجاب ٹیچرز یونین کا ایک وفد سیکرٹری تعلیم سے ملا اور دریافت کیا کہ بے شمار درخواستوں کے باوجود ضلع قصور کی تعلیمی فضا کو مسموم کرنے والے ڈپٹی ایجوکیشن افسر کے خلاف ابھی تک کوئی کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔ یہ بھی کہا کہ سیکشن افسر محمد اسلم نے ڈپٹی کے خلاف تمام پلندوں کو طاق نسیاں پر رکھ دیا ہے۔ سیکرٹری صاحب نے انہی کے سامنے محمد اسلم سیکشن افسر کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ابھی ڈائریکٹر تعلیمات لاہور ڈویژن پروفیسر سعید کے پاس جائے اور ڈپٹی ایجوکیشن افسر قصور کا تبادلہ کرا کر احکامات کی ایک نقل لے کر آئے۔

موصوف نے میرا تبادلہ بطور ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول دھنیسر پائیں ضلع گوجرانوالہ میں کر دیا۔ موسم گرما کی تعطیلات کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں تعطیلات ہی میں مذکورہ سکول جا پہنچا۔ مجھے سکول کا کلرک اور ایک دو مدرسین ملے۔ حاضری رپورٹ تیار کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے چند ایسے کاغذات پر دستخط کروائے جن کا تعلق اسکول کے اسکاؤٹس کو سمر کیمپ گھوڑا گلی لے جانے سے تھا۔ انہوں نے مجھے بھی کیمپ میں آنے کی دعوت دی لیکن میں نے معذرت کر دی۔ میری آمد پر انہوں نے مجھے بتایا کہ دھنیسر پائیں کی ایک شہرت ان چڑوں کی وجہ سے ہے جو موسم سرما میں اس علاقے میں نہ جانے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ چڑی مار ان کو پکڑ کر گوجرانوالے کے ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کو مہیا کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ انشاء اللہ موسم سرما میں مجھے یہ چڑے کھلا کھلا کر تندرست کر دیں گے لیکن میں گوجرانوالہ سے دھنیسر پائیں کے صبر آزما سفر ہی سے گھبرا چکا تھا۔

میری اہلیہ کا چھوٹا بھائی لاہور ڈویژن کا پہلا ڈائریکٹر پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ تعینات ہوا۔ کمشنر صاحب کے دفتر میں ہی اس کا دفتر تھا۔ کمشنر صاحب نے قومی تعمیر کے تمام محکموں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ترقیاتی منصوبے ڈائریکٹر منصوبہ بندی و ترقیات کو ارسال کیا کریں۔ منصوبوں

میں افسران کی دلچسپی کی رپورٹ بھی ڈائریکٹر منصوبہ بندی وترقیات لکھا کریں گے۔ میرے اس برادر نسبتی نے پروفیسر سعید صاحب سے کہا کہ آپ نے ہمارے بھائی صاحب کو قصور سے نکالنا تھا۔ وہ آپ نے نکال دیا۔ کیا یہ بھی ضروری تھا کہ انہیں دھنیسر پائیں ہی بھیجا جائے۔ کوئی نہ کوئی نزدیکی سکول بھی خالی ہوگا۔ پروفیسر صاحب بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔

بعد کو میرا تبادلہ انہی چھٹیوں میں دھنیسر پائیں سے ابدال ہوگیا۔ ابدال نہر اپر چناب کے کنارے نندی پور کے نچلی جانب کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے۔ سیالکوٹ جانے والی سڑک سے ایک میل کا فاصلہ پڑتا ہے۔ میں نے وہاں ایک سال گزارا۔ وہاں بھی درس وتدریس کے معمولات پرامن طریقے سے چل رہے تھے۔ قاضی شوکت علی بڑے فعال سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ مجھ سے بھی زیادہ اپنے فرائض کے پابند اور حاضر باش! میں نے رہائش بدستور سمبڑیال میں رکھی۔ میرے بچے لاہور میں تھے۔ شوکت علی صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے میرے لیے بعض سہولتیں ازخود پیدا ہوگئیں۔ سکول کے عملے اور طلبہ کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی۔ ضابطہ کے مطابق ہیڈ ماسٹر اس قدر تعداد والے اسکولوں میں صرف انتظامی امور کا پابند ہوتا ہے۔ درس وتدریس کی ذمہ داری صرف نگرانی کی حد تک رہ جاتی ہے۔ ہاں اپنی مرضی سے میں کبھی کبھی ایسی جماعتوں کو پڑھا لیتا جن کے اساتذہ رخصت پر ہوتے اور میرا مقصد اساتذہ کی کارکردگی کا جائزہ لینا ہوتا تھا۔ ڈویژنل ڈائریکٹر پروفیسر سعید صاحب تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ سائنس کالج سے پروفیسر اعوان صاحب ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ انہوں نے مجھے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر' ڈائریکٹوریٹ لاہور ڈویژن میں تبدیل کردیا۔ سیکرٹریٹ سے ان کی اس جرأت رندانہ کی باز پرس ہوئی تو ڈائریکٹر صاحب نے معذرت کرلی کہ انہیں طریق کار کا علم نہیں تھا۔ آئندہ کیلئے وہ محتاط رہیں گے۔ بلحاظِ عہدہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمن۔۲ تھا لیکن مجھے کام مقدمات کا دیا گیا۔ علیحدہ کمرے کے علاوہ مجھے ٹیلی فون کی سہولت بھی حاصل تھی۔ بعض حضرات کو کمرہ بھی کھٹکتا تھا اور ٹیلی فون بھی۔

ملک منظور احمد جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے بڑی جامع شخصیت تھے۔ محکمانہ قواعد ضوابط انہیں حفظ تھے' روزمرہ کے دفتری امور پر ان کے اطلاق کا فن جانتے تھے۔ افسران کی اہلیت کا لوہا مانتے تھے۔ وہ کلیریکل عملہ میں سے سنیارٹی کی بنیاد پر ترقی پاکر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوئے تو ڈائریکٹر صاحب نے مجھے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل کے طور پر تبدیل کر دیا۔ اور میری ذمہ داریاں ملک منظور احمد کو کمرہ و ٹیلی فون سمیت عنایت کردیں۔

ڈائریکٹر صاحب کو یہ احساس رہا کہ انہوں نے مجھے کمرے اور ٹیلی فون سے محروم کیا ہے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ دورے کرنے کا کام سونپنے لگے۔ جن میں زیادہ تر کام تحقیقاتی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ان کی اس مہربانی کے طفیل میں دوردراز علاقوں کی سرکاری خرچ پر سیر کرتا اور ٹی اے ڈی اے بھی بناتا رہا۔ وہ جو کام مجھے تفویض کرتے اس پر لکھتے کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر (جنرل) تحقیقات کر کے رپورٹ دے اور معاملے کو سدھارنے کی تجاویز بھی پیش کرے۔ میں نے اس عہدہ پر فائز رہ کر اتنی تحقیقات کیں کہ شاید ہی کسی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو اس کا موقع ملا ہو۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس کی وضاحت اس محاورے سے بھی ہو سکتی ہے کہ پانی کے اندر جال جو کچھ دیکھتا ہے وہ اگر ماہی گیر دیکھ لے تو چوکڑی بھول جائے۔

وہ کیا اندھیرا اور آفات تھیں جو میں نے دیکھیں؟ ان میں سے صرف چند کا ذکر قارئین کے علم میں اضافے کے لئے کرتا ہوں نام و مقام فرضی رکھوں گا کہ بعض حضرات اور احباب اب بھی ماشاءاللہ بقیدِ حیات ہیں اور ان کو ان کی اولاد، دوستوں اور عزیز و اقارب کے سامنے شرمندہ کرنا میری خواہش نہیں۔

☆☆

ضلع گوجرانوالہ کے ایک بزرگ اور صوفی منش ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کے خلاف شکایت موصول ہوئی کہ وہ سکول کا سب کچھ کھا گئے ہیں اور سکول کو مفلس کر دیا ہے۔ یہ شکایت ان کے تبادلے کے بعد سکول کی انتظامی ذمہ داری سنبھالنے والے ہیڈ ماسٹر خواجہ عبدالحفیظ نے کی تھی۔ شکایت میں درج چند الزامات یہ تھے۔

۱) سابقہ ہیڈ ماسٹر سکول میں فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک رہے۔ ان کے دور میں سکول میں حکومت نے پی ٹی سی کی کلاس کھولی۔ ہیڈ ماسٹر نے داخل ہونے والے طلبا سے تین سو روپے فی طالب علم واجبات وصول کیے جبکہ سرکاری طور پر فی کس واجبات سو روپے سے بھی کم تھے۔

۲) سابقہ ہیڈ ماسٹر نے پی ٹی سی کلاس کے طلبہ کو تاثر دیا کہ وہ ان کے نام پر سکول میں مسجد تعمیر کریں گے۔ تعمیر کے نام پر کافی سرمایہ اکٹھا کیا گیا۔ لیکن مسجد کی تعمیر کا ابھی تک پتہ نہیں جبکہ کلاس عرصہ ہوا امتحان دے کر جا چکی ہے۔

۳) قلعہ دیدار سنگھ کے ایک ریٹائرڈ کیپٹن ڈاکٹر سے سکول کے بچوں کا طبی معائنہ کئی بار

کرایا ہر بار میڈیکل فنڈ سے کیپٹن صاحب کو ادائیگی کی گئی۔ اس سلسلے میں صرف ایک کے علاوہ باقی رسیدیں جعلی ہیں۔

۴) گراؤنڈ کو ہموار کرنے پر دو مرتبہ پانچ پانچ سو روپے کی مٹی ڈلوانے کا خرچہ کیا گیا جبکہ گراؤنڈ ابھی تک ویران کھنڈر ہے۔

۵) کئی سال قبل کسی ہیڈ ماسٹر نے سکول یونین فنڈ سے پانچ پانچ ہزار کے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس قلعہ دیدار سنگھ کے ڈاک خانے سے خریدے تھے۔ سابقہ ہیڈ ماسٹر کے دور میں ان سرٹیفکیٹس کے دگنے ہو جانے کا عرصہ ختم ہوا۔ ان کو کیش کروالیا گیا لیکن یونین فنڈ کے رجسٹر اور پاس بک میں سرٹیفکیٹوں کی اصل قیمت ہی جمع کرائی گئی ہے۔ منافع کا ذکر کہیں نہیں۔

ان الزامات کے علاوہ اور بھی بہت سے الزامات تھے لیکن میری تحقیقات میں یہ الزامات شہادتوں اور دستاویزات سے ثابت ہو گئے۔ میں سارا ریکارڈ ساتھ لے آیا۔ جسے دفتر میں محفوظ کر دیا گیا۔ رپورٹ افسران بالا کی منظوری سے برائے تحقیقات بیسویں گریڈ کے سپیشل انکوائری افسر لودھی صاحب کے پاس سیکرٹریٹ چلی گئی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ سابقہ بزرگ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خصوصی انکوائری افسر کی طرف سے تاریخ سماعت مقرر کرنے تک مجھ سے رابطہ کیا اور نہ ہی بلاوے پر صفائی کے لئے حاضر ہوئے۔ ہوا یہ تھا کہ جن دنوں میں نے تحقیقات کی تھیں تب تک شکایت کنندہ خواجہ حفیظ سکول سے تبدیل ہو چکے تھے۔ اور ان کی جگہ بشیر احمد نامی ہیڈ ماسٹر آ چکے تھے۔ وہ بڑے کم گو اور مسکین آدمی تھے۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ ان کی سائیکل ایک ٹریکٹر ٹرالی سے ٹکرا گئی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سابقہ ملزم ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ دستاویزی ریکارڈ انہی کے پاس ہوگا اور اب جب کہ وہ اگلے جہان جا پہنچے ہیں تو عدم ثبوت کی بنا پر محکمہ ان کے خلاف کیا کرلے گا۔

جب انہیں سپیشل تحقیقاتی افسر کی چٹھی موصول ہوئی تو انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا کیونکہ محکمے کی طرف سے تو مجھے ہی استغاثہ کی طرف سے تحقیقاتی افسر کے روبرو پیش ہونا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ریکارڈ تو محکمے کے پاس موجود ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مختلف احباب کے ذریعے انہوں نے مجھے لبھانا چاہا لیکن میں اپنے ہی لکھے سے منحرف ہو کر کیسے جی سکتا تھا؟ میرے گھر کے سامنے پتھروں کے کتبے بنانے والے ایک شاہ صاحب کی

دکان تھی ان کے پاس میرا اٹھنا بیٹھنا تھا وہ بزرگ ملزم ہیڈ ماسٹر صاحب ان کو نمک مرچ لگا کر ایسی داستان سنا گئے کہ جیسے میں نے خواہ مخواہ ان کے بچوں کا رزق چھیننے کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب نے مجھے نصیحت کی کہ اگر اللہ نے کوئی اختیار دیا ہے تو یوں ظلم نہیں کرنا چاہیے جیسا اس بزرگ پر کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ ظلم تم نے پیسے کی خاطر کیا ہے تو وہ پانچ ہزار روپیہ بھی چھوڑ گئے ہیں' روپیہ لے لو اور تحقیقاتی افسر کو تحقیقاتی ریکارڈ پیش نہ کرو۔ میں نے شاہ صاحب کو ساری بات سمجھائی اور بتایا کہ جو شخص رشوت دینے کو تیار ہے اور آپ کو وہ روپیہ دے بھی گیا ہے وہ کس قدر ایماندار اور راہ راست پر چلنے والا ہوگا؟ شاہ صاحب سر ہلا کر رہ گئے اور اپنے بیٹے سے کہا کہ اگر اب وہ شخص آئے تو اس کی امانت اس کے منہ پر دے مارنا۔

ثبوتوں کی روشنی میں تحقیقات ان کے خلاف گئی۔ ان کو اٹھارہواں گریڈ ملنے والا تھا وہ رک گیا...... مگر ایک سال بعد ہی میں نے سنا کہ نہ صرف ان کو اٹھارہواں گریڈ مل چکا ہے بلکہ انیسواں گریڈ ''موو اوور'' بھی مل گیا ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے کیا کرامت دکھائی کہ تحقیقات کا سارا ریکارڈ ہی سیکرٹری تعلیم کے دفتر سے اڑن چھو ہو گیا......

☆☆

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر شیخوپورہ نے اپنے اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر سے رپورٹ حاصل کرنے کے بعد لکھا کہ فلاں ہیڈ ماسٹر صاحب سکول کے تمام فنڈز ڈاک خانے سے نکلوا کر کھا گئے ہیں۔ فنڈز کی رقم تقریباً بیس ہزار روپے تھی۔ میں اطلاع دے کر مڈل سکول پہنچا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فنڈز کے مختلف رجسٹر پیش کئے جن میں تمام اقسام کے فنڈز کا حساب کتاب سلیقے سے موجود تھا۔ ماہوار آمدن اور خرچ کے اندراجات باقاعدہ اور بھرپور تھے۔ میں نے ڈاک خانے میں رقم جمع کرانے کی پاس بک طلب کی تو انہوں نے مجھے برانچ پوسٹ ماسٹر کی طرف سے لکھا ہوا تصدیق نامہ پیش کیا کہ پاس بک منافع کے اندراج کے لئے سٹی پوسٹ آفس میں فلاں فلاں تاریخ کو بھیجی گئی تھی۔ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ سٹی پوسٹ ماسٹر کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔

میں نے صورت حال کی رپورٹ مرتب کی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو ایک ماہ کی مہلت دی کہ وہ اگلے ماہ فلاں تاریخ کو پاس بک مجھے میرے دفتر آ کر دکھائیں۔ رپورٹ کی ایک نقل ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے شکایتی مراسلے کے حوالے سے انہیں بھی بھیج دی۔ کسی میٹنگ میں ڈی۔ ای۔ او شیخوپورہ تشریف لائے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہیڈ ماسٹر مڈل سکول میری دی ہوئی تاریخ پر کبھی

نہیں آئے گا اور کسی صورت پاس بک پیش نہیں کرے گا دیکھ لینا۔ فی الواقع مہینہ گزرنے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ میں نے زبانی کلامی ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ان کی طرف سے یاد ہانی کا ایک مراسلہ ہیڈ ماسٹر مذکور کو لکھا جائے اور بتایا جائے کہ اگر وہ پندرہ دن کے اندر اندر حاضر نہیں ہوا تو اس کے خلاف حسب ضابطہ کارروائی کی جائے گی۔ میں نے مراسلہ لکھ دیا۔ اس مراسلے کے جواب میں اس نے لکھا کہ سکول کی پاس بک سٹی پوسٹ ماسٹر کے دفتر نے گم کر دی ہے۔ وہ ان کی باضابطہ درخواست کے جواب میں رجسٹر کھاتہ نمبر ۱۹۱۱۳ کی پاس بک بنا کر دے رہے ہیں جو وہ بہر صورت اگلے ماہ کی دس تاریخ تک پیش کر دے گا۔ کھاتے کا نمبر یہی تھا اور اگلے ماہ کی دس تاریخ تک میری تحقیقات کے دن سے دو ماہ چند دن بنتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر واقعی اپنی مقرر کردہ تاریخ پر پاس بک لے کر ڈائریکٹوریٹ پہنچ گیا۔ اس میں اصل زر اور سود دونوں علیحدہ علیحدہ درج تھے۔ اس نے کہا جناب اے۔ ای۔ او سے میرا جھگڑا ذاتی نوعیت کا تھا اے۔ ای۔ او بننے سے پہلے وہ اسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ہم زمیندار ہیں۔ ساجھے کا چکر تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے جواب دہ بھی نہیں تھا۔

اصل قصہ یہ ہے کہ میں موجودہ سکول میں تعینات ہوا تو میرے پیش رو نے مجھے فنڈز کی رقم پاس بک میں جمع یا نقدی کی صورت میں دستی نہیں دی بلکہ ایک تحریری معاہدے کی صورت میں دی جو اس نے اجنیانوالہ کے ایک زمیندار سے کر رکھا تھا اس نے اس زمیندار کے تین ٹیوب ویلوں کے لیے اسکول کے فنڈز سے فی ٹیوب ویل پانچ پانچ ہزار روپے کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ معاہدہ دو سال کا تھا۔ میں اس سکول میں گندم کی کٹائی سے پہلے تعینات ہوا۔ میرا پیش رو ایک سال کی آمدن لے چکا تھا۔ وہ گندم کی فصل بھی لینا چاہتا تھا میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے نقدی کی صورت میں رقم دے یا پاس بک میں جمع کرا کر پورا کھاتہ صاف کرے ورنہ میں صدر دفتر کو رپورٹ کر دوں گا۔ اسے گندم سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ڈی۔ ای۔ او کو بلکہ کسی کو بھی علم نہیں کہ اصل جھگڑا کیا ہے؟ دوسرا سال چھ ایام گزرے پورا ہوا ہے۔ زمیندار نے چاول کی فصل بھی دی ہے اور پندرہ ہزار روپیہ بھی واپس کر دیا ہے۔ دونوں فصلوں سے دس ہزار سے زیادہ آمدنی ہوئی ہے اور میں نے بھی سکول کا کھاتہ پورا کر دیا ہے......"

میں نے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ "میں حیلے بہانوں سے چاول کی فصل سمیٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ چند ماہ اے۔ ای۔ او اور ڈی۔ ای۔ او نے

گزار دیئے...... کچھ آپ نے گزار دیئے۔ شیخوپورہ کا چاول بڑا مشہور ہے۔ میں اعلیٰ قسم کے چاول کا ایک توڑا نذرانے کے طور پر لایا ہوں۔ آپ قبول فرمائیں اور تحقیقات کو گولی ماریں۔''

میں نے اب اس کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ بولا۔ ''مجھے دفتر میں حاضری کا سرٹیفکیٹ بنا دیں چاول قبول نہ فرمائیں۔ کوئی بات نہیں۔ یہاں دفتر میں اور بھی کئی مہربان موجود ہیں۔''

☆☆

اے ڈی آئی صاحبان کی طرف سے اپنی اسامیاں قابو رکھنے کی ناکام جدوجہد کے دوران ایک بڑا فعال کارکن گوجرانوالہ سے دریافت ہوا تھا۔ اب وہ بطور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کام کر رہا تھا۔ اس کا دھڑلہ مشہور تھا۔ راہنمائی کے جتنے اوصاف کسی اچھے کارکن میں ہو سکتے ہیں سب اس میں موجود تھے۔ پرکار گفتگو، مدلل تقریر، متاثر کن شخصیت اور تواضع اس کے وہ اوصاف تھے جن کا چرچا اساتذہ برادری میں عام تھا۔ اس کے خلاف شکایت آئی کہ اس نے محکمہ تعلیم میں مدرس بھرتی ہونے سے پہلے محکمہ اوقاف کی جگہ پر قبضہ کیا اور وہاں آہستہ آہستہ ایک مدرسہ قائم کر لیا۔ عمارت بنائی اور جگہ کا مالک بن بیٹھا کچھ امتحانات پاس کر کے وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گیا اور اب مدرسہ قومی تحویل میں آ جانے پر وہ عمارت کا تین ہزار روپے ماہانہ کرایہ بحیثیت مالک وصول کر رہا ہے۔ اس کی بھانجی صدر معلّمہ ہے اس کے ذریعے وہ اب بھی معلمات سے ماہوار حصہ لیتا ہے۔ اور محکمہ تعلیم میں افسری کی بنا پر فنڈز بھی کھا جاتا ہے۔ اور کوئی اس سے باز پرس بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ بڑا چالاک اور حرفوں کا بنا ہوا آدمی ہے۔

درخواست دہندہ ایک معلّمہ کا شوہر تھا۔ اس نے محکمہ تعلیم کے علاوہ دیگر متعلقہ محکموں کو بھی درخواستیں دے رکھی تھیں۔ مارشل لاء حکام کو بھی توجہ دلائی گئی لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔ یہ شکایت پروفیسر اعوان صاحب کے نام پر رجسٹرڈ لفافے میں آئی تھی۔ انہوں نے مجھے بھیج دی کہ میں تحقیقات کروں اور روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر اپنی رپورٹ دفتر میں دینے سے پہلے ان کو دکھاؤں۔

متعلقہ اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر میری جان پہچان والا تھا۔ وہ تحقیقات کی چٹھی ملتے ہی میرے پاس آیا اس نے بتایا کہ اس کے خلاف اس درخواست دہندہ نے خوامخواہ اودھم مچا رکھا ہے۔ مجھے اس کی زیادتیاں برداشت کرتے کرتے عرصہ ہو گیا ہے۔ محکمہ تعلیم اور انتظامیہ کے ذمہ دار افسر قوت فیصلہ سے محروم ہیں۔ اچھا ہوا کہ معاملہ آپ کے پاس آیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ضرور مفصل

تحقیقات کریں اور جو "کٹی کٹا" نکلنا ہے نکال ہی دیں کہ اس کی مستقل بک بک سے جان چھوٹے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر معاملہ تمہارے خلاف گیا تو برا تو نہیں مانو گے؟ اس نے جواب دیا کہ میں خوش' میرا خدا خوش' اس کے باوجود میں نے اسے پھر کہا کہ میں یہ لکھ کر کہ متعلقہ ملزم میرا دوست ہے تحقیقات کسی اور کو سونپی جائے' تحقیقات سے دست بردار ہو سکتا ہوں۔ میں شاید پہلے ہی دستبردار ہو جاتا لیکن تمہارا نام یاد نہیں رہا۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ تحقیقات آپ ہی کریں۔

میں موقع پر پہنچا تحقیقات کی۔ درخواست گزار نے محکمہ مال اور ریونیو بورڈ کی مصدقہ نقول' نقشے کھتونی نمبر وغیرہ تک نکلوا رکھے تھے۔ ریونیو بورڈ نے الزامات اور محکمہ مال کے ریکارڈ کی توثیق کر رکھی تھی۔ صدر معلّمہ کے خلاف اور اس کے ذریعے اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کے تصرفات کے بارے میں تقریباً نصف عملے نے بیانات دیئے۔ صدر معلّمہ اور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر نے الزامات کی صحت سے انکار کیا۔ میں مکمل بیانات اور دستاویزات کی نقول لے آیا۔ اپنی رپورٹ حسب حکم ڈائریکٹر صاحب کو دکھائی۔ انہوں نے ایک ایک حرف بغور پڑھا اور پھر لکھا کہ رپورٹ نامکمل ہے۔ تفتیشی افسر دستاویزات کی نقول کے ہمراہ دستاویزات جاری کرنے والے گوجرانوالہ کے متعلقہ دفاتر میں خود جا کر ریکارڈ ملاحظہ کرے اور متعلقہ افسران سے تصدیقی سرٹیفکیٹ حاصل کر کے اپنی تحقیقاتی رپورٹ کے ساتھ منسلک کرے۔

حکم کی تعمیل میں مجھے پندرہ بیس روز لگ گئے۔ جب میں سکول کی اراضی کی رجسٹری کی تصدیق کے لئے گوجرانوالہ کے تحصیل دفتر میں گیا تو اے۔ ای۔ او متعلقہ کو پتہ چل گیا کہ اس کے خلاف تحقیقات ابھی جاری ہیں۔ وہ میرے پاس آیا۔ اور اس نے باتوں باتوں میں کئی پرکشش ترغیبات دیں اور اپنی شخصیت کا سحر دکھلانے لگا۔ میں نے کہا میں ایک کمزور اور گنہگار انسان ہوں مجھے اپنی دیانتداری اور ایمانداری پر زیادہ فخر بھی نہیں ہے۔ تمہیں ہیرا پھیری کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ خاموش ہو گیا اور 'او۔ کے' کہتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا۔ وہ ڈائریکٹر صاحب کے پی۔ اے کے پاس گیا اور میرے خلاف پہلے سے تیار کی ہوئی ایک لمبی چوڑی درخواست دی جس میں مجھ پر بے سروپا الزامات تھوپے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ میں درخواست دہندہ کے ہاں ہوس ناکی کی غرض سے آتا جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ درخواست ڈائریکٹر صاحب کے دستخطوں سے اس حکم کے ساتھ مجھ تک پہنچ گئی کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر اس درخواست میں درج تحقیقات کی مکمل رپورٹ معہ متعلقہ ریکارڈ ڈپٹی ڈائریکٹر کے حوالے کر

دے اور ڈپٹی ڈائریکٹر اس تحقیقات کا بیڑا اٹھا کر اسے مکمل کریں۔

☆☆

ایک صاحب درخواست لے کر ڈی پی آئی کے ہاں پیش ہوئے کہ میں گورنر صاحب کے جہاز کا پائلٹ ہوں' میری اہلیہ مرید کے کے قریب نہر کے کنارے ایک گاؤں میں جو اس کا اپنا گاؤں ہے' صدر معلّمہ ہے۔ سال ہوا کہ متعلقہ اے۔ای۔او (زنانہ) نے اسے تنخواہ نہیں دی وہ اسے غیر حاضر شمار کرتی ہے جو سراسر زیادتی ہے انہوں نے بتایا کہ میں متعلقہ اے۔ای۔او' ڈی۔ای۔او اور ڈائریکٹر صاحب سے بھی ملا ہوں لیکن کہیں بھی دادرسی نہیں ہوئی کیونکہ میں جو بھی درخواست دیتا ہوں وہ اے۔ای۔او ہی کے پاس پہنچ جاتی ہے جو پہلے ہی میری اہلیہ کے خلاف ہے۔

ڈی پی آئی صاحب نے وہ درخواست ڈائریکٹر صاحب کو بھجوا دی وہاں سے مجھ تک آئی۔ اسی دوران پائلٹ صاحب بھی میرے پاس آ گئے۔ پوچھنے لگے کہ میں کب اس درخواست پر تحقیق کروں گا اور کب اس کی رپورٹ لکھوں گا۔ عرض کیا کہ ابھی تو درخواست میرے پاس آئی ہے میں اسے پڑھوں گا' دیگر مصروفیات کا جائزہ لوں گا پھر اس کے لئے وقت نکالوں گا...... اب انہوں نے مفصل طور پر اپنا تعارف کرایا بہت سے افسروں سے اپنے تعلقات کی داستانیں سنائیں۔ میں مرعوب نہیں ہوا اور ان سے کہا کہ اگر آپ کو جلدی تھی تو آپ ڈائریکٹر صاحب سے اس درخواست پر فوری کا لفظ لکھوا لیتے۔

وہ بھاگا بھاگا گیا اور چند منٹ بعد ڈائریکٹر صاحب سے ایک چٹ لکھوا لایا کہ اس شخص کی درخواست کو اولیت دی جائے کیونکہ یہ مصروف آدمی ہے۔ میں نے چٹ درخواست کے ساتھ لگائی اور اسے کہا کہ وہ پرسوں اپنے گاؤں میں موجود رہیں۔ خصوصی ہرکارے کے ذریعے اے۔ای۔او (زنانہ) کو بھی موقعہ پر آنے یا کلرک کے ذریعے متعلقہ ریکارڈ بھیجنے کیلئے لکھا۔ مقررہ دن میں گورنمنٹ ہائی سکول مرید کے پہنچا۔ وہاں سے ایک مدرس سے موٹر سائیکل لی اور ٹھیک نو بجے پائلٹ صاحب کے گاؤں کے گرلز پرائمری سکول پہنچ گیا۔ وہاں کوئی معلّمہ تھی نہ طالبہ' صرف پائلٹ صاحب کھڑے تھے۔

اے۔ای۔او۔ صاحبہ مع اپنے کلرک تشریف لائی تھیں اور قریبی گورنمنٹ ہائی سکول (مردانہ) میں بیٹھی تھیں۔ میں گرلز پرائمری سکول کے اندر گیا۔ چھتیں ندارد' دیواریں شکستہ سیلن کی بو پھیلی ہوئی۔ پائلٹ صاحب نے بتایا کہ عمارت کی ابتری کی وجہ سے سکول ان

کے گھر ہی میں قائم ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں وہ سکول دیکھ سکتا ہوں؟ انہوں نے کہا ''نہیں' ان کی اہلیہ پردہ دار ہے اور تحقیقاتی افسر کو کسی کے گھر میں گھسنے کا کوئی اختیار نہیں۔''

''میں تو سکول دیکھوں گا' آپ کی اہلیہ پردہ کر لیں۔''

''نہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''اچھا! متعلقہ اے۔ای۔او کو بھیج دیتا ہوں۔ آپ بھی ادھر ہائی سکول میں تشریف لے آئیں۔'' یہ کہہ کر میں موٹر سائیکل پر قریب ہی واقع ہائی سکول میں چلا گیا۔ وہاں کے صدر معلم مطیع الرحمٰن نستعلیق آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ گرلز پرائمری سکول تو کبھی کھلتا ہی نہیں۔ چند بچیاں آتی ہیں ان سے پائلٹ کی اہلیہ گھریلو کام کراتی ہے۔ جو صاحب اپنے آپ کو پائلٹ کہہ کر لوگوں پر رعب ڈالتے پھرتے ہیں وہ گورنر کے جہاز کو تیل اور گریس دینے کا کام کرتے ہیں۔ افسر لوگ خواہ مخواہ ان سے ڈر جاتے ہیں۔ یہ صاحب شور مچاتے ہیں اور محکمے کو ڈرا دھمکا کر گھر بیٹھے تنخواہیں وصول کرتے ہیں ...... اطلاع ملی کہ پائلٹ صاحب ادھر اس کمرے میں آ گئے ہیں جہاں اے۔ای۔او صاحبہ بیٹھی ہیں۔

میں اٹھ کر اس کمرے میں گیا تو دیکھا کہ پائلٹ صاحب کلرک سے جھگڑا کر رہے ہیں' کلرک بھی منہ زور تھا کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی اور کلرک تھا جسے ڈرا دھمکا کر وہ غیر حاضر باش' نااہل اور جعلی سند رکھنے والی معلّمہ کی تنخواہیں لے گئے ہیں۔ میں آپ کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اور آپ کی بیگم کو تب ہی معلّمہ تسلیم کروں گا جب آپ بیگم کی میٹرک کی سند بورڈ کے دفتر سے تصدیق کرانے کیلئے پیش کریں گی۔ پائلٹ صاحب نے اسے للکار کر کہا ''پدی کے شوربے! تم کیا چیز ہو میں سارے محکمہ تعلیم سے نمٹ لوں گا''۔

میں نے دونوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے بات کرنے اور معاملے کو سمجھنے کا موقع دیں۔ پائلٹ صاحب کا جعلی رعب اتنا تھا کہ وہاں کوئی بھی محکمے کے حق میں اور ان کی اہلیہ کے خلاف بیان دینے کو تیار نہیں تھا۔ معلّمہ کا گھر میں ہونا' گھر میں سکول منتقل کر لینا اور کسی اہلکار کو داخل نہ ہونے دینا ہر لحاظ سے محل نظر تھا۔ کچھ روشنی ان کی تو تکار سے پڑی تھی۔ میں نے اے۔ای۔او صاحبہ سے کہا کہ وہ درخواست دہندہ کے گھر جائیں اور طالبات کی حاضری چیک کریں اور رجسٹر حاضری برائے معلمات ادھر لے آئیں۔ وہ جانے کیلئے اٹھیں تو درخواست دہندہ پائلٹ صاحب نے کہا کہ تحقیقات کی وجہ سے میں نے سکول میں چھٹی کرا دی ہے اور میری اہلیہ مرید کے ہیلتھ سنٹر گئی ہے

کیونکہ اس کی طبیعت خراب ہے...... عجیب شخص سے پالا پڑا تھا۔ میں نے اپنی رپورٹ لکھنے کے لئے کچھ نکات اپنی ڈائری میں لکھے اور پائلٹ صاحب کو دوٹوک الفاظ میں کہا کہ آپ کی اہلیہ کی سند کی جانچ پڑتال کرانے میں محکمہ حق بجانب ہے۔ جب تک آپ سند اور اسکول کو باقاعدہ کام کرتے ہوئے نہیں دکھائیں گے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ مزید پتہ چلا کہ سکول میں کوئی دوسری معلّمہ نہیں ہے وہی صدر معلّمہ، وہی نائب غرضیکہ اپنی ذات میں وہی پورا اسکول ہیں۔ طالبات کی کل تعداد دس بتائی گئی جس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ مشاہدے میں آنے والے حالات کی روشنی میں، میں نے اپنی رپورٹ ڈائریکٹر صاحب کو پیش کی تو انہوں نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا۔ نظامت تعلیم لاہور ڈویژن کی طرف سے ڈی پی آئی صاحب کو پوری مسل کی فوٹو کاپی بطور ریکارڈ رکھ کر اصل درخواست مع رپورٹ بھجوادی گئی۔ بعد کو پائلٹ صاحب مجھ سے کبھی نہیں ملے مگر محکمہ تعلیم کی غلام گردشوں میں ان کی گشت و بازگشت کی صدائیں مسلسل گونجتی رہیں۔

☆☆

تعطیلات موسم گرما کے دوران گورنر پنجاب کی معائنہ جماعت بسلسلہ معائنہ مخدوش عمارات اقبال ہائی سکول، گڑھی شاہو گئی تو وہاں جماعت کے چیئرمین بریگیڈیئر ریٹائرڈ محمد صادق صاحب نے دیکھا کہ ایک ہال سکول کے فرنیچر سے اٹا پڑا ہے ان کی نظر ایک 5'x10' کی سائنس کے لئے تجربات کی میز، مدرس کے لئے کرسی اور میز پر پڑی تو انہوں نے ڈائریکٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ کیسا سامان ہے؟ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر اور ہیڈ ماسٹر سکول نے فوراً بتایا کہ یہ وہ سامان ہے جو سمال انڈسٹریز کارپوریشن نے سکولوں کے لئے بنوا کر بھیجا ہے۔ اور تعطیلات موسم گرما کے بعد سرحدی سکولوں میں تقسیم کرنے کے لئے یہاں رکھا گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ملتان روڈ والے علاقے کا سامان چشتیہ ہائی سکول میں رکھا ہوا ہے۔

سامان جمع کرنے پر ناراضی کا اظہار کرنے کے بعد انہوں نے سامان کو انتہائی غیر معیاری اور ناقص قرار دیا اس لئے کہ لوہے کے ہلکے پائپ سے بنی میز کے اوپر لگی لکڑی کمرشل پلائی کی تھی۔ اور کیمیکلز کے استعمال سے دو چار تجربات ہی سے گل سڑ سکتی تھی۔ مدرس کی کرسی بھی ہلکے لوہے کے پائپ سے بنی ہوئی تھی جبکہ نشست اور پشت پر کیکر کی چپٹیاں لگی ہوئی تھیں جو بدنما نظر آ رہی تھیں۔ یہی حال مدرس کی میز کا تھا اور اس کی بالائی سطح پر بھی کمرشل پلائی لگی ہوئی تھی۔ چیئرمین صاحب نے حکم دیا کہ محکمہ تعلیم تحقیق کرے کہ اس قدر ناقص سامان بنانے اور بنوانے کی ذمہ داری کس پر ہے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر سامان جیسا بھی ہے متعلقہ سکولوں میں بھیجا اور تقسیم بھی کیا جائے تا کہ موسمی بارشوں کی وجہ سے سٹوروں میں پڑا ہوا سامان خراب نہ ہو جائے۔

اس سامان کی تقسیم کے بارے میں ابھی سوچا ہی جا رہا تھا کہ رانا نذر الرحمٰن مالک وی برادرز (We Brotehers) کی جانب سے ایک بیان 'پاکستان ٹائمز' میں شائع ہوا کہ پنجاب بھر کے ہائی سکولوں میں غیر معیاری سائنس کا سامان اور زائد المیعاد کیمیکلز سپلائی ہوئے ہیں۔ بیالوجی کے سامان کی خرید میں گھپلا کیا گیا ہے۔ بیان گورنر کی معائنہ جماعت کی نظر سے گزرا اور اس کا تراشہ ڈی۔ پی۔ آئی پنجاب کو برائے تحقیقات موصول ہوا۔

سکولوں میں جا کر جملہ انواع کے خریدے ہوئے مال کے معائنہ کیلئے لاہور ڈویژن میں ایک جماعت تشکیل دی گئی جس کا سربراہ ملک گلزار احمد اسسٹنٹ ڈائریکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن تھا۔ حاجی حبیب اللہ ہیڈ ماسٹر این ڈی اسلامیہ ہائی سکول اچھرہ بیالوجی کے سامان کی پڑتال کے لئے ممبر نامزد کئے گئے مجھے اس تحقیقاتی کمیٹی کا سیکرٹری بنایا گیا۔ ڈائریکٹوریٹ کی ڈیزل سے چلنے والی فورڈ گاڑی تحقیقاتی کمیٹی کے سپرد کی گئی۔ ایک ماہ کے اندر ہم نے لاہور ڈویژن کے ان تمام پرائمری، مڈل اور ہائی سکولوں کی نصف تعداد کا دورہ کیا جن کو فرنیچر، ٹاٹ، سامان سائنس اور سامان بیالوجی مہیا کیا گیا تھا۔ جو حقائق سامنے آئے وہ یہ تھے کہ:

۱) فرنیچر اس مفروضے پر سمال انڈسٹریز کارپوریشن سے بنوایا گیا تھا کہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر زیادہ قیمت پر غیر معیاری فرنیچر خریدتے رہے ہیں۔

۲) سمال انڈسٹریز کارپوریشن نے پنجاب بھر کے فرنیچر کیلئے مختص رقم پچھتر لاکھ روپے محکمہ تعلیم سے پیشگی وصول کر لی تھی تا کہ وہ لکڑی اور پائپ وغیرہ خرید سکے۔ سننے میں آیا کہ پیشگی رقم ادا کرنے والے ڈپٹی سیکرٹری (ترقیات) نے پانچ لاکھ کمیشن لے لی ہے اور ایک سال کی رخصت پر بیرون ملک چلے گئے ہیں۔

۳) سمال انڈسٹریز کارپوریشن کے کرتا دھرتا افسران نے سیکرٹریٹ کی سطح ہی پر فرنیچر میں استعمال کیے جانے والے پائپ کی معیاری گیج اور کوالٹی میں کچھ کمی کرالی۔

۴) سمال انڈسٹریز کارپوریشن نے کراچی سے کمرشل پلائی جو بیرون ملک سے درآمد ہونے والی مشینری وغیرہ کی پیکنگ میں استعمال ہوتی ہو گی، انباروں کی صورت میں خریدی اور استعمال کی۔

۵) سیکرٹریٹ سے فرنیچر کی جو ڈرائینگیں اور تصریحات پنجاب کے انتیس اضلاع کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران کو ارسال کی گئیں ان کے ساتھ یہ ہدایات بھی بھیجی گئیں کہ وہ سمال انڈسٹریز کارپوریشن سے موصول ہونے والے فرنیچر کی پڑتال ان ڈرائینگوں اور تصریحات کے مطابق کرنے کے بعد مال وصول کریں۔ چونکہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران محکمے کے اس فیصلے سے ناراض تھے لہٰذا کسی بھی ضلع کے ایجوکیشن افسر نے سمال انڈسٹریز کارپوریشن سے موصول ہونے والے مال کی پڑتال ہی نہیں کی تھی جو مال آیا سیدھا اسٹورز میں ٹھونس دیا گیا۔

٦) کیمیکلز پڑتال میں واقعی ناکارہ پائے گئے مگر یہ قصور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں اور متعلقہ ہائی سکولوں کے صدر معلمین اور صدر معلمات کا تھا۔

۷) بیالوجی کے سامان میں اول سے آخر تک گھپلا ہی گھپلا تھا۔ ٹین کی پتریوں پر روغن سے امیبا کے پانچ مراحل کے ایک سیٹ کی قیمت ۱۵ روپے تھی جبکہ بعض ہوشیار ڈویلپمنٹ کلرکوں نے سامان مہیا کرنے والوں کی ملی بھگت سے ایک مرحلے کے ٹکڑے ہی کی قیمت ۱۵ روپے درج کی اور سرکاری خزانے سے رقم نکلوا کر ہضم کرلی۔

۸) سپرٹ لیمپ، امتحانی نلیاں اور شیشے کی نلیاں مارکیٹ کی قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت پر خریدی گئی تھیں۔

۹) کلرکوں کے پاس یہ بہانہ تھا کہ سائنس کے اساتذہ کو مال وصول کرتے وقت سارے سامان کی خود پڑتال کرنا چاہیے تھی۔

۱۰) صدر معلمین سارا قصور سائنس اساتذہ کا بتاتے تھے کہ انہوں نے تو ان کو سامان کی پڑتال کرنے کی تاکید کی تھی۔ جبکہ (تحریری شکل میں) کم از کم لاہور ڈویژن میں کسی بھی صدر معلم یا معلّمہ نے پڑتال کی زحمت نہیں اٹھائی تھی۔

☆☆

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنئے! ایک سکول کے معائنہ کو جاتے ہوئے ہماری سرکاری گاڑی فورڈ خراب ہوگئی، خطاب ڈرائیور نے سڑک پر ایک ورک شاپ سے رابطہ کیا۔ خرچ کا تخمینہ ۵۰۰ روپے بنا۔ ہمارے ساتھ ضلعے کا ترقیات کا وہ کلرک بھی تھا جو سامان کی پڑتال کروا رہا تھا۔ پڑتالی جماعت کے سربراہ ملک گلزار نے اسے بلایا اور اپنے مخصوص انداز میں کہا

''گاڑی خراب ہوگئی ہے اور ابھی بہت کام باقی پڑا ہے آخر کیا بنے گا؟'' اس نے ادب سے پوچھا ''جناب والا! کتنا خرچ آئے گا؟

''خطاب سے پوچھ لو۔ وہ پانچ کا خرچہ بتاتا ہے!''

ملک صاحب نے پانچ تو کہا مگر اس سے آگے سو (۱۰۰) کا ہندسہ گول کر گئے۔ وہ اسی ڈھب کی الجھی الجھی خلاؤں بھری ذومعنی گفتگو کیا کرتے تھے۔ (میں ان کا ذکر جب وہ اے۔ ڈی۔ آئی تھے کر چکا ہوں)

کلرک چونک پڑا۔ کہنے لگا۔ ''جناب والا! پانچ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے تو آپ حضرات کی مدارات کے لیے محض تین ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں...... اب ملک صاحب چونک پڑے۔ وہ تو اپنے طور پر پانچ سو روپے کی حد تک ہی محدود تھے مگر اب تین ہزار کی نقدی سن کر انھیں بڑا جھٹکا لگا' تاہم وہ کائیاں آدمی تھے اپنے آپ پر قابو رکھ کر بولے:

''ارے حرام خور! تو ہمیں صرف تین ہزار پر ہی ٹرخا رہا ہے سچ بتا باقیوں کے لئے کیا کیا نقد نرائن رکھا ہوا ہے۔؟''

کلرک نے دست بستہ' آڈٹ اور ضلعی افسر تعلیم سے لے کر ڈی پی آئی کے دفتر کے افسران تک سب کے نام اور ان کے لئے مختص رقم گنوا دی اور ساتھ ہی التجا کی کہ پردہ پوشی فرمایئے۔ میرا نام صیغۂ راز ہی میں رکھئے۔

ملک صاحب کا عالم دیدنی تھا وہ سر جھٹک کر ایک کونے میں لڑھک گئے اور خود کلامی کرنے لگے۔ ''اے میرے دلِ ناداں! تیرے حوصلوں اور ولولوں کا پیالہ بھی کتنا اُتھلا ہے۔ پانچ سو روپلی ہی سے بھر جاتا ہے۔ ادھر کلرک بادشاہ ہیں کہ ہزاروں کی گنگا بہا رہے ہیں یار لوگوں کی پانچوں گھی میں ہیں۔ سب تر مال کھا رہے ہیں اور غٹرغوں کر رہے ہیں۔ ادھر ایک ہم بدنصیب ہیں کہ چند کلیوں ہی پر قناعت کیے بیٹھے ہیں!''

☆☆

ڈویژن کی سطح پر تیار کی گئی رپورٹ ڈی۔ پی۔ آئی صاحب کو بھیجی گئی۔ جو آگے سیکرٹری تعلیم اور دیگر متعلقہ حکام کو بھیج دی گئی۔ وہاں دیگر ڈویژنوں سے بھی رپورٹیں موصول ہوئیں۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران اور سمال انڈسٹریز کارپوریشن کے افسران کو ۱۹۷۵ء کے انضباطی قواعد و ضوابط کے تحت مختلف سزائیں دی گئیں۔ پھر مزید کارروائی کے لئے گورنر کی معائنہ جماعت نے پورے

پنجاب کے لئے ایک بااختیار افسر تعینات کیا بعض افسران کو جبری ریٹائرمنٹ اور تنزل کی سزائیں دی گئیں۔ بااختیار افسر محکمہ سوشل ویلفیئر کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے ڈائریکٹر تعلیمات لاہور ڈویژن کو بھی طلب کیا۔ وہ مجھے اور ملک گلزار احمد کو ساتھ لے جاتے رہے۔ کئی ماہ بعد ہمیں یہی علم ہو سکا کہ ڈائریکٹر جنرل کلرکوں، اساتذہ، صدر معلمین و معلمات اور ضلعی افسران تعلیم کو محکمے کی طرف سے ملنے والی سزاؤں کو ان کے ساتھ زیادتی کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان بے چاروں نے چند روپے تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں حاصل کیے۔ ملک کا سرمایہ ملک ہی میں گردش میں آیا اصل مجرم تو سمال انڈسٹریز کارپوریشن کے افسران بالا اور ان سے معاملہ کرنے والے بیوروکریٹ ہیں جو ملکی سرمائے کو باہر لے گئے اس کے علاوہ زیادہ مجرم ٹھیکیدار اور تاجر ہیں جو محکمہ کو ناقص مال سپلائی کرتے ہیں اصل مجرموں کو سزا دینا متعلقہ محکمہ کی صوابدید پر موقوف ہے۔

☆☆

۸۱-۱۹۸۰ تک مارشل لاء کے باوجود منافع بخش عہدوں کے حصول کی دوڑ لگ چکی تھی۔ بعض اسامیاں بولی دے کر حاصل کی جاتی تھیں۔ دیانتدار اہلکار خاموش تھے۔ وہ تیل اور تیل کی دھار دیکھ رہے تھے۔ جائز کام کے لئے بھی لین دین کا سکہ چلتا تھا۔ محکمہ تعلیم کے معلمین اور معلمات پیسے کی چمک دمک کے آگے ہتھیار ڈالے نظر آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنی ساری توانائی سکول ہی میں صرف کر دیں گے تو پھر وہ طلبہ کے پانچ چھ گروپوں کو اپنے ذاتی ٹیوشن مرکز پر کیسے پڑھائیں گے۔ انتظامیہ مقدماتی اور مالیاتی امور میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ معائنہ کرنے اور اساتذہ کے کام کی پڑتال کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ محکمے اور بورڈ کے امتحانات کے غیر معیاری نتائج پر باز پرس اٹھ گئی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے کی کردار کشی میں گھٹیا سے گھٹیا حربہ بروئے کار لا رہا تھا۔ وہ پرانا احساس مروّت، دید لحاظ، خلوصِ نیت، پڑھانے کی لگن، طلبہ کی مجبوریاں اور ان کے والدین کا شعور سب کچھ باقاعدہ فیسوں کی نذر ہو چکا تھا۔ فیس ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ مدرس ہے...... اکادمیاں ہیں...... مراکز ہیں۔ فیس نہیں تو کچھ بھی نہیں...... احساس فرض اور ملازمت کے تقاضے بھی نہیں...... صدر معلم کی حصہ داری سے ٹیوشن مرکز سکولوں کی عمارتوں میں بھی چلنے لگے تھے۔ پیغمبری پیشہ سوداگری بن کر رہ گیا تھا۔

اللہ ہی حافظ تھا۔

◆◆◆◆◆

(۳۸)

ایک انقلابی افسر

ایسے میں سیکرٹریٹ کے افسروں کو شکایات کے پلندے موصول ہو رہے تھے۔ اصلاح احوال کے لئے وہ برطرفیاں یا اہل لوگوں کا تقرر ہی کر سکتے تھے۔ تاہم محکمہ تعلیم کو سدھارنے کے لئے حکومت پنجاب نے ایک دیانتدار ماہر نفسیات اور صاحب قلم استاد ڈاکٹر عبدالرؤف خواجہ کو نظامت تعلیم پنجاب کا سربراہ (ڈی پی آئی) بنا دیا۔

بعض لوگ اچھے کلرک ہوتے ہیں لیکن ترقی پانے پر اچھے منیجر یا منتظم ثابت نہیں ہوتے۔ اچھے مصنف ہوتے ہیں لیکن بہتر مقرر نہیں ہوتے۔ میری رائے میں بطور ناظم خواجہ صاحب اپنی ذہانت و فطانت کا سکہ نہ جما سکے۔ وہ اساتذہ کے ایک مخصوص گروہ کے ہتھے چڑھ گئے جن کا درس و تدریس اور بہبودِ تعلیم و تدریس سے محض اس قدر واسطہ تھا کہ دفتر کی ان کی ذاتی لیڈری چمکے۔ وہ پانچوں وقت کے نمازی تھے اور لیڈری جمانے کے لیے اساتذہ برادری میں مسجد ہی کے صحن میں بیٹھ کر جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے۔

صاحب موصوف نے صوبائی اور ڈویژنل افسران اور دیگر عملے سے اپنے تعارفی خطاب کے اختتام پر کہا کہ تمام افسران روزانہ اپنے ناموں کی تختیاں دیکھ کر اپنی نشست پر بیٹھا کریں کیونکہ وہ فوری آپریشن کے قائل ہیں وہ مرض کو بڑھنے نہیں دیں گے۔ خطاب کے بعد جملہ اہلکار جب اپنی اپنی نشستوں پر واپس آئے تو موصوف کے خطاب اور ان کی انتظامی اہلیت کی نسبت دیر تک معنی خیز تبصرے ہوتے رہے۔

غلام مصطفیٰ سلہریا گوجرانوالہ کے ایک معلم تھے۔ وہ ماضی میں سبارڈینیٹ ایجوکیشن سروس (SES) کے پروپیگنڈہ سیکرٹری رہے تھے۔ ان دنوں وہ اساتذہ کے حقوق کا ترجمان ایک جریدہ بھی شائع کرتے تھے اور اکثر دفاتر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ جوشیلے آدمی تھے

اکثر افسران سے الجھ پڑتے تھے لہٰذا افسران سے دبکتے تھے۔ اتفاقاً ان کی ملاقات پہلے ہی روز خواجہ عبدالرؤف سے ہو گئی انھوں نے اس قدر موثر اور دردناک لہجے میں محکمہ تعلیم میں برپا بدعنوانیوں' غلط بخشیوں' چشم پوشیوں اور اقربا پروریوں کا ذکر کیا کہ خواجہ صاحب پوری داستان سننے کے لیے ان کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ ازاں بعد وہ خواجہ صاحب کے تشکیل کردہ ''ندوۃ المفکرین'' کے رکن اور یکے از نورتن بن گئے۔ ندوۃ المفکرین اس کمرے میں قائم کیا گیا جو ڈی پی آئی صاحب کے شاندار کمرے کی بغل میں تھا۔ اس ندوۃ میں صرف افسروں اور اساتذہ کی اکھاڑ پچھاڑ ہی پر تفکر کیا جاتا تھا۔ اس کارنمایاں کے علاوہ اس ندوے کا اور کوئی ایسا کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا جس کا تعلیم و تعلم' متعلم یا معلم کی بھلائی سے کوئی واسطہ ہو۔

☆☆

غلام مصطفیٰ سلہریا اس کو ذاتی نہیں بلکہ ندوے کا کارنامہ قرار دیتے ہیں کہ ندوہ نے سب سے پہلے رانا صفدر جنگ کو محکمہ تعلیم پنجاب سے بطور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر متعارف کرایا۔ موصوف بعد میں دھڑلے کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب بھی رہے۔ رانا صاحب سے میری ملاقات سمال انڈسٹریز کارپوریشن سے متعلقہ تحقیقات کے دوران گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ میں ہوئی تھی۔ ڈویژنل تحقیقاتی جماعت نے وہاں رات بھر قیام کیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے رات کے کھانے پر رانا صاحب کو بھی بلایا تھا وہ ان دنوں بطور ماہر مضمون ایلیمنٹری کالج گکھڑ تعینات تھے۔ وہ جماعت کے سربراہ ملک گلزار احمد کو محکمے کی کسی ایسی غلطی اور بداندیشی کی داستان سناتے رہے جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ ان کی بطور ماہر مضمون تعیناتی میں کوئی گھپلا ہوا ہے۔ مجھے وہ تفصیل یا گھپلا یاد نہیں تاہم کچھ تھا ضرور...... انھوں نے یہ گھپلا غلام مصطفیٰ سلہریا کو بھی سنا رکھا تھا۔ موقع پا کر سلہریا نے رانا صفدر جنگ سے ہونے والی زیادتی اور حق تلفی کا ذکر ندوہ میں اٹھایا تو خواجہ صاحب نے رانا صفدر جنگ کو ضلعی افسر تعلیم لاہور کا عہدہ دے کر گھپلے کی تلافی کر دی۔

☆☆

میرا تبادلہ نظامت تعلیم لاہور ڈویژن سے نظامت تعلیم پنجاب میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریگولیشنز کر دیا گیا۔ میں اسی کمرے میں جس میں اب ندوۃ المفکرین قائم ہوا تھا بیٹھا کرتا تھا۔ میرے اور ملک عبدالمجید کے خلاف جو پراسرار تحقیقات اندر ہی اندر چلتی رہی وہ

اچانک باہر نکل آئی تھی لیکن ہم دونوں کا کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ ایک روز اچانک ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے ہم دونوں (مجھے اور ملک عبدالمجید) کو بلایا کہ ہم سے ۱۹۷۵ء کی امدادی گرانٹوں میں کتب کی خرید کے بارے میں جو جرم سرزد ہوا تھا اس میں جناب ڈی پی آئی پنجاب کے روبرو ذاتی شنوائی کے لیے پیشی ہے۔ ان کو حکومت پنجاب نے ہم دونوں کے لیے بااختیار افسر مقرر کیا ہے اور ضابطے کے مطابق صفائی کا یہ آخری موقع دینے کے بعد بااختیار افسر ہمیں سزا دے گا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے لکھ دیا ہے کہ ملزمان کے خلاف قطعی کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔

خواجہ صاحب کے روبرو ہماری پیشی ہوئی تو ہم سے مختصر اُتعارف کے بعد انھوں نے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

''رانا صاحب! یہ ۱۹۷۵ء کا معاملہ ہے اور اب ۱۹۸۲ء میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔''

''کیس دبایا جاتا رہا ہے جناب!''

ہم دونوں نے بیک زبان کہا کہ جناب ہماری تو ترقی کی نوٹیفکیشن بھی اس ناکردہ جرم کی بنا پر تا حال رکی ہوئی ہے۔ وہ اور بھی متعجب ہوئے۔ ہمدردی کے دو چار الفاظ بھی کہے۔ بلکہ ڈپٹی ڈائریکٹر کو حکم دیا کہ وہ ایسے دبے ہوئے معاملات اور دیر تک چلنے والی تحقیقاتوں سے متاثر ہونے والے اہلکاروں کی فوری دادرسی کریں اور کرائیں اور ہفتے بھر میں ان کو اس سلسلے میں رپورٹ پیش کی جائے۔ پھر انھوں نے ہمیں واپس جانے کی اجازت دے دی لیکن بعدازاں ڈپٹی ڈائریکٹر سے کہا کہ ملزموں کو کوئی نہ کوئی سزا تو ملنی ہی چاہیے خواہ ہلکی پھلکی سی ہو...... ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا کہ جب کوئی جرم ہی ثابت نہیں ہے تو پھر سزا کیسی...... مگر مسل تو خواجہ صاحب کے سامنے پڑی تھی۔ ان کے دور میں مسل میں اردو زبان چلتی تھی۔ یہ ان کا کارنامہ تھا کہ وہ اردو زبان کی ترویج کر رہے تھے لیکن ہم دونوں کے بارے میں انھوں نے انگریزی میں لکھا A simple warning may be issued to both the accused یعنی دونوں ملزموں کو ہلکی سی تنبیہ کی جائے۔

☆☆

شاید فوج کے بعد دوسرا بڑا محکمہ تعلیم ہی ہے۔ اسی حوالے سے اس کے دفاتر بھی بہت

زیادہ ہیں۔ دفتر تعلیم لاہور ڈویژن اور دفتر تعلیم صوبہ پنجاب بھی بڑے دفتر تھے۔ خواجہ صاحب کی وجہ سے افسروں نے سرکاری کام کاج شروع کرنے سے پہلے گپ شپ لگانے اور چائے کی پیالی پینے کا ''زیرو پیریڈ'' بھی ترک کر دیا۔ تاہم مندرجہ ذیل گفتگو کسی نہ کسی بہانے ضرور ہوتی تھی۔ تازہ ایرانی انقلاب کے حوالے سے خواجہ صاحب کو ''خمینی'' کا نام دے دیا گیا تھا۔

کوئی پوچھتا۔ ''آج کتنے برج گرے؟''

دوسرا پوچھتا۔ ''آج روح اللہ نے کتنے لوگوں کی روحیں قبض کیں؟''

ایران میں ثابت شدہ مجرموں کو گولیوں سے اڑایا جا رہا تھا مگر ہمارے محکمے کے غیر مصدقہ ملزموں کو تبادلوں سے بھگایا جا رہا تھا۔ اشتراکی ذہن رکھنے والے تو قطعی طور پر ڈی پی آئی کے خلاف ہو چکے تھے اور انہیں بھانت بھانت کے القابات سے نواز رہے تھے۔

ندوۃ المفکرین کو علمی زبان میں مجلس شوریٰ پکارا جانے لگا تھا۔ بعض ساتھی شوریٰ کے حوالے سے تازہ خبریں یوں پوچھتے تھے ''آج مجلس شوریٰ نے کتنے لوگوں کو لٹکانے کے مشورے دیئے ہیں؟''

ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس اکھاڑ پچھاڑ اور افسروں کی تذلیل کے حق میں تھا۔ وہ اسے ''آپریشن کلینگ'' کا نام دیتا تھا۔ ماتحت عملے میں ایسے افراد کی بھی کمی نہ تھی جو ڈی پی آئی کے رویے اور کام کو قرآن و حدیث کی روشنی میں غیر اسلامی ثابت کرنے میں لگے تھے۔ بعض دل جلوں نے غسل خانوں میں نہ صرف صاحب موصوف کے خلاف گری ہوئی سوقیانہ باتیں لکھیں بلکہ ان کے بھیانک کارٹون بھی بنائے۔ موصوف کو سگریٹ سے سخت نفرت تھی۔

یہ نفرت ہر چند خیر پر مبنی تھی لیکن وہ اہلکار جو سگریٹ پیتے تھے وہ سگریٹ نوشی پر پابندی سے چکرا گئے۔ وہ چھپ چھپا کر، مٹھیوں میں دبا کر یا میز کے نیچے ہاتھ لٹکا کر اپنا شغل جاری رکھتے۔ خواجہ صاحب کو ادھر ادھر دائیں بائیں جاتے ہوئے کوئی سگریٹ پیتا مل جاتا تو اس کی خوب خبر لیتے۔ سگریٹ نوش اہلکار خواجہ صاحب سے کہتے ''جناب والا! سگریٹ پینا تو کجا ہم تو سگریٹ کے نام سے بھی بیزار ہیں''۔

ایک روز میں نے اپنے دیندار، متشرع اور تبلیغی جماعت کے صاحب ریش ڈپٹی ڈائریکٹر (سکولز) سے کہا کہ آپ ہی نئے صاحب کو کچھ سمجھائیں؟ مجھے اس فرمائش کا حوصلہ اس لیے ہوا کہ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب سے میری ادب کی حدود میں کچھ بے تکلفی بھی تھی۔ تاہم یہ پہلی بار ہوا کہ وہ

میری بات سے چڑ گئے۔ فرمایا ''تمھیں باہر آویزاں میرے نام کی تختی اچھی نہیں لگتی؟''

میں خاموشی سے کمرے سے اٹھ آیا۔ تیسرے دن انھوں نے مجھے خود بلایا اور کہا ''لو بھئی، میں نے تمہاری فرمائش پوری کر دی ہے۔ میں نے صاحب سے ملاقات کی ہے اور کھلے لفظوں میں انھیں عرض کیا ہے کہ انہیں ان کے ندوہ کے مفکرین نے غلط راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ ''اصلاح احوال'' کے بجائے ''مردم آزاری'' کر رہے ہیں۔ ان کے اچھے اقدامات کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے جو کام کرنے چاہیے تھے وہ نہیں کیے گئے۔ جن لوگوں کے خلاف کچھ ہونا چاہیے تھا وہ انہی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ اصل مسئلہ تو ملک کی درماندہ تعلیمی حالت ہے۔ صوبہ پنجاب کی شرح خواندگی کو بڑھانا ہے جو مسلسل ۲۳ فیصد چلی آ رہی ہے۔ مڈل، میٹرک اور کالجوں کے نتائج اخبارات کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ بے شمار اداروں میں ایسے اساتذہ براجمان ہیں جو طلبہ کو مذہب و ملت سے بیگانہ کر رہے ہیں۔ کئی ان پڑھ مدرسین اب تک قومیائے گئے اداروں کے کاہن بنے بیٹھے ہیں۔ گزشتہ دس سال سے قوم کو جو پگڑی اچھال اور کھو کھلے وقار سے آراستہ مزاج دیا گیا ہے اسے سنوارنے کی کوششوں کی ضرورت ہے۔ آپ کا ''آپریشن کلینگ'' اس نالائق ڈاکٹر کے آپریشن جیسا ہے جو زخم سیتے ہوئے قینچی، تولیہ یا زنبور جسم کے اندر ہی سی دیتا ہے۔''

ڈپٹی ڈائریکٹر کسی کومے کے بغیر بے تکان مسلسل بات کیے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہ سب کچھ اس ناتواں پچھی مولوی نے کہہ دیا ہوگا؟ انھوں نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا فوراً پوچھا ''کیا تم یہ نہیں سوچ رہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا؟ میں نے تو ان سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ اصولوں کے نام پر سفاکی کر رہے ہیں۔'' میری خاموشی کا مفہوم یہی تھا کہ مجھے موصوف کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔

''میں خود حیران ہوں کہ میں نے اتنی باتیں کیسے کر لیں اور صاحب نے کس طرح سن لیں؟ لیکن تم اپنی فکر کرو۔ یونین نے تمہارے کارناموں پر مشتمل ایک یادداشت صاحب کو پیش کی ہے جسے صاحب نے اپنی حکمت عملی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے کہ صاحب یونین یا ایسوسی ایشن کے کہنے پر کسی پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ صرف ندوہ کی سفارشات ہی پر عمل کریں گے۔

چھ مہینے بعد ہی صاحب کا انداز بدل گیا۔ انہوں نے مسجد کے صحن میں ہفتہ وار درس بند کر دیا۔ سگریٹ کا دھواں سونگھنے اور سگریٹ پیتے افراد کے پیچھے بھاگنے کی عادت ترک کر دی۔

تبادلے تو ہوتے رہے لیکن اپنی نگرانی میں افسروں کی تختیاں اتروانے کا شوق ترک کر دیا۔ ندوۃ المفکرین کی تختی بھی اتار لی گئی، بہت سے تبدیل شدہ لوگ سیاسی اثر ورسوخ، علماء مشائخ کی سفارشات اور مذہبی عصبیتوں کے طفیل واپس آنے لگے۔ قدرتی طور پر ان کا رویہ انتقاماً صاحب موصوف سے بڑا جارحانہ اور معاندانہ رہا۔ بمشکل دو سال گزرے ہوں گے کہ ایک دن صاحب کے نام کی اپنی تختی بھی اتر گئی۔

اپنی پگڑی سے ہاتھ دھو بیٹھا
سب کی پگڑی اچھالنے والا

وقتِ وداع صاحب نے نظامت تعلیم، لاہور ڈویژن اور نظامتِ تعلیم پنجاب کے دفاتر کا الوداعی چکر لگایا تو کئی دل جلوں نے بھڑاس نکالتے ہوئے اخلاق کا دامن بھی چھوڑ دیا۔ وہ افسر اعلیٰ کے رسمی احترام کیلئے بھی اپنی نشست سے نہ اٹھے۔ 'صاحب' کا مصافحے کیلئے بڑھا ہوا ہاتھ بھی انتقام کے زیر اثر نہ تھاما۔ صاحب موصوف کی جابرانہ اور تحکمانہ حکمت عملی نے ان کے اچھے اور بھلے کاموں پر بھی پانی پھیر دیا تھا...... وقت کا تقاضا تب بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ نظم ونسق میں شائستہ جمہوری انداز اپنایا جائے اور کسی انضباطی معاملے کو ذاتی انا کا سوال نہ بنایا جائے۔

☆☆

سکول کیڈر کے اساتذہ مدت سے یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ کالج کیڈر کے اساتذہ کو ان کی نگرانی پر مامور نہ کیا جائے کیونکہ وہ سکولوں کے معاملات نہیں سمجھ سکتے۔ جہاں تک درس و تدریس کا معاملہ ہے سکول کا معلم بچوں میں علم کے بیج بوتا ہے جبکہ کالج کا معلم جوان طلبا میں علم بانٹتا ہے۔ حکومت پنجاب نے اچانک سکول اساتذہ کا یہ مطالبہ ہی منظور نہیں کیا بلکہ انگریزی کے اعلیٰ اساتذہ کی ترقی کا کلیہ بھی وضع کیا کہ مختلف گریڈوں میں یہ اساتذہ اپنی تعداد کی بنیاد پر کس شرح سے ترقی پائیں گے۔ بیسویں گریڈ میں ترقی پانے کی شرح ایک فیصد مقرر ہوئی۔ ڈی۔ پی۔ آئی سکولز کے عہدے پر اولین تقرری قاضی صغیر الحق صاحب کی ہوئی۔ موصوف نہایت اعلیٰ حسب ونسب اور شریف النفس تھے۔ تاہم وہ جلد ہی ریٹائر ہو گئے۔

محکمہ تعلیم میں درس و تدریس سے بے نیاز اور فن تعلیم سے نابلد افسروں کو فارغ افسروں کے پول سے کھپانے کی ایک روایت چلی آ رہی تھی۔ زراعت کی ڈگری والے ایک

افسر جو کئی برس پیشتر محکمہ تعلیم میں بھیجے گئے' انہیں سینیارٹی کی بنیاد پر انسپکٹر ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس تعینات کیا گیا تھا۔ ان کا نام میاں محمد شریف تھا۔ بول چال کا لہجہ تھانیداروں جیسا تھا۔ گالی گلوچ سے لدی ہوئی پنجابی زبان استعمال کرنا افسرانہ شان کا حصہ سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں ضلع لاپور کے تعلیمی دفتر میں اے۔ ڈی۔ آئی ترقیات تھا۔ مجھے ان کی طرف سے حکم ملا کہ میں ان کو پاتھی گراؤنڈ دکھاؤں جس کا تنازعہ محکمہ تعلیم کے ساتھ گراؤنڈ کے قابضین نے چلا رکھا ہے۔ میں اپنے لمبریٹا سکوٹر پر ان کو پاتھی گراؤنڈ لے گیا۔ اس پہلی ملاقات میں' مَیں نے ان سے گراؤنڈ' گراؤنڈ کے جھگڑے اور قابضین کے علاوہ متعلقہ محکمے کو مغلظات سناتے سنا۔

بعد میں لاہور جیسے مرکزی شہر کیلئے انہیں ناموزوں قرار دے کر ملتان کی ڈویژن میں بھیج دیا گیا۔ اب ان کو دوسرا ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سکولز تعینات کیا گیا تو چھوٹے عملے نے اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبا لیں۔ لیکن چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے بہت سے مدرسین' صدر معلم صاحبان اور دیگر انتظامی افسروں نے میاں شریف کی آمد پر تالیاں بجائیں اور سنہرے ہار ڈال کر ان کا استقبال کیا۔

سکولوں کے جداگانہ نظامتِ تعلیم کے قیام کا فیصلہ اس لحاظ سے مستحسن تھا کہ آئندہ ضلعی' ڈویژنل اور صوبائی سطح کے تمام افسر سکول کیڈر ہی سے منتخب ہونا تھے۔ کالجوں کے اساتذہ اب کالجوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ تعداد میں کمی کی وجہ سے ان کے انتظامی عہدے بھی کم پڑ گئے بلکہ کالج کیڈر کے جو سینئر ترین مدرس' بیوروکریٹوں کی جگہ سیکرٹری محکمہ تعلیم کے منصب تک پہنچے' ان کا ستارہ بھی گہنا گیا اور بڑے عہدوں پر ٹیکنوکریٹس کی تعیناتی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

☆☆

جن دنوں میں سنٹرل ماڈل سکول میں تھا تو پنجابی کے مشہور شاعر شریف صابر عرف بھاجی نے علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے......

ع...... گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

پر فکاہیہ گرہ لگائی۔

قاضی ذوالفقار کو اور بھی ذوالفقار کر
میاں نامدار کو اور بھی نامدار کر!

اور پھر یوں ہوا کہ اچانک میاں نامدار تو مرکزی تربیتی کالج کے پرنسپل کے عہدے

سے بطور ٹیکنو کریٹ سیکریٹری تعلیم، پنجاب مقرر ہوئے مگر میں اپنی جگہ بدستور قاضی ذوالفقار ہی رہا، میں نے شریف صابر سے کہا، بھاجی! آپ کی تضمین کا مصرعہ ثانی تو اپنے کامل معنوں میں کشف ہے۔ میاں نامدار تو واقعی اور زیادہ نامدار ہو گئے ہیں۔ البتہ ذوالفقار ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا، میرے بارے میں آپ کے مصرعے سے کوئی کرامت ظہور میں نہیں آئی۔ آخر کیوں...... موصوف نے موج میں آ کر فرمایا:

''قاضی صاحب!

ع..... آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

لندن میں قیام کے دوران میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ سے ایک پادری نے وحی کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا آپ وحی کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو علامہؒ نے فرمایا تھا۔ ''مجھ پر جب فکرِ شعر طاری ہوتی ہے تو میری اپنی حالت بدل جاتی ہے یوں لگتا ہے جیسے کوئی عظیم نادیدہ ہستی مجھ سے کچھ کہلوانے پر مامور ہے۔ جب مجھ جیسے چھوٹے موٹے شاعروں کے باطنی جذبوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی اور خدائے ذوالجلال امی نبیؐ پر اپنے ارشادات کس طور پر القا فرماتا ہوگا'' ...... ''بھائی قاضی''، وجدان بھی فطرت کا عطیہ ہے اور شعر دراصل کسی وجدان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر میرے شعر کا مصرع میاں نامدار کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے تو پہلا مصرع بھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ اور اس کے اچھے اثرات یقیناً نمایاں ہو کر رہیں گے۔

بھاجی تو اپنے ارشادات سنا کر چپ ہو گئے۔ مگر اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ کبھی کبھی وجدان پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں جو کبھی تو فوراً ظہور میں آ جاتی ہیں اور کبھی مستقبل کے نامحسوس نتائج کا ادراک بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ سراسر غیبی معاملہ ہے جس پر ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے...... بہرحال خدائے مقدس کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے ذوقِ خامہ فرسائی سے نوازا تبھی تو میں اوراق پر حرف و معنی کی مینا کاری اور دل کی جراحتوں کی نقش آرائیاں کرتا ہوں اور یوں قارئین کرام کی فکری ضیافت کرتا ہوں۔ ہر لحظہ میری صدائے حال یہی ہوتی ہے کہ داغ ہائے دل نمایاں کیے جاتا ہوں۔

☆☆

۱۷ اپریل ۱۹۸۲ء کو میری بھاوج کا زچگی میں انتقال ہو گیا۔ نوزائیدہ بچی اور چھوٹے

چھوٹے بچوں کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بھائی سیالکوٹ میں خوشنویس تھا اور روزانہ روزگار کی تلاش میں جاتا تھا۔ بچے سکول کے طالب علم تھے۔ میری اہلیہ نے بچی کو گود لے لیا۔ دیگر تمام رشتہ دار اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت خاموش رہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانا سہل نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اپنا تبادلہ ہی سیالکوٹ ضلع کے کسی سکول میں کرالوں اور لاہور سے نقل مکانی کر جاؤں۔ اپنے اس جذباتی فیصلے پر عملدر آمد کیلئے میں نے ڈی۔ پی۔ آئی صاحب کو ڈائریکٹر لاہور ڈویژن کی وساطت سے درخواست دی کہ مجھے ذاتی وجوہ کی بنا پر سمبڑیال کے گردونواح میں بطور ہیڈ ماسٹر ہائی سکول تبدیل کر دیا جائے۔ جب درخواست پر کوئی عملدر آمد نہ ہوا تو میں نے متعلقہ سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کیا' اس نے کہا کہ سیالکوٹ ضلع میں کوئی آسامی خالی نہیں۔

تھوڑے عرصے میں بھاوج کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا آپ ہی آپ بھر گیا کیونکہ بچی تو ہمارے پاس تھی' بھائی کی بڑی بیٹی نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے گھر سنبھال لیا۔ میں بڑے مطمئن انداز میں لاہور ڈویژن کی نظامت تعلیم میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک روز میرا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر یکم جنوری ۱۹۸۳ء سے قائم کی جانے والی نئی گوجرانوالہ ڈویژن کی ڈائریکٹوریٹ میں کر دیا گیا۔ اب یہ تبادلہ میرے لئے بوجھ بن گیا۔ کبھی میں رات گزارنے لاہور آ جاتا اور کبھی سمبڑیال بھائی کے ہاں چلا جاتا۔ کچھ عرصہ میں سمبڑیال سب ڈویژن کے اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر کے گوجرانوالہ شہر میں واقع مکان میں بھی رہا۔ ڈائریکٹوریٹ میں مجھے منصوبہ بندی و ترقیات کا شعبہ سونپا گیا۔ نئی ڈویژن سے متعلقہ زیادہ تر ریکارڈ لاہور ہی سے' اور تیسرا حصہ راولپنڈی سے حاصل کرنا تھا' میں نے وہ تمام ریکارڈ حاصل کیا' اسے ترتیب دی' ترقیات سے متعلقہ منصوبہ بندی کی' جاری منصوبوں کی ترقی کی رفتار اور تفصیلات الغرض مختلف رجسٹرات اور مسلیں تیار کیں۔ اس سلسلے میں میری سب سے زیادہ مدد قاضی شوکت علی نے کی جو گورنمنٹ ہائی سکول ابدال میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں نے ان کی ڈیوٹی ان کی منشاء کے خلاف عارضی طور پر گوجرانوالہ ڈائریکٹوریٹ میں لگوا لی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ برانچ بھی جان پہچان والے تھے' پہلے وہ دفتر تعلیم سیالکوٹ میں اسسٹنٹ تھے اور اب اپنی ترقی کے نتیجے میں گوجرانوالہ ڈویژن میں متعین ہوئے تھے۔ انہوں نے دن رات محنت کی۔ کام کی رفتار معمول پر آ گئی تو میں بھی گوجرانوالہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی منصوبہ بندی

کرنے لگا۔

☆☆

ابھی تک نئی ڈویژن کے ڈویژنل ڈائریکٹر کی تعیناتی نہیں ہوئی تھی۔ جن صاحب کا انتخاب کیا گیا تھا ان کو سمال انڈسٹریز کارپوریشن سے ناقص مال وصول کرنے کی بنیاد پر معتوب قرار دیا گیا تھا۔ ڈویژن کا کام مرزا نثار احمد ڈپٹی ڈائریکٹر ہی چلا رہے تھے۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ نئی ڈویژن میں مختلف اضلاع سے تبدیل ہو کر آنے والے بیشتر اہلکار اور افسر گوجرانوالہ شہر ہی کے رہنے والے تھے۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن لاہور سے وہاں گئے تھے۔ مجھے سن گن ملی کہ ہم دونوں کو ڈائریکٹوریٹ میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہاں کی رائج اصطلاح کے مطابق ہم 'شہر دار' نہ تھے۔ شہر دار کی اس نئی اصطلاح نے مجھے بھونچکا کر دیا کیونکہ سن گن دینے والے نے یہ بھی کہا تھا کہ شہر دار مجھے یہاں ٹکنے نہیں دیں گے اور اختر شاہ جو پہلے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کے دفتر میں اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر (ترقیات) تھا اور اب ترقی پا کر صدر مدرس گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ تعینات ہے' وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر (منصوبہ بندی ترقیات) کی اسامی پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا یقینی ہے۔ فلاں فلاں میاں جو اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے کی رسائی سیکرٹری تعلیم تک ہے' اس نے اختر شاہ سے وعدہ کر لیا ہے کہ جونہی کوئی ڈائریکٹر تعینات ہو کر آتا ہے' وہ اختر شاہ کو شہر میں لے آئے گا اور مجھے اس کی جگہ گکھڑ بھجوا دیا جائے گا۔ میں نے تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کا تکلف نہیں کیا اور گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کرنے کی منصوبہ بندی ترک کر دی۔

چند ہی دنوں بعد جامعہ سکولوں کے کیڈر کے ایک سینئر پرنسپل کو ناظم نظامتِ تعلیم گوجرانوالہ ڈویژن تعینات کر دیا گیا۔ موصوف کچھ مریض تھے' راولپنڈی کے رہنے والے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے دفتر سے ملحقہ کمرے ہی میں رہائش اختیار کر لی اور مقامی طور پر تعینات شہر دار اسسٹنٹ ڈائریکٹروں نے ان کے علاج معالجے اور خورونوش کی ذمے داری سنبھال کر ان کو ممنون و متشکر کر لیا۔ واقعی چند ہی دنوں بعد انہوں نے اختر شاہ شہر دار کی جگہ میرا تبادلہ بطور ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ کر دیا۔ یوں میری مسافت کا فاصلہ دس (۱۰) میل اور بڑھ گیا جبکہ اختر شاہ اپنے شہر لوٹ آیا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ڈائریکٹر صاحب شدید بیمار ہو کر رخصت پر چلے گئے اور

ساتھ ہی صدر جنرل ضیاء الحق نے گوجرانوالہ شہر کے دورے کا منصوبہ بنالیا۔ ان کی آمد کی وجہ سے ان کے ورود کیلئے تمام محکموں میں ہنگامی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وقت کے تقاضے کے پیش نظر عارضی طور پر ڈویژنل ڈائریکٹر کالجز ڈاکٹر امتیاز احمد کو سکولز ڈائریکٹوریٹ کا اضافی چارج بھی دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب رعب دار اور کارکن آدمی تھے۔ انہوں نے ڈپٹی ڈائریکٹر کو بلا کر جو ہدایات دیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ نظامت تعلیم سکولز کا کوئی افسر صدر پاکستان کے دورے تک رخصت پر نہیں جائے گا اور نہ ہی کسی کا تبادلہ کیا جائے گا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب نے میرے متعلق خاص طور پر پوچھا کہ کیا وہ مجھے فارغ کر دیں کیونکہ میرا تبادلہ تو ہو چکا ہے اور دوسرا آدمی حاضری کیلئے بے تاب ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ کیا وہ ان کو اپنی ہدایات واضح طور پر نہیں سمجھا سکے؟ کوئی تبادلہ ہو گا نہ تبادلے پر عملدرآمد!

اعداد و شمار اور منصوبوں سے متعلق معلومات کے سلسلے میں میری اور ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کی حاضری تقریباً روزانہ کالج کی نظامت میں ہونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب کا لہجہ ایسا اور دبدبہ اس قدر تھا کہ میرے ڈپٹی ڈائریکٹر مرزا صاحب جب ڈاکٹر موصوف سے جھڑک کھا لیتے تو میرا ہاتھ دبا کر مجھ سے پوچھتے ''کیا میں اس 'بلا' سے بچ جاؤں گا' کیا میں صدر ضیاء الحق کے 'جلسے تک زندہ رہوں گا؟''

میں ان کو تسلی دیتا اور کہتا کوئی بات نہیں مرزا صاحب...... دو ہی ہفتے کی چھٹی ہے ڈائریکٹر صاحب کی۔ مرزا صاحب کہتے 'یار...... ان ایام میں میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔ لیکن میں ان کا ساتھ رات گئے چھوڑ دیتا اور رات بسر کرنے لاہور آ جاتا یا سمبڑیال چلا جاتا۔

☆☆

میں بھی ڈاکٹر امتیاز چیمہ سے خوفزدہ تھا۔ اس لیے کہ ترقیات کے تمام اعداد و شمار کی تیاری کی ذمہ داری میری تھی اور ڈاکٹر مذکور کو سکولز کی نظامت کی کوئی رپورٹ' کوئی دستاویزی بیان اور کوئی عرض داشت پسند نہیں آ رہی تھی۔ وہ جھاڑتے اور سمجھاتے تو ڈپٹی ڈائریکٹر کو تھے اور کانپ میں جاتا کہ کہیں ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ بھئی تم کیا تیار کرتے ہو کہ ڈاکٹر صاحب کو کچھ پسند ہی نہیں آ رہا۔ مگر یہ مرزا نثار صاحب کا ظرف تھا کہ انہوں نے میرے خلاف کوئی بات کر کے اپنا بچاؤ نہیں کیا۔ ہاں علیحدگی میں مجھ سے پوچھتے تھے کہ 'یار' یہ ڈاکٹر کیا چاہتا ہے؟

میں کہتا ''آپ افسر ہیں؟ آپ ہی ان سے پوچھ سکتے ہیں؟''

وہ فرماتے ''کیا تم اب بھی نہیں سمجھے کہ وہ کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں نے تو پہلے بھی وہی کچھ تیار کیا تھا جو انہوں نے سمجھایا تھا۔ اب کوئی بات لکھی ہوئی تو موجود نہیں بس وہ آہستہ سے کہہ دیتے ہیں کہ میں نے تو یوں کہا تھا حالانکہ ایسا کہا نہیں ہوتا تھا۔''

لطف کی بات یہ تھی کہ ڈائریکٹر صاحب اپنا دفتر بھی رات دیر تک کھلا رکھتے تھے اور ہمارا ان کی منشائے مبارک تک دفتر میں حاضر رہنا ضروری تھا' یہ ہماری مجبوری تھی۔

☆☆

۱۹۵۲ء میں جب میں کارپوریشن میں ملازم تھا تو میں 'قاضی کی کٹڑی' (جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) میں رہتا تھا' میرے محسن ہاشمی صاحب کے علاوہ وہاں ایک درویش منش پاکیزہ طبیعت کے بزرگ قاضی محمد طفیل بھی رہتے تھے۔ وہ کٹڑی کے مالک کے دور پار کے رشتے دار بھی تھے' ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد اقبال سپرنٹنڈنٹ دفتر صدر بوائز سکاؤٹس ایسوسی ایشن پنجاب والٹن لاہور مالک کٹڑی قاضی عبدالطیف کے داماد تھے۔ مالک کٹڑی کے صاحبزادے عبدالقیوم قریشی ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین اور پھر محکمہ تعلیم حکومتِ پنجاب کے سیکرٹری بھی رہے۔

قاضی طفیل صاحب مجھ سے محبت اور شفقت سے پیش آتے' شاید اس لیے کہ میں بھی ایک غریب الوطن قاضی تھا۔ ان کا دو تین سال کا بچہ ممتاز عرف 'گھوڈی' مجھ سے اتفاقاً بڑا مانوس ہو گیا۔ وہ میری آواز سنتے ہی گھر سے نکل آتا اور میرے پاس آ بیٹھتا' وہ تھا بھی بہت پیارا گول مٹول سا' مجھ سے ادھر ادھر کی چیزوں کے بارے میں پوچھتا رہتا اور میں بھی اسے اس کی توتلی زبان میں بتاتا تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ کبھی کبھار میں اسے چھٹی کے دن ادھر ادھر سیر کرانے لے جاتا۔ اس دور میں حیا اور وفا کا چلن تھا۔ محبت و مروت کی کارفرمائی تھی۔ دنیا آج کی طرح خود غرض نہیں ہوئی تھی اور نہ آج کی طرح دیدوں کا پانی مرا تھا۔ وہ مجھے لال یا لعل کہا کرتا تھا۔ کبھی اس کے گھر والے اسے میرے پاس آنے سے روکتے تو وہ احتجاجاً لال' لال کہہ کر صدائیں دیتا اور روتا چلا جاتا ناچار اس کا بڑا بھائی یا خود قاضی محمد طفیل اسے میرے پاس چھوڑ جاتے اور کہتے۔ ''جاؤ اپنے لعل کے پاس۔''

ہماری محبت مسلسل بڑھتی رہی۔ ایک روز میں اسے چڑیا گھر لے گیا۔ وہاں میں نے اسے گود میں اٹھا کر منٹ کیمرے سے فوٹو بنوایا۔ منٹ کیمرے والے فوٹو کا نیگیٹو بھی فوٹوگرافر فوٹو کے ساتھ اسی وقت دے دیتے تھے۔ میں نے اصل فوٹو تو اپنے پاس رکھ لیا اور نیگیٹو کے پیچھے ''دو بھوت'' لکھ کر گھوڑی کو دے دیا۔ اور پھر ہمارا ساتھ میری تعلیم کی وجہ سے چھوٹ گیا۔

صدر ضیاء الحق کے گوجرانوالہ میں آنے کے ہنگامہ خیز دنوں کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر سے نکل کر ڈائریکٹر کالجز کے دفتر جا رہا تھا کہ مجھے اپنے دفتر کے باہر جو جامعہ ہائی سکول کی عمارت میں واقع تھا، قاضی محمد طفیل کی شبیہہ کا ایک شخص نظر آیا۔ پاس پہنچا تو میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے شناخت کر لیا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ تیس برس کے بعد بھی ان کی شکل وصورت اور وضع قطع میں کم ہی فرق آیا تھا۔ بولے، تم نے ملنا جلنا چھوڑ دیا لیکن ہم نے تمہارا کھوج نکال لیا ہے۔ مجھے ان کی محبتیں، دعوتیں، راہنمائی اور دلجوئی کی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ پچیس تیس سال پہلے کے دھندلے مناظر ذہن کے پردوں پر تواتر سے نمایاں ہو کر اترتے رہے۔ میں نے 'گھوڑی' کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ یہاں گوجرانوالہ ہی کے گورنمنٹ کالج میں سائنس کا لیکچرار ہے۔ ڈپٹی کمشنر روڈ پر اپنا گھر بنا رکھا ہے، تمہیں وہیں آنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔

میں نے گھوڑی سے بڑے بھائی اور بڑی بہن کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ بھائی تو ویسٹ ریجنل لیبارٹری لاہور میں ریسرچ آفیسر ہے۔ اس کی بھی اور بیٹی کی بھی شادی کر دی ہے۔ میں اور بچوں کی ماں دونوں گھوڑی اور جاجی کے ساتھ ادھر گوجرانوالہ ہی میں رہتے ہیں۔ جاجی (اعجاز) ان کا وہ بیٹا تھا جو میرے ان سے بچھڑ جانے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی گورنمنٹ کالج ہی میں جغرافیہ کا لیکچرار تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ ماضی کی باتیں اور ان کے شفقت و محبت سے ملنے والی راحتوں کا ذکر کروں گا اور ان کی مزید دعائیں لوں گا لیکن اس وقت میں اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر کے ساتھ ڈائریکٹر کالجز کے ہاں بسلسلہ ورودِ صدر پاکستان جا رہا ہوں کیونکہ ڈائریکٹر کالجز کو وہم ہو گیا ہے کہ صدر پاکستان صرف محکمہ تعلیم ہی کا جائزہ لینے آ رہے ہیں۔ فرمایا ''نفسیات کے آدمی ہیں نا، کوئی ابہام ہو ہی جاتا ہے۔'' اتنے میں میرے ڈپٹی ڈائریکٹر ''چل بھئی، چل'' کہتے آ گئے۔ ''کھا جائے گا، دیر ہو رہی ہے۔'' ایسے میں محترم قاضی صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں فرصت پاتے ہی ان کے ہاں پہنچوں گا۔

ڈائریکٹر کالجز کے دفتر میں حسب معمول رات ہو گئی۔ جو اعداد و شمار ہم نے کئی دنوں کی

ذلت وخواری اور جھڑکیوں کے بعد تیار کیئے ان میں سے کچھ ٹائپ نے دھیمے اور کچھ شوخ کر دیئے تھے۔ انہی دنوں نئی نئی فوٹوسٹیٹ مشین ڈائریکٹر کالجز کے دفتر میں رکھی گئی تھی۔ اس پر ہماری ٹائپ شدہ اعداد و شمار کا پرنٹ نکالا گیا جو اچھا نہ آیا' لہٰذا وہ صدر پاکستان کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل نہیں تھا۔ آخر کو ہم ماسٹر لوگ تھے' سلیقہ اور قرینہ کہاں سے آتا؟۔ حسب سابق جھاڑ کھا کر ہم ڈائریکٹر صاحب کے دفتر سے نکلے کہ مجھے ایک دبلا پتلا نوجوان پرتپاک اور بڑے ادب سے ملا۔ اس نے پوچھا کہ ''کیا آپ قاضی ذوالفقار احمد ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے بتایا کہ میں آپ کا گھوڑی ہوں...... یہ سنتے ہی میں نے فرطِ محبت سے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔ مرزا نثار مجھے باہر کھینچ رہے تھے اور میں ان سے چند لمحے رک جانے کو کہہ رہا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب نے ہمیں حکم دیا تھا کہ تمام کاغذات بازاری مشین پر خوبصورت انداز میں ٹائپ کروا کر دو گھنٹے میں واپس آؤ۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہمارے پاس وقت کم تھا لیکن ملنے کیلئے آنے والا اور پھر گھر لے جانے والا نوجوان بھی تو مجھے تیس برس بعد ملا تھا۔ کیا بتاؤں' وہ مجھ سے مل کر کتنا خوش ہو رہا تھا۔ جبکہ میں تو ہوں ہی جذباتی انسان...... میں بھی بے حد خوش تھا۔ برخوردار سے میری رسمی گفتگو ہو رہی تھی اور مرزا صاحب میرے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہے تھے کہ اگر ڈائریکٹر نے ہمیں یہیں دیکھ لیا تو ان کا دم نکل جائے گا۔ مرزا صاحب کی خاطر بھی عزیز تھی اور ممتاز گھوڑی سے بھی محبت کا رشتہ تھا۔ مجبوراً مجھے ممتاز کو ٹالنا پڑا۔ دفتر کے برآمدے میں ممتاز سے ملاقات کو بھی اب انیس برس ہو رہے ہیں پھر اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ واہ ری گردشِ دوراں!

ٹائٹل کی پشت پر طبع تصویر میں آپ جس نوجوان کو ایک بچہ گود میں اٹھائے دیکھ رہے ہیں...... تو نوجوان خود میں ہوں اور بچہ...... گھوڑی ہے۔ یہ تصویر 'دو بھوت' کے عنوان والے نیگیٹیو سے بڑی کروا کر مجھے محمد یوسف اکرام الحق' عزیزی ممتاز کے بڑے بھائی نے فراہم کی ہے۔ یوسف صاحب سے تو ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں لیکن ممتاز سے ملاقات ابھی تک باقی ہے۔ زمانے اور زندگی کے ریلے انسانوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں حتیٰ کہ محبت کے رشتے بھی گردِ فراموشی سے اَٹ جاتے ہیں۔

◆◆◆◆◆

(۳۹)

میگا سٹار

محکمہ تعلیم کے انتظامی عہدوں پر متمکن حضرات عام طور پر اس لیے غیر معمولی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دیگر ہم سفروں کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنیادی طور پر وہ سترہویں گریڈ کے افسر ہیں لیکن اسامی اٹھارہویں گریڈ کی سنبھالے ہوئے ہیں اور کوئی دوسرا امیدواران کے درپے نہیں ہے۔ ان غیر معمولی حضرات کو میں سٹار (ستارے) کہتا ہوں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ستاروں میں زیادہ تعداد ہم جیسے عام ستاروں کی ہے۔ محکمہ تعلیم میں روشن ستارے وہ شمار ہوتے ہیں جو شہر لاہور میں محکمے کے انتظامی اور بااختیار عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کو ہم سلور سٹار یا گولڈ سٹار کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

حمید اللہ چودھری کو میں اس کے اے۔ڈی۔ آئی ہونے کے زمانے ہی سے سپر سٹار کہنے لگا تھا کہ اس میں 'کاہڈا' ہونے کی صفت کے علاوہ آگے بڑھنے' دوست بننے اور بنانے' ہر کسی کے کام آنے اور ناراض ہو کر راضی ہو جانے جیسی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں اور اس کی ضرورت ہر چھوٹے بڑے افسر کو تھی۔ سترہویں اور اٹھارہویں گریڈ میں ترقی پانے کے بعد بھی وہ ریٹائرمنٹ تک لاہور ہی میں رہا اور افسری کرتا رہا۔ صرف ایک شخص چودھری نذیر احمد بھٹہ اس کے مقابلے میں ارضی وسماوی آفات کی یلغار کے باوجود نمایاں ستارے کی طرح جگمگاتے رہے۔ میں ہی نہیں بہت سے دوست اِسے 'میگا سٹار' کہتے رہے اور آج بھی اسی لقب کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ایک کامیاب اے۔ڈی۔ آئی تھے کہ اچانک ان کے متعلق خبر آئی کہ وہ ڈیپوٹیشن پر لاہور کارپوریشن کے سکولوں کے 'ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ' تعینات ہو گئے۔ صاف ظاہر تھا۔ یہ غیر معمولی عہدہ حاصل کرنے کے لئے لاہور جیسے شہر میں انہوں نے اپنے مقابلے میں بہت سے امیدواروں کو پچھاڑا ہوگا۔ ان دنوں کارپوریشن کے میئر میاں شجاع الرحمٰن تھے۔

یار لوگوں نے کہانی گھڑی کہ نذیر بھٹہ صاحب بی۔ایس۔سی ہیں، گورنمنٹ ہائی سکول لاہور چھاؤنی میں کامیابی سے سائنس کے مضامین پڑھاتے رہے ہیں ساتھ ہی وہ فلاں جج صاحب کی بیٹی کو ٹیوشن بھی پڑھایا کرتے تھے جو کہ میاں شجاع الرحمٰن کے رشتے دار تھے۔ میاں شجاع الرحمٰن کو بھی اپنے بچوں کیلئے سائنس مدرس کی ضرورت پڑی تو جج صاحب ہی نے موصوف کو ان کے ہاں بھیج دیا۔ یوں انہوں نے کارپوریشن کے 'ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ' کی اسامی میاں صاحب سے براہ راست تعلق کی بنا پر حاصل کی۔ حیرت اس بات پر تھی کہ ان کو ابھی ابھی سترھواں گریڈ ملا تھا اور اسامی ان کے علمی قد وقامت سے بہت اونچی تھی۔

حاسد لوگ ان کو سفاری سوٹ پہنے جیپ پر سوار ادھر ادھر آتے جاتے دیکھ کر جلتے بھی رہے لیکن کوئی ان کو ان کے منصب سے ہلا نہیں سکا تا آنکہ ان کی ڈیپوٹیشن کی مدت جو دو یا تین سال کی تھی، انجام کو پہنچی اور اس باوقار اور بااختیار اسامی کو بالآخر خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن میگا سٹار، اس ظاہری زوال کے بعد بھی میگا سٹار ہی رہا۔

☆☆

محکمے میں ایک صاحب چودھری بشیر احمد صوبہ بلوچستان سے ''ری پیٹری ایٹ'' ہوکر آئے تھے، ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے محکمہ تعلیم کے مجاز افسروں نے انہیں بطور سیکشن افیسر سیکرٹریٹ میں متعین کر رکھا تھا۔ چونکہ خاصے ذہین اور ملنسار تھے اس لیے محکمے کے دیگر چھوٹے بڑے افسر بھی ان کو خوب جانتے تھے اور سیکرٹریٹ میں پھنسے ہوئے اپنے کام نکلوانے کے لئے ان کی اعانت بھی حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہ بھی اکثر کارِ سرکار میں ماتحت دفاتر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کی اٹھارہویں گریڈ میں ترقی ہوئی تو ان کو ضلع لاہور کا ضلعی افسرِ تعلیم تعینات کر دیا گیا جہاں وہ جانفشانی سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ ان کے ماتحت عملے میں دو ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر ملک عبدالمجید اور نبی بخش صابر تھے۔

ایک روز چودھری بشیر احمد نے ان دونوں کو بلایا اور رازداری سے کہا کہ وہ سیکرٹریٹ گئے تھے اور وہاں کسی ڈپٹی سیکرٹری نے ان کو جو کچھ بتایا ہے اس کے تحت تم دونوں میں سے کسی ایک کا اس دفتر سے جانا یقینی ہے کیونکہ نذیر بھٹہ صاحب لاہور کارپوریشن سے فارغ ہو گئے ہیں اور ان کے احکامات دفتر ہذا میں بطور ڈپٹی ایجوکیشن افسر جاری ہو رہے ہیں۔ آپ لوگ کوئی بھاگ دوڑ کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ دونوں ڈپٹی فکرمند ہو گئے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آ رہی

ہے یقیناً انہوں نے اپنی سی بھاگ دوڑ بھی کی ہوگی۔

چودھری بشیر احمد ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر اپنے ماتحت ڈپٹی صاحبان کو محکمے کی تازہ نکلنے والی خبر قبل از وقت سنا کر ماتحت پروری فرما رہے تھے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ''میگا سٹار'' کا رخ ان کی اپنی ہی کرسی کی طرف ہے۔ سیکرٹریٹ میں سالہا سال خدمات سرانجام دینے کے باوجود ان کو کسی نے نہیں بتایا کہ نذیر بھٹہ صاحب اب بطور ماتحت گریڈ سترہ کی ڈپٹی ایجوکیشن افسر کی اسامی نہیں بلکہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر ضلع لاہور کینٹ کی اٹھارہویں گریڈ کی اسامی پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگلے ہی روز قوانین میں نرمی کر کے نذیر بھٹہ کو چودھری بشیر احمد کے بجائے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر لاہور کینٹ تعینات کر دیا گیا۔ وہ افسر جو اپنے ڈپٹی صاحبان کو اپنی فکر کرنے کو کہہ رہا تھا اسے اب اپنی ہی پڑ گئی۔ انہیں بطور افسر بکار خاص ڈی۔ پی۔ آئی کے پاس بھیج دیا گیا۔ ڈپٹی صاحبان اپنی جگہ پر قائم تو رہے لیکن اب وہ اپنے سے جونیئر شخص کو جناب بھٹہ صاحب کہنے پر مجبور تھے۔

یہ بھٹہ صاحب وہی چودھری نذیر احمد بھٹہ تھے جنہوں نے مجھ خاکسار سے اے۔ ڈی۔ آئی لاہور وسطی کا چارج لیا تھا اور تاخیر سے چارج لینے کے بارے میں میرے استفسار پر مزاحاً کہا تھا کہ وہ اتنا بڑا عہدہ پا کر اپنی گاڑی پر لہرانے کیلئے چھوٹا سا پرچم تیار کروا رہے تھے اور پرچم تیار ہو جانے کے بعد وہ گاڑی کی تلاش میں تھے پھر انہوں نے مجھ ہی سے لمبریٹا سکوٹر خریدا تھا۔ اس انقلاب پر مجھے ملک غلام حیدر بہت یاد آئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم کو سفارش کرانی ہے تو سفارش تگڑی اور صحت مند ہونی چاہیے۔ مریل یا کوڑھی سفارش ہو جانے والے کام کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ بھٹہ صاحب کی سفارش گو غائبانہ تھی لیکن اس کے توانا اور مؤثر ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔

میں جن ایام کی بات کر رہا ہوں ان دنوں سیکرٹری تعلیم احمد صادق جیسے بیوروکریٹ، ڈی۔ پی۔ آئی سکولز میاں محمد شریف جیسے تھانیدار تھے۔ ڈویژنل ڈائریکٹر لاہور ڈویژن ملک غلام محمد جیسے سرد وگرم چشیدہ گھاگ افسر تھے۔ لاہور کو اگر پنجاب کی پرائمری، وسطانی، ثانوی اور کلیاتی تعلیم کا مرکزی برج کہا جائے تو اس برج میں اس وقت دو ستاروں میگا سٹار اور سپر سٹار کا قِران تھا (جب دو سیارے ایک ہی برج میں اکٹھے ہوتے ہیں تو اسے انجم شناس قِران کہتے ہیں)۔ چودھری نذیر احمد بھٹہ لاہور کینٹ کے اور چودھری حمید اللہ لاہور سٹی کے ضلعی افسران

تعلیم تھے۔ ایک ہی برج میں ہونے کے باوجود وہ اپنے اپنے مدار پر محوِ گردش رہے۔ دونوں دوست بھی تھے لیکن اندر خانے چشمک بھی چلتی تھی۔ مثال کے طور پر حمید اللہ کو بھٹہ صاحب سے یہ شکایت رہی کہ بھٹہ صاحب کے پاس مالیاتی اور انتظامی امور کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل دو حاجی سپر نٹنڈنٹ صاحبان ہیں جن کی وجہ سے وہ غیر معمولی طور پر کامیاب جا رہے ہیں۔ وہ کیوں ایک حاجی سپر نٹنڈنٹ ان کو نہیں دے دیتے تاکہ طاقت کا توازن برقرار رہے۔ یہ دو اپنے وقت کے نامی گرامی سپر نٹنڈنٹ حاجی بشیر احمد اور حاجی محمد صدیق تھے اور یہ اول الذکر حاجی ہی تھے جنہوں نے مجھے 'لوتی لفافہ' دیا تھا مگر تب وہ حاجی تھے نہ سپر نٹنڈنٹ، محض چھوٹے سے خزانچی تھے

ایسے اساتذہ کرام جو مدتوں سے اٹھارہویں گریڈ میں تعینات تھے اور تعلقات والے بھی تھے، بھٹہ صاحب کے لاہور کارپوریشن میں ایجوکیشن سپر نٹنڈنٹ مقرر ہونے پر صرف زبانی کلامی تبصرے کر کے خاموش ہو گئے تھے کہ بلدیاتی ادارے میں ڈیپوٹیشن کا معاملہ تھا اور اس میں سارا کردار کارپوریشن کے کرتا دھرتا افراد کا تھا لیکن اب تو محکمہ تعلیم نے سترہویں گریڈ کے افسر کو ان کے سر پر لا بٹھایا تھا اور وہ بھی لاہور شہر میں...... جہاں بڑی بڑی 'بلائیں' ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ انہوں نے درخواستیں داغیں، اساتذہ کی چھوٹی بڑی تنظیموں سے حکومت کو عرضداشتیں بھجوائیں، اخباری بیان شائع کرائے، انصاف دلانے والی تنظیموں سے پریس کانفرنسیں کرائیں کہ بھٹہ صاحب میں کیا خوبی ہے؟ کون سی قابلیت ہے، کون سی مخصوص اہلیت ہے کہ ان کو اتنا بڑا عہدہ دے دیا گیا ہے جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کے استحقاق پر ڈاکہ ڈالا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جس طرح ان کے بخیے ادھیڑے گئے اور ان کی جس قدر مخالفت ہوئی، اور کردار کشی کے لئے جو جو حربے استعمال کیے گئے وہ اگر مجھ جیسے شخص کے خلاف استعمال ہوتے تو میں عافیت کی تلاش میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سفارشی شخصیت ان کے سر سے اپنا دستِ شفقت یہ کہہ کر اٹھا لیتی کہ بس بھئی بس۔ کافی ہو چکی ہے...... کہیں میرا کھوج لگا لیا گیا تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔ مسٹر بھٹہ کو کوئی مائی کا لال اس وقت تک ان کے منصب سے ہٹایا ہٹوا نہیں سکا جب تک کہ انہوں نے خود ثانوی تعلیمی بورڈ میں بطور کنٹرولر امتحانات جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ انہیں ''کنٹرولر امتحانات'' تعینات کر دیا گیا، گویا میگا سٹار اپنے برج سے نکل آیا تھا۔ انہوں نے ایک

ہی دفعہ امتحانات لیے تھے کہ ان کے مقدر کے برج سے کوئی دوسرا برج ٹکرا گیا اور گردش ایام نے ان کو معطل کرا دیا۔ ابتلا کا دور آیا اور گزر گیا لیکن ازاں بعد وہ عام سٹار بھی نہ رہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ میں میگا سٹار کے ساتھ ہی سپر سٹار کے خروج کی عبرت انگیز کہانی بھی لکھتا اور گردش ایام کا ایک مزید رخ آپ کو دکھاتا لیکن سپر سٹار ۱۹۹۵ء تک اسی برج میں رہا۔ بہر حال اس کا ذکر باقی ہے اور آگے ہے۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد آپ کو ان حالات سے آگاہ کرنا ہے جن سے پنجاب کا پورا تعلیمی نظام متاثر ہو رہا تھا۔ اس نظام تعلیم میں، مَیں خود بھی شامل تھا۔ میں صرف تماشائی نہیں بلکہ ایک فعال کردار بھی تھا۔ ایک طرف میں نے کچھ عہد و پیمان اپنے ضمیر سے کر رکھے تھے تو دوسری طرف مَیں بدستور میں ''لوت'' کی گرفت میں بھی تھا اور میری حالت ڈولتی ڈگمگاتی کشتی جیسی ہو رہی تھی۔ غالب مرحوم کے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ میری حالت یہ تھی ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

☆☆

صدر ضیاء الحق گوجرانوالہ آ کر چلے گئے۔ ڈویژنل ڈائریکٹر بھی اپنی چھٹی ختم کر کے واپس آ گئے۔ اب میرے تبادلہ پر عملدر آمد یقینی تھا۔ مَیں نے بھی ایک سفارش تلاش کی جو تگڑی تو نہ تھی مگر اتنی گئی گزری بھی نہیں تھی۔ میاں اشتیاق احمد سلیمی ڈی۔ای۔او زنانہ کے دفتر کے اسسٹنٹ تھے ان کے ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز سکولز رانا محمد اکرام سے خصوصی تعلقات تھے۔ میاں صاحب نے رانا محمد اکرام کو میری سفارش کی کہ گکھڑ کی بجائے ان کو لاہور یا قصور میں تبدیل کیا جائے۔ انہوں نے مجھے مایوس کیا وہ اس طرح کہ انہی دنوں لاہور ڈویژن میں قصور کے ڈپٹی ایجوکیشن افسر جواد حیدر نقوی، انتقال کر گئے چنانچہ یہی ایک اسامی خالی تھی اور ڈپٹی ڈائریکٹر کے خیال میں وہاں دوبارہ قاضی کا تقرر خلاف مصلحت تھا۔

نچلی سطح پر متعلقہ اسسٹنٹ مسٹر زیدی کو میری سفارش شبیر احمد سپرنٹنڈنٹ نے کی۔ شبیر احمد طبعاً ہر شخص کی بھلائی کرنے والا آدمی تھا۔ ادھر مسٹر زیدی نے کسی اور سے اس اسامی کا وعدہ کر رکھا شبیر احمد سے اسسٹنٹ نے پوچھا کہ وہ قاضی کی سفارش قصور کیلئے کیوں کر رہا ہے؟ اسے تو ماضی میں وہاں سے شکایت پر تبدیل کیا گیا تھا۔ اس کا اور قاضی کا کیا تعلق ہے؟ شبیر احمد

نے اسے جواب دیا کہ جہاں تک قاضی سے اس کے تعلق کی بات ہے تو اس کے ساتھ اس کا تعلق وہی ہے جو اس کا پوچھنے والے یعنی مسٹر زیدی کے ساتھ ہے۔ رہا اس کا ماضی میں تبادلہ......تو اس نے زیدی کی خالہ کی سفارش بھی تو بطور ہیڈ مسٹریس تعیناتی کیلئے کی تھی حالانکہ وہ تو معطل بھی رہی تھی...... قاضی کی سفارش کا جواز یہ ہے کہ وہ بہاولپور روڈ پر رہتا ہے وہاں سے اسے قصور آمدورفت میں آسانی رہے گی۔

قصہ کوتاہ گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ میں میرا تبادلہ منسوخ کر کے مجھے ایک بار پھر ڈپٹی ایجوکیشن افسر قصور مقرر کر دیا گیا۔ قصور میں ڈپٹی۔ڈی۔ای۔او کے میرے پہلے دور اور دوسرے دور کے درمیان جون ۱۹۷۹ء سے لے کر اپریل ۱۹۸۳ء کا زمانی فاصلہ تھا۔ بظاہر حالات بڑے موافق تھے تاہم ملنے جلنے والے اساتذہ کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے جون ۱۹۷۹ء میں قصور سے چلے جانے کے بعد بھی وہاں حالات کی چال بے ڈھنگی ہی رہی ہے۔ البتہ اس عرصے میں ڈپٹی صاحبان سے اگرچہ یونین کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا لیکن جو ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران آئے ہیں ان سے بھی پنجاب ٹیچرز یونین کا اور دیگر رہنما قسم کے اساتذہ کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔

چودھری اکرام الحق کے تبادلے کے بعد ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر صوفی عبدالقیوم لالہ موسیٰ سے تشریف لائے۔ صوفی صاحب بے باک، مزاج کے کڑوے کسیلے اور دو اور دو کو چار ہی کہنے والے فرد ہیں۔ مصلحتوں کے ہیر پھیر میں نہیں پڑتے۔ اتفاق کی بات کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کے ہم زلف تھے۔ اور ہم زلف ایسے کہ بقول شخصے ہم زلفی کا کیا رشتہ؟ بالکل ایسے جیسے دو تین افراد مختلف اوقات میں جوتوں کی کسی دکان پر جائیں اور ایک ہی ساخت اور چمڑے کا جوتا پسند کریں، خریدیں اور پہن کر لوٹ آئیں۔ پھر زندگی بھر جوتوں کی خبر ملے نہ جوتے پہننے والوں کی۔ بس ان سے رشتہ داری اسی نوعیت کی تھی۔

میں اس رشتہ داری میں ایک ایسا فرد تھا جسے ملازمت کی وجہ سے صوفی عبدالقیوم سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ وہ ڈاڑھی کی لمبائی کو مستثنیٰ کر کے باقی پوری شکل و شباہت، لباس، ٹوپی اور مزاج کے لحاظ سے مجھے ہمیشہ سردار عبدالقیوم سابق صدر آزاد کشمیر جیسے نظر آئے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے اپنے اس احساس کا ذکر لاہور کی ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ میں کیا تو انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے کہ ”تم نے میرا تعلق ایک عظیم شخصیت سے جوڑا ہے حالانکہ چہ

نسبت خاک را بہ عالم پاک' میرے رشتہ دار تو میرے متعلق کچھ اور ہی رائے رکھتے ہیں"۔

قصور میں پنجاب ٹیچرز یونین کے عہدیداروں کی رائے بھی ان کے خلاف تھی۔ وہ کوئی غلط کام کرتے تھے نہ ہونے دیتے تھے جبکہ زمانے اور زندگی کے رویئے اور رفتار بدل چکی تھی۔ سفارش اور پیسے کے زور پر کام ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوفی عبدالقیوم کے خلاف بھی ایک مہم چل نکلی۔ کردار کشی کرنے والوں کی فردِ جرم میں ان کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ تو قاضی ذوالفقار احمد سابقہ ڈپٹی کے رشتہ دار بھی ہیں۔ ڈپٹی کمشنر قصور نے صوفی عبدالقیوم سے پنجاب ٹیچرز یونین کے ایک شکایتی پلندے کے بارے میں جواب طلب کیا تو صوفی عبدالقیوم صاحب نے بڑا مدلل اور واضح جواب اسسٹنٹ کمشنر کو لکھا تا کہ وہ محکمہ تعلیم کے عمومی حالات سے ڈپٹی کمشنر کو آگاہ کر سکیں۔ صوفی صاحب کا یہ جواب ایک علمی معلوماتی اور ادبی دستاویز ہے' جسے یہاں من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ آج کے حالات کی تشکیل ہم ماضی میں کن خطوط پر کرتے رہے ہیں۔

☆☆

منجانب: صوفی عبدالقیوم ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر قصور

بخدمت: جناب اسسٹنٹ کمشنر صاحب قصور

عنوان: صدر پنجاب ٹیچرز یونین' قصور بخلاف ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر' قصور

جو شکایات صدر یونین کی طرف سے بوساطت ڈپٹی کمشنر صاحب قصور آپ کو موصول ہوئیں آپ نے مجھے ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۰ء کو بغرض وضاحت دی ہیں وہ میں نے بغور پڑھ لی ہیں۔ جواباً عرض گزار ہوں کہ:۔

صوبائی ڈائریکٹر تعلیمات عامہ' پنجاب...... لاہور نے اپنے گشتی مراسلہ نمبری ۱۴۱/۷/ آر۔سی۔۲ مجریہ ۸ر مارچ ۱۹۸۰ء میں محکمہ تعلیم میں اساتذہ کی جملہ تنظیموں کے عہدیداروں کو متنبہ کیا تھا کہ محکمہ میں کوئی تنظیم منظور شدہ نہیں ہے۔ اس لیے کسی معلم کو اجازت نہیں کہ وہ تنظیم کا نمائندہ بن کر دفتر کے چکر لگائے اور افسران بالا کو پریشان کرے کیونکہ اس سے نہ صرف طلبہ کی تعلیم کا حرج ہوتا ہے بلکہ دفاتر کے ضروری کام بھی التوا میں پڑ جاتے ہیں۔ اس مراسلے کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے انضباطی کارروائی ہو گی۔ اس گشتی مراسلہ کو میں نے شکایت کنندہ نور محمد کے نام روانہ کیا تھا

تا کہ وہ ذاتی طور پر مطلع رہے اوراس کی تعمیل میں یونین کے نام پر ایسی سرگرمیوں سے باز رہے۔اس مراسلے کی ایک نقل لف ھذا ہے۔

اس ہدایت کے باوجود شکایت کنندہ اپنی کدوکاوش تعلیم وتدریس کی طرف منعطف کرنے کے بجائے بدستور خلافِ ہدایت سرگرمیوں میں ملوث چلا آیا ہے۔اور شکایات کی جو مِسل اس نے تیار کی ہے اور آپ نے مجھے وضاحت کیلئے دی ہے وہ خوداس امر کا بین ثبوت ہے کہ شکایت کنندہ نور محمد ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفس کی روزمرہ دفتری کارروائی میں کیڑے ڈالنے، اس کی عیب جوئی کرنے، اس کی غلط تشہیر کرنے کیلئے اَن مِل، بے جوڑ کہانیاں اکٹھی کرنے اور ہر ملنے جلنے والے اور ہر آنے جانے والے سے ایک نہ ایک تحریر حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔تا کہ وہ افسرانِ بالا کے خلاف چھوٹی چھوٹی باتوں پر اساتذہ کو ابھارتا رہے۔ان کے دلوں میں دفتر کے خلاف نفرت کا زہر پھیلاتا رہے اور خود ایسے مراسلے لکھ لکھ کر اپنی قیادت کی دھونس دفتری عملے پر جماتا رہے۔ایسی سرگرمیاں آخر کار اساتذہ کو بددل کر دیتی ہیں اور وہ تدریسی کام میں دل لگانے اور جان کھپانے کی بجائے ایجی ٹیشنز کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ادھر جن افسران محکمہ کے خلاف یہ مہمات یونین کی طرف سے چلائی جاتی ہیں وہ دفتری کاموں پر پورا اترنا اور تعلیمی منصوبوں کے لئے راہ تلاش کرنے اور ہموار کرنے کی بجائے ہر دم ان مہم جو، خودساختہ قائدین کے الزامات سے بریت کے لئے تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ایسی فضا جب تک قائم رہے گی تعمیری کام رکے رہیں گے۔وقت گزرتا جائے گا قوم کا پیسہ صرف ہوتا رہے گا نتیجہ صرف طبقاتی آویزش اور شکوہ شکایت اوران کی حکایت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

میری گزارش ہے کہ محکمہ تعلیم کو صنعتی اداروں کے ہم پلہ نہ سمجھا جائے جہاں مزدوروں کو ٹریڈ یونین جیسی سرگرمیوں کا حق دیا جاتا ہے اس محکمے میں جو آج بویا جاتا ہے اسے دس سال بعد کاٹنا ہوتا ہے اسی مفہوم میں معلم کو مستقبل کا معمار کہا جاتا ہے۔جب آج کی کاشت کی آبیاری کرنے والے کے ذہن میں بس گھول دیا جائے اور وہ آبیاری کے ذوق سے عاری ہوکر اپنے اوپر تخریب طاری کرلے تو قوم کو بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔اس لیے اگر آپ میری بات میں کچھ وزن پائیں تو محکمہ تعلیم کو اپنی سفارشات میں لکھیں کہ وہ اساتذہ کی تنظیموں کے عہدیداروں کو ہدایت کریں کہ اگر انہیں فروغِ تعلیم کیلئے کام کرنے کی توفیق نہ ہو تو کم سے کم روزمرہ کے دفتری امور پر افسران بالا کو بدنام کرنے کی کارروائی کی عادت سے ہاتھ

روک لیں۔ سیاست بازی کا شوق سرکاری ملازمت کے سوا کسی اور جگہ پورا کر لیں۔

موجودہ درخواست جس کا وزن بڑھانے اور ضخامت میں اضافہ کرنے کیلئے ۲۴ صفحات لگا دیئے گئے ہیں اس میں صفحہ ا تا صفحہ ۴، اس کے بعد صفحہ ۷، پھر صفحہ ۱۳ اور صفحہ ۱۴ اور آخر میں صفحہ ۲۳ اور صفحہ ۲۴ پر شکایات اور حکایات درج ہیں باقی صفحات بعض لوگوں سے حاصل کی ہوئی درخواستوں، بعض دفاتر کو لکھے ہوئے مراسلوں اور اپنے جاری کیے گئے اخباری بیانات کی فوٹو سٹیٹ نقول پر مشتمل ہیں۔ ان شکایات میں زیادہ تر، اساتذہ کے تبادلوں کا تذکرہ ہے یا پھر کسی معلم یا کسی ایک سکول کی تنخواہ کی ادائیگی میں تاخیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر امور، شکایت کنندہ کے قلم سنبھالنے اور مسل تیار کرتے وقت دفتری منازل طے کر کے اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور کوئی شکایت باقی نہیں رہی۔ محکمہ خزانہ کے اعتراضات ہمارے روزمرہ کے دفتری امور میں شامل رہتے ہیں اور انہیں مالی ضابطوں کی روشنی میں دور بھی کیا جاتا رہتا ہے ہاں خط وکتابت اور بات کی وضاحت میں کچھ دیر تو لگ ہی جاتی ہے نور محمد شکایت کنندہ صرف اس ٹوہ میں ملازمت کا وقت گزار رہا ہے کہ کون سی دفتری کارروائی کا نام لے کر ظلم ستم کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکتا ہے نیز یہ ہنگامہ خیزی، یہ شر انگیزی اب ایک پیشہ بن گئی ہے۔ اس لیے ایسی روزمرہ کی دفتری باتوں پر محض چسکے کی خاطر درخواست بازی کی مہم جاری کر دی گئی ہے۔ اور یہی وہ سیاست ہے جس سے کم سے کم تعلیم کے میدان کو بچانا گویا ملک کو بچانا ہے۔

اسی طرح تبادلے بھی دفتری امور کا حصہ ہیں جو سرکاری ملازمت میں معمول کی بات ہے اس میں کسی افسر کی بدنیتی کا ڈھنڈورا پیٹنا اور پھر اس کا اشتہار بنا دینا صرف پنجاب ٹیچرز یونین کے صدر نور محمد ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

درحقیقت یہ شکایات بے بنیاد اور یہ حکایات بے اصل ہیں۔ تاہم اس ضمن میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات لاہور، ڈویژن تفصیلی تحقیقات پر محکمہ تعلیم کی طرف سے مامور ہو چکے ہیں جو ۱۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کو اپنے دفتر میں تحقیقات کا آغاز کر چکے ہیں۔ اور مزید کارروائی جاری ہے۔

رہا یہ انکشاف جو نور محمد نے بڑی کاوش کے بعد کیا ہے کہ قاضی ذوالفقار احمد سابق ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر قصور، میرا رشتہ دار ہے، تو عرض یہ ہے کہ رشتہ داری سے انکار نہیں۔ ہر افسر کسی نہ کسی کا رشتے دار تو ہو گا۔ تاہم قاضی صاحب موصوف اور میں کسی دہشت پسند تنظیم

کے رکن تو ثابت نہیں ہو جاتے کہ اس کا تذکرہ حکایتوں اور شکایتوں میں درج کرتے چلے جانا اور اس کی تشہیر کرنا ہی ملک وقوم کی سب سے بڑی خدمت قرار پا جائے۔ نور محمد صاحب دراصل ہماری یہ رشتہ داری ثابت کر کے بوجہ رشتہ داری ہماری کوئی غداری ثابت کرنے کے آرزومند معلوم ہوتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ گویا قاضی صاحب اور میں محکمہ تعلیم میں گریڈ ۱۷ یا ۱۸ کے ملازم نہیں بلکہ کسی خطرناک ملک دشمن گروہ کے فرد ہیں۔ اس لیے خطرے کی گھنٹی بجادی جائے۔ اپنی حکایتوں میں نور محمد نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ قاضی ذوالفقار احمد کے خلاف تذکرہ اپریل ۱۹۷۹ء میں مارشل لاء کے ایک مراسلے میں حکومت کے کاغذات میں ہوا تھا اس کا فوٹوسٹیٹ منسلک کر کے نور محمد صاحب غالباً یہ ثابت کرنے کے خواہاں ہیں کہ صوفی عبدالقیوم چونکہ قاضی ذوالفقار احمد کا رشتے میں بھائی لگتا ہے اس لیے افسران بالا ہشیار رہیں کہ صوفی صاحب بھی ٹھیک ٹھیک بھائی جیسی غلطیاں کریں گے۔ استدلال ملاحظہ ہو کہ مجرم کا بھائی...... بوجہ بھائی ہونے کے گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے حالانکہ ہر شخص قانون کی نظر میں اپنے قول وفعل کا خود ذمے دار ہے ایک کی غلطی کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں ڈالی جاسکتی۔

جناب والا! نور محمد کی سوچ ملاحظہ ہو کہ اس سے زیادہ منفی تخریبی مفسدانہ سوچ کسی معلم کی نہیں ہو سکتی کہ چند دفتری امور کو پکڑ لیا جائے چاہے وہ سچ ہوں یا نہ ہوں اور پھر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افیسر کے خاندانی حالات کا تجسس کیا جائے۔ اس کے رشتہ داروں کی گم شدہ کڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسے عادی، پیدائشی اور خاندانی غلط کار ثابت کرنے کیلئے اشتہار بازی شروع کر دی جائے اور کسی کو کسی کا دلال بھی کہہ دیا جائے (حوالہ صفحہ ۲۳)

شکایات کے اس پلندے پر کیا کچھ عرض کیا جائے کہ صفحہ ۱۳، صفحہ ۱۴ نیز صفحہ ۲۳ کے بیشتر حصے پر ملک اشرف، محمد جمیل نجم اور سیف الدین کے متعلق پرانے قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

دراصل یہ دشنام طرازی، یہ گالی گلوچ کے اشتہارات اور عرضی پرچے پنجاب ٹیچرز یونین کے الیکشن کی مہمات کا حصہ ہیں یہ دستاویزات اپنے ووٹروں کو قائل اور مائل کرنے اور مخالف ووٹروں کو گھائل کرنے کے حربے ہیں۔ پنجاب ٹیچرز یونین کے متحارب گروہ پارٹی بازی کا زہر دفترِ تعلیم میں پھیلانے کے درپے رہتے ہیں اور دفتر کی کارکردگی کی تاویل وتعبیر میں اپنی

پسند کا رنگ بھر بھر کے نئے نئے بت تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایک ایک حکم جو دفتر سے انتظامی صورت میں جاری ہوتا ہے اسے پنجاب ٹیچرز یونین کے عہدے دار اپنے ڈھب کا نہ پائیں تو اس کے پس منظر اور پیش منظر میں داستان امیر حمزہ جوڑ جوڑ کر آہ و بکا اور نالہ و فریاد کا وہ عالم پیدا کرنے میں لگ جاتے ہیں کہ پڑھنے' سننے والا ذرا سا سنجیدہ ہو جائے تو اسے ایسی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ گویا حق و باطل کا معرکۂ کربلا بپا ہے۔ حالانکہ یہ جادوئے سامری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بدامنی اور بدنظمی سے پر فضا عصائے موسوئی کی ایک جھلک سے پاکیزہ و منزہ ہو سکتی ہے جس کا آغاز جناب ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے مذکورہ گشتی مراسلے جاری فرما کر' کر دیا ہے۔ اب اسے موثر طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب والا! صفحہ ا پر فوٹو سٹیٹ نقل درخواست بنام سیکرٹری ایجوکیشن پنجاب کے نام بھیجی ہوئی لگائی گئی ہے جس مین نور محمد نے الزامات کا آغاز کیا ہے۔ گویا یہ شکایت تو سیکرٹری تعلیمات کو جا چکی ہے۔ تاہم ان کی نقول ڈپٹی کمشنر صاحب کو روانہ کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ سارے دفاتر اپنا کام چھوڑ دیں اور صرف نور محمد کی بات سنیں

عالی جاہ! چونکہ نور محمد نے اس درخواست کی نقول ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب اور ڈائریکٹر تعلیمات لاہور ڈویژن کو بھی روانہ کی تھیں اس لیے عرض گزار ہوں کہ محکمہ نے ان شکایات کا باضابطہ نوٹس لیا ہے اور جناب محمد سلیم خان صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات (سکولز) لاہور ڈویژن' لاہور کو اس پر انکوائری آفیسر مامور کر دیا ہے جنہوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کو تحقیقات کا عملی طور پر آغاز کر کے بیانات لینے اور الزامات کی چھان بین کرنا شروع کر دی ہے اور مزید کارروائی جاری ہے۔

تاہم پھر بھی صفحہ ۱۱ اور صفحہ ۲۳ کے آخر میں جو الزامات مجھ پر لگائے گئے ہیں ان کے بارے میں مندرجہ ذیل وضاحت عرض خدمت کرتا ہوں:۔

(i) ایف۔ آئی۔ آر جس کی نقل شکایت کنندہ نے مسل میں لگا رکھی ہے' یہ محمد ابراہیم مدرس واڑہ ملکاں ضلع لاہور نے درج کرائی تھی۔ شکایت میرے خلاف نہیں تھی بلکہ محمد رشید خاں آفس سپرنٹنڈنٹ کے خلاف تھی۔ چوکی پولیس نمبر ۳ قصور نے اسی شام ۳۰ اپریل ۱۹۸۰ء کو اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی متعلقہ اے۔ ایس۔ آئی صاحب سے نتائج برائے تفتیش و کارروائی منگوا لیے جائیں۔

(ii) یہ شکایت نور محمد مذکور نے میرے دفتر میں دائر کی اور میں نے کوئی توجہ نہ دی بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں نے اس شکایت پر اسی روز مورخہ ۳۰ / اپریل ۱۹۸۰ء کو رات کے سات بجے تک وقفے کے بغیر انکوائری کی جس میں خود محمد ابراہیم جو مبینہ طور پر مضروب ہوا اس کا تحریری بیان بھی شامل ہے۔ مکمل فائل میرے دفتر میں موجود ہے۔ مزید عرض یہ ہے کہ میں نے اپنے دفتر کے تمام کلرکوں اور دفتریوں کو پابند کر لیا تھا کہ جب تک اس شکایت پر انکوائری مکمل نہ ہو جائے کوئی صاحب گھر نہ جائیں۔ چنانچہ میرا سارا دفتر انکوائری میں شامل رہا ان کے تحریری بیانات میرے پاس فائل پر ہیں۔

میں نے اپنی تحقیقات کی رپورٹ ڈائریکٹر تعلیم لاہور ڈویژن کو دی تھی۔ جس پر ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات (سکولز) لاہور ڈویژن لاہور (خان محمد سلیم خان) نے قصور تشریف لا کر تحقیق کی مورخہ ۳۰ / اپریل ۱۹۸۰ء کو جس روز شکایت کی تحقیق ہوئی عین اس روز پنجاب ٹیچرز یونین قصور کے صدر نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے میرے دفتر کا گھیراؤ کر لیا تھا جبکہ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر قصور کا تمام عملہ یرغمال بنا لیا گیا ہے اور اس وقت تک وہ یرغمال رہیں گے جب تک کہ یونین کے مطالبات تسلیم نہیں ہو جاتے۔ اس ضمن میں بھی ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب تعلیمات لاہور ڈویژن تحقیقات کر رہے ہیں۔

ب والا! اول تو یہ الزامات ہی بے بنیاد ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان شکایات کا نور محمد سے کوئی ذاتی اور شخصی واسطہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ ان میں درج ایک جیسی شکایات کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چوتھے یہ کہ اس پلندے کا زیادہ تر حصہ پنجاب ٹیچرز یونین کے متحارب گروپوں کی آپس میں چپقلش کی داستان لایعنی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ پانچویں یہ کہ اصل درخواست سیکرٹری تعلیمات پنجاب کے نام داغی گئی تھی جبکہ نقول چار پانچ دفاتر میں بھیجی گئیں۔ نہایت ادب سے عرض ہے کہ ایک درخواست پر پانچ دفاتر میں کارروائی محض وقت اور محنت کا نقصان ہے۔ مناسب خیال فرمائیں تو کسی ایک جگہ مکمل تحقیقات کا انتظام فرما دیں۔

دستخط

(صوفی عبدالقیوم)

ضلعی افسر تعلیم قصور

☆☆

ابھی صورتحال کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ صوفی صاحب کا قصور سے ان کے حسب خواہش تبادلہ کر دیا گیا۔ ان کے بعد راولپنڈی ڈویژن ہی سے قاضی مقصود احمد تشریف لائے موصوف بڑے درویش قسم کے انسان تھے انتہائی بے ضرر...... جب میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا تو دو چار مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا کرتے تھے کہ وہ تو بس قصور میں چلہ کاٹ رہے ہیں جلد ہی اپنے گھر چکوال کی طرف لوٹ جائیں گے۔ انہوں نے اپنی رہائش' دفتر ہی میں رکھی۔ اپنا کھانا اپنے ہاتھوں سے خود پکایا اور کھایا۔ کسی بات میں الجھے نہیں دامن جھاڑ کر جلد ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ ادب' علم اور صداقت و شرافت کا نمونہ تھے۔ ذیل کی نظم طبی نسخوں کی مالا ہے۔ دیکھئے اس میں ان کی لیاقت' زبان و بیان پر قدرت' انسانی ہمدردی اور مروت و مرحمت کے کیسے کیسے نمونے بیک وقت بے ساختہ جگمگاتے نظر آتے ہیں'

ع...... اب ایسے لوگ زمانے میں روز روز کہاں!

آسان نسخے

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہیے بچنا دوا سے

اگر تجھ کو لگے جاڑوں میں سردی
تو استعمال کر انڈے کی زردی

جو ہو محسوس معدے میں گرانی
تو چکھ لے سونف یا ادرک کا پانی

اگر خون کم بنے بلغم زیادہ!
تو کھا گاجر' چنے' شلغم زیادہ

جو بدہضمی میں تو چاہے افاقہ
تو کر لے ایک یا دو وقت فاقہ

جو پیچش ہے تو پیچ اس طرح کس لے
ملا کر دودھ میں لیموں کا رس لے

جگر کے بل پر ہے انسان جیتا
گر ضعف جگر ہے کھا پپیتا

جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا
اگر آنتوں میں خشکی ہے تو گھی کھا

تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرم گرم پی لے

جو طاقت میں کمی ہوتی ہے محسوس
تو پھر ملتانی مصری کی ڈلی چوس

زیادہ گرد ماغی ہے تیرا کام
تو کھایا کر ملا کر شہد بادام

اگر ہو دل کی کمزوری کا احساس
مربہ آملہ کھا اور انناس

اگر گرمی کی شدت ہو زیادہ
تو شربت پی بجائے آب سادہ

جو دکھتا ہے گلہ نزلے کے مارے | تو کر نمکین پانی کے غرارے
اگر ہے درد سے دانتوں کے بے کل | تو انگلی سے مسوڑھوں پر نمک مل
نبیؐ کا قول سن باوصفِ ادراک | روزانہ کیا کر تازہ مسواک

جو ہے افکار دنیا سے پریشاں
خدا کی یاد سے کر دل کو شاداں

پیارے قارئین!......میرے منصب پر کام کرنے والے جواد نقوی تو وفات ہی پا چکے تھے۔ آپ سید غلام الثقلین نقوی معروف افسانہ، ناول اور سفرنامہ نگار کے برادر عزیز تھے۔ میرے ان کے بھائی صاحب سے اور ان سے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔ وہ زندہ ہوتے تو تحریری نہ سہی زبانی مجھے قصور کی سیاست کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتاتے۔ میں ان کے لئے صدق دل سے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے اور مذکورہ دونوں ضلعی افسران تعلیم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تیسری بار قصور وارد ہوا ہوں۔

◆◆◆◆◆

(۴۰)

پھر قصور میں

مئی ۱۹۸۳ء میں جب مَیں قصور حاضر ہوا تو اس وقت وہاں چودھری محمد اکرام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر تھے۔ میں انہیں مدت سے جانتا تھا جب میں سیالکوٹ میں ڈپٹی ایجوکیشن افسر تعینات ہوا تھا تو اس وقت وہ وہاں پائلٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ اسی سکول میں ایک کامیاب سائنس ٹیچر بھی رہے تھے۔ سیالکوٹ ان کا اپنا ضلع اور گھر تھا۔ صوفی عبدالقیوم اور قاضی مقصود احمد کی طرح وہ بھی اٹھارہویں گریڈ میں ترقی پانے والے تھے۔ وہ جملہ کیڈروں کی نمائندگی کے کھاتے میں سینیارٹی کی بنیاد پر ڈی۔ای۔او بنائے گئے تھے۔ وہ خود اس اسامی کے خواہشمند نہیں تھے بلکہ انہوں نے درخواست بھی دے رکھی تھی کہ ترقی ملنے پر انہیں جامعہ سکول سیالکوٹ شہر ہی میں پرنسپل بنا دیا جائے تو ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں انتظامیہ کا نہیں درس و تدریس کا آدمی ہوں۔ ان کی یہ بات ان کے اپنے کردار و عمل سے ٹھیک ہی ثابت ہوئی۔

سیالکوٹ میں قیام کے دوران میں نے ان کے سکول کا ایک کام بھی کیا تھا۔ وہ یہ کہ ڈی۔ای۔او کے حکم پر ان کے سکول کی لائبریری کی پڑتال کر کے بوسیدہ اور دیمک خوردہ کتب کو رجسٹر اشیائے مال سے خارج کیا تھا یہ کام کرتے ہوئے دوپہر کا وقت ہوگیا چودھری صاحب مجھے سیالکوٹ چھاؤنی میں ''ایٹ مور'' نامی ریسٹورنٹ میں لے گئے اور ایک پرتکلف ظہرانہ کھلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کا افسر ہوا ہوں آپ تو پرانے افسر ہیں اور مجھ سے کہیں سینئر' یہ تواضع کچھ اچھی نہیں لگتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ انتظامی طور پر اس وقت تمہارا مرتبہ مجھ سے بلند ہے۔ بہر کیف قصور میں ان سے میری ابتدائی ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے مجھے مرحوم ڈپٹی جواد حیدر کا کمرہ کھلوا کر دیا جو متعلقہ نائب

قاصد نے پہلے ہی صاف کر رکھا تھا۔ میرے تقرر کی اطلاع قصور میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔
کمرے میں بیٹھ کر میں نے جواد حیدر کی یاد میں چند لمحے خاموشی اختیار کی۔ خاموشی کے اس مختصر سے وقفے میں، مَیں ماضی میں کھو گیا اور مجھے اپنی سرکاری ملازمت کے اس اتفاق پر بڑی حیرت ہوئی کہ میں نے گورنمنٹ ایس۔ڈی ہائی سکول بہاولپور میں اپنے ہی گاؤں کے منظور حسین کی مرگ ناگہاں پر اس کی جماعت کا چارج سنبھالا تھا، پھر سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تبادلہ ہوا تو وہ بھی سیکنڈ ہیڈ ماسٹر شفقت حسین کی وفات سے خالی ہونے والی اسامی پر ہوا اور اب تیسری مرتبہ میں جواد حیدر مرحوم کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یادوں کا قافلہ جادہ پیما ہوا تو بے اختیار والدہ مرحومہ یاد آ گئیں۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ ماضی کی یادیں بجلی کے قمقموں کی طرح قطار در قطار دور تک جگمگاتی چلی گئیں۔ پھر جو اپنے آپ کو دیکھا تو بہت ہلکا پھلکا پایا کسی نے سچ کہا ہے ۔

نہیں جہان محبت میں اشک بھی بے کار
یہ کام آتے ہیں دل کی لگی بجھانے میں

میں قصور کا بھیدی تھا۔ جب قصور اور چونیاں کی تحصیلیں ضلع لاہور کا حصہ تھیں تو بطور اے۔ڈی۔آئی قصور جنوبی، اے۔ڈی۔آئی پتوکی اور اے۔ڈی۔آئی ترقیات ضلع لاہور تعینات رہا تھا اور پھر ساڑھے چار سال پہلے یہیں ڈپٹی ڈی ای او تھا۔
پنجابی کا ایک لفظ ہے 'کھوچلی' جس کے معنی ''بہت کچھ خاص طور پر جاننے والا'' ماضی میں جب میں سیالکوٹ میں تھا تو چودھری محمد اکرام نے اپنے متعلق بتایا تھا کہ وہ گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول سیالکوٹ کے 'کھوچلی' ہیں اور اب ہیڈ ماسٹر بننے پر انہوں نے سکول میں کئی تعمیری کام اس کے ''کھوچلی'' ہونے کی وجہ سے کئے ہیں۔ یہ بات ایک پانی کی آہنی ٹینکی سے چلی تھی۔ اسی طرح میں نے چودھری محمد اکرام کو بتایا کہ میں بھی ضلع قصور کا 'کھوچلی' ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ان کو ضلع اور ضلعے کے اساتذہ کے بارے میں کبھی کچھ معلومات درکار ہوں تو میں بہتر طور پر ان کے کام آ سکتا ہوں۔ انہوں نے بڑے معنی خیز الفاظ میں کہا کہ اب تو میں بھی بہت کچھ جان چکا ہوں۔ یہاں آئے سال سے اوپر عرصہ ہو رہا ہے گویا انہیں میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں تھی اور ان کے کان میرے خلاف بھرے جا چکے تھے۔
انہوں نے مجھے اس طرح نظر انداز کیا جیسے میں دفتر میں تعینات ہی نہیں ہوں۔ میں

نے ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہا۔ زبانی بات چیت ہوئی انہوں نے بڑے اخلاق سے کہا ''میرا ذہن تو شیشہ ہے، مجھے آپ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں۔'' حقیقت یہ تھی کہ وہ زندگی میں کبھی اے۔ ڈی۔ آئی رہے تھے اور نہ ڈپٹی، انہیں انتظامیہ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس بات سے وہ خود بھی آگاہ تھے۔ وہ مجھے وہی کام دیتے تھے جو وہ خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مقامی اور غیر مقامی اجلاس تھے۔ یا کبھی کبھار کسی شکایت کی تفتیش۔ میری حالت کو محسوس کرتے ہوئے دفتر کے ایک اہلکار نے ان سے کہا کہ قاضی صاحب کرایہ خرچ کر کے آتے اور چائے کی پیالی پی کر چلے جاتے ہیں انہیں کوئی کام دیں تو انہوں نے کہا کہ قاضی صاحب کو اس سلسلے میں نور محمد سے بات کرنی چاہیے۔

گویا یہ نور محمد تھا جو ڈی۔ ای۔ او کی ذہنی باگ ڈور تھامے ہوئے تھا۔ حالانکہ نور محمد مجھ سے خود ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ سیاست میں ساری باتیں وقتی ہوتی ہیں۔ اسے مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں اور مجھے بھی اس سے کوئی ذاتی رنجش نہ تھی مگر مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ ڈی۔ ای۔ او سے مجھے دفتر کا کام دلائے۔ جب مجھے دفتر میں بیکار بیٹھے رہنا تھا تو محاورے کے مطابق شغلِ بیکاری، سراسر بیزاری اور بیماری، میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ بس میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ چنانچہ زبانی بات چیت کے بجائے میں نے چودھری محمد اکرام ڈی۔ ای۔ او قصور کو لکھا کہ میرے ذہن کے پردے پر آپ کی تصویر اور تصور بہت دلکش تھا۔ آپ کے طرزِ عمل نے اسے مسخ کر ڈالا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ کا دل شیشہ ہے مگر اس شیشے پر غلط فہمیوں کی دھول جمی ہوئی ہے سردست اس عرضی کے ذریعے یہ گوش گزار کرنا مقصود ہے کہ آپ اپنے آئینہ دل کی حفاظت کیجئے ورنہ اس پر پتھر بھی برس سکتے ہیں۔ غلط فہمیوں کو راہ نہ دیجئے اور جان لیجئے کہ آپ کو سابقہ ڈی۔ پی۔ آئی خواجہ صاحب کی طرح انتظامیہ کا کوئی تجربہ نہیں جبکہ میں پرائمری سکول کے مدرس سے لے کر اے۔ ڈی۔ آئی ڈپٹی ایجوکیشن افسر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات تک کی اسامیوں پر کام کر چکا ہوں اور محکمہ تعلیم کے نظم و نسق اور دفتری امور کا ہمہ جہت تجربہ رکھتا ہوں۔

میں نے مزید لکھا کہ انتظامیہ کے ''ان سروس'' تربیتی کورسوں میں، میں نے 'افسر' کی تعریف پڑھی اور سنی ہے کہ وہ ماتحتوں کے لئے کیا ہوتا ہے۔ میں نے ترقی دیہات کی اکادمی میں فرید اللہ شاہ کی زبانی سنی ہوئی تعریف کا حوالہ دیا کہ:

''افسر اپنے ماتحتوں کے لئے ابرِ نیساں'' ہوتا ہے۔''

شرکائے کورس میں سے بہت سوں نے ہاتھ کھڑے کیے اور پوچھا کہ ابرِ نیساں کیا ہوتا ہے۔ جواب ملا کہ ابر نیساں' اس بادل کو کہتے ہیں جس کے برسنے سے سیپ میں موتی' کیلے میں کافور' بانس میں بن سلوچن (طباشیر) سانپ میں زہر مہرہ اور نافۂ ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے۔

''ماتحت کی بھی کوئی تعریف ہوگی۔'' ایک شوخ نے پوچھا۔

''جی ہاں ماتحت کی تعریف بھی موجود ہے۔'' فرید اللہ شاہ نے کہا ''وہ افسر کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہے۔ معاملات بگاڑنے کا تصور بھی نہیں کرتا البتہ سنوارنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتا ہے۔ افسر کو اس کی غلطی کی نشاندہی تخلیئے میں موقع پا کر کرتا ہے اور ساتھ ہی ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔''

''آپ افسر مجاز ہیں...... افسر مجاز سے سے کرائی گئی غلطی ماتحتوں یا یونین کے عہدیداروں کے کھاتے میں نہیں پڑتی۔ افسر ہی کے کھاتے میں پڑتی ہے۔ ڈی۔ ای۔ او لاہور ملک نثار احمد کو قومی تحویل میں لی گئی عمارت خالی کرنے کے الزام میں اس لئے برطرف کیا گیا تھا کہ افسر مجاز ہونے کی حیثیت سے اس نے عدالتی فیصلے کے خلاف اپیل کرنے میں تاخیر کر دی تھی۔ لہٰذا میں آپ کی توجہ اس ناگوار صورت حال کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو آپ نے جانے بوجھے یا نادانستہ اپنے اردگرد پیدا کر رکھی ہے اور جس کا میں دفتر میں حاضری اور اپنی بیکاری کی وجہ سے مستقل عینی شاہد ہوں۔

آپ کے دائیں بائیں مختلف نقاب پوش چہرے موجود ہیں۔ ایک اہلکار کہتا ہے کہ ''جب میں اپنا دوسرا چہرہ دکھاؤں گا تو صاحب غش کھا کر گر پڑے گا کیونکہ خوبصورت چہرے تو سب کی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ میں نے تو سرمایہ بھی لگایا ہے۔''...... دوسرا کہتا ہے میں بکری کی زبان والا ہوں میرے چاٹے ہوئے درخت بھی ہرے نہیں ہوتے۔ اکرام کیا چیز ہے۔'' اسی برادری کا ایک اہلکار دوسرے ساتھی کو سمجھا رہا تھا کہ کیا اس نے نہیں سن رکھا کہ کتا کتے کا بیری ہوتا ہے۔ دونوں ہی سیالکوٹی ہیں۔ ایک ہی بھٹے کی اینٹیں! اور بہت سی باتیں لکھنے کے بعد میں نے لکھا کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ بلاوجہ معاندانہ ہے اور آپ نے مجھے ایک ''بڑا صفر'' بنا کر رکھ دیا۔ اس منافقت اور بلاوجہ عداوت کے نقصان سے خود آپ بھی محفوظ نہیں رہیں

گے۔ پھر میں نے ایک بیمار عورت کا حوالہ دیا جس کا ذکر کارلائل نے یوں کیا ہے:

''موذی مرض میں بیمار عورت گھر گھر دستک دے کر پکارتی ہے۔'' اے گھر والو! سنو میں تمہاری بہن ہوں۔ میری مدد کرو...... '' لیکن اس کی مدد کے بجائے وہ دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دیتے تھے۔ اس کی مدد نہیں کی گئی تو اس کی بیماری متعدی بن گئی جب وہ مری تو اس کے ساتھ اسی محلے سے اسی بیماری میں مبتلا ہونے والوں کے چودہ جنازے اٹھے۔ اس طرح اس عورت نے محلے کو اپنے ''بہناپے'' کا ثبوت دیا۔

میں نے مزید کہا کہ ''آپ کی بیماری سے جو نقصان آپ کو اور دفتر کو پہنچ رہا ہے اس کا اندازہ لگائیے مثلاً:۔

۱...... جب آپ دفتر میں نہیں ہوتے تو دفتر میں خاک اڑتی ہے میری کوئی پروا نہیں کرتا کیونکہ میں ایک بے اختیار اور بیکار افسر ٹھہرا۔

۲...... کسی کلرک کو کوئی کام سونپا جائے تو وہ حیلوں بہانوں سے ٹال دیتا ہے

۳...... مجھے عام ضابطے کے سرکلر بھی نہیں بھیجے جاتے۔

۴...... آپ کی غیر حاضری میں جب صدر دفتر سے کوئی اہم فون اور مقامی انتظامیہ سے کوئی اہم استفسار آتا ہے تو عدم واقفیت کی بنا پر میرا جواب خاموشی ہوتا ہے۔ جس سے آپ کی ذات زیر بحث آتی ہے۔ اور بعض لوگوں کی زبان بے قابو ہو جاتی ہے۔

۵...... اگلے روز ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے فلاں فلاں بات کے سلسلے میں فون کرنا۔ میں نے بجلی کے دفتر سے معلومات لے کر فون کیا۔ کیونکہ فون بوجہ تالہ بند تھا

۶...... دفتر میں ہونے والے عملے کے اجلاس میں بھی مجھے نہیں بلایا جاتا۔ لہٰذا میں ارکانِ عملہ کو بھی کبھی کچھ نہیں بتا سکتا۔

فی الجملہ اس طرح ابتری کا ایسا ملغوبہ تیار ہو رہا ہے جس کے اثرات نہایت مضر ہو سکتے ہیں۔

اس خط کا چودھری محمد اکرام پر مثبت اثر ہوا انہوں نے حکم نامہ جاری کیا کہ سپرنٹنڈنٹ کے بعد روزمرہ ڈاک کی ترسیل یا وصولی ڈپٹی ڈی۔ ای۔ او کی معرفت ہو گی نیز وہ مڈل سکولوں کے دورے کر کے تدریسی کام کا جائزہ لیں وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بھی دفتر میں شمار کیا جانے لگا۔ خود کئی معاملات میں چودھری صاحب

نے مجھ سے مشورہ طلب کیا اور میں نے اپنی دانست کے مطابق موزوں مشورے دیئے یہ صورتحال دفتری عملے کو ہضم نہ ہو سکی اور نہ ہی اساتذہ کے سیاسی ٹولے کو راس آئی۔

ایک پنجابی فوجی، تربیتِ جسمانی کا استاد بننے کا امیدوار تھا فوجیوں کا کوٹہ حکومت نے ۲۵ فیصد مقرر کر رکھا تھا۔ ٹھیک ایسا ہی ایک اور امیدوار بھی تھا جو میو تھا۔ دونوں کے نام مجھ سے پہلے کی ریکروٹمنٹ کمیٹی نے انتخاب کر کے متعلقہ رجسٹر میں درج کر رکھے تھے۔ جب کوئی اسامی خالی ہوتی تو اس کی جگہ تقرر استحقاق کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ میری دانست میں نئی خالی ہونے والی تربیتِ جسمانی کے مدرس کی اسامی پر مخصوص کوٹہ کے حوالے سے باری فوجی کی تھی جبکہ دفتر کا خیال میو ٹیچر کے حق میں تھا۔ میرے لکھے ہوئے نوٹ سے ڈی۔ای۔او نے اتفاق کیا اور فوجی امیدوار کے تقرر کا حکم جاری کر دیا۔ یہ حکم جاری ہوتے ہی زلزلہ آ گیا۔ وہی چار سال پہلے کا پنجابی اور میو کا جاہلانہ سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ میری کھلی مخالفت شروع ہو گئی تاہم اس مرتبہ مختلف بات یہ تھی کہ چودھری محمد اکرام میرے مخالفین کے ترجمان تھے اور وہ برابر کہہ رہے تھے کہ واقعی حق میو امیدوار کا تھا اور میں نے ان کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے۔ حالانکہ آخری فیصلہ خود ڈی۔ای۔او چودھری محمد اکرام نے خود کیا تھا۔

سردار احمد علی کے خاندان کا خصوصی کارندہ حاکم علی جے وی مدرس ایک دن میرے پاس آیا اور اس نے چپکے سے بتایا کہ چودھری اکرام اور یونین کے آدمی براہ راست میاں شریف ڈی۔پی۔آئی سے ملتے ہیں اور وہاں میرے خلاف زبانی کلامی بھی بہت کچھ کہتے ہیں اور عرضی پرچہ بھی دے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ چند دن پہلے وہیں تھا۔ ان لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد اس نے ڈی۔پی۔آئی صاحب سے مودبانہ درخواست کی تھی کہ یہ لوگ ایک بھلے آدمی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اس پر ڈی۔پی۔آئی میاں شریف نے کہا کہ وہ بھلے آدمی کو (یعنی مجھے) اچھی طرح جانتا ہے۔ بڑا قانون دان اور تجربہ کار بنتا ہے۔ لاہور کے پڑوس میں بیٹھا ہے لیکن کبھی سلام تک کرنے نہیں آیا۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ میں میاں صاحب سے مل آؤں ورنہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہ دی اور میں نے حاکم علی کی نصیحت پر کوئی توجہ نہ دی۔

ڈی۔پی۔آئی صاحب کی ناراضی کی وجہ میں سمجھتا تھا۔ محمد اصغر نامی ایک ٹیچر نو سال بیرون ملک گزار کر آیا تھا۔ ڈی۔پی۔آئی صاحب نے اسے چودھری اکرام کے پاس بھیجا تھا

کہ اسے ملازمت پر حاضر کر لیا جائے۔ اس کے کاغذات جب میرے پاس آئے تو میں نے لکھ دیا کہ فلاں فلاں قانون کے تحت کوئی سرکاری ملازم پانچ سال کی رخصت لے کر کسی دوسرے ملک میں ملازمت یا قیام کر سکتا ہے۔ اس مدرس کا ماجرا مختلف ہے...... یہ تو نو برس کے بعد واپس آیا ہے' اتنی طویل مدت کی غیر حاضری کے باوجود اسے اس کو ملازمت پر حاضر کر لینا قانون کی مٹی پلید کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ اسے نئے سرے سے ملازمت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ مدرس تربیت یافتہ ہے۔ اس شخص نے مجھے تین ہزار روپے کی پیش کش بھی کی اور ڈی۔ پی۔ آئی کا آدمی ہونے کا رعب بھی دیا۔ میں نے صاف جواب دے دیا کہ وہ کچھ بھی کر لے اس کی نو سال کی غیر حاضری نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ چودھری محمد اکرام نے مجھ سے اتفاق کیا اور چٹھی نمبر ای ۵۱۳۹/۳ مورخہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۸۳ء کے جواب میں مدرس کو مطلع کر دیا گیا کہ اسے طویل غیر حاضری کی بنا پر اس کی سابقہ اسامی پر بحال نہیں کیا جا سکتا۔

وہ دوبارہ ڈی۔ پی۔ آئی صاحب کے پاس پہنچا موصوف نے لکھا کہ درست طریقہ یہ ہے کہ مدرس کو اس کی اسامی پر حاضر کر لیا جائے اس کی چھٹی کا فیصلہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ اس حوالے سے اسے ۲۴/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو بلاک نمبر ۵ چھانگا مانگا میں حاضر کر لیا گیا۔ نہ جانے اس سلسلے میں چودھری محمد اکرام اور ڈی۔ پی۔ آئی میاں شریف میں کیا کیا باتیں ہوئیں ہوں گی اور یونین کے حوالے سے بھی میرا ذکر آیا ہوگا۔ چودھری صاحب احکام بحالی لے کر خود ڈی۔ پی۔ آئی صاحب کو دینے گئے تھے۔ اب پھر مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا۔

ہاں' ایک فرق ضرور پڑا کہ میں اپنے دورے کا جو بھی منصوبہ بناتا چودھری اکرام اسے منظور کر دیتے اور میں تقریباً نصف ماہ دوروں پر رہتا۔ اس طرح اساتذہ سے رابطہ ہونے پر مجھے علم ہوا کہ پنجابی تو پنجابی بہت سے متوازن ذہن کے میو بھی نور محمد اور اس کے ٹولے کی سیاست سے نفرت کرتے تھے۔ انہیں ان کا ڈی۔ ای۔ او سے گٹھ جوڑ بھی ناپسند تھا۔ میں کوشش کرتا کہ مجھے کہیں رات کیمپ میں نہ گزارنی پڑے۔ آپ کو الطاف حسین کتابوں والا یاد ہوگا وہ بھی کتب کے سلسلے میں چودھری اکرام سے ملا اس نے اسے سمجھایا کہ اگر قاضی صاحب تمہارے مقابلے پر اترے تو تم مات کھا جاؤ گے۔ چودھری اکرام نے جواب دیا کہ جب تک اپنا مہربان ارائیں بھائی میاں شریف ڈی۔ پی۔ آئی ہے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب تو میں خود انتظامیہ کے داؤ پیچ سمجھنے لگا ہوں۔" الطاف حسین نے چودھری اکرام کو کہا کہ وہ خواہ

کچھ بھی ہے اسے خاں صاحب جیسے جابر انسپکٹر سکولز کا انجام یاد رکھنا چاہیے ایک ہی جگہ رہتے ہوئے آپس میں بگاڑ اچھی بات نہیں۔

انہی کے ایک دوست نے جو سیالکوٹ کا ٹھیکیدار تھا غلط یا صحیح میرے ایک دوسرے دوست سے کہا کہ اکرام نے ۸۳۔۱۹۸۲ء کی گرانٹوں میں لاکھوں کی 'گوڈی' کی ہے۔ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ اس نے سیالکوٹ ٹرنک بازار میں اپنے بیٹے کو ریڈیو ٹی وی اور الیکٹرونکس کے سامان کی دکان خرید کر دی ہے۔ وہ پنجاب ٹیچرز یونین سے بگاڑ کر اپنے رزق پر لات نہیں مار سکتا۔ میں سنی ان سنی کر دیتا تھا۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

☆☆

ڈویژنل ڈائریکٹر جی۔ ایم ملک تبدیل ہو گئے۔ ان کی جگہ رانا صفدر جنگ ڈائریکٹر لاہور ڈویژن مقرر ہوئے۔ وہ چونیاں کے رہنے والے تھے۔ ان کا میل جول پہلے بھی قصور کے لوگوں اور اساتذہ سے تھا اب مزید بڑھ گیا۔ انہیں کچھ اے۔ ای۔ او صاحبان' کچھ مدرسین اور کچھ دیگر افراد نے بتایا کہ قصور کے ڈی۔ ای۔ او اور ڈپٹی ڈی۔ ای۔ او میں چپقلش چل رہی ہے۔ ڈی۔ ای۔ او انتظامیہ کا ضلعی سربراہ ہے اور میاں شریف ڈی۔ پی۔ آئی اس کا خصوصی سرپرست ہے۔ میاں شریف بوجوہ رانا صفدر جنگ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ردعمل کے طور پر رانا صفدر جنگ نے بھی میاں شریف سے منہ پھیر رکھا ہے۔ تاہم افسر ماتحت کا رشتہ تو تھا ہی۔ ڈی۔ ای۔ او سے میری چپقلش کے بارے میں مجھ سے ڈائریکٹر صاحب نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ رانا صاحب نے بھی کبھی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن رانا صاحب سے متواتر ملنے والے اے۔ ای۔ او چونیاں محبوب سیال کے سامنے رانا صفدر جنگ نے نور محمد سے کہا کہ یونین تو ختم ہو چکی ہے۔ تم افسروں کو باہم لڑا کر اپنی سیاست چمکانا بند کر دو۔

نور محمد نے جواب دیا کہ میری قاضی صاحب سے کوئی لڑائی نہیں' نہ میں ان کا کوئی کام اٹکاتا ہوں۔ یہ سب کیا دھرا تو میاں شریف کا ہے اور اصل قصہ یہ ہے کہ جب قاضی صاحب ادھر ڈائریکٹوریٹ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے تو ان کے فون کی تاریں اکثر میاں شریف کے ٹیلی فون کی تاروں سے مل جاتی تھیں۔ اگر قاضی صاحب کہیں بات کر رہے ہوتے' میاں شریف کو درمیان میں بات کرنی پڑ جاتی تو وہ یہ جانے بغیر کہ کون بات کر رہا ہے۔ دو چار گالیاں بھی لڑھکا دیتے۔ قاضی نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ گالیوں کا بلغم کون تھوک رہا ہے ان کی

گالیاں انہی کو لوٹا دی تھیں۔ تب سے میاں شریف قاضی صاحب کے خلاف ہے۔ چونکہ قاضی صاحب ان کے ہتھے نہیں چڑھے ہیں۔ تبادلہ نچلی سطح پر ہو جاتا رہا ہے لہٰذا قاضی صاحب کا کام چل رہا ہے۔ وہ بچ کر گوجرانوالہ چلے گئے اب پھر قصور آ گئے ہیں۔ میاں شریف جلد ہی ان کو مزہ چکھانے والا ہے لہٰذا ہما شما کو بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ قاضی کو دفتری کام دینے اور پھر بہانہ بنا کر اس سے کام چھین لینے کا ٹوپی ڈرامہ میاں شریف کے ایما پر ہوا ہے اور پھر قاضی نے میاں شریف کے آدمیوں کو قانون سمجھانے کا جرم بھی کیا ہے۔ اے۔ سی۔ آر لکھنے کا وقت آ جائے پھر قاضی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا!''

اب تھوڑی دیر یہیں رک جایئے۔ فرید اللہ شاہ کی 'افسر' کے بارے میں بیان کردہ تعریف ذہن میں از سرِ نو تازہ کیجئے اور اندازہ لگایئے کہ ہمارے عہد میں محکمہ تعلیم کے افسرانِ بالا کس کینڈے کے کتنے بونے لوگ تھے اور ان کی سرپرستی میں سینچے ہوئے پودوں میں سے ایسے جھاڑ بھی نکلے ہیں جنہوں نے آج معاشرے کی اقدار کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے اور قومی تعلیم کا کچرا کر دیا ہے۔

☆☆

قواعد وضوابط کے خلاف روایات کے برعکس سیکرٹری تعلیم نے سیکرٹریٹ میں کچھ مشیر تعینات کر رکھے تھے یہ مشیر کالجوں اور دیگر ماتحت دفاتر سے تبادلوں' تحقیقات اور میری طرح رنجشوں کے زخم کھا کر سیکرٹریٹ میں عبوری طور پر حاضر کیے گئے افسروں میں سے منتخب کیے گئے تھے۔ انتخاب کا واحد معیار کسی سیاستدان' یا بیوروکریٹ سے تعلق تھا' یہ مشیر لوگ تنخواہ اپنے کالج یا دفتر سے لیتے تھے اور کام سیکرٹریٹ میں کرتے تھے۔ مختلف مسائل کے بارے میں جو چھوٹے بڑے ملازمین سیکرٹری صاحب سے ملنا چاہتے انہیں پہلے کام کی نوعیت کے لحاظ سے کسی مشیر سے ملنا پڑتا تھا مشیر اگر سائل کو ٹال سکتا تو سائل سے درخواست لے کر اسے ٹال دیتا۔ یا پھر اسے متعلقہ سیکشن افسر' ڈپٹی سیکرٹری یا ایڈیشنل سیکرٹری وغیرہ کے پاس بھیج دیتا۔ سائلان جن کی ملاقات سیکرٹری صاحب سے کرانا ضروری ہوتی تو سیکرٹری صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری سے فون پر رابطہ کر کے ان کے پاس روانہ کر دیا جاتا تھا۔

ستم بالائے ستم' سکول کے کیڈر میں نچلے درجے کے افسر کو اعلیٰ اسامی پر تعینات کرانے کا دھندہ بھی ان مشیروں ہی کے قبضہ قدرت میں دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مشیروں کی پانچوں

گھی میں تھیں انہوں نے غیر قانونی دھندوں کا کاروبار چمکانے کے لئے اپنے گماشتے چھوڑ رکھے تھے۔ چنانچہ مجھے سیکرٹریٹ آنے جانے والے کئی دوست یہ مشورہ دے چکے تھے کہ برادرِ عزیز! آج کل اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ ہے۔ کچھ مال لگاؤ' چودھری اکرام کا ٹکٹ کٹواؤ اور خود ڈی۔ای۔او بن جاؤ...... میں ان سے کہتا کہ قصور میں میرا ڈی۔ای۔او بننا کانٹوں کا ہار پہننے کے مترادف ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ میرا تو سترہویں گریڈ کا نوٹیفیکیشن ابھی ابھی ہوا ہے اور میں سترہویں گریڈ میں جونیئر ترین فرد ہوں پنجاب کی سطح کا افسر مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔

انہی دوستوں کی زبانی علم ہوا کہ پنجاب بھر میں بہت سے ڈی ای او جامعہ سکولوں کے پرنسپل' ایلیمنٹری کالجوں کے پرنسپل اور سینئر ماہرین مضامین اٹھارہویں گریڈ میں صرف 'مواوور' کی وجہ سے تعینات ہیں۔ قصور اور لاہور کا تو مجھے علم تھا کہ وہاں کیسے کیسے گھپلے ہیں لیکن مجھے مشیروں کے اختیارات کا علم نہ تھا۔

☆☆

چودھری اکرام کے سعودی عرب میں مقیم بیٹے نے اپنے ہاں باپ کو عمرہ پر بلایا۔ انہوں نے دس فروری ۱۹۸۴ء سے ایک ماہ کی رخصت لی۔ وہ حرمین شریفین جا رہے تھے۔ میں نے ان کی ساری زیادتیاں بھلا دیں اور آدھی رات کو انہیں الوداع کہنے ہوائی اڈے پر جا پہنچا۔ وہاں سینئر اے ای او چودھری احمد حسن بھی دو کلو برفی کا ڈبہ اٹھائے موجود تھے۔ میں نے چودھری اکرام صاحب سے اپنے حق میں حرمین شریفین میں دعا کرنے کی درخواست کی۔ برفی کا ڈبہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کو روانہ کرنے کے بعد چودھری احمد حسن نے وہ ڈبہ مجھے دے دیا۔ واپسی پر چودھری اکرام نے چودھری احمد حسن سے شکایت کی کہ اس نے تو اسی وقت یہ سمجھ کر آنکھیں پھیر لی تھیں کہ چودھری اکرام واپس بھی آتا ہے یا نہیں؟ وہ حیران ہوا تو چودھری نے کہا کہ کیا تم نے اسی وقت میرے لئے لائی ہوئی مٹھائی کا ڈبہ قاضی کی نذر نہیں کر دیا تھا؟

جس روز چودھری صاحب کو روانہ ہونا تھا اسی روز ڈائریکٹوریٹ میں بلا کر دفتر کا انچارج بناتے ہوئے ڈویژن کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے مجھے تحریری طور پر آگاہ کیا کہ میں صرف روزمرہ کی ڈاک نکالوں گا اور کوئی تقرر یا تبادلہ نہیں کروں گا۔ بطور سند کہ مجھے ضابطے کی اطلاع

ہو چکی ہے چودھری صاحب کی رخصت کی منظوری کے احکام پر میرے دستخط بھی کرائے گئے۔ ضابطہ یہی تھا مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا۔

☆☆

طویل القامت عبدالعزیز ورک اور گول مٹول مرزا محمد شفیع باہم جگری دوست تھے اور ہمیشہ اکھٹے نظر آتے تھے۔ یار لوگ انہیں الف نون کہتے تھے گو وہ اے ای او تھے لیکن محکمے کے علاوہ دائیں بائیں بھی رسائی رکھتے تھے' اپنے بھی خاصے مہربان دوست تھے۔ دو تین دینی مسلکوں کے مشائخ کرام سے بھی نیاز مندی تھی وہ ان کی درخواست پر وزیروں کو ٹیلی فون کر کے ان کے معاملات سیدھے کرادیا کرتے تھے۔ انہوں نے بزعم خویش مجھے خوشخبری سنائی کہ انہوں نے سیکرٹری صاحب کے مشیر اعلیٰ سے مجھے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر مقرر کرنے کی بات کر لی ہے اور اسے بیس ہزار میں سے پانچ ہزار پیشگی بیعانہ بھی دے دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اس غلط مقصد کیلئے ایک کوڑی بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ بھی مجھ سے ایک کوڑی بھی لینا پسند نہیں کرتے لیکن مجھے ڈی۔ ای۔ او بننے کے بعد ان کے کام کرنا ہوں گے۔ مزید بتایا کہ چودھری اکرام نے خود اپنے سیالکوٹ میں تبادلے کی درخواست دے رکھی ہے اور وہ میرے لیے قصور ہی میں تعیناتی کی کوشش کر رہے ہیں رخصت سے واپسی پر چودھری سیالکوٹ ہی حاضر ہوگا۔

میرے دل میں بھی ضلعی سربراہ بننے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ میں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ لوت کے سامنے میرا ضمیر خاموش ہو گیا اور جس پاکبازی اور راست روی کا عہد میں نے اپنے آپ سے کر رکھا تھا' اُسے بھول گیا۔ وہ مجھے مشیر اعلیٰ کے ڈیرے پر لے گئے۔ میری ملاقات مشیر صاحب سے کرائی اور ان سے کہا کہ قابل اعتماد دیرینہ دوست ہے نہایت بے ضرر ہے۔ آپ کے حکم اور ہماری فرمائش سے سرتابی نہیں کرے گا۔ مشیر صاحب نے ان سے کہا کہ رسمی سی درخواست اور کوائف نامہ لے لو اور مجھ سے کہا کہ میں آئندہ ہفتے کے دن ڈی ای او صاحبان کی اسامیاں پر کرنے کے لئے سیکرٹریٹ میں ہونے والے انٹرویو میں شامل ہونے کی تیاری کروں۔ میں اپنے سارے دکھ درد بھول گیا۔ اور اپنے تصورات کی دنیا میں خوابوں کے محل تعمیر کرنے لگا۔ الف نون نے میری خاطر جو بیعانہ دیا تھا وہ میں نے ان کو پیش کیا جسے لینے سے انھوں نے انکار کر دیا تاہم میرے اصرار کے سامنے ان کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

☆☆

مقررہ تاریخ پر انٹرویو کے لئے حاضر ہوا۔ مشیر اعلیٰ سید صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بٹھا لیا۔ انٹرویو دینے والے ۳۷ افراد تھے میرا نمبر گیارہواں تھا۔ پورے پنجاب سے مستحق اور غیر مستحق امیدوار آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے پشاور کی ترقی دیہات اکادمی میں میرا دوست بننے والا نثار اختر زیدی بھی شامل تھا اس نے مجھ سے رازداری سے پوچھا کہ تم نے کسی مشیر سے پکا سودا کر لیا ہے یا نہیں؟ میں جواب گول کر گیا مگر خود اس نے انکشاف کیا کہ اس نے نہ صرف پکا سودا کر لیا ہے بلکہ نقد نذرانہ بھی دے دیا ہے۔ اور جس کے ذریعے یہ کام طے کیا گیا ہے، کام نہ ہونے کی صورت میں وہ اس کے گلے میں ہاتھ بھی ڈال سکتا ہے۔ یہ انٹرویو کا چکر کمائی کی غرض ہی سے چلایا گیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو صرف کوائف نامے اور خفیہ رپورٹوں کے مطالعے سے انتخاب کیا جا سکتا تھا۔

انٹرویو میں سیکرٹری صاحب کے ساتھ ڈی پی آئی میاں شریف بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیکشن آفسر افتخار شاہ بھی تھا جس نے میری اور ملک عبدالمجید کی ترقی کا معاملہ ایسی کھٹائی میں ڈال دیا تھا کہ وہاں سے ہماری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی برآمد نہ ہو سکا۔ مزید دو اور افراد بھی انٹرویو بورڈ میں شامل تھے۔

سیکرٹری صاحب نے میرا کوائف نامہ پڑھا، مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے میاں شریف سے پوچھا کہ قصور میں تو ہم نے سیالکوٹ کے شیخ صاحب کی سفارش پر وہاں کے ہیڈ ماسٹر کو ڈی۔ ای۔ او لگایا تھا وہ کدھر چلا گیا۔

''وہ ابھی تو عمرہ پر گیا ہے، لیکن وہ وہاں ٹِک نہیں سکے گا''۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسے چلنے دے تو وہ وہاں جم کر کام کرے وہ تبادلے کے لئے کئی درخواستیں دے چکا ہے۔ یہ بڑا سیاستدان، عالم فاضل اور قانون دان ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی اس کا سترہویں درجے میں ترقی پانے کا معاملہ صاف ہوا ہے اور اب یہ ڈی۔ ای۔ او بننے کا خواب دیکھنے لگا ہے۔''

سیکرٹری صاحب نے میری طرف ایک نظر دیکھا اور میرے کوائف نامہ کی پشت پر کچھ لکھنا شروع کیا۔ پھر کوائف نامہ سیکشن افسر کو تھماتے ہوئے انہوں نے انگریزی میں اگلے امیدوار کو بلانے کا حکم دیا اور مجھے کہا ''تم جا سکتے ہو۔'' میں سید صاحب کے پاس آ بیٹھا اور ان کو

انٹرویو کی روئیداد سنائی۔ انہوں نے کہا کہ میاں شریف بڑا گھٹیا آدمی ہے حالانکہ میں نے اسے کہا تھا کہ میرے خصوصی امیدوار کا خیال رکھنا۔ پھر کہا کہ کوئی بات نہیں میں خود سیکرٹری صاحب سے بات کروں گا۔ تم مطمئن ہو کر جاؤ۔

میں ادھر سیکریٹریٹ ہی میں متر گشت کرتا رہا۔ صرف تین افراد کا انتخاب ہوا جن میں نثار اختر زیدی بھی شامل تھا۔ تینوں کو سیکشن افسر نے بلا کر کہا کہ وہ اپنے لئے احکام لے کر جائیں۔ یہ تینوں افراد سینئر ترین تھے اور اٹھارہویں گریڈ میں آ چکے تھے۔ باقی سب افراد کے بیعانے اور نذرانے ضائع گئے تھے۔ میں خوش تھا کہ شکست میری نہیں الف اور نون کی ہوئی ہے۔ لیکن الف اور نون مایوس نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر انٹرویو کے بعد ہی جملہ اسامیاں پر کردی جاتیں اور وہ بھی جونیئر امیدواروں سے تو افراتفری مچ جاتی ابھی تو کئی اسامیاں خالی پڑی ہیں کئی مزید خالی ہونے والی ہیں۔ ان کی منطق اور موازنہ ٹھیک ہی تھا میں واپس آ گیا۔ بطور قائم مقام ڈی۔ ای۔ او کی جیپ میرے تصرف میں تھی۔ میٹرک کے امتحانات شروع تھے اور میں قائم مقامی کی وجہ سے پورے ضلع کے امتحانی مراکز کا انسپکٹر بھی تھا۔ میں نے بعد از دوپہر دو مراکز کی پڑتال کی پھر لاہور لوٹ آیا کہ اگلے روز انٹرویوز کی مزید سن گن لوں اور پھر کسی امتحانی مرکز سے ہوتا ہوا دفتر بھی حاضری دوں۔ اگلے روز جو سن گن پختہ کار لوگوں سے ملی وہ یہ تھی کہ انٹرویو کے سراب کا شکار زیادہ تر تو میائے گئے سکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہوئے ہیں کیونکہ ان کو افسر بننے کا زیادہ شوق تھا۔ میں سوچتا رہا کہ انتظامیہ کے اعلیٰ افسر بے انصافی کیوں کرتے ہیں؟ ان کو تو سب ماتحتوں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے تھا۔

میں انٹرویو کو اعلیٰ افسران کی دیانت کا مظہر خیال کرتا تھا۔ گڑبڑ تھی تو نچلے درجوں پر ......سید صاحب مشیر اعلیٰ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''دنیا امید پر قائم ہے اور تمہاری امانت میرے پاس محفوظ ہے۔'' دل میں، مَیں یہ سمجھتا تھا کہ الف نون نے مجھے بہلانے کے لئے بیعانے کا ذکر کیا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔ میں سید صاحب کو سلام کر کے سیکرٹریٹ سے نکل آیا۔ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے مجھے سیکرٹری تعلیم کی اس تحریر کا خیال آیا جو انہوں نے میرے کوائف نامہ کی پشت پر لکھی تھی۔ میرے لئے تحریر کو جاننا ضروری تھا۔ میں فوراً سیکشن افسر کے دفتر گیا اور ایک واقف اسسٹنٹ سے پوری بات کی۔ اس نے بڑی محبت سے کہا۔ ''بیٹھئے بیٹھئے کوئی بات نہیں۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ صاحب نے کیا لکھا ہے۔ آپ بیٹھیں آپ کو چائے پلاتے ہیں۔''

میں بیٹھ گیا وہ اٹھ کر افتخار شاہ کی میز پر گیا۔ انٹرویوز والی مسل نکالی اور میرا کوائف نامہ نکال لایا۔ میں نے تحریر پر سرسری نظر ڈالی وہ یکسر منفی تھی۔ لکھا تھا کہ مجھے فی الفور قصور کے کسی دیہی سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات کیا جائے اور ڈی۔ پی۔ آئی سکولز ڈپٹی کی منفی سرگرمیوں کے بارے میں مفصل رپورٹ پیش کریں تا کہ قوانین کے مطابق انضباطی کاروائی ہو سکے۔ میں گھبرا گیا۔ اسسٹنٹ کو چپکے سے دوسو روپے تھمانے لگا۔ اس نے میرے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی...... کہنے لگا یہ تکلیف نہ کیجئے۔ آپ ہمارے محسن ہیں۔ آپ جب اے۔ ڈی۔ آئی لاہور تھے تو آپ نے میرے بھائی جوزف پر ایک بہت بڑا احسان کیا تھا۔"

مجھے جوزف یاد تھا نہ احسان...... مگر اپنے نامعلوم احسان کا نقد بدلہ مل رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نیکی سدا بہار چیز ہے کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اس ابدی صداقت کا ثبوت میں نے ہمیشہ اور ہر جگہ دیکھا ہے۔

اسسٹنٹ نے مزید کہا کہ آپ کے احسان کی وجہ سے میرا بھائی سی ٹی کر کے اب تک لاکھوں کما چکا ہے۔ میں نے اپنا کوائف نامہ جیب میں ڈالا اور خوشی خوشی قصور روانہ ہو گیا۔ اگر کوائف نامہ میرے ہاتھ نہ لگتا تو افتخار شاہ اپنی نشست پر آتے ہی سیکرٹری کے حکم پر دستخط کرتا۔ اور آگے روانہ کر دیتا۔ کئی دن بعد میں نے افتخار شاہ سے پوچھا کہ صاحب نے میرے متعلق کیا لکھا تھا تو اس نے کہا وہ کاغذ کہیں ان کے دفتر ہی میں گر گیا تھا۔ آپ کیلئے اچھا ہوا۔ سیکرٹری نے میاں شریف کے بیان کے مطابق ہی کچھ لکھا ہو گا...... ویسے آپ میاں شریف کو راضی کر لیں تو اچھا رہے گا"۔

میرے دل سے افتخار شاہ کے اندیشوں کا بوجھ اتر گیا ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے اس بارے میں کوئی اودھم نہ مچایا ہو۔

☆☆

چودھری اکرام نے عمرہ کے لئے لی گئی ایک ماہ کی رخصت میں پندرہ ایام کی توسیع کرالی۔ جب توسیع ہوئی تو محبوب سیال اے۔ ای۔ او چونیاں نے رانا صفدر جنگ سے میرے حق میں یہ لکھوا دیا کہ میں مکمل طور پر ڈی۔ ای۔ او قصور کے اختیارات استعمال کر سکتا ہوں۔ ساتھ ہی وہ چار آدمیوں کی درخواستیں برائے تقرر درجہ چہارم ملازمین لایا اور عندیہ دیا کہ یہ رانا صفدر جنگ ہی کا کام ہے۔ پھر اس نے دو اپنے آدمی بھی ان میں شامل کر

دیئے۔ مجھے اختیارات استعمال کرنے کا جو پروانہ ملا تھا وہ میں نے واضح طور پر رجسٹر آمد ڈاک میں درج کرایا اور اس کی ایک نقل اپنے پاس رکھی تا کہ بروقت کام آئے۔ میں نے درجہ چہارم کے چھ افراد کا تقرر کر دیا۔

پندرہ یوم کے بعد جس روز چودھری اکرام واپس آئے تو ان کے پروردہ سپرنٹنڈنٹ شیخ رفیع نے رات بھر ان کے کان بھرے میرے تمام کاموں کی رپورٹ پیش کی۔ تقررات کا ذکر بھی کیا مگر اس حکمنامے کا ذکر نہیں کیا جو مجھے اختیارات تفویض کرتا تھا۔ اس نے اسے مسل ہی سے گم کر دیا۔ اس نے میرے انٹرویو برائے اسامی ڈی۔ ای۔ او کا ذکر بھی کیا اور کہا ''آپ کو بس آپ کی اچھی قسمت اور عمرے کے فیوض نے بچایا ہے ورنہ قاضی صاحب تو آپ کو لے ڈوبے تھے''۔ اس نے مزید کہا ''آپ کے لئے خطرہ اب بھی باقی ہے''۔

کچے کانوں والے چودھری اکرام پر سپرنٹنڈنٹ کی لگائی بجھائی کا اثر یہ ہوا کہ مبارک باد کے جواب میں انہوں نے خیر مبارک' تو کہا لیکن مجھے خاک حرم کی کوئی کھجور یا آب زمزم تک نہیں دیا۔ پھر ایک روز ان کی درخواست پر دفتر ڈی پی آئی سے ایک افسر میرے کیے ہوئے بے ضابطہ تقررات کی تحقیقات کے لئے پہنچ گیا۔ بڑی لے دے ہوئی۔

سپرنٹنڈنٹ بولا کہ مجھے تو احکام پر اپنے مختصر دستخط کرنے ہی تھے کہ اس وقت قاضی صاحب قائم مقام ڈی ای او تھے کرسی کو سلام کرنا ہی پڑتا ہے اگر ڈائریکٹر صاحب نے ان کو اختیارات دیئے تھے تو ان کی چٹھی بھی ملتی۔ اس کا اندراج بھی کسی کلرک کے ہاتھ کا نہیں۔ بالآخر جب میں نے ڈائریکٹر لاہور ڈویژن رانا صفدر جنگ کے دستخط کے حامل حکم کی فوٹو کاپی پیش کی تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اور سب کے منہ بند اور آنکھیں نیچی ہوگئیں تاہم ڈی۔ پی۔ آئی نے یہ حکم بھیجا کہ تقرر خلاف ضابطہ تھے ان کو منسوخ کر دیا جائے۔ ڈی۔ ای۔ او صاحب نے تقرر منسوخ کر دیئے۔

چودھری محمد اکرام کو احساس ہوا کہ ڈی پی آئی سکولز سے اس کی دوستی اور ڈپٹی سے پرخاش کی وجہ سے ڈائریکٹر صاحب اس کے رویے سے کچھ شاکی ہیں۔ ایک روز انہوں نے مجھے ازخود اپنے کمرے میں بلایا۔ اور کہا کہ ان کو علم ہوا ہے کہ مجھے ان کی جگہ ڈی۔ ای۔ او اور انہیں پرنسپل جامعہ سکول سیالکوٹ تعینات کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ یہ خبر ان کو سید صاحب نے دی ہے۔ مگر بعد میں شاید سید صاحب اپنے منشاء میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کی اطلاع

مجھے تو الف نون نے یہ کہہ کر دی کہ میاں شریف نہیں مانتا۔ چودھری صاحب کو بھی اطلاع ہوگئی اب وہ مجھ سے ٹیڑھے ہوگئے بلکہ ایک روز انہوں نے میری جواب طلبی کی کہ کیا میں نے محکمے سے روزانہ اپنے گھر جانے اور وہاں سے آنے کی اجازت لے رکھی ہے؟ جبکہ قواعد وضوابط کے تحت کسی سرکاری ملازم کو بغیر اجازت اپنا مقام تقرر چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

میں نے قدرے گستاخانہ انداز میں جواب لکھا کہ میں سٹیل باغ قصور کے قریب کمیٹی کی حدود کے اندر رہتا ہوں افسوس ہے کہ آپ کے مخبروں نے آپ کو غلط اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ تصدیق کے لئے آج میرے ساتھ پانچ بجے چائے کی پیالی نوش فرمائیں۔ مزید لکھا کہ واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ دشمن' دوست سے زیادہ ہماری ذات میں دلچسپی لیتا ہے۔

مدرس قادر بخش کے ایک نائب مدرس سے میرے اے۔ ڈی۔ آئی کے زمانے سے تعلقات تھے۔ اس نے موڑ پر ایک مکان بنا رکھا تھا۔ میں موسم سرما میں کبھی کبھی وہاں تک جاتا تھا۔ میں آسانی سے اس کے دیوان خانے میں چودھری کو چائے پلا سکتا تھا۔ میرا جواب پڑھ کر دن بھر چودھری صاحب کی صورت پر مردنی چھائی رہی۔ کچھ بھی تھا آخر کو وہ میرے افسر تھے انہوں نے دانستہ مجھے تنگ کرنے کیلئے میری ۱۹۸۳ء کی اے۔ سی۔ آر نہیں لکھی تھی۔ مختلف لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں اور حرکات سے انہوں نے مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور اب میرے لئے اپنا دفاع ضروری ہوگیا۔ میں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ انجام کی بھی پرواہ نہیں کی اور کچھ ایسے الزامات کی فہرست مرتب کی جن کے واضح ثبوت موجود تھے۔ میں نے کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جس کو میں ثابت نہ کرسکوں پھر بھی وفور جذبات میں چند ایسی باتیں لکھ دیں جن کو میں ثابت نہ کرسکتا تھا مگر وہ تھیں سولہ آنے سچی اور کھری......

☆☆

چونکہ میں ایک ادیب وفنکار بھی تھا۔ میں نے درخواست کی ایک تمہید باندھی کہ ظالم کے بجائے مظلوم بننا احسن گردانا گیا ہے۔ تاہم اصلاح وتادیب کا نظریہ یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ بلاوجہ ایک تھپڑ مارنے والے کو دوسرا گال پیش نہ کیا جائے بلکہ تھپڑ کا جواب ایسے تھپڑ سے دینا چاہیے کہ وہ اپنا گال سہلاتا رہ جائے ایسی ہی فلسفیانہ باتیں قلم بند کر کے۔ میں نے چودھری اکرام کے خلاف چار صفحات پر مشتمل اٹھارہ الزامات پر مبنی ایک درخواست تیار کی' اس کے ساتھ چار روپے کے اسٹام پر بیان حلفی مجسٹریٹ درجہ اول سے تصدیق کرا کر منسلک کیا اور

بذریعہ رجسٹری ڈاک چیئر مین گورنر معائنہ ٹیم کو ارسال کردی۔ حلفیہ بیان میں اپنا نام و پتہ لکھنے کے علاوہ میں نے لکھا کہ

۱۔ منسلکہ درخواست ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر' قصور چودھری محمد اکرام کے خلاف ہے۔

۲۔ درخواست میں لگائے الزامات سو فیصد درست ہیں

۳۔ میں دفتر کے ریکارڈ اور گواہوں کے ذریعے ان کو ثابت کر سکتا ہوں۔

۴۔ تحقیق کے بعد الزامات غلط ثابت ہوں تو میں اپنے آپ کو سزا کیلئے پیش کرتا ہوں۔

درخواست کا متن طویل تھا لیکن میں نے قسم کھا کر لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ اکیلا چنا کوئی بھاڑ نہیں جھونک سکتا لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے۔ نالائق افسر ذلیل کرنے پر اتر آئے تو اظہار خیال ضروری ہو جاتا ہے:

جناب عالی! جس طرح ستارے ہیں کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ اور! جس طرح ریت کا سمندر پانی کی طرح جھلملاتا ہے ٹھیک یہی حال چودھری محمد اکرام دسٹرکٹ ایجوکیشن افسر قصور کا ہے۔ وہ آٹھوں گانٹھ کمیت ہے ننانوے کے پھیر میں ہے حرفوں کا پتلا ہے اپنی چالاکی طفیل آسمان پر تھگلی لگاتا ہے اور بندر کی بلا طویلے کے سر منڈھ دیتا ہے۔

اس ابتدائیے کے بعد میں نے ۱۹۸۲-۸۳ کی گرانٹوں سے اس وقت کے ڈائریکٹر کو دس ہزار حصہ دینے' محمد اصغر کو نو سال کی غیر حاضری کے بعد حاضر کر لینے' رمضان المبارک میں گرانٹوں سے خریدے ہوئے مال کی ٹھیکیداروں کو سحری کے وقت ادائیگی اور ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب اپنی کمیشن کا بریف کیس بھر کر سیالکوٹ کے ٹھیکیداروں کے ساتھ ہی رخصت اتفاقیہ پر چلے جانے کی واردات' خریدے ہوئے اموال تیسرے درجے سے بھی گھٹیا ہونے' جولائی ۸۲ میں عطا کیے گئے اساتذہ کی سلیکشن گریڈوں کی اغلاط کی وجہ سے منسوخی' اس امر کی جعلی تصدیق کہ ۱۹۸۳ء میں بھی اساتذہ کو سلیکشن گریڈ دیئے گئے۔ جولائی اگست ۸۳ء میں ستر سے زیادہ درجہ چہارم کے ملازمین کا میرٹ کے بغیر تقرر' فوجی کوٹہ کی نظر اندازی' سلیم جاوید بک ڈپو رامتلائی' سیالکوٹ کے پبلشر کی گرامر اور ٹرانسلیشن کی کتب مڈل اور ہائی سکولوں میں لگوانا' فرضی سرٹیفکیٹ کا اجراء کہ ضلع بھر میں کوئی مردانہ یا زنانہ گھوسٹ سکول نہیں ہے۔ جماعت پنجم کے طلباء سے بیک وقت امتحان لینے کیلئے چھتیس ہزار روپیہ جمع کرنا اور ڈائریکٹر سے مل کر کھا جانا' عبدالکریم قادیانی اے۔ ای۔ او کو خلیفہ بنانا اس کو میری جگہ تعینات کرانے کے منصوبے'

روشن خیال اساتذہ کی سرکوبی کے لئے یونین کو استعمال کرنا کلرکوں کی ذمہ داریاں تواتر سے بدلنا بارہ اور چودہ مئی کو رسمی انٹرویو کرنے اور عربی اساتذہ کا میرٹ عبدالکریم سے بنوانے' قومی تحویل میں لئے گئے جس سکول میں ڈی ای او کی رہائش تھی وہاں کے ہیڈ کلرک کو شخصی خدمات کے عوض دفتر کا سرنٹنڈنٹ بنانے' چمچے اور کڑچھے رکھنے معلمات اور معلمین کو سلیکشن گریڈ دینے کے علاوہ ناجائز تقررات کے الزامات کا ڈھیر لگا دیا۔

آخری پیرا میں نے یوں لکھا:

جناب والا! میں نے مئی میں قصور میں بطور ڈپٹی ایجوکیشن افسر حاضری دی۔ تب ہی سے صاحب کا رویہ میرے ساتھ معاندانہ ہے۔ انہوں نے میری ۱۹۸۳ء کی اے سی آر ابھی تک نہیں لکھی جو قواعد وضوابط کی رو سے جنوری ۸۴ء میں لکھ دی جانی چاہیے تھی۔ وہ خود ضلعی سطح پر ہونے والی میٹنگوں میں جانے سے اجتناب کرتے ہیں اس لیے صرف مجھے میٹنگوں میں بھیجتے ہیں اس کے علاوہ کسی قسم کا کوئی کام مجھے تفویض نہیں کیا گیا۔ آخر گریڈ ۱۷ کی آسامی کس مقصد کے لئے ہے۔ میں خالی بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہوں۔ اس صورتِ حال کا فیصلہ کر دیجئے۔ اس طرح محکمے کا بڑا بھلا ہوگا۔

◆◆◆◆◆

(۴۱)

تحقیقات

مذکورہ درخواست میں نے ۱۵/جولائی ۸۴ء کو بھیجی۔ اس پر تیزی سے عمل ہوا۔ محکمے کے افسروں کو اطلاع ہوگئی کہ فلاں شخص کی درخواست فلاں افسر کے خلاف انٹی کرپشن سیل کو بھیج دی گئی ہے۔ درخواست پر انٹی کرپشن کے عملے نے ابتدائی تحقیقات خفیہ طور پر کیں اور کئی مندرجات درست پا کر درخواست مکمل تحقیق، رپورٹ اور سفارشات کے لئے لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد یوسف، افسر بکار خاص جنرل ایڈمنسٹریشن کو بھیج دی۔

۳۱/اگست ۸۴ء کو اچانک میرے چھوٹے بھائی کا عین عالم جوانی میں یکایک انتقال ہوگیا۔ میں پہلے ہی دل گرفتہ تھا۔ اس کے چھ بچوں اور بیوہ کی آہ وبکا نے مجھے اور زیادہ پریشان کردیا۔ میں ایک درخواست لے کر کرنل یوسف کے پاس گیا اور عرض کیا کہ میں اپنے ڈی۔ای۔او کے خلاف دی گئی اپنی درخواست سے دستبردار ہوتا ہوں۔ کرنل نے کہا کہ غم کی وجہ سے تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ اگر تم نے درخواست واپس لی تو تمہارے خلاف فلاں فلاں دفعہ کے تحت کارروائی ہوسکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہے۔ جس میں کسی بھی دعوے میں منحرف کے لئے برخاستگی کی سزا ہے۔ میں دل گرفتہ لوٹ آیا میں سمجھ رہا تھا کہ نیکی کی طاقتوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور میں 'لوت' کی گرفت میں ہوں۔

☆☆

ابھی تحقیقات کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی کہ مجھ ناپسندیدہ شخص کو میاں شریف نے بطور ماہر مضمون گورنمنٹ کالج برائے ایلیمنٹری ٹیچرز، لالہ موسیٰ (گجرات) تبدیل کردیا۔ مجھے احکام بذریعہ ڈاک بھیجے گئے۔ جبکہ میری جگہ تعینات ہونے والے پروانشلائزڈ کیڈر کے فعال کارکن شیخ محمد اقبال ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول واں رادھا رام کو احکام دفتر ڈی۔پی۔آئی بلا کر

دست بدست دیئے گئے۔ انہیں حکم دیا گیا۔ کہ وہ اپنے سکول کا چارج چھوڑ کر فوراً قصور حاضر ہوں۔ چودھری محمد اکرام کو بھی ایک نقل دستی دفتر سے بھجوائی گئی۔ انہوں نے فخریہ انداز میں دفتر میں موصول ہونے والے حکم کی نقل مجھے بھی بھیجی۔ شیخ اقبال کو تو دوسرے دن آنا تھا لیکن میں نے حکم ملتے ہی اسامی کا چارج چھوڑ دیا۔ فارم بھرے نائب قاصد کو دیئے وہ عملہ جو از خود میرے کمرے میں آیا اس سے میں نے ہاتھ ملایا باقی کسی فرد سے میں نے الوداعی ملاقات نہیں کی۔

میں خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گھر آ کر خوب سویا۔ بیوی کو بھی نہیں بتایا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ میں لالہ موسیٰ حاضر ہو کر اپنی استحقاقی رخصت حاصل کر سکتا تھا یا پھر سمبڑیال سے روزانہ لالہ موسیٰ آمد و رفت ہو سکتی تھی۔ میں ابھی سو ہی رہا تھا کہ الف نون آ گئے۔ کہنے لگے تم نے میدان چھوڑ دیا تو ہماری سبکی ہو گی۔ ہم دو ٹکے کے نہیں رہیں گے۔ مشیر صاحب کہتے ہیں کہ قاضی سے درخواست لاؤ۔ کرنل یوسف کی طرف سے ہونے والی تحقیقات پوری ہونے تک قاضی کا تبادلہ ہو سکتا ہے نہ ڈی ای او کا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس بک بک سے نکلنے ہی دو۔ میاں شریف کی موجودگی میں میری دال نہیں گل سکتی۔ وہ بضد ہوئے تو میں نے کہا اچھا! اب جائیے درپیش صورتحال پر کل مزید سوچ بچار کریں گے۔

یہ ماجرا بیوی بچوں کو سنایا تو انہیں صدمہ سا ہوا اور سوال و جواب کی تکرار ہونے لگی۔ بچے پوچھتے کیا ہم لالہ موسیٰ جائیں گے۔ ہمیں اپنا سکول اور اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔

میں نے سمجھایا کہ ملازمت میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہم بہاولپور بھی رہے ہیں، قصور بھی رہے ہیں، سیالکوٹ میں مَیں اکیلا ہی رہا ہوں۔ اب بھی میں وہاں اکیلا رہ لوں گا فکر کی کوئی بات نہیں۔ دن کو زیادہ سو لینے کی وجہ سے رات کو نیند ٹوٹ گئی۔ جوش ملیح آبادی بعض باتیں بڑی پر لطف کہہ گئے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہم چاہے کتنے ہی زمانے دیکھ لیں، کتنی ہی عمر گزار لیں، دودھ کے دانت ہمارے اندر موجود رہتے ہیں۔ پوری طرح نہیں ٹوٹتے۔ اپنی کچی پکی نیند کے دوران میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں صبح ہوتے ہی ایک ڈرامہ رچاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ کل صبح میں اکیلا ہی کسی کو بتائے بغیر کرنل یوسف سے ملوں گا اور لکھ کر لے جاؤں گا کہ میاں شریف نے ان کی تحقیقات میں حائل ہونے اور اپنی برادری کے بھائی چودھری محمد اکرام کو بچانے کی خاطر میرا تبادلہ کر دیا ہے۔ ایسے میں میرے لیے تحقیقات میں حصہ لینا مشکل ہو گا۔

کرنل یوسف نے میری درخواست پڑھی۔ پھر فوراً قلم اٹھایا اور لکھا:

"ڈی پی آئی......تبادلہ التواء میں ڈال دو۔"

چنانچہ ۷/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہونے والا میرا تبادلہ منسوخ ہو گیا میں دفتر پہنچا شیخ محمد اقبال فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور معاً کہنے لگے کہ میں نے تو میاں شریف کو دفتر ہی میں کہہ دیا تھا کہ وہ یہ تبادلہ کر کے غلطی کر رہے ہیں یہ لازماً منسوخ ہو جائے گا اور ہم سب کو شرمندگی ہوگی۔"

"آپ تو میرے بھائی ہیں...... جو جتنی بلندی سے گرتا ہے اسے اتنی ہی شدید چوٹ لگتی ہے میرا ارادہ تبادلہ خود منسوخ کرانے کا نہیں تھا لیکن مجھے ایک بیماری چمٹی ہوئی ہے جو کبھی کبھی مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور میں منفی حرکتیں کرنے لگتا ہوں۔"

شیخ اقبال نے مجھے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور خود سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی نائب قاصد کے ذریعے رجسٹر حاضری منگوایا حاضری لگائی۔ پھر رسمی رپورٹ تیار کرائی۔

شیخ محمد اقبال بڑے اچھے دوستوں میں سے تھے جب میں نیا نیا اے ڈی آئی بنا تھا تو اس وقت وہ ڈی بی ہائی سکول رائے ونڈ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ بڑے مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ کسی کے کام آنا اور اپنے پرائے کی تمیز اٹھا کر اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا بھی کتنا بڑا شرف ہے جو اپنا انعام خود ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مکائد و مکروہات کو نا قابل توجہ بنا دیتا ہے۔ شیخ اقبال کام کرنے کے دھنی تھے۔ جب بھی انہیں کوئی کام سونپا جاتا اسے وہ اس قدر ادب اور اخلاص سے انجام دیتے جیسے میں ان کا پیر اور وہ میرے مرید ہیں۔

اُن کا یہ حسن عمل صرف مجھ تک ہی موقوف نہیں تھا وہ ہر چھوٹے بڑے کے کام آتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انہوں نے کہا کہ کیا آپ دونوں یعنی میرے اور چودھری اکرام صاحب کے درمیان صلح صفائی نہیں ہو سکتی۔ میں نے جواب دیا......نہیں......اس لیے کہ معاملہ دور نکل چکا ہے۔

چند روز بعد ہی تحقیقاتی افسر کرنل یوسف کی جانب سے ۱۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو جاری ہونے والے سمن موصول ہو گئے کہ وہ ۲۳، ۲۴ اور ۲۵/اکتوبر کو قصور کے ضلعی دفتر میں میری درخواست بنام گورنر معائنہ ٹیم کے مندرجات کی تحقیق کریں گے لہٰذا میں ان تواریخ کو دفتر میں حاضر رہوں۔

☆☆

تین دن مسلسل تحقیقات ہوئی۔ پھر گواہوں کی شہادتیں ہوئیں۔ دستاویزات بطور ثبوت حاصل کی گئیں اور ان کا معائنہ ہوتا رہا کئی ایسی باتیں بھی تحقیقاتی افسر کے علم میں آئیں جن کا خود میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ اور ''افسانہ از افسانہ می خیزد'' کے مطابق تحقیقات شیطان کی آنت بن گئی اس کا اندازہ مختصر رپورٹ سے منسلک شدہ چار فائلوں کی ضخامت سے لگایا جا سکتا ہے جو چیئرمین گورنرز انسپکشن ٹیم اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر/گورنر کو بھیجی گئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

فائل نمبرا...... اٹھارہ صفحات پر مشتمل تھی جو تحقیقات کے حاصل پر مبنی تھے۔
فائل نمبر۲...... ۸۹ صفحات پر مشتمل تھی جس میں الزامات اور ملزم افسر کے جوابات درج تھے۔
فائل نمبر۳...... ۳۴ گواہوں کی شہادتوں پر مشتمل تھی
فائل نمبر۴...... میں دستاویزی شہادتیں تھیں۔

گورنر کی منظوری کے بعد سیکرٹری تعلیم نے سمری اور متعلقہ ریکارڈ عمل درآمد کے لئے ڈی۔ پی آئی سکولز کو فراہم کر دیا۔ گورنر معائنہ ٹیم نے تحقیقات کے نکات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ عمومی تھا کہ ڈی پی آئی اس صورت حال کی تحقیقات سارے پنجاب میں کرائے۔ دوسرا حصہ خصوصی تھا کہ ضلع قصور میں یہ یہ کام کئے جائیں اور فلاں فلاں اہلکار کے خلاف انضباطی قوانین کے تحت کارروائی کی جائے۔ اس رپورٹ کی ایک نقل مجھے ڈی پی ای کے دفتر کے ایک مرحوم و مغفور ہمدرد کلرک نے فوٹو سٹیٹ کروا کر مہیا کر دی۔

بقول کسے جب یہ رپورٹ میاں شریف نے پڑھی تو انہیں چودھری اکرام پر بڑا غصہ آیا انہیں فوراً بلوایا اور فرمایا:

''تینوں اپنا برادری بھرا سمجھ کے ڈی او لایا سی۔ توں اوتھے چھولے ویچ دا رہیا تے مال بناندا رہیا ایں۔ تیرا ڈپٹی ہن ساڈا مانیٹر بن گیا اے۔ اوہدی وجہ نال ہن اسی ایکسر سائز کراں گے...... قصور وچ ای نئیں پورے پنجاب وچ۔''

یعنی تمہیں اپنی برادری کا سمجھ کر ڈی ای او تعینات کیا تھا لیکن تم وہاں چنے بیچتے رہے اور مال بناتے رہے۔ تمہارا ڈپٹی اب ہمارا محتسب بن گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں ضلع قصور ہی میں نہیں سارے پنجاب میں بہت کام کرنا پڑے گا...... کام تو خیر میاں شریف صاحب کو کیا

کرنا تھا وہ ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی لیکن انہوں نے چودھری اکرام کے تو سارے قصور معاف کر دیئے لیکن میرے متعلق اپنے دل میں بغض و عناد کی گرہ باندھ لی۔ رپورٹ پر عمل درآمد صرف اس قدر کیا کہ کلرکوں کے تبادلے کر دیئے اے ای او صاحبان کو وارننگ جاری کی اور چودھری اکرام کو فوری طور پر اپنے دفتر میں افسر بکار خاص لگالیا اور پھر چند روز بعد انہیں ان کے گھر سیالکوٹ میں جامعہ سکول کا پرنسپل تعینات کر دیا۔

ضلعی سطح پر نظم و نسق کی تصویر تحقیقاتی رپورٹ کے ۲۷ویں پیراگراف میں یوں کھینچی گئی ہے:

''تحقیقات کے دوران یہ بھی انکشاف ہوا کہ ناقص منصوبہ بندی پیش بینی اور کارکردگی کے فقدان وجہ سے مکتب سکیم آخری سانس لے رہی ہے۔ مکتب سکولوں کی کل تعداد کے ایک تہائی کا تو وجود ہی نہیں ہے اور جو ہیں ان کی حالت نظم و ضبط اور دیگر ضروری تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ناگفتہ بہ ہے مکتب سکیم سے کوئی فائدہ نہیں ہوا (میں نے اپنی درخواست میں مکاتب کا نام بھی نہیں لیا تھا)۔ مدرسوں کے لئے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے سرمائے اور خصوصی ترقیاتی امدادی رقوم سے خریدا ہوا سامان یا مخصوص فرنیچر وغیرہ گوداموں میں پڑا گل سڑ رہا ہے۔ وہ منظور شدہ معیاری تصریحات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یونیسکو کی طرف سے فراہم کردہ تعلیمی معاونت کے اہم آلات اشیاء اور دیگر سائنسی سامان ۸۳-۱۹۸۲ سے بند پڑا ہے۔ بہت سے مفید آلات چرا لئے گئے ہیں لہٰذا سفارش کی جاتی ہے کہ اس صورت حال کی پنجاب بھر میں پڑتال کی جائے...... پڑتال کی یہ سفارش ہی وہ ''ایکسر سائز'' تھی جس کا ذکر ڈی پی آئی نے چودھری اکرام کو ڈانٹتے ہوئے کیا تھا اور مجھے ''مانیٹر'' کا لقب عطا کیا تھا۔ مندرجہ بالا پیرے کا آخری جملہ یہ تھا کہ ضلعی تعلیمی افسروں کا تقرر خصوصی احتیاط سے کیا جانا چاہیے۔

جب رپورٹ تک میری رسائی ہوئی اس وقت تک رپورٹ کے کئی حصوں پر عمل ہو چکا تھا لیکن سیکرٹریٹ کے افسروں اور میاں شریف نے چودھری اکرام کو معطل کرنے کی سفارش نظر انداز کر دی تھی۔ میرے بارے میں بھی لکھا کہ چودھری اکرام نے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ڈپٹی کو کوئی کام نہیں دیا۔ محکمہ تعلیم کے نزدیک ۱۷ویں گریڈ کی اسامی کا یقیناً کوئی اہم مقصد ہوگا یہ مقصد بخوبی پورا ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کو مؤثر اقدام کرنا چاہیے ادھر میری حالت یہ تھی کہ میں خود اندر سے سہما ہوا تھا۔ ہر وقت یہی خوف لاحق رہتا کہ میاں شریف میرے منسوخ کئے گئے احکام تبادلہ از سر نو جاری نہ کر دے۔

میرا سترہویں گریڈ سے اٹھارہویں میں ''موواور'' یکم دسمبر ۸۴ سے ملنا چاہیے تھا لیکن میری اے سی آر نہ لکھنے کی وجہ سے یہ بھی رکا ہوا تھا۔ چودھری اکرام کے خلاف درخواست دینے کا سبب یہ دکھ بھی تھا۔ معلم کا عظیم منصب تعلیم وتربیت کے میدان مین قندیل رہبری کی حیثیت رکھتا ہے مگر حالت یہ ہوگئی تھی کہ معلم اپنی ہی انتظامیہ کے ہاتھوں بدنام ہورہا تھا۔ ہم اساتذہ اپنے اپنے جداگانہ مسائل میں الجھا دیئے گئے تھے اصل کام کا عشر عشیر بھی پورا نہ ہوا

☆☆

چودھری محمد اکرام کی جگہ نئے ڈی ای او کا تقرر پُراسرار طور پر دبے پاؤں ہوا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ان کو خفیہ ہاتھ کی سفارش پر پروانشلائزڈ سکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدہ سے تبدیل کرکے ڈی ای او تعینات کیا گیا۔ وہ مجھ سے دوسال جونیئر تھے۔ عمر میں بھی چھوٹے تھے۔ انہوں نے ۸۵ء کے پہلے ہفتے میں قصور میں اپنا منصب سنبھالا۔ وہ ۲۲/جون تک قصور میں رہے۔ میرا انہوں نے ادب ولحاظ ہی کیا۔ شروع میں تو وہ مجھے بھولے بھالے نظر آئے لیکن اندر سے نہ صرف پختہ کار تھے بلکہ

ع...... ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

کی عملی تفسیر تھے۔ ان کا طریق واردات بڑا کاری تھا۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انہیں جو عہدہ ملا ہے وہ وقت کی غلط بخشی ہے۔ وہ اس کے اہل نہ تھے......

چودھری احمد حسن اے ای او انہی کے ضلع شیخوپورہ کے رہنے والے تھے اور ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ پہلے تو انہوں نے ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ، صوبائی ڈائریکٹوریٹ اور سیکریٹریٹ کے افسران اعلیٰ کے نام گنوائے اور ان سے اپنے ''خاص تعلقات'' کا ذکر کیا۔ دیگر محکمہ میں بھی اپنے مہربان موجود ہونے کا جعلی عکس ڈالا چند نامی گرامی سیاستدانوں کے نام جتائے۔ اور اپنے ماتحتوں پر دھاک بٹھادی۔ پھر انہوں نے اپنے ہر ماتحت سے الگ الگ ملاقات کی اور سب کو یہ باور کرایا کہ وہ مستقل میں اسے ہی اپنا خاص آدمی سمجھیں گے۔

میرے ساتھ ان کی خصوصی نشست ہوئی۔ فرمانے لگے میں تو دفتری معاملات سے بے خبر کندۂ ناتراش ہوں یوں سمجھو کہ آپ ہی ڈی ای او صاحب ہو۔ میں ہر قدم اٹھانے سے پہلے آپ سے مشورہ کروں گا۔ آپ کو مرشد کہوں گا اور آپ سے محکمہ تعلیم کے خاص گُر سیکھوں گا۔ یہ تو چودھری اکرام کی کورنگاہی اور بدبختی تھی کہ اس نے آپ جیسے تجربہ کار ڈپٹی کے تجربات

اور پختگی سے استفادہ نہیں کیا۔"

☆☆

چند ہی دن گزرے تھے کہ اصل بھید کھل گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ وہ مجھ سے مشورہ تو ضرور لیتے ہیں لیکن مرضی اپنی ہی چلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کچھ کلرکوں کی تقسیم کار بدلنی چاہی۔ مجھ سے مشورہ کیا جو کچھ میں کہتا اور ان کو پسند نہ آتا تو وہ کہتے کہ الف کو فلاں کام دینے کے متعلق فلاں فلاں افسر نے سفارش کی ہے۔ چودھری احمد حسن نے بتایا کہ وہ من مانی کریں گے اور بات اُسی کی مانیں گے جو انہیں اپنے ڈھب کا نظر آئے گا۔ چودھری نے مجھے یہ بھی کہا کہ اب ضلعی بھرتی کمیٹی کے سیکرٹری آپ ہیں اور میں رکن ہوں لیکن وہ تقرر کے سلسلے میں مشورے زنانہ ڈی ای او کے ہیڈ کلرک سے لے رہے ہیں۔ ہم سے انہوں نے بات بھی نہیں کی۔ (۱۹۸۵ء کی آمد کے ساتھ ہی زنانہ شعبہ الگ کر دیا گیا تھا اور ضلعی افسر تعلیم (زنانہ) کا تقرر بھی ہو چکا تھا) ہیڈ کلرک زنانہ دفتر ضلع قصور کے گوشے گوشے سے باخبر تھا اور خواتین اساتذہ اُسی کو اپنے دفتر کا کرتا دھرتا سمجھتی تھیں۔ لہٰذا وہ ایک اہم شخص تھا۔

احمد حسن نے اپنے ضلع کے ناتے ڈی ای او صاحب کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی تو ڈی ای او نے احمد حسن سے کہا کہ تو مجھے جانتا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے یہ عہدہ ایسے ہی راہ چلتے نہیں مل گیا۔ میں جلد از جلد اپنا کھاتہ پورا کرنا چاہتا ہوں۔ ڈپٹی صاحب کو سمجھا دو۔ مجھے دوستوں کے کام کرنے ہیں لہٰذا میں ضلع بھر کی تمام ایسی اسامیاں جو میرے دائرہ اختیار میں آتی ہیں پُر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ہیڈ کلرک زنانہ سے اشتہار بنوا لیا ہے۔ جو چند دن میں اخبارات میں شائع ہونے والا ہے۔

☆☆

ہیڈ کلرک زنانہ قصور کی سرکاری رہائشی کالونی میں رہائش پذیر تھا اس نے کوشش کر کے ڈی ای او صاحب کو بھی کالونی میں ایک بڑا کوارٹر الاٹ کرا دیا۔ وہ بال بچوں سمیت وہاں رہنے لگے۔ چند روز بعد "ضرورت ہے" کا اشتہار شائع ہوا جس میں انہوں نے بطور چیئر مین ضلعی بھرتی کمیٹی و ضلعی تعلیمی افسر اساتذہ اور درجہ چہارم کے امیدواران سے بذریعہ دفتر روزگار درخواستیں طلب کیں۔ مجھ سے اور احمد حسن سے صرف اتنا کہا کہ اشتہار میں دی گئی تواریخ کو آپ دونوں میرے ساتھ انٹرویو کے لئے قصور اور چونیاں میں حاضر رہیں گے۔

اشتہار میں انہوں نے یہ اطلاع بھی دی کہ دوسال پہلے بننے والی میرٹ کی فہرست منسوخ کر دی گئی ہے لہٰذا ایسے امیدوار جو ابھی تک تعینات نہیں ہوئے وہ بھی نئے سرے سے درخواست گزاریں۔ اس پر کچھ امیدواروں میں بے چینی پھیلی تو انہوں نے دفتر کے باہر ایک اطلاع نامہ آویزاں کر دیا کہ ''میرٹ'' سال وار بنے گا۔ امیدوار ہرگز ہراساں نہ ہوں۔ کسی دفتری اہلکار سے تقرر کے سلسلے میں کوئی لین دین نہ کریں صرف میرٹ پر تقرر ہوگا جو محکمہ تعلیم کے مہیا کردہ کلیے کی روشنی میں تیار کیا جائے گا۔

امیدواروں کی جتنی درخواستیں موصول ہوئیں ان کو دفتر روزگار نے مختلف درجوں کے اساتذہ کی الگ الگ فہرستوں کے ساتھ نتھی کر دیا۔ پھر سب کی تفصیل ایک چٹھی میں تحریر کی اور اس تفصیل کے مطابق ایک بنڈل بنایا اور دفترِ تعلیم میں بھیج دیا۔ ڈی ای او صاحب اس بنڈل کو جیپ میں رکھوا کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں انہوں نے ہیڈ کلرک زنانہ سے مل کر خود ہی میرٹ تیار کرایا۔ دو خاص آدمی اپنے گاؤں سے بلوائے۔ ہیڈ کلرک زنانہ کے علاوہ ایک کلرک اپنے دفتر سے بھی لیا اور اس سے قرآن کریم پر حلف لیا کہ جو کام اُسے سونپا جائے گا وہ اُسے دیانتداری سے انجام دے گا یعنی بے ایمانی کا کام ایمانداری سے کرے گا۔ ان چار افراد نے میرٹ پر آنے والے ہر امیدوار سے ان کے درخواستوں میں لکھے ہوئے پتوں پر جا کر رابطہ کیا ہیڈ کلرک زنانہ نے ان کی مفصل راہنمائی کی۔ شک میں تو ہر شخص مبتلا ہوتا ہے کہ شاید اس کا کام ہو یا نہ ہو...... اسے انٹرویو ہی میں کم نمبر دیے جائیں گے وغیرہ وغیرہ چنانچہ بات کو یقینی بنا دینے کے پکے وعدے اور ''منی بیک'' ضمانت کے ساتھ امیدواروں سے نقدی وصول کی۔ بے کاری کا دور دورہ تھا۔ امیدوار ہزاروں روپے ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ ان کے ورثا کا بھی یہی ایمان تھا کہ جب تک کوئی نوٹ نہیں تھامے گا' کام نہیں بنے گا۔ یوں صاحب کا مارٹن فورک (Morten Fork) والا مقصد کامیاب رہا (مارٹن فورک ایک انگریز بادشاہ کا چالاک وزیر تھا جو دولت بٹورنے میں ثانی نہیں رکھتا تھا)۔ مجھے بھی برابر اطلاعات مل رہی تھیں کہ کیا ''اپریشن'' جاری ہے۔ میں لین دین کے اس چکر کو افواہ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے کہ شور ضرورت سے زیادہ پھیل گیا تھا۔

☆☆

ابھی احکام تقرر جاری نہیں ہوئے تھے کہ صاحب نے ایک سوزوکی کار خرید لی جس

پر مزید شور مچا۔ احمد حسن نے کہا کہ ہمیں صاحب سے پوچھنا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ میں کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کروں گا۔

دفتر کا وہ کلرک جس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر دیانت داری سے کام کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے دوبارہ قرآن کی قسم کھا کر احمد حسن کو بتایا کہ اسے صرف ایک ہزار روپیہ دیا گیا ہے جو حساب کتاب کی روشنی میں ۱۰ پیسے فیصد بھی نہیں بنتا۔ چودھری احمد حسن غصے میں لال پیلا ہو گیا اور میرے پاس آیا کہنے لگا اگر آپ خاموش رہیں گے تو پھر تحقیقات شروع ہو جائیں گی۔ اس نے مزید کہا کہ مجھے فلاں کلرک نے یہ بھی بتایا ہے کہ دفتری خرچ کی پوری گرانٹ مال خریدے بغیر جعلی رسیدوں پر ہضم کر لی گئی ہے...... میں نے جواب دیا:

''جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ تم میری زبان بند رہنے دو۔ سچ کا زمانہ نہیں، میں ابھی ابھی بحران سے گزرا ہوں۔ اردگرد کے سناٹوں اور میاں شریف کی خاموشی میں لازمی طور پر کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔''

اکرام چودھری کے معاملے میں احمد حسن غیر جانبدار رہا تھا۔ اس لیے اس سے میری دوستی ہو گئی تھی۔

☆☆

چند روز بعد صاحب نے تحریری طور پر بھرتی کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور بتایا کہ کلرکوں سے میرٹ بنوالیا ہے۔ ہم درخواستوں کے مطابق پڑتال کر لیں اور کمیٹی کی کارروائی کے رجسٹر میں اندراج کر دیں۔ انٹرویو کی تاریخیں بھی طے کر دی گئیں اور اے ای او صاحبان کے ذریعے اطلاعات بھجوادی گئیں۔

تیار کی گئی میرٹ کی فہرست پر ہم دونوں نے دستخط کر دیئے۔ نوے پی ٹی سی اساتذہ کا انتخاب ہوا۔ ان کے احکام جاری ہوئے۔ کچھ کوٹہ سسٹم کے تحت احکام صاحب نے فرداً فرداً اور ازخود ہی جاری کیے۔ یہ تقرر کا کام کس طرح انجام کو پہنچا اور کیا کچھ ہوا؟ اس کی تفصیل ایک تحقیقاتی سوالنامے کے جواب میں ملاحظہ کیجئے۔

☆☆

کسی مہربان دوست نے کسی وقت میاں شریف سے کہا تھا کہ انہیں میو قوم کے ضدی ہونے کی زبردست خاصیت کا علم نہیں اس لیے وہ پروپیگنڈہ کی زد میں نہ آئیں اور قاضی کو

معاف کر دے۔ اسے میاں نے بڑے تلخ جوابات دیئے تھے جو اس نے مجھے محتاط الفاظ میں بتائے۔ قصور میں ہونے والے یکمشت نوے تقررات کا ماجرا سن کر میاں شریف نے حمید اللہ کو بلایا اور پوچھا ''حمید اللہ' تو قصور کا رہنے والا ہے کیا تجھے خبر نہیں ملی کہ وہاں منحوس ڈی ای او نے کس انوکھے طریقے سے تین چار لاکھ کا ''ہونجا'' (جھاڑو) پھیرا ہے۔ اس پر تیرے یار قاضی کو قومی ہمدردی کا کوئی مروڑ نہیں اٹھا۔ کھایا پیا تو اکرام نے بدہضمی تیرے یار کو ہو گئی تھی...... اور درخواستوں پر درخواستیں ٹھونکے جاتا تھا۔ اب وہ مل گیا ہے ڈی ای او سے لہٰذا بندر بانٹ کر کے منہ اس سے مال کھائے گا''۔ حمید اللہ کیا جواب دیتا۔ اس نے کہا جی مجھے تو قصور چھوڑے اب ۲۵ برس سے اوپر ہو گئے ہیں...... البتہ اس نے مجھے یہ گفتگو قہقہے لگا لگا کر سنائی اور کہا کہ میاں کو شک ہے کہ میں نے اور احمد حسن نے بھی خوب ''گوڈی'' کی ہے۔ اور بہتی گنگا میں جی بھر کے ڈبکیاں لگائی ہیں۔ میں نے کہا۔ ''میں تو میاں شریف کو اگر مولوی ثناء اللہ بھی بن کر دکھاؤں تو اسے تب بھی میری کسی بات پر یقین نہ آئے گا۔ میاں بڑا شکی مزاج ہے کانوں کا کچا بھی ہے۔ اسے تو ڈائریکٹر پر بھی یقین نہیں لیکن مجبور ہے کہ ڈائریکٹر کا ہم زلف سیکرٹری ہے۔ کہتا ہے کہ اسے بھی حصہ مل گیا ہو گا۔ لہٰذا مست ہے۔''

ڈی ای او صاحب تقررات سے فارغ ہو کر ترقیاتی رقوم کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے ٹینڈر وغیرہ وصول کرنے اور کھولنے کی جو تاریخ مقرر کر رکھی تھی اس سے ایک روز پیشتر ہی ان کو فارغ کرنے ڈیرہ غازی خان کے مسٹر ملغانی قصور پہنچ گئے۔ ادھر ڈائریکٹر صاحب کا بھی تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ مس قمر النساء شیرازی تشریف لائیں۔

☆☆

مس قمر النساء شیرازی پڑھی لکھی، مہذب اور تجربہ کار خاتون تھیں۔ میں ان کے ساتھ ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایڈ میں پڑھتا رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایک انجمن کے سکول میں معلّمہ تھیں۔ اپنی اہلیت کی بناء پر وہ لیکچرار تعینات ہوئیں اور پھر جامعہ سکولوں کے کیڈر میں پرنسپل منتخب ہو گئیں۔ انہوں نے جب میرے متعلق سنا تو مجھ سے فرمایا کہ میں قصور چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ میں نے عرض کیا کہ آپ میرا تبادلہ کر دیں۔ میں آپ کو دعائیں دوں گا۔ ایک ماہر مضمون جامعہ سکول لاہور سے طویل رخصت پر بیرون ملک گیا تھا۔ محترمہ نے میرا اس کی جگہ تبادلہ کرنے کی حامی بھر لی پھر سوچا کہ لاہور میں تبادلے کا معاملہ ہے۔ ڈی پی آئی کے

علم میں لے آنا چاہیے۔ڈی پی آئی صاحب نے جونہی میرا نام اور میرے تبادلے کی بات سنی' وہ اپنی کرسی سے اچھل پڑے اور اپنی غیر مہذب زبان سے محترمہ کو بدحواس کر دیا۔

محترمہ نے مجھے بلایا' فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میاں شریف سے آپ کے تبادلے کے بارے میں پوچھا حالانکہ رخصت کا معاملہ تھا وہ خود اس خالی ہونے والی آسامی پر تبادلے کی مجاز تھیں۔مس شیرازی نے بتایا کہ میاں شریف کو آپ پر بڑا غصہ ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس نے اب تک قاضی کا قصور سے تبادلہ اس لئے نہیں کیا کہ گورنر معائنہ ٹیم کے تحقیقاتی افسر نے اکرام کے خلاف تحقیقات کو لٹکا رکھا ہے۔محترمہ نے مجھے ہدایت کی کہ مجھے میاں کو کسی نہ کسی طرح راضی کرنا چاہیے۔

میں نے مس شیرازی کے فرمودات پر غور کیا۔میں حکومت میں کچھ معتبر افراد کا استاد رہا تھا لیکن کبھی ان سے ملا نہیں تھا۔اب غرض کی خاطر ملنا گوارا نہ ہوا۔مس شیرازی کا یہ جملہ بڑا بامعنی تھا کہ گزیٹڈ کیڈر کے افسر کا تبادلہ پنجاب بھر میں کہیں بھی ہو سکتا ہے اور میاں شریف کہتا ہے مجھے بدمعاشوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔میں نے ڈی ای او اور ڈائریکٹر کا تو صفایا کر دیا ہے بس اب قاضی کی باری ہے۔

☆☆

میں محکمہ تعلیم کے جملہ ''بدمعاشوں'' میں سے کمزور تھا۔میاں نے میرا قصور تبادلہ نہیں کیا لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح پھنسا دینے کے چکر میں لگا رہا۔صاحب بہادر نے قصور میں ہونے والے نوے تقررات کے بارے میں تحقیقات کرائی۔تحقیقات تو اصولی طور پر ڈی ای او افسرِ مجاز کی ہونا چاہیے تھے لیکن مجھے خواہ مخواہ ملوث کرنا ضروری سمجھا گیا۔لہٰذا پچیس شقوں پر مشتمل ایک سوالنامہ لے کر ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر سکولز مسٹر ارشد بھٹی دفتر ڈی ای او میں ۳۱ مئی ۸۵ء کو تشریف لائے۔موصوف مجھے جانتے تھے۔ایل ایل بی بھی تھے۔ان کی وفاداریاں اپنی ملازمت اور افسر اعلیٰ سے ہونا منطقی بات تھی۔زبانی کلامی بہت سی باتیں ہوئیں لیکن تحریری طور پر ان کو جواب دینے کیلئے میں نے ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی۔جو انہوں نے دے دی۔انہوں نے مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے ان کو کیا جوابات دیئے۔وہ حرف بحرف درج ذیل ہیں:

بخدمت جناب انکوائری آفیسر مسٹر ارشد بھٹی صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر نظامت تعلیم

پنجاب لاہور۔

آپ کے سوالنامہ مورخہ ۳۰رمئی کی تعمیل میں حلفیہ طور پر درست جوابات حاضر خدمت ہیں:

س ۱ آپ کو بحیثیت ممبر ضلعی ریکروٹمنٹ کمیٹی کیا فریضہ سونپا گیا تھا؟ جواب کے ساتھ تحریری حکم نامہ منسلک کریں۔

ج فریضہ کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں کوئی حکمنامہ بھی موجود نہیں ہے۔ جیسے افسر با اختیار نے کہا ویسے کر دیا۔

س ۲ جناب ڈی ای او صاحب نے کل مجھے زبانی طور پر بتایا تھا کہ وہ اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے قصور میں موجود نہیں تھے اور آپ نے ان کی عدم موجودگی میں امیدواروں کا انٹرویو لیا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟ اس سے متعلق تحریری حکم نامہ اگر موجود ہو تو منسلک کریں۔

ج جناب ڈی ای او صاحب کا یہ کہنا کہ وہ قصور میں موجود نہ تھے حقیقت پر مبنی نہیں۔ قصور میں انٹرویو کے دن یعنی ۸رجنوری کو ڈی ای او صاحب دفتر میں موجود تھے۔ میں نام پکارتا تھا۔ ڈی ای او صاحب اصل تعلیمی دستاویزات دیکھتے تھے اور دفتر کا سپرنٹنڈنٹ شیخ رفیع درخواستیں اور نقول اسناد چیک کرتا تھا۔ احمد حسن اور متعلقہ کلرک محمد شریف بنڈل سے درخواستیں پیش کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ میں اور احمد حسن اپنے اپنے چارٹوں پر انٹرویو کے نمبر درج کرتے رہے۔ اگر کسی امیدوار کا کوئی کاغذ یعنی سندات وغیرہ کم ہوتیں تو درج کرتے تھے۔ انٹرویو کے اختتام کے قریب یعنی چار بجے ان کو ان کی والدہ کی علالت کا فون آیا۔ وہ مغرب کے بعد سرکاری جیپ پر واربرٹن تشریف لے گئے۔

یہ درست ہے کہ چونیاں میں انٹرویو ڈی ای او کے بجائے ۔۹رجنوری کو میں نے کیا۔ فرائض اور طریق کار وہی رہا جو قصور میں تھا۔ میری جگہ اے ای او چونیاں مسٹر نذیر متین نے سنبھالی۔

س ۳ کیا آپ نے اپنا علیحدہ انٹرویو چارٹ تیار کیا تھا؟ اگر تیار کیا تھا تو اس کی کاپی منسلک کریں؟

ج میں نے اور خود ڈی ای او صاحب نے بشمول احمد حسن اپنا اپنا چارٹ تیار کیا تھا۔ چونیاں میں مسٹر مٹن نے بھی چارٹ تیار کیا۔ یہ سب چارٹ اور درخواستیں ڈی ای او صاحب کے حکم کے مطابق مسٹر محمد شریف متعلقہ کلرک کو دے دیئے گئے۔

س۴ کیا یہ درست ہے کہ ضلعی ریکروٹمنٹ کمیٹی نے ملازمت کے خواہاں لوگوں کا تحریری امتحان لیا تھا؟ اگر تحریری امتحان لیا گیا تھا تو امتحان کے نگران عملہ کی تفصیل اور تحریری امتحان کی ایوارڈ لسٹ مہیا کریں۔

ج ضلع لاہور کے اتباع میں ٹسٹ لیا گیا تھا لیکن اسے مہر بند کر کے رکھ دیا۔ عملہ اے ای او صاحبان ہی پر مشتمل تھا۔ ایوارڈ لسٹ تیار نہیں کی گئی۔

س۵ تحریری امتحان کے رولز میں (پروویژن) موجود ہے؟ یا یہ صرف انٹرویو کی متبادل صورت تھی۔

ج پہلے پروویژن موجود تھی۔ بعد میں کئی سال ہوئے ختم کر دی گئی۔ یہ امتحان انٹرویو ہی کی متبادل صورت تھی۔ شاید ڈی ای او صاحب کا کوئی اور موقف بھی ہو۔

س۶ کیا تحریری امتحان میں شامل لوگوں کو امتحان میں کامیابی کے بعد انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا تھا؟

ج ایسا نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ

۱) گیارہ دسمبر ۸۴ء کو امیدواروں کا امتحان لیا گیا۔

۲) امتحان کے بعد تمام درخواستیں ڈی ای او صاحب اپنے گھر آفیسرز کالونی میں لے گئے۔

۳) کالونی میں محمد علی گوجر، محمد شریف متعلقہ کلرک اور محمد علی خزانچی بھی رہتے تھے۔

۴) ......ان تینوں نے مل کر تمام درخواستوں کا پوسٹ مارٹم کیا اور ایک عام سی میرٹ لسٹ تیار کی۔

۵) ......مندرجہ بالا سند یافتہ بدنام اور جعلساز اہلکاروں کے تعاون سے امیدواروں سے رابطے کی مہم شروع کی گئی۔ درونِ خانہ کیا ہوا؟ اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہر صورت بیس اکیس دن کے بعد ایک فہرست دفتر کو کالیں جاری کرنے کے لئے دی گئی۔ جس پر کالیں برائے انٹرویو جاری ہوئیں۔

۶) درخواستوں کے بنڈل ان کے پوسٹ مارٹم کے دوران گڈمڈ کردیے گئے۔ کچھ درخواستیں گم بھی ہوگئیں کچھ دوسری مدوں میں کھپادی گئیں۔ یہ سارا کام ڈی ای او صاحب کے گھر پر ہوتا رہا۔ علی محمد ہیڈ کلرک زنانہ مشیر خاص، محمد شریف کارکن خاص اور محمد علی خزانچی دعا گو خاص ڈی ای او صاحب کے ساتھ تھے۔

۷) مجھے دو تین دفعہ ڈی ای او صاحب سے یہ پوچھنے کی جسارت کرنا پڑی کہ درخواستیں کہاں ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کی اپنی تحویل میں ہیں۔ اپریل ۸۵ میں جب ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈمن مردانہ) قصور تشریف لائے۔ انہوں نے تحقیقات بسلسلہ میرٹ کرنا چاہی تو اس دن درخواستوں کے بنڈل ان کے پاس ان کے گھر پر تھے۔

س ۷: انٹرویو میں ایوارڈ کی تقسیم مع متعلقہ نمبر درج کریں۔

ج: انٹرویو میں ایوارڈ ۱۰ نمبروں پر مشتمل تھا۔ ۴ نمبر چیئرمین کے اور تین تین نمبر دو ممبروں کے تھے

س ۸: کیا ایوارڈ انٹرویو کے موقع ہی پر دے دیا گیا تھا یا بعد میں فہرستیں تیار کی گئی تھیں؟

ج: ایوارڈ تو موقع پر دے دیا گیا تھا۔ لیکن اسے باہم مربوط کرنے کے لئے ڈی ای او صاحب نے ہم سے لے لیا تھا۔ ان فہرستوں کا پھر دھواں بھی نہیں نکل سکا۔ ایک دو مرتبہ مجھے رجسٹر کارروائی بھرتی کمیٹی میں درج کرنے کے لئے فہرستیں حتمی صورت میں دی گئیں جنہیں میں نے اور احمد حسن نے مل کر رجسٹر کارروائی پر درج کیا لیکن بعد میں ان رجسٹرات کو پھاڑ دیا گیا اور تیسرے رجسٹر پر اندراج مکمل ہوا۔ جس پر ڈی ای او صاحب نے لفظ منظور شد لکھا۔ گویا یہ تاثر دیا کہ ساری کارروائی اور گڑبڑ کرنے والے اور لوگ ہیں وہ تو محض منظور کرنے والا ہے۔ پھر ان لوگوں کا ایک وفد جنہوں نے ڈی ای او صاحب کو یہ عہدہ بلا جواز اُچکنے کی ترغیب دی اور دامے درمے ان کو فائز کرایا دفتر تشریف لائے تو ان کے کہنے پر لفظ approved کے آگے انہوں نے لکھا ''جیسا کہ تقرر کمیٹی نے تیار کیا''۔ کیا چیئرمین کے بغیر کمیٹی کا کوئی وجود ہوسکتا ہے؟ آپ خود فیصلہ کریں...... ہم دو ممبروں کی تیار کردہ میرٹ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

س ۹: انٹرویو کے دوران تعلیمی اسناد کی جانچ پڑتال کا فریضہ کسے سونپا گیا تھا؟

ج: یہ کام قصور میں ڈی ای او صاحب اور سپرنٹنڈنٹ دفتر شیخ رفیع کے ذمہ تھا اور چونیاں

میں میں نے اور شیخ رفیع صاحب نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔

س ۱۰: کیا انٹرویو چارٹ اور میرٹ کی فہرست میں درج ایوارڈز میں کوئی تضاد آپ نے نوٹ کیا ہے؟

ج: جن کو آپ انٹرویو چارٹ کہہ رہے ہیں میں انہیں ابتدائی فہرستیں کہہ رہا ہوں۔ میرٹ کی فہرست میں درج ایوارڈ کا تضاد تو جب ہی نوٹ کیا جا سکتا تھا جب انٹرویو چارٹ کمیٹی کے ارکان کو واپس دیے جاتے۔

حقیقتاً کمیٹی تو ایک ڈی ای او صاحب کی مجبوری تھی ورنہ ان کے مشیر ہی سب کچھ کرتے تھے۔ مشیروں کے نام پہلے لکھ چکا ہوں۔

میں نے کچھ تضاد نوٹ کرنے کے بعد ڈی ای او صاحب کو کہا تھا لیکن انہوں نے کہا آپ کو کیا پتہ ہے کہ میں کتنا مجبور ہوں اور مجھے افسران بالا کیا کہہ رہے ہیں۔ میں خود ذمہ دار ہوں۔ کمیٹی تو ایک رسمی کارروائی ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صلح جو امن پسند اور کمزور ہونے کے باوجود سابقہ ڈی ای او صاحب مسٹر محمد اکرام سے میرا کچھ اختلاف ہو گیا تھا۔ اس اختلاف نے مجھے افسروں کی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میں کوئی موقع کسی بھی افسر کو نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ یہ نہ کہہ اٹھے کہ اختلاف کرنا اور جھگڑنا میری عادت ہے۔

س ۱۱: میرٹ لسٹ کی تیاری میں شہری اور دیہی کی تشخیص کی گئی ہے کیا اس کا کوئی قاعدہ موجود ہے؟

ج: S.O (NE) کا ایک پرانا مراسلہ موجود ہے کہ غیر تربیت یافتہ اساتذہ دیہی علاقوں میں تعینات کیے جائیں اور وہ اسی دیہی علاقے ہی کے رہنے والے ہوں جہاں ان کی تقرری کی جائے۔

س ۱۲: قواعد کے مطابق بحیثیت غیر تربیت یافتہ معلم تقرر کا استحقاق صرف دیہی امیدواروں کا ہے۔ کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے۔ اگر نہیں تو جواز عدم اتفاق پیش کریں؟

ج: اوپر سوال نمبر ۱۱ کے جواب میں یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ ضابطے یہی کہتے ہیں۔

س ۱۳: کیا کسی ایسے امیدوار کو نمبر دیے جا سکتے ہیں جو انٹرویو میں کوئی بھی جواب درست نہ دے سکے؟

ج: نہیں۔

س ۱۶: میرٹ کی بعض فہرستیں جو سابقہ ڈی ای او نے تیار کی تھیں بحال رکھی گئی ہیں اور بعض منسوخ کر دی گئیں اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟

ج: یہ بھی ڈی ای او صاحب کی اپنی صوابدید تھی

س: کیا یہ درست ہے کہ میرٹ فہرست برائے غیر تربیت یافتہ معلم کی تیاری سے قبل کچھ امیدواروں کے تقرر کر دیے گئے تھے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کا کیا جواز ہے؟

ج: ڈی ای او صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے متعلق ایسی باتیں پھیلتی جا رہی ہیں جو ان کی شہرت کے لئے مناسب نہیں۔ چنانچہ بعض تنظیموں اور سرکردہ افراد ضلع قصور کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے میرٹ لسٹ بننے سے پہلے کچھ امیدواروں کا تقرر کر دیا تھا۔

س ۱۷: کیا تقرر کے لئے آفس نوٹس کو آپ نے موثق کیا تھا یا تجاویز میں آپ کا مشورہ شامل تھا؟

ج: اس لحاظ سے کہ امیدوار قابلیت کے لحاظ سے موزوں اور اس کے کاغذات مکمل ہیں' کیا تھا۔ تجویز کرنے میں اپنا کوئی دخل نہیں تھا۔ میری توثیق محض زبان بندی تھی ویسے بے شمار ایسے احکام ہوئے ہیں جن کا مجھے تو در کنار دفتر کو بھی پتہ نہیں۔

س ۱۸: کیا آپ طارق کو جانتے ہیں جو ڈی ای او صاحب کی پرائیویٹ گاڑی کا ڈرائیور ہے۔ میٹرک تھرڈ ڈویژن ہے اور اسے غیر تربیت یافتہ معلم مقرر کیا گیا؟

ج: جی ہاں میں طارق کو شکل سے کم لیکن اس کی شہرت سے زیادہ جانتا ہوں۔ دفتر قصور میں غبن کی بہت سی وارداتوں میں ملوث اور ڈی ای او صاحب کے مشیر خاص علی محمد گوجر کا کہنا ہے کہ جب سے ضلع بنا ہے میں اس دفتر میں ہوں۔ بڑے گرم و سرد افسر دیکھے' خشک و تر انسان دیکھے ادلتے بدلتے موسم دیکھے لیکن طارق کو میں نے استاد مان لیا ہے وہ مجھے بھی چونا لگا گیا ہے۔ وہ بڑا چالاک اور کائیاں شخص ہے۔

ڈی ای او صاحب نے خفیہ طور پر اسے پہلے پرائمری سکول بھائی پھیرو میں چھٹی پر جانے والے معلم کی جگہ تعینات کیا۔ ابھی چھٹی پر جانے والا مدرس واپس بھی نہیں آیا تھا کہ اسے عبوری بنیاد پر گھر کے نزدیک تبدیل کر دیا۔ وہ ذاتی طور پر کہیں بھی حاضر نہیں رہا کیونکہ زبانی کلامی احکام کے تحت وہ دفتر ڈی ای او میں کام کر رہا تھا۔ دفتر

میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تاہم یہ ثابت شدہ بات ہے کہ وہ تھرڈ ڈویژن ہے۔

س ۱۹: کیا آپ کے ضلع میں ایسے لوگوں کا بھی تقرر ہوا جن کے نام میرٹ لسٹ میں نہیں ہیں؟

ج: جی ہاں میرٹ لسٹ تو ایک طرف...... ایسے تقرر بھی ہوئے ہیں جن کی درخواستیں بھی نہیں آئیں۔ جن کا دفتر کو بھی علم نہیں۔ رجسٹر ڈاک پر جن کے نمبر اور ہی انداز سے لگے ہیں۔ تصدیق کرنی ہو تو اے ای او صاحبان سے اساتذہ کے اگست ۸۴ء اور جولائی ۸۵ء کے تنخواہوں کے بل نکلوا کر دیکھ لیں۔ فرق معلوم ہو جائے گا کہ کتنے اساتذہ زائد ہو گئے ہیں۔ پھر ان زائد اساتذہ کا موازنہ دفتر میں موجود ریکارڈ سے کر لیا جائے اساتذہ کی فوج ظفر موج میں چور دروازے سے آنے والے رنگروٹوں کا پتہ چل جائے گا۔

س ۲۰: کیا آپ نے ایس وی کے لئے تیار میرٹ لسٹ میں سے امیدوار غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی فہرست میں منتقل کئے ہیں۔ اگر کئے ہیں تو ان کی تفصیل مع جواز درج کریں؟

ج: میں کون ہوتا ہوں ایسا کرنے والا...... ایسا خود ڈی ای او صاحب نے کیا ہے کہ وہ افسرِ مجاز ہیں۔ تفصیل بھی وہی بتا سکتے ہیں کیونکہ سارا ریکارڈ ان کی تحویل میں ہے۔

س ۲۱: دفتر روزگار کی طرف سے آنے والی سب فہرستیں محفوظ ہیں؟ اگر محفوظ ہیں تو تقرر نہ پانے والے امیدواروں کی فہرست مع تعلیمی استعداد مہیا کریں؟

ج: اس سوال کا جواب اور مطلوبہ فہرست بھی ڈی ای او صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

س:۲۲ بحیثیت ڈپٹی ڈی ای او آپ کو کیا فرائض سونپے گئے ہیں؟ تحریری حکم نامہ منسلک کریں۔

ج: کوئی مخصوص فرائض نہیں ڈی ای او صاحب کی مرضی ہے جو کام چاہیں دے دیں۔ کوئی تحریری حکم اس سلسلے میں نہیں ہے بلکہ ڈپٹی ڈی ای او کی آسامی کا تو کسی کو ''نام من کلچر'' بھی معلوم نہیں اسی لئے تو بچارا ڈپٹی ڈی ای او اپنے صاحب کی نظر التفات کا منتظر رہتا ہے اور دفتر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟

س ۲۳: آپ کے ساتھ ڈی ای او صاحب کا عمومی رویہ کیسا ہے؟

ج: اس سوال کا جواب خاصا مشکل ہے کیونکہ ڈی ای او صاحب کا رویہ بدلتا رہتا ہے جب اپنی کارروائی میں مجھے ملوث کرنا ہو تو آنے بہانے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر لی کہہ دیا کہ قاضی صاحب بزرگ آدمی ہیں۔ کام سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا سلسلہ نہ ہو تو پوچھتے بھی نہیں کہ بھیا کیسی ہے؟

س:۲۴ ریکروٹمنٹ کمیٹی کے ریزولیوشن مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۸۵ کے تحت تقررات کی تفصیل مہیا کریں؟

ج: مذکورہ ریزولیوشن کے تحت ۹۰ کے قریب تقررات ایک ہی حکم میں ہوئے۔ جستہ جستہ جو احکام نکلتے رہے ان کا شمار ناممکن ہے۔ مکتب اور مسجد سکولوں میں تعیناتی کے لئے حال ہی میں ڈی ای او صاحب نے ایک میرٹ لسٹ اور احکام تیار کئے ہیں جن کا اجراء ابھی باقی ہے۔ المختصر یہ کہ تقررات کے متعلق بتانا کہ کتنے ہوئے ہیں میرے بس کی بات نہیں۔

سوالات کے جوابات کے بعد میں گزارش کروں گا کہ جن حالات میں ڈی ای او صاحب اس عہدہ کو اینٹھنے میں کامیاب ہوئے ان حالات کا یہی تقاضا تھا کہ محکمہ تعلیم ضلع قصور نظم وضبط کا فقدان، مفاد پرستی اور چھینا جھپٹی کا منظر دیکھے...... ابھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ اللہ کرے آپ کی آمد اور تحقیق ضلع ہذا کے دفتر تعلیم کی حالت سدھارنے میں ممد ومعاون ثابت ہو۔

(قاضی ذوالفقار احمد ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر قصور)

◆◆◆◆◆

(۴۲)

ایک نئی مفید سکیم

نظام تعلیم میں بدنظمی' اساتذہ اور سکولوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے پھیل رہی تھی۔ کوئی پانچ چھ سال پہلے ایک کالا امریکن سکالر مسٹر کوانڈا پنجاب کے نظام تعلیم کے مطالعے کے لئے ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں آیا تھا میرا اس سے رابطہ بطور اے ڈی آئی ترقیات ہوا۔ میں اسے ضروری اعداد و شمار اور معلومات بہم پہنچاتا رہا۔ تعلیمی نظم و نسق کے مطالعے کے بعد اس نے حکومت پنجاب سے سفارش کی کہ وہ اختیارات نچلی سطح پر منتقل کرے۔ تحصیل کی سطح پر بااختیار ڈپٹی ڈی او تعینات کر کے پرائمری تعلیم کی جملہ انتظامی ذمہ داریاں اسے سونپ دے حکومت نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

طے پایا کہ تحصیل کی سطح کے بااختیار ڈپٹی ڈی ای او صاحبان کا تقرر موجودہ تجربہ کار ہیڈ ماسٹروں اور ڈپٹی ایجوکیشن افسروں میں سے کیا جائے۔ اس لیے باصلاحیت افراد کے انتخاب کے لئے کمشنر صاحب کی سرکردگی میں ہر ڈویژن میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی کا سیکریٹری ڈویژنل ڈائریکٹر کو مقرر کیا گیا جبکہ کمیٹی ڈویژن کے جملہ منتخب صوبائی ممبران اسمبلی پر مشتمل تھی۔ طویل تجربے کی بنیاد پر میرا انتخاب تحصیل شیخوپورہ کے لئے ہوا۔ اس ڈویژنل سلیکشن کمیٹی نے صرف احکام جاری کرنے کا اختیار ڈی پی آئی کو دیا۔ کسی رد و بدل کی اجازت نہیں دی۔ میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ میاں شریف جو میری بے اختیار ڈپٹی کی آسامی پر میرا دشمن بنا ہوا تھا وہ مجھے بااختیار اسامی پر مقرر ہوتے دیکھ کر جل بھن کر کباب ہو گیا ہوگا۔ میری اس سوچ کی ایک ٹھوس بنیاد ہے۔ وہ یہ کہ دس اکتوبر ۱۹۸۵ء کو مسٹر ملغانی نے قصور سے اپنے تبادلے کے وقت مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں ان کو اپنی اے سی آر

کے فارم ابتدائی تعارفی کالم پُر کردوں تا کہ وہ اسے لکھ دیں۔ میں نے تین ماہ سے زائد عرصہ ان کے ماتحت کام کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اے سی آر لکھوانے کے لئے ان کے پیچھے بھاگتا پھروں۔

محکمے میں یہ عام مرض تھا کہ ضابطے میں اے سی آر نہ لکھنے والے افسر کے لئے سزا مقرر ہے لیکن افسران کبھی بھی اس وقت تک اپنے ماتحتوں کی اے سی آر نہیں لکھتے جب تک کہ متعلقہ ماتحت اپنی اے سی آر خود لکھوانے پر مُصر نہیں ہوتا۔ محکمے کا اے سی رکھنے والا شعبہ بھی اس اہلکار کو چٹھی لکھتا جس کی اے سی آر لکھی جانی مطلوب ہوتی ہے کہ آپ کی فلاں فلاں عرصے کی اے سی آر نہیں مل رہی لہٰذا اسے لکھوائیں اور لکھنے والے افسر کے افسر اعلیٰ سے اس پر توثیقی دستخط کروائیں اور فلاں تاریخ تک دفتر ہذا میں جمع کرائیں۔

اکرام چودھری نے میری دو سال کی اے سی آر نہیں لکھی تھی۔ اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری اے سی آر اس وقت لکھے گا جب اس کو گورنر معائنہ ٹیم کی سفارشات پر انضباطی کارروائی کے بعد اٹھارواں گریڈ مل جائے گا۔ مسٹر ملغانی چونکہ ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے تھے اور میاں شریف ملتان کے۔ اس ہمسائیگی کے حوالے سے میاں نے مسٹر ملغانی سے کہا کہ وہ اپنے دور کی میری اے سی آر میں کچھ میرے خلاف لکھیں تا کہ وہ مجھے اس کی بنیاد پر رگڑا لگا سکے یہ مسٹر ملغانی کا ظرف تھا انہوں نے میاں شریف سے کہا کہ وہ ان سے ایسی کمینگی کی توقع نہ رکھیں۔ اب اپنی واپسی کے وقت انہوں نے میری اے سی آر میرے سامنے لکھی۔ انہوں نے لکھا کہ میں نہایت دیانتدار، مستعد اور آگے بڑھ کر کام کرنے والا جدت پسند افسر ہوں۔

نئے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر چودھری نذیر احمد تشریف لائے۔ ان کی آمد کے ایک ماہ بعد ہی میرا تبادلہ بطور بااختیار ڈپٹی کی حیثیت سے شیخوپورہ ہو گیا۔ جہاں میں نے نومبر ۸۵ء کے آخری ایام میں حاضری دی۔

☆☆

میں نے درس و تدریس میں عملی تجربات کا آغاز اپنے بھولپن کی عمر میں بطور ورنیکلر مڈل غیر تربیت یافتہ مدرس کیا۔ میرا تقرر لوئر مڈل سکول کٹھالہ گناں ضلع سیالکوٹ بیلے کے علاقے میں ہوا۔ درس و تدریس سے محبت مجھے اسی دور سے ہوئی۔ گو میں دیگر دفاتر میں بھی کام کرتا رہا لیکن ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ پتا چلا کہ درس و تدریس ایک عظیم فن ہے۔

میں نے اس فن میں تربیت حاصل کی۔ جا بجا خاک چھانی اور اس فن میں کمال کے تجربات کا دور سنٹرل ماڈل سکول' لوئر مال' لاہور میں اختتام پذیر ہوا۔ وہ اساتذہ کرام جو اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درس وتدریس کی زندگی کا آغاز گھر کی دہلیز سے کیا اور دہلیز ہی پر ختم کیا ان کی مثال بس ایسی ہے جیسے وہ ایک جگہ بسم اللہ کے گنبد میں ورزش کرتے رہے ہوں۔

نئے مقام' نئے ماحول' نئی نئی درس گاہوں میں نئے نئے اساتذہ اور لوگوں سے میل جول بہترین غیر رسمی تعلیم مہیا کرتے ہیں میں اس تعلیم سے بھی آراستہ تھا اور مزید تعلیم کے لئے میں نے ایم ایڈ کی شبینہ جماعت میں داخلہ لئے رکھا تھا۔

سکول سے نکل کر جب میں انتظامیہ میں آیا تو میرے جیب و دامن میں صرف 'کالا یونیورسٹی' مڈل سکول کالا گھمناں کا اولین تجربہ تھا جسے میں دیگر مڈل سکولوں میں بھی دہراتا رہا۔ انتظامیہ میں آنے کے بعد میں مختلف النوع تجربات اور انتظامی سلسلوں سے گزرا۔ اب ایک نیا موڑ آیا تھا اب مجھے بااختیار ڈپٹی ڈی او کی حیثیت سے اپنی سابقہ زندگی کے تجربات سے کام لیتے ہوئے آگے چلنا تھا۔ محکمہ تعلیم کے افسروں کا یہ خیال حقیقت پر مبنی تھا کہ جو مدرس اے ڈی آئی کی کٹھالی سے گزر جاتا ہے وہ کسی انتظامی عہدے پر مات نہیں کھاتا۔ میں انتظامیہ کی جن جن کٹھالیوں سے گزرا تھا ان کی وجہ سے مجھے کندن بن جانا چاہیے تھا لیکن میری راہ میں ابھی کئی آزمائشیں اور کئی کٹھن مرحلے باقی تھے۔

نئی اسامی پر شیخوپورہ میں حاضر ہونے کے لئے میں ابھی قصور سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ مجھے دریائے ستلج کے کنارے کے ایک گاؤں کے ہیڈ ماسٹر چودھری الف دین ملے۔ موصوف بڑے زندہ دل اور ذہین انسان تھے۔ ان کا تجربہ اور مشاہدہ اس قدر گہرا تھا کہ وہ بلا تکان گھنٹوں بول سکتے تھے اور اس قدر دلچسپ معلومات پر مبنی باتیں کرتے تھے کہ سننے والے کبھی نہیں اکتاتے تھے۔ بلکہ قہقہے لگاتے تھے۔ بعد میں ان کا دوست ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں شگفتہ مزاح کا پہلوان کے شاگردوں اور ماتحتوں کو بھی پسند تھا۔ ان کا ایک بازو قدرے ناکارہ ہو چکا تھا لیکن پھر بھی وہ ماہر شکاری تھے۔ ایک آدمی بندوق اٹھائے ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کی باتیں یاد کرتا ہوں تو ختم ہی نہیں ہونے پاتیں لیکن اب جب ان کا ذکر آ گیا ہے تو ان کے چند پند ونصائح کی کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ جو نصیحت کرنے وہ مجھے

آئے تھے اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

آڈٹ پارٹی کے ساتھ ضلع لاہور کے تعلیمی دفتر کے تانا شاہی ہیڈ کلرک ان کے ہائی سکول میں گئے تو انہوں نے مقامی ماحول سے بڑھ کر مہمانوں کی خاطر مدارت کی دیسی مرغ بھنوایا' دنبے کا گوشت پکوایا' دریائے ستلج کی تازہ مچھلی تلی' پستہ بادام اور بھینس کے دودھ کی کھیر بنائی لسی کی چاٹی پیش کی۔ سبز چائے بھی بنائی۔ سب نے خوب جی بھر کر کھایا۔ اور چائے کی چسکیاں لیتے گئے۔ دفعتاً ہیڈ کلرک صاحب نے دون کی لی۔ چائے سڑپتے ہوئے فرمایا:

''چودھری صاحب! کھانا بہت اچھا تھا۔ مزے دار تھا مگر تھا بے جوڑ...... مچھلی کے ساتھ چائے اور لسی نہیں چلتی...... مرغ کا گوشت ہو تو دنبے کی حیثیت صفر ہو جاتی ہے۔''

چودھری الف دین نے سر پر دوہتڑ مارتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ 'جو بھی حرام خور آتا ہے وہ کھانا کھانے کے بعد کھانے میں نقص نکالتا ہے۔ میری ماں کہا کرتی تھی۔ الفے' تیرا نمک ہی ''چمکوڑ'' ہے جو تیرا کھاتے ہیں وہی تجھ سے الجھتے ہیں۔''

ہیڈ کلرک صاحب پریشان ہو گئے کہ انہوں نے کیوں ایسی بات کی حالانکہ بات کی بھی مزاح کے انداز میں تھی کہ چودھری الف دین محفل کو کشت زعفران بنائیں مگر چودھری نے تو مزاح کا بھرتہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے ہیڈ کلرک کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'چودھری! تو اتنا بخت آور ہے' کلرکوں کا بادشاہ ہے' لاہور میں تیری حویلی ہے' دیہات میں زمین ہے' سارا ضلع تیرا ماتحت ہے تو ہی بتا کیا پچھلے دس بارہ سال میں تجھے دفتر میں یا اپنے گھر میں مجھے کھانا کھلانے کی توفیق ہوئی ہے تا کہ مجھے تیرا معیار معلوم ہوتا اور جوڑ' بے جوڑ کا پتا چلتا۔

ہیڈ کلرک کو بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ اور جا رہے تھے کہ پوری آڈٹ پارٹی اور عملۂ سکول کے سامنے الف دین نے اس کی پگڑی اتار کر رکھ دی۔ لیکن سب نے اس سرزنش کو چودھری الف دین کی جولانیٔ طبع قرار دیا اور باتوں کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف موڑ دیا۔ چودھری الف دین سرحدی علاقے کے موضع بھسین کے ہائی سکول میں تبدیل کر دیئے گئے۔ وہاں انہوں نے رہائش کے لئے ایک سستا مکان خرید لیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں پرائمری سکول کی ہیڈ معلّمہ ان کی رشتہ دار نکل آئی۔ ایسی رشتہ دار جن سے کبھی ان کی منگنی ٹوٹ گئی تھی۔ اور اب وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ وہ ایک دوسری معلّمہ کے ساتھ مل کر ایک مکان میں رہتی تھی۔ چودھری صاحب سے دو چار ملاقاتوں کے بعد ایک روز اس نے کہا

کہ چودھری صاحب آپ اس قدر پر لطف باتیں کرتے ہیں کہ جب آپ اُٹھ جاتے ہیں تو دل گڑ بڑا جاتا ہے' گفتگو کی روانی میں چودھری صاحب نے کہہ دیا تو پھر الف دین کو مستقل طور پر باندھ لو۔ وہ شرما گئی۔ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ کوئی اولاد وغیرہ بھی نہیں تھی لہٰذا چودھری صاحب نے اس سے عقد ثانی کر لیا۔

کسی دوسرے ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے دفتر میں ان سے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟''

کیا کیا ہے؟...... اگر کچھ غلط کیا ہے تو یہ سارا قصور محکمہ تعلیم کا ہے۔ میں بھلا چنگا اپنے گاؤں کے سکول میں تعینات تھا۔ پکی پکائی روٹی مل رہی تھی۔ زندگی سبک رفتاری سے گزر رہی تھی۔ راوی چین لکھتا تھا میرا آرام وسکون محکمے کو کھٹکا مجھے گھر سے اٹھایا سرحد پر پھینک دیا۔ جا بچہ راوی' نہ کوئی آوی نہ کوئی جاوی'...... اب کون بھاجھڑ (گھریلو سامانِ ضرورت) اٹھاتا۔ بچوں کو انگلی لگاتا اور بیوی کو برقعے میں لپیٹتا گھسیٹتا سرحد پر دھما کے سنانے لے جاتا۔ میں نے تو اصول بنا لیا ہے کہ جہاں تبادلہ ہو وہیں ایک گھر خریدو اور وہیں سے ایک کماؤ اہلیہ تلاش کرو اور مزے سے گھر سے پکی پکائی کھاؤ...... بچے بھی آ جائیں گے......''

چودھری الف دین کا یہ حقیقی لطیفہ کافی عرصے تک اساتذہ کے حلقے میں گردش کرتا رہا۔

چودھری صاحب کے عقد ثانی پر ان کی پہلی اہلیہ کو دکھ ہوا۔ وہ بہت روئی پیٹی' تین بچوں کی ماں تھی کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی اپنے گھر میں تو تھی ہی۔ پھر بھی بھائیوں نے چودھری الف دین کو سکول میں آ پکڑا اور سختی سے پوچھا کہ دوسری شادی کی حرکت کیوں کی ہے؟ چودھری صاحب نے معاً کہا۔ حرکت ہو گئی ہے۔ قصور وار ہوں معاف کر دیں۔''

بھائیوں نے کہا کہ غلطی معاف ہو سکتی ہے لیکن آپ کو نئی بیوی کو ابھی طلاق دینا ہو گی ورنہ ہم ابھی پولیس کے پاس جائیں گے اور بتائیں گے کہ ہیڈ ماسٹر نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کر لی ہے۔ پولیس آپ کو پکڑ کر لے جائے گی۔''

الف دین منہ بنا کر بولے ''کیا تم نے نہیں سنا کہ ''نانی نے خصم کیا''...... کسی نے کہا بُرا کیا' پھر کسی نے بتایا کہ نانی نے خصم چھوڑ دیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا اب بہت بُرا کیا۔ میں نے غلطی کی ہے لیکن اب بہت بڑی غلطی نہیں کروں گا کہ اسے چھوڑ دوں۔ پولیس مجھے پکڑ کر لے جائے' جیل میں بھی بند کر دے تو نکاح پھر بھی نہیں ٹوٹے گا۔''

بھائی کہنے لگے کہ پھر ہماری بہن کو طلاق دے دو۔ ہم اپنی بہن پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے؟ چودھری صاحب نے فرمایا یہ جو بیوی میں نے کی ہے یہ میری پہلی منگیتر تھی۔ بیچ میں تمہارے ماں باپ ٹپک پڑے مجھے اُچک کر لے گئے۔ یہ استانی ہے اڑھائی سو تنخواہ لیتی ہے تمہارے ہی بھانجوں کے کام آئے گی۔ رہی تمہاری بہن، تو میں اس کو چھوڑ تو نہیں رہا وہ بھی رہے گی وہ بھی میرے بچوں کی ماں ہے۔ میری تازہ بیگم اس کی خدمت کرے گی...... ہاتھ پاؤں سے بھی پیسے دھیلے سے بھی......اور کیا چاہیے؟''

بات جذباتی بھائیوں کی سمجھ میں نہیں آئی تیکھے لہجے میں کہنے لگے ''بس دو ہی صورتیں ہیں، ہماری بہن کو چھوڑ دو یا پھر اس استانی کو...... اب چودھری صاحب جلال میں آ گئے فرمایا: ''چلو میں تمہاری بہن کو چھوڑتا ہوں۔ میں نے پرانا ڈم ڈم گلے میں ڈالے رکھنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ بجائے اس کے کہ تم تھانے جاؤ سیدھے کچہری جاؤ وہ اشٹام لاؤ جس پر طلاق دی جاتی ہے۔ تمہیں پولیس کے پاس جانے کے قانون کا علم ہے تو اس قانون کا بھی پتہ ہوگا کہ اب طلاق یونین کونسل کے ذریعے دی جاتی ہے...... کاغذ خرید کر لے جاؤ یونین کونسل میں درخواست دو یونین کونسل جب میرے نام سمن بھیجے گی میں حاضر ہو جاؤں گا اور تمہارا مطالبہ پورا کر دوں گا۔''

بھائی سکول سے نکل گئے۔ چودھری صاحب اپنے گھر چلے گئے نہ بھائی لوٹ کر آئے نہ کوئی سمن آیا۔ البتہ یہ ہوا کہ جلد ہی چودھری صاحب کا تبادلہ گھر کے قریب ہو گیا اور ان کی مدلل گفتگو اور دو چار شرعی حوالوں کے زیر اثر پہلی بیگم نے نئی بیگم کو بہن بنا لیا۔ چودھری صاحب کی باتیں ان کی پہلی بیگم کو بھی بھاتی تھیں۔ اس لئے ان سے بھی چودھری صاحب کا ٹانکہ بخوبی جڑا رہا۔

چودھری صاحب کے کچھ اپنے نظریات بھی تھے جن کا اظہار وہ طلبہ اور اساتذہ سے موقع بموقع کرتے رہتے تھے ان کو بے شمار آیاتِ کلام پاک، احادیث نبویؐ اسلامی تاریخ کے واقعات اور علامہ اقبال کے اشعار یاد تھے۔ فرماتے تھے کہ ہر طالب علم اور ہر استاد کو فنِ تقریر سے آگاہی ہونی چاہیے۔ استاد کا کردار رہنما کا ہے اور راہنما ہمیشہ مقرر ہوتا ہے تبھی وہ دوسروں سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ اس فن میں اُتارو ہونے کی وجہ سے چودھری صاحب کا لیکچر تین تین دن تک جاری رہتا۔ وہ زیادہ تر ''ضرب کلیم'' کے اشعار اور ان کی شرح بیان کرتے۔

فرماتے تھے کہ اقبالؒ کا پیغام 'ضرب کلیم' میں پوری شرح وبسط کے ساتھ موجود ہے اس لئے ضرب کلیم طالبانِ علم کو حفظ ہونی چاہیے۔

بہر کیف اپنی طویل ملاقات جس میں اُن ہی کی طرف سے چائے اور کھانا بھی شامل تھا انہوں نے فرمایا: کہ وہ میرے معتقد صرف اس لئے ہیں کہ میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں اور جب سے انہوں نے میرا افسانہ 'بیکار افسر' پڑھا تھا تب ہی سے مجھے اپنا جگری دوست سمجھنا شروع کر دیا تھا گو اظہارِ محبت کا موقع کم کم ملا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے خصوصی ملاقات کا سبب بیان کیا۔ رازدارانہ انداز میں کہا کہ وزیر اعلیٰ نواز شریف نے اپنی حکومت کا سکہ جمانے کے لئے محکمہ جات کو لکھا ہے کہ وہ ایسے افسران کو جو خود کو بڑی اہم توپ تصور کرتے ہیں اپنے محکمے سے لڑتے جھگڑتے ہیں اور جن کے خلاف ڈسپلن رولز مجریہ ۱۹۷۵ء کے تحت کارروائی ہو رہی ہے ان کی سروس اگر ۲۵ سال ہو چکی ہے تو انہیں جبراً ریٹائر کر دیا جائے۔ چودھری صاحب نے مزید بتایا کہ وہ ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ میاں شریف ڈی پی آئی سکولز میرے خلاف ہیں اور ۲۵ سالہ سروس کی بنیاد پر جملہ افسران ذاتی ناپسند کی آڑ میں اپنے مخالفین کا شکار کریں گے لہٰذا میں پہلی فرصت میں میاں شریف کو راضی کروں۔

''چودھری صاحب! میں نے کہا۔'' آپ اتنے کھرے آدمی ہو کر مجھے یہ مشورہ دے رہے ہیں؟''

ہاں میں یہی مشورہ دوں گا۔ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کا محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا......''

''بڑا ہی غلط محاورہ ہے...... میں اس بارے میں استخارہ کروں گا۔''

''اچھا تو پھر اسلام علیکم...... تین گھنٹے گزر گئے ہیں......'' وہ اٹھ کر چلے گئے۔

میں سوچتا رہا کہ ان کی آمد اور گفتگو خالی از علت نہیں ہے گو میری سروس پچیس سال ہو چکی تھی لیکن میرے خلاف کوئی انضباطی تحقیقات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ میں کسی بھی با اختیار اسامی پر تعینات نہیں رہا تھا۔ پھر بھی میں پریشان ہو گیا۔ پی پی پی نے اپنے دورِ حکومت میں تیرہ سو افسر جبری ریٹائر کئے تھے اور سب ہی کو وہ پنشن مفادات دئے تھے جو تیس سالہ سروس پر ملتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ حکومت کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے اور حکومت ناپسندیدہ افراد سے نجات بھی حاصل کر لے پھر عبوری آئین کے تحت ضیاء الحق نے بھی بہت سے افسروں کی چھٹی

کرائی تھی۔ان کے لئے قانونی اپیل کی بھی گنجائش نہیں تھی صرف ریٹائر کرنے والی اتھارٹی ہی کونظر ثانی کی درخواست دی جاسکتی تھی۔

میں ان چودہ سوافسروں میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔لیکن میں سب سے زیادہ جس شخص کو جانتا تھا وہ ملک غلام حیدر ڈی ای او لاہور تھے۔ایک مقامی نوعیت کے ہفتہ وار اخبار نے ان کے خلاف غلط سلط مواد چھاپا تھا جس کی بناء پر ان کو وزیر اعظم سیکرٹریٹ کے حکم پر ریٹائر کر دیا گیا۔یہی سلوک کمانڈر ظہور احمد ڈائریکٹر تعلیم لاہور ڈویژن کے ساتھ بھی کیا گیا جبکہ ان سے پہلے ربانی صاحب سے بھی یہی کچھ ہوا تھا۔میرے علاوہ دوسرے احباب کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ لوگ لائق احترام تھے مگر اخبارات نے خواہ مخواہ نمک مرچ لگا کر ان کی کردار کشی کی تھی۔ اپنے فرائض سے بھی آگاہ تھے اور ان کے بعد آنے والے افسروں کی نسبت کارکردگی میں بھی کہیں بہتر تھے۔ایماندار افسر کے تو ویسے ہی بہت سے دشمن ہوتے ہیں۔وہ اپنے دشمنوں کو بھی دوست کہہ کر پکارتے تھے لیکن وہ بلاوجہ ستم ہائے روزگار کا شکار ہوئے۔پنشن مفادات تو ان کو پورے ملے۔فراغت بھی میسر آئی لیکن وہ جو جبری ریٹائرمنٹ کا تصور عامتہ الناس میں موجود ہے اس کی روشنی میں وہ لٹیرے،راشی اور بدکردار تھے۔ہمدردی کرنے والے بھی دل میں کہتے کہ کچھ نہ کچھ تو کیا ہی ہوگا تبھی تو سزا ملی ہے۔

☆☆

اس رات تو میں سو نہیں سکا۔لیکن اگلی صبح سب کچھ بھول گیا۔اور اسی روز قصور سے فارغ ہونے کا سوچنے لگا دفتر پہنچتے ہی میں نے اپنی فراغتی رپورٹ تیار کی۔سینئر اے ای او قصور چودھر احمد حسن جو شیخوپورہ ہی کے رہنے والے تھے سے مل کر پروگرام بنایا کہ وہ آج ہی شیخوپورہ چلے جائیں گے اور اگلے روز ویگنوں کے اڈے پر میرا انتظار کریں گے۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں شیخوپورہ کے ڈی ای او مسٹر بشیر اختر ساہی کو جانتا ہوں۔

میں نے احمد حسن کو بتایا کہ میں ان کی صورت سے شناسا ہوں ۔ جب میں گوجرانوالہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر (منصوبہ بندی وترقیات) تھا تو اس وقت موصوف ایلیمنٹری ٹیچرز ٹریننگ کالج لالہ موسیٰ کے پرنسپل تھے۔جب کبھی وہ کسی سرکاری کام سے ڈویژن کے تعلیمی دفتر تشریف لاتے تو اہلکار ان کی بڑی پذیرائی کرتے کیونکہ وہ اپنا تعلق گجرات کے چودھری برادران سے بتایا کرتے تھے۔ان کی بینائی کمزور تھی کرسی پر بیٹھے ہوئے اہلکار سے ہاتھ ملاتے

تھے یا پاس بیٹھے شخص کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ وہ پہلے سے واقف افراد کو ان کی آواز سے شناخت کرتے تھے۔ بس میں اتنا ہی ان کو جانتا ہوں۔

احمد حسن نے بتایا کہ ان کی بینائی کی وجہ سے شیخوپورہ میں کچھ لطائف نے بھی جنم لیا۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود وہ کافی تیز اور ہوشیار آدمی ہیں۔ میں ان سے ذرا بچ کر چلوں۔ چودھری محمد اکرام سے میری چپقلش اور گورنر کی معائنہ ٹیم کی طرف سے تحقیقات کی بازگشت ابھی تک فضا میں موجود ہے اور جب سے میرے احکام تقرر بطور بااختیار ڈپٹی ڈی او تحصیل شیخوپورہ جاری ہوئے ہیں مسٹر ساہی میرے متعلق کوائف جمع کر رہے ہیں۔ وہ میرے حسب نسب' رشتہ داروں اور سفارشات کے بارے میں پوچھ گچھ کر چکے ہیں۔ چودھری محمد علی ضلعی صدر پنجاب ٹیچرز یونین شیخوپورہ نے میرے متعلق ان کو بتایا کہ قاضی میرا یار ہے۔ شیخوپورہ میں مجھ سے پوچھ کے چلے گا ویسے وہ بڑی پہنچ والا آدمی ہے۔ اس کے بیٹے کا سسر ڈی آئی جی پولیس کے عہدے سے ریٹائر شدہ افسر ہے۔ اس کے قریبی رشتہ دار اہم بیوروکریٹ ہیں اور یہ چودھری برادران جن کا ذکر ساہی صاحب اٹھتے بیٹھتے کرتے رہتے ہیں قاضی کے سنٹرل ماڈل سکول میں دو سال نہم دہم میں شاگرد رہے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کے عہدے کے کئی افسر اس کے شاگرد ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے احمد حسن سے پوچھا کہ چودھری محمد علی نے میرے متعلق جھوٹ کا یہ طومار کیوں باندھا؟

احمد حسن نے بلا تکلف جواب دیا:

''اپنی دھاک بٹھانے کیلئے۔ وہ سیاسی آدمی ہے۔ اس کا طریق کار یہی ہے کہ افسر کو دہلا دیتا ہے اور پھر اپنے کام نکلوا لیتا ہے۔ آپ کا تعارف کرانے کے ساتھ ہی اس نے ساہی سے کئی رکے ہوئے کام نکلوا لئے۔ آپ سے بھی کئی کام نکلوانے کی فہرست اس کے پاس موجود ہے''۔

''یہ یونین والے کمال کے لوگ ہیں۔''

''اس دور میں سب لوگ کمال کے ہیں۔ یہ شیخوپورہ تو ویسے ہی فنکاروں کا شہر ہے۔ اکثر اساتذہ کی تنظیموں کے صدور اور سیکرٹری صاحبان اسی ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے اردگرد بہت سے مشیر' ہمدرد اور کارکن جمع ہو جائیں گے ساہی بھی اپ سے دل میلا کیے بیٹھا ہے اس لئے ہر قدم سنبھل کر اٹھایئے گا۔''

اگلے روز چودھری احمد حسن مجھے شیخوپورہ میں ویگنوں کے اڈے پر ملا باتیں کرتے کرتے ہم ضلعی افسر تعلیم کے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں میرا شناسا کوئی ایک آدھ کلرک ہی تھا لیکن احمد حسن کو سب جانتے تھے۔ اس نے میرا تعارف سب سے کرایا پھر مجھ سے کہا کہ میں ڈپٹی ڈی ای او کے لئے مخصوص کئے گئے کمرے میں بیٹھتا ہوں آپ ساہی صاحب کے کمرے میں جا کر ان سے مل آؤ۔

☆☆

ایک بڑی سی میز کے ایک سمت درمیان میں لگی کرسی پر ڈی۔ ای۔ او صاحب تشریف فرما تھے۔ میں نے 'اسلام علیکم' کہا تو انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ میز کے بائیں طرف بیٹھے تھے دو عرض گزاروں کی کوئی وضاحت سن رہے تھے اور ان کو ٹوک رہے تھے کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں حقیقت یوں ہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ فارغ ہوئے تو مجھ سے کہا' فرمایئے؟

میں نے انہیں بتایا کہ میرا نام یہ ہے اور...... انہوں نے 'بس بس' کہا کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ''ادھر تشریف لائیں اور گلے لگیں...... میں تو کئی دن سے آپ کا منتظر ہوں...... مجھے علم ہے کہ آپ صوفی عبدالقیوم کے رشتہ دار ہیں۔ اس نیک مرد کا رشتہ دار تو سر آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہے...... میں ان کے قریب ہو گیا تو انہوں نے مجھے اپنے بھاری بازوؤں میں سمیٹ لیا ساتھ ہی مصافحے کی نسبت معانقے کے فضائل بیان فرمائے۔ کوئی حدیث بھی پڑھی اور میں ''بے شک' بے شک'' کرتا رہ گیا۔

میں قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ باتیں پوچھتے رہے میں مؤدبانہ جواب دیتا رہا۔ مجھے احمد حسن کی ہر بات غلط محسوس ہونے لگی۔ وہ بے تکان باتیں کئے جا رہے تھے ایک بات میں انہوں نے یہ کہا کہ چودھری اکرام تو پاگل تھا جس نے ہیرے کی قدر نہ پہچانی۔ وہ مجھے نگینے کی طرح رکھیں گے۔ پھر انہوں نے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو بلایا کہ وہ میری حاضری رپورٹ تیار کرے اور فی الفور متعلقہ دفاتر کو ارسال کرے۔ ساتھ ہی اسے اس کمرے میں پر تکلف چائے بھجوانے کا حکم دیا جو میرے لئے مختص کیا گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ چل کر مجھے اس کمرے میں چھوڑنے آئے اور کہا باقی سب کچھ تو انہوں نے کر دیا تھا صرف کرسی خالی تھی سو وہ مبارک ہو۔ چائے کے بعد میں نے ان کو ان کے کمرے تک چھوڑنا چاہا وہ میری بجائے احمد حسن کو

اپنے ساتھ لے گئے۔

ساہی صاحب سے احمد حسن کی ملاقات پہلے بھی ہوتی رہتی تھی اور وہ اسے تبادلہ کروا کر اپنے گھر شیخوپورہ آجانے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔اس کی حیثیت مسلمہ تھی وہ ایک سیاسی شخصیت حاجی محمد نواز کھوکھر کا قریبی عزیز تھا۔

مسٹر ساہی نے میرے دفتر میں جو کلرک اپنے دفتر سے نکال کر تعینات کئے تھے ساہی صاحب ان سے ناخوش تھے۔ میں نے کلرکوں کو اپنے کمرے میں بلا کر ان کا تعارف حاصل کیا وہ تین ہی تھے۔ اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میرے لئے سب لوگ نئے تھے' کوئی ورک تھا تو کوئی منج کوئی چٹھہ تھا تو کوئی گل۔ ان دنوں حکومت میں انہی برادریوں کا چرچا تھا۔ چودھری بشیر احمد اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر (تعلیم و تربیت جسمانی) میرے پرانے واقف نکلے۔ جب میں سیالکوٹ میں تعینات تھا تو ان دنوں ان کی اس عہدے پر نئی نئی تعیناتی ہوئی تھی۔ پورا دن رسمِ تعارف میں گزر گیا۔ چھٹی کے وقت میں نے ساہی صاحب سے اجازت طلب کی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں احمد حسن کے ہاں ٹھہروں گا؟

''دیکھتا ہوں کہ اب کیا کرنا ہے فی الحال تو میں احمد حسن ہی کے قبضے میں ہوں'' میں انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں تو واپس لاہور جا رہا ہوں۔ ''بس ذرا سیاسی خانوادہ ہے' سنبھل کر چلئے گا۔'' انہوں نے الوداعی مصافحے میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ بات احمد حسن کو بتائی تو اس نے کہا کہ جب وہ اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے کر گئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ بلا (یعنی میں) ٹل جائے گی مگر اب نازل ہو ہی گئی ہے تو نمٹیں گے میرا ارادہ تو شبیر شاہ کو ادھر لانے کا تھا۔ میں نے ڈائریکٹر صاحبہ سے کہا بھی تھا کہ اس کو ننکانہ صاحب بھیج دیں اور شبیر احمد شاہ کو ادھر کر دیں مگر وہ بھی عورت ہی نکلیں۔ احمد حسن نے ان سے پوچھا کہ 'نکلیں' کیا مطلب وہ تو ہیں ہی خاتون۔ پھر انہوں نے احمد حسن سے کہا کہ وہ اپنے رشتہ دار سیاستدان سے کہہ دے کہ وہ اپنے ناچیز خادم پردیسی ساہی کا خیال رکھیں کہ سابقہ ڈی ای او چودھری فیض کا گروہ ان کی کارکردگی کی وجہ سے ان کے خلاف سرگرمِ عمل ہے۔

☆☆

میں روزانہ لاہور سے شیخوپورہ اپنے دفتر وقت پر پہنچتا۔ دفتر چونکہ تعلیمی پالیسی کے تحت ابھی نیا نیا قائم کیا گیا لہٰذا کام کا کوئی دباؤ نہ تھا۔ روزانہ کی ڈاک سے ہدایات پر مبنی کوئی مراسلہ

آ جاتا۔ ایسے بعض مراسلات میں کچھ اعداد و شمار یا کچھ کوائف طلب کئے جاتے جن کا تعلق پوری تحصیل سے ہوتا۔ مجھے مرکز کے تمام اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں سے یہ کوائف حاصل کرنا پڑتے چنانچہ میں نے کچھ ایسے چارٹس، گوشوارے اور کوائف کی ترتیب کا کام شروع کر دیا کہ کسی بھی سرکاری مراسلے کا جواب دینے سے پہلے اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں کی میٹنگ نہ کرنی پڑے۔ ایسی منصوبہ بندی بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی لیکن ایسا اہتمام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں نے نہیں کیا تھا۔

کاغذات اور مالیات کے حوالے سے یہ دفاتر جولائی ۱۹۸۵ء سے قائم ہو چکے تھے لیکن ڈپٹی ایجوکیشن افسران کے انتخاب اور پھر تقرر کا مرحلہ نومبر ۱۹۸۵ء میں طے ہوا۔ اب بھی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران، ان دفاتر میں تفویض اختیارات کے حوالے سے رکاوٹیں ڈال رہے تھے کہ اگر ان کے دائرہ اختیار سے مڈل اور پرائمری سکول کے جملہ امور نکل گئے تو کیا وہ بیکار بیٹھے جھنجھنا بجایا کریں گے۔ وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ کے ذریعے تعلیمی افسروں پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ انہوں نے اختیارات کے چارٹر کے اجراء میں رکاوٹیں ڈال کر اسے نظر ثانی کی خاطر انتظامی اور تعلیمی اصلاحات کی 'نفاذ کمیٹی' کو واپس بھجوا دیا تھا۔

اختیاراتی چارٹر کا تعلق انتظامی امور سے تھا۔ اس میں رکاوٹ ڈالنے کے علاوہ کسی بھی ایسے مراسلے پر ڈی ای او صاحبان نے کوئی توجہ نہیں دی تھی جن کا تعلق صحیح اعداد و شمار اور دیگر کوائف سے تھا۔ میں جب ان جمع شدہ مراسلات کے پلندوں پر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر سے بات کرتا تو وہ کئی تاویلات پیش کرتے اور سارا بوجھ اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں پر ڈال دیتے اور کہتے کہ یہ بے لگام گھوڑے ہیں۔ سرکاری برادریوں کے چہیتے ہیں میری سنتے ہی نہیں تھے۔ آپ کو بھی جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان سے کام لینا کتنا مشکل ہے۔ پھر میری حوصلہ افزائی کرتے اور تعریف کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ وہ کہتے کہ میں ان سے بات چیت کرتے ہوئے گزارش یا التماس نہ کیا کروں بلکہ انہیں حکم دیا کروں۔ مجھے ان کی اس بات پر حیرت بھی ہوتی اور افسوس بھی کہ کیسی دودھاری تلوار سے سابقہ پڑا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں کو اختیارات کا چارٹر جاری نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا تقرر بھی دفاتر کے قیام کے پانچ ماہ بعد ہوا تھا۔ اس اثناء میں سفارشات اور نذر و نیاز سے بننے والے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں نے اپنے کھاتے درست کرنے

کا پروگرام بنایا۔ قصور میں نوے اسامیوں پر تقرر کا ماجرا تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ وہاں کے جھرلو سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا تھا دو جمع دو چار کا معاملہ رہا تھا جو طریق کار وہاں کھاتہ پورا نہ کرنے کا اختیار کیا گیا تھا وہ کسی غیر معمولی مالیاتی ماہر کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ دوسرے ضلعوں میں سے چند ایک اضلاع میں نرالی قسم کا طریق کار اختیار کیا گیا اس طریقے سے محکمہ تعلیم میں افراتفری مچ گئی۔

جب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں کو یقین ہو چکا کہ ڈپٹی ڈی او کو ''انتقالِ اختیارات'' کے بعد وہ ٹھن ٹھن گوپال ہو کر رہ جائیں گے اس لئے انہوں نے موسم گرما کی تعطیلات کے اندر اندر اساتذہ کو سلیکشن گریڈ دینے' خالی اسامیوں پر ان کے تبادلے کرنے اور خالی اسامیوں پر تقرر کی درخواستیں طلب کیں۔ جب بھی محکمہ تعلیم کے اندر کسی بھی سطح پر ایسے مفادات حق داروں میں تقسیم کرنے کا اعلان ہوتا ہے تو بہت سے مفاد پرست خدمت گار اور حرام خور افسروں کے گماشتے حرکت میں آ جاتے ہیں۔

میں کسی کی نیت پر شک نہیں کرتا۔ خود گنہگار ہوں۔ پورے پنجاب کے مختلف اضلاع کے اشتہارات بعنوان ''اسامیاں خالی ہیں'' اخبارات میں چھپتے رہے لیکن زیادہ اضلاع کے افسروں نے نیک نیتی سے اپنا کام نمٹانے کی خاطر یہ کام کیا لیکن چند اضلاع میں اور ہی کھیل کھیلا گیا۔ لاہور ڈویژن میں شیخوپورہ میں اور گوجرانوالا ڈویژن میں سے سیالکوٹ میں کام صریحاً گھپلے کی خاطر کیا گیا یا پھر ضلعی افسرانِ تعلیم کو نیک نیتی سے کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ان دو اضلاع کے ضلعی تعلیمی افسروں نے پی ٹی سی مدرسین کے جو تقررات کئے وہ منظور شدہ خالی اسامیوں سے سینکڑوں کی تعداد میں زیادہ تھے۔ تقرر کے احکام تعطیلاتِ موسم گرما میں جاری کر دئے گئے۔ امیدواروں کو تعطیلات کے بعد سکول کھلنے پر حاضر ہونے کی تاکید کی گئی۔

تقرر کے احکام کی نقول میں نے بھی دیکھیں لیکن ضلعی تعلیمی افسروں نے کتنا روپیہ بٹورا مجھے علم نہیں۔ بس روایات ہی سنیں کہ ضلع شیخوپورہ میں اتنا اور ضلع سیالکوٹ میں اتنا روپیہ اکٹھا ہوا یہ لاکھوں کی رقوم تھیں۔ شیخوپورہ میں تو اس دھاندلی کا قصہ ایک حوالہ بن گیا ساہی صاحب سب کو بتاتے تھے کہ دیکھو! فیض کیا کر گیا ہے؟ دھاندلیوں کی خبریں نکلنے پر بعض ضلع تعلیمی افسروں کو تبدیل بھی کر دیا گیا۔ تعطیلاتِ موسم گرما کے بعد جب پی ٹی سی مدرسین حاضری کے لئے سکولوں میں جاتے تو سنٹر ہیڈ ماسٹر ان کو بتاتے کہ ان کے مرکز میں تو کوئی اسامی خالی

نہیں ہے امیدوار بھاگے بھاگے اے ای او کے پاس آتے۔ اے ای او انہیں ڈی ای او کے سامنے پیش کر دیتا۔ ڈی ای او صاحب امیدواروں سے اظہارِ ہمدردی کرتے اور پوچھتے کہ اس نے کتنے پیسے دیئے ہیں؟ کس کو دیئے؟ کب دیئے؟ اور احکام تقرر کب ملے؟ زبانی گفتگو کے بعد امیدوار سے سب کچھ لکھوالیا جاتا اور تسلی دی جاتی کہ اس کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ مشہور تھا کہ ڈی ای او شیخوپورہ نے ایک پوری مسل تیار کر کے ڈائریکٹر لاہور ڈویژن کو ارسال کی۔ اس کے نتیجے میں ضلعی دفتر میں ان کی دھاک بیٹھ گئی کہ یہ محکمہ تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر دستیاب ہوا ہے۔ جو دیانت دار بھی ہے اور مستعد کارکن بھی!

☆☆

ایک روز چودھری فیض احمد جواب گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ نمبر ۲ کے ہیڈ ماسٹر تھے' مجھے ملنے آئے۔ انہوں نے زائد تقررات کے بارے میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے انہوں نے کسی سے کچھ لے لیا ہو لیکن زیادہ تقرر انہوں نے سفارشات پر کئے ہیں۔ جو زائد ہوئے ہیں وہ بھی دفتر کی مہیا کردہ معلومات اور بھرتی کمیٹی کی تصدیق کے بعد ہوئے ہیں اب سارا نزلہ ان پر گرایا جا رہا ہے اور یہ ساہی' تو شاید شیخوپورہ میں ان کے نقائص پکڑنے اور عیب جوئی کرنے کے لئے آیا ہے۔ ہر وقت ان کے خلاف باتیں کرتا رہتا ہے۔ اب جو اس کے مصاحب بنے پھرتے ہیں وہ ان کے بھی مصاحب ہوا کرتے تھے۔ یہی ہوا کا رخ موڑتے اور کھڑے تنے توڑتے ہیں۔ ازراہ مروت اور بھائی بندی میں نے چودھری فیض احمد کو چائے پلائی ان کی کسی بات کو غلط نہیں کہا بلکہ ان سے وعدہ کیا کہ جونہی مجھے اختیارات کا چارٹر ملے گا میں ہر خالی ہونے والی یا نئی پیدا کی جانے والی اسامی پر اسی ترتیب سے تقرر کروں گا جس ترتیب سے انہوں نے کئے ہیں اور انشاءاللہ سب لوگ اپنے اپنے وقت پر کھپ جائیں گے۔

فیض احمد کی آمد کی خبر رات ہی کو ساہی صاحب کو پہنچ گئی اگلے روز انہوں نے مجھ سے ملاقات کی تفصیلات پوچھیں۔ میں نے بلاکم و کاست سب کچھ بتا دیا بلکہ فیض احمد سے جو وعدہ ان کے بھرتی کردہ اساتذہ کرام کے بارے میں کیا تھا وہ بھی بتا دیا۔ انہوں نے میری اس ملاقات کو ناپسند کیا اور کہا کہ اگر افسران بالا کو اس ملاقات کا علم ہو جائے تو وہ بھی مجھ سے ناراض ہوں گے کیونکہ وہ چودھری فیض احمد کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے آئندہ محتاط رہنے کا یقین دلایا۔ لیکن ساہی صاحب کا ذہن ہی ایسا تھا کہ انہوں نے فیض احمد سے میری ملاقات کو اپنے

خلاف سازش قرار دیا۔

☆☆

مجھے ڈی ای او صاحب کے متعلق جو مزید باتیں معلوم ہوئیں انہیں میں ان کی خصوصیات میں شمار کرتا ہوں۔ موصوف آدھے منٹ میں سو الفاظ یقیناً بولتے ہوں گے کیونکہ اگر کوئی ٹائپسٹ فی منٹ چالیس الفاظ لکھ لیتا ہے تو بولنے کی رفتار مشین کی نسبت چار پانچ گنا زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بڑا جاندار تھا۔ اشعار بھی خوب یاد تھے۔ ماضی میں انہوں نے مطالعہ بھی کافی کیا ہوگا تب ان کی بینائی بھی یقیناً بہتر ہوگی۔ اردو میں فی البدیہہ لچھے دار تقریر کرنے کے ماہر تھے۔ میں انہیں ایک قابل اور اعلیٰ پائے کا حرفوں کا بنا انسان کہوں تو بے محل نہ ہوگا۔ ان کی یہ خصوصیت کچھ وراثتی بھی تھی ان کے والد مرحوم (جن کا نام شاید مولا داد تھا یا مولا بخش تھا) پنجابی کے شاعر تھے اور ان کے متعلق ضلع گجرات میں مشہور تھا کہ وہ اپنے کلام اور ترنم کے زور سے اکھڑتے جلسے جما دیتے تھے۔ تحریک پاکستان میں انہوں نے کافی کام کیا تھا۔

وہ گفتگو میں الفاظ کے برمحل' استعمال کی بڑی قدرت رکھتے تھے ان میں تملق اور چاپلوسی کی صلاحیت بھی خوب تھی۔ اس تعریف کے بعد ساہی صاحب اپنی جگہ اگر کانٹا بھی ہوتے تو اب تو انہیں پھول ہی بننا تھا۔ شاید اسی خوبی کے طفیل وہ پہلے سترہویں گرید میں ماہر مضمون منتخب ہوئے تھے اور بعد میں اٹھارہویں گرید میں براہ راست جامعہ سکول کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ وہ مخاطب کے حسبِ مراتب لفظ اور گفتگو کے انداز کا انتخاب کرتے تھے۔

مجھے گوجرانوالا کے دفتر کا ایک واقعہ یاد ہے وہاں ایک شاہ صاحب تھے جو کلرکوں کے کیڈر سے تعلق رکھتے تھے اس وقت اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے اور کلیریکل عملے کے تقرر' تبادلے اور ترقیات وغیرہ کے اختیارات رکھتے تھے۔ ساہی صاحب کو ان سے کوئی خاص کام لینا تھا۔ وہ شاہ صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب کی تعریف میں انہوں نے کہ فضل شاہ کی کیا بات ہے؟ وہ تو سادات کے باغ کا پھول ہے۔

ماتحت پسندیدہ ہوتا تو اس سے اور زبان میں بات کرتے' ناپسند ہوتا تو گفتگو میں غلاظت بھی ملا دیتے تھے لیکن یہ تول لیتے کہ ماتحت شیخوپورہ کے ورکوں چٹھوں' منجوں یا گلوں میں سے تو نہیں مبادا الٹا رگڑا لگا دے۔ ہماری میٹنگوں میں وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے باقاعدہ کارروائی سے پہلے کوئی نہ کوئی شعر پڑھتے۔ ایک طویل قامت مگر خاموش طبع ہیڈ ماسٹر ہائی

سکول بھی ان کے مقربین میں سے تھا۔ ایک اجلاس میں ان کے لئے جو شعر انہوں نے پڑھا ہے وہ مجھے آج تک یاد ہے۔

رفتار سارے ہم وطنوں کی بدل گئی
اک اونٹ تھا کہ شہر میں ثابت قدم رہا

طویل قامت چودھری صاحب سے پوچھا کیا تم نے شعر سنا ہے؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا تو پھر پوچھا کہ کیا تم نے شعر سمجھا بھی ہے؟ پھر فرمایا کہ انہوں نے ایک ذاتی نوعیت کا چھوٹا سا کام تمام اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں سے کرنے کو کہا تھا کسی نے پروا نہیں کی صرف لمبے چودھری کو یاد رہا اور اسی نے کیا۔

انہیں آج کی کہی بات دوسرے دن یاد نہ رہتی تھی کیونکہ وہ بات دوسروں سے متعلق ہوتی تھی شاید وہ دانستہ جھوٹ بولتے تھے۔ افسروں کے سامنے بچھ بچھ جاتے تھے۔ فصیح و بلیغ قصیدے کہتے تھے جن میں زبردست مبالغہ ہوتا تھا۔ ماتحت کی کوئی غلطی اتفاق سے یا ارادۃً پکڑ لیتے تو ہر موقع پر اس کو اس طرح رازدارانہ انداز میں بیان کرتے جیسے کوئی اہم راز افشا کر رہے ہیں۔ ہیر پھیر، گھپلوں اور چونکہ چنانچہ کے ماہر تھے۔ اپنا زورِ بیان ہر اس بات کی تردید میں صرف کرتے جو ان کی ذات کے خلاف نکلتی۔

موصوف کی رہائش دفتر ہی میں تھی۔ چند مقامی اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر دو چار صدر معلمین اور کچھ خدمت گزار مدرس دفتری اوقات کے بعد ان کی دلجوئی اور خدمت کے لئے موجود رہتے تھے۔ وہ صاحب کا مزاج سمجھ چکے تھے لہٰذا ان کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کیلئے چغل خوری کیا کرتے تھے ان کے ہر کام کی تائید کرنا فرض سمجھتے تھے ننکانہ صاحب کے ڈپٹی ڈی ای او شبیر شاہ کی زبان بھی بڑی میٹھی تھی۔ جناب، حضور، بندہ پرور جیسے الفاظ ان کا تکیہ کلام تھے۔ وہ موصوف کو بہت عزیز تھے۔ افسروں کی خوشامد کرنا ان کی ہاں میں ہاں ملانے کا مرض مجھ میں بھی تھا بسا اوقات اس 'وصف' سے کام بھی نکالے تھے لیکن میں اس صنف میں بھی اعتدال کا قائل تھا۔ مگر ساہی صاحب شدت پسند تھے۔

ایک روز میرے کمرے میں تشریف لائے۔ دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا کہ کیا میں وہی ذوالفقار احمد ہوں جس نے فلاں فلاں کتاب لکھی ہے اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہے۔ میری عاجزانہ 'ہاں' پر زور سے 'ہوں' کہا۔ پھر فرمایا کہ تین چار اہم صاحب اقتدار شخصیتیں

تمہاری شاگرد ہیں۔ پھر تم نے ان کو میاں شریف کو رام کرنے کے لئے کیوں استعمال نہیں کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں ان سے کبھی ملا ہی نہیں، اب اپنی غرض سے ملنا گوارا نہ تھا۔ پھر پوچھا تمہارے اختلاف تو چودھری اکرام سے تھے لیکن میاں شریف تمہارے مخالف کیوں ہو گئے؟

''مجھے تو اس بات کا علم نہیں کہ میاں شریف میرے خلاف ہیں۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''تعجب ہے۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ کو ان سے ملنا چاہیے وہ تو آپ کے خلاف ایڈیشنل سیکرٹری سے بات کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

''دیکھیں جی جس شخص کے خلاف سارا قصور تھا اسے کمشنر صاحب نے نئی سکیم کے تحت شیخوپورہ کا بااختیار ڈپٹی ایجوکیشن افسر مقرر کر دیا ہے۔''

''آپ وہاں موجود تھے؟''

''ہاں...... چودھری نذیر صاحب ایڈیشنل سیکرٹری سے اپنی کچھ یاد اللہ ہے۔ کبھی کبھی بلا لیتے ہیں۔ میں وہاں تھا کہ میاں شریف تشریف لائے۔ وہ پنجاب بھر میں تعینات ہونے والے ڈپٹی صاحبان کی موزونیت کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ جب آپ کے متعلق بات ہوئی تو میرے بس میں جس قدر ممکن تھا میں نے آپ کی تعریف کی۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کو چائے کی پیشکش کی لیکن وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے سے باہر تک چھوڑنے گیا تو پھر فرمایا کہ میں میاں شریف سے ضرور ملوں بلکہ ان کو اپنے کسی سیاسی خانوادے کے شاگرد سے فون بھی کراؤں۔ میں سمجھ گیا کہ میں میاں شریف کو اب بھی کانٹے کی طرح چبھ رہا ہوں۔ شاید انہوں نے ڈی ای او شیخوپورہ کو میرے بارے میں وہی کچھ کہا ہو گا جو انہوں نے مسٹر ملغانی سے کہا تھا۔ لیکن میری ۱۹۸۵ء کی اے سی آر ساہی صاحب کی دسترس سے باہر تھی اس لئے کہ ان کے ماتحت میں نے ۱۹۸۵ء میں صرف ایک ماہ کام کیا تھا ہاں وہ جنوری ۱۹۸۷ء میں میری ۱۹۸۶ کی اے سی آر لکھ سکتے تھے۔ اور یہ ''ہنوز دہلی دور است'' والا معاملہ تھا۔

مجھے بھنک پڑی کہ ساہی صاحب کو میرا روزانہ اپنے گھر لاہور جانا کھٹک رہا ہے۔ انہوں نے اپنے بعد از دفتر حاضر باشوں سے 'اسٹیشن چھوڑنے' کی اجازت کے قانون کی بات کی اچانک ڈویژن کے تحصیل انچارج ڈپٹی صاحبان کی تربیت کا دو روزہ کورس آ گیا۔ اس کورس میں دی جانے والی تربیت سے اسسٹنٹ ایجوکیشن افسروں اور مڈل سکولوں کے ہیڈ

ماسٹر صاحبان کو روشناس کرانے کا کام مجھے سونپا گیا۔ میں نے کچھ سمعی و بصری اعانات تیار کرائے اور پرائمری تعلیم کی اہمیت کے بارے میں کچھ وضاحتوں کے لئے متعلقین کا اجلاس بلایا۔ اپنی طرف سے میں نے کوئی بات نہیں کی اسی طرح ننکانہ صاحب اور فیروزوالا تحصیل کے انچارجوں نے بھی اجلاس طلب کئے اور تحصیل شیخوپورہ کو ہدف تنقید بنایا گیا جب سے تحصیل شیخوپورہ نئے بااختیار ڈپٹی ڈی ای او تشریف لائے ہیں میٹنگوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ ان کو علم ہی نہیں کہ میٹنگوں سے سرکاری خزانے پر بوجھ پڑتا ہے اس طرح تو ملازمت میں قدم نہیں جمائے جاتے۔ اصل بنیادی فرض تو حاضر افسر کو خوش رکھنا ہے۔

تین چار ماہ کے اُلٹ پھیر ہی میں ہوا کا رخ میرے خلاف ہو گیا۔ شیخوپورہ میرے لئے نیا ضلع تھا۔ دفتر میں سوائے ایک دو کلرکوں کے کوئی پہلے سے شناسا نہ تھا لے دے کے تربیت جسمانی کے اے ای او چودھری بشیر احمد سے میری آشنائی تھی وہ کبھی کبھی اندرونی دفتری سیاست سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

بحیثیت ڈی ای او ساہی صاحب نے میرے بارے میں چھ ماہ کی کارگزاری کی جو رپورٹ مرتب کی، وہ یہ تھی:

☆ قاضی صاحب کام کے آدمی نہیں۔ ان کے تعلقات اونچے لوگوں سے ہیں۔

☆ قاضی صاحب مشہور ادیب ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس لئے ان میں زبردست انانیت پائی جاتی ہے اور دماغ آسمان پر رہتا ہے۔

☆ قاضی صاحب قلتِ دیانت کے مریض ہیں۔ دوروں پر جاتے ہیں تو اے ای او صاحبان اُن کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں۔ پرتکلف دسترخوان سجاتے ہیں۔ اور قاضی صاحب مرغ و ماہی اور بٹیر سے شوق فرماتے ہیں۔ اے ای او صاحبان میں اتنا دم خم کہاں کہ قاضی صاحب کو پلے سے پُرتکلف ضیافتیں کھلائیں۔ وہ اسکولوں پر دورہ ٹیکس لگاتے ہیں جس کی برکت سے قاضی صاحب کے لئے من وسلویٰ تیار ہوتا ہے۔

☆ قاضی صاحب نے پانچویں جماعت کے سالانہ امتحان کے لئے پرچوں کی طباعت اور جوابی کاپیوں کی فراہمی کی مد میں فی طالب علم ایک روپیہ وصول کیا۔ اس طرح انہوں نے ہزاروں روپے بٹور لیئے۔

☆ قاضی صاحب کے چپراسی کی اہلیہ سرطان کی مریضہ ہے۔ قاضی صاحب نے اس کے

علاج کے لئے فلاں فلاں ہیڈ ماسٹر صاحبان پر دباؤ ڈالا اور حکم دیا کہ ریڈ کراس کے فنڈ سے مریضہ کے لئے ادویات مہیا کرو۔

☆ موصوف اسکولوں کا دورہ کسی نہ کسی معلم یا صدر معلم کی موٹر سائیکل پر کرتے ہیں مگر جب خرچ کا بل دیتے ہیں تو تانگے کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔

☆ قاضی نے ناک کا اپریشن کرایا دس دن کی اتفاقیہ چھٹی کی درخواست دی جبکہ انہیں یہ چھٹی استحقاقی مد سے حاصل کرنی چاہیے تھی۔

☆ فلاں فلاں صدر معلمین سے قاضی صاحب کا بڑا گہرا یارانہ ہے معلوم نہیں کیوں؟ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

☆ ابھی قاضی صاحب کو اختیاراتِ تقرر بھی نہیں ملے تھے کہ انہوں نے نگاہِ لطف کے امیدوار استادوں سے تقررات کے بیعانے پہلے ہی وصول کر لئے ہیں۔

☆ فلاں فلاں ڈی ای او نے منظور شدہ اسامیوں سے ۱۰۰ افراد زیادہ بھرتی کئے تھے اور سات آٹھ لاکھ کا مال بنایا تھا۔ وہ شخص قاضی صاحب کے رابطے میں ہے۔ وہ دفتر آیا۔ قاضی صاحب سے ملا۔ موصوف نے اُسے پُرتکلف چائے پلائی...... قاضی صاحب نے ایسا کیوں کیا؟

☆ قاضی صاحب کو ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ درکار تھا۔ اس کی جستجو میں تین اے ای او صاحبان دن بھر پھرتے اور طرح طرح کے ہینڈ بیگ لاتے رہے۔ قاضی صاحب ناک چڑھاتے رہے۔ انہیں کوئی ہینڈ بیگ پسند نہیں آیا۔ ان کا ذوق تجمل بہت اونچا ہے۔

☆ موصوف نے اپنے بیٹے کی شادی چپکے سے کر دی۔ کسی کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ فلاں فلاں صدر معلم نے قاضی صاحب کو ایک من چاول بھیجے۔ اور فلاں صدر معلم نے ایک ڈبل چھپر کٹ اُدھار بنوا کر دیا۔

☆ قاضی صاحب نے فلاں فلاں سکول کا معائنہ کیا مگر کھانا ہرن مینار پر پکنک مناتے ہوئے کھایا۔

☆ موصوف نے اجنیاں والا کے قریب ایک اسکول کا اچانک معائنہ کیا۔ اول مدرس غیر حاضر تھا۔ قاضی صاحب نے نوٹس لیا۔ وہ گھبرا گیا۔ چھولیے کا نذرانہ لایا تو قاضی صاحب نے اُسے معاف کر دیا۔

☆ فلاں مدرس اینٹوں کے بھٹے کا ماہر ہے۔ قاضی صاحب اُس کے ساتھ گئے۔ بھٹے کا طریق کار دیکھا وہاں کھانا بھی کھایا اور ملحقہ سکول جنڈیالہ شیر خان کے فرضی معائنے کی لاگ بُک بھی لکھ آئے۔

یہ الزامات اپنی وضاحت خود ہیں۔ اور ساہی صاحب کے ذہن کی عکاسی کر رہے ہیں۔ کہنے کو تو یہ الزامات محض چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہی ننھی ننھی باتیں ہی دھیرے دھیرے اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اور رائی سے پہاڑ بنانے کے کام آتی ہیں۔

قاعدہ یہ تھا کہ کم ظرف حاشیہ نشین یہ ساری باتیں تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ نمک مرچ لگا کر ڈی ای او صاحب کے کان میں پھونکتے تھے اور قہقہے لگاتے تھے۔ اور ڈی ای او صاحب اپنے علم و فضل کے باوجود اُن کے آوارہ قہقہوں میں شامل ہو کر قلم و قرطاس کی معرفت اپنے ظرف کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کیا انہیں یہ زیبا تھا کہ جو کچھ اُن کے حاشیہ نشین حواری بتلائیں۔ وہ آنکھیں میچ کر اس پر یقین کرتے چلے جائیں اور حقائق کی تہ تک پہنچنے کی ذرہ بھر زحمت نہ فرمائیں۔ اس اعتبار سے میں اُنہیں نرم سے نرم لفظوں میں عالم بے عمل کہوں تو کیا یہ غلط ہوگا؟

بعد میں عیاں ہوا کہ میرے اس اعمال نامہ کی کئی نقول تیار کی گئیں جس میں سے یک ڈی پی آئی کو، ایک ڈائریکٹر لاہور ڈویژن کو اور ایک قائم مقام سیکرٹری تعلیم چودھری نذیر احمد کو مہیا کی گئیں۔

ایڈیشنل سیکرٹری کو قائم مقام سیکرٹری اس لئے کہا گیا ہے کہ سیکریٹریٹ کی سطح پر کچھ تبدیلیاں نمودار ہوئیں جن سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ احمد صادق صاحب کو تبدیل کر کے کسی اور محکمے کا سیکرٹری لگا دیا گیا جبکہ ان کی جگہ مہر جیون خان سیکرٹری تعلیم تعینات ہوئے۔ انہیں حکومت نے مختصر عرصے کی تربیت پر بیرون ملک بھیج دیا اور ان کی جگہ کسی سیکرٹری کے تقرر کے بجائے ایڈیشنل سیکرٹری کو قائم مقام سیکرٹری بنا دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں سابق سیکرٹری تعلیم کے مشیروں نے سیکرٹریٹ سے اپنا بوریا بستر گول کیا اور اپنی اسامیوں پر چلے گئے۔ الف نون کے خرچ شدہ پانچ ہزار روپوں نے میرے گرد جو دفاعی حصار تعمیر کر رکھا تھا اب وہ بھی گر چکا تھا۔ 'لوت' اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ میری تاک میں تھی۔

◆◆◆◆◆

(۴۳)

قبل از وقت ریٹائرمنٹ

۸ جولائی ۱۹۸۶ء کو میں معمول کے مطابق دفتر پہنچا تو وہاں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ مسز ذکیہ باسط، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر (زنانہ) اور مجھے قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ مسز ذکیہ باسط کے تو احکام آ چکے جبکہ میرے احکام پہنچنے والے ہیں۔ ساہی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے میں فوراً واپس ڈائریکٹوریٹ پہنچا اور اپنے دوست حمید اللہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کا کمرہ بند کیوں ہے۔ اور وہ کہاں ہیں؟ حمید اللہ نے جو جواب دیا اس نے مجھے بھونچکا کر دیا کیوں کہ میں اس سے ایسے جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا میں تو اس سے اس خبر کی تصدیق کا طلب گار تھا جو میں شیخوپورہ سے سن کر آیا تھا۔ اس نے کہا ''وہ جناب کے کاغذات کی تکمیل کے لئے شیخوپورہ تشریف لے گئے ہیں۔ کتنے دن ہو گئے آپ کو لکھا گیا تھا کہ یہ تصدیق نامہ، اکاؤنٹس افسر شیخوپورہ سے لے کر بھیجیں کہ آپ کی سروس پچیس سال ہو چکی ہے یا نہیں؟ لیکن آپ نے کوئی پروا نہیں کی۔ آپ کو وہ چٹھی تو مل ہی گئی ہو گی جو میں نے اپنے چپڑاسی محمد اشرف کے ذریعے آپ کو بھیجی ہے؟''

حمید اللہ کا خیال تھا کہ میں گھر ہی سے اس کے پاس دفتر آیا ہوں۔ میں نے چٹھی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسی چٹھی تھی؟ تو اس نے سرد مہری سے کہا ''آپ کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی''...... میں افسردہ ہو گیا۔ حمید اللہ کے لہجے میں تھوڑی سی نرمی آئی۔ اس نے بتایا کہ پائلٹ ہائی سکول وحدت کالونی کے ہیڈ ماسٹر چودھری حفیظ الہ کو ضلع سیالکوٹ کا ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر تعینات کیا گیا تھا وہ لاہور سے تبادلے کے خلاف درخواستیں بھیج رہا ہے جبکہ اس کو بھی ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ وہ تھا بھی میاں شریف کا بڑا چہیتا۔ میاں شریف نے ہی اس کی

فائل میرے سپرد کر رکھی ہے۔'' میں نے حمید اللہ سے کہا کہ جب میری قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے احکام جاری ہو ہی چکے ہیں تو اب یہ تصدیق حاصل کرنے سے کیا فائدہ کہ میری سروس پچیس سال ہو چکی ہے یا نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میاں شریف کو اپنا کھاتہ بھی تو پورا کرنا ہے یا نہیں!'' ...... میں نے زہر خند کے ساتھ کہا'' کرو بھائی! کھاتے پورے کرو!!''

خبر سچ نکلی میں تھوڑا سا چکرایا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور متعلقہ افسر کو تلاش کیا۔ احکام کی ایک نقل حاصل کی۔

قائم مقام سیکرٹری تعلیم کی طرف سے حکم نمبر ایس او (ایس ای) ا۔۸۴/۱۰ مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۸۶ء آج ہی جاری ہوا تھا۔ یہ حکم قسط نمبر دو تھا جبکہ اسی نمبر ایک کا ایک حکم نامہ یکم جولائی ۱۹۸۶ء کو جاری ہو چکا تھا۔ اُس میں مسز ذکیہ باسط کا نام تھا۔ اس حکم میں میرا نام آٹھویں نمبر پر تھا۔ کل افراد کی تعداد ۱۴ تھی۔ مختصر حکم نامے میں لکھا تھا کہ درج ذیل گریڈ ۱۷ کے محکمہ تعلیم کے افسروں نے اپنی خدمات کے ۲۵ سال پورے کر لئے ہیں اس بناء پر وہ پنشن اور دیگر تمام مفادات کے اہل ہیں۔ ان کو فوری طور پر ملازمت سے جملہ پنشن مفادات کے ساتھ ریٹائر کیا جاتا ہے۔

مجھے چودھری الف دین اور ساہی صاحب کے علاوہ کئی افراد نے میاں شریف سے مل لینے کو کہا تھا تو غالباً انہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ خود اس قدر محتاط تھے کہ انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میرا میاں شریف سے ملنا کیوں ضروری ہے؟ ممکن ہے وہ بھی اصل بات نہ جانتے ہوں۔ مجھے ویسے ہی سمجھاتے ہوں کہ محکمے کے چیف سے بنا کر رکھنے ہی میں میری بہتری ہے۔

میاں شریف نے قائمقام سیکرٹری تعلیم اور بعض روایات کے مطابق نومسلم وزیر تعلیم چودھری ممتاز حسین سے مل کر جن افراد کو رگڑا دیا تھا ان سب سے وہ ذاتی طور پر ناراض تھے۔ ان میں سے بعض میاں شریف کے آگے پیچھے رہنے والے لوگ بھی تھے۔

چودھری الف دین کی بات اکثر مجھے یاد آتی رہی شاید انہیں یہ خبر تھی کہ میں میاں شریف کی تیغِ انتقام کی زد میں آنے والا ہوں۔ دوسرے محکمہ جات میں بھی ایک آدھ سبکدوشی ہوئی تھی لیکن محکمہ تعلیم میں ۱۳۴ افسران کو برطرف کیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ کہیں کہ ان کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ قصور وار دھاندلیاں کرنے والے تو ابھی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے لیکن ذرائع

ابلاغ قبل از وقت ریٹائر کئے جانے والوں کو راشی اور بددیانت قرار دے رہے تھے۔

میں نے خاموشی سے ۳۶۵ دن کی رخصت قبل از ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی کیونکہ حکم میں درج تھا کہ ہم چاہیں تو پنشن پر جانے والے عام قانون کے تحت سال بھر کی قبل از ریٹائرمنٹ کے رخصت لے سکتے ہیں یا چھ ماہ کی یکمشت تنخواہ!...... پھر اس پوچھ گچھ سے بچنے کے لئے "کیا ہوا اور کیوں ہوا" میں خاموشی سے اپنے گاؤں بھائی کے پاس چلا گیا۔ یہ مشورہ میرے برادر نسبتی نے بندروں کی مثال دیتے ہوئے دیا تھا۔

مثال یہ تھی کہ اگر کوئی بندر زخمی ہو جائے تو وہ اپنے زخم کو دوسرے بندروں سے چھپاتا ہے لیکن اگر زخم ایسا ہو کہ چھپایا نہ جا سکے یا بندر اپنی روائتی بے وقوفی کی وجہ سے کسی دوسرے بندر کو دکھا دے تو پھر باری باری تمام بندر اس کا زخم اظہار ہمدردی کے طور پر دیکھتے ہیں اور زخم کھول کھول کر دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب معمولی زخم پھیل کر ناسور بن جاتا ہے اور پھر زخمی بندر اپنے بھائیوں کی مہربانی سے موت کے گھاٹ اتر کر کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔

گو میں اشرف المخلوقات سے تعلق رکھتا تھا لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ اسی طبقے میں کچھ لوگ بندروں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں' کچھ کیڑے مکوڑے اور کچھ گندگی سمیٹنے والے جانوروں جیسے بھی ہیں! بلکہ بعض کا شجرہ نسب تو درندوں سے جا ملتا ہے۔

☆☆

یہ خبر ایسی تھی کہ میرے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی وہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ مڈل سکول کی گراؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے ان میں سے ہماری برادری کے بچے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے اور میری بیٹی کو آتے دیکھا تو بھاگے' ہماری برادری کی اپنی گلی ہے۔ جب ہم گلی میں داخل ہوئے تو خلاف معمول سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا اسی وقت طاری ہوا کرتا تھا جب گلی کے کسی گھر میں کوئی مرگ ہو جاتی تھی۔

میری بیٹی بی اے کا امتحان دے چکی تھی۔ اسے بھی ان دنوں نفسیاتی کہانیاں لکھنے کا خبط تھا۔ تین چار دن کے اس افسردہ قیام پر اس نے ایک افسانہ 'سناٹے' کے عنوان سے لکھا۔ میں اس افسانے کے چند اقتباسات اپنی لاڈلی کی زبان میں بیان کرتا ہوں۔ ان میں میری اور گاؤں کی حالت کی عکاسی کی گئی ہے۔

""گلی میں پراسرار سناٹا ہے۔ بس منڈیروں پر کوؤں کی کائیں کائیں یا بچوں کی دبی دبی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ چچی بھی بچوں کو نہیں ڈانٹ رہی' نہ ہی کوئی ٹیپ لگائی ہے۔ دوسرے چچا کے آنگن سے بھی کوئی گھن گرج نہیں سنائی دیتی۔ عم زادوں کے قہقہے بھی فضا میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر رہے۔ درمیان والے خالی مکان میں نل کے قریب ٹھنڈی جگہ پر کتا اپنی تھوتھنی ٹھنڈی مٹی پر رکھے سو رہا ہے اور برآمدے میں کھردری چارپائی پر پائنتی کی جانب تکیہ رکھے ابو کوئی رسالہ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی وہ پڑھتے پڑھتے ٹوتھ پک سے دانتوں میں خلال کرنے لگتے ہیں اور کبھی بند نتھنوں کو کھجانے لگتے ہیں۔ کبھی عینک اتار کر آنکھوں کا پانی پونچھتے ہیں۔ پھر پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں کہ میں دیر سے کھڑکی کے پاس بیٹھی ماحول کو بالعموم اور ان کا بالخصوص جائزہ لے رہی ہوں اور ان کی حالت دیکھ کر کئی نفسیاتی اصطلاحیں میرے ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔

""ابو کیا آپ اپنے آپ کو پرسکون نہیں رکھ سکتے ...... آخر کیا ہو گیا ہے؟"" ابو مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں ...... ""شہر سے اسی لیے گاؤں آ گیا ہوں تاکہ سکون کا سانس لے سکوں۔""

""یہاں کیا خاک سکون ملے گا؟ ...... یہ خاموشی اور سناٹا ...... یہ آپ کے بھائیوں کے گھروں میں بے سبب خاموشی ...... کیا یہ سب آپ کو اس بات کا احساس نہیں دلا رہے کہ ان لوگوں کی افسردگی کا تعلق آپ کی ذات سے ہے ...... بڑے' بچوں کو بولنے تک نہیں دے رہے کہ تایا جان محسوس کریں گے ...... آپ بھی تو بس اپنے اوپر قنوطیت طاری کئے پڑے ہیں ...... آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ

ع ...... افسردہ دل افسردہ می کند انجمنے را""

...... میں ابھی کچھ اور کہنے والی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹوک کر کہا۔

""میں تمہیں یہاں آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے لایا تھا ...... میرے بجائے تم سب کو سمجھاؤ کہ کوئی بات نہیں آخر میرے ابو کو ریٹائر ہونا ہی تھا۔ دو سال پہلے کیا اور دو سال بعد کیا ......""

""سمجھایا تھا ......""

""پھر انہوں نے کیا کہا؟""

""کہتے تھے وہ تو ٹھیک ہے ...... ازخود ریٹائرمنٹ لے لیتے تو اور بات تھی اب تو جبراً

ریٹائر ہوئے ہیں نا..... اخبارات میں یہ خبر بھی چھپ گئی ہے برادری تو یہی سمجھتی ہے نا کہ نجانے بھائی صاحب نے کیا گُل کھلایا ہے؟..... کتنی لوٹ مچائی ہے کہ حکومت نے ان کو جبراً ریٹائر کر دیا ہے؟''

''جب میرے بھائی یہ کہتے ہیں کہ تو غیروں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے..... تمہاری ماں بھی تو کہتی تھی کہ مجھے ڈھنگ سے نوکری کرنی ہی نہیں آئی..... ساری نوکری لڑتے جھگڑتے گزار دی۔ اب بیٹھے کبھی ناک صاف کرتے ہیں کبھی شوگر چیک کرتے ہیں..... لیکن اب میرے خیالوں کا رخ دوسری طرف ہے۔ میں کسی اور وجہ سے دکھی ہوں اور میرا خیال ہے کہ صرف تم ہی مجھے سمجھ سکتی ہو.....''

ابو نے جن بولتی نظروں سے مجھے دیکھا ان سے میں سب کچھ جان گئی اور اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتی۔ طبیعت پر اُداسی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ابو یک دم ہنس پڑے ..... ''ارے میری لاڈلی..... اتنی بھی حساس نہ بنو..... حساس انسان ساری عمر دکھی رہتا ہے..... میں علم و ادب کا آدمی تھا میں نے حفظِ خودی کا سبق اقبالؒ سے پڑھا اور فارسی ادب سے عجز و انکسار سیکھا۔ مجبوریوں میں غیرتوں کے چراغ جلانا بڑا مشکل کام ہے..... تمہیں فلسفہ و نفسیات کی تعلیم اس لئے دلائی ہے کہ تم زندگی کے حقائق سے آگاہ ہو جاؤ..... چلو..... رونا بند کرو سرنج لاؤ..... میرا ایک قطرہ خون نکالو اور شوگر جانچو.....''

''مجھ سے خون نہیں نکالا جاتا.....''

یہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے آج کل تو عورتیں بڑے بڑے اپریشن کر رہی ہیں اور تم خون کی ایک بوند نہیں نکال سکتیں..... وہ بھی طبی مقصد کے لئے.....''

''آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں تو شوگر بالکل ختم ہو جائے گی۔'' میں نے بات بڑھانے کے لئے کہا ''میری بیٹی میں پریشان نہیں ہوں..... اگر پریشان ہوتا تو میرا حال یا تو چچا فاروقی کی طرح ہوتا جو کچھ دنوں کے لیے حواس ہی کھو بیٹھے ہیں یا پھر میرا حال جسٹس کیانی کی طرح ہوتا کہ جس دن ریٹائر ہوئے اسی دن زندگی سے بھی ریٹائر ہو کر اگلے جہان کا ٹکٹ کٹوا لیا۔

ابو محکمہ تعلیم میں گریڈ سترہ کے افسر تھے ان کی تحریر کردہ کتب میں سے کئی کتب لائبریری کتب کی منظور شدہ فہرست پر تھیں اور کئی وقت کی مشہور کتب تھیں۔ دو چار سال پہلے تک ابو

مختلف رسائل میں لکھتے رہے تھے ادبی حلقوں میں ایک مخصوص مقام حاصل تھا۔ طبعی لحاظ سے وہ عجز وانکسار کا پیکر تھے لیکن اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کی خاطر وہ خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے تھے۔ وہ اچھی خاصی قوت برداشت کے حامل تھے لیکن بسا اوقات وہ بے رحم سچ بولتے تھے۔ عزیز واقارب تو کجا خود ہماری امی بھی ان سے ناراض ہو جاتی تھیں۔ بھائی بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ سروس میں بھی کبھی حق گوئی سے نہیں چوکے۔ بعض افسروں کے نزدیک ان کا یہ وصف نہایت پسندیدہ تھا اور وہ اعتراف کرتے تھے کہ قاضی صاحب کھرے اور سچے انسان ہیں۔ وہ تعلیم کو سیاست نہیں عبادت سمجھتے تھے۔ ان کی یہی خوبی محکمہ کے کرتا دھرتا کے لئے سب سے بڑی برائی تھی۔

ابو صرف سرکاری ملازم ہوتے تو شاید ان کی شخصیت کچھ اور ہوتی لیکن ادب اور وسعتِ مطالعہ کے باعث وہ شاہراہِ عام کے مسافر نہیں ہیں۔ حقائق کو کسوٹی پر جانچنے کے عادی ہیں۔ میں ان کی تحریروں کی دلدادہ ہوں۔ وہ خوش کلام انسان ہیں توازن ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ وہ باتیں کرتے ہیں تو ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں دلربائی، علم کی گہرائی اور تجربے کی روشنی ملتی ہے۔

وہ میرے لئے پریشان تھے۔ جن لوگوں کے ہاں میری بات چل رہی تھی انہوں نے ابو کی ریٹائرمنٹ پر افسوس تو ضرور کیا مگر پھر نہیں آئے...... امی کے خون کا دباؤ معمول سے بڑھ کر دوگنا ہو گیا۔ ان کے خیال میں ہم بہنوں اور بھائیوں کا مستقبل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ سروس کے کئی معاملات ابھی طے کرنے باقی تھے مکان کے قرضوں کی قسطیں بھی باقی تھیں...... ایک چچا چھ بچے اور بیوہ چھوڑ کر دو سال قبل اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ سال ہوا دوسرے چچا کو فالج ہو گیا تھا اور ابو نے ان کے بال وبچوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی تھی۔ وہ انہیں ترجیح دیتے اور اپنی گھریلو ضروریات کی نسبت ان کا زیادہ خیال رکھتے تھے وہ ایک وضع دار انسان کی طرح یہ تمام ذمہ داریاں نبھا رہے تھے...... کہ اچانک سبکدوشی کی افتاد آن پڑی۔ ابو کا ایمان ڈوبنے ڈولنے لگا۔ وہ کہتے کہ چلو انسان بے خبر ہے لیکن اللہ تو جانتا ہے۔ اس پر سارے ظاہری اور باطنی بھید عیاں ہیں۔ پھر کیا ہوا کہ یکا یک زمانے کی نظروں سے گرا دیا۔ پھر وہ خود ہی کہتے کہ شاید یہ مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے۔ میں نے انہیں بسم اللہ الرحمٰن الرحم کی تفسیر پر ایک کتابچہ پڑھنے کو دیا تو انہوں نے کہا بیٹی...... تم نے میرے ایمان کو متزلزل ہونے سے بچا لیا......''

میں نے عرض کیا ''اللہ نے فضل فرمایا ہے..... اللہ نے بچایا ہے'' پھر انہوں نے ایک دن مجھے پاس بٹھا کر کہا..... بیٹا..... تمہارا دیا ہوا کتابچہ میں نے بار بار پڑھا ہے اور ہر بار میرا ایمان مضبوط تر ہوا ہے لیکن ابھی کچھ کسر ہے میں بے سکونی محسوس کرتا ہوں۔ تمہاری طبیعت بھی عید کے بعد سے ٹھیک نظر نہیں آ رہی..... چلو گاؤں چلتے ہیں وہاں چند دن آرام کریں گے..... '' مجھے معلوم تھا کہ ابو گاؤں آ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اسی لیے میں ان کے ساتھ گاؤں آ گئی۔ لیکن اب کے گاؤں کی حالت ایسی تھی جیسے بہار میں خزاں آ جائے۔ کوئی عزیز مر جائے تو عزیز رشتہ دار نہ چاہتے ہوئے بھی سر پر افسردگی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں اور مرحوم کے اٹھ جانے پر اپنے قلق کا اظہار کرتے ہیں اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں ویسا ہی حزن و ملال ابو کی ریٹائرمنٹ پر سب نے اوڑھ لیا۔ وہ ابو کو یقین دلا رہے تھے کہ ان کی ریٹائرمنٹ پر سب افسردہ ہیں۔ یوں ایک ماتمی سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ابو کی طبیعت مائل بہ گداز ہے گداز کی یہ کیفیت اپنے آپ پر رحم کھانے کے مترادف ہوتی ہے جیسے کسی انسان پر بے پناہ ظلم کیا گیا ہو اور اس سفاکی کو یاد کرتے کرتے انسان اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا ہو..... نفسیات میں اسے خود ترسی (Depression) کہا جاتا ہے۔

ابو نے مجھ سے کیلکولیٹر مانگا۔ میں نے کہا کیلکولیٹر نہیں لائی۔ میں سمجھ گئی کہ ابو اب پھر سے پنشن، گریجوئٹی اور جی پی فنڈ کا حساب لگانے والے ہیں اور دل کو تسلی دینے لگے ہیں کہ اگر ریٹائرمنٹ دو سال قبل ہو گئی ہے تو اس سے کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ اگر وہ دو سال بعد ریٹائر ہوتے تو پنشن بھی کم ہوتی اور تب تک نہ جانے روپے کی قیمت کتنی گر جاتی اور اس وقت جو رقم ملتی وہ اصل قیمت کے لحاظ سے آج کی نسبت کافی کم ہوتی..... میں نے ابو سے کہا:

''ابو! آپ بار بار اسی ایک موضوع پر کیوں سوچتے ہیں؟''

''ہاں مجھے نہیں سوچنا چاہیے..... لیکن اور سوچا بھی کیا جائے..... میں سوچنے پر مجبور ہوں کیونکہ میرے ساتھ صریحاً زیادتی ہوئی ہے''

ابو! چچا غالب فرما گئے ہیں:

ع..... قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں!

زیادتیاں تو زندگی کا حصہ ہیں..... ابھی وہ معاشرہ وجود میں نہیں آیا جو بے حسی، ستم اور سفاکی سے پاک ہو جس میں کسی انسان سے زیادتی نہ ہو کسی کی ہنستی بستی دنیا نہ اجاڑی جائے اور کسی کی

آنکھوں سے آنسو نہ چھلک جائیں۔

''بس اب زندگی کے روز و شب بدل گئے ہیں۔ پہلے میں صبح اٹھتا تھا۔ سیر کو جاتا تھا۔ نماز پڑھتا تھا...... کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ بس مزے سے ناشتہ کیا اور دفتر کی راہ پکڑی۔ لیکن اب ...... اب تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی کی ہر رونق چھین لی گئی ہے جیسے کوئی مصروفیت ہی نہیں ہے...... حالانکہ مصروفیت کو نعمت قرار دیا گیا ہے......

''ابو یاد کیجئے...... جب آپ ملازمت پر فائز تھے تو آپ کہا کرتے تھے کہ ہر وقت ذہن الجھا رہتا ہے۔ سر پر سرکاری کاموں کا بوجھ سوار رہتا ہے...... ستانے کا موقع ہی نہیں ملتا...... آپ (Relaxation) پر زور دیا کرتے تھے...... اور اب آپ مصروفیت پر زور دینے لگے ہیں...... ابھی تو فراغت کے چند ہی دن نصیب ہوئے ہیں...... بہت کام پڑے ہیں دھیرے دھیرے کرتے رہیے گا!''

''ہاں واقعی کام تو بہت پڑے ہیں مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں ریلیکس سنگھ ہی نہ ہو جاؤں...... اور وہ خود ہی ہنس پڑے انہیں ''ریلیکس سنگ (Relaxing) والا لطیفہ یاد آ گیا...... مجھے بھی ہنسی آگئی اچانک چچی جان آ گئیں۔ انہوں نے ہمیں ہنستا دیکھ کر پوچھا۔

''باپ بیٹی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔''

ابو نے چچی کو بتایا کہ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ چچی نے کہا: ''بھائی صاحب ہمیں بھی سنایئے۔''

ابو نے بتایا کہ ایک سردار صاحب (سکھ) تھے دھوپ میں ستا رہے تھے۔ انہیں انگریزی واجبی سی آتی تھی۔ کوئی انگریز ان کے قریب سے گزرا تو کہنے لگا ''اوہ! ریلیکسنگ؟'' (ارے واہ! کیا ستا رہے ہو؟) سردار صاحب نے جواب دیا ''نو...... بوٹا سنگھ'' چچی جان کے پیچھے ان کی بیٹیاں بھی آ کھڑی ہوئیں تھیں اس لطیفے پر سبھی ہنس پڑے۔ ابو ارادہ کر چکے تھے کہ اب واپس لاہور چلنا چاہیے دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ساتھی کیا کر رہے ہیں۔

☆☆

لاہور پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ متاثرہ افسروں نے ایک اجلاس بلا رکھا ہے۔ سب لوگ سیکرٹریٹ کے سامنے صبح آٹھ بجے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ میں بھی پہنچ گیا۔ چودھری حفیظ اللہ اور نثار زیدی کے سوا باقی سب ساتھیوں سے متعارف ہوا۔ اٹھارہ حضرات تشریف لائے تھے

باقیوں نے سبکدوشی قبول کر لی تھی۔ ویسے بھی ان کے سال دو سال ہی باقی تھے۔ میرے بھی دو سال باقی تھے۔ مجھے اپنی تاریخ پیدائش کے مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ء کو ریٹائر ہو جانا تھا۔

اخباری بیانات میں وزیر تعلیم نے کہا کہ ابھی ہم نے صرف سترہ گریڈ کے افسروں کی چھانٹی کی ہے۔ اعلیٰ گریڈ والوں کی چھان پھٹک بھی جلد ہی کر رہے ہیں۔ سترہ گریڈ کے جو افسر سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی زیادتی ہوئی ہے تو ان کے لئے عدالتوں کے دروازے کھلے ہیں۔ سیاسی آدمیوں کو تو صرف بیان دینا ہی آتا ہے۔ قانون کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہو بھی تو وہ سوچ سمجھ کر بیان نہیں دیتے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ہمارے لئے عدالتوں کے دروازے بند تھے۔ صرف پنجاب سروس ٹربیونل کا دروازہ ہی کھلا تھا۔ اور وہاں اپیل کرنے کی گنجائش تب ہی نکل سکتی تھی کہ پہلے چارج چھوڑا جائے اور اپنے آپ کو سبکدوش تسلیم کیا جائے۔ عدالتوں سے حکم امتناعی لے آنے کا طریقہ پنجاب سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۷۴ء کی روشنی میں ختم ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اور بعد کو دیگر احباب نے سبکدوشی کے حکم کے اجراء کی تاریخ کے ایک ماہ کے اندر اندر پنجاب سروس ٹربیونل میں اپیلیں دائر کیں۔ جن کو باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کر لیا گیا۔ لیکن مزید کارروائی کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد پنجاب سروس ٹربیونل کے چیئرمین جسٹس (ر) عبدالجبار خان اپنے اس عہدے سے ریٹائر ہونے والے تھے۔

☆☆

قبل از وقت سبکدوشی کے بعد غیر رسمی تعلیم کا نیا دور شروع ہوا پہلے میں اساتذہ کرام کی انجمنوں کی بھرمار سے خائف رہتا تھا لیکن اب سبکدوشی کے بعد مجھے اس انجمن کا سیکرٹری بننا پڑا جس کا نام ہم نے ''قبل از وقت سبکدوش کئے جانے والے محکمہ تعلیم کے افسروں کی انجمن'' رکھا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ پھر بھی میں نے انجمن مذکورہ کا بڑا سا 'پیڈ' چھپوایا۔ حقائق پر مبنی مراسلہ لکھا میاں شریف ڈی پی آئی سکولز محکمہ تعلیم پنجاب اور قائمقام سیکرٹری تعلیم چودھری نذیر احمد کے بارے میں شکایت کی کہ انہوں نے ہماری ملازمت کا ریکارڈ نہیں دیکھا اور ہمیں ناجائز طور پر فارغ کر دیا۔ جو کچھ ہوا ہے محض ذاتی وجوہ کی بنا پر ہوا ہے قائم مقام سیکرٹری تعلیم کو ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ انہوں نے یہ سب کچھ ڈی پی آئی

سکولز کے کہنے پر کیا ہے تاکہ وہ وزیر اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ اپنی معروضات پر مبنی مراسلہ اخبارات کے علاوہ ہم نے پنجاب کے گورنر سجاد حسین، وزیر اعلیٰ نواز شریف وزیر تعلیم ممتاز حسین، چیف سیکرٹری انور زاہد، سیکرٹری تعلیم مہر جیون اور صوبائی اسمبلی کے اراکین کو بھیج دیا تاکہ وہ ہماری دادرسی فرمائیں میاں شریف ڈی پی آئی سکولز نے ہمارے مراسلے کے جواب میں ایک سفارشی افسر سے کہا کہ ہم ریٹائر کر سکتے تھے، سو کر دیا۔ آپ لوگ مجاز ذریعے سے واپس آجائیں تو ہمیں آپ کی بحالی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

☆☆

ہم نے سول سرونٹس ایکٹ کا جائزہ لیا اور اپنے مراسلے میں لکھا کہ یہ قانون 'بھٹوازم' کا آئینہ دار ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے ۱۹۷۳ء میں وفاقی سرکاری ملازمین اور حکومت پنجاب کے ملازمین کے لئے یہ قانون ۱۹۷۴ء میں تیار کیا۔ ۲۵ سالہ سروس کی بنیاد پر مراعات کے ساتھ ریٹائر کرنے کی شق مذکورہ ایکٹ میں وفاقی ملازمین کے لئے ۱۳ (ii) ہے۔ ریٹائر کیے جانے والے افراد کو ریٹائر کرنے والے حکام سے بڑے حاکم کے پاس زیر دفعہ ۲۲ اپیل کا حق دیا گیا ہے اور حاکم اپیل کا فیصلہ نوے دن میں کر دینے کا پابند بنایا گیا ہے۔

اپیل کا یہ حق صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ امکان پورے طور پر موجود تھا کہ بعض فراعنہ صفت بااختیار افسر محض ذاتی ناراضی پر ماتحتوں کی چھانٹی کر دیں گے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے بعد اس قانون کے تحت جو آخری کارروائی کی گئی اس کے لئے محکمہ سروس اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن پنجاب نے ۴ ردسمبر ۱۹۷۹ء کو چٹھی نمبر ۸/۷/۴۔۱۴ (ایس) ایس۔ ایس جاری کی اور اس میں ایسی کارروائی کے لیے کچھ راہنما اصول مقرر کیے۔ کچھ ہدایات دیں پھر ان ہدایات کا اعادہ چیف سیکرٹری پنجاب نے کیا۔ چنانچہ اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ جن افسروں نے اپنی جبری سبکدوشی کے خلاف اپیلیں دائر کیں ان کو جائزہ کمیٹیوں نے بحال کر دیا۔

جس زمانے میں ہمیں سبکدوش کیا گیا ان دنوں چیف سیکرٹری کی طرف سے آخری چٹھی ۱۵ رجولائی ۸۲ء کو جاری ہوئی تھی۔ اس کا تعلق گریڈ ایک سے سترہ تک کے ملازمین سے تھا۔ اسی چٹھی میں جو اصول وضع کئے گئے وہ یہ تھے۔

ا)..... نظر ثانی برائے ریٹائرمنٹ سالانہ خفیہ رپورٹوں کی روشنی میں ہوگی۔ اور گزشتہ دس سال کی خفیہ رپورٹوں کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

۲)......۲۵ سال کے بعد ملازمت میں رکھنے کا مجموعی معیار اور جواز تسلی بخش ریکارڈ ہو گا۔
۳)......نظر ثانی کرتے وقت افسر کی کارکردگی اور دیانتداری کو مدنظر رکھا جائے گا۔

چٹھی میں نظر ثانی کی کمیٹیاں تشکیل دینے کو کہا گیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اگر کسی ملازم کے خلاف ''بدعنوانی اور شہرت کی بنیاد'' موجود نہیں ہے تو ملازم کو پوری پنشن اور جملہ مفادات کے تحت ریٹائر کیا جائے۔

قائم مقام سیکرٹری تعلیم نے ۸ اور ۲۵ر جون' ۷ اور ۸ر جولائی ۱۹۸۶ء کو ایک پروفیسر' چار ٹیکنکل ایجوکیشن کے انسٹرکٹرز اور سکولز کیڈر کے ۲۹ افسروں کو پوری پنشن اور تمام مراعات کے تحت ریٹائر کیا۔ اسی فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریٹائر ہونے والے افسروں کے خلاف بدعنوانی کا کوئی الزام نہیں تھا۔

☆☆

ریٹائرمنٹ کے احکام میں لکھا تھا کہ جن افسروں کو قبل از وقت ریٹائر کیا گیا ہے وہ دراصل 'مفاد عامہ' میں ریٹائر کیے گئے ہیں۔ مفاد عامہ کی اصطلاح ایک وسیع اصطلاح ہے۔ اسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ملتان کے ایک افسر کو جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے مفاد عامہ کے تحت ۲۴ر جون ۸۶ء کو ریٹائر کیا گیا اور ۲۶ر جون ہی کی دوسری چٹھی سے اس کا نام ریٹائر ہونے والوں کی فہرست سے حکماً حذف کر دیا گیا۔ متذکرہ شخص کی اہلیت یہ تھی کہ وہ سیاسی اثر ورسوخ کا مالک تھا اور اسے سیکرٹریٹ میں ایک اجلاس کے دوران پتا چل گیا تھا کہ اسے ریٹائر کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے اثر ورسوخ سے فہرست سے اپنا نام اسی روز کٹوا لیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مفاد عامہ صرف ایک دن میں بدل گیا تھا؟

دراصل یہ کوئی خصوصی نوعیت کا شوشہ نہ تھا۔ صرف انتظامی پالیسی کا معاملہ تھا جسے قائم مقام سیکرٹری تعلیم اور ڈی پی آئی سکولز نے محض وزیر اعلیٰ پنجاب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بے رحمی سے چھوڑا تھا۔ کسی افسر کی سابق خدمات کا کوئی ریکارڈ نہیں دیکھا گیا جبکہ ۷ر مئی ۱۹۸۳ کو وفاقی شرعی عدالت سول سرونٹس ایکٹ کی دفعہ ۱۳(i) اور ۱۳(ii) کے خلاف فیصلہ دے چکی تھی۔ اس فیصلے میں وفاقی شرعی عدالت نے کچھ وضاحتیں بھی کی تھیں اور سب سے اہم بات یہ کہی تھی کہ سول سرونٹ ایکٹ کی متذکرہ دفعات اسلام کے احکام سے متصادم ہیں۔ ان کی روشنی میں اگر سرکاری افسران اعلیٰ اپنے ماتحتوں سے ہمدردی رکھتے اور انصاف کے

تقاضوں پر آنچ نہ آنے دیتے تو وزیر اعلیٰ کو صائب مشورے دے سکتے تھے۔

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے چند نکات

............سرکاری ملازمین کے قوانین شرعی عدالت کی نظر میں...... (فیصلہ) نظام حکومت کے بارے میں قرآن وسنت اور اسلامی فقہ نے کچھ بنیادی اصول متعین کرنے کے بعد تفصیلات اور جزئیات طے کرنے کا مسئلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وقت کے احوال وظروف کے مطابق تفصیلات طے کرلیں اور سرکاری ملازمین کے قوانین کا تعلق بھی حکومت سے ہے۔

نیم سرکاری اداروں کے ملازمین

............سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین میں فرق...... (فیصلہ): سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین کے درمیان فرق کتاب وسنت کے خلاف ہے۔

سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۷۴ء

............دفعہ ۱۳ (i) (ii) ۶۰ سال کی عمر سے قبل ریٹائر کرنے کی شق...... (فیصلہ): دفعہ ۱۳ (i) (ii) کتاب وسنت سے متصادم ہیں اس لیے انہیں کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

آجر اور اجیر

............آجر اور اجیر کے تعلقات اور ملازمین کے لئے قانونِ تحفظات...... (فیصلہ): اسلام نے آجر واجیر کا مسئلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا ہے جو اپنے دور کی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے جو طریقہ کار اختیار کرنا چاہیں کریں اسلام اس راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

آجر اور اجیر

ملازمین......اور شرائط ملازمت کا تعین (فیصلہ) ملازمت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ مدت ملازمت' متعلقہ امور اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں آجر (Employer) اور اجیر (Employee) کے درمیان جو شرائط بھی طے ہو جائیں' فریقین پر ان کی پابندی لازم ہوتی ہے' آجر کو اس بات کا بھی اختیار ہے کہ وہ مختلف افراد سے مختلف شرائط (Terms and Conditions) طے کرے' اور جب تک یہ شرائط باہمی رضامندی سے طے شدہ رہیں' اور ان میں بذات خود کوئی ناجائز بات شامل نہ ہو' وہ فریقین کے لئے پابندی کے قابل سمجھی جاتی ہیں' ان شرائط کے

مطابق کسی کارروائی کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

مدت ملازمت

فریقین کو اختیار ہے کہ وہ ملازمت کے لئے مدت جتنی چاہیں مقرر کر لیں اور اس مقررہ مدت کے بعد ملازمت سے علیحدگی کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اظہار وجوہ کا موقع دینا

اس اصول کا اطلاق اس جگہ ہوسکتا ہے جہاں کسی شخص کے خلاف کوئی ایسا فیصلہ سنانا ہو جس کے ذریعے (i) یا تو وہ مجرم ثابت ہوتا ہو (ii) یا اس کے ذمہ کوئی قانونی حق عائد ہوتا ہو (iii) یا اسے کسی قانونی حق سے محروم کیا جارہا ہو۔

سول سرونٹس ایکٹ (۱۹۷۴)

دفعہ ۱۳ (i) (ii) کسی ملازم کو ۶۰ سال کی عمر سے پہلے ملازمت سے ریٹائر کرنا ......(فیصلہ): کسی ملازم کو ریٹائر کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ اسے کسی جرم کا مجرم یا اس کے منصب کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے (مزید فیصلہ) ریٹائر کرنے سے ملازم سے کوئی حق نہیں چھینا گیا بلکہ وہ تمام مراعات جن کا وہ ملازمت مکمل ہونے پر حقدار ہوتا اسے دی گئیں۔

سول سرونٹس ایکٹ (۱۹۷۴)

دفعہ ۱۳ (i) (ii)...... ملازمت سے ریٹائر کرنا اور معاشرے میں ملازمت کی اہلیت یا کارکردگی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہونا...... (فیصلہ): کسی شخص کی قواعد کے مطابق ملازمت سے علیحدگی کی بنا پر معاشرے میں اس کی اہلیت یا کارکردگی کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو جائیں تو اس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ملازمت سے اس کی علیحدگی اس کو مجرم قرار دینے کے مترادف ہے، لہٰذا قرآن وسنت کی رو سے اس کو کم از کم ''اظہار وجوہ کا پروانہ'' دینا اور اس کی صفائی سننا ضروری ہے، اور جو قانون اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر ملازمت کا معاہدہ ختم کرنے کو جائز قرار دے، وہ قرآن وسنت سے متصادم ہے۔

گویا تمام قوانین، ضابطے اور حکومتوں کے کئی نوشتے ہمارے حق میں تھے۔ ایسے ہی ایک معاملے میں ۱۹۵۳ء میں سپریم کورٹ کے جسٹس آنجہانی کارنیلس نے لکھا ہے:

''یہ ایک عام بات ہے کہ اکثر اوقات ایک ٹھیک ٹھاک شخص جھوٹے اور گھناؤنے

الزامات کا ہدف بن جاتا ہے اور وہ تحقیقات کے علاوہ مقدمات کے مراحل سے بھی گزرتا ہے۔ یہ صرف مقدمے کا نتیجہ ہوتا ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ نہ کہ اس شخص کے مقدمے کی کارروائی کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔"

☆☆

اپنا دفتر ہمارے لیے میر تقی میر کی دلی بن گیا جبکہ سیکرٹریٹ ہمارے لیے لکھنؤ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ہم لکھنؤ (سیکرٹریٹ) والوں کو وہ سب کچھ بتاتے جو ہم پر بیتی تھی اور اپنے دفاع میں جو کچھ ہم نے اکٹھا کر رکھا تھا وہ دکھاتے پھرتے۔ لیکن ہم جیسے "راندہ ہائے درگاہ" کے لئے ان دنوں سیکرٹریٹ میں ایک سے بڑھ کر ایک بگڑا ہوا نواب پڑا تھا اُدھر ہماری عقل کے آگے ایسی تاریکی پھیل چکی تھی کہ ہم ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز اٹھا کر ہر کسی کو بتاتے پھرتے تھے کہ:

۱)......ملک میں اسلام سے متصادم تمام قوانین معطل کیے جا رہے ہیں۔

۲)......ملک میں جمہوریت بحال ہے بنیادی انسانی حقوق بحال ہیں مزید برآں وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس سمیت چار ججوں کا فیصلہ ہے کہ...... ریٹائرمنٹ کی دفعہ غیر اسلامی اور قرآن کی روح کے منافی ہے پھر بھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اور انصاف کے مسلمہ بین الاقوامی اصول "آڈی آلٹرم پارٹم یعنی "کسی کو بغیر صفائی پیش کیے سزا نہیں دی جائے گی" پر عمل کیوں نہیں ہوا؟؟

کیا سرکاری ملازم پاکستانی شہری نہیں؟ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت جو اس وقت بحال اور نافذ ہے۔ آئینی تحفظ کے مطابق ان کو صفائی کا موقع کیوں نہیں دیا گیا بعض باتیں صرف زبانی کہنے کی ہوتی ہیں۔ جبکہ تحریری الفاظ کے پیچھے ایک بوقلموں جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ مثلاً سرکاری ملازمین کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ دورانِ ملازمت ان کا تبادلہ کوئی سزا نہیں ہے۔ یہ بات قانون بھی کہتا ہے اور ملازمت کے ضابطے بھی یہی کہتے ہیں مگر جب کسی سرکاری ملازم کو لاہور شہر سے اچانک ڈیرہ غازی خاں تبدیل کر دیا جائے تو اس کے آنے جانے کے اخراجات، نئی جگہ، اجنبی ماحول میں اس کی اور اس کے بچوں کی رہائش اور تعلیم کا مسئلہ، عزیز و اقارب سے دوری اور دوسری معاشی، معاشرتی اور لسانی مشکلات کی روشنی میں تبادلہ اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہ ہوگا۔ مگر تبادلہ اور تبادلے کے احکام میں یہی لکھا ہوگا کہ اس کا تبادلہ مفادِ عامہ میں کیا گیا ہے۔

شاید انہی مشکلات کے پیشِ نظر حکومتوں، محکمہ جات اور نگران افسروں اور حقوق کی تنظیموں کی طرف سے بہت سے سرکلر، تبادلہ پالیسی، مراسلات اور ہدایت نامے موجود ہیں کہ سرکاری ملازمین کو ان کے آبائی گھروں کے نزدیک تعینات کرنے کی کوشش کی جائے اور میاں بیوی کو ایک ہی مقام پر رکھا جائے۔

اسی طرح سول ملازمین کے قانون کی رو سے ۲۵ سالہ ملازمت پر کسی ملازم کی سبکدوشی کو سول ملازمت کے قواعد کی زبان میں محض ریٹائرمنٹ کہا جائے گا لیکن پچیس سال تک ملازمت کرنے والا انسان زندگی کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے جس مقام پر آ کھڑا ہوگا۔ وہاں اس کے لیے بیشمار مسائل موجود ہوں گے۔ مثلاً

۱)......بچوں کی تعلیم کے آخری مراحل

۲)......بچوں کی شادیاں

۳)......قرضوں کی ادائیگی

۴)......تعمیر مکان وغیرہ

۵)......بڑھاپا گزارنے کے مناسب طریقے

افسوس! ان سب حقائق ومسائل کی موجودگی میں کوئی انسانی و اخلاقی تقاضا محسوس کیے بغیر مفاد عامہ کی مد میں سادہ سی ریٹائرمنٹ دے کر ہمیں اندھیروں میں دھکیل دیا گیا ہے۔

◆◆◆◆◆

(۴۴)

ہم خدا کی رحمت سے مایوس نہ تھے

ہم جب بھی وزارت قانون پنجاب کے دفتر میں گئے ہمیں متعلقہ اہلکار ایک چھپا ہوا مراسلہ تھما دیتے کہ ہم قانون کے مطابق صرف اسی افسر سے نظر ثانی کی اپیل کر سکتے ہیں جس نے ہمیں ریٹائر کیا ہے۔

ہم مایوس ہو کر لوٹ آتے' چیف سیکرٹری کے دفتر کے سامنے گھاس کے تختے پر بیٹھ جاتے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگتے تھے ایک روز میں یونہی سرسری طور پر یہ مراسلہ پڑھنے لگا۔ میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا کسی نے سیکشن افسر محکمہ قانون کا مہیا کردہ مراسلہ پڑھا بھی ہے؟ سب نے کہا کہ یہ مراسلہ پڑھنے سے کیا فائدہ؟ یہ تو چودھری نذیر احمد صاحب کو پڑھ کر ہم پر ترس کھانا چاہیے...... میں نے کہا "نہیں دوستو' یہ مراسلہ مارشل لاء دور کے ۱۹۸۱ء کے عبوری آئین سے تعلق رکھتا ہے۔" اس بات پر سب ایک دم مراسلے پر جھپٹ پڑے۔

گلزار صاحب بہاولپور سیکنڈری بورڈ کے سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر کیے گئے تھے۔ انہوں نے مراسلہ پڑھا تو سر پیٹ لیا۔ اور کہا کہ ہم نے اس مراسلے کو سنبھالا تو ضرور مگر یہ نہیں دیکھا کہ اس کا تعلق کس دور سے ہے چنانچہ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سیکشن افسر قانون سے جا کر ملے۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا مگر ساتھ ہی اس نے کہا کہ اس کے پاس مارشل لاء کے خاتمے اور ۱۹۷۳ء کا آئین بحال ہونے کا گزٹ نوٹیفیکیشن نہیں ہے۔

ساتھیوں نے مجھے ہی ہائی کورٹ کے قریب ایک قانونی ناشر سے گزٹ لانے کے لئے بھیجا۔ اس کا عنوان "مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان" تھا اور وہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جاری ہوا تھا۔ اس گزٹ میں ان مارشل لائی ضابطوں کی تفصیل بھی شامل تھی جنہیں مارشل کے خاتمے

کے باوجود آئندہ کی حکومتوں کی رہنمائی کے لئے بحال رکھا گیا تھا۔ سول سرونٹس کا عبوری ایکٹ ان میں شامل نہیں تھا۔

☆☆

سیکشن افسر نے اس حد تک سبکی محسوس کی کہ اس نے اسی وقت سیکرٹری محکمہ قانون کی طرف سے ایک چھٹی چیف سیکرٹری کو لکھوائی۔ ہمیں چائے بھی پلائی اور چار دن بعد آنے کو کہا۔ اس دوران اس نے ذاتی دلچسپی لے کر پانچ مختلف محکمہ جات کے سیکرٹریوں پر مشتمل ریٹائر شدہ افراد کے لئے ''نظر ثانی کی کمیٹی''، تشکیل کروا ڈالی تھی۔ سیکرٹری سروسز کے دفتر کے ایک سیکشن افسر کو ہمارے ریکارڈ مہیا کرنے اور کمیٹی کے اجلاس طلب کرنے کے انتظامات کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔

سیکشن افسر یعقوب ضیاء امریکہ پلٹ نوجوان اور خاصا چست و چالاک کارندہ تھا۔ اس نے پھرتی سے کام لیا اور میٹنگ کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے ہی ہمیں بتا دیا کہ کسی بھی ریٹائر ہونے والے افسر کی اے سی آر خراب نہیں ہے۔ محمد اقبال کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن سے وابستہ تھے کی اے سی آر گزشتہ ۱۴ سال سے لکھی ہی نہیں گئی۔ مجھے اپنی دو اے سی آر کے نہ لکھے جانے کا علم تھا لیکن محکمے نے میری دو سال کی اے سی آر نہ ہونے کے بارے کچھ نہیں لکھا تھا۔ اگر وہ لکھتے کہ میری دو سال کی اے سی آر نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اے سی آر نہ لکھنے والا متعلقہ اعلیٰ افسر معتوب قرار پاتا۔ ہر ایک کے بارے میں ڈی پی آئی نے لکھ دیا تھا کہ کسی کی اے۔سی۔آر میں کوئی مخالفانہ اندراج نہیں ہے۔

☆☆

یہ جاننے کے بعد کہ نظر ثانی کی کمیٹی بن چکی ہے اور اب دادرسی ہوا ہی چاہتی ہے ہم نے اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ہر شخص کمیٹی کے روبرو میاں شریف سے اپنی ذاتی رنجیدگی کی شکایتیں اور حکایتیں ضرور بیان کرے گا۔ تاہم جب ہم کمیٹی کے روبرو فرداً فرداً پیش ہوئے تو میرے سوا سب نے چُپ سادھ لی۔ کسی نے بھی میاں شریف کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ قصہ کوتاہ بہت سے افراد کو نظر ثانی کی کمیٹی نے بحال کر دیا لیکن میری نظر ثانی کی اپیل کو اس لئے مؤخر کر دیا گیا کہ میں نے گورنر کی تحقیقاتی رپورٹ جس پر ''خفیہ'' لکھا ہوا تھا کمیٹی کے روبرو پیش کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ ڈی پی آئی سکولز نے مجھے محض اپنے ڈسٹرکٹ

ایجوکیشن افسر کے خلاف درخواست دینے پر برطرف کیا اور کرایا ہے۔ میں نے کمیٹی سے یہ بھی کہا کہ ۱۲(ii) کے تحت ریٹائر ہونے کی وجہ سے یکم دسمبر ۸۴ء سے مجھے ملنے والا اٹھارہواں گریڈ بھی نہیں دیا گیا حالانکہ اگر یہ مجھے بروقت مل گیا ہوتا تو میں سترہویں گریڈ کے ان افسروں میں جو ریٹائر کئے گئے شامل ہی نہ ہو پاتا۔

میں نے کمیٹی کو بتایا کہ چودھری محمد اکرام جو ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھا میاں شریف ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز کا منظور نظر اور انہی کی برادری کا آدمی ہے اور اُسی کے خلاف درخواست دینے پر میری جبری سبکدوشی عمل میں آئی ہے۔

بہر حال کمیٹی نے میرا معاملہ زیر غور رکھا کہ مستقبل میں میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا!

احمد صادق صاحب نظر ثانی کی کمیٹی کے ممبر تھے میری طرف سے پیش کی گئی گورنر کی معائنہ جماعت کی تحقیقاتی رپورٹ پر چونک پڑے انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہ کہا مگر کمیٹی کو بتایا کہ یہ تو خفیہ دستاویز ہے۔ اس کے ہاتھ کیسے لگی؟ کمیٹی کے بعض ارکان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ اشارے دیے۔ میں ان اشاروں کا مطلب تو نہیں سمجھ سکا لیکن بیوروکریٹ اس انوکھے اندازِ کلام پر حیران ضرور ہوا۔

جب بھی جام آتے ہیں غیروں ہی کے نام آتے ہیں

دوسری بار کمیٹی نے اپنے اجلاس میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس میاں شریف اور چودھری اکرام کے خصوصی تعلقات اور برادری کا بھائی ہونے کے کیا ثبوت ہیں؟ میرے پاس اس بارے میں کوئی دستاویز تو نہیں تھی تاہم میں نے کچھ وضاحتیں اس تناظر میں پیش کیں اور خاموش ہو گیا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۸۵ء کو مجھے اطلاع دی گئی کہ میری نظر ثانی کی درخواست مسترد کی جاتی ہے تاہم کمیٹی نے اپنی کارروائی میں محکمہ تعلیم کو یہ ہدایت کی کہ مجھے میرے خدماتی ریکارڈ کی روشنی میں یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے واجب الادا اٹھارہویں گریڈ میں "موواوور" دے دیا جائے۔ سیکشن افسر نے اپنے اطلاع نامے میں کمیٹی کی اس سفارش کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔

بہت بعد کو سیکریٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ جس نے کمیٹی کے جملہ فیصلے ٹائپ کیے تھے میرے ایک دوست سے کہا کہ چلو قاضی کو اگر کمیٹی نے بحال نہیں کیا تو اسے ترقی تو دے دی۔

اس دوست نے مجھے بتایا تو میں نے کئی ماہ کی ذاتی کوششوں سے ڈپٹی سیکرٹری سروسز سے کمیٹی کی کارروائی کی مسل نکلوائی اور فیصلے کی مفصل نقل حاصل کی۔

میری اگلے گریڈ میں ترقی کا معاملہ متعلقہ افسروں نے محض اپنی نااہلی کی وجہ سے پے در پے اس قدر التوا میں ڈالا کہ محکمے کے کھاتے میں میری درخواستوں کے پلندے لگ گئے۔ ان پلندوں پر اچانک کسی رکن صوبائی اسمبلی کے کارندے کی نگاہ پڑ گئی یوں میرے بارے میں یہ معاملہ پنجاب اسمبلی میں سوال کی صورت میں اٹھایا گیا اور وزیر تعلیم نے برسر ایوان سفید جھوٹ بولا۔ ملاحظہ کیجئے۔ پنجاب اسمبلی میں ۲۰/ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے سوال جواب کی روداد:۔

سوال: چوہدری وجاہت حسین: کیا وزیر تعلیم ازراہ کرم بیان فرمائیں گے کہ...... (الف) کیا یہ حقیقت ہے کہ قاضی ذوالفقار احمد سابق ڈپٹی ڈی ای او شیخوپورہ کو سیکنڈ ریویو کمیٹی کے احکام مورخہ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے باوجود ۱۹۸۴ء سے واجب الادا سترھویں گریڈ سے اٹھارھویں میں موواوور ۷/ مارچ ۱۹۹۱ء کی تاریخ آ پہنچنے کے باوجود نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے تنخواہ کی تجدید اور نئے سرے سے پنشن کا تعین کرانے کے لئے مذکورہ اہلکار کو مشقت طلب جدوجہد کرنا پڑے گی تعلیمی اہلیت اور پنجاب سروس ٹربیونل کے فیصلے کے مطابق مذکورہ اہلکار کو تین پیشگی ترقیاں بھی ملنی ہیں جن کی سفارش ڈی پی آئی سکولز نے اپنی چھٹی میں بھی کی ہے مگر یہ معاملہ بھی زیر التواء ہے۔

(ب)...... آیا یہ امر واقعہ ہے کہ مذکورہ اہلکار ۱۱/ ستمبر ۱۹۸۴ء سے سلیکشن گریڈ کا حقدار ہے جس کے لئے اس نے متعدد درخواستیں پیش کی ہیں۔ لیکن ابھی تک ان پر کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا اگر ایسا ہے تو اس کی وجوہ کیا ہیں اور حکومت یہ معاملہ حل کرنے کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے؟

وزیر تعلیم کا جواب

(الف)...... یہ بات درست نہیں ہے۔ مذکورہ افسر کو یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے موواوور اور تین زائد ترقیاں دی جا چکی ہیں۔

(ب)...... مذکورہ افسر کے سلیکشن گریڈ کیس کا بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے اور اسے اس کا مستحق نہیں پایا گیا۔ (سلیکشن گریڈ بی۔ ایس ۱۸ ہی کا نہیں بعد میں مجھے ۱۹ویں گریڈ کا حق دار بھی تسلیم کیا گیا)

☆☆

میں نے دوسری بار کے استرداد پر سرکاری چھٹی موصول ہوتے ہی ایک ماہ کے دوران مسٹر یٰسین بھٹی ایڈووکیٹ کے ذریعے پنجاب سروس ٹریبونل میں بحالی کی اپیل دائر کردی۔ ہماری تنظیم ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ سروس ٹریبونل سے بھی کوئی امید نہ تھی۔ وہاں سے صرف مسز ذکیہ باسط ہی بحال ہوئیں۔ میری خوش بختی تھی کہ وہاں جسٹس ریٹائرڈ اختر حسین ملک چیئرمین تعینات ہو گئے۔ ان کا نام اعلیٰ قانونی لیاقت اور بے لاگ فیصلے کی صلاحیت رکھنے والے ججوں میں نمایاں تھا۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں میری پوری گراں بار داستان کی تلخیص کردی۔ مطالعے کی چیز ہے۔ اسے پڑھیے۔ آپ کو روشنی ملے گی۔

پنجاب سروس ٹریبونل کا فیصلہ

پنجاب سروس ٹریبونل نے میری اپیل نمبر ۸۹/ ۵۸۷ کا فیصلہ مورخہ ۳۱ر جولائی ۱۹۹۳ء کو سنایا جبکہ آخری سماعت ۵ر جون ۹۳ء کو ہوئی۔ اب عدالتی رُوداد ملاحظہ ہو:

اپیل بخدمت چیئرمین صاحب، پنجاب سروس ٹریبونل۔ لاہور

●

منجانب قاضی ذوالفقار احمد سابق ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر شیخوپورہ

بنام

۱)..... چیف سیکرٹری۔ حکومت پنجاب۔ لاہور
۲)..... سیکرٹری تعلیم۔ حکومت پنجاب۔ لاہور
۳)..... ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز (سکولز) پنجاب۔ لاہور

میری طرف سے یٰسین بھٹی ایڈووکیٹ اور سرکار کی طرف سے جاوید چیمہ پیش ہوئے۔ سماعت کے دوران سید آل احمد پی سی ایس افسر نے میری مخالفت کی۔ انہوں نے چیئرمین کو لقمہ دیا کہ ''بری شہرت'' کو مدِ نظر رکھیے۔ چیئرمین نے کہا کہ بُری شہرت نہیں بلکہ ''غیر تسلی بخش شہرت'' کے الفاظ ہیں اور وہ بھی پانچویں گریڈ کے ایک ادنیٰ اے ایس آئی کا نوشتہ ہیں۔ آپ جو بیسویں گریڈ کے افسر ہیں کیا آپ پسند کریں گے کہ کوئی اے ایس آئی آپ کے بارے میں

کوئی ایسی اول فول بات لکھے۔ میں اسے بدنیت نہیں تو احمق ضرور کہوں گا۔''

یہ جواب باصواب پا کر آل احمد صاحب کے چہرے پر خاموشی کا چھینٹا پڑ گیا۔

ٹربیونل کے چیئرمین نے فیصلہ لکھوایا اور وہ تمام دستاویزی حوالے جو میں نے اپنی اپیل کے ساتھ منسلک کئے تھے فیصلے کے دوران جابجا حوالے کے طور پر استعمال کئے۔ متن میں یہ حوالے واوین میں مذکور ہیں۔

فیصلے کا مکمل متن (بزبان انگریزی) یہ تھا

۱)...... ''قاضی ذوالفقار احمد اپیل کنندہ ۲؍جولائی ۱۹۶۰ کو انگریزی کے سینئر معلم کی حیثیت سے محکمہ تعلیم میں بھرتی ہوا۔ بدرجہ آخر وہ ۵۴؍امیدواروں میں سے صرف اپنی عمدہ خدمات اور لیاقت کی بنیاد پر تحصیل کی سطح پر بااختیار ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر منتخب ہوا جبکہ مذکورہ اسامی پر اس کا تقرر ۳؍نومبر ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ اپیل کنندہ کا مؤقف یہ ہے کہ اس کی خدمات کا ریکارڈ بے داغ آئینہ تھا لیکن اسے ۸؍جولائی ۱۹۸۶ء کو پنجاب سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۷۴ء کی دفعہ ۱۲(ii) کے تحت ۲۵ سال تک خدمات پوری ہو چکنے کی بنیاد پر جبری طور پر سبکدوش کر دیا گیا۔ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز تعلیم پنجاب نے اس کے خدماتی ریکارڈ سے غلط اقتباسات بدنیتی سے تیار کرائے اور حکامِ بالا کو پیش کئے کیونکہ وہ اپیل کنندہ سے کدورت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اپیل کنندہ نے اس کی برداری کے رکن چودھری محمد اکرام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر قصور کی رشوت خوری اور مالی گھپلوں کے خلاف گورنر معائنہ ٹیم کو درخواست دی تھی۔ اپیل کنندہ نے مزید دعویٰ کیا ہے کہ اس کی ریٹائرمنٹ کے احکام قائم مقام سیکرٹری نے جاری کئے جو ایسا کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مزید برآں فیصلہ ہوا تھا کہ ۱۸ویں گریڈ کے افسروں کی تطہیر بھی کی جائے گی لیکن وہ تطہیر کبھی عمل میں نہیں آئی بلکہ انہیں گریڈ ۱۷ کے ان ۳۴ افسروں سے جو میاں محمد شریف ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز سکولز کی تیغ جفا کا شکار ہوئے تھے مختلف تصور کیا گیا۔ اپیل کنندہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ریٹائر کر دیئے جانے والے اکثر افسروں کو اس ٹربیونل نے یا پھر ریویو کمیٹی نے وزیراعلیٰ کے کہنے پر بحال کر دیا ہے۔

۲)...... حکومت کی چٹھی نمبر ایس او (ایس) ۱۴-۶/۸۱ مورخہ ۵ جولائی ۸۶ جس میں ریٹائر کیے جانے والے افسروں کے آخری دس سالہ خدماتی ریکارڈ کی جانچ پڑتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے' مذکورہ چٹھی کا حوالہ دیتے ہوئے اپیل کنندہ نے کہا ہے کہ اس چٹھی کو کم از کم اسکے معاملے میں مد

نظر نہیں رکھا گیا اپیل کنندہ جبری سبکدوشی سے صرف ۸ ماہ پہلے مقابلے کے کڑے امتحان میں ۵۴ امیدواروں میں امتیازی حیثیت سے منتخب ہوا...... ریٹائر کرتے وقت یہ اہم واقعہ بھی فراموش کر دیا گیا۔ ڈی پی آئی کے اس غیر معمولی ناروا سلوک کو اپیل کنندہ صرف اس تحقیقات کا شاخسانہ قرار دیتا ہے جو میاں کی برادری کے رکن چودھری محمد اکرام کے خلاف گورنر کی معائنہ ٹیم نے کی۔ اپنے اس موقف کی تائید میں اپیل کنندہ نے ڈی پی آئی کی اس چٹھی کا حوالہ بھی دیا ہے جو اس نے ۸راگست ۱۹۸۴ء کو ڈائریکٹر لاہور ڈویژن کو لکھی کہ وہ اپیل کنندہ کو قصور سے تبدیل کر دے۔ جب ڈائریکٹر نے ایسا نہیں کیا تو خود ڈی پی آئی نے اپیل کنندہ کو تبدیل کر دیا لیکن جب اپیل کنندہ نے اپنے تبادلے کے متعلق گورنر کی معائنہ ٹیم کو اطلاع دی تو اس پر تبادلہ تو رک گیا لیکن اس سے ڈی پی آئی کی انانیت کو سخت صدمہ پہنچا اور جوش انتقام میں اس نے اپیل کنندہ کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کرا دی۔

۳)...... اپیل کنندہ کو یقین ہے کہ اس کا دفترِ خدمات کسی ایسی کمیٹی کو مہیا نہیں کیا گیا جس نے دفعہ ۱۲(ii) کے تحت افسروں کو ریٹائر کرنے کے لئے کوئی ابتدائی رپورٹ تیار کی۔ وہ یقیناً من گھڑت اقتباسات ہوں گے جو ڈی پی آئی نے خود یا اس کے کہنے پر کسی اور اہلکار نے تیار کئے ہوں گے۔

۴)...... جبری سبکدوشی کے فوراً بعد اپیل کنندہ نے اس ٹربیونل میں اپیل کی۔ پھر اس نے یہ اپیل اس لیے واپس لے لی کہ اسے پہلے محکمانہ جائزہ کمیٹی سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ مگر جائزہ کمیٹی نے اپیل کنندہ کی دادرسی کے لئے کچھ نہیں کیا۔

۵)...... متذکرہ بالا واقعات پر اپیل کنندہ نے اپنے اس موقف کا اضافہ بھی کیا ہے:۔

کہ سول سرونٹس ایکٹ کی دفعہ ۱۲ (ii) کو وفاقی شرعی عدالت نے اپنے ۲۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء کے فیصلے کے ذریعے مورخہ ۲۹ر جون ۱۹۸۴ سے غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ لہٰذا اپیل کنندہ کو غیر اسلامی دفعہ کے تحت ریٹائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ عدالتی فیصلہ اپیل کنندہ کی قبل از ریٹائرمنٹ کی ایک سالہ رخصت مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۸۷ء کو ختم ہونے سے پہلے نافذ ہو چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپیل کنندہ ابھی سرکاری ملازم تھا جب کہ دفعہ ۱۲(ii) کو مکمل طور پر غیر موثر قرار دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ ۱۲(ii) کی زد میں نہیں آتا تھا۔

مزید برآں سائل کے بارے میں جائزہ کمیٹی نے ہدایت کی تھی کہ اپیل کنندہ کو گریڈ

سترہ سے گریڈ اٹھارہ میں اس کے ۱۹۸۴ء تک کے سروس ریکارڈ کی بنیاد پر موواوور دیا جائے۔ اس ہدایت کا مطلب یہ ہوا کہ اپیل کنندہ کی گزشتہ دس سال کی اے سی آر کسی بھی لحاظ سے ناقص اور غیر معیاری نہیں تھی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ڈی پی آئی نے اپیل کنندہ کا موواوور بھی خوانخواہ روک رکھا تھا۔ اپیل کنندہ نے ۵ر نومبر ۱۹۸۸ء کی سرکاری چٹھی بھی پیش کی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اپیل کنندہ کے خلاف کبھی کسی الزام میں کوئی تحقیقات نہیں کی گئی اور نہ اس کے خلاف کوئی انضباطی کارروائی عمل میں آئی ہے۔

آخر میں اپیل کنندہ نے اپنی قبل از وقت جبری ریٹائرمنٹ کو اس بنیادی عالمگیر اصول ''آڈی آلٹرم پارٹم'' کہ ''کسی کو صفائی کا موقع دیئے بغیر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی'' کے سراسر خلاف قرار دیا ہے۔ جبکہ انصاف کے اسی اصول کے تحت کسی کو صفائی کا موقع دیے بغیر ریٹائر نہ کئے جانے کی شق کا اضافہ ۷ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو دفعہ ۱۲(ii) میں بھی کیا گیا ہے۔ اس وضاحت سے شاید اپیل کنندہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ رخصت قبل از ریٹائرمنٹ پر ہونے کی وجہ سے ابھی اس کی حقیقی ریٹائرمنٹ نہیں ہوئی تھی کہ دریں اثناء سرکاری ملازمین کو ۲۵ سالہ خدمات کی بنیاد پر سبکدوش کرنے سے پہلے صفائی کا موقع دینے کی ترمیم سرکاری ملازمین کے قانون مجریہ ۱۹۷۴ء میں آ چکی تھی۔

٦)......اپیل کنندہ نے دونوں احکام کو مبہم اور بے دلیل قرار دیا ہے۔ جائزہ کمیٹی کا فیصلہ محض یہ تھا:-

''آپ نے نظر ثانی کی جو درخواست ۲۰ر اگست ۸۶ء کو دی تھی، اس پر جائزہ کمیٹی نے غور کیا اور اسے مسترد کر دیا۔''

ٹربیونل نے مندرجہ بالا حکم کو ناکافی اطلاع سمجھا اور سائل کو ہدایت کی کہ وہ جائزہ کمیٹی سے اپنی نظر ثانی کی درخواست مسترد ہونے کی اصل اور مفصل وجہ دریافت کرے۔ وہ یہ تفصیل حاصل نہ کر سکا اور اس لئے حاصل نہ کر سکا کہ شاید وہاں سرے سے ایسی کوئی وجہ موجود ہی نہ تھی۔ تاہم سرکاری وکیل کو ۲۱ر مئی ۹۰ء کو اس سلسلے میں ایک خط موصول ہوا جس میں یہ عبارت درج تھی:-

''اطلاع دی جاتی ہے کہ تمہاری نظر ثانی کی درخواست تمہاری غیر تسلی بخش شہرت کی وجہ سے مسترد کی گئی ہے مزید برآں تم نے ریٹائرمنٹ کا جو محرک ڈی پی آئی سے منسوب کیا ہے وہ ثابت نہیں ہو سکا۔''

اپیل کنندہ نے ۱۹/اگست کو اپنی اپیل میں شامل کرنے کے لئے ایک ضمنی درخواست دی کہ اُسے اس کی شہرت ''غیر تسلی بخش'' ہونے کی اطلاع کبھی نہیں دی گئی اور نہ کبھی اس کے خلاف ''شہرت کی خرابی'' کے باعث کوئی تحقیقات ہوئی۔ اپیل کنندہ کے مطابق اس کے خلاف سبکدوشی کی کارروائی پہلے کر دی گئی اور کوئی الزام نہ پا کر وجۂ جواز بعد میں گھڑ لی گئی۔ صرف اسی ایک امر سے نظر ثانی کی درخواست مسترد ہونے کی وجہ بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر ایسی اس قسم کی وجوہ اٹکل پچو سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔ چونکہ یہ دستاویز فریقین سے متعلق تھی لہٰذا اسے اپیل کنندہ کی اپیل کے ساتھ شامل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

۷)...... مدعا علیہ ڈی پی آئی نے جس نے اپیل کنندہ کی ریٹائرمنٹ کی تجویز پیش کی تھی اپیل کے متن کا جواب دیتے ہوئے میکانکی انداز اختیار کیا اور کہا کہ ''اپیل کنندہ کی سبکدوشی کا فیصلہ بااختیار حکام نے متعلقہ ریکارڈ کی جانچ پڑتال کے بعد کیا۔ اس فیصلے کا چودھری محمد اکرام کے خلاف تحقیقات سے کوئی تعلق نہیں''۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اس نے اس امر کی کوئی خاص متعین وجوہ بیان نہیں کیں کہ آخر اپیل کنندہ کو قبل از وقت ریٹائر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے برعکس مدعا علیہ نمبر ایک چیف سیکرٹری نے اپنے جواب میں لکھا ہے کہ اپیل کنندہ کی ریٹائرمنٹ ''غیر تسلی بخش شہرت'' کی وجہ سے عمل میں آئی۔

اس امر سے انکار نہیں کہ کسی بھی سرکاری ملازم کو پنجاب سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۸۴ء کی دفعہ ۱۲(ii) کے تحت ریٹائر کرنے کے لئے اس کا دس سالہ سروس ریکارڈ ملاحظہ کیا جاتا ہے۔ مگر فاضل سرکاری وکیل اپیل کنندہ کے سروس ریکارڈ میں دس سال تو کیا اس سے پہلے کا بھی کوئی قابل اعتراض اندراج پیش نہیں کر سکے۔ اس سے اپیل کنندہ کے موقف کی...... کہ اس کا خدماتی ریکارڈ پوری ملازمت میں بڑا تسلی بخش رہا ہے...... کی تائید ہوتی ہے۔ مزید برآں اسے ۸۴ء سے گریڈ سترہ سے گریڈ اٹھارہ میں مووااوور دے دیا گیا ہے اور اسے یہ مووااوور بھی جائزہ کمیٹی کی سفارش ہی سے ملا ہے۔ پھر سائل کو اس کی ریٹائرمنٹ سے صرف آٹھ مہینے پہلے چون حاضر سروس گریڈ ۱۷ کے افسروں میں سے منتخب کیا گیا (کل ۸/افسروں کا انتخاب ہوا تھا۔ ان میں سے ایک میں تھا) یہ انتخاب ایک جامع بورڈ نے کیا تھا۔ یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ جس شخص کو ۸ ماہ قبل ایک ذمہ دار بورڈ گریڈ سترہ کی اہم اسامی کے لئے منتخب کرتا ہے

اسے آناً فاناً ریٹائر کر دیا گیا۔ اسی طرح ۸ر جولائی ۸۶ء کا زیر اعتراض حکم نامہ بھی یہ نہیں بتاتا کہ اپیل کنندہ کو ریٹائر کرنے کے لئے کیوں دھر لیا گیا؟ اسی طرح جائزہ کمیٹی کا حکم بھی گونگا ہے۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ سائل کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کر دی گئی' یہ نہیں بتاتا کہ کیوں اور کس قصور کی پاداش میں مسترد کی گئی۔

۸)......ٹربیونل کی ہدایت پر سرکاری وکیل' سائل کی نظر ثانی کی درخواست کے رد کئے جانے کے ظاہری اسباب حاصل کرنے میں بمشکل کامیاب ہوا۔ کیونکہ کوئی واضح اسباب تھے ہی نہیں۔

لے دے کے سائل کی روزی چھیننے کا باعث جو ''تنہا جرم عظیم'' بتایا گیا وہ صرف یہ تھا کہ ''سائل کی شہرت تسلی بخش نہیں ہے۔'' اپیل کنندہ کے وکیل صفائی نے دلائل پیش کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ سائل کے پورے خدماتی ریکارڈ میں کہیں بھی اور کسی بھی مقام یا مرحلے پر یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کی ''شہرت غیر تسلی بخش'' رہی ہے۔ سائل کے خلاف کسی بد نظمی' ضابطے کی خلاف ورزی یا کسی بداطواری کے زیر عنوان کبھی کوئی تحقیقات نہیں کی گئی اور نہ اسے کبھی ایسی انتباہی اطلاع دی گئی کہ اس کی شہرت بُری یا غیر تسلی بخش ہے۔ وکیل صفائی کے دلائل کی صداقت ہر شک و شبے سے ماورا ہے۔ جائزہ کمیٹی نے ٹربیونل کو جو وجہ سائل کی نظر ثانی کی درخواست کے رد کئے جانے کی بتائی ہے وہ یکسر غلط اور من گھڑت ہے۔

وکیل صفائی یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ''غیر تسلی بخش شہرت'' بداطواری یعنی ''مس کنڈکٹ'' کے زمرے میں آتی ہے لیکن اس کے تحت اپیل کنندہ کے خلاف کبھی کوئی انضباطی کارروائی نہیں کی گئی۔ اپیل کنندہ کو ریٹائر کرنے کی کسی اور فرضی وجہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اپیل کنندہ کو ۱۲(ii) کے تحت محض اس لئے ریٹائر کیا گیا کہ اس نے چودھری محمد اکرام کی مالی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیاں طشت از بام کی تھیں اور اس سلسلے میں گورنر کی معائنہ ٹیم کو درخواست دے کر سارے بھید کھول دیے تھے۔

پیش نظر مسل پر ایسی مسکت شہادت موجود ہے کہ سائل نے ڈی ای او کے خلاف درخواست دی جس کی پاداش میں سائل کو قصور سے تبدیل کیا گیا تاہم سائل کے اعتراض پر اس کا تبادلہ روک دیا گیا جس کے نتیجے میں سائل اور میاں شریف کے مابین مخاصمت بڑھتی چلی گئی۔ یہ پس منظر گواہی دیتا ہے کہ سائل کو چودھری محمد اکرام کے خلاف تحقیقات کرانے کی

پاداش میں سبکدوش کردیا گیا۔

۹)......معاملے کی اس نوعیت پر بھی بحث کی گئی کہ سائل کو اس کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ سے پہلے صفائی کا موقعہ نہیں دیا گیا جو دفعہ ۱۲(ii) کا لازمی تقاضا تھا۔ گو یہ تقاضا مذکورہ دفعہ میں ترمیم کے ذریعے شامل کیا گیا لیکن یہ ۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو مؤثر ہو چکا تھا جبکہ اپیل کنندہ کے خلاف اصل حکم بہت پہلے یعنی ۸ر اگست ۱۹۸۶ء کو جاری ہو چکا تھا معمولاً اس ترمیم کو اپیل کنندہ کی ریٹائرمنٹ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ ریٹائرمنٹ اس ترمیم کے موثر ہونے سے بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن ابھی سائل رخصت قبل از ریٹائرمنٹ پر تھا اور ترمیم طریق کار سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا وہ اپیل کنندہ کے مفاد میں استعمال ہو سکتی تھی۔

اس ضمن میں کئی قانونی فیصلے موجود ہیں کہ طریق کار میں ترامیم التوا میں پڑے معاملات پر نافذ کی گئیں۔ ۱۹۵۸ء کی پی ایل ڈی لاہور صفحہ ۸۵۳ (محمد بشیر بنام صوبہ مغربی پاکستان) میں حوالہ موجود ہے:

''کارروائی کے طریق کار کا حق اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ طریق کار موجود رہتا ہے۔ کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد وہ مؤثر نہیں رہتا...... جب کوئی شخص یہ تقاضا کرتا ہے کہ طریق کار کا اثباتی ضابطہ جو اس کے حق میں ہے استعمال کیا جائے تو جس طریق کار کے تحت اس کے بارے میں کارروائی کی گئی ہو اس طریق کار کو اس کے انجام تک دیکھنا ہوگا۔''

مزید برآں...... میکس ویل اپنی کتاب 'آئین' کے ۱۲ویں ایڈیشن صفحہ ۲۲ پر رقم طراز ہے...... ''اور اگر کوئی قانون...... قانونی کارروائی کا طریق کار بدل دیتا ہے تو وہ (جج) صرف بدلے ہوئے طریق کار کے مطابق کارروائی کر سکتا ہے۔...... طریق کار میں تبدیلیاں ہمیشہ متعلق بہ ماضی ہوتی ہیں......''

اس روشنی میں اپیل کنندہ کو ریٹائرمنٹ کے خلاف صفائی کا موقع دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صاف واضح ہے کہ اسے ان اسباب سے آگاہ نہیں کیا گیا جن کے نتیجے میں اسے ریٹائر کیا گیا اور نہ اسے کسی قسم کی صفائی کے لئے ذاتی شنوائی کا موقعہ دیا گیا۔ اس کی ریٹائرمنٹ کا مرحلہ مکمل ہی نہیں ہوا تھا مگر اس کے باوجود اسے ۱۲(ii) کے تحت کارروائی کا ہدف بنا دیا گیا۔ یہ سراسر خلاف قانون تھا۔

۱۰)......سرکاری وکیل کے پاس کوئی ایسا موادنہیں ہے جس سے وہ مندرجہ بالا دلائل کے خلاف کوئی حجت پیش کر سکے۔اس نے از خود یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دونوں احکام اپیل کنندہ کے خلاف کیے گئے اقدام کا کوئی جواز مہیا نہیں کرتے تاہم پھر بھی ریٹائرمنٹ کے احکام کے اجراء میں حکام کی کوئی ذاتی انا یا مفاد شامل نہیں اور کسی سرکاری ملازم کو ایسی صورتحال میں شاکی نہیں ہو چاہیے۔

سرکاری وکیل نے زور دیا ہے کہ اسے ''غیر تسلی بخش شہرت'' کی جو چٹھی مہیا کی گئی ہے وہ اپیل کنندہ کی ریٹائرمنٹ کا کافی جواز رکھتی ہے۔مگر ہم سرکاری وکیل سے متفق نہیں ہو سکتے۔ سائل کی دس سالہ سروس میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں ہے مزید برآں اس کی نہ صرف ترقی ہوئی بلکہ اسے سترہویں گریڈ سے اٹھارہویں گریڈ میں موواوور بھی دیا گیا۔اور ایسا کوئی اتفاق اپیل کنندہ کی پوری مدتِ خدمات میں موجود نہیں کہ اس کی شہرت پر بے جا منفعت' نااہلی' یا بے قاعدگی کا کوئی دھبہ لگا ہو یا اگر لگا ہے تو یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ اس پر اس سے کبھی کوئی جواب طلبی ہی نہیں کی گئی۔سائل کے خلاف جو کچھ عمل میں آیا ہے وہ کوئی پادر ہوا' توہماتی یا قیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ کینہ پروری کا نتیجہ ہے۔سائل محض ڈی پی آئی کے خلاف شکایت کرنے کی رنجش کی بناء پر بیک بنیی دوگوش فارغ کر دیا گیا۔اس لیے اپیل کنندہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ اس کے خلاف جبری سبکدوشی کینہ پروری کی آئینہ دار ہے اور ڈی پی آئی کی مونچھ کے بال چودھری محمد اکرام کے خلاف شکایت کی پاداش میں انتقاماً عمل میں آئی ہے۔

۱۱)......اس ٹربیونل کے فیصلے (۵۔اے) کی روشنی میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اپیل کنندہ کے زیر بحث احکام ہی کے ذریعے ریٹائر ہونے والی سرکاری ملازمہ کو اس لیے بحال کیا گیا کہ اس کا خدماتی ریکارڈ بے داغ تھا مزید برآں اُسے جبراً ریٹائر کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔اپیل کنندہ کا یہ معاملہ بھی ٹھیک ٹھیک متذکرہ معاملے سے مطابقت رکھتا ہے۔لہٰذا یہ بھی اسی سلوک کا مستحق قرار پاتا ہے۔

۱۲)......اپیل منظور کی جاتی ہے۔زیر بحث حکم معطل کیا جاتا ہے اور اپیل کنندہ کو تمام مفادات و مراعات سمیت بحال کیا جاتا ہے۔

فیصلے کی تاریخ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دستخط ممبران و چیئرمین ٹربیونل

۳۱/جولائی ۱۹۹۳ء

◆◆◆◆◆

(۴۵)

فیصلے کے بعد

پنجاب سروس ٹربیونل کا یہ فیصلہ حکومت پنجاب کو پسند نہ آیا۔ وہ کھسیانی ہوگئی اور ایسے قانونی نکات ڈھونڈنے لگی جنہیں جواز بنا کر مجھے کسی بڑی عدالت میں رگیدا جا سکے۔ چنانچہ قانونی کھوٹ نکالنے کے لئے یہ فیصلہ سولیسٹر برائے حکومت پنجاب کو بھیج دیا گیا۔ وہاں بھلے چنگے قانونی دماغ بیٹھے ہوئے ہیں اور فیصلوں کی قانونی غلطیاں پکڑتے ہیں۔ میرا معاملہ ان لوگوں کے سرد خانے میں آیا تو کافی وقت گزر گیا، کوئی صدا، نہ ندا! میں تاخیر سے گھبرا کر سولیسٹر کے دفتر گیا اور ڈپٹی سولیسٹر کو بتایا کہ میرا مقدمہ ۱۹۸۶ء میں شروع ہوا تھا اس کا فیصلہ اب کہیں ۱۹۹۳ء میں آ کر ہوا ہے۔ اب اس بارے محکمہ تعلیم کا مراسلہ آپ کا دفتر دبا کر بیٹھ گیا ہے۔

ڈپٹی سولیسٹر صاحب نے فوراً پوچھا۔ فیصلہ کس نے لکھا ہے؟'' میں نے بتایا تو وہ فوراً بولے کہ ہمارا دفتر ملک اختر حسین کے لکھے ہوئے فیصلوں میں آج تک کوئی نقص یا غلط قانونی نکتہ نہیں نکال سکا۔ انہوں نے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر میرے معاملے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ جواب لکھا جا چکا ہے۔ اور وہ سائل کے حق میں ہے۔ صرف سولیسٹر صاحب کے دستخط ہونے باقی ہیں۔

فیصلہ بھیجنے والے ایس این جی اے ڈی کے محکمے نے محکمہ تعلیم کو میرا کیس بھیجنے میں مزید دو ہفتے لگا دیئے۔ ایک ماہ بعد سیکرٹری صاحب کی منظوری کے بعد محکمہ تعلیم کی ایک خاتون سیکشن افسر نے ازراہ کرم میرے دوبارہ تقرر کا حکم لکھا جس کی عبارت یہ ہے:

''قاضی ذوالفقار احمد ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر شیخوپورہ جسے سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۷۴ء کی دفعہ ۱۲(ii) کے تحت مورخہ ۸/جولائی ۱۹۸۶ء کو ریٹائر کیا گیا تھا اسے پنجاب

سول سروس ٹربیونل کے فیصلے کے مطابق جملہ مفادات کے ساتھ اسی تاریخ سے بحال کیا جاتا ہے۔اب وہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۸۹ءکو ریٹائر ہوگا۔''

میرے بحال ہونے کی خبر صرف روزنامہ 'جنگ' نے چھاپی جبکہ میرے اور میرے ساتھ دیگر ریٹائر ہونے والوں کی خبر تمام اخبارات نے خوب اچھالی تھی۔

سات سال بعد بحال ہونا یقیناً خوشی کی بات تھی جس پر مجھے اپنے احباب اور رشتہ داروں کی طرف سے مبارک بادیں ملنے لگیں۔ مبارک باد دینے والوں میں ایسے احباب بھی تھے جو دل سے میری بحالی پر خوش نہ تھے۔ وہ میری اور دیگر متاثرین کی بحالی کی کوششوں کو مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کی نامناسب حرکت سے تعبیر کرتے تھے۔ بعض لوگوں پر حسد کی چوٹ پڑی انہوں نے منہ در منہ کہا ''واہ صاحب واہ! کمال ہوگیا!! گھر بیٹھے دو سال کی تنخواہوں کا 'مُفتا' لگ رہا ہے''۔ بعض رشتہ داروں نے یہ بھی کہا کہ ''بیٹھے بیٹھے 'بوبا' مل گیا ہے اور کیا چاہیے قاضی کو......''

حسب ضابطہ میرے تمام واجبات مل گئے۔ یہاں تک کہ مدتوں پہلے ملنے والی ایم۔ایڈ کی تین ترقیاں بھی اٹھارہویں گریڈ میں ملیں جبکہ ان ترقیوں کے بارے میں محکمہ خزانہ تک انکار کر چکا تھا۔ پہلے اٹھارہویں گریڈ میں ''مووا اوور'' ملا مگر یہ سب کچھ اچانک راہ چلتے نہیں مل گیا مجھے دفاتر میں برسوں چکر لگانے پڑے اور شبیر احمد اسسٹنٹ ڈائریکٹر تو ابتداء ہی سے میرے خیر خواہوں میں سے تھا لیکن خواری کے دنوں میں میری ہر درخواست خواہ وہ بامعنی تھی یا بے معنی' مثبت سفارشی تحریریں بشیر و شیر ڈپٹی ڈی پی آئی نے لکھیں یہ بشیر و شیر صاحب دھنسیر پائیں ہائی سکول میں میرے پیشرو تھے۔ بعد کے تعلقات میں وہ ایک ناک کی سیدھ میں چلنے والے ہمدرد افسر اور دوست ثابت ہوئے۔ میرے کام تو اللہ تعالیٰ کی ذات نے کئے لیکن جن اللہ کے بندوں کے توسط سے ہوئے ان میں شبیر احمد اور بشیر و شیر صاحب کے نام روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ اللہ ان کو خوش' شاد و آباد رکھے۔

ایک اور شخص کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ یہ مسٹر رحمت اللہ سوری ہیں۔ موصوف شاید ڈاکٹر جہانگیر خاں کے بعد دوسرے اعلیٰ افسر ہیں جنہوں نے یہ عملاً تسلیم کیا کہ اے۔ڈی۔آئی سکولز ہی پرائمری تعلیم میں افسر ہوا کرتا تھا۔ موصوف جب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے گریڈ سترہ کے افسر بنے اس وقت وہ مڈل سکول سرانچ (میری وسطی سب ڈویژن) میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں ان کو اپنی خواری اور بیزاری کے دور میں جب بھی ملا انہوں نے خندہ پیشانی سے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ تواضع بھی کی اور واپسی پر مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے اور ہر بار یہی دہرایا کہ وہ

مجھے اب بھی افسر ہی خیال کرتے ہیں اور وہ میرے ماتحت ہیں۔ یہ ان کے اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ نسب کی بات ہے۔ ان کی شخصیت کی عظمت ہے۔ میں جب بھی ان سے بطور سائل ملا وہ کرم فرمائی سے پیش آئے۔ جب وہ ڈی۔ پی۔ آئی کے دفتر میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن تھے' جب وہ لاہور ڈویژن کے ڈائریکٹر تعلیم تھے اور اب جب میں اپنی آپ بیتی کے آخری حصے کو لکھ رہا ہوں وہ ڈی۔ پی۔ آئی سکولز (پرائمری تعلیم) ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنے عہدے کا تفاخر نہیں دکھایا بلکہ انہوں نے مجھے ہی اہمیت دی.......... میں ان کے ظرف کو تا زندگی کو سلام کرتا رہوں گا۔

القصہ.......... اب جب کہ میرے پاس بحالی کا پروانہ تھا کئی دفتری بابو مبارکباد دیتے اور انہی کے ساتھی انہیں آنکھ مارتے اور فوراً کہہ دیتے کہ "سوکھی مبارکباد دے کر قاضی صاحب کو کیوں شرمندہ کر رہے ہو۔ انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ان کا منہ میٹھا کراؤ...... بڑی موذی جنگ جیتی ہے...... فلاں فلاں تو انتظار کرتے کرتے زندگی ہی سے ریٹائر ہو گئے اور آخرت کا ٹکٹ کٹوا بیٹھے۔ یہ ھل من مزید کی روایتی یلغار تھی۔ ایسے مکروہات سے کسی کو مفر نہیں۔ چار و ناچار میں اُن سے کہتا...... بہت اچھا بھیجو نائب قاصد کو پرانی انارکلی اور ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو کا نوٹ نکال دیتا جو میں ایسی ہی جانی بوجھی بلائے بے اماں فرمائشوں کے لئے گھر سے لے کر چلتا تھا۔ اللہ کا فضل و کرم تھا۔ ۱۹۸۷ء سے پنشن مل رہی تھی۔ پہلے سترہویں گریڈ میں ملی' پھر اٹھارہویں میں اور اب اللہ کی مہربانی سے انیسویں مو وا دور میں مل رہی ہے۔

خدا نے مجھے لکھنے کی صلاحیت دے رکھی تھی اس فن کے قدردان میری سرپرستی فرما رہے تھے۔ بچے بھی برسرِ روزگار تھے یوں میں تنگ دستی کا شکار نہ تھا...... الحمد اللہ۔

☆☆

مجھے اپنے واجبات کی وصولی کے لئے جو ہفت خواں طے کرنے پڑے وہ اپنی جگہ ایک جداگانہ جانگداز اور دراز سرگزشت ہے۔ ہمارا وطن دنیا بھر میں اس لحاظ سے ممتاز اور حامل امتیاز ہے کہ یہ بزم گاہِ عالم میں نظریاتی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ کوئی دریا' کوئی خلیج' کوئی کوہستانی سلسلہ یا کوئی جغرافیائی عامل ایسا نہ تھا جو ہمارے وطن کے مسطح میدان کو قدرتی طور پر بھارت سے جدا کر دیتا۔ ہمارے وطن کی سرحد صرف نور کی وہ لکیر ہے جو ہمارے دینی عقیدے نے عطا کر دی ہے...... ہمارے ہاں تھانہ کچہری کے جو سبحان اللہ یا استغفر اللہ قسم کے معاملات ہیں ان کا تو نام ہی نہ لیجئے۔ کانوں کو ہاتھ لگایئے۔ ان کے علاوہ دوسرے دفاتر کا جو حال ہے اُسے دیکھ کر دل ڈرتا ہے اور سانس

میں گرہ پڑنے لگتی ہے۔ مجھے خاص طور پر اکاؤنٹس آفس میں جس "نقد نرائن" قسم کے تجربے سے گزرنا پڑا اُس سے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ یہ احساس بار بار نشتر زنی کرتا رہا کہ

ع...... یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

جو اسلام کے مقدس نام پر بننے والے وطن میں خدا خوفی کو آگ لگا کر اللہ اور رسول ؐ کے احکام پامال کرتے ہیں اور جائز کام کے لئے بھی دھڑلے سے سودا کاری (مک مکا) سے کام لیتے ہیں۔ ستم بالائے ستم کہ ایسے لین دین کی لعنت کسی ایک اہلکار تک محدود نہ تھی بلکہ اس شجرِ خبیثہ کی چھتری اتنی گھنی اور گھناؤنی ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک آکاش بیل کی طرح چھائی ہوئی ہے اور اسی کی طرح الجھی ہوئی ہے۔

میں ۱۹۹۴ء تک سال بھر سے زیادہ مدت تک سیکرٹریٹ میں دفتر محکمہ تعلیم اور دفتر ڈائریکٹر تعلیم لاہور ڈویژن کے چکر لگاتا رہا۔ اہلکار مجھ سے تعاون کرتے تھے اور میں ان سے "تعاون" کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔ کبھی کبھار کسی سے جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ایک اہلکار ایک میز سے اٹھا کر دوسری میز پر منتقل کر دیا گیا تو نئے اہلکار کو ازسرنو اپنا معاملہ سمجھانا پڑتا اور لمبی بات کرنی پڑتی۔ یہ خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ پیسے کا معاملہ تھا۔ میرا کام سو فیصد جائز تھا۔ پھر بھی معمولی معمولی کاغذ کے پرزے 'زرِتعاون' کے بغیر آگے نہیں کھسکتے تھے۔ مگر...... آفرین ہے کہ کوئلے کی کان میں ہیرے بھی تھے۔ ظہیر الدین خاں معاون افسر مالیات اور حفیظ اللہ پنشن اسسٹنٹ...... ان دونوں اہلکاروں نے مجھ سے چائے کا گھونٹ بھی پینا قبول نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے ان دونوں حضرات سے ماضی کے بکھرے کام سنوارنے کے لیے بار بار سابقہ پڑا۔

میں نے ظہیر الدین خاں کو جب بھی یہ بتایا کہ مجھے فلاں فلاں مد میں اتنی رقم ضلعی اکاؤنٹس آفس سے وصول کرنی ہے۔ اب اکاؤنٹس آفس والے کہتے ہیں کہ یہ ادائیگی معمول کی نہیں غیر معمولی ہے۔ اس لئے اپنے محکمے سے بجٹ لاؤ۔ ظہیر احمد خان جلد از جلد بجٹ الاٹ کرنے کی چٹھی تیار کرتا اور متعلقہ افسر سے دستخط کرا کے میرے حوالے کر دیتا تھا۔ اسی طرح حفیظ اللہ نے بھی میری پنشن کے کاغذات بار بار ازسرنو تیار کرنے میں بڑی مدد دی۔ یہ دونوں مجھ سے کبھی پھوٹی کوڑی لینے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ ترجیحی طور پر پوری فرض شناسی سے میرے واجبی کام کرتے رہے۔

مالیاتی بقایا جات برآمد کرانا بڑا طویل، دل شکن اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس ضمن میں متعدد

کاغذات تیار کرنے پڑتے تھے۔ شبیر احمد اسسٹنٹ ڈائریکٹر ماضی کے حوالے تلاش کرتا تھا کہ کس خالی اسامی پر مجھے تعینات کر کے وہ میرے لئے سابقہ دور کی تنخواہ کے حصول کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ مل کر مسلوں کے بھاری پلندے اور کاغذات چھانتا رہتا اور معلومات ڈھونڈتا رہتا تھا۔ وہ باتیں کرتا جاتا اور مجھے لقمہ بھی دیتا جاتا: ''قاضی صاحب! میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ آپ ضرور بحال ہوں گے۔ اب بتایئے محکمے سے کوئی لین دین باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی وصول کئے لیتے ہیں...... میرا مکمل تعاون ہو گا اور اس نے دامے درمے اور سخنے میرے ساتھ تعاون کیا۔ خدا اس کو اس کی جزا دے۔

انہی دنوں میری ملاقات اپنے قدیم رفیق کار مولانا نظام دین صاحب آف چراڑ کے بیٹے خواجہ محمد شریف سینئر سول جج سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے والد کے حوالے سے میرا بڑا احترام کیا۔ میں ان کے تعلقات اور سفارشات سے بھی شیخوپورہ اور لاہور میں معرض التواء میں پڑے اپنے مسائل حل کرنے میں مدد لیتا رہا۔ وہ خوشی سے میرے ساتھ شیخوپورہ اکاؤنٹس آفس تک گئے اور میرے الجھے معاملات سنوارنے کے کام آئے۔ ان کا شکریہ لازم ہے کہ وہ میرے کام سے کبھی نہیں اکتائے۔ بے شک اپنے پرائے کے کام آنے والے ایسے ہی بھلے مانسوں کے دم قدم سے دنیا قائم ہے۔

☆☆

ڈاکٹر سمنٹن کینسر کے نفسیاتی علاج میں عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ وہ اس موذی مرض کے ۲۷ اسباب بیان کرتا ہے۔ ان میں سے جیون ساتھی کے بچھڑ جانے اور اچانک روزگار چھن جانے کو اس نے سب سے پہلا اور بڑا سبب شمار کیا ہے۔ اس حوالے سے ہی میں نے اس کی کتاب ''گیٹنگ ویل اگین'' کا ترجمہ کیا کہ لوگ ایسے صدمات کو دل پر نہ لگائیں۔ تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جائیں۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ! کہ اللہ نے اس ہوشربا آزمائش میں راقم کو ہمت بخشی اور سرخرو فرمایا۔

محکمہ تعلیم کے جو چونتیس افسر 'مفاد عامہ' کے تحت ریٹائر کیے تھے ان میں سے ایسے افسروں نے جنھوں نے تعلیمی خدمات سے مال بنایا تھا اس جبری ریٹائرمنٹ کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور نظر ثانی کی کمیٹی یا ٹربیونل سے رجوع کرنے کے بجائے گوشہ عافیت میں دبک گئے۔ ایک دوست نے ایک سدا کی کنواری معلّمہ سے دوسری شادی کی اور نیا مکان بھی خریدا۔ مسز الطاف بخاری کو وزیر اعلیٰ نے بحال کیا۔ باقیوں کو نظر ثانی کی کمیٹی نمبر ایک اور کمیٹی نمبر دو نے

بحال کردیا۔ ذکیہ باسط کے بعد میں اور مسٹر نثار زیدی دو افراد ایسے تھے جن کی سیاسی قبیلے میں کوئی رسائی نہیں تھی۔ ہمیں پنجاب سروس ٹربیونل نے بحال کیا۔ ہمارے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے ''دیر آید درست آید'' والا معاملہ ہوا۔

ریٹائرڈ شدہ افراد میں سے دو افراد بڑے ثابت قدم اور مستقل مزاج نکلے...... ایک چودھری فیض احمد ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ نمبر ۲ سابقہ ضلعی افسر تعلیم شیخوپورہ اور خواجہ ضیاء الدین بٹ جو سنٹرل ماڈل سکول کے نامور استاد تھے اور ریٹائرمنٹ کے وقت ماہر مضمون تھے۔ ان دونوں نے کسی ادارے' کمیٹی یا ٹربیونل سے رجوع نہیں کیا۔ چودھری فیض احمد سے شیخوپورہ میں ملاقات ہوئی پھر وہ ایک مرتبہ گکھڑ میں بھی ملے لیکن ضیاء الدین بٹ اکثر ملتے تھے اور جب میں ان سے پوچھتا کہ سناؤ بھئی......؟؟ وہ سمجھ جاتے تھے کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں...... اس لئے فوراً انگلی آسمان کی طرف اٹھا دیتے تھے۔ کافی عرصے بعد ایک روز انہوں نے انگلی آسمان کی طرف اٹھانے کے بجائے میری طرف کر دی اور مبارک فاخرین کی دعاؤں سے مجھے گلے لگالیا اور بتایا کہ وزیر اعظم میاں نواز شریف نے ان کو ضابطوں میں چھوٹ دے کر جملہ مفادات کے ساتھ بحال کر دیا ہے۔ اور اب محکمہ مالیات ان کے لئے بجٹ الاٹ کر رہا ہے۔ جلد ہی بقایا جات مل جانے کی توقع ہے۔

میں بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے والا انسان ہوں۔ میں نے خواجہ صاحب سے چودھری فیض احمد کے متعلق پوچھا تو خواجہ صاحب نے بتایا کہ ''اس کو تو جملہ واجبات بھی کبھی کے مل چکے ہیں۔ بھئی اس کا بھتیجا ایس ایس پی ہے'' کیا نام ہے اس بھئی کا وہ لاہور میں بھی رہا ہے''۔ انہیں نام یاد نہیں آیا تاہم خواجہ صاحب نے بتایا کہ اس نے موقع پاتے ہی چچا کو وزیر اعظم سے معاف کرالیا تھا۔'' بے شک ان دونوں صاحبان نے وزیر اعظم کے ذریعے معافی تلافی کرالی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کو بھی جملہ مفادات حاصل کرنے اور مالیاتی امور درست کرانے کے لئے وہی جاں گسل جدوجہد کرنا پڑی ہوگی جو میں نے کی تھی۔

☆☆

خدا حافظ کے طور پر میں تو اپنے برادر مدرسین اور دیگر اہلکاران' سرکاری اور نیم سرکاری ادارہ جات سے یہ کہہ کر رخصت ہو رہا تھا کہ وہ اپنے انتظامی ادارے سے بنا کر رکھیں کیونکہ جیت ہمیشہ محکمے ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن

مولانا احمد کامران معاون مدیر ''اردو ڈائجسٹ'' نے اپنے افکار' پند و نصائح اور جذباتِ عالیہ کا اظہار میری زبان سے کرتے ہوئے ذیل کی تحریر سے قارئین کرام کو نوازا۔ انھیں اس بات کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ میری سرگزشت کی نصف سے زائد اقساط کی زبان' صرف و نحو کے حوالے سے درست کرتے رہے ہیں اور میرے خیالات کی ترجمانی کی تشریح اشعار اور مصرعہ جات سے فرماتے رہے ہیں۔ راقم الحروف مولانا کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے مجھے احسن طریق سے الوداع کہنے کا شعور دیا۔

☆☆

خدا حافظ

قارئین کرام! میری سرگزشت تمام ہوئی۔ اب گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو گزشتہ زندگی کے لیل و نہار نمودِ غبار معلوم ہوتے ہیں۔

کاٹے ہیں کچھ خوشی میں تو کچھ دن غمی کے ساتھ
ہوتا رہا مذاق مری زندگی کے ساتھ

میں ایک چیلا تھا۔ پھر گرو ہو گیا۔ بعد کو محکمہ تعلیم نے مجھے محتسب بنا دیا۔ میری زندگی انہی مرحلوں کے نشیب و فراز کی داستان ہے جسے میں نے آپ کو سنا کر غبار خاطر نکالا ہے۔ اس کے لئے میں قارئین ''اردو ڈائجسٹ'' اور قریشی برادران جناب ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور جناب الطاف حسن قریشی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری داستان کی چھبیس اقساط بڑے حوصلے اور محبت سے شائع کیں۔ علی برادران نے فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کیا تھا' قریشی برادران بے دینی' غفلت' جہالت اور فحاشی و بے حیائی کے اصنامِ باطل سے نبرد آزما ہیں اور اُن اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو ڈولنے اور ڈوبنے سے بچا رہے ہیں جنہیں آج کے دور کی مادی تابکاریاں رسوا کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ اول الذکر محسن اگر علم و نظر کے جام نہ چھلکاتے تو میں تشنہ رہتا۔ اور آپ شاید یہ داستان نہ پڑھ پاتے۔ وہ تعلیم کی خاطر اور باغوانوں کی رہائی کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا صلہ ان کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے اور دے رہا ہے۔

ع...... بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے!

میں نے زندگی کی تگ وتاز سے جو کچھ پایا، وہ اس داستان کے پیچ وخم کے حوالے کر دیا ہے۔ اس داستان کے آئینے میں خوب وزشت کی ہر تصویر بول رہی ہے۔ اس میں ہمارے نظام تعلیم کے کھلے ہوئے گیسو بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اُڑی ہوئی رنگت بھی! اساتذۂ کرام کے لئے یہ داستان تجربات کی دستاویز ہے...... اور وہ محترم اساتذہ جن کی زندگی تعلیم وتدریس کے تسلسل سے الگ ہوگئی ہے اور جو اب سبکدوشی کے دن گزار رہے ہیں ان کے لئے بھی یہ کہانی بے مزہ نہیں۔ وہ اسے پڑھیں گے تو

ع...... ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کی گونج سُنیں گے۔ میری صداؤں میں انہیں اپنے دل کی آواز سُنائی دے تو عجب نہیں۔ زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا۔ اب علام الغیوب ہی بہتر جانتا ہے کہ بقیہ زندگی کا جلوۂ سیراب کتنے دن کا ہے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اس سے پہلے کہ آپ سے اجازت چاہوں

ع...... میری سنو! جو گوش نصیحت نیوش ہے!

چند باتیں پلے باندھ لیجئے:

۱)...... طرب کی حالت ہو یا طیش کی، کسی حال میں اللہ رب العزت کو نہ بھولئے۔ بہادر شاہ ظفر کا مشہور شعر ہے جو میری زبان پر اکثر جاری ہو جاتا ہے

ظفر آدمی اسے نہ جانئے گا، ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا!
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اللہ کے فضل سے آپ کو دولت اور فراغت میسر ہو تو غریبوں ناداروں اور کسمپرسوں کا خیال رکھئے...... خدا نہ کرے کسی آشوب یا آزمائش کا سامنا ہو تو کسی فانی انسان کا سہارا نہ ٹٹولیے۔ اُسی رب العزت پر بھروسہ رکھئے جو رات کی تاریکیوں میں بجلی چمکا کر پریشان حال مسافروں کو راستہ دکھا دیتا ہے۔ اصحاب عزیمت کبھی کسی غیر کے سہارے کے محتاج نہیں ہوئے وہ ہمیشہ اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور اپنا سہارا خود بنے رہتے ہیں۔

۲)...... اگر آپ معلم یا صدر معلم ہیں تو اپنی منزلت کا ہر آن خیال رکھئے۔ معلّمی فضیلت ہی نہیں بے پایاں ذمہ داری بھی ہے۔ اپنے فرائض کے اعتبار سے آپ قوم کے معمار ہیں۔ آپ کا فکر

وعمل سچے اور کھرے مسلمان کا ہونا چاہیے۔طلباء کی سیرت سازی میں سب سے زیادہ مؤثر عامل آپ ہی کا حسن کردار ہے۔آپ کی زندگی میں ایمان باللہ اور نیکیوں کا چراغاں ہو گا تو زیر تعلیم نونہالوں کے ذہن پر آپ کی سیرت کے تابندہ نقوش ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائیں گے۔اس طرح وہ اچھے اور باعمل مسلمان بنیں گے آپ کا یہی حسن عمل حشر کے ہجوم و ہیجان میں آپ کی کیلئے جنت کی بشارت بن جائے گا۔قوم کے بچوں کو اپنی سگی اولاد سمجھئے۔ بہتر سے بہتر تدریسی استعداد صرف کیجئے اور خلوص دل سے پڑھایئے۔تاکہ ان میں سچا علمی ذوق اور تحقیق وانکشاف کا شوق بیدار ہو جائے۔

قوم کی قسمت سیاست دان نہیں معلم بدلتے ہیں۔امتِ مسلمہ جس خواری اور زبوں حالی سے دوچار ہے اُسے دیکھ کر دل دکھتا ہے۔آپ ملت اسلامیہ کی فلاح کے لئے نہایت مؤثر کردار انجام دے سکتے ہیں۔اتنا ضرور کیجئے کہ:

۱)..... طلبہ کو محبت اور شفقت سے نماز کی ترغیب دیتے رہیے اور اتنا پکا نمازی بنا دیجئے کہ انہیں نماز پڑھے بغیر کبھی چین نہ آئے۔

۲)..... اپنی بات چیت کو موقع محل کی مناسبت سے الحمدللہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، جزاک اللہ اور انشاء اللہ جیسے نورانی جملوں سے سجا لیجئے۔جب آپ ہر موقع محل پر اللہ رب العزت کو یاد کریں گے تو طلباء کے ذہنوں پر مقدس حروف نقش ہو جائیں گے۔اس طرح اللہ کی ذات عالی پر ان کا یقین بتدریج مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔

۳)..... ہر سطح پر، ہر درجے میں اور ہر حال میں اُردو بولئے اور لکھئے اور طالب علم برادری کو قومی زبان، قومی لباس اور ملی قدروں کا پاسبان بنا دیجئے۔مادری زبان سے بھی غفلت نہ برتیئے۔

۴)..... اپنے برتاؤ اور میٹھی میٹھی ترغیب سے طلبا کے ذہن میں یہ بات پیوست کر دیجئے کہ اپنے وطن کی کم سے کم تر معیار کی مصنوعات بھی بڑھیا سے بڑھیا بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں قابل ترجیح ہیں۔ہمیں اپنے وطن کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ممالک کی مصنوعات سے متنفر رہنا چاہیے۔

۵)..... طالبان عزیز کے ذہن میں وقتاً فوقتاً التزام کے ساتھ یہ حقیقت جاگزیں کرتے رہیے کہ تمام مسلمان ایک امت ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور ختمی مرتبت رسالت مآب ﷺ کے اسوۂ مبارک کے مطابق زندگی گزارتا ہے، وہ مسلمان ہے۔ہم سب ایک ملت ہیں۔اچھا اور

معزز مسلمان وہ ہے جو اچھے کام کرتا ہے۔

۳)...... ملازمت کے قواعد و ضوابط کی پوری پابندی کیجئے۔ ماتحتوں پر اپنی محبت و شفقت کا چھڑکاؤ کرتے رہیے۔ اور افسرانِ بالا کا احترام کیجئے۔ کینہ، کپٹ، حسن کارکردگی کیلئے کسی صلے کی امید یا ستائش کی تمنا نہ رکھئے...... اچھا کام اپنا انعام خود ہوتا ہے۔ آپ اپنے فرائض کی بجا آوری میں بے لچک اور مستعد ہوں گے تو قدرت آپ کو عزت بخشے گی اور آپ کے لئے بیش از بیش انعامات کی راہیں آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائیں گی۔

۴)...... خدانہ کرے محکمہ کے کسی ادنیٰ یا اعلیٰ فرد سے کوئی رنجش یا شکایت پیدا ہو جائے تو اُسے مشترکہ دوستوں اور بزرگوں کے ذریعے جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ لڑائی بھڑائی اور پنجہ آزمائی کی نوبت نہ آنے دیجئے۔ مقدمہ بازی سے پرہیز کیجئے۔ یاد رکھیے کیچڑ میں ہاتھی بھی پھسل جاتا ہے۔ آدمی کا اصل سرمایہ باطنی قوتیں ہیں۔ سچائی، پارسائی، فرض شناسی، محنت، محبت، ملنساری، خلوص اور حُسنِ اخلاق کی بدولت آپ کٹھن ترین چیلنج سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جبکہ مقدمہ بازی بڑے سے بڑے سورما کو ادھ موا کر دیتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے سچ فرمایا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے بام و در میں ہوئی ہیں...... واقعہ یہ ہے کہ عدالت کے کٹہرے سے انصاف نہیں ملتا۔ بفرض محال مل بھی جائے تو اس پر عمل درآمد کرانے والا اعملہ اپنے خول میں بند بیٹھا رہتا ہے اور اسے متحرک کرنے کیلئے قارون کا خزانہ اور عمر نوحؑ درکار ہوتی ہے۔

زندگی تیزی سے منقلب ہو رہی ہے۔ وقت کروٹیں بدل رہا ہے۔ موجودہ حالات کی سرد فضا میں، میں ایک بھٹکی ہوئی آواز ہوں۔ میرے جیب و دامن میں جن تجربات کی نقدی تھی وہ میں نے بصد ادب آپ کے حوالے کر دی۔

اب دعائے خیر کی التجا کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں — والسلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اے عشق ہمیں لے چل ایک نور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں
اب خُلدِ بریں لے چل
اے عشق ہمیں لے چل

◆◆◆◆

(تمام شد)



تعارف

قاضی ذوالفقار احمد

میٹرک	۱۹۴۷ء
بی۔اے	۱۹۵۲ء
بی ٹی	۱۹۵۳ء
ایم۔اے (اردو)	۱۹۵۷ء
ایم۔ایڈ (ثانوی)	۱۹۶۵ء

بچپن ہی سے مطالعے کا شوق رہا۔ چونکہ پہلی ملازمت ہی مڈل (ان ٹرینڈ) ٹیچر تھی۔ اس لیے طبعی رجحان معلمی ہی کی طرف رہا۔ ابتدا میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے سکولوں اور انجمنوں کے سکولوں میں سات سال بطور انگلش ٹیچر ملازمت کی۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ سنٹرل ماڈل سکول لوئر مال سے دسمبر ۱۹۶۳ء میں انتظامیہ میں آمد ہوئی۔ ۱۹ویں گریڈ میں ۱۹۸۹ء کو ریٹائر ہوا...... تمام سروس پل صراط ہی بنی رہی۔ پوری کہانی ''منکہ ایک مدرس'' میں احباب کی راہنمائی کے لیے لکھ دی ہے۔

......☆......

میں ایک مدرس

قاضی ذوالفقار احمد



ابلاغ پبلشرز



۱۹۵۱ء









قاضی ذوالفقار احمد کی دیگر تصانیف